ISSN- 2249-636X

خصوصی پیشکش

مشرف عالم ذوقی

اشرف گل

مدیر اعزازی : ڈاکٹر امام اعظم

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

اجراء: مارچ ۲۰۰۱ء

ماہنامہ "تمثیل نو" دربھنگہ

اشاعت: انیسواں سال

جلد: ۱۹ — جولائی ۲۰۱۹ء تا دسمبر ۲۰۲۰ء — شمارہ: ۷۴-۷۹

بانی : جناب ایم. زیڈ. ایم. زیڈ. فاروقی (سابق پولیس افسر)

سرپرست: جناب بلال حسن (صدر 'بزم شہر نشاط' کولکاتا)

مجلس مشاورت

زرتعاون

فی شمارہ: ۲۰۰ روپے، سالانہ ۲۴۰۰ روپے، خصوصی تعاون: ۲۰۰۰ روپے، تاحیات (بھارت) ۱۰۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۸۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ) ۶۰ امریکی ڈالر/۴۰ پونڈ

رابطہ: مدیر "تمثیلِ نو"، ادبستان، محلّہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، دربھنگہ–846007 (بہار)

Email: imamazam96@gmail.com / imamazam96@yahoo.com ; Blog: drimamazam.blogspot.com

پرنٹر، پبلشر و آنر ڈاکٹر امام اعظم نے دربھنگہ آفسیٹ پریس، دربھنگہ سے چھپوا کر
دفتر "تمثیلِ نو" اردو ادبی سرکل، محلّہ: گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ–846007 سے شائع کیا۔

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ھے

سال ۲۰۱۹ء کا اختتام ہندوستان سمیت پوری دنیا کے لیے بحرانی کیفیت کے ساتھ ہوا۔ حکومت نے پارلیمنٹ سے شہریت ترمیمی بل - ۲۰۱۹ء منظور کروا کے ملک کے ایک خاص طبقے کو شدید تشویش میں مبتلا کر دیا جس کی وجہ سے لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور ملک بھر میں اس کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دہلی کے 'شاہین باغ' کا احتجاج (آغاز: ۱۴ر دسمبر ۲۰۱۹ء - اختتام: ۲۴ر مارچ ۲۰۲۰ء، کووڈ-۱۹ لاک ڈاؤن کے سبب) ملک بھر کے لیے رول ماڈل بن گیا اور اس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ابھی احتجاج جاری ہی تھا کہ دنیا کووڈ-۱۹ کے شکنجے میں پھنس گئی۔ دسمبر ۲۰۱۹ء میں چین کے شہر ووہان سے جس مرض کا آغاز ہوا اس نے بہت جلد ساری دنیا میں اپنی دہشت پھیلا دی اور عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے اسے بین الاقوامی وبا (Pandemic) کا نام دے دیا۔ ۲۷ر جنوری ۲۰۲۰ء کو ہندوستان میں پہلا کورونا مثبت مریض پایا گیا جس کے بعد اس متعدی مرض کے متاثرین کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۲۴ر مارچ ۲۰۲۰ء کو مرکزی حکومت نے ملک گیر پیمانے پر تالا بندی (Lockdown) کا حکم دیا اور ہنگامی خدمات انجام دینے والے افراد کے علاوہ تمام لوگ گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ مکمل لاک ڈاؤن کا یہ سلسلہ تقریباً ۷۶ر دنوں تک جاری رہا جس کے بعد معمولاتِ زندگی دھیرے دھیرے اپنی ڈگر پر آنے لگے تاہم اس طویل تالا بندی سے عام افراد کے علاوہ محنت کش طبقہ، زراعت پیشہ لوگ، طلبہ وغیرہ بے حد متاثر ہوئے۔ لیکن اس وقفے کو کئی شعرا و ادبا نے غنیمت بھی جانا اور شعری و نثری ادب کا ایک نیا پہلو منظر عام پر آیا جسے وبائی یا کورونائی ادب کا نام دیا گیا۔ ایسے میں ادبی اور ثقافتی الجھاؤ بھی سامنے آیا۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اس کے لکھنے والے ذہنی انتشار میں مبتلا رہے۔ تشنگی کے صحرا میں جلتے رہے، درد کی اندھی گزرگاہوں کا سامنا کرتے رہے۔ امن و آشتی کی دعا کرتے رہے۔ جن سے جو ہو سکا، پیار اور انصاف کا دریا بہاتے رہے۔ ایسے میں ادبی رسالے کے مدیر زیادہ متاثر ہوئے کہ پریس بند تھا، کمپوزر گھروں میں محصور تھے اور دیگر بنیادی ضرورتوں کے لیے دوری اختیار کر لی گئی تھی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ "تمثیلِ نو" گزشتہ انیس برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ ایسے میں اردو کے دیگر رسائل کے ساتھ "تمثیلِ نو" کا متاثر ہونا بھی فطری ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ شوخ، سرکش اور کھلنڈری کرن لوٹ آئے تاکہ رنگین ہوا "تمثیلِ نو" تک پہنچ سکے، لیکن تاخیر ہوتی گئی۔ اب جب ہم کچھ تازہ دم ہوئے ہیں اور اس خوف ناک اندھیرے سے نکلنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، تو ایسے میں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ لکیروں کو ہم نے جلدی جلدی مٹایا ہے تاکہ ابھرتے ڈوبتے مواد کی گم شدگی دیوار نہیں بنے بلکہ روشن دیوار کے حصے ابھر کر سامنے آ سکیں۔ ڈھیر ساری تخلیقات میں سے منتخب مواد آپ کے مطالعے میں ہے۔ اس میں جتنا تنوع ہے، اس کی داد آپ ضرور دیں گے کہ عہد کی دستاویز کو تہذیب و تمدن کے جائزے کو ہم نے سمیٹنے کی کوشش کی ہے تاکہ موضوعی اعتبار سے بھی یہ شمارہ عمدہ بن سکے اور لائقِ استفادہ ہو سکے۔

مشرف عالم ذوقی بے حد فعال قلم کار ہیں اور اپنی ذہنی مضبوطی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ ان پر خصوصی پیشکش

کے تحت ہم نے پانچ مضامین شامل کیے ہیں، جن سے ان کے پر پیچ خیالات اور تصورات پر روشنی پڑ سکے۔ اشرف بگل اردو کی تیسری بستی کے شاعر ہیں۔ وہ شاعری میں مصوری کرتے ہیں اور ہم عصر تاریخ کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے مختلف النوع خیالات ان کی شاعری میں آسانی سے نظر آجاتے ہیں۔ ان پر بھی خصوصی پیشکش کے تحت تین مضامین شامل ہیں۔ راقم الحروف کے نام مختلف شعبوں کے مشاہیر نے سینکڑوں خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے ۴۴۳؍مکتوب نگاروں کے ۷۱۹؍مکاتیب کو جواں سال ادیب وشاعر شاہد اقبال نے ترتیب دے کر مع اپنے ۴۴؍صفحاتی مقدمے کے شائع کیا ہے جس کی پذیرائی ہنوز جاری ہے۔ بعض قلم کاروں نے مختصر آرا پیش کیں، چند نے منظوم ستائش کی جب کہ متعدد ادباء نے تبصرہ یا مضمون کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے ۴؍مضامین، ۳؍مختصر آراء، ا؍نظم اور...... قطعات اس شمارے میں بطورِ خصوصی پیشکش شامل ہیں تاکہ اس کتاب کے مطالعہ کا ردِ عمل پیشِ نظر رہے۔ وہ اس لیے کہ خطوط نویسی کی روایت جاں بلب ہے۔ اردو ادب کی نابغہ شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام خطوط کا مجموعہ (دو جلدوں میں) گزشتہ دنوں منظرِ عام پر آیا جنھیں خود پروفیسر موصوف نے ترتیب دیا ہے۔ ان خطوط کی اہمیت کو پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ نت نئے ادبی، لسانی اور تنقیدی تصورات کی ایک نئی منطق قارئین تک پہنچ سکے۔ مظہر امام اردو ادب کی نابغہ شخصیت تھے۔ ان پر کئی کتابیں لکھی گئیں اور مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی۔ میرے خیال میں ایک پہلو تشنہ رہ گیا تھا جسے پروفیسر ہرگانوی نے دھماکہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اردو ادب میں بازی گروں کی کمی نہیں ہے جس کی نشان دہی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ''تمثیلِ نو'' کا ایک حصہ تبصروں پر مبنی ہوتا ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ بیشتر نئی کتابوں کو تبصروں کے ذریعہ قارئین سے متعارف کرایا جاسکے۔ اس بار بھی...... اہم کتابوں کو بامعنی بنانے کے لیے، قارئینِ اردو تک پہنچانے کے لیے یہ صفحات مختص ہیں۔ میرا اداریہ عام طور پر پسند کیا جاتا ہے کیوں کہ گزشتہ دنوں کی ادبی سرگرمیوں کی تفصیل اس کا حصہ ہوتی ہے۔ اس بار بھی تعصبات اور غلط فہمیوں سے درکنار معلومات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے اور نئے قلم کاروں کے نئے خیالات کو قارئین تک پہنچایا گیا ہے۔ کورونا سے پہلے اور اس کے دوران بھی اموات کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ڈیڑھ برس کے دوران کئی مشاہیر نے اس عالمِ فانی کو خیر باد کہا۔ ان کے انتقال کی خبریں بھی وفیات کے تحت اس شمارے کا حصہ ہیں۔

ادبی و ثقافتی خبریں:

● (۲۵؍مئی ۲۰۱۹ء): ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' کا اجراء آج مرتب کی رہائش گاہ ادبستان، محلّہ: گنگوارہ، دربھنگہ (بہار) میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام پروفیسر رئیس انور، پروفیسر ایم نہال، ڈاکٹر قمر الحسن، ڈاکٹر نجیب اختر وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر موجود مہمانوں نے کہا کہ ''سہرے جیسی منفرد صنفِ سخن پر یہ انوکھی اور اولین کتاب ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم صاحب نئی اور ان چھوئے موضوعات پر معیاری کتابیں لاتے رہتے ہیں۔ سہرے کے پھولوں کی طرح اس کی خوشبو بھی اردو حلقوں میں پھیل رہی ہے۔ اس کتاب پر اب تک بہت سارے قلم کاروں نے منظوم و منثور تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ کتاب کے مشمولات میں

مرتب کے مقدمہ اور شاہد جمیل کے دیباچہ کے علاوہ ایک انٹرویو (ڈاکٹر امتیاز وحید)، ۱۲؍مضامین اور ۲۳۵؍شعراء کے سہرے شامل ہیں۔ مرتب کے مقدمہ ''میں پیامِ نشاط لایا ہوں'' سے اردو ادب میں سہرے کی روایت اور اس کی تاریخ پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔'' دیگر حاضرین میں حیدر وارثی، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، محمد کریم اللہ حیاتی، انجینئر انور امام، سیّد متین اشرف، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، شکیل احمد سلفی، اقبال حسن، حافظ محمد نصر الحق، مولانا عبدالصمد وغیرہ بھی شامل تھے۔ تقریبِ اجراء سے قبل ادارۂ ہٰذا کی جانب سے پُر تکلف عشائیہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

....

● (۱۸؍جون ۲۰۱۹ء): آج شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں ریسرچ اسکالر عذرا مناظ (معلمہ، سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول، کولکاتا) کا اوپن وائیوا ہوا۔ محترمہ کے مقالہ کا عنوان ''مناظر عاشق ہرگانوی ایک منفرد افسانہ نگار'' تھا۔ وائیوا کے بیرونی ممتحن پروفیسر نبی احمد، جب کہ مقالہ کے نگراں ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ تھے۔

....

● (۲۴؍جون ۲۰۱۹ء): پی جی شعبۂ اردو، ایل این ایم یو دربھنگہ میں ریسرچ اسکالر محترمہ شاداں پروین کا اوپن وائیوا آج صدرِ شعبہ ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ کی صدارت میں ہوا۔ شاداں پروین نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ''اردو کے ایک اہم تخلیقی نثر نگار شین مظفر پوری'' زیرِ نگرانی ڈاکٹر برکت علی سابق صدر شعبۂ اردو ایم ایل ایس ایم کالج دربھنگہ مکمل کیا تھا۔ وائیوا میں بیرونی ممتحن کی حیثیت سے پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، صدر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر قیام نیر کی تازہ تصنیف ''معروف و غیر معروف افسانہ نگاروں کی افسانوی خدمات (بہار و جھارکھنڈ کے تناظر میں)'' کا اجرا بدست پروفیسر آفتاب احمد آفاقی عمل میں آیا۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں اہل علم حضرات نے شرکت فرمائی جس میں ڈاکٹر برکت علی، پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر محمد سجاد خان، ڈاکٹر راحت حسین، ڈاکٹر محمد افروز الہدیٰ، ڈاکٹر جاوید رحمانی (سلچر، آسام) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

....

● (۳۰؍جون ۲۰۱۹ء): ادبی تنظیم ''ہم نشیں'' بہار کے زیرِ اہتمام آج الحرا پبلک اسکول شریف کالونی، پٹنہ کے اقرا ہال میں جواں سال اسکالر ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی تحقیقی و تنقیدی تصنیف ''پروفیسر عبدالمغنی: ناقد و دانشور'' کی رسمِ اجرا بہار اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر جناب امتیاز احمد کریمی کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ تقریب کی صدارت معروف ادیب و شاعر پروفیسر علیم اللہ حالی نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ریحان غنی نے انجام دیے۔ اس موقع پر جناب شفیع مشہدی، جناب ایس. ایم. اشرف فرید، ڈاکٹر رضیہ تبسم، پروفیسر توقیر عالم، سید اکبر رضا جمشید، پروفیسر جاوید حیات، پروفیسر ممتاز احمد خاں، جناب فخر الدین عارفی، ڈاکٹر اسلم جاوداں اور جناب محمد انور تشریف فرما تھے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اس موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کسی کتاب کی رسم اجرا کے موقع پر اتنا بڑا مجمع شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ مجمع دیکھ کر کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے مصنف کتاب ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں قومی سطح پر سمینار منعقد کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی نے تنقید کے حوالے سے اپنی منفرد اور معتبر پہچان بنائی تھی۔

جناب شفیع مشہدی نے کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرنا اردو والوں پر اب بھی قرض ہے۔ جناب ایس ایم اشرف فرید نے اس موقع پر کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے اور ان کے ادبی و علمی کارناموں کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ رسم اجرا کے اس موقع پر جواں سال شاعر و صحافی کامران غنی صبا نے ''پروفیسر عبدالمغنی: ناقد و دانشور'' پر اپنا تبصرہ پیش کیا جسے کافی پسند کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو ''ہم نشیں'' کی جانب سے ''ہم نشیں ادبی ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا۔ جناب شفیع مشہدی، پروفیسر علیم اللہ حالی، امتیاز احمد کریمی اور دیگر مہمانان نے ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو شال اور توصیفی سند پیش کرکے اعزاز سے نوازا۔ اس تقریب میں کثیر تعداد میں ادیب، دانشور، صحافی اور مختلف شعبۂ حیات کے سرکردہ افراد شریک تھے۔

●(۶؍جولائی، ۲۰۱۹ء): آج سابق وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند محمد علی اشرف فاطمی نے معروف ادیب، شاعر، صحافی اور مانو ریجنل سنٹر کولکاتا کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم کے رسالہ ''تمثیل نو'' (شمارہ جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء) اور ان کی مرتبہ کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' کا اپنی رہائش گاہ خواجہ سرائے، لہریا سرائے، دربھنگہ میں اجراء کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر امام اعظم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ۱۹۹۶ء سے ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ پھر مانو ریجنل سنٹر دربھنگہ کے ریجنل ڈائرکٹر ہوئے اور ان کی قیادت میں دربھنگہ میں تاریخی نوعیت کے کام ہوئے جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی کنوینرشپ میں دوروزہ قومی سمینار اور عالمی مشاعرہ ہوا جس میں احمد فراز، حسن کمال، ساغر خیامی، وسیم بریلوی، ممتاز راشد و دیگر نامور اہل علم اور شعراء حضرات نے شرکت کی۔ پھر ان کا تبادلہ پٹنہ ہوا، وہاں سے کولکاتا گئے۔ اس وقت وہیں ریجنل ڈائرکٹر ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کا کام توجہ طلب ہوتا ہے۔ وہ اردو ادب کے روشن ستارے کی طرح اپنے کام کا جادو دکھاتے رہتے ہیں۔ ان کا رسالہ 'تمثیل نو' میں اس لئے پسند کرتا ہوں کہ پڑھنے کے لئے اس میں بہت مواد ہوتا ہے۔ صرف لفظی نباضی نہیں ہوتی ہے بلکہ سوچ، قوت، مشاہدہ، طرز عمل اور نقطہ نظر کی فکری سطح ہر شمارے میں نمایاں رہتی ہے۔ تازہ شمارہ میں بھی ترجیحات و صفات اس کی خوبیاں ہیں۔ دوسری طرف یہ کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' جستجو کے واقعاتی سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔ یہ ایک فرسودہ اور کسی حد تک فراموش کردہ موضوع تھا جسے امام اعظم نے پرداخت عطا کی ہے۔ قارئین اور ناقدین کے لئے بھی یہ ایک جستجو بھرا تحفہ ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے فاطمی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ موصوف دربھنگہ پارلیمانی حلقہ سے چار بار جیت چکے ہیں اور انہیں عوام کی بے حد اور بے پناہ محبت حاصل ہے۔ انہوں نے دربھنگہ کو ہندوستان کے نقشہ پر اس طرح ابھارا ہے کہ دربھنگہ ہندوستان کے ہر علاقہ سے ریلوے لائن سے جڑ گیا ہے۔ دربھنگہ میں مانو کا تعلیمی ہب انہوں نے قائم کیا جو ان کی اردو دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کا رویہ پیشہ ورانہ سیاست نہیں بلکہ خادمانہ سیاست ہے۔ اسی لئے موصوف بہار میں بے حد مقبول اقلیتی رہنما ہیں۔ یہ محض قصیدہ گوئی نہیں سچائیوں پر مبنی باتیں ہیں۔ اگر رہنما کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے تو وہ اپنے خوابوں کو زمین پر اتارتا ہے اور یہ صلاحیت فاطمی صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

● (۲۱؍جولائی ۲۰۱۹ء): معروف ادیب اور محقق ڈاکٹر ایم صلاح الدین (سبکدوش استاد، موضع: رام نگر، پوسٹ: رام نگر دھونسی، وایا: نہرا، دربھنگہ) کی تنقیدی و تحقیقی کتاب ''چراغِ آ گہی'' جس میں ان کے کل ۲۲؍مضامین اور پیش لفظ شامل ہے، کی رونمائی آج الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام ادبستان محلہ گنگوارہ، دربھنگہ میں ہوئی۔ اس تقریب رونمائی کی صدارت نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم، دربھنگہ) نے کی جب کہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب محمد امام (چمپا باغ، دربھنگہ)، حیدر وارثی اور ڈاکٹر نجیب اختر موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے کی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر نوا امام (ڈینٹل سرجن) نے ادا کی۔ تمام مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر امام اعظم نے کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب ''چراغِ آ گہی'' میں شامل مضامین متوجہ کرتے ہیں اور اس لئے قابل قدر بھی ہیں کہ ان کے افکار میں جذباتیت اور علم و آ گہی کا پورا پس منظر کارفرما ہے۔ انہوں نے اپنے وسیع مطالعہ اور مصروفیت کے ساتھ جمالیاتی فاصلے کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح تاثر آفرینی کے گہرے رنگ صاف نظر آتے ہیں۔ محمد امام، حیدر وارثی، ڈاکٹر نجیب اختر، محمد کریم اللہ حیاتی نے کتاب کے مشمولات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایم صلاح الدین کی تحریر میں سلاست ہے نیز خیالات اور تاثرات کی آئینہ کاری بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں تین علاقوں سکری، ہرسنگھ پور اور گنگوارہ پر خامہ فرسائی کی ہے اور یہ بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے کہا کہ ایم صلاح الدین صاحب کی تحریریں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی ۵؍کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریروں میں تنقید کی زیریں لہریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں تاہم وہ اپنی تحریروں میں نکتہ چینی نہیں کرتے بلکہ خوبصورتی سے تنقید کرتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد عیب جوئی نہیں ہے۔ نیاز احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی تحریروں میں صاف گوئی ہے اور ان کی بعض تحریریں تحقیق کے زمرے میں آتی ہیں جن سے ان کے عمیق مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ ''چراغِ آ گہی'' کی اشاعت پر ان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے موصوف نے یہ بھی کہا کہ اس طرح کی ادبی محفلیں ڈاکٹر امام اعظم آراستہ کرتے رہتے ہیں جو ان کی اردو دوستی کا کھلا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے اپنی کتاب کے حوالے سے مختصر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کتاب کے مشمولات کا ادبی تعین قارئینِ ادب کریں گے۔ اخیر میں اظہارِ تشکر ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر نوا امام نے کہا کہ ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی یہ کتاب اپنی جاذبیت کے لحاظ سے بھی متنوع ہے۔ ادارے کی جانب سے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تقریب کے دیگر شرکاء میں ڈاکٹر ایس احمد ناصح، مولانا محمد مستقیم قاسمی (صدر مدرس مدرسۃ البنات فاروقیہ، گنگوارہ)، معز الدین راغب، فضا امام وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

....

● (۳۰؍جولائی ۲۰۱۹ء): ''طب یونانی ہمارا تہذیبی ورثہ ہے، اس کا تحفظ و فروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اردو کو زندگی بخشنے میں طب یونانی کا بھی بڑا رول رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے آج کونسل کے صدر دفتر میں آج منعقدہ طب یونانی پینل کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ طب یونانی اور اردو کا گہرا رشتہ رہا ہے اسی لیے طب یونانی کا خاصا بڑا ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے۔ ہندوستان

میں طب یونانی کے ماہرین نے یونانی طریقۂ علاج کے لیے جس زبان کا سہارا لیا، وہ اردو ہی ہے۔ اس طرح اردو کے ذریعہ طب یونانی کا اور طب یونانی کے ذریعہ اردو کا فروغ ہوتا رہا ہے۔ دونوں کے باہمی رشتہ کو رواں صدی میں بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جائے اور اس سمت میں مثبت و مضبوط اقدامات کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ اپنی اس تاریخی و تہذیبی وراثت کے تحفظ و فروغ کے لیے قومی اردو کونسل گذشتہ کئی برسوں سے کام کر رہی ہے اور کونسل سے یونانی طریقۂ علاج، یونانی ادویہ اور طب یونانی کی تاریخ پر کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اس حوالے سے مزید کئی کتابیں جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔

ڈاکٹر محمد خالد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ قومی اردو کونسل کی بڑی کامیابی ہے کہ اس نے قلیل مدت میں بڑے پیمانے پر اردو میں طب یونانی سے متعلق مواد کی اشاعت کو یقینی بنایا اور متعدد اہم کتابیں شائع کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ حال ہی میں کونسل نے صحت سے متعلق ایک اہم کتاب 'حفظانِ صحت' شائع کی ہے اور امراض اطفال اور امراض نسواں سے متعلق کتابوں کی اشاعت کے ساتھ تاریخ طب، معالجات، جراحت، علم الادویہ اور کلیات ادویہ جیسی کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ ڈاکٹر اشہر قدیر نے کہا کہ گزشتہ چند برسوں میں ہم طب یونانی پر اچھی خاصی کتابیں شائع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اگلے چند برسوں میں یہ دائرہ مزید وسیع ہو جائے گا۔ میٹنگ میں نئے منصوبوں پر بھی غور و خوض کیا گیا اور کئی اہم تجاویز سامنے آئیں۔ میٹنگ میں پروفیسر محمد ایوب، ڈاکٹر وسیم احمد، ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی، ڈاکٹر محمد اکرم، حکیم وسیم احمد اعظمی، ڈاکٹر شبیر احمد کے علاوہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک، ڈاکٹر محمد فیروز عالم اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، ذیشان فاطمہ اور یوسف رامپوری شریک رہے۔

● (۱۴؍ اگست ۲۰۱۹ء): انجینئر محمد شکیب عالم (خلف جناب ڈاکٹر محمد منصور عالم مرحوم، مقام سید نگر، باقر گنج، لہریا سرائے، دربھنگہ) حال مقیم دبئی (متحدہ عرب امارات) اکثر اپنے وطن تشریف لاتے ہیں۔ شعر و ادب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ سوشل میڈیا سے کافی دلچسپی ہے اور فیس بک وغیرہ پر بے حد متحرک رہتے ہیں۔ آج ملاقات کی غرض سے ڈاکٹر امام اعظم کی رہائش گاہ ادبستان، محلہ: گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ - ۲ تشریف لائے جہاں ڈاکٹر موصوف نے انہیں اپنی دو کتابیں ''سہرے کی ادبی معنویت'' (ترتیب)، ''گیسوئے افکار'' (ادبی مضامین) اور اردو جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ شمارہ جولائی ۲۰۱۸ء - جون ۲۰۱۹ء پیش کئے۔ انجینئر شکیب عالم نے تینوں کتابوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر امام اعظم ایک مدت سے اردو ادب سے وابستہ ہیں۔ ''گیسوئے تنقید''، ''گیسوئے تحریر'' اور ''گیسوئے اسلوب'' کے بعد ''گیسوئے افکار'' ان کے ادبی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے، جس میں کافی اہم مضامین شامل ہیں، نیز سہرے کے حوالے سے میری معلومات کے مطابق اردو دنیا میں پہلی کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' ہے۔ اس میں کئی مضامین، انٹرویو اور ۲۳۵ رشعرائے کرام کا ایک ایک سہرا بطورِ نمونہ شامل کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی مرتب کا ایک طویل مقدمہ ''میں پیامِ نشاط لایا ہوں'' کے عنوان سے بھی موجود ہے۔ موصوف کی ادارت میں تقریباً ۱۸ ربرس سے اردو جریدہ ''تمثیل نو'' شائع ہو رہا ہے جس کی پذیرائی ملک و بیرونِ ملک اردو حلقوں میں کی

جاتی ہے۔اس رسالے کے ابتدائی ۷ ابرسوں پر مشتمل ایک کتاب ''تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش'' ڈاکٹر ابرار اجراوی نے ترتیب دی ہے جس میں ''تمثیل نو'' کے حوالے سے مضامین، تبصرے، رائیں اور مشمولات کا اشاریہ شامل ہے۔ میں انہیں ان کتابوں کی اشاعت پر صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

....

● (۱۵/اگست ۲۰۱۹ء): آج جشنِ آزادی کے موقع پر مغربی بنگال کے قدیم ملی، فلاحی اور ثقافتی ادارہ 'ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ' کولکاتا میں ایک شاندار مشاعرہ کا انعقاد ادارہ کے جنرل سکریٹری محمد عزیز الحق اور لٹریری سیکشن کے چیئر مین کوثر احمد کی قیادت میں کیا گیا۔ مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر شبیر ابروی نے کی اور نقابت کے فرائض فراغ روہوی نے انجام دیئے۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر اچاریہ جمال احمد جمال (مروئی والے) نے شرکت کی۔ مشاعرہ کا باضابطہ آغاز مغربی بنگال کے استاد شاعر و ادیب جناب علقمہ شبلی مرحوم کی ادبی شخصیت کا مختصراً احاطہ کرتے ہوئے اراکین ادارہ کی طرف سے تعزیتی کلمات ادا کیے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی۔ مشاعرے کا آغاز نظیر راہی کے نعتیہ کلام سے ہوا۔ شعرائے کرام میں ڈاکٹر امام اعظم، سیّد اقبال طالب، مشتاق دربھنگوی، شمیم انجم وارثی، ارشاد آرزو، طاہر بیگ دہلوی، محترمہ رونق افروز، منجو کماری عشرت، ڈاکٹر احمد معراج، ارشاد احمد طاب، افتخار عظیم اور رانیہ صابری وغیرہ نے اپنے خوبصورت کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرہ کو کامیاب بنانے میں مجلسِ منتظمہ کے اراکین پیش پیش رہے۔ مشاعرہ ۱۱ بجے شب ایاز احمد روہوی (لٹریری سکریٹری) کے اظہارِ تشکر کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

....

● (۱۹/اگست ۲۰۱۹ء): اردو دوست معروف افسانہ نگار گیان چند کینتھ نشتر دہلوی کے افسانوی مجموعہ ''درد کے سائے'' کا اجراء سینئر صحافی و ادیب نند کشور وکرم کے ہاتھوں آج انصاری اسلامک کلچرل سینٹر 6/275، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی میں ہوا۔ نند کشور وکرم نے نشتر دہلوی کے لئے دعائیہ کلمات کے ساتھ کہا کہ اگر اپنے ادبی تخلیقی سفر کو جاری رکھیں گے، تو اس کے نتائج کارآمد ثابت ہوں گے۔ صدارت ممتاز افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شیام سندر سنگھ نے انجام دیئے۔ ابتدا میں مہمان خصوصی شاعر و ناقد عمران عظیم ایڈوکیٹ، معروف ادیب فاروق ارگلی اور نوجوان ادیب و صحافی حبیب سیفی تھے۔ تقریب کے صدر مشرف عالم ذوقی نے کہا گیان چند کینتھ نشتر دہلوی کی خوش قسمتی ہے، کہ انھیں اس ادبی سفر میں اطہر انصاری (ساحر داودنگری) ملے اور نشتر دہلوی کی کتاب شائع کرا کے اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے دھارے میں جو رکاوٹ ہوتی دکھ رہی تھی اس میں تیزی لانے کا کام کیا۔ شاعر و ناقد عمران عظیم ایڈوکیٹ نے کہا نشتر دہلوی 1960 سے پہلے انجام دے رہے ہیں، نتیجہ میں ان کی کتاب ''درد کے سائے'' کو تشکیل دی، دنیاوی درد کے سائے سے نجات کی تدبیریں اپنے افسانوں میں نشتر دہلوی نے پیش کی ہیں۔ معروف ادیب فاروق ارگلی نے بھی موصوف افسانہ نگار کو آئندہ بھی اس سفر پر چلنے کی دعائیں دیں، اور کہا کہ ایسے مشترکہ تہذیب کے متوالوں سے ہی ہندوستان کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ادیب و صحافی حبیب سیفی نے کہا کہ 'درد کے سائے' افسانوی مجموعہ میں قدروں کے زوال، قوموں کے انتشار، اور ذہنوں کے خلفشار کے ساتھ انسانیت کا درد کثرت سے پایا جاتا ہے، آپ کی اردو سے دوستی موجودہ حالات میں بڑی چیز ہے۔ بزرگ نشتر دہلوی کی پوتی

امریتا کینتھ نے بھی اردو سے والہانی محبت کا ثبوت اظہار خیال کر کے دیا۔ اس موقع پر شرکاء نے کہا اگر کینتھ جیسے گھرانوں میں ایسے اردو کے چاہنے والے ہیں تو ہمیں امید ہے دنیا میں اردو پھلتی پھولتی رہے گی۔ تقریب میں شامل شمس الضحیٰ ایڈیٹر آئینہ انڈیا، مشہور صحافی افتخار قریشی، سینئر صحافی ساجد عبید، ارشد حسین اور اصناف ادب پر کام کرنے والے دانشوران کثیر تعداد میں شامل تھے، جنہوں نے درد کے سائے کی اشاعت پر مصنف گیان چند کینتھ کو مبارکباد پیش کیں۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر اطہر انصاری نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

....

● (۵ر ستمبر ۲۰۱۹ء): اردو دوست، معروف ملّی اور سماجی شخصیت جناب بلال حسن (صدر، بزمِ شہرِ نشاط، کولکاتا اور سرپرست اردو جریدہ 'تمثیل نو' دربھنگہ) جو شہر کولکاتا و مضافات کے درجنوں اداروں سے وابستہ ہیں نیز اپنے ادارہ ''بزمِ شہرِ نشاط'' کے تحت ۷۰ر سے زائد پروگرام کر چکے ہیں، آج مانو ریجنل سینٹر ۱-اے/۱، چھاتو بابو لین (محسن ہال)، کولکاتا-۱۴ میں تشریف لائے اور مانو کے امتحانات کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ اس موقع پر معروف ادیب، شاعر اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا ریجنل سینٹر) نے اپنی تازہ کتاب ''گیسوئے افکار'' انہیں پیش کی۔ جناب بلال حسن نے کہا کہ ڈاکٹر امام اعظم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی اب تک ۲۲ر کتابیں شائع ہو چکی ہیں نیز ان کی ادبی خدمات پر بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے ڈاکٹر سرور کریم (صدر شعبۂ اردو، آر این اے آر کالج، سمستی پور) ۲۰۱۴ء میں پروفیسر رئیس انور کے زیرِ نگرانی بعنوان ''دربھنگہ کا ادبی منظرنامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی و صحافتی خدمات کے حوالے سے'' پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں جو کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ ماہر تعلیم جناب سید محمود احمد کریمی ایڈوکیٹ (دربھنگہ) نے ان کے اولین شعری مجموعہ ''قربتوں کی دھوپ'' کا انگریزی ترجمہ 'Proximal Warmth' کے نام سے کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ادارت میں ۱۸ر برس سے 'تمثیل نو' شائع ہو رہا ہے جس کا شہرہ ملک و بیرون ملک ہے۔ نوجوان ناقد و محقق ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے 'تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش' ترتیب دے کر شائع کیا ہے جس کا کافی چرچا ہے۔ ان کی کئی کتابیں منتظرِ اشاعت ہیں جن میں شہر کولکاتا کی منظوم مختصر تاریخ ''یہ کولکاتا ہے'' اہم ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کلکتہ میں سات برس سے اپنے عہدے کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں نیز ادبی کاموں میں بھی سرگرم ہیں۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ''ڈاکٹر موصوف ایسے محقق ہیں جو نئے نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس کتاب سے یہ بھی علم ہوا کہ نوجوان ادیب و شاعر شاہد اقبال ڈاکٹر امام اعظم کے نام آئے ہوئے مشاہیر کے خطوط ترتیب دے کر شائع کر رہے ہیں جس کا بے صبری سے ہمیں انتظار ہے۔ زیرِ نظر کتاب جو انہوں نے بڑی محبت سے پیش کی ہے اس میں ۳۷ر مضامین شامل ہیں جو اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کتاب جناب عامر سبحانی (آئی اے ایس، ایڈیشنل چیف سکریٹری، داخلہ اور اقلیتی فلاح و بہبود، حکومت بہار) کو منسوب ہے۔ میں ان کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اللہ انہیں زورِ قلم اور زیادہ عطا فرمائے۔ آمین!''

....

● (۱۰ر ستمبر ۲۰۱۹ء): اراکین بزم شاکری کی جانب سے ۸ر ستمبر ۲۰۱۹ء کو دفتر بزم شاکری، ۵۳ر اے، شمس الہدیٰ روڈ،

کولکاتا-۷ میں بزم مسالمہ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب سفیر الدین کمال نے فرمائی اور نظامت کے فرائض معتمد بزم نے انجام دیئے۔ جلسے کے آغاز سے پہلے شاکری کے بہی خواہ اور اردو کے مشہور شاعر علقمہ شبلی مرحوم کی تعزیت کی گئی اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی۔ اس موقع پر انجم عظیم آبادی، حلیم صابر، ڈاکٹر امام اعظم اور معتمد بزم (مصطفےٰ اکبر) نے مرحوم کے سانحہ ارتحال پر اظہار غم کیا اور ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ مقررین نے ان کی رحلت کو اردو ادب کا نا قابل تلافی نقصان بتایا۔ افضال انصاری نے 'بزم سے اٹھ گئے شبلی صاحب' کے عنوان سے ایک تاثراتی مضمون پڑھ کر سنایا جس میں شبلی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ بعد ازاں فیروز اختر، ڈاکٹر امام اعظم اور سفیر الدین کمال نے مرحوم کو شعری خراج عقیدت پیش کیا۔ معتمد بزم کی درخواست پر جناب حلیم صابر نے اپنے منفرد انداز میں شاکر کلکتوی کے ایک سلام سے ادبی جلسے کا آغاز کیا۔ جناب انجم عظیم آبادی نے 'بزم شاکری میں مسالمے کی روایت' کے عنوان سے ایک خصوصی خطبہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو میں سلام کہنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ شاعر اپنے کلام کے ذریعے بارگاہِ امام حسین میں اپنی محبت کا پرخلوص اظہار کرتے ہیں اور انہیں سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔ بزم شاکری میں شاکر کلکتوی کی زندگی میں بزم مسالمہ کا انعقاد پابندی کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ موجودہ معتمد نے اس روایت کو زندہ کیا اور اب یہ پابندی کے ساتھ ہوتا آرہا ہے۔ بزم شاکری کی خدمات میں اس عمل کو بھی یاد رکھا جائے گا۔ بعد ازاں شعری دور کا آغاز ہوا جس میں انظار البشر، اشفاق احمد اشفاق، انجم نایاب، شمیم ساگر، پرویز رضا، یوسف اختر، سلطان ساحر، عبدالوارث سفر، فیروز اختر، اشرف یعقوبی، ارشد جمال حشمی، جمیل حیدر شاد، امام اعظم، مصطفےٰ اکبر، حلیم صابر، انجم عظیم آبادی اور صدر جلسہ سفیر الدین کمال نے سلام، منقبت، نوحہ اور اپنے اشعار پیش کیے۔ اس موقع پر غیاث الدین احمد، پرویز طاہر، سلیم احمد، شیخ عثمان اور شوکت علی بھی موجود تھے۔ جناب پرویز طاہر نے اراکین بزم کی جانب سے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اظہارِ تشکر کے بعد جلسہ رات دس بجے اختتام پذیر ہوا۔

....

● (۶/ اکتوبر ۲۰۱۹ء): معروف ادیب، شاعر اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر مانو کولکاتا) کی تنقیدی و تحقیقی کتاب ''گیسوئے افکار'' کا اجراء امریکہ سے تشریف لائے نامور شاعر و ادیب جناب رفیع الدین راز کے ہاتھوں آج ادبستان، محلہ گنگواره دربھنگہ میں زیر اہتمام الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ ہوا۔ جلسے کی صدارت جناب علاء الدین حیدر وارثی (سابق ہیڈ ماسٹر، شفیع مسلم ہائی اسکول دربھنگہ) نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے ادا کیے۔ اس موقع پر جناب رفیع الدین راز نے ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مختصر مضمون بھی پیش کیا۔ تقریب کے آغاز میں تمام مہمانوں کا تعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد کتاب پر نقیب جلسہ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے مختصر روشنی ڈالی۔ دیگر اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر ایم صلاح الدین اور ڈاکٹر عالمگیر شبنم کے نام اہم ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے جناب رفیع الدین راز کا تعارف پیش کیا اور ان کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اشعار بھی سنائے۔ تمام مہمانوں نے ان کی سادگی اور عمدہ شاعری کی تعریف کی۔ واضح ہو کہ ۲۷۲ صفحات پر

مشتمل اس کتاب میں ۳۷ مضامین اور پیش لفظ شامل ہے، جس کا انتساب اردو دوست جناب عامر سبحانی (آئی اے ایس)، ایڈیشنل چیف سکریٹری داخلہ اور اقلیتی فلاح حکومت بہار کو کیا گیا ہے۔ تقریب میں شامل دیگر افراد میں ڈاکٹر وکیل احمد (ایڈوکیٹ)، محمد کریم اللہ حیاتی، ڈاکٹر سرفراز احمد، حافظ محمد نصر الحق، حافظ نازش نہال، انجینئر فضا امام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تقریب میں موجود شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ بھی کیا۔ شکریہ کی رسم ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے ادا کی۔

....

● (۹/ اکتوبر ۲۰۱۹ء): دارا شکوہ میں غیر معمولی صلاحیتیں تھی۔ اس نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو وسیع تر تناظر میں سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کی۔ دارا شکوہ نے تمام مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مذہبی شخصیات کے درمیان وقت گزارا۔ مختلف امور اور مسائل پر گفتگو کی۔ اس نے ہندو مذہب کو سمجھنے کے لیے سنسکرت زبان بھی سیکھی اور کاشی کے برہمنوں کے ساتھ بھی وقت گزارا۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ قومی سمینار ''محمد دارا شکوہ: حیات و خدمات'' کے افتتاحی اجلاس میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر کرشن گوپال (جوائنٹ سکریٹری، آر ایس ایس) نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دارا شکوہ مسلمان تھا۔ وہ اپنے گہرے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا میں مختلف نظریات ہیں اور رہیں گے لیکن دنیا محبت اور ہم آہنگی سے چلے گی۔

سمینار کے مہمانِ اعزازی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے اپنے خطاب میں کہا کہ دارا شکوہ ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک روشن علامت تھا۔ وہ اس سلسلۂ فکر سے جڑا ہوا تھا جس میں اتحاد، یگانگت اور یکجہتی کا تصور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ وائس چانسلر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دارا شکوہ چیئر کے قیام کا اعلان بھی کیا جس کے تحت دارا شکوہ پر تحقیقی مطالعات کے سلسلے کا آغاز ہوگا۔ انھوں نے دہلی میں دارا شکوہ سینٹر کے قیام پر بھی زور دیا تاکہ دارا شکوہ کے افکار و تصورات کی مکمل طور پر تشہیر کی جا سکے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے کہا کہ دارا شکوہ پر سمینار ایک نئے باب کا آغاز ہے جس سے دارا شکوہ پر مزید گفتگو کے در وا ہوں گے۔ انھوں نے بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دارا شکوہ پر ایک وِنگ تشکیل دینے کا اعلان کیا۔

استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے کہا کہ آج یہاں ہندوستان کے ایک ایسے شہزادے کی حیات و خدمات پر گفتگو ہو رہی ہے جو ایک شہزادہ کم اور صوفی، یوگی اور سنیاسی زیادہ نظر آتا ہے۔ ایسے صوفی شہزادے پر یہ سمینار یقیناً میل کا پتھر ثابت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ دارا شکوہ نے دنیا کے دوسرے ممالک میں ہندوستانی تہذیب اور کلچر کو متعارف کرایا۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے دارا شکوہ کی حیات و خدمات مبسوط گفتگو کی اور دارا شکوہ پر سمینار کے انعقاد کو موجودہ وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ دارا شکوہ ہندوستانیت کا مظہر اور بین مذاہب اتحاد اور یکجہتی کی ایک روشن علامت تھے۔ اگر وہ ہندوستان کے حکمراں ہوتے تو اس ملک کی تاریخ، تصویر اور تقدیر کچھ اور ہی ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ سَرو دھرم سمبھاؤ کا تصور سب سے پہلے دارا شکوہ

نے ہی دیا تھا۔اس کا وژن بہت وسیع تھا،وہ اس روحانیت پر یقین رکھتا تھا جو انسانوں سے نفرت نہیں بلکہ محبت سکھاتی ہے۔خدمتِ خلق،احترامِ آدمیت اس کا منشور تھا۔قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ داراشکوہ کے افکار وتصورات کو آج کے عہد میں عام کرنے کی ضرورت ہے اور اسی مقصد کے تحت قومی اردو کونسل داراشکوہ کی تمام کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اردو میں اس کے ترجمے بھی کرا رہی ہے۔اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب 'مجمع البحرین' کے ترجمے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔افتتاحی اجلاس کی نظامت جناب تحسین منور نے کی اور شکریے کی رسم قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے ادا کی۔

پلینری سیشن میں محترمہ آذرمی دخت صفوی نے اپنے کلیدی خطبے میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ داراشکوہ نے معاصر روایات کا رخ موڑ کر اسے سائنسی بنانے کا کام کیا۔داراشکوہ منطقی ذہن رکھتا تھا، وہ فکر انسانی کا علمبردار تھا۔پروفیسر محمد شبیر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ داراشکوہ متعدد صلاحیتوں کا حامل تھا۔کئی اہم عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود مطالعے کے لیے وقت نکالا اور بین المذاہب مکالمے میں دلچسپی لی۔اس نے اپنشد کا مطالعہ کیا اور ہندومت اور اسلام کے درمیان یکسانیت کو تلاش کیا۔وہ سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری پر یقین رکھتا تھا۔اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے کی۔ظہرانے کے بعد تکنیکی سیشن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر طلحہ رضوی برق نے کی۔اس سیشن میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر سید محمد عزیز الدین ہمدانی اور پروفیسر سید عین الحسن نے پرمغز مقالے پیش کیے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے انجام دیے۔دوسرے سیشن کی صدارت شریف حسین قاسمی نے، جبکہ پروفیسر سید حسن عباس، پروفیسر سلمہ محفوظ، پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اپنے مقالے پیش کیے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔

● (۱۶/اکتوبر ۲۰۱۹ء): اردو میں املا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔درست املا تحریری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے اور غلط املے سے لفظ کے معنی اور حسن میں تبدیلی کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ اس تعلق سے بڑے پیمانے پر لاپرواہی برتی جارہی ہے اور املے کی سطح پر بہت سے الفاظ کو الگ الگ انداز میں لکھا جارہا ہے، جس کے سبب قارئین اور اردو کے عام طلبا کے لیے مشکلات پیدا ہورہی ہیں، اس لیے قومی کونسل اردو املا کے حوالے سے باضابطہ ایک گائیڈ لائن بنانے پر کام کررہی ہے تاکہ املے کے مسائل کو حل کیا جاسکے۔یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ میٹنگ میں کہیں۔انھوں نے کہا کہ املا کے تعلق سے اعتدال کی راہ اختیار کی جانی چاہیے۔اگر قدیم املا میں وقت کے تقاضے اور سہولیات کے تحت تبدیلی کی گنجائش ہو تو اس بارے میں غور کیا جاسکتا ہے تاکہ نئی نسلوں کے لیے اردو پڑھنا، لکھنا اور بولنا آسان ہو۔ماہرین کی مدد سے کونسل یہ کام کررہی ہے۔داستانوں کی قرأت کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ داستانوں کے بہت سے الفاظ کو آج ٹھیک طور پر پڑھنا دشوار ہے۔ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں موجودہ نسلوں کے لیے ان سے استفادہ مشکل ہے۔اس لیے اس سمت میں بھی پیش رفت کی ضرورت ہے۔

میٹنگ کی صدارت کر رہے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے املا کے مسائل پر تحقیقی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف بولی ہی نہیں بلکہ زبان ہے جو لکھی بھی جاتی ہے۔ ایسے میں رسم الخط اور املا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمزہ کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ جہاں ہمزہ ناگزیر ہو، وہاں اس کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ زبان کو منطقی نہیں بنایا جا سکتا۔ عربی الفاظ کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ جہاں عربی کی ترکیب ہے وہاں ان کے املا کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ جب بھی اردو املا کی بات کریں، تو اردو کے صوتی مزاج کو سامنے رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ الفاظ کے اسٹرکچر ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہوتے ہیں، اس لیے املا کی سطح پر اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی کونسل اردو کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی طرف اردو والوں کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں سے شائع ہونے والی چیزوں کو معیاری خیال کیا جاتا ہے۔ املا کے حوالے سے قومی کونسل کی کوششیں لائق تحسین ہیں اور یہ امید کی جا سکتی ہے کہ کونسل کے ذریعے تیار کیے ہوئے املا نامہ کو ہر جگہ قبول کیا جائے گا۔ میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی، ان میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر عبدالحی، جناب اجمل سعید، محترمہ آبگینہ، شہاب الدین، ڈاکٹر بہلول، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، جناب مشہود احمد، جناب محمد اکرام اور جناب امین اللہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

....

● (۱۹/اکتوبر ۲۰۱۹ء) محترمہ مسرت جہاں (بنت: محمد سمیع اللہ مرحوم، سابق منیجر آزاد ہند، معلمہ ہوڑہ مسلم ہائی اسکول، ہوڑہ، مقیم تالتلہ نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا) نے ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ (صدر شعبۂ اردو، ایل این ایم یو) کے زیر نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ ''اقبال انصاری: ایک نمایاں فکشن نگار'' ایل این متھلا یونیورسٹی میں ۲۰۱۷ء میں جمع کیا تھا جس کے بیرونی ممتحنین پروفیسر جاوید حیات (صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر منظر حسین (رانچی یونیورسٹی، جھارکھنڈ) تھے۔ آج پی جی شعبۂ اردو میں پروفیسر جاوید حیات نے وائیوا لیا۔ واضح ہو کہ ریسرچ اسکالر مسرت جہاں کے خاوند محمد مفتاح الدین خاں (پاپا سر) کا انتقال ۲/اکتوبر ۲۰۱۹ کو ہو گیا جس کا انھیں گہرا صدمہ تھا پھر بھی انھوں نے ہمت جٹائی اور اوپن وائیوا میں شریک ہوئیں۔ ان کی تمام بہنیں ڈاکٹر نصرت جہاں (صدر شعبۂ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا)، محترمہ شبانہ جبیں (ہیڈ مسٹریس سی ایم او اسکول)، محترمہ روحی یاسمین اور محترمہ ثروت سمیع درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

....

● (۷/نومبر ۲۰۱۹ء) دربھنگہ سوشل ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۳۱/ہرن باڑی لین، کولکاتا-۷۳ کی ایک اہم میٹنگ زیر صدارت معروف سماجی شخصیت جناب محمد بدرعالم آج بعد نماز ظہر منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں سوسائٹی کی طرف سے کمبل کی تقسیم، خون عطیہ کیمپ، طبی جانچ پروگرام وغیرہ کے سلسلے میں غور و خوض کیا گیا اور سوسائٹی کے اراکین کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ تمام پروگراموں کی تاریخ طے کریں اور اس کارِ خیر کو انجام دیں۔ مانو ریجنل سینٹر کولکاتا کے ریجنل ڈائریکٹر اور مدیر اعزازی اردو جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ ڈاکٹر امام اعظم کو ان کی ادبی، شعری، علمی و قومی خدمات کے لئے سوسائٹی ہٰذا کی جانب سے گلدستہ، شال اور میمینٹو پیش کیا گیا۔ نوجوان شاعر ڈاکٹر احمد معراج نے ڈاکٹر امام اعظم کا بھرپور تعارف کراتے ہوئے کہا کہ موصوف مانو کے ریجنل ڈائریکٹر کی حیثیت سے کولکاتا میں گزشتہ ۷ برسوں سے

مقیم ہیں۔اس سے قبل جناب نظیر راہی نے اپنی مترنم آواز میں نعت پاک پیش کرتے ہوئے پروگرام کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر امام اعظم نے مختصر اور جامع گفتگو اردو کے حوالے سے کی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعارف بھی پیش کیا نیز سابق وزیر مملکت برائے فروغِ انسانی وسائل، حکومت ہند جناب محمد علی اشرف فاطمی کے ذریعہ یونیورسٹی کی ترقی وترویج کا ذکر بھی خصوصی طور پر کیا۔اپنی زیرِ اشاعت ''یہی کولکاتا ہے!'' (کولکاتا کی مختصر منظوم تاریخ) کا ایک بند پڑھ کر سنایا اور سوسائٹی کے تمام اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔اس تقریب میں محمد بدرِ عالم، اخلاق احمد (سابق کونسلر)، محمد یونس (جنرل سکریٹری)، محمد ایوب صدیقی، محمد بلند اختر، محمد مبین، عبداللہ خاں، محمد داؤد، محمد علاء الدین، محمد یعقوب، جمیل اختر، عبدالبارک، محمد سرفراز عالم، دانش اخلاق، محمد معراج، محبوب اختر، صادق حسین وغیرہ صاحبان موجود تھے۔جناب محمد یونس نے شکریہ کی رسم ادا کی۔

....

● (۳۰ر نومبر ۲۰۱۹ء): اردو کے معروف شاعر مجروح سلطان پوری کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے ۳۰-۲۹ر نومبر ۲۰۱۹ کو اکادمی آڈیٹوریم، منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں دوروزہ سمینار کا انعقاد کیا۔سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز نقاد، دانشور پدم بھوشن گوپی چند نارنگ نے کہا کہ مجروح کا نام ان کے تغزل اور شعری کمال کی وجہ سے ہمیشہ روشن رہے گا۔مجروح سلطان پوری کا کمال یہ تھا کہ فارسی اور اردو شاعری کی غزلیہ روایت کی روح کو انھوں نے جذب کرلیا تھا اور ان کی آواز میں ایسا جمالیاتی رچاؤ اور کشش پیدا ہوگئی تھی کہ ان کی بات دل پر اثر کرتی تھی۔ان کی شائستہ اور دردمند آواز میں از دل خیزد بر دل ریزد والی کیفیت تھی۔ایک زمانہ تھا جب ترقی پسندوں نے غزل کی شدید مخالفت کی تھی، مجروح سلطان پوری کا کارنامہ یہ ہے کہ نہ تو انھوں نے ترقی پسندوں کا ساتھ چھوڑا اور نہ ہی غزل سے اپنی وفاداری کو ترک کیا۔یہ ان کی سلامتی طبع اور خوش مذاقی کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ تغزل اردو شاعری کا جوہر ہے اور اس سے ہاتھ اٹھانا گویا شعریت سے منہ موڑنا ہے۔

اکاڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے تمام مقالہ نگاروں اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں مجروح کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب شین کاف نظام نے ابتدائی کلمات پیش کیے۔انھوں نے مجروح سلطانپوری کے شعری اوصاف پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔اگرچہ انھوں نے کم کہا ہے لیکن جو بھی کہا وہ اردو شاعری میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارجمند آرا نے مجروح سلطانپوری کی شاعری، ان کے فن اور ان کی شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی جسے سامعین نے خوب پسند کیا۔ صدارت اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر مادھو کوشک نے کی اور مجروح سلطانپوری کے فلمی نغموں اور ان کی غزلیہ شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اپنے عہد کا مقبول ترین شاعر قرار دیا۔آخر میں اکادمی کے ہندی ایڈیٹر انوپم تیواری نے تمام شرکا اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مشہور طنز نگار اور صحافی نصرت ظہیر نے کہا کہ جہاں

نظم گو شعرا لمبی لمبی نظموں میں باتیں کیا کرتے تھے وہیں مجروح سلطانپوری نے صرف شعر کے دو مصرعوں میں بیان کر کے غزل کی اہمیت کو منوایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زیادہ تر ترقی پسند شعرا نظم کو غزل پر ترجیح دیتے رہے۔ اس اجلاس میں شائستہ یوسف، حسن رضا اور غلام نبی کمار نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف نقاد، شاعر اور ادیب پروفیسر عتیق اللہ نے تخلیق اور تنقید کو اپنے گفتگو کا موضوع بناتے ہوئے کہا کہ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ شعرا دانشورانہ طور پر اپنے کو متنازعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ شاعری ایک فطری عمل ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مجروح نے فلمی گیتوں میں نیا انقلاب پیدا کیا۔ اس اجلاس میں نصرت جہاں اور زبیر شاداب نے اپنے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شہزاد انجم نے کی۔ اس اجلاس میں جواں سال ناول نگار رحمٰن عباس نے مجروح سلطانپوری کی شخصیت اور ان کے ابتدائی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں خالد اشرف اور نوشاد منظر شامل تھے۔ اس موقع پر راجدھانی کے کئی اردو ادیب، شاعر، دانشور اور مختلف یونیورسٹیوں کے طلبا موجود رہے۔

....

● (۸ر دسمبر ۲۰۱۹ء): ''پروفیسر ثوبان فاروقی اردو شعر و ادب کے پارکھ اور تخلیق کار تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ جہاں بڑے شاعر تھے وہیں ایک بڑے نثر نگار بھی تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے مرحوم پروفیسر ثوبان فاروقی (سابق صدر شعبۂ اردو آر این آر کالج، حاجی پور، ویشالی) کی ۵ر کتابوں ''گردابِ فنا'' (منتخب غزلیں)، ''ماحصل'' (منتخب نظمیں)، ''سہ برگہ'' (ماہیے اور دوہے)، ''شفق عماد پوری کی تین نایاب تصانیف'' اور ''سچ بولنے کی روایت کا نیا آہنگ'' کی رسم اجرا کے موقع پر کیا۔ اس اجرائی تقریب کا انعقاد آج باربی کیو لائیو ہال، ڈاک بنگلہ انور پور، حاجی پور میں ہوا۔ معروف افسانہ نگار اور شاعر ڈاکٹر قاسم خورشید نے بحیثیت مہمان خصوصی کہا کہ پروفیسر ثوبان فاروقی کی زندگی میں شور کم تھا اور شدت زیادہ تھی۔ ان کی تخلیقات کو پڑھنے، سمجھنے اور ان پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ معروف ادیب اور صحافی جناب انوار الحسن وسطوی نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر صاحب شہر حاجی پور کے ایک بے بدل شخصیت تھے۔ انہوں نے ۵۰ سال قبل حاجی پور میں اردو شعر و ادب کی پہلی شمع روشن کی تھی۔ ایسی گرانقدر شخصیت سے یہ شہر محروم ہوگیا ہے۔ پروفیسر سریندر پرساد نے مرحوم پروفیسر صاحب کے ساتھ گذارے ہوئے اوقات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ان پانچ کتابوں کی اشاعت کے لئے کافی فکرمند رہتے تھے لیکن ان کی زندگی میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ اس موقع پر ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق نے پروفیسر موصوف کے تعلق سے اپنا مقالہ پڑھا جبکہ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کا تحریر کردہ تبصرہ ''گرادبِ فنا: ایک مطالعہ'' ان کے فرزند مولانا نظر الہدیٰ قاسمی نے پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر فاروقی مرحوم کے خویش ڈاکٹر سید غلام نبی احمد (شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی) کے اظہار تشکر پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس رونمائی تقریب میں مرحوم کے صاحبزادگان محمد شہاب فاروقی، محمد شکیب فاروقی اور محمد شارب فاروقی نے اہم کردار ادا کیا۔

● (۲۴ر دسمبر ۲۰۱۹ء): اردو پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ یہ اردو کا وہ ادارہ ہے جو دنیا کے ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اردو زبان کی توسیع کا کام کرتے ہیں۔ اب قومی اردو کونسل اردو زبان کی توسیع و ترقی کا عالمی مرکز بن چکا ہے۔ آج کا پروگرام قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ کتابوں کی رسم اجرا کے موقعے پر کہیں۔ اس موقعے پر کناڈا سے تشریف لائے معروف محقق و نقاد سید تقی عابدی کی کتاب 'باقیات و نادرات فیض احمد فیض' اور موریشس سے تشریف لائے ڈاکٹر آصف علی محمد کی کتاب 'ماریشس میں اردو' نیز 'تاشیانہ شمتالی کی کتاب 'جوش اور اقبال کا تقابلی مطالعہ' کا اجرا ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور پروفیسر انور پاشا کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ رسم اجرا سے قبل سید تقی عابدی نے اپنی تصنیف 'باقیات و نادرات فیض احمد فیض' کے بارے میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی نیز اس کے ماٰخذ و منابع اور مواد کی فراہمی میں درپیش مشکلات سے حاضرین کو آگہی دی۔ ماریشس سے تشریف لائے ڈاکٹر آصف علی محمد نے ماریشس میں اردو کی صورت حال پر مبسوط گفتگو کی اور ہندوستان میں اپنے تعلیمی سفر کی روداد سناتے ہوئے کہا کہ ہم ہر سال ہندوستان آتے ہیں اور یہاں کے دانشوروں اور اہل کمال سے علمی قوت لے کر تازہ ہوتے ہیں۔ صدر نشیں پروفیسر انور پاشا نے بالترتیب ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈاکٹر آصف علی اور تاشیانہ شمتالی کی کتابوں پر اظہارِ خیال کیا۔ انور پاشا نے قومی اردو کونسل میں سفیران اردو کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر کے بعد اردو کا اگر کوئی گھر ہوسکتا ہے تو وہ ماریشس ہے۔ اردو وہاں کی تہذیبی و ثقافتی شناخت بن چکی ہے۔ آخر میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمانانِ گرامی ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈاکٹر آصف علی محمد، تاشیانہ شمتالی اور پروفیسر انور پاشا و دیگر خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

....

● (۲۵ر دسمبر ۲۰۱۹ء): عصر حاضر میں گلشن ادب کی شادابی میں جن شعراء و ادباء کا خون جگر شامل ہے ایسے چار صاحب فن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایوارڈ سے نوازنے کے لئے ''بزم صابری'' نے ایک ایسی بارونق بزم سجائی جس میں کثیر تعداد میں محبانِ ادب شامل ہوئے۔ بھارتیہ بھاشا پریشد میں سجائی گئی اس بزم کی قابل ذکر بات یہ رہی کہ اس میں ادب کے خدمت گاروں کو اعزاز دیا گیا۔ حلیم صابر کی صدارت اور انظار البشر کی نقابت میں ہونے والے اس پروگرام میں ''علامہ شبلی ایوارڈ'' دینے کے علاوہ آل بنگال مشاعرہ برائے شاعرات کا اہتمام کیا گیا۔ دیرینہ ادبی خدمات کے اعتراف میں شاعر و ادیب مشتاق دربھنگوی، مضطر افتخاری، ہندی ادیب اور صحافی جتیندر جیتانگشو اور صدارتی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر مہناز وارثی کو ایوارڈ اور سپاس نامے پیش کئے گئے۔ اس موقع پر تمام ایوارڈ یافتگان نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بزم کے اراکین کا شکریہ ادا کیا۔ بزم کے صدر جناب انظار البشر نے کہا کہ مشتاق دربھنگوی نے اب تک ۱۶ ر کتابیں ترتیب دی ہیں لیکن شعراء و شاعرات کی عالمی ڈائرکٹری ''گوش برآواز'' ایسی کتاب ہے کہ اگر کوئی اسے ترتیب دینا چاہے تو اسے سو سال انتظار کرنا پڑے گا۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر امام اعظم نے اس موقع پر علامہ شبلی کی علمی خدمات کا ذکر کیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب حلیم صابر نے کہا کہ عصر حاضر میں کلکتہ کی سرزمین پر چار عظیم علمی شخصیتیں تھیں۔ ان میں سالک لکھنوی، اعزاز افضل، علامہ شبلی

اور قیصر شمیم شامل تھے۔ قیصر شمیم کے سوا سبھی ادب کی محفل کو ویران کر کے چلے گئے۔ ان سبھی شعراء کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے ان کی خدمات کو سراہا۔ اس پروگرام کے بعد شاعرات کا مشاعرہ ہوا جس کی صدارت محترمہ کوثر پروین کوثر نے کی جب کہ نقابت کے فرائض محترمہ رونق افروز نے انجام دئے۔ جن شاعرات نے اپنے کلام پیش کئے ان کے اسمائے گرامی ہیں کوثر پروین کوثر، ڈاکٹر مہناز وارثی، نادرہ ناز، بشریٰ سحر، رونق افروز، زرتاب غزل، شبنم ذاکر، چنا سرن، بینا کشی اور ننیتا انامیکا۔

....

● (۲۶ر دسمبر ۲۰۱۹ء): آج مانو کولکاتا ریجنل سینٹر میں ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر) کی کتاب ''ہندستانی ادب کے معمار: مظہر امام'' (مونوگراف، ساہتیہ اکاڈمی) کی رونمائی دربھنگہ سے تشریف لائے معروف ناقد، محقق، شاعر اور صحافی پروفیسر مشتاق احمد (پرنسپل، سی ایم کالج، دربھنگہ و مدیر اعزازی ''جہانِ اردو'' دربھنگہ) کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقع پر ڈاکٹر افتخار احمد (صدر، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کولکاتا)، جناب ایم نصر اللہ نصر (ہوڑہ)، ڈاکٹر محمد مظہر قادری (اے آر ڈی، مانو کولکاتا)، جناب صابر رضا شمسی (مٹیا برج)، شاہد اقبال، راحیل شاداب، محمد جاوید رضا و دیگر حضرات موجود تھے۔ محفل کی صدارت ڈاکٹر امام اعظم نے کی جب کہ پروفیسر مشتاق احمد بحیثیت مہمانِ خصوصی اور ڈاکٹر افتخار احمد بحیثیت مہمانِ اعزازی موجود تھے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے حاضرین سے پروفیسر مشتاق احمد کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کی درجنوں کتابیں منصۂ شہود پر آ کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں نیز ان کے Views ہندوستان کے تمام موقر روزناموں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔'' بعدہٗ جناب صابر رضا شمسی نے پروفیسر موصوف کی شال پوشی کی۔ پروفیسر مشتاق احمد نے کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''جناب مظہر امام ۶۰ر کے بعد کی اردو شاعری کا نمایاں نام ہے۔ انھوں نے اردو غزل میں تجربہ کرتے ہوئے اردو والوں کو آزاد غزل سے متعارف کرایا۔ ساتھ ہی نثر کے میدان میں بھی تنقید و خاکہ نگاری جیسی اصناف پر اہم کتابیں اردو ادب کی نذر کیں۔ ستمبر ۱۹۵۱ء میں وہ کلکتے آئے جہاں وہ کئی روزناموں سے وابستہ ہوئے۔ پھر کلکتہ کے سی ایم او ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے جہاں پرویز شاہدی ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہیں سے انھیں ۱۹۵۸ء میں آکاش وانی کی ملازمت ملی۔ وہ پہلے آکاش وانی پھر دوردرشن سے وابستہ ہوئے اور بحیثیت ڈائریکٹر جہاں جہاں بھی گئے، وہاں اپنی منصبی ذمہ داریوں کے علاوہ اردو زبان و ادب کی ترویج میں بھی مشغول رہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی زیرِ نظر کتاب مظہر امام پر ان کی چوتھی کتاب ہے۔ اس سے قبل ''نصف ملاقات'' (مرحوم مشاہیر کے خطوط مظہر امام کے نام)، ''مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ'' اور ''مظہر امام: شخصیت سیریز'' (برائے اتر پردیش اردو اکاڈمی) شائع ہو چکی ہیں۔ مانو کے ریجنل سینٹر کولکاتا آ کر مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ اچھا لگا کہ ڈاکٹر امام اعظم کی قیادت میں یہ دفتر اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہا ہے۔'' اس کے بعد صابر رضا شمسی، شاہد اقبال، ڈاکٹر افتخار احمد، نصر اللہ نصر، ڈاکٹر امام اعظم اور پروفیسر مشتاق احمد نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروفیسر موصوف کی دو احتجاجی نظموں ''چراغِ دل'' اور ''مریم و سیتا کی نم دیدہ آنکھیں'' کے علاوہ ان کا درج ذیل شعر بھی سامعین نے

بے حد پسند کیا: اب تو گلشن پہ بھی ہوتا ہے قفس کا دھوکا چار سو بیٹھا ہے صیاد کہاں تک جاؤں

اخیر میں شاہد اقبال کے کلماتِ تشکر کے ساتھ محفل برخاست ہوئی۔

....

● (۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء): ہندوستان اور ایران کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی رشتے ہزاروں سال سے قائم ہیں۔ ان رشتوں کو مضبوط و مستحکم کرنے میں اردو اور فارسی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو شاعری کا سرچشمہ فارسی شاعری ہے۔ ایران و ہندوستان کے مابین ہر سطح پر خوشگوار تعلقات کو آگے بڑھانے کے لیے قومی کونسل اور ایران کلچرل ہاؤس نے ان دونوں زبانوں کے فروغ کے لیے کئی اہم معاہدے کیے ہیں۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی کے لیے منعقد کی جانے والی استقبالیہ تقریب کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں ممالک نے اپنے اپنے ملکوں میں اردو اور فارسی زبان وادب کے فروغ وارتقا کے لیے اپنے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے باہمی مفاہمت سے کئی اہم تجاویز اور منصوبوں کو حتمی شکل دی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اس ایم او یو کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی ہزاروں سالہ پرانی تہذیب اور اس کے فلسفے سے ایران کی نئی نسل کو متعارف کرایا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی اور ایرانی تہذیب وثقافت کے درمیان اتنی قربت ومماثلت ہے کہ ان کے مابین فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر علی ربانی اور ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے مشترکہ بیان میں کہا کہ معاہدے کا بنیادی مقصد اردو، فارسی اور باہمی کلچر کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاہدے میں طے ہوئی باتوں کے مطابق قومی کونسل اور اسلامک کلچر اینڈ ریلیشن آرگنائزیشن ان کتابوں کی فہرست ایک دوسرے کو مہیا کرنے کا بندوبست کریں گے جو کتابیں اردو اور فارسی میں ترجمہ کی جاچکی ہیں۔ تاکہ ان کتابوں کی اشاعت کو یقینی بنایا جاسکے جن کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا ہے اور جن کی اشاعت عمل میں نہیں آئی ہے۔ انھوں نے اپنے مشترکہ بیان میں مزید کہا کہ ہم ایک دوسرے کو لوجسٹک سپورٹ فراہم کریں گے تاکہ دونوں ممالک میں ہونے والے ادبی وثقافتی پروگراموں و سمیناروں کے انعقاد میں معاون ثابت ہوں۔ نیز ہم ایسا تعلیمی اور تدریسی مواد تیار کر کے شائع کریں گے جس سے حسب ضرورت استفادہ کیا جاسکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلامک کلچر اینڈ ریلیشن آرگنائزیشن ایران سے منسلک نمائش اور خطاطی کے ماہرین قومی کونسل کو فراہم کرے گی تاکہ قومی کونسل کے ذریعے چلائے جارہے خطاطی سینٹرس کے لیے تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا جاسکے۔ قومی کونسل کے تحت چلنے والے فارسی سینٹرس میں فارسی پڑھانے والے اساتذہ کے لیے اسلامک کلچر اینڈ ریلیشن آرگنائزیشن فارسی کے ماہرین کی مدد سے ریفریشر کورس کا اہتمام کرے گی۔ اس موقعے پر ایران کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی ربانی نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس ملک میں فارسی آٹھ سو سال تک تہذیبی اور ثقافتی زبان رہی ہے۔ درحقیقت فارسی ہندوستان کی میراث ہے اور فارسی سے اردو نے جنم لیا ہے۔ آخر میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے ڈاکٹر علی ربانی کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا اور شکریہ ادا کیا۔ استقبالیہ تقریب میں کونسل کا عملہ موجود تھا۔

....

● (۴ر جنوری ۲۰۲۰ء): آج پروفیسر محمد آفتاب اشرف نے پی جی شعبۂ اردو ایل این متھلا یونیورسٹی کے سربراہ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ اس سے قبل وہ ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ میں صدر شعبۂ اردو تھے۔ واضح ہو کہ پروفیسر موصوف کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور وہ کئی ادبی اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ امید کہ ان کی سربراہی میں شعبہ ہذا مزید ترقی کے منازل طے کرے گا۔

....

● (۱۴ر جنوری ۲۰۲۰ء): غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر کو آج وزارت ثقافت حکومت ایران کی طرف سے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے فروغ کے لئے اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ایران کی وزارتِ ثقافت اور ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ایک پُر وقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں ہندوستان میں ایران کے سفیر ڈاکٹر علی چیگینی، کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر ربانی، ایران کے وزیر ثقافت ڈاکٹر محسن جوادی، بیدل فاؤنڈیشن، تہران کے صدر ڈاکٹر ہادی سعیدی کیساری، انڈیا انٹرنیشنل کے چیئرمین این این ووہرا، جامعہ ہمدرد کے چانسلر سید شاہد مہدی کے علاوہ ایران وہندوستان کے اہم اسکالرز کی موجودگی میں اس ایوارڈ رتقریب کا اہتمام کیا گیا۔ گزشتہ ۵ برسوں سے غالب انسٹی ٹیوٹ نے اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایران کے کئی اہم ادبی وثقافتی اداروں کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ایم او یو پر بھی دستخط کئے ہیں۔ بیدل فاؤنڈیشن آف انڈیا جو ایران کا ایک اہم ادبی ادارہ ہے اُس ادارے کے باہمی اشتراک سے ادھر چند برسوں میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے فارسی کے بزرگ شعرا پر اہم مذاکروں اور جلسوں کا اہتمام کیا جس میں ایران کے علاوہ کئی ممالک کے اساتذہ واسکالرز نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سید رضا حیدر نے پریس ریلیز کے ذریعے بتایا کہ یہ اعزاز صرف اُن کا نہیں بلکہ یہ غالب انسٹی ٹیوٹ اور ادارے سے وابستہ اُن تمام افراد کا ہے جنھوں نے اپنی کوششوں سے اس ادارے کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا ہے۔

....

● (۱۴ر جنوری ۲۰۲۰ء): اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر اور نغمہ نگار **کیفی اعظمی** (اصل نام سید اطہر حسین رضوی، ولادت: ۱۴ر جنوری ۱۹۱۹ء، اعظم گڑھ، یوپی) کی ۱۰۱ ویں سالگرہ کے موقع پر گوگل نے ڈوڈل بنا کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک طرح سے گوگل نے انہیں بہترین تحفہ پیش کیا ہے۔ واضح رہے کہ حال میں ان کی اہلیہ شوکت کیفی کا بھی انتقال ہوا ہے۔ کیفی اعظمی کی شاعری عشق ومحبت پر منحصر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فلمی دنیا میں نغمے لکھے اور اسکرپٹ بھی لکھی تھی۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں پہلی بار شعر لکھے تھے۔ شاعرانہ مزاج رکھنے والے کیفی اعظمی ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی بھارت چھوڑو تحریک سے کافی متاثر ہوئے۔ کیفی اعظمی اور ان کی اہلیہ شوکت اعظمی کے عشق کی داستان بھی کافی مشہور ہے۔ ایک بھری محفل میں انہوں نے کیفی کو بدتمیز کہہ دیا تھا اور پھر دونوں میں محبت ہو گئی اور پھر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دراصل کیفی اعظمی حیدرآباد میں ایک مشاعرہ میں اپنی نظم 'اٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا تجھے' سنا رہے تھے۔ اس نظم کی پہلی سطر 'اٹھ' شوکت اعظمی کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا شاعر ہے، جسے تمیز سے بات تک کرنا نہیں آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا کیفی 'اٹھ' کی جگہ 'اٹھئے' نہیں کہہ سکتے تھے۔

شوکت نے یہ کہہ تو دیا کہ یہ کیسا شاعر ہے جو ادب سے بھی ناواقف ہے لیکن پوری نظم سن کر وہ چپ ہو گئیں اور بعد میں وہ شوکت اعظمی بن گئیں حالانکہ پہلے انہیں 'اٹھ میری جان' کہنے پر اعتراض تھا۔ واضح ہو کہ مشہور اداکارہ شبانہ اعظمی کیفی اعظمی کی بیٹی اور ممتاز نغمہ نگار جاوید اختر داماد ہیں۔ کیفی اعظمی کے نام سے اعظم گڑھ سے دہلی 'کیفیات ایکسپریس' بھی چلتی ہے۔ پھولپور، اعظم گڑھ میں ان ہی کے نام سے کیفی پارک بھی بنا ہوا ہے مگر اس وقت بدحالی کا شکار ہے۔

....

● (۲رفروری ۲۰۲۰ء): معروف ڈینٹل اینڈ فیشیل استھیٹک سرجن ڈاکٹر نوا امام (رہائش: ادبستان، محلہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ-۷، کلینک: ڈینٹل اینڈ کاسمیٹک کیئر، بی ایس کمپلیکس، محلہ رحم خاں، نزد ملت کالج چوک، دربھنگہ) کو اہم طبی خدمات کے لئے آروگیہ گرو پبلک ہیلتھ کی جانب سے آج بہار شریف، نالندہ کی سرزمین پر ''ہیلتھ کیئر ایوارڈ ۲۰۲۰ء'' دیا گیا جو سند، میمنٹو اور شال پر مشتمل تھا۔ تقریب کا افتتاح این سی سی افسر لیفٹیننٹ راکیش رنجن پانڈے، معروف معالج ڈاکٹر کے کے منی (بھاگلپور میڈیکل کالج)، نالندہ کے معروف ادیب ڈاکٹر لکشمی کانت سنگھ، مگہی شاعر اومیش پرساد اومیش، ماہر تعلیم اودے شنکر سونی نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ یہ تقریب میڈیا پارٹنر ''سنگنی لائیو'' کے اشتراک سے منعقد کی گئی تھی۔ ڈاکٹر نوا امام کو ان کے والدین کے علاوہ خویش و اقارب، بھائی بہن کے علاوہ چندر پرکاش (ٹیکنیکل اسسٹنٹ چھمیشور سنگھ، میوزیم دربھنگہ)، سماجی کارکن فواد غزالی اور سلطان علی و دیگر نے اپنی نیک خواہشات پیش کیں اور مبارکباد سے نوازا۔

....

● (۱۰رفروری ۲۰۲۰ء): اردو حلقوں میں یہ خبر باعث مسرت ہے کہ ڈاکٹر عبدالحئی جواب تک قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان، نئی دہلی سے وابستہ تھے آج انہوں نے سی ایم کالج دربھنگہ میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اردو جوائن کیا۔ کالج کے فعال پرنسپل پروفیسر مشتاق احمد نے اس موقع پر کہا کہ ''مجھ جیسے پرنسپل کے لئے سب سے بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک پڑھنے لکھنے والے ٹیچر اس کالج سے منسلک ہوئے ہیں۔ ان کے لئے نیک خواہشات اور مبارکباد۔ اردو کے معروف ناقد پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی) کی آمد کالج کے لئے دوہری خوشی کا سبب ہے۔'' واضح ہو کہ پروفیسر موصوف ایک وائیوا کے سلسلے میں دربھنگہ تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسد ظہیر، ڈاکٹر محمد ضیاء حیدر (صدر، شعبۂ نفسیات، کالج ہٰذا) و دیگر تدریسی و غیر تدریسی ملازمین بھی موجود تھے۔

....

● (۱۵رفروری ۲۰۲۰ء): شہر کے قلب میں واقع لال باغ کے راجندر بھون ٹاؤن ہال میں کو محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کے زیر اہتمام یک روزہ ضلعی سطحی عمل گاہ اور فروغ اردو سمینار و مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ضلع اقلیتی فلاح افسر، اردو زبان سیل، راج بھاشا دربھنگہ جناب رضوان احمد نے کی اور ان کی غیر موجودگی میں پروفیسر شاکر خلیق (سابق صدر، شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) نے کی۔ پروگرام کا افتتاح شمع جلا کر مہمانوں نے کیا۔ اس موقع پر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے جناب رضوان احمد نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی پہچان ہے۔ اس کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ہے۔ اردو صرف زبان نہیں بلکہ ایک

تہذیب ہے۔اس کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ یہ لوگوں کے درمیان رائج رہے۔ سرکاری سطح پر کوشش کی ہی جارہی ہے لیکن جب تک لوگ خود کوشش نہیں کریں گے اپنے گھروں میں اردو کے فروغ کے لئے کوشاں نہیں ہوں گے اور اردو کا درد نہیں رکھیں گے تو سرکاری کوششیں ناکافی ہوں گی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر اظہار احمد (سابق ایم ایل اے) نے کہا کہ ہمیں فروغ اردو کے لئے حالات سازگار خود کرنے ہوں گے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم نے امبیڈکر کو امبیڈکر بنا تو دیا لیکن ان کے پیغام کو گاؤں گاؤں تک نہیں پہنچایا۔انہوں نے اس حوالہ سے کہا کہ امبیڈکر ایسے حلقہ سے الیکشن ہار گئے جو جاگیرداروں کا حلقہ تھا لیکن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔اس طرح انہوں نے کہا کہ اردو والوں نے انقلاب زندہ باد، جے ہند بھی اردو والوں کی ہی دین ہے۔ پروفیسر شاکر خلیق نے کہا کہ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بانے میں راجندر بھون کا حصہ بھی رہا ہے۔اس تاریخی عمارت سے اردو کی بڑی لڑائیاں لڑی گئی ہیں جس میں وہ بھی شامل تھے۔ جناب ابوذر ہاشمی (مدیر ''روحِ ادب'' کولکاتا) نے اپنا مقالہ ''قاضی مجاہدالاسلام قاسمی :شخصیات اور خدمات'' کے حوالہ سے پڑھتے ہوئے کہا کہ ان کا نام ہی مجاہد نہیں تھا شخصیت بھی مجاہدانہ تھی۔ڈاکٹر عصمت جہاں (شعبۂ اردو،ملت کالج ،دربھنگہ) نے کہا کہ اردو کو فروغ دینے میں حکومت پیش پیش ہے۔ڈاکٹر جمشید عالم نے کہا کہ اردو کا ماضی بہت شاندار رہا ہے لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔اردو کے فروغ کے لیے ہر گھر میں اردو اخبارات خریدنے چاہئے۔جدیو لیڈر حافظ ابوشحمہ نے کہا کہ خواتین میں بڑی بیداری آئی ہے اور وہ بھی اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کررہی ہیں۔انہوں نے ریاستی حکومت کی اردو کے فروغ کے لئے کی جارہی کوششوں کی ستائش کی اور اس سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔اس موقع پر خاکسار (ڈاکٹر امام اعظم) نے اپنی گفتگو میں کہا کہ اردو مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی زبان کے ساتھ ساتھ تلفظ کی زبان بھی ہے۔اردو اس وقت مدارس اور غریبوں کے درمیان زندہ ہے۔وقت آگیا ہے کہ اردو کا ماحول گھروں میں پیدا کریں بالکل تبلیغ کی طرح نیز مانو کے ذریعہ دربھنگہ میں بی ایڈ، پالی ٹکنک ،آئی ٹی آئی ، مانو ماڈل اسکول سے اردو میڈیم کے ذریعہ تعلیم وتدریس کا عمدہ ماحول قائم ہوا ہے۔سابق وزیر مملکت جناب محمد علی اشرف فاطمی کے ذریعہ یہاں مانو کا یہ بڑا کام ہوا جس سے یہاں کا اردو داں طبقہ مستفید ہوا۔انھوں نے اردو کے حوالے سے قطعات پیش کیے نیز غزلیں پڑھیں۔ مفتی محمد توحید، ڈاکٹر زیبا پروین (شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج)،ڈاکٹر عقیل صدیقی، احتشام الحق، اقبال حسن، ڈاکٹر کائنات آفتاب، محمد فراز الدین، قاری عثمان وغیرہ نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اس موقع پر نداعارفی، مسرور صغری، حسین منظر، عرفان احمد پیدل، ایم اے صارم، خون چندن پٹوی، زماں برداہوی، منظر صدیقی، منظر ریونڈھوی، انعام الحق بیدار مرتضٰی سنجر، ڈاکٹر نور محمد عاجز وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا اور داد وتحسین وصول کی۔اس موقع پر ضلع کے مختلف بلاکوں کے میٹرک اور انٹر سطح کے ساتھ مدارس کے طلبہ نے تقریری مقابلہ میں بھی حصہ لیا جس میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ۵/طلبہ وطالبات کو انعام سے نوازنے کا اعلان کیا گیا۔ججوں میں ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر عصمت جہاں اور محمد احتشام الحق شامل تھے۔ پروگرام کی نظامت محمد ضیاء اللہ (اردو مترجم، دربھنگہ) نے بحسن وخوبی انجام دی۔ہدیۂ تشکر حافظ ابوشحمہ نے ادا کیا۔اس موقع پر ممتاز عالم ایڈووکیٹ، ڈاکٹر شمس الرحمٰن، ناہید حسن،

افلاک منظر، نسیم احمد، رفعت ملی، محمد شہزادے (اردو مترجم، صدر بلاک) وصی احمد، علم الہدیٰ، مرزا رضا بیگ، محمد خورشید، عرفان احمد، افضل احمد، محمد ظفر، ابوالفرح، تنویر احمد، محمد شعیب، مولانا نجم الدین وغیرہ کے علاوہ مختلف اسکول کالج و مدارس کے طلبہ و طالبات بڑی تعداد میں موجود تھے۔ پروگرام کا آغاز صبح ۱۰ر بجے ہوا جب کہ ۶ر بجے شام اختتام پذیر ہوا۔

....

● (۲۱ر فروری ۲۰۲۰ء): ریجنل سینٹر، مانو، کولکاتا واقع ۱-اے/۱، چھاتو بابو لین محسن ہال، کولکاتا-۱۴ میں آج معروف شاعر اور ادیب جناب ایم نصر اللہ نصر کی تازہ کتاب ''اذکارِ ادب'' کی رونمائی نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ و مدیر ہفت روزہ ''نقیب'' مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کے دست مبارک سے انجام پائی۔ انہوں نے کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے کہا کہ جناب نصر اللہ نصر کی کتاب 'اذکارِ ادب' اردو ادب کے عالمی منظر نامہ کے حوالے سے متنوع ادبی تنقید میں قابل قدر اضافہ ہے۔ ان کے مطالعے میں گہرائی، گیرائی اور اصناف کے اعتبار سے بڑا تنوع ہے نیز اس کتاب میں شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری اور تحقیق و تنقید کا گراں قدر مطالعے کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ۴۸۰ر صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف اصنافِ ادب پر اہم لوگوں کے مطالعے کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ اس کتاب کے اجراء پر مصنف کو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کا ادبی سفر آئندہ بھی جاری و ساری رہے تا کہ اردو ادب کے قارئین کو قابل قدر مطالعہ اور استفادہ کا موقع ملے۔ اس اجرائی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا) نے کہا کہ نصر اللہ نصر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا قلم رواں دواں ہے۔ وہ نصف درجن کتابوں کے خالق ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور تنقید و تحقیق سے بھی خاصا شغف رکھتے ہیں۔ دسمبر ۲۰۱۶ء میں ہوڑہ ہائی اسکول سے بحیثیت استاد سبکدوش ہو کر لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں تنوع ہے نیز بنگال اور بیرونِ بنگال کے شعراء و ادباء پر بھی انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ معروف ناقد پروفیسر کرامت علی کرامت کی اس کتاب کی پشت پر رائے ہے، جس میں وہ کہتے ہیں: ''......نصر اللہ نصر کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے درمیانی بلکہ متوازن رویہ اختیار کیا ہے اور ان کا زیادہ تر جھکاؤ تخلیقی تنقید کی جانب ہے......۔'' اس موقع سے قاضی محمد فلاح الدین (دار القضاء امارت شرعیہ، توپسیا، کولکاتا) اور مولانا محمد اکبر حسین (دار القضاء امارت شرعیہ، توپسیا، کولکاتا) نے بھی اس کتاب پر روشنی ڈالی اور مصنف کو مبارکباد دی۔ ڈاکٹر محمد مظہر قادری (اے آر ڈی، مانو، کولکاتا) نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور 'اذکارِ ادب' کے مصنف نصر اللہ نصر کو مبارکباد دی اور کہا کہ کتاب نہایت جامع اور مضامین مبسوط ہیں۔ صاحبِ کتاب نصر اللہ نصر نے مہمان خصوصی مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور ڈاکٹر امام اعظم کا شکریہ ادا کیا کہ اس مختصر سے وقت میں اس کتاب کی رونمائی ہوئی۔ واضح ہو کہ مفتی موصوف پٹنہ سے گذشتہ شب ایک تقریب مناکحت میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے اور بعد نماز جمعہ ریجنل سینٹر کولکاتا آئے۔ اس رونمائی تقریب میں شاہد اقبال، رحیل شاداب و دیگر عملے بھی موجود تھے۔ اس موقع پر حاضرین نے ایک دوسرے کو بین الاقوامی یومِ مادری زبان کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے اپنی مادری زبان اردو کے تئیں مخلص رہنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش رہنے کا عہد بھی کیا۔

● (۳۰ رمئی ۲۰۲۰ء): ''جہانِ من'' کا شاندار اور منفرد پروگرام بذریعہ زوم آج شام سوا سات بجے سے ساڑھے دس بجے تک چلا اور کامیابی سے ہم کنار رہا۔ جہانِ من ایک یوٹیوب چینل ہے جس کا کچھ عرصے قبل قیام عمل میں آیا تھا۔ اس چینل کے تحت رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے دوران ایک آن لائن حمد/نعت خوانی (Devotional Song) مقابلہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں دنیا بھر سے (بالخصوص ہندوستان/متحدہ عرب امارات/سعودی عرب) کے ستر سے زیادہ شرکاء نے شرکت کی۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی (سابق استاذ، شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، بہار)، ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا ریجنل سینٹر اور مدیر، اردو ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ، بہار) اور انجینئر ایچ اے جیلانی صاحبان نے فرائضِ منصفی ادا کرتے ہوئے پہلے دور کے بعد کل پندرہ شرکاء کو فائنل راؤنڈ کے لئے منتخب کیا۔ فائنل راؤنڈ کا انعقاد ۳۰ رمئی ۲۰۲۰ء کو ہندستانی معیاری وقت کے مطابق شام ۷ ربجے ہوا جس میں ان پندرہ فائنلسٹ نے اپنی مترنم آواز اور دلکش انداز کے ذریعہ ناظرین کا دل جیت لیا۔ منصفین نے احتیاط و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہوئے شاہین اسلام (سہسرام، ہندوستان)، حفصہ شہلال (شارجہ)، امینہ شیخ (شارجہ) کو فاتح قرار دیا جب کہ تین شرکاء معراج فاطمہ (بنگلور)، رمشا مجیب (نئی دہلی) اور محمد فیض (رامپور، یوپی) کو اسپیشل جیوری چوائس ایوارڈ دیا گیا۔ فائنل راؤنڈ میں بطورِ مہمانِ خصوصی مسٹر احمد علی (سعودی عرب)، جناب تنویر جمال عثمانی، جناب ریاض ملک، مسٹر شہاب اور جناب انتخاب وغیرہ شریک تھے۔ اس پروگرام کی میزبان اور انتظام کار ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ (جہانِ من یوٹیوب چینل کی روحِ رواں) تھیں جو عرصہ سے اپنی متنوع تحریکات کے ذریعہ نوجوان نسل کو متحرک کرنے اور کیریئر گائیڈنس جیسے پروگرام انجام دیتی آرہی ہیں۔ اس پروگرام کی سرپرستی ایس اے ای ٹی، نئی دہلی نے کی تھی جب کہ اسے ڈی پی ایم آئی، دربھنگہ کی تائید حاصل تھی۔ پروگرام کے خاتمے پر فاتحین شرکاء اور منصفین و مہمانان حضرات کو اسناد سے بھی نوازا گیا اور ان حضرات نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے اور تقریباً ساڑھے دس بجے شب پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ ''جہانِ من'' کے اس مقابلہ جاتی کامیاب پروگرام کے انعقاد پر ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ صاحبہ و دیگر افراد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

....

● (۷ جولائی ۲۰۲۰ء): معروف ناقد، شاعر، افسانہ نگار و صحافی پروفیسر مشتاق احمد (پرنسپل، سی ایم کالج، دربھنگہ و مدیر اعزازی، ادبی جریدہ ''جہانِ اردو'' دربھنگہ) کو ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا ریجنل سینٹر و مدیر اعزازی، ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ) نے آج ایک نجی ملاقات کے دوران کتاب ''چٹھی آئی ہے'' پیش کی۔ واضح رہے کہ مذکورہ کتاب ڈاکٹر امام اعظم کے نام ۴۳۴ رمشاہیر کے ۹۱۷ رخطوط کا مجموعہ ہے جسے نوجوان ادیب و شاعر شاہد اقبال (کولکاتا) نے ترتیب دیا ہے۔ پروفیسر مشتاق احمد نے کتاب ملنے پر ڈاکٹر امام اعظم اور مرتبِ کتاب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دیگر اصناف کے ساتھ خطوط نویسی نے بھی مختلف زبانوں کے ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور ایسا ہی اردو کے ساتھ بھی ہوا۔ اکابرین ادب سے لے کر ڈاکٹر امام اعظم تک خطوط کے ذریعے اس عہد کے ادب کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کا ادبی سفر تین دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط

ہے۔وہ علمی وادبی حلقوں میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔اس کتاب میں شامل خطوط یہ واضح کرتے ہیں کہ موصوف ایک منظم ذہن کے مالک ہیں۔مجموعے کے بیشتر خطوط سے امام اعظم کے علمی وادبی کاموں سے آشنائی ہوتی ہے اور ان کی تخلیقی سمت ورفتار کا بھی علم ہوتا ہے۔مرتب کتاب شاہد اقبال نے اپنے مقدمے میں نہ صرف اردو میں مکتوب نگاری کی روایت پر روشنی ڈالی ہے بلکہ امام اعظم کے نام لکھے گئے ان مکاتیب کا بھی سلیقے سے تنقیدی جائزہ لیا ہے جس سے ان کی تحریری صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی گفتگو میں کہا کہ یہ خطوط چالیس برس کے عرصے پر محیط ہیں۔ادب میں مکاتیب کی اہمیت کے پیش نظر میں نے ان خطوط کو سنبھال کر رکھا تھا۔یہ میرے لیے بھی مقامِ مسرت ہے کہ ان میں سے بیشتر خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں جب کہ کم وبیش اسی تعداد میں مکاتیب کمپوزشدہ میرے پاس موجود ہیں۔مجھے اس بات کی بھی خوشی میرے ہمدمِ دیرینہ پروفیسر مشتاق احمد نے اس کتاب پر ایک مبسوط تبصرہ اپنے رسالہ ''جہانِ اردو'' (شمارہ اپریل تا جون ۲۰۲۰ء) میں شامل کیا۔امید قوی ہے کہ یہ کتاب بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز کے اردو ادب کی سمت ورفتار کی عکاسی میں معاون ثابت ہوگی۔

....

● (۷/جولائی ۲۰۲۰ء): جناب امتیاز احمد کریمی (سابق ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ وجوائنٹ سکریٹری، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، بہار) کے نام اور کام سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔انہوں نے دوسرے عہدہ داروں کے مقابلے میں اردو کے ڈائرکٹر بن کر اردو کی ترویج واشاعت کے لئے جذباتی طور پر کام کیا ہے جس میں ربط موجود ہے۔انہوں نے اردو سے محبت کے لئے ذہنی پیش قدمی کی اور ضلعی طور پر مسلسل پروگرام کرکے اس زبان کو پھیلانے اور مقبول بنانے میں ہمہ وقت مصروف رہے۔موصوف کی شخصیت ایسی ہے کہ زندگی کے معمہ کو سمجھانے کی توانائی ان میں ہے۔ان کے کام کی یہ وارفتگی ہی ہے کہ وہ بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوکر ایک بڑے ادارہ سے وابستہ ہوگئے ہیں۔بہار اردو اکیڈمی اور اردو مشاورتی بورڈ کے تعطل کے بعد اردو ڈائرکٹوریٹ واحد ادارہ ہے جہاں سے امتیاز احمد کریمی نے اردو کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ان کے جانے کے بعد نعم البدل ملنا مشکل نظر آرہا ہے۔دور دور تک کشادگی اور وسعت بھری شخصیت نظر نہیں آرہی ہے۔ان کے جانے سے اردو کا نقصان یقینی طور پر ہوگا، لیکن جس ادارہ سے ان کی وابستگی ہوئی ہے وہاں ان کا وسیع تر انداز نظر کی تصویر کشی ہوگی اس کا یقین ہے۔

....

● (۷/جولائی ۲۰۲۰ء): بہار اسکول بورڈ امتحانات ۲۰۲۰ء کے نتائج جاری کیے گئے ہیں جس کے مطابق اقراء اکیڈمی، دربھنگہ کے تمام طلبا نے صد فیصد کامیابی حاصل کی ہے۔کیف احمد خان 95.4 فیصد کے ساتھ اسکول کے ٹاپر رہے۔ وہیں آمنہ شاہین 92 فیصد کے ساتھ دوسرے مقام اور وردا ہاشمی نے 89.6 فیصد کے ساتھ تیسرا مقام حاصل کیا۔ کیف احمد نے ریاضی میں 100 فیصد، سائنس، انگریزی اور سوشل سائنس میں 95 فیصد اور اردو میں 92 فیصد نمبر حاصل کیے۔وہیں آمنہ شاہین نے ریاضی میں 99، سوشل سائنس میں 95 اور اردو میں 92 فیصد نمبرات حاصل کئے۔رافع مجتبیٰ خلیل نے ریاضی میں 95، اردو میں 91 اور انگریزی میں 90 فیصد نمبرات حاصل کئے۔وردا ہاشمی نے سوشل سائنس میں 95، اردو میں 92 اور انگریزی میں 91 فیصد نمبرات حاصل کئے۔اسی کے ساتھ طارق وفا

نے 87.6 فیصد، آخر ہاشمی نے 86.4، عظمیٰ خالد نے 86.2، سوہا نواز نے 85.4، رافع مجتبیٰ خلیل نے 85.2، شاہ زیب ضیاء نے 85 فیصد، محمد ہاشم صدیقی نے 82.6 فیصد، محمد شاغل سبحانی نے 82.2 اور صابرین ناز نے 81.4 فیصد نمبرات حاصل کرکے اپنے ساتھ اسکول اور والدین کا نام روشن کیا ہے۔ اسکول کی پرنسپل رضیہ سلطانہ نے بچوں کو مبارکباد دی ہے اور اسکول کے ڈائرکٹر انجینئر محمد خورشید عالم نے بچوں کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کے روشن مستقبل کی دعائیں کی ہیں۔ واضح ہو کہ اقراء اکیڈمی لگاتار بورڈ امتحانات میں اپنا پرچم لہرا رہا ہے۔

....

● (۵/اگست ۲۰۲۰ء): ڈاکٹر رباب امام (بنت جناب شہیر امام ساؤتھ افریقہ اور شبنم نسرین مرحومہ، خاوند جناب سیف الاسلام، لندن اور نبیرۂ جناب مظہر امام اور جناب منظر شہاب مرحومین) ریسرچ اسکالر ڈیپارٹمنٹ آف سوشل ورک جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ''پوسٹ مائیگریشن لیونگ ڈیفی کلٹیز اینڈ کاپینگ اسٹریٹیجز آف ریفیوجی یوتھس ان انڈیا'' (نقل مکانی کے بعد اقامت میں مشکلات اور بھارت میں نوجوان مہاجروں سے نپٹارے کی حکمت عملی) زیر نگرانی پروفیسر ارچنا دسی، یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ آف سوشل ورک ۳۰/مئی ۲۰۱۹ء کو یونیورسٹی ہذا میں جمع کیا تھا۔ کورونا وائرس کے سبب یونیورسٹی نے آن لائن وائیوا کا اہتمام کیا تھا۔ اسکالر محترمہ رباب انگلینڈ میں تھیں اور انٹرنیشنل فلائٹس بند تھی۔ آن لائن وائیوا ۲۰/جون ۲۰۲۰ء کو ہوا۔ اسکالر نے ممتحن کے تمام سوالات کا بحسن و خوبی جواب دیا۔ ڈیپارٹمنٹ کے تمام اساتذہ، سربراہ، نگراں اور ممتحن اسکالر سے مطمئن ہوئے اور ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی اور ان حضرات نے اسکالر رباب امام کو مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کیں۔ رباب امام کا رول نمبر SW3PhD13 اور اندراج نمبر 86571 ہے۔ پی ایچ ڈی کا نوٹیفکیشن ۹/جولائی ۲۰۲۰ء کو جاری ہوا۔

....

● (۷/اگست ۲۰۲۰ء): نوجوان ادیب و شاعر شاہد اقبال نے آج مانو ریجنل سینٹر کولکاتا میں تشریف لائے معروف ادیب، محقق و مدرس جناب اشرف احمد جعفری (سکریٹری ''بزمِ نثار'' کولکاتا) اور معروف قلم کار جناب سیّد محفوظ عالم (مہمان لیکچرار، شعبۂ اردو، کریم سٹی انٹر کالج، جمشید پور، جھارکھنڈ حال مقیم کولکاتا) کو اپنی مرتبہ کتاب ''چٹھی آئی ہے!'' (ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر کے خطوط) پیش کی۔ اس موقع پر معروف ادیب، شاعر و صحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا ریجنل سینٹر) بھی موجود تھے۔ جناب اشرف احمد جعفری نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ''شہر کولکاتا میں اکیسویں صدی میں منظرِ عام پر آنے والے قلم کاروں میں ایک اہم نام شاہد اقبال کا ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر امام اعظم کے نام لکھے گئے مشاہیر کے خطوط کو ترتیب دے کر ایک ادبی وراثت کو محفوظ کر دیا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ساتھ ہی مبارک باد کے مستحق ہیں ڈاکٹر امام اعظم جنھوں نے کم و بیش چالیس برس پرانے خطوط کو بھی حفاظت سے رکھا اور اس کتاب میں شامل کروایا۔ نئی نسل کو چاہیے کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے۔ ایسی کتابوں کی خریداری ہونی چاہیے۔'' جناب محفوظ عالم نے بھی ڈاکٹر امام اعظم اور شاہد اقبال دونوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''خطوط نگاری اب قصۂ پارینہ بنتی جا رہی ہے۔ خصوصاً اکیسویں صدی میں برقی ایجادات نے اس فن کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ ایسے میں ادبی خطوط کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر امام اعظم کے

نام لکھے گئے ۴۳۸ رمکتوب نگاروں کے ۷۱ ۹ رخطوط کو شاہد اقبال نے یکجا کر کے کتابی شکل دے دی۔ اس کتاب سے یقیناً مکاتیبی ادب پر کام کرنے والوں کو مدد ملے گی۔'' ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی بات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے نام لکھے گئے یہ خطوط ماضی اور حال کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں جہاں بیسویں صدی کے اختتام میں اردو زبان وادب کی گہما گہمی کا عکس ملتا ہے وہیں اکیسویں صدی کے آغاز میں اب تک ہونے والی ادبی سرگرمیوں کی ہلچل بھی موجود ہے۔ امید قوی ہے کہ یہ کتاب اردو کے مکاتیبی ادب میں اپنی جگہ بنائے گی۔'' مرتبِ کتاب شاہد اقبال نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''اس کتاب میں شامل مکاتیب کی ادبی اہمیت نے مجھے انھیں یکجا کرتے ہوئے کتابی شکل دینے کی ترغیب دی۔ کتاب کی ترتیب کے دوران مجھے ڈاکٹر امام اعظم کی رہنمائی ملتی رہی جس سے یہ کام کافی آسان ہو گیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب قارئینِ اردو ادب کو پسند آئے گی۔''

....

● (یکم ستمبر ۲۰۲۰ء): بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک آسمان ادب پر جن اکابرین ادب نے اپنے فکر و نظر کی روشنی بکھیری ان میں پروفیسر لطف الرحمٰن جیسی عبقری شخصیت شامل ہیں۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے شاعری، تنقید، تحقیق اور صحافت کو ایک نئے جہان سے آشنا کیا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے نامور دانشور، ناقد پروفیسر قدوس جاوید نے کیا۔ پروفیسر قدوس ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے زیر اہتمام منعقد دو روزہ قومی ویبینار بعنوان ''لطف الرحمٰن: شخصیت اور کارنامے'' کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ پروفیسر جاوید نے کہا کہ ساٹھ کی دہائی میں ترقی پسندیت اور جدیدیت کے استحکام کے لئے جدو جہد کر رہا تھا تو دوسری طرف ترقی پسندی کے حامیوں نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ ایسے کشمکش کے دور میں اردو کے جن چند ناقدوں نے ترقی پسندیدیت کی اہمیت کا اقرار کرتے ہوئے جدیدیت کی روح کو واضح کرنے کی کوشش کی ان میں لطف الرحمان نمایاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی کتاب ''جدیدیت کی جمالیات'' جدیدیت کے رجحان پر مکالمہ قائم کیا اور دنیائے ادب کو اس کے مضر اثرات سے بھی آگاہ کیا۔ دراصل لطف الرحمٰن وجودیت کی آنکھ سے جدیدیت کو دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر جاوید نے کہا کہ لطف الرحمٰن ایک تخلیقی فنکار تھے انہوں نے افسانہ لکھا، شاعری کی۔ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اس لئے ان کی تنقید میں تخلیقیت کی اہمیت کا اعتراف ملتا ہے۔ تحقیق میں بھی ان کی عالمانہ اور دانشورانہ بصیرت اور بصارت کی آئینہ داری ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ لطف الرحمٰن کی شخصیت پرت در پرت ایک نئے باب کی متقاضی ہے۔ انہوں نے اس ویبینار کو لطف الرحمٰن کے تئیں علمی خراج عقیدت قرار دیا اور شعبۂ اردو کی اس کوشش کو تاریخی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ جلسہ کے مہمان خصوصی پروفیسر رئیس انور صاحب نے ان کے شخصی اوصاف پر روشنی ڈالی اور یہ اعتراف کیا کہ وہ وسیع المطالعہ شخص تھے اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہوں نے جدیدیت کے حوالے سے ان کی فکر و نظر کو مشعل راہ قرار دیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر اسلم آزاد نے کہا کہ لطف الرحمٰن کی ہمہ جہت شخصیت کا زمانہ قائل ہے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے لے کر آخری سانس تک زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ ایک وقفہ کے لئے سیاست میں گئے

لیکن وہاں بھی اپنی دانشورانہ حیثیت کا لوہا منوایا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دبستان عظیم آباد کی علمی وادبی اور ثقافتی شناخت کو استحکام بخشا۔ شاعری کے میدان میں آئے تو نئے لب و لہجے کی شاعری کی اور تنقید میں جدیدیت کی جمالیات کی بدولت پوری اردو دنیا میں مرکز نگاہ بن گئے۔ واضح ہو کہ لطف الرحمٰن کا تعلق دربھنگہ سے رہا ہے اور ان کی فکر و نظر پر یہ پہلا قومی مذاکرہ تھا لہٰذا صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد آفتاب اشرف نے متھلانچل بالخصوص دربھنگہ کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالی اور اس و۔بینار کی غیر معمولی اہمیت کا جواز بھی پیش کیا۔ انہوں نے اپنے استقبالیہ خطب میں ہی شعبۂ اردو ایل این متھلا یونیورسیٹی کی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی ڈالی اور شعبہ کی عملی خدمات کو بھی اجاگر کیا جبکہ افتتاحی اجلاس کے تمام شرکاء کا شکریہ شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر محمد افتخار احمد نے کیا اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد عملی اجلاس کا آغاز ہوا، اجلاس اول کے صدر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (دہلی)، پروفیسر محمد علی جوہر اور پروفیسر حامد علی خاں مظفر پور تھے، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالرافع، ملت کالج نے دربھنگہ نے انجام دیا۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر مانو کولکاتا)، ڈاکٹر ابوبکر رضوی، ڈاکٹر ریاض احمد جموں کشمیر، ڈاکٹر چشمہ فاروقی، ڈاکٹر صالحہ صدیقی الہ آباد، ڈاکٹر احسان عالم دربھنگہ نے لطف الرحمٰن کے افکار ونظر پر اپنے مقالات پیش کئے۔ علمی اجلاس کے صدر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے تمام مقالہ نگاروں کے مقالات پر تبصرہ کیا اور فرمایا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن اردو زبان وادب کی تاریخ میں جدیدیت کے حوالے سے ہمیشہ حوالہ جاتی نقاد کے طور پر یاد رہیں گے۔ انہوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا بھی اعتراف کیا لیکن بنیادی طور پر لطف الرحمٰن کو ایک خلاق ذہن اور تعمیری فکر و نظر کا نقاد قرار دیا۔ اجلاسِ دوم کے مجلس صدارت میں پروفیسر انیس صدری اور کوثر مظہری شامل تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد ارشد حسین سلفی نے انجام دی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی جموں کشمیر، ڈاکٹر دبیر احمد کلکتہ، جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر عبدالرافع دربھنگہ نے کیا۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر انیس صدری نے پروفیسر لطف الرحمٰن کو ایک وسیع المطالعہ اور کشادہ ذہن نقاد قرار دیا۔ غیر عملی اجلاس مورخہ ۳۰ راگست کو پروفیسر مظہر مہدی (دہلی) اور ڈاکٹر مشتاق احمد دربھنگہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مقالہ نگاران میں پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی چھپرا، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم بتیا، ڈاکٹر محمد کاظم دہلی، ڈاکٹر مشرف علی بنارس، ڈاکٹر ابرار اجراوی مدھوبنی اور ڈاکٹر عبدالسمیع بنارس نے اپنے مقالات پیش کئے۔ پروفیسر ارشد ہاشمی نے لطف الرحمٰن اور جدیدیت کی تحریک پر بھرپور روشنی ڈالی اور ڈاکٹر نسیم نے لطف الرحمٰن کے شعری مجموعہ ''صنم آشنا'' کو اپنا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر محمد کاظم نے لطف الرحمٰن کی تنقیدی بصیرت و بصارت پر بھرپور روشنی ڈالی اور ان کے نظریۂ فنِ ڈراما کی وضاحت کی۔ ڈاکٹر مشرف عالم، ڈاکٹر اجراوی اور ڈاکٹر عبدالسمیع نے ان کی شاعری اور تنقید کے حوالے سے گفتگو کی۔ صدور جلسہ ڈاکٹر مشتاق احمد نے کہا کہ یہ دو روزہ و۔بینار اردو ادب میں لطف الرحمٰن شناسی کی خشت اول ہے۔ اان کی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بین العلومی مطالعہ کی بنیاد پر اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پروفیسر مظہر مہدی نے کہا کہ لطف الرحمٰن کے تعلق سے یہ و۔بینار ان کی شخصیت اور ان کے افکار ونظریات کے افہام وتفہیم کا مسئلہ حل کرے گا۔

انہوں نے اجلاس کے تمام مقالہ نگاروں کو مبارک باد دی کہ سبھوں نے اپنے موضوع کا حق ادا کیا۔ چوتھا اور آخری عملی اجلاس کی صدارت پروفیسر منظر حسین رانچی اور ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ دربھنگہ نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر وصی احمد شمشاد نے انجام دیا تھا اور اظہار تشکر ڈاکٹر عبدالرافع نے پیش کیا تھا۔ اس اجلاس میں پروفیسر احتشام الدین کا مقالہ ان معنوں میں منفرد تھا کہ انہوں نے پروفیسر لطف الرحمٰن کے افسانوں میں موجود اس تھیوری کو بہ حسن و خوبی اجاگر کیا جسے سن کر لوگ آنکھ کان بند کر لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرافع، ڈاکٹر کامران غنی صبا، ڈاکٹر احمد علی، محترمہ زیبا پروین، صادق اقبال، عبداللہ صوفی، ڈاکٹر ریحان احمد قادری، ڈاکٹر محمد رضوان، ڈاکٹر رحمت اللہ افضل نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اور بھی مقالہ نگاروں نے پروفیسر لطف الرحمٰن کی ہمہ جہت شخصیت کو موضوع بنایا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ اور منظر حسین نے اس عملی اجلاس کے تمام پرچوں پر اپنی رائے قائم کی۔

....

● (۸رستمبر ۲۰۲۰ء): ''مکاتیب نہ صرف دو لوگوں کے ذاتی خیالات کی ترسیل کا ذریعہ ہوتے ہیں بلکہ اپنے عہد کا تہذیبی و ثقافتی ورثہ کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں حالاں کہ خط لکھنے کا چلن تقریباً ختم ہو گیا ہے مگر بیسویں صدی کے آخر تک اس کا رواج عام تھا جب موبائل کا دور نہیں تھا اور ٹیلی فون سے کال کرنا بھی کافی مہنگا تھا۔ اردو کے رسالوں میں خطوط کے کالم خاص طور پر شامل رہتے تھے جن سے قاری کی رائے کا اندازہ ہوتا تھا۔ قلمی دوستی کا سلسلہ بھی اس زمانے میں عام تھا۔ میری نظر میں جو کتاب ''چٹھی آئی ہے!'' اس وقت موجود ہے، یہ دربھنگہ سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر، ادیب وصحافی کے نام لکھے گئے مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے جواں سال ادیب وشاعر شاہد اقبال (کولکاتا) نے ترتیب دیا ہے۔ کتاب میں مرتب کا طویل مقدمہ بھی شامل ہے جس سے مکتوب نگاری کی روایت اور تاریخ کا مختصر تعارف ملتا ہے وہیں کتاب میں شامل اہم خطوط کا جائزہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں شامل خطوط تقریباً چالیس برس کے دوران لکھے گئے ہیں جن سے اس دور کی علمی، ادبی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا علم بھی قاری کو ہوتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار مشہور جدیو رہنما جناب محمد علی اشرف فاطمی (سابق وزیر مملکت، حکومت ہند) نے آج اپنی رہائش گاہ واقعہ خواجہ سرائے، لہریا سرائے، دربھنگہ میں کیا جب ڈاکٹر امام اعظم نے مذکورہ کتاب موصوف کی خدمت میں پیش کی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ''جناب محمد علی اشرف فاطمی یوں تو عوامی رہنما ہیں اور عام آدمی کے مسائل پر نہ صرف ان کی نظر رہتی ہے بلکہ ان کے حل کے لیے بھی وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن اردو زبان وادب کے فروغ میں وہ خصوصاً سرگرم رہتے ہیں جس کا بین ثبوت دربھنگہ میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل سینٹر، ماڈل اسکول، پالی ٹیکنک، آئی ٹی آئی اور سی ٹی ای جیسے تعلیمی اداروں کا قیام ہے۔ دراصل انھیں اردو داں طبقہ کی ضرورتوں کا بھرپور احساس اپنے سیاسی کیریئر کے ابتدائی دنوں سے ہے اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔''

....

● (۲۵رستمبر ۲۰۲۰ء): معروف ادیب، شاعر، صحافی اور سی ایم کالج کے حرکی پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد کو معزز چانسلر اور گورنر بہار نے ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کا رجسٹرار نامزد کیا ہے۔ گورنر کے ایڈیشنل سکریٹری شری رام انوگرہ نرائن سنگھ کے جاری کردہ اعلامیہ مورخہ ۲۴رستمبر ۲۰۲۰ء کے مطابق ڈاکٹر مشتاق احمد نے رجسٹرار کا عہدہ سنبھالا۔

یونیورسٹی ہذا کے وائس چانسلر پروفیسر سریندر پرتاپ سنگھ نے رجسٹرار مشتاق احمد صاحب کو گل پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف ٹیچر کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں۔انہوں نے بھی اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔واضح ہو کہ ڈاکٹر موصوف درجنوں کتابوں کے مصنف ،مولف اور مرتب ہیں نیز مارچ ۲۰۰۱ء سے ان کی ادارت میں اردو رسالہ ''جہانِ اردو'' دربھنگہ سے با قاعدگی سے شائع ہورہا ہے۔مشتاق احمد صاحب ہفتہ وار کالم بھی لکھتے ہیں جو اردو کے کئی موقر روزناموں میں شایع ہوتے ہیں۔وہ شہر کے کئی کالجوں ملت کالج ،مارواڑی کالج اور ایم ایل ایس ایم کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔وہ جن جن کالجوں میں رہے وہاں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔امید ہے کہ وہ رجسٹرار جیسے اہم عہدہ کو بھی اپنے کاموں سے انفرادیت بخشیں گے۔

....

● (۴؍اکتوبر ۲۰۲۰ء): معروف ادیب ،صحافی اور شاعر ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی مرتبہ کتاب ''پہلی جنگِ آزادی میں اردو زبان کا کردار'' ڈاکٹر نورا سلام (اسسٹنٹ سکریٹری، بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ) کو ان کی رہائش گاہ ''حق انکلیو'' آشیانہ روڈ، راجہ بازار، پٹنہ میں آج پیش کی۔کتاب کے اجمالی جائزہ کے بعد ڈاکٹر نورا سلام نے کتاب کی پیش کش پر ڈاکٹر امام اعظم کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اپنے عنوان ''پہلی جنگِ آزادی میں اردو زبان کا کردار'' کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت منفرد ہے اور یک موضوعی ہوتے ہوئے بھی متنوع مضامین کا مجموعہ ہے۔کتاب کے بیشتر مضامین میں جہاں پہلی جنگِ آزادی کے اسباب، حالات اور نتائج کا تاریخی حوالوں اور دلائل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے وہیں اردو ادب کے تاریخی ورثے کا بھی قاری کو مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا۔ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے مقدمہ کے ذریعہ اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔میں موصوف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر امام اعظم نے چند توصیفی کلمات کے ساتھ ڈاکٹر نورا سلام کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ ہیں۔معروف ادیب ہیں۔قاضی عبدالودود پر تحقیقی مقالہ قلم بند کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ان کے مذکورہ کلمات میری اس کتاب کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔'' اس موقع پر معروف ادیب ڈاکٹر ایم صلاح الدین (صدر، الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ گنگوارہ دربھنگہ مقیم رام نگر دھونسی) بھی موجود تھے۔

....

● (۱۰؍اکتوبر ۲۰۲۰ء): یہ اطلاع یقیناً مسرت بخش ہے کہ اردو، ہندی، انگیکا اور انگریزی کے معروف ومقبول اور بسیار نویس قلمکار پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کو ایک اور ایوارڈ کی بشارت DIAM یونیورسٹی Kohima کے چانسلر کی طرف سے ملی ہے کہ بین الاقوامی ایوارڈ کے لیے اس یونیورسٹی نے پروفیسر ہرگانوی کے نام کا انتخاب کیا ہے۔ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی ایل سنچو نے خط کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ ڈاکٹر ہرگانوی کا م اتنا متنوع اور پھیلا ہوا ہے کہ تن تنہا انہوں نے کیسے کرلیا ہے جو حیرت انگیز اور یادگار ہے۔اپنی ادبی تحریر سے انہوں نے تاریخ رقم کی ہے جس کا اعتراف DIAM یونیورسٹی کو ہیما کرے گی۔قارئین کو علم ہوگا کہ ابھی پچھلے مہینہ کورونا وائرس پر پروفیسر ہرگانوی کی کتابوں کے پیش نظر فرینڈ شپ فورم دہلی نے انہیں بیک وقت چھ اعزازات سے نوازا تھا۔ابھی صفی الرحمٰن راعین کی انگریزی کتاب مناظر صاحب پر آئی ہے جس میں ان کے فن پر کئی زاویوں سے روشنی پڑتی ہے۔

مناظر صاحب کی کتابوں کی تعداد ۲۵۸ ہو چکی ہے اور ان پر ۵۹ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

....

● (۲۷/اکتوبر ۲۰۲۰ء): معروف ادیب، شاعر اور صحافی ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی (استاد، شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا) آج اپنے دو احباب معتبر شاعر و ادیب جناب جاوید ہمایوں (ڈبلیو بی سی ایس) اور معروف شاعر جناب مبارک علی مبارکی (سابق ہیڈ ماسٹر، کھڑگپور اردو ہائی اسکول) کے ساتھ کو مانو ریجنل سینٹر کولکاتا تشریف لائے۔ اس موقع پر موصوف نے معروف شاعر، ادیب و صحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو ریجنل سینٹر) کی خدمت میں اپنی رباعیوں کا دیوان ''باغِ صنوبر'' بھی پیش کیا۔ ڈاکٹر امام اعظم نے کتاب کے سرسری جائزہ کے بعد اپنی گفتگو میں کہا کہ غزلوں کے دیوان عموماً آتے رہے ہیں تاہم رباعیوں کے دیوان اردو ادب کی تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں۔ یوں بھی رباعی دیگر اصنافِ سخن سے ہٹ کر ایک ایسی صنفِ شاعری ہے جس پر ہر شاعر طبع آزمائی نہیں کرتا لیکن ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی برسوں سے مختلف موضوعات پر رباعی کہتے آرہے ہیں۔ ان کی شخصی رباعیاں اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی رباعی گوئی انہیں ورثے میں ملی ہے اور ان کے والد بزرگوار علقمہ شبلی مرحوم کی رباعیوں کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اب ان کی رباعیوں کا دیوان ''باغِ صنوبر'' کی صورت میں ہم دست ہے جو ان کی مشاقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اردو کے استاد ہونے کے علاوہ عاصم صاحب شاعر، تنقید نگار، ادبی صحافی اور ایک کامیاب نقیب کی حیثیت سے اردو حلقوں میں مشہور ہیں۔ ان کی ادارت میں ادبی رسالہ ''اثبات و نفی'' جاری ہوا تھا۔ امید کرتا ہوں کہ ان کا ادبی سفر یوں ہی جاری و ساری رہے گا۔ شاہد اقبال نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

....

● (۳۱/اکتوبر ۲۰۲۰ء): معروف شاعر، ادیب، نقیب اور ہوڑہ ہائی ہائر سکنڈری اسکول کے سینئر استاد جناب خواجہ احمد حسین آج اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ اساتذہ اور اسکول انتظامیہ نے ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت ہیڈ ماسٹر آفتاب عالم نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب قیصر شمیم، حبیب ہاشمی، بلال حسن، قمر الدین ملک، وسیم الحق (آسنسول)، خالد عباد اللہ، شکیل انصاری، مختار علی، ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، پروفیسر عمر غزالی، احمد علی وارثی، محمد عبد اللہ اور نثار احمد وغیرہ نے خواجہ احمد حسین کی خدمات اور اخلاص کو قابلِ تحسین کیا ہے۔ اس تقریب کی نظامت اسکول ہذا کے استاد محمد علی طارق کر رہے تھے جبکہ سامعین میں ہوڑہ و کولکاتا کے مختلف اسکولوں کے اساتذہ، شعراء ادباء اور اسکول انتظامیہ کے لوگ شامل تھے۔ اسکول کے ماسٹر خورشید انور، سرور عزیز اور انتظامیہ کے دیگر افراد نے اس تقریب کو کامیاب بنایا۔ وہ کانگریس پارٹی سے وابستہ ہیں اور پارٹی کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

....

● (۱۱/نومبر ۲۰۲۰ء): رانچی یونیورسٹی مولانا آزاد ریسرچ سنٹر میں ''یوم تعلیم'' کے موقع پر مولانا آزاد کے افکار کی معنویت اکیسویں صدی میں''ایک بین الاقوامی و۔بینار کا انعقاد آج کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر منظر حسین (صدر، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی) نے کی جب کہ افتتاح مہمانِ خصوصی اور رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رمیش کمار پانڈے نے کیا۔ انھوں نے اکیسویں صدی میں مولانا آزاد کی معنویت پر تفصیلی روشنی ڈالی اور مولانا آزاد کو ہندو

مسلم اتحاد کا پیغامبر کہتے ہوئے ان کی عظمت، مقام و مرتبہ پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر دبیر احمد (صدر، پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج) نے اپنے کلیدی خطبہ میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے حوالے سے مولانا آزاد کی قربانیوں اور ان کی خدمات کا جائزہ پیش کیا اور ان کی قائدانہ شخصیت کے ہر پہلو کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتے ہوئے انہیں عظیم قائد قرار دیا۔ اس سے پہلے شعبہ اردو کی طالبہ ماہ پارہ امین نے مولانا آزاد کی ایک نعت پاک اپنی مترنم آواز میں پیش کی جو بہت پسند کی گئی۔ ڈاکٹر زین رامش استاذ شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی نے اکیسویں صدی میں مولانا آزاد کے افکار کی معنویت کے حوالے سے بہت ہی بصیرت افروز گفتگو کی۔ ان کے تعلیمی افکار و نظریات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ رانچی یونیورسٹی کے سابق استاذ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سرور ساجد نے مولانا آزاد کی تصنیف ''جامع الشواہد'' کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا۔ انہوں نے اس کتاب کی روشنی میں مولانا آزاد کو ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور اسلام کی وسیع المشربی، مذہبی رواداری کے نکات کو اجاگر کیا۔ کریم سٹی کالج جمشید پور کے شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر افسر کاظمی نے مولانا آزاد کا قومی نظریہ کے عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا آزاد کے افکار و نظریات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ان کی دانشوری کی معنویت کو اکیسویں صدی میں مسلّم قرار دیا۔ ''مولانا آزاد کے افکار کا تجزیہ اکیسویں صدی کے تناظر میں'' عنوان کے تحت ہگلی محسن کالج کے شعبۂ اردو استاذ ڈاکٹر عمر غزالی نے مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے جو انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان پر تفصیلی گفتگو کی اور مولانا آزاد کو ایک سچا محب وطن قرار دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر قرار دیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے مولانا آزاد کی شخصیت اور تحریک آزادی میں ان کی قربانیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے جیل کی جو صعوبتیں جھیلیں اور جو مظالم برطانوی حکومت نے کئے ان نکات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ مولانا آزاد کے خطبات کے اقوال بھی پیش کئے۔ ڈاکٹر جمال احمد صدر شعبہ اردو سنت کولمبس کالج ہزاری باغ میں مولانا آزاد کی دانشوری اور ان کے تعلیمی نظریات پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ شعبہ کی طالبہ نازیہ نے مولانا آزاد کی ایک غزل ترنم میں پیش کر کے لوگوں کو محظوظ کیا۔ کوئلا نچل یونیورسٹی دھنباد کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر موصوف احمد نے مولانا آزاد کی ادبی حیثیت کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی رانچی میں قیام کے دوران مولانا آزاد نے جو خدمات انجام دئے ان پر بھی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر فہیمہ خاتون نے مولانا آزاد کے افکار پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ان کی ادبی حیثیت کا بھی جائزہ لیا۔ شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر احمد سجاد نے پڑھے گئے مقالوں پر تفصیلی تبصرہ پیش کیا۔ ہر مقالے کی قدر و قیمت کو منکشف کیا۔ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پروفیسر احمد سجاد نے مولانا آزاد کی قاموسی شخصیت، ان کے تدبر، ان کی سیاسی بصیرت پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروگرام کے آخر میں اپنے صدارتی خطبہ میں ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابوذر عثمانی نے مولانا آزاد کی معنویت اکیسویں صدی کے حوالے سے، پر تفصیلی گفتگو کی اور مولانا آزاد کے افکار و نظریات کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔ اظہار تشکر کی رسم ڈاکٹر کہکشاں پروین، سابق صدر، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی نے ادا کی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ مولانا آزاد پر شعبے میں نئی جہت سے تحقیقی مقالے لکھے جائیں گے۔ نقابت کے فرائض فاطمہ حق اور دانش ایاز نے انجام دئے۔

● (۲۴ر نومبر ۲۰۲۰ء): ڈاکٹر مشتاق احمد، رجسٹرار، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے جاری کردہ اعلامیہ مورخہ ۲۴ر نومبر ۲۰۲۰ء کے مطابق پروفیسر محمد آفتاب اشرف (صدر، شعبہ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی) کو ''مولانا ابوالکلام آزاد چیئر'' کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ اور وہ بحیثیت ڈائریکٹر اس چیئر کے بینک اکاؤنٹس کو رجسٹرار موصوف کے ساتھ مشترکہ طور پر چلانے کے بھی مجاز ہوں گے۔ واضح ہو کہ ایل این متھلا یونیورسٹی میں اس چیئر کو برسوں کے بعد فعال کیا گیا ہے جس کے لیے موجودہ رجسٹرار کی کوششوں کا کافی عمل دخل ہے۔ آفتاب اشرف صاحب کے ڈائریکٹر نامزد کیے جانے پر ادبی حلقوں میں خوشی محسوس کی جا رہی ہے۔

....

● (۲۶ر نومبر ۲۰۲۰ء): معروف علمی، دینی، اصلاحی اور دعوتی شخصیت، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید ابواختر قاسمی کی حیات و خدمات پر مشتمل جواں سال صحافی محمد عارف اقبال کی کتاب ''حضرت مولانا سید ابواختر قاسمی: حیات و خدمات'' کا اجراء آج دربھنگہ شہر کے مدرسہ اسلامیہ، جھگڑوا میں منعقد ہوا، پروگرام میں قرب و جوار سے بڑی تعداد میں علماء کرام نے شرکت کی اور اس تاریخی لمحہ کے گواہ بنے۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت قاری شبیر احمد مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکر پور دربھنگہ اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالودود قاسمی (اسسٹنٹ پروفیسر) نے انجام دیں۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی و کانگریس کے قد آور لیڈر ڈاکٹر شکیل احمد (سابق مرکزی وزیر برائے امور داخلہ) نے کہا کہ اس جدید دور میں بھی کتابوں کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے، اگر اپنے علمی وراثت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو آج بھی کتابوں سے قریب ہونا ہوگا، مستند کتاب آج بھی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل بھی عزیزم عارف اقبال کی کئی کتابیں منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے، مجھے یقین ہے حضرت مولانا ابواختر صاحب کے سیرت و سوانح کے تعلق سے یہ نئی کتاب بھی عوامی سطح پر مقبول ہوگی۔ حضرت مولانا ابواختر قاسمی محتاج تعارف نہیں، ان کی نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط خدمات نئی نسل کے لئے ایک سبق اور ہم لوگوں کے لئے قابل رشک ہے۔ راجد کے سینئر لیڈر ڈاکٹر تنویر حسن (سابق ایم ایل سی بیگوسرائے) نے کہا کہ حضرت مولانا ابواختر قاسمی نے اپنی علمی زندگی کو جس طرح سے پڑھنے اور پڑھانے میں لگایا اور کئی نسلوں کی علمی و اصلاحی تربیت کی یہی ان کی اصل شناخت اور پہچان ہے، مجھے فخر ہے کہ جس دیار سے حضرت کا خاندانی تعلق ہے اسی جگہ کا میں بھی رہنے والا ہوں، اہل دربھنگہ تو حضرت سے مستفیض ہوتے رہتے ہے مگر ہم لوگوں کو کم وقت ملا مگر نوجوان صحافی عارف اقبال کی اس کتاب کے ذریعہ اب حضرت کی دیگر خدمات سے بھی ہم لوگ متعارف ہو سکیں گے۔ آل انڈیا ملی کونسل بہار کے صدر حضرت مولانا انیس الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ مولانا سید ابواختر قاسمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود انہوں نے کبھی بھی موقع کا فائدہ نہیں اٹھایا، مولانا نے متھلانچل میں مسلکی اتحاد اور مسلمانوں میں تعلیمی و اصلاحی شعبوں میں جو گراں قدر خدمات انجام دیئے ہیں وہ سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے، انہوں نے کتاب کے مرتب عارف اقبال کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ جس محنت اور لگن کے ساتھ وہ اپنی تصنیفی و صحافتی خدمات کو جاری رکھئے ہوئے ہیں وہ ان کے روشن مستقبل کی علامت ہے اور آج کی نسل کے لئے ایک سبق بھی۔

کتاب کے مرتب عارف اقبال نے کہا کہ آج کا دن ہماری زندگی کا سب سے خوشگوار اور یادگار دن ہے۔ کیونکہ حضرت مولانا ابواختر صاحب پر ناچیز کی مرتبہ کتاب کا اجراء عمل میں آ رہا ہے۔ یہ مرحلہ طے کرنا آسان نہیں تھا، کورونا متاثر ہونے کے باوجود کتاب کی اشاعت کی فکر ہمہ وقت ذہن میں رہا۔ یہ کتاب حضرت کی چھ دہائیوں پر مشتمل ان کی علمی اور تدریسی خدمات کا ایک سنہرا دستاویز ہے۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے حضرت قاری شبیر احمد نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ عارف اقبال نے اس روایتی جمود کو توڑنے کا کام کیا ہے کہ مرنے کے بعد ہی خدمات کا اعتراف کیا جائے یہ ایک اچھی شروعات ہے، ہم اس کتاب کی اشاعت پر نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں، حضرت مولانا ابواختر صاحب کی خدمات جلیلہ کا اعتراف نہ صرف متھلانچل بلکہ ریاستی سطح پر بھی کئے جانے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر مولانا اعجاز احمد، شاہنواز بدر قاسمی، احتشام الحق، پروفیسر زاہد رضا، مولانا جمیل اختر، ماسٹر شفیع اللہ، نیر حسنین، عادل اختر عادل وغیرہ نے بھی تقریب رسم اجراء سے اظہار خیال کیا۔ کلمات تشکر قاری نسیم اختر قاسمی نے ادا کی۔

....

● (۱۴ر دسمبر ۲۰۲۰ء): ''اسرائیل-فلسطین تنازعہ جسے جدید دنیا کے انتہائی پیچیدہ اور دلچسپ مسائل میں سب سے اوپر سمجھا جاتا ہے، صرف زمین کی ملکیت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخی، ثقافتی اور مذہبی جہتیں بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بطور ملک اسرائیل کے قیام نے اسے ایک اہم سیاسی مسئلہ بنا دیا ہے۔ انعم کا یہ سفرنامہ حقیقت اور دلچسپ بیانیہ ہے جو اسرائیل اور فلسطین میں ان کے آٹھ ماہ کے تحقیقی کام پر مبنی ہے۔ وہ اس تنازعہ کے پرامن حل میں ادب کے کردار پر تحقیق کر رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کے دانشوروں اور عام لوگوں کے ساتھ نظریاتی گفتگو اور تاریخی مقامات کے دوروں کو انتہائی متعلقہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، جو امن و استحکام کی ضرورت اور امکانات کو تقویت بخشتا ہے۔ نئی نسل اس طرح کے پڑھنے لائق مواد سے بہت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔'' معروف دفاعی سائنس داں پدم شری مانس بہاری ورما نے اِفلو، حیدرآباد کی ریسرچ اسکالر انعم کی کتاب ''شالوم سلام'' کی اجرائی تقریب میں بطور مہمانِ خصوصی یہ باتیں کہیں۔ اس موقع پر اپنے تجربات کا تبادلہ کرتے ہوئے مصنفہ انعم نے کہا اسرائیل اور فلسطین کے تنازعے کو دیکھنا اور سمجھنا میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش تجربہ ہے جو صرف حکومتِ ہند اور اسرائیل کی فراہم کردہ رفاقت کی وجہ سے ممکن تھا۔ عام لوگوں سے ملاقات، ان کی باتیں سننے اور وہاں کی صورت حال کو دیکھ کر مجھے ان کی نظر میں ترس اور امن و اہم آہنگی کے امکانات کا حقیقی احساس ہوا۔ میرے خیال میں خون کا یہ پیچیدہ زخم صرف باہمی ہم آہنگی اور امن کے مرہم سے بھرا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے کورسز اور تعلیمی پروگراموں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے جس کے تحت لوگوں کے مابین تبادلہ اور باہمی رابطے کے مواقع موجود ہیں۔ یہ تقریب ان کی آبائی رہائش گاہ ہیر تیج، وارڈ نمبر-۳۱ محلہ چک رحمت بھگو، تھانہ لہریا سرائے، دربھنگہ میں منعقد ہوئی۔ میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے انعم نے یہ بتایا کہ اس سفرنامہ سے ایک خاص ادبی بات بھی جڑی ہے۔ مشہور امریکی ادیب سینڈی تولان کی کتاب ''دی لیمن ٹری'' عرب اور اسرائیل کے تنازعہ کو جس حقیقی تناظر میں پیش کرتی ہے، وہ بے حد متوازن اور مثبت زاویے کو اجاگر کرتی ہے۔ اس ناول کا اختتامی حصہ پرانے لیمن ٹری کے ختم ہو جانے پر فلسطینی اور

یہودی بچوں کے ذریعہ مشترکہ طور پر نئے لیمن ٹری کا پودا لگانے کو بے حد پر اثر طریقہ سے بیان کرتا ہے، جس میں مرکزی کردار کی حامل یہودی لڑکی ڈالیا کہتی ہے ''یہ دنیا بھی خوب صورت اور اچھی ہو سکتی ہے، جب ہم سب ساتھ رہیں۔'' انعم نے اپنے سفرنامے کو اسی مثبت ادب سے منسوب کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیرونی قیام کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ دونوں قوموں کے عام لوگ بے حد خوش اخلاق اور امن پسند ہیں جنھیں ناانصافی اور تشدد ہرگز گوارا نہیں۔ یہ ماننا غلط نہیں ہوگا کہ مثبت اور متوازن ادب ایک بہتر ماحول کی تشکیل میں اہم کردار ادا سکتا ہے۔ اپنے جذبات کو ساجھا کرتے ہوئے انعم کی والدہ محترمہ صبیحہ نسیم نے کہا کہ اس کتاب کی اشاعت سے انہیں اپنی بیٹی اچانک بڑی لگنے لگی ہے۔ آج کی نئی نسل اگر انسانی برادری کے پیچیدہ مسائل میں دلچسپی لینے لگے تو یقینی طور پر ایک بہتر مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے۔ اظہارِ تشکر پروفیسر انعم کے والد پروفیسر ایم نہال نے ادا کیا۔ پروگرام کے دیگر حاضرین و شرکاء میں انعم کے نانا نسیم محمد جان، بہن ڈاکٹر مدیحہ، پروفیسر سیّد احتشام الدین، ڈاکٹر ریشما، ڈاکٹر سنجے کمار، جناب انور حلیم، محترمہ عشرت بانو، راجیو جھا، سنتوش، محمد احتشام الحق وغیرہ شامل تھے۔

....

● (۱۶/دسمبر ۲۰۲۰ء): ادب کی مایہ ناز شخصیات کے ذریعہ عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شعری، علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات پر مشتمل ''ذرہ نوازی'' کی رسم اجراء آج آن لائن منعقد کی گئی۔ روحانی پیشوا مراری باپو، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر اختر الواسع، حسن کمال، پروفیسر وسیم اختر، پروفیسر اشوک چکردھر، ڈاکٹر کمار وشواس، ڈاکٹر نواز دیوبندی اور کتاب کے مرتب ڈاکٹر الف ناظم نے مشترکہ طور پر رسم اجراء کو انجام دیا۔ 'ذرہ نوازی' کے لئے ایک سو سے زائد قلم کاروں نے نواز دیوبندی کی شاعری، شخصیت اور خدمات پر مقالے لکھے ہیں، جسے ڈاکٹر الف ناظم نے بڑے سلیقے اور محنت سے ترتیب دے کر کتاب بنایا ہے۔ حقیقتاً یہ صرف ایک کتاب نہیں بلکہ ایک دستاویز ہے، جو ڈاکٹر نواز دیوبندی کے چاہنے والوں اور ان پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے حوالہ ہی نہیں بلکہ ایک تحفہ ہے۔ اکثر لوگ تخلیق کار کی تخلیق خصوصیات سے تو واقف ہوتے ہی ہیں لیکن ان کی زندگی پر ایسی ہی دستاویز ہے۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی نے تمام شرکاء اور مقالہ نگار خواتین وحضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ادب کے آفتاب و ماہتاب اور میرے دوستوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ 'ذرہ نوازی' ہے۔ میں تہہ دل سے سب کو سلام پیش کرتے ہوئے عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آخر میں مرتب ڈاکٹر الف ناظم نے کہا کہ 'ذرہ نوازی' کو جامع اور پر مغز بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

....

● (۲۲/دسمبر ۲۰۲۰ء): ''ملک کی تعمیر و ترقی میں اے ایم یو کا کلیدی رول رہا ہے۔ ملک کی خوشحالی کے لئے ہر سطح پر ترقی ضروری ہے۔ آج ہر شہری کو بلاتفریق ترقی کے مواقع فراہم ہو رہے ہیں۔ ملک کے وسائل کا تعلق ہر شہری سے ہے اور اس کا سب کو فائدہ پہنچنا چاہئے۔ کسی کو بھی اس کے مذہب کی بنیاد پر پیچھے نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہ باتیں اے ایم یو کی صد سالہ تقریب میں وزیر اعظم نریندر مودی نے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ اپنے خطاب میں کہیں۔'' اس موقع پر وزیر اعظم مودی نے سر سید احمد خاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اے ایم یو صدی ڈاک ٹکٹ بھی جاری

کیا۔ ورچوئل جلسہ میں اے ایم یو کے چانسلر سیدنا مفضل سیف الدین اور مرکزی وزیر تعلیم رمیش پوکھریال نشنک کے علاوہ نواب ابن سعید خاں چھتاری بھی موجود رہے۔ وزیراعظم نے جہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو چھوٹا ہندوستان قرار دیا وہیں جنگ آزادی میں اس ادارے کے کلیدی کردار کا بھی تذکرہ کیا۔ آج کا دن اے ایم یو کی تاریخ کا بہت اہم دن تھا، جس دن سرسید کے اس چمن کا ۱۰۰ رسالہ جشن منایا جارہا تھا، یہ دن اس لئے بھی خاص ہوگیا تھا کہ ۱۹۶۴ء کے بعد پہلی مرتبہ ملک کے وزیراعظم اے ایم یو کے کسی جلسہ سے خطاب کرنے والے تھے۔ ان کا خطاب شروع ہونے تک سبھی کی نظریں وزیراعظم نریندر مودی کی منتظر تھیں۔ اپنے خطاب کے دوران وزیراعظم نریندر مودی نے جہاں سرسید احمد خان کے اس عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے کی تعریف کی، وہیں یہاں سے فارغ التحصیل طلبا کا بھی ذکر کیا، جو آج پوری دنیا میں چھائے ہوئے ہیں اور دنیا میں ملک کا نام روشن کررہے ہیں۔

وزیراعظم نریندر مودی کا خطاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر لگنے والے ان الزامات کی بھی تردید کرتا رہے گا جو اکثر و بیشتر ادارے پر لگتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ملک کی تعمیر و ترقی میں اے ایم یو کے کلیدی کردار کا جو ذکر کیا اس کو سبھی نے پسند کرتے ہوئے وزیراعظم کے خطاب کی ستائش کی۔ وزیراعظم نریندر مودی نے اے ایم یو کو منی انڈیا سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں اردو، ہندی، عربی اور سنسکرت کے ساتھ تمام علوم پڑھائے جاتے ہیں جو یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ وزیراعظم کا کہنا تھا کہ یہاں کی لائبریری میں قرآن موجود ہے تو گیتا رامائن کے قدیم نسخے بھی موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اے ایم یو میں ہندوستان کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ وزیراعظم نے اے ایم یو کی کچھ دیرینہ روایتوں کا بھی ذکر کیا جسے خود علیگ برادری بھولتی جارہی تھی۔ ان کے ذریعہ تعلیم نسواں کے تعلق سے آج سے ۱۰۰ رسال قبل اے ایم یو کے ذریعہ کئے گئے کارہائے نمایاں کی ستائش پر بھی اساتذہ کا کہنا ہے کہ یقیناً تعلیم نسواں کے میدان میں اے ایم یو نے سنگ میل کی حیثیت بنائی ہے۔ اب مستقبل میں ان کاوشوں کو مزید مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ نریندر مودی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جنگ آزادی میں کلیدی کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں سے کئی مجاہدین آزادی نکلے ہیں جن کو یاد کئے جانے کی ضرورت ہے۔ وزیراعظم نے کہا کہ اے ایم یو میں اسلام کے حوالہ سے جو تحقیق ہوتی ہے اس سے ہندوستان کے اسلامی ممالک سے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔ اے ایم یو کی انتظامیہ نے انہیں کچھ دن پہلے خط لکھ کر کورونا ویکسین کے مشن کے دوران ہر ممکن مدد دینے کی یقین دہانی کی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے کووڈ کے دور میں اے ایم یو کے ذریعہ کئے گئے رفاہی کاموں کا بھی تذکرہ کیا اور کہا کہ آپ نے اس مشکل وقت میں عوام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وزیراعظم مودی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اے ایم یو کی دیواروں پر ملک کی تاریخ درج ہے اور یہاں سے نکلے متعدد طلبا قدیم سے بیرون ممالک میں ملاقات ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ اپنی مادر علمی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں سے واقف کراتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں سے فارغ طلبا ہمیشہ خوش مزاج اور شعر و شاعری کے مداح ہوتے ہیں۔ وزیراعظم مودی نے سرسید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے پیغام کو دہرایا کہ جس میں انہوں نے کہا تھا کہ سب کی خدمت کرنی چاہئے، چاہے اس کا مذہب یا طبقہ کچھ بھی ہو۔ ایسے میں ملک کی خوش حالی کے لئے اس

کی ہرسطح پر ترقی ہونا ضروری ہے۔آج ہرشہری کو بلاتفریق ترقی کے مواقع فراہم ہورہے ہیں۔وزیراعظم نے کہا کہ شہری آئین سے حاصل شدہ حقوق کے حوالہ سے سب بےفکر رہیں۔'سب کا ساتھ-سب کا وکاس اور سب کا وشواس' ہی سب سے بڑا نعرہ ہے۔

وزیراعظم نے مزید کہا کہ کچھ وقت پہلے اے ایم یو کے ایک سابق طالب علم نے بتایا کہ مسلم بیٹیوں کا اسکول ڈراپ آؤٹ ریٹ (اسکولی تعلیم ترک کردینے کی شرح) ۷۰رفیصد سے زیادہ تھا، کئی عشروں تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہورہی ہے کہ اے ایم یو میں بھی اب ۳۵رفیصد تک مسلم بیٹیاں پڑھ رہی ہیں۔ انہوں نے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ اے ایم یو ملک کا پہلا ادارہ ہوگا جس نے ۱۹۲۰ء میں تعلیم نسواں کی گراں قدر کوششیں کرتے ہوئے یونیورسٹی کی پہلی چانسلر بیگم سلطان جہاں کو بنایا تھا' یہ اس دور کی بات ہے جب لڑکیوں کو تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا، ایسے وقت میں اے ایم یو نے تعلیم نسواں کی جو نظیر پیش کی وہ کہیں اور نہیں ملتی۔انہوں نے کہا کہ اگر ایک عورت تعلیم یافتہ ہوتی ہے تو پوری نسل تعلیم یافتہ ہو جاتی ہے۔انہوں نے کہا کہ مرکزی حکومت جو اسکیمیں چلارہی ہے، وہ بلاتفریق مذہب ہر طبقہ تک پہنچ رہی ہیں جس میں ۴۰رکروڑ غریبوں کے بینک کھاتے کھولے گئے۔۲رکروڑ سے زیادہ غریبوں کو پکے مکان دیئے گئے اور ۸رکروڑ سے زائد خواتین کو گیس کنکشن فراہم کئے گئے۔سماج میں نظریاتی اختلاف ہوتے ہیں لیکن جب بات قومی مقصد کے حصول کی ہو تو تمام اختلافات کو درکنار کردینا چاہئے۔ملک میں کوئی کسی بھی طبقہ یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اسے ملک خودکفیل بنانے میں اپنا تعاون دے۔اے ایم یو سے کئی جنگجو نکلے ہیں جنہوں نے اپنے نظریات سے علیحدہ ملک کے لئے جنگ لڑی۔سیاست صرف سماج کا حصہ ہے لیکن سیاست اقتدار سے علیحدہ ملک کا سماج ہوتا ہے۔ایسی حالت میں ملک کے سماج کو فروغ دینے کے لئے ہمیں کام کرتے رہنا چاہئے۔وزیراعظم نے کہا کہ جب ہم ایک مقصد کے حصول کے لئے گامزن ہوں گے تو کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جنہیں دقت ہوگی، وہ عناصر ہر سماج میں ہیں لیکن ہمیں ان سب کو نظرانداز کرتے ہوئے ملک کے لئے کام کرنا چاہئے۔گزشتہ صدی میں نظریاتی اختلاف کی وجہ سے کافی وقت برباد ہو گیا لیکن اب بلا تاخیر 'آتم نربھر بھارت' کے مقصد کو حاصل کرنا ہے۔

اس سے قبل مہمان اعزازی مرکزی وزیر تعلیم رمیش پوکھریال نشنک نے بھی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اے ایم یو کی صدی تقریب کے موقع پر سبھی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ جس مقصد کے لئے اے ایم یو کا قیام کیا گیا اس کے لئے وہ آج بھی کام کررہا ہے۔اے ایم یو کے چانسلر سیدنا مفضل سیف الدین نے اسلام میں تعلیم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ اے ایم یو اپنے مقاصد کے حصول کی طرف مسلسل گامزن ہے۔صدی جلسہ سے پروفیسر علی محمد نقوی اور پروفیسر نعیمہ گلریز نے بھی خطاب کیا جبکہ وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔نظامت کے فرائض ڈاکٹر فائزہ عباسی نے انجام دیئے۔وہیں جلسہ میں نواب ابن سعید خاں آف چھتاری، اے ایم یو کے آنریری ٹریژرار پروفیسر عبدالحمید آئی پی ایس نے اظہار تشکر پیش کیا۔جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جب کہ یونیورسٹی ترانہ اور قومی ترانہ پر جلسہ اختتام پزیر ہوا۔

● (۲۵ر دسمبر ۲۰۲۰ء): معروف ڈینٹل، فیشیل اینڈ استھیٹک سرجن ڈاکٹر نوا امام (ولد ڈاکٹر امام اعظم، ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا، رہائش: ادبستان، متھلا محل کمپلیکس، پوسٹ: سارا موہن پور، دربھنگہ-ے، کلینک: ڈینٹل اینڈ کاسمیٹک کیئر، بی ایس کمپلیکس، محلّہ: رحم خاں، نزد ملت کالج چوک، دربھنگہ) ہندوستان کے ۱۰۰ربہترین ڈینٹل ڈاکٹروں کی فہرست میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ فہرست ''دی گلوبل آوٹ ریچ میڈیکل ہیلتھ ایسوسی ایشن'' کے ذریعہ جاری کی گئی ہے۔ ان کی اس کامیابی پر محترمہ زرینہ آفتاب (دادی)، ڈاکٹر شاہینہ امام (نانی)، ڈاکٹر زہرہ شمائل (والدہ)، احمر اعظم، انجینئر سیّد ظفر اسلام ہاشمی، سیّد خرم شہاب الدین (چچا)، سہیل احمد احسانی (پھوپھا)، شہلا فاروقی (پھوپھی)، انجینئر فضا امام (بھائی)، حیا فاطمہ (بہن، طالبہ، بی یو ایم ایس) اور دیگر خویش و اقارب نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کے روشن مستقبل کی دعائیں کی ہیں۔

....

● (۳۱ر دسمبر ۲۰۲۰ء): آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس، حیدرآباد کے صدر اور ادیب وصحافی ڈاکٹر مختار احمد فردین نے آج ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا) کو اردو کی شعری، نثری اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ۲۲رواں اردو انمول رتن ایوارڈ مانو ریجنل سینٹر کے دفتر میں پیش کیا۔ واضح ہو کہ ملک کے مختلف اردو حلقوں میں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی خدمات کا اعتراف ڈاکٹر فردین اپنے اس منفرد ایوارڈ کے ذریعہ کرتے رہتے ہیں۔ اس دوران جواں سال ادیب و شاعر شاہد اقبال نے اپنی مرتبہ کتاب ''چٹھی آئی ہے!'' ڈاکٹر مختار احمد فردین کو پیش کی۔ نوجوان صحافی شہاب الدین (نمائندۂ روزنامہ ''تاثیر'' ہوڑہ) سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر امام اعظم طویل عرصے سے اردو ادب وصحافت کی خدمت کرتے آرہے ہیں۔ اب تک ان کی تقریباً دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، نیز ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' تقریباً ۱۹ربرسوں سے پابندی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ایسے میں یہ ضروری تھا کہ ایسے خادمِ اردو کی کاوشوں کا اعتراف کیا جائے۔ پس آج یہ ایوارڈ ہمارے ادارہ کی جانب سے انھیں دیا گیا۔ ڈاکٹر امام اعظم نے ڈاکٹر مختار احمد فردین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ موصوف ملک کے مختلف علاقوں میں اردو کی ادبی سرگرمیوں سے واقف ہیں اور وہاں اردو کے جیالوں کی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے اعزاز سے نوازتے ہیں۔ یہ ان کی ذرہ نوازی ہے کہ آج انھوں نے خاکسار کو اس ایوارڈ سے نوازا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تازہ کتاب ''سماجی امید'' بھی پیش کی ہے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس موقع پر معروف ادیب و محقق اشرف احمد جعفری (معتمد ''بزمِ نثار'' کولکاتا)، معروف شاعر و ادیب ہمدم نعمانی (کمرہٹی، کولکاتا) اور شاہد اقبال نے بھی ڈاکٹر مختار احمد فردین اور ڈاکٹر امام اعظم کو مبارک باد پیش کی۔

وفیات

● اردو کے معروف قلمکار روشو ناتھ طاؤس (ولادت: ۱۰رجون ۱۹۳۲ء، پنجاب) کا انتقال ۶رجون ۲۰۱۹ء کو نوئیڈا میں ہوگیا۔ ان کے مضامین فلمی حوالوں سے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں تواتر سے شائع ہوتے رہے نیز وہ فلمی دنیا سے عرصے تک وابستہ رہے۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔

● معروف شاعر **بی ایس جین جوہر** (اصل نام: بکرم سین جین، ولادت: ۱۰/مئی ۱۹۲۷ء، امین نگر سرائے، میرٹھ) کا انتقال ۱۱/جون ۲۰۱۹ء کو میرٹھ میں ہوگیا۔ آنجہانی پیشے سے ایک کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے رہے۔ ان کے سات شعری مجموعے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندی، جدیدیت اور روایت کا عنصر ہے۔ ان کی تخلیقات دیگر رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ 'تمثیل نو' میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔

....

● مصر کے سابق صدر **ڈاکٹر محمد مرسی** (ولادت: ۲۰/اگست ۱۹۵۱ء، العدوہ، شمالی مصر) کا ۱۷/جون ۲۰۱۹ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے مقدمہ کی سماعت کے دوران کمرۂ عدالت میں ہی انتقال ہوگیا۔ ۱۸/جون کی صبح قاہرہ کے مشرقی علاقے مدینۃ النصر (نصر سٹی) میں تدفین عمل میں آئی۔ وہ جاسوسی کے الزام میں مقدمے کا سامنا کر رہے تھے۔ مرحوم ۳۰/جون ۲۰۱۲ء سے ۳/جولائی ۲۰۱۳ء تک مصر کے صدر رہے۔ فوج نے ان کی حکومت کا تختہ پلٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ ۲۰۱۱ء میں اسلامی شدت پسندوں کو جیل سے بھاگنے میں مدد کی۔ انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

....

● معروف شاعرہ **سمیعہ نسیم** (اصل نام: سمیعہ خاتون، ولادت: ۱۹۳۶ء بمقام مظفر پور، بہار) کا ۱۹/جون ۲۰۱۹ء کو سائیں ہاسپٹل، کنکر باغ، پٹنہ میں صبح ساڑھے نو بجے انتقال ہوگیا۔ وہ مشہور شاعرہ مخفی صالحہ اور سیّد حسن ذکی (دیوان روڈ، مظفر پور) کی بیٹی تھیں۔ مرحومہ ایک اچھی شاعرہ اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کے تین شعری مجموعے ''حرفِ اول''، ''خوشبوئے وفا'' اور 'بدلتے منظر'' شائع ہو چکے ہیں۔ بہار اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ گذشتہ دنوں محفل نسواں میں ان کی شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں فروغ اردو ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ سمیعہ نسیم بہار میں نسوانی شاعری کا ایک معیاری نشان تھیں۔ مرحومہ کی نماز جنازہ کنکر باغ مسجد میں بعد نماز عصر ہوئی اور تدفین پیر موہانی قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ۴/بیٹے اور ۴/بیٹیوں کے علاوہ پوتے پوتیوں سے بھرا پرا خاندان ہے۔ مرحومہ جناب شہیر امام (جنوبی افریقہ) کی اہلیہ نوشین غزالہ (امریکہ) کی حقیقی خالہ تھیں۔

....

● معروف قانون داں **سید عذیر ہاشمی** کا انتقال ۲۲/جون ۲۰۱۹ء کو ۹۲ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد پٹنہ میں ۵/بجے شام میں ہوگیا جہاں وہ زیر علاج تھے۔ ان کا جسد خاکی اسی شب پٹنہ سے ان کے آبائی وطن عملہ پٹی، موتیہاری لایا گیا جہاں دوسرے روز ۲۳/جون کو بعد نماز عصر نماز جنازہ ادا کی گئی اور صدر قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے فیضی عذیر ہاشمی دہلی گورنمنٹ میں ایڈیشنل ہیلتھ سکریٹری، پنجاب وقف بورڈ اور دہلی وقف بورڈ کے سکریٹری رہے ہیں اور اب دہلی وقف ٹریبونل کے رکن ہیں۔ مرحوم عذیر ہاشمی ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی و رواداری کی علامت و استعارہ تھے۔ ان کی سماجی، ملّی خدمات اور ان کے گفتار و کردار کا ذکر ہوتا رہے گا۔ مرحوم نے ۵۰/سال تک وکالت کی اور دس سال تک سرکاری وکیل بھی رہے۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں کی شان تھے اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمہ جہت کوشاں رہتے تھے۔ متعدد ادبی، ثقافتی، سماجی مجلسوں کے روح رواں تھے۔

● معروف ادیب اور ناقد **پروفیسر یوسف سرمست** (سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، ولادت: ۲۸؍دسمبر ۱۹۳۶ء، حیدرآباد) کا انتقال ۲۴؍جون ۲۰۱۹ء کو حیدرآباد میں ہوگیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتابوں میں "پریم چند کی ناول نگاری"، "عرفانِ نظر"، "نظری اور عملی تنقید"، "ادب: نقد و حیات"، "ادب کی ماہیئت"، "منصب اور تاریخ"، "تحقیق و تنقید"، "دکنی ادب کی مختصر تاریخ"، "اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت" اہم ہیں۔ مرحوم کا شمار ترقی پسند تحریک کے نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد اداروں نے انعامات و اعزازات سے نوازا۔ اردو فکشن کے بھی وہ اہم ناقد تھے۔

....

● معروف ادیبہ **ڈاکٹر وسیم بیگم** (پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ولادت: ۲۳؍جنوری ۱۹۶۱ء، دہلی) کا انتقال سرطان کے مرض میں ۲؍جولائی ۲۰۱۹ء کو سٹیزن ہاسپٹل، لنگم پلی، حیدرآباد ہوگیا۔ پسماندگان میں خاوند کے علاوہ ایک بیٹا ہے۔ ان کی تدفین دہلی میں ہوئی۔ ان کی تقریباً پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

....

● معروف شاعر اور نغمہ نگار **حمایت علی شاعر** (اصل نام: میر حمایت علی۔ ولادت: ۱۴؍جولائی ۱۹۲۶ء، اورنگ آباد، دکن، مہاراشٹر) کا انتقال ۱۶؍جولائی ۲۰۱۹ء کو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ہوگیا۔ وہ شعبۂ درس و تدریس کے علاوہ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی کئی شعری مجموعے جن میں "مٹی کا قرض"، "آگ میں پھول"، "تشنگی کا سفر"، "حرف حرف روشنی" وغیرہ اہم ہیں۔ ان کی ایک نظم "بنگال سے کوریا تک" بے حد مشہور ہوئی۔ انہوں نے فلموں کے لئے بھی بہت سے گیت لکھے نیز افسانہ نگاری بھی کی اور ڈرامے بھی لکھے۔ ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ "پاکستان میں اردو ڈرامہ" تھا۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "فاصلے" بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ کراچی سے کینیڈا چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے تھے۔

....

● **نیر اعظم** (سابق ایم ایل اے، راجد) کا ۲۸؍جولائی ۲۰۱۹ء کی صبح پٹنہ میں انتقال ہوگیا ہے۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ ان کے آبائی گاؤں شکری (مدھوبنی) میں اسی روز بعد نماز عصر ادا کی گئی اور وہیں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ واضح ہو کہ مرحوم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے علم سیاسیات میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد خدمت خلق کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ دو دہائی تک پنچایت کے مکھیا رہے۔ پنڈول اسمبلی حلقہ سے تین بار ایم ایل اے منتخب ہوئے اور آخری سانس تک قوم و ملّت کے غم خوار رہے۔

....

● سابق مرکزی وزیر اور کانگریس کے سینئر لیڈر **ایس جے پال ریڈی** (ولادت: ۱۶؍جنوری ۱۹۴۲ء، مدگل، آندھرا پردیش) کا انتقال ۲۸؍جولائی ۲۰۱۹ء کو ڈھائی بجے شب میں ایشین انسٹی ٹیوٹ آف گیسٹر وانٹرولوجی، حیدرآباد میں ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ آنجہانی پانچ بار لوک سبھا اور دو بار راجیہ سبھا کے رکن رہے نیز وہ چار بار رکن اسمبلی بھی رہے۔ وہ محنتی، ایماندار اور مضبوط ارادوں والے سیاستداں تھے۔ وہ معذور تھے لیکن انہوں نے اپنے اور ملک کی ترقی میں کبھی معذوری کو آڑے آنے نہیں دیا۔

● بی جے پی کی نامور سیاست داں، مقرر اور سابق وزیر خارجہ **سشما سوراج** (ولادت: ۱۴؍فروری ۱۹۵۲ء، انبالہ کنٹونمنٹ، ہریانہ) کا انتقال ۶؍اگست ۲۰۱۹ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے نئی دہلی میں ہو گیا اور ۷؍اگست کو سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی آخری رسومات لودھی کریماٹوریم دہلی میں ادا کی گئی۔ محترمہ سشما سوراج وزیر اعظم نریندر مودی کے پہلے دور حکومت میں وزیر خارجہ رہیں اور اس کے علاوہ وہ ریاست نئی دہلی کی 1998 میں وزیر اعلیٰ بھی رہیں اور انہیں دہلی کی پہلی خاتون وزیر اعلیٰ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا اور وہ تقریباً پانچ دہائیوں تک ہندوستانی سیاست پر نمایاں رہیں۔ پسماندگان میں ان کے شوہر سوراج کوشل اور بیٹی بانسری سوراج ہیں۔

● نامور وکیل **محمد علی مرتضیٰ** (آبائی وطن: دیوپار، پوسا، سمستی پور) کا انتقال ۹؍اگست ۲۰۱۹ء کو ان کی رہائش گاہ مرتضیٰ کمپلیکس، جیل روڈ، مظفر پور میں ۹۶؍سال کی عمر میں ہو گیا اور نماز جنازہ مدرسہ اسلامیہ جامع العلوم کے استاد مولانا اشتیاق احمد نے پڑھائی اور تدفین مولوی عیسیٰ صاحب کے باغ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم انتہائی خلیق، مرنجاں مرنج اور خدا ترس انسان تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا اور ۱۹۴۳ء میں برٹش حکومت کے فلیکس نامی کارخانے کو نذر آتش کر دیا تھا جس کی وجہ سے جیل کی صعوبتیں بھی اٹھانا پڑی تھیں۔ مجاہدینِ آزادی کو ملنے والی سرکاری سہولتوں کو رضا کارانہ طور پر لینے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ بہار اسکول اگزامینیشن بورڈ کے چیئر مین بھی رہے اور نارتھ بہار انڈسٹریل کارپوریشن کے چیئر مین کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں نیز اردو گرلس ہائی اسکول کے بانی اور مدرسہ جامع العلوم کے صدر بھی رہے۔ وہ برسوں کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے۔ بھاگلپور فساد کے بعد کانگریس پارٹی سے الگ ہو گئے لیکن کسی دوسری پارٹی میں نہیں گئے۔

● نامور شاعر و ادیب جناب **علقمہ شبلی** (اصل نام: ابوعلقمہ محمد شبلی نعمانی، ولد مولانا عبدالجبار مرحوم، ولادت: یکم نومبر ۱۹۲۸ء سند کے مطابق یکم نومبر ۱۹۳۰ء بمقام میر غیاث چک، موجودہ ضلع نالندہ، بہار) کا ۱۳؍اگست ۲۰۱۹ء کو شام ۴؍بجے طویل علالت کے بعد 'شبلی منزل' رپن اسٹریٹ، کولکاتا-۱۶ میں انتقال ہو گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے شہزاد شبلی، ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی اور شہریار شبلی کے علاوہ ایک بیٹی فرزانہ نسرین اور پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ہیں۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ ۱۴؍اگست کو بعد نماز ظہر رہائش گاہ کے قریب ابراہیم خلیفہ مسجد، صندل اسٹریٹ، کولکاتا-۱۶ میں ادا کی گئی اور تدفین سہ پہر میں ۲؍نمبر گوبرا قبرستان میں عمل میں آئی جہاں خویش و اقارب کے علاوہ شہر کے سینکڑوں معززین نے انہیں اشکبار آنکھوں سے سپرد خاک کیا اور مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ میں (ڈاکٹر امام اعظم) اپنے وطن دربھنگہ میں تھا جہاں مرحوم کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملتے ہی الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، محلہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا۔ مرحوم کا شمار مغربی بنگال کے اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ وہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۲ء کے اوائل تک دربھنگہ میں مقیم تھے جہاں ان کے والد مولانا عبدالجبار مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں استاد تھے۔ مرحوم نے سی ایم کالج، دربھنگہ سے بی کام کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں کولکاتا تشریف لائے جہاں کلکتہ مدرسہ کے اے پی ڈپارٹمنٹ میں استاد ہو گئے اور یہاں

سے ۱۹۹۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ یہاں ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ وہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے دوبار نائب چیئرمین رہ چکے تھے نیز ایران سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ کئی ادبی رسالوں نے ان پر گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ مرحوم سے خاکسار کی مراسلت ۱۹۹۰ء سے تھی۔ ان کے ۱۸ر خطوط اردو جریدہ 'تمثیل نو'، دربھنگہ (جولائی ۲۰۱۳ء تا جون ۲۰۱۴ء) میں شائع ہو چکے ہیں اور ان پر میرے دو مضامین ''علقمہ شبلی: خواب خواب زندگی کے تناظر میں'' (مشمولہ ''گیسوئے تنقید'' ۲۰۰۸ء) اور ''روح عصر کا شاعر: علقمہ شبلی'' (مشمولہ ''گیسوئے اسلوب'' ۲۰۱۸ء) میں شامل ہیں۔ مرحوم پر بہار اور مگدھ یونیورسٹی سے کئی پی ایچ ڈی کے مقالے قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ مرحوم کے شعری مجموعے ''حرف وصوت''، ''بے چہرہ لمحے''، ''زادسفر''، ''خواب خواب زندگی''، ''صلوعلیہ وآلہ''، ''چہار آئینہ''، ''دھوپ دھوپ سفر''، ''شہرنامہ'' اور ''تارے زمین کے''، ''پھول آنگن کے'' (شاعری برائے اطفال)، ''دیارِ حرم میں'' (سفرنامہ)، ''حرف حرف تلاش'' (مضامین) وغیرہ شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ جناب مظہر امام نے علقمہ شبلی کے اشتراک سے مغربی بنگال کے میٹرک کے فارسی نصاب کی ایک فرہنگ ''شرح منتخبات فارسی'' شائع کرائی تھی جو مغربی بنگال کے طلباء وطالبات کے درمیان مقبول ہوئی اور برسوں شائع ہوتی رہی۔ انہیں متعدد اکیڈمیوں نے انعامات سے بھی نوازا تھا۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ، بھارتیہ بھاشا پریشد کولکاتا نے ۱۹۹۹ء میں رجت جینتی سمان سے نوازا تھا۔ وہ عرصہ تک روزنامہ 'آزاد ہند' میں باقاعدگی سے قطعات لکھتے رہے۔ انہوں نے شخصیاتی رباعیاں بھی لکھیں اور اس پہلو سے ان کی کافی پذیرائی بھی ہوئی۔ ویسے وہ بنیادی طور پر غزل و نظم کے شاعر تھے لیکن انہوں نے ماہیے اور کئی دوسری نئی اصناف میں بھی تجربے کئے تھے۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے اُن پر ۹ر ستمبر ۲۰۱۸ء کو یک روزہ قومی سیمینار بعنوان ''علقمہ شبلی: حیات وفن'' کا اہتمام بھی کیا تھا۔ مرحوم 'بزم احباب' کے صدر بھی تھے اور ان کے زیر صدارت 'لالۂ صحرا' کے نام سے ایک مجلّہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ مرحوم کے ادبی کارناموں پر دو کتابیں ''علقمہ شبلی: خوابوں کا صورت گر'' (مرتبین: ڈاکٹر راشد انور راشد اور جاوید ہمایوں) اور ''علقمہ شبلی: حیات اور شاعری'' (مصنف: ڈاکٹر مظہر کبریا) شائع ہو چکی ہیں۔ علقمہ شبلی کی رباعیات کو ''چہرہ نامہ'' کے عنوان سے جاوید ہمایوں نے ترتیب دے کر شائع کرایا۔

....

● **پروفیسر عثمان علی خاں** (ولادت: ۱۵ر نومبر ۱۹۳۸ء، بمقام سیوان، خلف بابو اشفاق علی خاں مرحوم، مقام محلّہ: خان صاحب کی ڈیوڑھی، دربھنگہ، حال مقیم ڈیلس، امریکہ) سابق صدر، شعبۂ اردو و انچارج پرنسپل ملت کالج دربھنگہ کا انتقال ۱۴ر اگست ۲۰۱۹ء بروز بدھ بمطابق ۱۲ر ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ ان کے چھوٹے صاحب زادے ثناء اللہ خاں کی رہائش گاہ واقع ڈیلس، امریکہ میں ہوگیا۔ ۱۵ر اگست ۲۰۱۹ء کو ڈیلس کے مقامی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ محترمہ شاکرہ خانم کے علاوہ چار بیٹے عمران علی خاں (دہلی)، عدنان علی خاں، طارق احمد خاں، ثناء اللہ خاں (امریکہ) اور ایک بیٹی ثمینہ احمد (امریکہ) ہیں۔ مرحوم ملت کالج، دربھنگہ سے بحیثیت انچارج پرنسپل ۲۰۰۰ء میں سبک دوش ہوئے تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ امریکہ میں مقیم تھے۔ گاہے گاہے وطن آتے اور تمام عزیز واقارب، دوست احباب سے ملاقات کرتے۔ نہایت نیک، شریف النفس اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا تعلق دربھنگی خاں سے تھا۔ ''تمثیلِ نو'' کے مستقل قاری تھے۔

● معروف افسانہ نگار اور ادیب جناب **یٰسین احمد** (ولادت ۲۵؍ستمبر ۱۹۴۶ء ولد میر شجاعت علی مرحوم بمقام حیدرآباد) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۸؍اگست ۲۰۱۹ء بوقت ۹؍بجے شب ہوگیا۔ ۱۹؍اگست کو بعد نمازِ ظہر ان کی تدفین یاقوت پورہ قبرستان، حیدرآباد میں ہوئی جہاں سینکڑوں افراد نے نمناک آنکھوں سے انھیں سپردِ خاک کیا۔ وہ محکمۂ کمرشیل ٹیکس سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ مرحوم نہایت خلیق انسان تھے اور ''تمثیل نو'' دربھنگہ کے مستقل قاری تھے۔ اس رسالے میں ان کا ایک خصوصی گوشہ بھی شائع ہوا تھا۔ ان کے افسانوی مجموعے ''گم شدہ آدمی''، ''سلاٹر ہاؤس''، ''یہ کیا جگہ ہے''، ''سایوں بڑا دالان'' شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں نیز انھوں نے ایک انتھولوجی اپنے دوست رشیدہ درانی کے تعاون سے ''ہر ذرہ ستارہ ہے'' کے نام سے شائع کرایا تھا۔

....

● نامور موسیقار **خیام** (اصل نام: محمد ظہور خیام ہاشمی، ولادت: ۱۸؍فروری ۱۹۲۷ء، جالندھر، پنجاب) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۹؍اگست ۲۰۱۹ء کو پھیپھڑوں کے انفیکشن سے ممبئی کے ایک اسپتال میں ہوگیا اور تدفین ۲۰؍اگست کو عمل میں آئی۔ 'کبھی کبھی' اور 'امراؤ جان' فلموں کے علاوہ بے شمار نغموں کو اپنی دُھنوں سے زندہ جاوید کرنے والے خیام فلم اور آرٹ کی دنیا ہمیشہ ان کی مرہون منّت رہے گی۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں فلم 'پتھ پاتھ' سے اپنی فلمی کیریئر کی ابتدا کی۔ ان کی مشہور فلموں میں 'پھر صبح ہوگی، لالہ رخ، کبھی کبھی، نوری، تھوڑی سی بے وفائی، دل نادان، بازار، رضیہ سلطان' وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے موسیقی کی تعلیم معروف موسیقار معروف موسیقار بابا جی اے چشتی سے لاہور میں حاصل کی تھی۔ ان کی اہلیہ جگجیت کور ایک نامور گلوکارہ تھیں اور ۲۰۱۲ء میں ان کے بیٹے پردیپ کا انتقال ہوگیا۔ انہیں سنگیت ناٹک اکاڈمی اور پدم بھوشن سے بھی نوازا جا چکا ہے نیز کئی فلموں میں فلم فیئر ایوارڈ کے ساتھ ساتھ نیشنل ایوارڈ اور ۲۰۱۰ء میں لائیو اچیومنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

....

● بہار کے سابق وزیر اعلیٰ، دانشور، مدبر اور میرِ اردو **جگن ناتھ مشرا** (ولادت: ۲۴؍جون ۱۹۳۷ء) کا انتقال ۱۹؍اگست ۲۰۱۹ء کو نئی دہلی میں طویل علالت کے بعد ہوگیا۔ وہ بنیادی طور پر معاشیات کے پروفیسر تھے۔ بعد میں عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ وہ غیر منقسم بہار کے تین بار وزیر اعلیٰ بنے۔ ان کی میعادِ کار ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۰ء رہی۔ ان کی یادداشت غیر معمولی تھی اور وہ لوگوں کو ان کے ناموں سے پہچان لیتے تھے۔ اردو کی فلاح و بہبود اور ترقی و ترویج کے لئے ۱۹۸۰ء میں انھوں نے ریاست بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اردو مترجمین و نائب مترجمین کی اسامیاں تشکیل دے کر سینکڑوں اردو والوں کو ملازمت سے جوڑا۔ یہ ان کا تاریخ ساز کارنامہ ہے جس کے ردِ عمل کے طور پر انھیں 'مولانا جگن ناتھ' بھی کہا جاتا تھا۔ انجمن ترقی اردو، بہار کے صدر پروفیسر عبدالمغنی مرحوم کی قیادت میں چلائے جانے والی تحریک کا نتیجہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کی صورت میں ملا۔ آنجہانی جگن ناتھ مشرا جی کی رحلت سے بہار کی اردو آبادی کا ایک محسن دنیائے فانی سے گذر گیا۔

....

● مولانا **صداقت حسین قاسمی** (ولادت: جنوری ۱۹۴۶ء، بالاساتھ، سیتامڑھی، بہار) کا انتقال ۲۲؍اگست ۲۰۱۹ء

کوطویل علالت کے بعد ۱۲ر بجے دن میں ہوگیا۔ پسماندگان میں پانچ بیٹے ڈاکٹر مناظر الاسلام، مولانا شباب انظر، مولانا محمد دانش قاسمی، حافظ سرخاب، انجینئر فیضی اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ مرحوم نے دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۶۳ء میں سند فراغت حاصل کی تھی اور دارالعلوم دیوبند کے موجودہ شیخ الحدیث حضرت مفتی سعید پالن پوری کے رفیق درس تھے۔ مرحوم اپنی زندگی کا طویل عرصہ جھارکھنڈ کے ڈالٹن گنج کے ایک مدرسہ میں مدرس رہے اور تقریباً ۳۵ر برسوں تک علوم دینیہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اخیر عمر میں اپنے آبائی وطن بالاساتھ آگئے اور ۲۰۰۶ء سے جامعہ قاسمیہ بالاساتھ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینا شروع کیا اور اخیر عمر تک درس وتدریس کے محبوب مشغلہ سے منسلک رہے۔ آپ عربی کے کامیاب استاذ تھے اور عربی کی مشہور کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ بڑی تعداد میں آپ کے شاگرد ملک وبیرون ملک دین کی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔

....

● بھاجپا کے قد آور لیڈر، نامور وکیل اور سابق مرکزی وزیر خزانہ **ارون جیٹلی** (اصل نام: ارون مہاراج کشن جیٹلی، ولادت: ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۲ء، دہلی) کا انتقال ۲۴ر اگست ۲۰۱۹ء کو ایمس، دہلی میں ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ، بیٹا اور بیٹی ہیں۔ ان کا جسد خاکی ایمس سے ان کی رہائش گاہ ایسٹ آف کیلاش، دہلی لایا گیا۔ ان کی آخری رسومات نگم بودھ گھاٹ پر سرکاری اعزاز کے ساتھ ادا کی گئیں۔ آنجہانی ایک ایسے لیڈر تھے جنہیں تمام اپوزیشن لیڈران احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ خواہ مخواہ کی سخت بیانی سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے ہی اپنی وزارت میں جی ایس ٹی نافذ کیا تھا۔ انہوں نے سیاست کا آغاز ۱۹۷۰ کی دہائی میں بطور طالب علم لیڈر کیا تھا۔

....

● معروف افسانہ نگار **اظہار الاسلام** کا انتقال طویل علالت کے بعد رانی گنج، مغربی بنگال میں ۲۴ر اگست ۲۰۱۹ء کو رہائش گاہ پر ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً ۷۰ر سال تھی۔ وہ مجرد تھے۔ ان کے ہمراہ بہن اور بھانجے رہا کرتے تھے۔ نہایت سادہ زندگی گزاری۔ برن اسٹینڈرڈ کمپنی میں ملازم تھے۔ وہ قبل از وقت سبکدوش ہوگئے تھے اور کل وقتی ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء سے افسانہ نگاری شروع کی تھی۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'واپسی' اور 'کانچ کے پھول' شائع ہو چکے ہیں۔

....

● معروف شاعر اور حافظ **رفیق انجم** (ولادت ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۰ء بمقام موضع بتھیا، منی گاچھی، دربھنگہ) کا انتقال ۲۵ر اگست ۲۰۱۹ء کی شب حرکتِ قلب بند ہو جانے سے محلّہ چک رحمت، بھیگو (دربھنگہ) میں ہوگیا جہاں وہ عرصہ سے مقیم تھے اور ایک مقامی ہائی اسکول میں اردو کے استاد تھے۔ ان کا جسد خاکی ان کے آبائی گاؤں لے جایا گیا جہاں بعد نماز ظہر جنازے کی نماز ادا کی گئی اور انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم برسوں قبل سید صاحب کے قائم کردہ انسان اسکول، کشن گنج میں معلم رہ چکے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'ساحل بولتا ہے' اور 'منور افکار' شائع ہو چکے ہیں۔

....

● معروف ادیب، شاعر، مترجم اور ادبی صحافی جناب **نند کشور وکرم** (ولادت: ۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء) کا ۲۷ر اگست ۲۰۱۹ء کو

دہلی میں انتقال ہوگیا۔ اسی دن شام کے وقت ان کی آخری رسوم گیتا کالونی شمشان گھاٹ، دہلی میں ادا کی گئیں۔ ان کے انتقال سے پورا ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ موصوف کی خصوصیات سے ادب کا ہر قاری واقف ہے۔ ان کی زیر ادارت ایک رسالہ ''عالمی اردو ادب'' بھی شائع ہوتا تھا۔ بیحد مخلص انسان تھے۔ ایسے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ فارسی، اردو اور ہندستانی فلموں پر انہیں کافی درک تھا۔ حافظہ بھی بلا کا تھا۔ چند برس قبل کولکاتا میں ان سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی اور دہلی کے کئی سیمیناروں میں ان کا ساتھ رہا۔

....

● سابق مرکزی وزیر اور نامور وکیل **رام جیٹھ ملانی** (۱۴؍ستمبر ۱۹۲۳ء، شکار پور، سندھ) کا انتقال ۸؍ستمبر ۲۰۱۹ء کو طویل علالت کے بعد دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر ہوگیا۔ آخری رسومات دہلی کے لودھی روڈ پر شام چار بجے ادا کی گئی۔ پسماندگان میں دو بیٹے مہیش جیٹھ ملانی ایڈوکیٹ، جنک جیٹھ ملانی اور دو بیٹیاں رانی جیٹھ ملانی، شوبھا جیٹھ ملانی ہیں۔ آنجہانی پہلی بار ۱۹۵۹ء میں کے ایم ناناوتی بنام مہاراشٹر حکومت کا مقدمہ لڑنے کے بعد مقبول ہوئے تھے۔ انھوں نے راجیو گاندھی کے قاتلوں کا مقدمہ بھی لڑا تھا اور شیئر بازار گھپلہ میں ہرشد مہتہ اور کیتن پاریکھ کے مقدموں کی پیروی بھی کی تھی۔ ان کے انتقال سے ہندوستانی سیاست اور عدالتی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اور ملک ایک عظیم ماہر قانون کھو دیا ہے۔

....

● معروف شاعر اور ادیب **ڈاکٹر شمیم انور** (سابق پروفیسر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی) کا انتقال تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں کولکاتا کے ووڈ لینڈ اسپتال میں ۲۰؍ستمبر ۲۰۱۹ء کو ہوگیا۔ تدفین گوبرا قبرستان-۲ میں بعد نماز عصر ہوئی۔ پسماندگان میں بیوہ ڈاکٹر یاسمین اختر (سابق صدر شعبۂ اردو کلکتہ گرلز کالج) کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ مرحوم کا تعلق کولکاتا کے مٹیا برج سے تھا۔ وہ معروف صحافی اور شاعر ابراہیم ہوش مرحوم کے خویش تھے۔ ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ انہوں نے جدیدیت کی تحریک کی ہم نوائی کی اور اپنی تخلیقات سے بنگال کا نام روشن کیا۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''اجنبی خدا'' (اشاعت ۱۹۷۴ء) کافی مشہور ہوا۔ جدید لب و لہجے میں ان کی کہی گئی نظمیں شناخت رکھتی ہیں۔ نہایت مخلص اور ملنسار تھے۔ مٹیا برج میں مروج صنفِ سخن نعتیہ قصیدہ گوئی پر بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

....

● معروف شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور صحافی **عارف خورشید** (اصل نام: عارف علی خان، ولادت: یکم دسمبر ۱۹۵۰ء، اورنگ آباد، مہاراشٹر) کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ۲۲؍ستمبر ۲۰۱۹ء کو ہوگیا۔ وہ مولانا آزاد ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج کے ریٹائر استاد تھے۔ پسماندگان میں بیوہ اور تین بیٹے مصطفےٰ علی خاں آصف، ڈاکٹر مجتبیٰ علی خاں جاوید اور مرتضٰی علی خاں شارق ہیں۔ وہ کتابی سلسلہ ''عالمگیر ادب'' اورنگ آباد کے مدیر بھی تھے۔ ان کی تدفین ۲۳؍ستمبر کو پنچ کنواں، اورنگ آباد قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کے چار شعری مجموعے 'ٹوٹا ہوا آئینہ' (۱۹۸۳ء)، 'لمحوں کی صلیب' (۱۹۸۷ء)، 'دھول کی شال' (۱۹۸۸ء) اور 'سوچ کے جزیرے' (۲۰۰۹ء) اور دیگر کتابوں میں 'سنہری رت کا فریب' (افسانے، ۱۹۸۶ء)، 'یادوں کے سائبان' (افسانچے، ۱۹۸۷ء)، 'آتشیں لمحوں میں' (افسانچے، ۱۹۸۹ء)، 'لہولہو آرزو' (ناولٹ، ۱۹۹۰ء)، 'احساس کا زخمی مجسمہ' (افسانے، ۱۹۹۱ء)، 'تنظیم کثیر رنگی' (خاکے، ۱۹۹۲ء)، 'قافلے والو سچ کہنا'

(افسانے، ۱۹۹۹ء)، 'اور کچھ بھی نہیں کہانی میں' (افسانچے، ۲۰۰۰ء)، 'رنگ امتزاج' (تبصرے اور خاکے، ۲۰۰۳ء) اور 'وقت کے چاک پر' (۲۰۱۰ء) اہم ہیں۔ عارف خورشید پر ایک خصوصی شمارہ 'عالمگیر ادب' کا ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔

....

● معروف شاعر **آفاق مرزا** (ولادت: ۱۵؍جولائی ۱۹۴۲ء، محلہ قطب پور، مرشد آباد، مغربی بنگال۔ والدین: مرزا فرخ حسین اور سیدہ زہرہ بیگم) کا انتقال ۴؍اکتوبر ۲۰۱۹ء کی صبح ہو گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اطہر آفاق مرزا اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین ۴؍اکتوبر کی شام بعد نماز مغرب ایمانی گنج کربلا، مرشد آباد میں ہوئی۔ انھوں نے کئی نسلوں کی آبیاری کی۔

....

● معروف شاعر، افسانہ نویس اور تنقید نگار پروفیسر ناز قادری (اصل نام محی الدین انصاری ناز، ولادت: ۹؍نومبر ۱۹۴۰ء) کا طویل علالت کے بعد ۱۳؍نومبر ۲۰۱۹ء کو صبح ساڑھے نو بجے انتقال کر گئے۔ ۱۵؍نومبر ۲۰۱۹ء کو ان کے آبائی وطن بروراج، ضلع مظفر پور میں ان کی تدفین بعد نمازِ جمعہ عمل میں آئی۔ موصوف بہار یونیورسٹی مظفر پور میں صدر، شعبۂ اردو کے عہدے سے ۲۰۰۴ء میں سبکدوش ہوئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں لکچرر کی حیثیت سے موتی پور، مظفر پور کے جیوچھ کالج میں تقرری کے بعد مختلف منصبوں پر اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے وہ بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے بھی فعال رہے۔ ان کی شناخت کلاسیکی رچاؤ رکھنے والے ایسے معتبر شاعر کی حیثیت سے ہے جس نے کبھی بھی شاعری کے معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کی غزلیں غور و فکر کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ان میں ہند اسلامی ثقافت، حالات حاضرہ پر تبصرے اور کلاسیکی موضوعات کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ ان کی کتابوں میں ''سحر البیان: ایک مطالعہ'' (تنقید)، ''دریافت'' (تحقیق و تنقید)، ''لمحوں کی صدا'' (غزلیں)، ''اردو ناول کا سفر'' (تاریخ و تنقید)، ''زاویے'' (تحقیق و تنقید)، ''رنگِ حرا'' (نعتیں)، ''صحرا میں ایک بوند'' (غزلیں)، ''وہ ایک بات'' (افسانے)، ''رنگِ شکستہ'' (نظم و غزل)، ''سلسبیل نور'' (نعتیں) مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ کئی کتابیں منتظر اشاعت ہیں۔ ان کی حیات و خدمات پر ان کے صاحب زادے نظام الدین احمد نے دو ضخیم جلدوں میں مضامین شائع کیے۔ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی اور ڈاکٹر حسن رضا نے ناز قادری کی حیات و خدمات کے حوالے سے دو کتابیں شائع کیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے فیلو ایمریٹس کی خدمات بھی انھوں نے انجام دیں۔ ان کی نگرانی میں ۱۰۰؍ سے زیادہ تحقیقی مقالے لکھے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ ملک اور بیرونِ ملک میں سرگرم عمل ہے۔ ۲۰۰۹ء میں ان کی اہلیہ شمیم ناز اور ۲۰۰۶ء میں ان کے فرزند ڈاکٹر ضیاء الدین احمد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پسماندگان میں چار فرزند صلاح الدین، شہاب الدین احمد، نظام الدین احمد اور معین الدین احمد نیز ۳؍بیٹیاں ناہید فرزانہ، صبیحہ ناز اور شازیہ ناز ہیں۔ معروف نقاد پروفیسر صفدر امام قادری ان کے نسبتی بھائی ہیں۔ دریں اثنا اردو جریدہ ''تمثیل نو'' کے مدیر اعزازی ڈاکٹر امام اعظم نے پروفیسر ناز قادری کی رحلت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موصوف مجھے بے حد عزیز رکھتے۔ انھوں نے ناچیز کو کئی خطوط لکھے تھے جو شاہد اقبال کی مرتبہ کتاب ''چٹھی آئی ہے!'' میں شامل ہیں۔ رسالہ ''تمثیل نو'' انہیں پابندی سے جاتا تھا اور ان کی کئی تخلیقات اس رسالے میں شائع بھی ہوئی تھیں۔

● سابق چیئرمین ضلع پریشد دربھنگہ جناب **صفی احمد** (عمر تقریباً ۸۷ رسال، موضع روپس پور، علی نگر، دربھنگہ) کا انتقال ۲۰ رنومبر ۲۰۱۹ء کو ساڑھے نو بجے صبح پٹنہ کے آئی جی ایم ایس اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ عرصے سے صاحب فراش تھے۔ مرحوم بہار کے سابق فائنانس منسٹر جناب عبدالباری صدیقی کے چچا تھے۔ مرحوم کے جنازے کی نماز ۲۱ رنومبر کو ان کے گاؤں روپس پور (علی نگر) میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی۔ مرحوم اپنے علاقے میں بے حد مقبول تھے اور تقریباً ۲۲ سال مکھیا رہے نیز ملّت ہائی اسکول روپس پور کے بانی سکریٹری اور مدرسہ فرقانیہ بگھیلا گھاٹ کے تقریباً ۲۰ سال سے سکریٹری تھے۔ اپنے علاقے میں سماجی، فلاحی کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہتے اور بیحد خلیق، ملنسار انسان تھے۔

....

● معروف ادیب، شاعر، صحافی اور اردو سہ ماہی ''رنگ'' کے مدیر جناب **شان بھارتی** (اصل نام: شمس الہدیٰ انصاری، آبائی وطن: مونگیر، ولادت: ۱۱ رستمبر ۱۹۴۷ء) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۲۳ رنومبر ۲۰۱۹ء کو دھنباد میں ہوگیا۔ اسی دن بعد نماز عصر تجوا کے بھدری چک قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کی ادارت میں سہ ماہی 'رنگ' تجوا، دھنباد سے باقاعدگی سے شائع ہورہا تھا جس کے ۵۵ رسے زائد شمارے شائع ہوچکے ہیں۔ اس رسالہ کے شریک اعزازی مدیر ڈاکٹر مشتاق صدف تھے۔ اب یہ سہ ماہی 'رنگ' ڈاکٹر اقبال حسین کی زیر ادارت شائع ہورہا ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں ایک رسالہ سہ ماہی 'کنول' بھی نکالا تھا مگر دو تین ہی شمارے کے بعد وہ بند ہوگیا۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں پندرہ روزہ اخبار ''ہم عصر'' کی اشاعت شروع کی جس نے صرف تین چار ماہ کی حیات پائی۔ ۱۹۷۹ء-۱۹۸۱ء کے درمیان پندرہ روزہ اخبار ''دن'' کے نام سے بھی شائع کیا۔ ان کے شعری مجموعے ''بیسویں صلیب'' (۱۹۸۰ء)، دوسرا ''آخری صلیب'' (۱۹۹۰ء) اور ''ندی کا جب کنارا ڈوبتا ہے'' (۲۰۱۶ء) منظر عام پر آکر ادبی حلقوں میں اپنی شناخت بنا چکی ہے۔ سہ ماہی 'اسباق' پونہ نے ان کے ادبی خدمات پر گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ شان بھارتی کا تخلیقی سفر ۱۹۶۴ء سے شروع ہوا۔ ۲۵ رنومبر ۲۰۰۶ء کو ادبی سرکل، دھنباد کے زیر اہتمام 'جشن شان بھارتی' کا انعقاد بھی ہوا تھا۔ انہوں نے 'اوراقِ پریشاں' (دبستانِ دھنباد کے ایک بزرگ شاعر عابد عزیزی کی غزلوں کا مجموعہ)، 'نیم ملاقاتیں' (مشاہیر کے خطوط شان بھارتی کے نام) اور 'کالی دھرتی کی غزلیں' (دھنباد ضلع کے نمائندہ شعراء کی غزلوں کا انتخاب) ترتیب دی تھیں۔

....

● معروف شاعر اور صحافی **عابد کرہانی** (ولادت: ۱۸ راکتوبر ۱۹۵۰ء) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۲۳ رنومبر ۲۰۱۹ء کو گروگرام کے میدانتا اسپتال میں ہوگیا۔ ان کا جسد خاکی ۲۴ رنومبر کو درگاہ شاہ مرداں لے جایا گیا اور دہلی گیٹ کے قبرستان میں تدفین کی گئی۔ مرحوم معروف شاعر شمیم کرہانی کے فرزند تھے۔ وہ انڈین انفارمیشن سروس میں آفیسر رہے نیز محکمہ اطلاعات ونشریات میں مختلف عہدوں پر متمکن رہے۔ طویل مدت تک ماہنامہ ''آج کل'' اور ''یوجنا'' اردو کے مدیر رہے اور پریس انفارمیشن بیورو میں شعبہ اردو کے سربراہ رہے۔ چند برس قبل وہ وظیفہ یاب ہوچکے تھے۔ پسماندگان بیوہ ناہید کرہانی ہیں۔

....

● قادرالکلام شاعر حسن نواب حسن (ولادت: ۲/نومبر ۱۹۴۰ء، بمقام گیا) کا ۷/دسمبر ۲۰۱۹ء کو مظفر پور میں حرکت قلب بند ہوجانے سے رات ۲/بجے کے قریب انتقال ہوگیا۔ مرحوم مظفر پور میں اپنے نواسے کی شادی میں شرکت کے لئے آئے تھے جہاں ان کی طبیعت خراب ہوئی تو اسپتال لے جائے گئے اور وہیں ابدی نیند سو گئے۔ اسی دن بعد نمازِ ظہر پیغمبر پور، کلھوا، مظفر پور میں ہی امام باڑہ بیت الاخزان سے ملحق قبرستان میں تدفین ہوئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا سیّد محمد علی ارمان ہے۔ وہ ایل آئی سی کی ملازمت سے ۲۰۰۰ء میں سبکدوشی کے بعد اردو کی خدمت میں ہمہ وقت لگے رہے۔ ان کی سسرال کمرا محلہ، مظفر پور تھی۔ پٹنہ ان کا وطن ثانی تھا۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی نظمیں رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ وہ پٹنہ کے علاوہ گیا کے مختلف علمی، ادبی، سماجی انجمنوں کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔

....

● معروف صحافی اور کالم نگار حفیظ نعمانی (ولادت: ۱۹۳۰ء، محلہ دیپا سرائے، سنبھل ولد محدث کبیر مولانا منظور نعمانی) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۸/دسمبر ۲۰۱۹ء کو لکھنؤ میں ہوگیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ ۹/دسمبر کو بعد نماز ظہر ندوۃ العلماء میں ندوہ کے ناظم رابع حسنی ندوی نے پڑھائی اور انہیں عیش باغ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مرحوم روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ کے چیف ایڈیٹوریل ایڈوائزر اور سرپرست بھی تھے اور آخری دم تک اخبارات میں پابندی سے مضامین لکھتے رہے۔ ان کا تعلق سنبھل کے علمی اور دینی خانوادے سے تھا۔ وہ کئی دینی اداروں سے بھی منسلک تھے۔ انہوں نے اپنی صحافتی زندگی ۱۹۵۵ء میں روزانہ ''تحریک'' سے شروع کی۔ بعدہٗ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء ''ندائے ملت'' نکالا۔ ''جدید عمل'' سے تقریباً پانچ سال تک منسلک رہے۔ وہ بطور کالم نگار بھی ہندو پاک میں شہرت رکھتے تھے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''بجھے دیوں کی قطار'' (مرتبہ: اویس سنبھلی) کافی مشہور ہوا نیز انہوں نے جیل کی روداد ''رودادِ قفس'' کے نام سے لکھی جو کتابی شکل میں منظر عام پر آچکی ہے۔ ان کے کالموں کا انتخاب ''قلم کا سپاہی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مرحوم بے باک لکھتے تھے اور لکھنے کی پاداش میں ہی انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ملک وملت کے مسائل پر ان کی گرفت کافی اچھی تھی۔ انہوں نے اپنے قلم سے ادب اور صحافت دونوں کی آبیاری کی۔

....

● ممتاز افسانہ نگار اور سابق ڈائریکٹر محکمۂ تعلقاتِ عامہ شفیع جاوید (اصل نام: ایس ایم شفیع الدین، ولد سید محمد رفیع الدین، ولادت: ۴/جنوری ۱۹۳۵ء، مظفر پور) کا انتقال ۱۲/دسمبر ۲۰۱۹ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے رات ایک بجے اسپتال میں ہوگیا۔ دو روز قبل پٹنہ کے ایک اسپتال میں ان کی انجو پلاسٹی بھی ہوئی تھی۔ تدفین ۱۳/دسمبر کو بعد نماز مغرب ہارون نگر سیکٹر-۲، نیا ٹولہ، پھلواری شریف، پٹنہ کے حاجی حرمین قبرستان میں ہوئی۔ ان کے والد محکمہ پولیس میں افسر تھے۔ مرحوم شفیع جاوید اپنے عہدہ سے ۱۹۹۵ء میں وظیفہ یاب ہوئے تھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دائرے سے باہر'' ۱۹۷۹ء منصۂ شہود پر آیا۔ پھر ''کھلی جو آنکھ'' (۱۹۸۲ء)، ''تعریف اس خدا کی'' (۱۹۸۴ء)، ''وقت کے اسیر'' (ہندی ۱۹۹۱ء)، ''رات شہر اور میں'' (۲۰۰۴ء) اور ''بادبان کے ٹکڑے'' (۲۰۱۳ء) افسانوی مجموعے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے افسانوں کی کلیات ''حکایت ناتمام'' زیر

اشاعت ہے نیز ان کے کالم اور مضامین کے مجموعے بھی زیر اشاعت ہیں۔ ان کے افسانوں کی کل تعداد تقریباً ۱۰۰ ہیں۔ شفیع جاوید ترقی پسند افسانہ نگار تھے لیکن جب جدیدیت کی لہر آئی تو ان کا رجحان اسی طرف ہوگیا۔ انہوں نے بعض مبہم افسانے بھی لکھے اور عصری مسائل کی عکاسی کرتے رہے۔ ان کی فکر میں جدت تھی، نیا پن تھا اور اسلوب میں بھی تازگی تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا پولیس محکمہ کے اعلیٰ عہدے پر کولکاتا میں فائز تھے وہ اکثر کولکاتا آتے۔ راقم الحروف کو بے حد عزیز رکھتے۔ انہوں نے میرے شعری مجموعہ "قربتوں کی دھوپ" کی حصولیابی پر ۴؍ستمبر ۱۹۹۶ء کو ایک خوبصورت خط لکھا۔ ان کے دو خط شاہد اقبال (کولکاتا) کی مرتبہ کتاب "چٹھی آئی ہے" میں شامل ہیں۔ "تمثیل نو" کے مستقل قاری تھے۔ وہ مخلص اور مرنجامرنج انسان تھے۔ گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے۔ ان کے کئی خطوط ممتاز شاعر جناب مظہر امام مرحوم کے نام ہیں جو محفوظ ہیں۔

....

● معروف ترقی پسند ادیب اور ناقد **پروفیسر سید محمد عقیل رضوی** (سابق پروفیسر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی۔ ولادت: ۱۰؍اکتوبر ۱۹۲۸ء، الہ آباد) کا انتقال ۲۰؍دسمبر ۲۰۱۹ء کو طویل علالت کے بعد الہ آباد میں ہوگیا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ مرحوم اپنے عہدہ سے ۱۹۹۰ء میں سبکدوش ہوکر ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ ان کی تقریباً دو درجن کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں 'نئی علامت نگاری'، 'مرثیے کی سماجیات' کے علاوہ 'جدید ناول کا فن' اور 'اردو افسانے کی نئی تنقید' بے حد مقبول ہوئیں۔ انہوں نے کئی رسالے 'شب رنگ' اور 'اندازے' بھی اپنی ادارت میں شائع کئے اور عالمی سیمیناروں میں شرکت کے لئے لندن، فرانس، تاشقند، قطر اور پاکستان کا سفر کئے۔

....

● معروف شاعر و ادیب **سید رؤف خلش** (ولادت: ۴؍جنوری ۱۹۴۱ء، ولد داؤد گتہ دار مرحوم) کا انتقال ۲؍جنوری ۲۰۲۰ء کو بعد مغرب ہوگیا۔ نماز جنازہ ۳؍جنوری کو بعد نماز جمعہ مسجد گلزار نزد مرکزی انجمن مہدویہ جدید ملک پیٹ، حیدرآباد میں ادا کی گئی اور تدفین مسجد محی الدین النساء جدید ملک پیٹ سے متصل قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے مکرم نیاز (اسسٹنٹ ایگزیکیٹو انجینئر محکمہ عمارات وشوارع) اور معظم راز (سرویئر سروے آف انڈیا) اور بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی کتابیں 'صحرا صحرا اجنبی'، 'شاخ زیتون'، 'شاخسانہ'، 'تلخیص ابن الوقت'، 'حکایت نقد جاں کی'، 'نئی رتوں کا سفر' وغیرہ منظر عام پر آکر پذیرائی حاصل کرچکی ہیں۔

....

● معروف براڈکاسٹر، شاعر اور صحافی **عبید صدیقی** (ولادت: ۱۹۵۷ء، میرٹھ) کا انتقال ۹؍جنوری ۲۰۲۰ء کی صبح یشودھا اسپتال غازی آباد میں ہوگیا۔ ۱۰؍جنوری کو بعد نماز جمعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی قبرستان میں تقریباً ۲؍بجے دن میں مدفون ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز آکاش وانی سری نگر سے کیا اور مئی ۱۹۸۸ء میں ان کا تقرر بی بی سی لندن کی اردو سروس میں ہوگیا۔ وہاں ۱۹۹۶ء تک بطور اناؤنسر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ لندن سے واپسی کے بعد انہوں نے این ڈی ٹی وی

جوائن کیا اور میگزین ایڈیٹر کے بطور کام کیا۔ ۲۰۰۴ء میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے ایم سی آر سی شعبے میں بطور پروفیسر وابستہ ہوئے۔ ان کا شعری مجموعہ ''رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعہ کا مقدمہ ممتاز شاعر پروفیسر شہریار نے لکھا۔ پسماندگان میں ایک بیٹی ہے۔

● ہندی کے معروف ادیب، شاعر اور مارکسی مفکر **ڈاکٹر کھگیندر ٹھاکر** (ولادت: ۹؍ستمبر ۱۹۳۷ء، گوڈا، جھارکھنڈ) کا انتقال ۱۳؍جنوری ۲۰۲۰ء کو پٹنہ میں ہوگیا۔ ان کی رحلت سے ہندی ادب میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تنقید کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح اور شاعری کے حوالے سے اہم ادیب و شاعر تسلیم کئے جاتے تھے۔ وہ پروگریسیو رائٹر ایسوسی ایشن کے قومی صدر بننے والے سینئر رکن تھے اور سابق جنرل سکریٹری بھی تھے۔ وہ 'جن شکتی' کے ایڈیٹر بھی رہے اور انہوں نے تقریباً دو درجن کتابیں بھی تصنیف کیں۔ وہ باباناگ ارجن سے بھی بے حد قریب تھے۔

● معروف ادیب **ڈاکٹر صاحب علی** (ولادت: ۲۱؍فروری ۱۹۶۳ء یوپی) کا انتقال ۲۴؍جنوری ۲۰۲۰ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوگیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے کیریئر کا آغاز ممبئی یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے کیا۔ سابق صدر شعبۂ یونیورسٹی ممبئی یونیورسٹی کی تقریباً ایک درجن کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں جن میں ''قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فن''، ''رانی کیتکی کی کہانی'' اہم ہیں۔

● جامعہ رحمانی مونگیر کے سابق استاد حدیث اور آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ کے رکن تاسیسی **مولانا صغیر احمد رحمانی** کا انتقال ۲۶؍جنوری ۲۰۲۰ء کو عین مغرب کی نماز کے وقت ان کے آبائی گاؤں محرم پور جدیا ضلع سوپول بہار میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوگیا۔ وہ تقریباً ۸۷؍سال کے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی کے علاوہ پوتے پوتیاں، نواسے نواسیوں سے بھرا پرا خاندان ہے۔ نماز جنازہ ۲۷؍جنوری کو بعد نماز عصر مولانا جمیل نے پڑھائی اور نمناک آنکھوں سے مقامی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ وہ تقریباً ۴۰ برسوں تک جامعہ رحمانی میں استاد تھے۔ طویل مدت تک امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے دست بازو رہے۔ وہ اچھے خطیب بھی تھے۔ مرحوم مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا ضلع دربھنگہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا اور اپنی محنت جدوجہد سے پورے علاقے کو فیض پہنچایا اور ان کے شاگردوں میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مولانا ڈاکٹر دبیر عالم قاسمی، مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی وغیرہ ہیں۔

● سابق وزیر حکومت بہار **ڈاکٹر عبدالغفور** ایم ایل اے (ولادت: ۵؍مئی ۱۹۵۹ء) کا ۲۸؍جنوری ۲۰۲۰ء کی صبح دہلی کے وسنت کنج کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ عرصے سے جگر کے مرض میں مبتلا تھے۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی نماز جنازہ ۲۹؍جنوری کو دن کے دو بجے ان کے آبائی گاؤں بوہروا، سہرسہ میں سرکاری اعزاز کے ساتھ ادا کی گئی اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم نے پروفیسر کلیم عاجز کے زیر نگرانی بعنوان عبدالستار: بحیثیت ناول نگار ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور ۱۹۸۲ء میں پاروتی سائنس کالج مدھے پورہ میں بطور لیکچرار بحال ہوئے۔ وہ سہرسہ ضلع کے مہیشی اسمبلی حلقہ سے چار بار ایم ایل اے رہے۔

● معروف ساجی شخصیت جناب **اظہار کریم انصاری ایڈوکیٹ** (عمر تقریباً ۷۵ر سال، اردو بازار، نیم چوک، دربھنگہ) کا ۴ر فروری ۲۰۲۰ء کو صبح ۶ر بجے ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی اہلیہ کا انتقال چند ماہ قبل ہو چکا تھا۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں جو ایک لندن اور دوسری رانچی میں ہیں۔ مرحوم آخری دنوں میں اپنی زندگی تنہا گزار رہے تھے اور صاحب فراش تھے۔ ان کے کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ۸۰-۸۵ کے دہے میں آر ایس ایس کے مقابلے انہوں نے راشٹریہ مسلم مورچہ بنایا اور گرین ہاف پینٹ، وہائٹ شرٹ پہنا کر ملت کالج کے پیچھے ٹریننگ کراتے رہے۔ یہ سلسلہ عرصہ تک رہا۔ ساجی کاموں میں پیش پیش رہتے۔ شہر کے معززین کے ہمراہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نیا کرنے کی سوچ رکھتے۔ گھر پر اہلیہ محترمہ شکیلہ خاتون جو شکیلہ باجی کے نام سے معروف تھیں وہ ٹیلرنگ، پینٹنگ کا کورس چلاتیں جس سے قوم وملت کی بچیوں نے کافی استفادہ کیا۔ مرحوم نے اس محلے میں ممتاز صحافی کلدیپ نیر کو سینئر صحافی اے یو آصف کے توسط سے بلوایا اور ایک جلسہ منعقد کرایا۔ اس کے بعد وہ عرصہ تک نئی دہلی میں مقیم رہے۔ مرحوم اظہار کریم انصاری شہر کے سینئر ایڈوکیٹ آئی آر بسل کے ساتھ عرصے تک پریکٹس کرتے رہے۔ اسی روز بعد نماز مغرب ان کی تدفین عمل میں آئی۔

....

● معروف صحافی، ساجی خدمتگار اور قومی اقلیتی مالیاتی وترقیاتی کارپوریشن، حکومت ہند کے سابق چیئرمین **قاری میاں محمد مظہری** کا انتقال تقریباً ۷۶ر سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ۶ر فروری ۲۰۲۰ء کو شام ۴ر بجے ہوگیا۔ وہ صحافی کے ساتھ ساتھ اسلامی اسکالر بھی تھے۔ مرحوم کی تدفین ۷ر فروری کو بعد نماز جمعہ دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ انہوں نے ماہنامہ 'قاری' اور ہفت روزہ 'سیکولر قیادت' بھی نکالے۔

....

● ممتاز عالم دین اور جامعہ ابن تیمیہ، چندن بارہ، موتیہاری، بہار سمیت کئی معروف اداروں کے موسس **ڈاکٹر محمد لقمان سلفی** (عمر تقریباً ۸۷ر سال) کا انتقال ۵ر مارچ ۲۰۲۰ء کو طویل علالت کے بعد سعودی عرب کے شہر ریاض میں ہوگیا۔ تدفین سعودی عرب میں ہوئی۔ مرحوم کی رحلت دین و دعوت علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے شعبے کا عظیم نقصان ہے۔ دعوت وارشاد، تصنیف وتالیف اور تحقیق کے میدان میں ان کے کارہائے نمایاں روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے کاموں کا دائرہ بیحد متنوع اور وسیع وعریض ہے۔ مرحوم نے تن تنہا وہ خدمات انجام دیں جن کے لئے اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی بہترین خدمات کے نتیجہ میں ایک پوری نسل فیض یاب ہو رہی ہے اور فیض یابی کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

....

● **علامہ اسرار جامعی** (اصل نام: سید شاہ محمد اسرار الحق، ولادت 11 اگست 1938، وفات 4 اپریل 2020 بمقام ذاکر نگر، نئی دہلی) طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں زندگی کی ناہمواریوں کے خلاف ہمدردانہ شعور سے کام لیتے تھے اور فنکارانہ عرق ریزی کا ثبوت دیتے تھے۔ انسان اور سماج کے درمیان بنتے بگڑتے رشتوں کی واضح تفہیم ان کی شاعری میں ملتی ہے اسی لئے اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ایسی وابستگی

پر دردمندی کا اثر سامنے آنا فطری ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے شفیع الدین نیر سے اصلاح لی تھی لیکن باضابطہ طور پر وہ رضا نقوی واہی کے شاگرد تھے۔ اخبار ''چٹنی'' اور ''پوسٹ مارٹم'' کے ذریعہ انہوں نے طنزیہ و مزاحیہ صحافت میں اپنا حصہ درج کرالیا ہے۔ 1996ء میں شائع ان کے شعری مجموعہ ''شاعر اعظم'' نے بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ویسے عمر کے آخری پڑاؤ میں جامعہ نگر نئی دہلی کے علاقہ میں وہ ہر محفل اور ہر مجلس میں شریک ہوتے تھے اور چھوٹے چھوٹے پرزہ پر حالات حاضرہ پر ایک دو اشعار لکھ کر وہاں موجود لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ان کی سادگی اور سادہ لوحی بھی لوگوں کو متوجہ کرتی تھی۔ موصوف کا تعلق زمین دار گھرانے سے تھا۔ شاہو بیگھا موجودہ نالندہ ضلع ان کا وطن تھا۔ سبزی باغ اولڈ کافی ہاؤس پٹنہ ان کا ہی تھا۔ ان کے بھائیوں نے انہیں کسی طرح بے دخل کر دیا اور وہ پوری زندگی پریشان حال رہے۔ معروف ترقی پسند شاعر ادیب اور بانی پرنسپل کریم سٹی کالج جمشید پور سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔ 29-30 مارچ 2007ء میں مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں این سی پی یو ایل اور مانو ریجنل سنٹر دربھنگہ کے اشتراک سے جب میں نے دو روزہ قومی سیمینار اور عالمی مشاعرہ کا انعقاد زیر صدارت احمد فراز ہوا تو انہیں بھی بحیثیت شاعر مدعو کیا۔ اس تاریخی مشاعرہ میں انہوں نے جو قطعہ پیش کیا وہ اس طرح ہے:

اے جناب فاطمی و اے وزیر محترم — کہہ رہا ہے جامعی جو غور سے سن جائیے
اس نگر کا ایک پل جو خودکشی کرنے کو ہے — جس قدر ہو جلد ممکن آپ اسے بنوائیے

....

● **ڈاکٹر شاہ تحسین احمد** (ولادت یکم دسمبر ۱۹۵۰ء، خلف پروفیسر شاہ مقبول احمد آبائی وطن پچنا ضلع شیخ پورہ) کا انتقال ویلزلی کولکاتا والے مکان میں ۲۵/اپریل ۲۰۲۰ء کی صبح ۵ بج کر ۵۰ منٹ پر ہو گیا۔ اسی روز ۳/ بجے سہ پہر ۲-نمبر گورِغریباں (گوبرا) قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم نیک اور شریف النفس انسان تھے۔ وہ ایک اچھے اور ہمدرد معالج اور ریڈیولوجسٹ تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں۔ گزشتہ سال انہوں نے اپنے بنیا پوکر والے فلیٹ میں ایک نشست 'چٹ-چیٹ' کے نام سے کی تھی جس میں پروفیسر منصور عالم، ظہیر انور، پروفیسر جیلانی، پروفیسر غلام سرور، اشرف احمد جعفری، ڈاکٹر شفیع الرحمٰن، ڈاکٹر نوشاد مومن، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر مظہر قادری وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ وہ اپنے والد بزرگوار پر کچھ ادبی پراجیکٹ شروع کرانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر تحسین احمد اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں تقریباً ۷/سال ایران میں مقیم رہے۔ والد کے بلاوے پر واپس کولکاتا آ گئے۔ ان کی سسرال دائرہ بہار شریف تھی۔ اشرف جعفری صاحب ان کے والد کی تخلیقات کو جمع کر کے ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں جس کے لئے مجھ سے بھی انہوں نے رائے لکھوائی ہے۔

....

● جے این یو کی بایو کیمسٹری کی معروف پروفیسر **ڈاکٹر نجمہ ظہیر باقر** (ولادت: ۱۱/اگست ۱۹۴۰ء، والدین ممتاز پسند ادیب اور ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر و رضیہ سجاد ظہیر مرحومین مقیم بسنت کنج دہلی) کا ۲۸/اپریل ۲۰۲۰ء کو تین بجے دن طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ بعد نماز عشاء تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں اکلوتی بیٹی سیما باقر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ ہیں۔ مرحومہ کے خاوند علی باقر کا انتقال قبل ہو چکا تھا۔ سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر کی چار بیٹیوں میں پروفیسر

نجمہ ظہیر باقر بڑی تھیں۔ دوسری ڈاکٹر نسیم ظہیر بھاٹیا، تیسری نادرہ ظہیر ببر اور چوتھی نور ظہیر گپتا جنھوں نے چند دنوں پہلے بی بی سی کے یاور عباس سے نکاح کیا ہے۔ دو ہفتہ قبل ان کی دوسری بہن ڈاکٹر نسیم ظہیر بھاٹیا کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔

....

● نامور فلمی اداکار **عرفان** (اصل نام: صاحبزادہ عرفان علی خان، ولادت: ۷؍جنوری ۱۹۶۷ء، ٹونک، راجستھان) کا انتقال ۲۹؍اپریل ۲۰۲۰ء کو کولون (بڑی آنت) کے انفیکشن کے باعث ہو گیا۔ پیٹ کے انفیکشن کے بعد انہیں کوکیلا بین دھیرو بھائی امبانی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کے جسدِ خاکی کو اسپتال سے سیدھے وارسووا کے قبرستان لے جایا گیا اور ۳؍بجے ان کی آخری رسوم ممبئی ورسووا قبرستان میں ادا ہوئی۔ پسماندگان میں ستا پاسکدرا اور دو بیٹے عیان اور بابل ہیں۔ عرفان نے ٹیلی ویژن اور تھیٹر سے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعدازاں وہ ۱۹۸۸ء کی فلم 'سلام بومبے' میں مختصر کردار کے لیے جلوہ گر ہوئے اور یہی سے ان کے فلمی کیریئر کا آغاز ہوا۔ وہ اپنے کیریئر میں 'حاصل'، 'مقبول'، 'لائف ان اے میٹرو'، 'دی لنچ باکس'، 'حیدر'، 'پیکو'، 'تلوار' اور 'ہندی میڈیم' جیسی کامیاب فلموں میں جلوہ گر ہوئے۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں بھارتی نیشنل ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ جیسے اعزازات بھی حاصل کیے۔ ان کی آخری فلم 'انگریزی میڈیم' رواں سال ریلیز ہوئی تھی جس میں تجزیہ کاروں اور مداحوں نے عرفان کے کام کو خوب سراہا۔ عرفان بالی وڈ کے ساتھ ساتھ ہالی وڈ فلموں میں بھی جلوہ گر ہوئے، انہوں نے 'سلم ڈاگ ملینیئر'، 'لائف آف پائے'، 'دی امیزنگ اسپائیڈر مین' اور 'جریسک ورلڈ' جیسی نامور ہولی ووڈ فلموں میں کام کیا۔

....

● ہندی سنیما کے سرکردہ اداکار **رشی کپور** (ولادت: ۴؍ستمبر ۱۹۵۲ء، ممبئی) کا انتقال سرطان کے عارضہ سے ۳۰؍اپریل ۲۰۲۰ء کو ممبئی کے سر ایچ ایم ریلائنس فاؤنڈیشن ہسپتال میں ہو گیا۔ آخری رسومات اسی دن ممبئی کے چندن واڑی شمشان گھاٹ میں ادا کی گئیں۔ پسماندگان میں اہلیہ نیتو سنگھ، بیٹا رنبیر کپور اور بیٹی ردھیما کپور ہیں۔ آنجہانی بہترین اداکار اور ہمہ جہت خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ اداکار کے ساتھ ساتھ فلمساز اور ڈائرکٹر بھی تھے اور بطور اطفال فنکار کے بھی انہوں نے فلموں میں کام کیا تھا۔ انہیں ان کی پہلی فلم 'بابی' میں شاندار اداکاری کے لئے ۱۹۷۱ء میں قومی فلم اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ وہ طویل عرصے تک فلمی شائقین کے دلوں پر چھائے رہے۔

....

● **کامریڈ ہارون بی اے** (سابق مدیر، ماہنامہ ''بیباک'' مالیگاؤں) کا ۱۰؍مئی ۲۰۲۰ء کو ساڑھے دس بجے صبح انتقال ہو گیا اور تدفین ظہر بعد عمل میں آئی۔ اسے اتفاق کہیے کہ گزشتہ ۹؍مئی کو رات کے ساڑھے نو بجے ''بیباک'' مالیگاؤں کے موجودہ مدیر احمد عثمانی بھی چل بسے تھے۔ دونوں میں ایسی قربت تھی کہ ہارون بی اے نے اپنی ضعیفی کی وجہ سے رسالہ ''بیباک'' احمد عثمانی کے حوالے کر دیا تھا اور وہ اسے پابندی سے شائع کر رہے تھے۔ ترقی پسندیت کا ترجمان یہ ماہنامہ بیحد مقبول تھا۔ احمد عثمانی بنیادی طور پر ناول نگار اور افسانہ نویس تھے۔ ہارون بی اے کمیونسٹ پارٹی کے بیحد سرگرم رکن تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ صحافت میں گزرا۔ مالیگاؤں میں سب سے بڑی لائبریری 'اپیکس لائبریری' انہوں نے ہی قائم کی تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سابق سکریٹری اور ترقی پسند مصنفین مالیگاؤں کے اہم رکن تھے۔

دونوں ادبی شخصیتوں کے انتقال سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ واضح ہو کہ احمد عثمانی کو گھر کے تمام افراد کے ساتھ کورونا وائرس ہو گیا تھا۔ پانچ دن قبل ان کے بڑے فرزند اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کی اہلیہ اور دو فرزند ہیں۔

....

● **پروفیسر شاہد احمد یحییٰ** (ولادت: میٹرک کی سند کے مطابق ۶ر فروری ۱۹۴۴ء، اصل ۱۹۳۸ء، بمقام چنسورہ، ضلع ہگلی خلف جناب عبدالخالق خلیق مرحوم مقام نظر احمد آباد، نہرا، دربھنگہ) کا انتقال ۱۱رمئی ۲۰۲۰ء بروز اتوار صبح چار بج کر پندرہ منٹ پر بانگور اسپتال کولکاتا میں ہو گیا۔ تدفین ۱۲رمئی کو سولہ آنہ قبرستان، کولکاتا میں عمل میں آئی۔ مرحوم بیحد خلیق اور ملنسار تھے۔ وہ جے این کالج نہرا، دربھنگہ میں صدر شعبۂ اردو کے ساتھ ساتھ انچارج پرنسپل بھی رہے اور وہیں سے ۲۰۰۴ء میں عزت و افتخار کے ساتھ سبک دوش ہوئے۔ ان کی اہلیہ عترت فاطمہ کا انتقال ۲۰۰۶ء میں ہوا۔ اسی سال ان دونوں حج بیت اللہ سے مشرف بہ دید ہوئے تھے۔ مرحوم ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گاؤں میں سماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگے اور سادگی سے زندگی گزارتے۔ پسماندگان میں ایک بیٹا احتشام شاہدی اپنی اہلیہ آمنہ کے ساتھ ابوظہبی میں وزارت دفاع میں انگلش ایڈیٹر کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ بڑی بیٹی پروین شاہدی اپنے شوہر سید عسکری اختر کے ساتھ باندرا، ممبئی میں ہیں جبکہ چھوٹی بیٹی شیریں شاہدی اپنے شوہر مختار عالم کے ساتھ کولکاتا میں ہیں۔ مرحوم اہلیہ کی رحلت کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ دوبئی یا پھر اپنی چھوٹی بیٹی کے یہاں کولکاتا رہتے۔ جب اپنے وطن آتے تو نظرا محمد آباد اور محلہ شاہ سوپن میں قیام کرتے۔ ادھر چند ماہ سے علیل چل رہے تھے۔ انہیں رعشہ، الزائمر اور جسم میں سوڈیم کی کمی تھی۔ کولکاتا میں ان کا علاج چل رہا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائیوں میں پروفیسر شاکر خلیق (دربھنگہ)، پروفیسر شائق احمد یحییٰ (امریکہ) ہیں۔ مرحوم نے ۱۹۹۸ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے پروفیسر شاکر خلیق کی نگرانی میں بعنوان ''عبدالخالق خلیق: حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی۔

....

● معروف سماجی و ادبی شخصیت ایڈووکیٹ ڈاکٹر **نرگس جہاں باروی** (عمر تقریباً ۷۰ سال) کا انتقال ۷رمئی ۲۰۲۰ء کو دہلی کے ویدانتا اسپتال میں شام کے ساڑھے چھ بجے ہو گیا۔ وہ طویل عرصے سے صاحب فراش تھیں۔ وہاں سے ان کا جسد خاکی ان کے آبائی وطن بارو، بیگوسرائے لایا گیا جہاں انہیں ۱۸رمئی ۲۰۲۰ء کو نمناک آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا سیّد محمد طارق حسین، امریکہ میں ماہر امراضِ قلب ہے اور ایک بیٹی نصرت جہاں دہلی میں ایڈووکیٹ ہے۔ مرحومہ خواتین کو با اختیار اور خود کفیل بنانے کی سمت میں ہمیشہ کوشاں رہتیں اور اسی تعلق سے وہ کئی نمائندہ تنظیموں سے بھی منسلک رہیں۔ وہ بہار رابطہ کمیٹی، فلیم، باجی اور کئی اہم تنظیموں سے وابستہ تھیں اور وہ پٹنہ ہائی کورٹ میں بطور وکیل پریکٹس بھی کرتی تھیں نیز ادب سے بھی اپنا رشتہ گہرا رکھا۔ وہ افسانہ نگار بھی تھیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''دہلیز'' منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ ان کے مضامین دیگر رسائل اور اخبارات کے ساتھ ساتھ اردو جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ میں بھی شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے ڈاکٹر کلیم عاجز کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی۔ ان کے خاوند سیّد محمد نہال حسین محکمہ مردم شماری میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔

....

● معروف عالم دین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند **مفتی سعید احمد پالن پوری** (ولادت: ۱۹۴۰ء، کالیٹر، کانٹھا، شمالی گجرات) کا انتقال پھیپھڑوں میں پانی سرایت کر جانے کے سبب ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء کی صبح جوگیشوری، ممبئی کے ایک اسپتال میں ہوگیا۔ مرحوم کی تدفین اوشیورہ قبرستان، جوگیشوری ویسٹ ممبئی میں ہوئی۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں اور دس بیٹے ہیں۔ مرحوم ملک اور بیرون ملک اپنی لیاقت اور حدیث میں اختصاص کی وجہ سے جداگانہ شناخت رکھتے تھے۔ وہ دارالعلوم اشرفیہ، راندیڑ (سورت) میں مدرس ہوگئے پھر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن ہوئے اور تا حیات دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تقریباً ۴۷؍برسوں تک دیوبند میں اپنی خدمات انجام دیں۔ دارالعلوم میں مختلف فنون کی کتابیں پڑھانے کے ساتھ مفتی صاحب کی ترمذی شریف اور طحاوی کے اسباق طلباء میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی فقہی مہارت کی وجہ سے دارالافتاء دارالعلوم کے خصوصی بنچ میں ان کا نام نمایاں طور پر شامل ہوا۔ انہوں نے تصنیف و تالیف میں بھی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجموعہ 'فتاویٰ امدادالفتاویٰ' پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ مرحوم تقریباً ۱۲؍کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے کئی دارالعلوم سمیت مختلف دینی مدارس میں شامل نصاب ہیں۔

....

● ممتاز طنز و مزاح نگار پدم شری **مجتبیٰ حسین** (ولادت ۱۵؍جولائی ۱۹۳۶ء، بمقام گلبرگہ) کا ۲۷؍مئی ۲۰۲۰ء کی صبح ۸:۴۵؍ بجے ان کے بڑے فرزند ہادی حسین انجینئر کی قیام گاہ پر انتقال ہوگیا۔ نمازِ جنازہ اسی روز بعد نمازِ عصر مسجد فرمان واڑی عابڈس میں ادا کی گئی اور تدفین مسجد سے متصل قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انہیں طنز و مزاح نگاری کا ذوق تھا جس کی تکمیل کے لیے روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوگئے اور وہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے محکمہ اطلاعات میں ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۲ء میں دلی میں گجرال کمیٹی کے ریسرچ شعبہ سے وابستہ ہوگئے۔ دلی میں مختلف محکموں میں ملازمت کے بعد ۱۹۹۲ء میں سبکدوش ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین ملک کے پہلے طنز و مزاح کے ادیب ہیں جن کو حکومت نے بحیثیت مزاح نگار پدم شری کے باوقار اعزاز سے نوازا۔ مجتبیٰ حسین کے مضامین پر مشتمل ۲۲؍ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی ۷؍کتابیں ہندی زبان میں شائع ہوئیں۔ جاپانی اور اڑیہ زبان میں بھی ایک ایک کتاب شائع کی گئی۔ انہیں ۱۰؍ سے زائد ایوارڈز حاصل ہوئے جن میں غالب ایوارڈ، مخدوم ایوارڈ، کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ، جوہر قریشی ایوارڈ اور میر تقی میر ایوارڈ شامل ہیں۔ ان کی طویل خدمات کے اعتراف میں کرناٹک کی گلبرگہ یونیورسٹی نے انہیں ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ مجتبیٰ حسین کے انتقال کی خبر سے ملک کے ادبی و صحافتی حلقوں میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مختلف ادبی، سماجی اور دیگر تنظیموں سے وابستہ اہم شخصیات مجتبیٰ حسین کی خدمات کو یاد کر کے انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کر رہی ہیں۔ حسن چشتی اور صفدر امام قادری صاحبان نے ان کے فن پر کتابیں ترتیب دی ہیں۔

....

● جدید لب و لہجہ کے نمائندہ شاعر اور ادیب **رفیق جعفر** (عمر تقریباً ۷۵؍سال) کا ۳۱؍مئی ۲۰۲۰ء بوقت دوپہر پونا میں انتقال ہوگیا۔ اسی روز ان کی تدفین ممبئی میں عمل میں آئی۔ رفیق جعفر حال کے تناظر میں پوری توانائی سے اپنی

تخلیقات کے ذریعہ معنویت کالوہا منوانے میں کامیاب تھے۔ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور بیشتر ادبی رسالوں میں وہ مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔موضوعاتی ،لفظیاتی اور معنوی اعتبار سے وہ اپنی تحریر سے طرب ناکی اور سحر انگیزی پیدا کرنے میں کامیاب تھے۔ان کی تحریر میں واقعات واحوال کا نقش جابجا بکھرا نظر آتا ہے۔مرحوم رفیق جعفر فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ٹیکنیکل کاموں میں مہارت رکھتے تھے۔اسکرپٹ رائٹنگ اور ڈبنگ میں بھی انہیں مہارت تھی۔

....

● **ڈاکٹر آصف اسلم فرخی** (ولادت:۱۶رستمبر ۱۹۵۹ء ولد اسلم فرخی) کا انتقال یکم جون ۲۰۲۰ء کوکراچی پاکستان میں ہوگیا۔مرحوم پیشہ سے معالج تھے لیکن اردو کے آدمی تھے اور اردو کی ترویج واشاعت میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔خاکہ نگار مدرس محقق بھی تھے کیونکہ یہ خوبیاں ان کے والد اسلم فرخی مرحوم سے وابستہ تھیں لیکن آصف فرخی کی شہرت فکشن نگار، مترجم ،مدیر اور ناشر کی حیثیت سے تھی۔ان کا شمار پاکستان میں ادبی سیمینار اور فیسٹیول کرانے والوں میں ہوتا تھا۔''دنیازاد' کے نام سے ایک منفرد رسالہ نکالا تھا اور شہرزاد کے نام سے انہوں نے پبلشنگ ہاؤس بھی شروع کیا تھا۔ان کے انتقال سے اردو ادب میں ایک خلا ضرور پیدا ہوا ہے جس کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔مرحوم اپنی مختصر کہانیوں اور مضامین کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ان کی مختصر کہانیوں کے ۷رمجموعے اور مضامین کے ۲رمجموعے شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے مشہور ادبی شخصیات کی تحریروں کے تراجم بھی کیے۔منٹو پر تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔آصف فرخی مرحوم نے پاکستانی ادیبوں کی ایک اینتھولوجی بھی ترتیب دی تھی جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔مرحوم موصوف کی تحریریں 'ڈان' اور دیگر انگریزی روزناموں کے علاوہ رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں ''تمغۂ امتیاز'' سے بھی نوازا تھا۔مرحوم کے آباواجداد کا تعلق فرخ آباد، یوپی سے تھا جب کہ ان کی نانیہال ڈپٹی نذیر احمد کے کنبہ میں تھی۔

....

● گنگا جمنی تہذیب کے اہم ستون اور نبیرۂ داغ دہلوی کہے جانے والے قادرالکلام شاعر **آنند موہن زتشی گلزار دہلوی** (ولادت:۱۹۲۶ء بمقام محلہ کشمیریان، پرانی دلّی) کا کووِڈ-19 سے صحت یاب ہونے کے پانچ دن بعد ۱۲رجون ۲۰۲۰ء کو سہ پہر میں ان کی رہائش گاہ (نوئیڈا) میں حرکتِ قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا۔آنجہانی ۹۴رسال کے تھے۔وہ حکومت ہند کے اردو رسالہ ''سائنس کی دنیا'' کے مدیر بھی رہے۔دہلی میں مشترکہ تہذیب وثقافت کی وہ آخری کڑی تھے اور اردو کاز کے لئے وہ ہمیشہ مستعد رہے۔تاریخ کے صفحات میں وہ ہمیشہ زندہ اور محفوظ رہیں گے۔

....

● اردو کے معروف ادیب اور محقق **مظہر محمود شیرانی** (ولادت ۹راکتوبر ۱۹۳۵ء) کا ۱۲رجون ۲۰۲۰ء کولاہور پاکستان میں انتقال ہوگیا۔مرحوم نامور شاعر اختر شیرانی کے بیٹے تھے۔وہ کئی کالجوں میں فارسی کے استاد رہے۔اکتوبر ۱۹۹۵ء میں ڈگری کالج ،شیخوپورہ (پاکستان) سے پروفیسر وصدر شعبہ فارسی کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔انہوں نے خاکہ نگاری بھی کی اور خاکوں کے ۴رمجموعے شائع ہوئے۔

....

● **جمال ہاشمی** (اصل نام: عطاء الحق ہاشمی ولد اسرار الحق گیندا بابو، دھمواڑہ، دربھنگہ، ولادت:۱۵راکتوبر ۱۹۴۸ء) کا

انتقال ۷ار جون ۲۰۲۰ء کوشام ۷ ر بجے اپنی رہائش جعفر آباد، دہلی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ دوسرے روز ۱۸ر جون کو ۹ ر بجے صبح جعفر آباد قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم ہمدرد دواخانہ غازی آباد سے برسوں قبل سبکدوش ہو کر جعفر آباد میں مقیم تھے۔ جدید لب ولہجہ میں ستھری شاعری کرتے تھے۔ ان کا شعر دیکھیے:

صداقت، شرافت، محبت، خلوص   ہواؤں کی زد پر ہے گھر ریت کا

جمال ہاشمی کی تحریریں ''تمثیل نو'' دربھنگہ اور دیگر رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ موصوف کے اعزاز میں ۱۹۸۷ء کے آس پاس ڈاکٹر امام اعظم صاحب نے اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں ایک ادبی نشست کا انعقاد بھی کیا تھا جس میں کئی اہم شعراء نے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر کے خطوط کے مجموعہ ''چٹھی آئی ہے'' (مرتبہ: شاہد اقبال، کولکاتا) میں جمال ہاشمی کا خط شامل ہے۔

....

● معروف ٹی وی کمپیئر اور اداکار **طارق عزیز** (ولادت: ۲۸ر اپریل ۱۹۳۶ء، جالندھر، بھارت) کا انتقال ۱۷ر جون ۲۰۲۰ء کو لاہور، پاکستان میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ہو گیا۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے کئی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے، شاعری بھی کی۔

....

● عربی کے نامور اسکالر ڈاکٹر **ولی اختر ندوی** (پروفیسر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، وطن: موضع بھکورہر، بیر گینیا بلاک، ضلع سیتامڑھی، بہار) کا انتقال ۲۰ر جون ۲۰۲۰ء کو جنوبی دہلی کے ابوالفضل میں واقع الشفاء اسپتال میں انتقال ہو گیا اور اسی روز ساڑھے دس بجے شب جامعہ نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے عربی زبان وادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں اور متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔ مرحوم عربی گرامر کے اسکالر تھے۔ وہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ معروف عالم دین مولانا تسلیم خاں رحمانی کے پوتے اور مولانا امان اللہ خاں فیضی کے دوسرے فرزند تھے۔ انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے عربی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ مرحوم کو تعلیمی میدان میں نمایاں کارکردگی کے اعتراف میں سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے اعزاز سے بھی نوازا تھا۔ وہ جب بھی اپنے وطن آتے تو اپنے گاؤں میں سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور علاقے کے فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے۔

....

● جدید لب ولہجہ کے معروف افسانہ نگار اور ادیب **ڈاکٹر اکرام باگ** (ریٹائرڈ استاد کھوباڈگری کالج بسوا کلیان ضلع بیدر، کرناٹک عمر تقریباً ۷۵ر سال) کا ۲ر جولائی ۲۰۲۰ء کو صبح ۵ ر بجے اپنی رہائش بسوا کلیان بیدر میں انتقال ہو گیا اور اسی روز قدیم قبرستان بسوا کلیان درگاہ حضرت تاج الدین شیر سوار میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہے۔ ان کی رحلت سے جنوبی ہند کے ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مرحوم اکرام باگ کے دو افسانوی مجموعے ''کوچ'' اور ''اندوختہ'' شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پزیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی

فن اور شخصیت پر کئی یونیورسیٹیوں سے پی ایچ ڈی بھی ہو چکی ہے۔ مرحوم علامتی افسانے لکھتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کی جو لہر آئی اس کی ایک اہم آواز اکرام باگ بھی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت جلد وہ منظر نامے سے غائب ہو گئے اور گزشتہ تین دہائیوں سے ان کے افسانے بہت کم نظر آئے۔ اس کی وجہ شاید یہ نظر آتی ہے کہ ان کے افسانے مبہم اور علامتی ہوا کرتے تھے جو جدیدیت کے ختم ہونے کے بعد ان کی طرف قارئین کی توجہ کم ہو گئی۔

....

● بالی ووڈ کی ممتاز کوریوگرافر **سروج خان** (اصل نام: نرملا ناگ پال، ولادت: ۲۲؍نومبر ۱۹۴۸ء، ممبئی) کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ۳؍جولائی ۲۰۲۰ء کو باندرہ، ممبئی کے گرونا نک اسپتال میں ہو گیا۔ تدفین صبح ہی ملاڈ نامی علاقے میں واقع قبرستان میں ہوئی۔ انہوں نے ۲۰۰؍سے زائد فلموں کے لئے کوریوگرافی کی۔ انہوں نے تین سال کی عمر میں 'نذرانہ' فلم میں ایک چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اواخر میں انہوں نے بیک گراؤنڈ ڈانسر کا رول ادا کیا۔ بعد میں انہوں نے کوریوگرافی کو اپنا لیا اور ۱۹۷۴ء میں فلم 'گیتا میرا نام' میں انہیں کوریوگرافر کے طور پر پہلا بڑا کام ملا۔ تین بار قومی ایوارڈ حاصل کرنے والی سروج خان کو مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کئی سال انتظار کرنا پڑا۔ ان کی کوریوگرافی والی مقبول فلموں میں مسٹر انڈیا، ناگن، چاندنی، تیزاب، تھانے دار اور بیٹا شامل ہیں۔

....

● معروف مزاحیہ اداکار **جگدیپ** المعروف سورما بھوپالی (ولادت: 29 مارچ 1939ء، داتیا، مدھیہ پردیش، اصل نام: سید اشتیاق احمد جعفری) ۸؍جولائی ۲۰۲۰ء کو اپنی رہائش گاہ باندرہ، ممبئی میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ۹؍جولائی کو جنوبی ممبئی کے مجگاؤں علاقہ میں واقع رحمت آباد قبرستان میں بعد نمازِ ظہر سپرد خاک کر دیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ، تین بیٹے اور بیٹیاں ہیں جب کہ دو بیٹے جاوید جعفری اور نوید جعفری بھی فلموں میں سرگرم ہیں۔ جگدیپ نے ۱۹۵۱ء میں بی آر چوپڑہ کی فلم 'افسانہ' سے بطور چائلڈ اداکار شروعات کی۔ ۱۹۶۸ء میں فلم 'برہمچاری' سے انہوں نے بطور مزاحیہ اداکار کے اپنی شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے تقریباً ۴۰۰؍فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

....

● معروف شاعر **فراغ روہوی** (اصل نام محمد علی صدیقی ولادت ۱۶؍اکتوبر ۱۹۵۶ء، روہ ضلع نوادہ، بہار، مقیم ۶۷؍ مولانا شوکت علی صدیقی اسٹریٹ/ کولوٹولہ اسٹریٹ کولکاتا۔۷۳) کا طویل علالت کے بعد ۱۳؍جولائی ۲۰۲۰ء کو صبح ۹؍بجے ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین بعد نمازِ عصر ۲۔نمبر گوبرا قبرستان، کولکاتا میں عمل میں آئی۔ مرحوم بنیادی طور پر شاعر اور ادبی صحافی تھے۔ ان کی ادارت میں سہ ماہی ''ترکش'' کے کئی شمارے شائع ہوئے اور ایک دیگر رسالہ ''دستخط'' (بارکپور) سے بھی وابستہ رہے۔ ماہیے اور رباعی کے حوالے سے ان کا نام زندہ رہے گا کیوں کہ ان اصناف میں ان کی کتابیں موجود ہیں اور کئی اردو اکیڈمیوں سے انہیں انعامات مل چکے ہیں۔ ویسے انہوں نے غزلیں اور نظمیں بھی لکھیں اور بچوں کے لیے شاعری بھی کی۔ ان کی شاعری میں روشنی کی صورت اس طرح ملتی ہے کہ اندھیرے کے چہرے سے وہ نجات دلانا چاہتے ہیں۔ مقصد کے حصول کے لیے وہ ہمیشہ مصروف عمل رہے اور ایک بڑے حلقہ کو اپنے ساتھ لے کر چلتے رہے۔ ان کی شاعری میں معنیاتی پھیلاؤ اور قوت کا انعکاس ضرور ملتا ہے۔

کہیں کہیں ان کے یہاں علامتی پھیلاؤ بھی ملتا ہے لیکن وسیع تر احساسی منطقوں میں اور کھلی فضا میں وہ سانس لیتے رہے۔ فراغ روہوی مخلص انسان تھے۔ ان کی رحلت سے پوری اردو آبادی سوگوار ہے۔ ان کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مشاعرہ کے بھی وہ باکمال شاعر تھے۔ ۲۰۱۵ء میں انہوں نے ''ہم نوا'' کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ کیا تھا۔

....

● معروف صحافی اور روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ کے ایگزیکیوٹو ایڈیٹر جناب **خورشید ہاشمی** (ولادت: یکم مارچ ۱۹۵۸ء، گیا) کا انتقال ۱۳؍جولائی ۲۰۲۰ء کی درمیانی شب کو تقریباً ۱۱؍بجے ہو گیا۔ واضح ہو کہ روزنامہ 'تاثیر' کے ۱۴؍جولائی ۲۰۲۰ء کا شمارہ مرحوم کی ہی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ ان کی نماز جنازہ ۱۴؍جولائی کو پٹنہ کے جامن گلی مسجد سے متصل احاطے میں پروفیسر شاہ حسین احمد نے بعد نماز ظہر پڑھائی اور تدفین شاہ گنج قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی بنیادی تعلیم مقامی مکتب اور مدرسے ہوئی اور بعد میں کالج اور یونیورسٹی تک کی ڈگریاں انہوں نے حاصل کیں۔ اردو ادب میں تحقیق کے لئے انہیں خدا بخش فیلوشپ ملی تھی۔ مرحوم تحقیق کی دنیا سے الگ ہو کر ۱۹۸۵ء میں اردو صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ایک عرصے تک روزنامہ 'قومی تنظیم' سے وابستہ رہے۔ دوردرشن اور آکاش وانی، پٹنہ سے دو دہائیوں تک وابستہ رہے۔ کچھ دنوں روزنامہ انقلاب، لکھنؤ سے بھی وابستہ رہے۔ وہ کم سخن، خوددار، منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔

....

● ملت کالج دربھنگہ کے سابق صدر شعبہ سماجیات اور انچارج پرنسپل **ڈاکٹر فخر الاسلام خان** (ولادت یکم جولائی ۱۹۳۸ء خلف مرحوم سعید خان ڈی ایس پی موضع پٹھان کبی مقیم شاہ سوپن ٹیڑھی بازار، دربھنگہ) کا ۱۶؍جولائی ۲۰۲۰ء کو طویل علالت کے بعد دن کے ساڑھے گیارہ بجے جے ایم ہاسپٹل لہریا سرائے دربھنگہ میں ہو گیا۔ ان کی تدفین اسی روز بعد نماز جمعہ پٹھان کبی (سکری) دربھنگہ میں عمل میں آئی۔ مرحوم تقریباً سات سال سے صاحب فراش تھے۔ ان کی اہلیہ کا انتقال تین سال قبل ہو چکا تھا۔ مرحوم فخر الاسلام خان اپریل ۱۹۹۸ء میں ملت کالج دربھنگہ سے بحیثیت پرنسپل سبکدوش ہوئے تھے۔ بڑے ہی باغ و بہار شخصیت کے حامل تھے۔ پسماندگان میں تین بیٹے ڈاکٹر نجیب احمد خان، ڈاکٹر نفیس احمد خان، ڈاکٹر نقیب احمد خان اور دو بیٹیاں ہیں ایف آئی خان صاحب مجلسی آدمی تھے۔ کانگریس پارٹی میں ڈاکٹر ناگیندر جھا کے ساتھ رہے نیز وہ مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ کے صدر بھی تھے۔

....

● معروف افسانہ نگار اور شاعر **حسن رہبر** (اصل نام محمد ابرار الحسن ولادت: ۱۴؍مارچ ۱۹۴۲ء مقام بھاگلپور، بہار) کا ۱۷؍جولائی ۲۰۲۰ء کو دن کے ۱۱؍بجے انتقال ہو گیا۔ مرحوم حسن رہبر مخلص اور نیک انسان تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء سے افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کے افسانوی مجموعے ''ایک پل کا فیصلہ''، ''چسکا''، ''آگے راستہ بند ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔ افسانچوں کا مجموعہ ''ہر بوند سمندر'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''بند مٹھی کا سچ'' زیر اشاعت ہے۔ نمائندہ افسانے، غزلیں اور افسانچوں کا انتخاب ''خوشبیوں کا ماتم'' بھی زیر ترتیب ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر کئی مشاہیر نے مضامین لکھے جن کو ڈاکٹر احسان عالم نے ترتیب دے کر ''حسن رہبر: ایک منفرد افسانہ نگار'' ۲۰۱۹ء

میں شائع کرائی ہے۔ حسن رہبر نہ ترقی پسند افسانہ نگار تھے اور نہ جدیدیت کو پسند کرتے تھے۔ ابہام سے دور انہوں نے افسانے لکھے۔ وہ دوست نواز تھے اور محفلوں میں شریک ہونے کو فوقیت دیا کرتے تھے۔

....

● مشہور عالم دین **مولانا محمد متین الحق اسامہ قاسمی** (ولادت: ۷/مئی ۱۹۶۷ء، فتح پور، یوپی) کا انتقال ۱۷/جولائی ۲۰۲۰ء کو شب کے ڈھائی بجے اسپتال میں علاج کے دوران ہوگیا۔ وہ کورونا سے متاثر تھے۔ ۱۸/جولائی کو کورونا پروٹوکول کے تحت صبح ساڑھے سات بجے ان کا جسد خاکی جامعہ محمودیہ اشرف العلوم، مئولایا گیا جہاں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا امین الحق عبداللہ نے جنازے کی نماز پڑھائی اور انہیں اشرف آباد قبرستان میں مدفون ہوئے۔ مرحوم جمعیۃ علماء اتر پردیش کے صدر تھے۔ ان کی رحلت سے امن و یکجہتی، اتحاد اور بھائی چارہ، خدمت خلق اور علوم دینیہ کا ایک تابناک سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

....

● مدھیہ پردیش کے گورنر، اتر پردیش کے سابق وزیر اور بی جے پی کے سینئر رہنما **لال جی ٹنڈن** (ولادت: ۱۲/اپریل ۱۹۳۵ء، چوک، لکھنؤ) کا انتقال ۲۱/جولائی ۲۰۲۰ء کی صبح ۵:۳۵ بجے طویل علالت کے بعد ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کرشنا ٹنڈن اور تین بیٹے بشمول آسوتوش ٹنڈن ہیں۔ وہ بہت دنوں سے جگر کے عارضہ میں مبتلا تھے اور لکھنؤ کے میدانتا اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ان کی آخری رسوم چوک کے گلالہ گھاٹ میں شام کو ادا کر دی گئی۔ ان کی رحلت پر ریاستی حکومت نے تین دنوں کا سوگ منایا۔ لال جی ٹنڈن کو ۲۰۱۸ء میں بہار کا گورنر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ۲۰۱۹ء میں انہیں مدھیہ پردیش کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لکھنؤ میں لال جی ٹنڈن کی مقبولیت معاشرے کے ہر طبقے میں تھی۔ وہ سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے بہت قریبی تھے۔

....

● معروف عالم دین **مولانا وصی احمد صدیقی قاسمی** (ولادت: ۱۹۴۵ء) ناظم مدرسہ چشمۂ فیض ململ، مدھوبنی کا انتقال ۲۱/جولائی ۲۰۲۰ء کو رات کے ۹/بجے ان کی رہائش گاہ پر ہوا۔ ان کی نماز جنازہ مدرسہ کے احاطے میں ان کے فرزند مولانا فاتح اقبال ندوی نے پڑھائی اور ان کے جسد خاکی کو آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں ململ، جامعہ رحمانی، مونگیر اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں ہوئی۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۵ء میں مدرسہ چشمۂ فیض، ململ کی ذمہ داری سنبھالی۔ مولانا کئی اداروں کے سرپرست تھے۔ امارت شرعیہ کے رکن اور ارباب حل وعقد تھے۔ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اور قاضی شریعت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے خاص تربیت یافتہ تھے۔ مولانا مرحوم وصی احمد صدیقی علاقے میں ایک دینی، ملّی شخصیت کے طور پر ہی نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی شخصیت کے طور پر بھی معروف تھے۔ نہایت خلیق، تحریکی شخصیت کے مالک، متواضع اور خوش مزاج عالم دین تھے۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی تعلیم و دعوت کے لئے وقف کر دیا تھا۔

....

● معروف طنز و مزاح نگار، شاعر، صحافی اور کالم نگار **نصرت ظہیر** (ولادت: ۹/مئی ۱۹۵۱ء) کا طویل علالت کے بعد اپنے آبائی وطن سہارن پور میں ۲۲/جولائی ۲۰۲۰ء کو انتقال ہوگیا اور تدفین بھی وہیں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں

بیوہ کے علاوہ چار بیٹیاں ہیں۔مرحوم ''بقلم خود''، ''تحت اللفظ'' اور ''خراٹوں کا مشاعرہ'' کے خالق اور سہ ماہی رسالہ ''ادب ساز'' کے مدیر بھی تھے۔انہیں ساہتیہ اکیڈمی ترجمہ کا ایوارڈ بھی دے چکی ہے۔مرحوم شاہین باغ نئی دہلی میں مقیم تھے لیکن ادھر اپنے آبائی وطن سہارن پور میں رہ رہے تھے۔نصرت ظہیر نے شاعری شروع کی، ساری زندگی کالم نگاری کی، انشائیہ اور طنز ومزاح نگاری کی اور صحافتی زندگی جیتے رہے۔وہ کئی اخبارات قومی آواز، راشٹریہ سہارا اور انقلاب سے وابستہ رہے۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رسالہ ''اردو دنیا'' اور ''فکر وتحقیق'' سے بھی جڑے رہے۔ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد نے ان پر ضخیم نصرت ظہیر نمبر بھی نکالا تھا اور وہ شگوفہ کے علاوہ انقلاب میں مسلسل طنزیہ کالم لکھ رہے تھے۔ان کی طنز ومزاح نگاری کی الگ انفرادیت یہ ہے کہ چبھن اور نشتر زنی کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کی شخصیت بیحد سادہ، طرح دار اور دوست نوازتھی جس کی اہم خصوصیت یہ رہی ہے کہ پہلی ملاقات اور گفتگو کے بعد وہ کسی کو بھی اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔دنیا بھر کے چھوٹے بڑے قلمکاروں سے ان کے تعلقات یکساں رہے۔دیکھنے میں وہ سنجیدہ شخصیت معلوم ہوتے تھے لیکن باغ وبہار طبیعت کے مالک تھے۔انہوں نے جتنا لکھا اور جیسا لکھا اس کے سلسلہ میں ابھی ان پر کام نہیں ہوا ہے۔انہیں یوپی اور دہلی اردو اکیڈمی سے انعامات بھی مل چکے ہیں نیز مرحوم دوردرشن اور آکاش وانی میں اپنی خدمات پیش کرتے رہے تھے۔مرحوم نہایت مخلص انسان تھے اور مجتبیٰ حسین کے بعد مزاح نگاری میں ان ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔مرحوم تقریباً ۴۰رسال قبل سہارن پور سے دہلی ہجرت کرکے آئے تھے۔انہوں نے سہارن پور کے معروف لوگوں پر خاکے بھی لکھے ہیں۔ان کے انتقال سے طنز ومزاح کی صحافت کا ایک باب ختم ہوگیا۔ان کی بے وقت موت سے ادبی، شعری اور صحافتی حلقہ سوگوار ہے۔

....

● معروف صحافی اور روزنامہ ''عکاس'' کولکاتا کے مدیر **کریم رضا مونگیری** (ولادت ۲رجنوری ۱۹۴۶ء) ۲۵رجولائی ۲۰۲۰ء کے دن پونے دس کولکاتا میں اپنی رہائش گاہ میں ابدی نیند سوگیے۔وہ کئی روز سے علیل تھے۔پسماندگان میں ایک بیٹی اور داماد ہیں۔اسی روز بعد نمازِ عصر سولہ آنہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔مرحوم بیحد خلیق اور شریف النفس انسان تھے۔انہوں نے جدوجہد بھری زندگی گزاری۔کئی اخبارات سے وابستہ رہے۔۱۹۶۶ء میں شہزاد سلیم نے ''عکاس'' نکالا اس میں مرحوم کریم رضا مونگیری شامل رہے۔۱۹۷۱ء سے باضابطہ ان کی ادارت میں ''عکاس'' نکلنے لگا۔یہ ایک زمانے میں بیحد مقبول اخبار تھا۔اس کے لیے انہوں نے کافی محنت کی۔اس کے اشتہارات بھی اپنی بدولت لاتے۔مغربی بنگال کے صحافتی حلقوں میں کافی مقبول تھے اور یہاں کی تمام ادبی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔

....

● معروف علمی اور سماجی شخصیت **ایم ٹی خاں** (اصل نام: محمد تجمل خاں۔آبائی وطن: کواتھ، آرہ) سابق رجسٹرار پٹنہ ہائی کورٹ کا انتقال ۲۵رجولائی ۲۰۲۰ء کوشب کے ساڑھے آٹھ بجے گولڈن پلازہ اپارٹمنٹ، چتکوہرا، پٹنہ میں ہوگیا۔ان کی عمر تقریباً ۷۶رسال تھی۔ان کی تدفین ۲۵رجولائی کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے چتکوہرا قبرستان میں عمل میں آئی۔پسماندگان میں بیوہ ریحانہ خانم کے علاوہ ایک بیٹا محمد سہیل (این آئی ایم آر میں سائنٹسٹ) اور بیٹی نگار خانم (دونوں شادی شدہ) ہیں۔وہ ۲۰۰۴ء میں پٹنہ ہائی کورٹ سے رجسٹرار کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے تھے۔وہ لکھنے پڑھنے

کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر انہیں کافی دسترس تھا۔ انہوں نے انگریزی میں ایک کتاب "Thought Care" کی تھی۔ وہ بندیشور پاٹھک کی تنظیم سے بھی وابستہ تھے۔ 'الرسالہ' مومنٹ میں کافی سرگرم رہے۔ نہایت مخلص انسان تھے۔

....

● معروف شاعر، ادیب **متین عمادی** (اصل نام: سید شاہ متین الحق عمادی، ولادت: ۲۶؍فروری ۱۹۴۲ء، خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، پٹنہ سٹی) کا انتقال ۲۸؍جولائی ۲۰۲۰ء کو ہوگیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشین اور ان کے عم محترم حضرت سید شاہ مصباح الحق عمادی نے خانقاہِ عمادیہ کے احاطہ میں پڑھائی اور تدفین اسی دن بعد نماز عشاء ۹؍بجے عمل میں آئی۔ مرحوم محمڈن اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے ۲۰۰۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کا سراپا خانقاہی ماحول میں گزرا۔ تصوف پر خاصا درک تھا۔ ان کا ایک مشہور شعر اس طرح ہے:

چیختی تنہائیوں کی بھیڑ ہے چاروں طرف اور تو کچھ بھی نہیں ہے خامشی کے شہر میں

....

● معروف شاعر، ادیب اور معالج **ڈاکٹر ارمان نجمی** (اصل نام ایس حسن ولادت ۱۹۳۸ء) کا ۳۰؍جولائی ۲۰۲۰ء کی صبح ان کی رہائش گاہ واقع باقر گنج پٹنہ میں انتقال ہوگیا اور نماز جنازہ اسی روز بعد نمازِ ظہر شاہ گنج قبرستان کے قریب ہوئی اور تدفین اسی قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم ڈاکٹر ارمان نجمی کے والد بزرگوار ڈاکٹر نجم الحسن مرحوم بھی ڈاکٹر تھے۔ ان کے صاحبزادے بھی ڈاکٹر ہیں۔ مرحوم منفرد اسلوب کے شاعر نیز ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے اور زندگی کا ایک اہم حصہ سعودی عرب میں گزارا تھا لیکن پھر وہ پٹنہ آکر بود و باش اختیار کر لی تھی جہاں ان کا آبائی مکان ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں حالات حاضرہ کے مسائل پر توجہ دی ہے اسی لیے پڑھتے وقت ان کی شاعری اپیل کرتی ہے۔ انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جن میں فکر کی گہرائی ہے اور نئے ٹرینڈ کی موشگافی ہے۔ وہ خاموش طبع شخصیت کے مالک تھے اور احباب نواز بھی تھے۔ ان کے کئی شعری و ادبی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ادبی حلقوں میں پزیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ انکا ایک مشہور شعر دیکھیے: میں منظروں کی شگفتہ چمک سے کیا لیتا/ کھلی فضاؤں میں مجھ کو کہاں ٹھہرنا تھا۔ دربھنگہ سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ شہر کی مشہور شخصیت اسحاق بابو مرحوم بیتنا ان کے سمدھی تھے۔ جن دنوں مظہر امام مرحوم 'امیر منزل' دربھنگہ میں ہوتے ان سے ملنے بھی آتے اور اپنے سمدھیانے بھی جاتے۔

....

● معروف ترقی پسند نقاد **ڈاکٹر افصح ظفر** (اصل نام: سید ابوالافصح ظہیر الاسلام ولادت: ۲۳؍اکتوبر ۱۹۳۳ء میٹرک کی سند کے مطابق ۵؍فروری ۱۹۳۶ء) کا انتقال ۳۱؍جولائی ۲۰۲۰ء بروز جمعہ ساڑھے پانچ بجے شام اپنی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا میں ہوگیا اور تدفین دوسرے دن یکم اگست کو گیارہ بجے دن میں کریم گنج قبرستان میں عمل میں آئی۔ جنازہ میں شہر کی معزز شخصیات کے علاوہ کثیر تعداد میں شاگردان شریک ہوئے۔ مرحوم ڈاکٹر افصح ظفر مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے شعبہ اردو سے سبکدوش تھے۔ نیز عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ ان کی اہلیہ کا انتقال پچیس سال قبل ہو چکا تھا۔ ان کی اہلیہ نور النہار افصح معروف افسانہ نگار انور عظیم کی ہمشیرہ تھیں اور دونوں ۱۹۵۹ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ مرحوم کو دو بیٹے اریب افصح اور شکیب افصح امریکہ میں ہیں اور ایک بیٹی بہارینہ

افصح بھوپال میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہیں۔ڈاکٹر افصح ظفر مرحوم ترقی پسند تحریک کے علمبردار تھے۔ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے اور انہوں نے صرف تنقید لکھی ہے اور مارکسی نظریہ کو پیش کیا ہے۔وہ اپنے ہمعصروں میں بیحد مقبول تھے اور اپنے انداز کی زندگی جینے کے عادی تھے۔ان کی تنقیدی کتابوں میں ''بساطِ نقد''، ''خرمنِ ادب'' اور ''کلچر ادب اور جنگ'' ہیں نیز انہوں نے مگدھ یونیورسٹی سے پروفیسر سید محمد حسنین مرحوم کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی بعنوان ''اکبر الہ آبادی کا سیاسی وسماجی شعور'' کیا۔یہ اس یونیورسٹی کے پہلے ڈاکٹریٹ تھے۔یہ کتابی شکل میں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئی۔وہ کل ہند ترقی پسند تحریک کے کارگزار صدر رہے۔اسی انجمن کے تحت گاہے گاہے ادبی محفلوں کا اہتمام بھی ہوا کرتا تھا۔اسی انجمن کے زیر اہتمام مرحوم کی ادبی خدمات کے اعتراف میں گیا میں جشن منانے کا پروگرام تھا لیکن کورونا اور لاک ڈاؤن کے سبب جشن نہیں ہوسکا۔

....

● راج سبھا رکن اور سابق سماج وادی پارٹی لیڈر **رام سنگھ** (ولادت:۲۷رجنوری ۱۹۵۶ء، اعظم گڑھ، یوپی) کا انتقال یکم اگست ۲۰۲۰ء کو طویل علالت کے بعد سنگاپور میں ہوگیا۔ان کے پسماندگان میں بیوہ پنکجا اور دو جڑواں بیٹیاں درشٹی اور دِشا ہیں۔آنجہانی پہلی بار ۱۹۹۶ء میں راجیہ سبھا کے رکن ہوئے۔انہوں نے کولکاتا کے سینٹ زیویر کالج سے لاء کی ڈگری حاصل کی۔اپنے سیاسی کیریئر میں وہ کئی پارلیمانی کمیٹیوں کے رکن بھی رہے اور اپنے لمبے سیاسی کیریئر میں بھی وہ کانگریس، بی جے پی اور سماج وادی پارٹی کے قریب رہے۔وہ صنعت کار سے لیڈر بنے۔ایک زمانے میں وہ سماج وادی پارٹی کے قدآور لیڈر جناب ملائم سنگھ یادو کے قریبی تھے نیز فلمی دنیا میں بھی ان کی خاصی پکڑ تھی اور امیتابھ بچن، جیا پرداجیسی فلمی ہستیوں سے لے کر انل امبانی جیسے صنعت کاروں کے ساتھ ان کے رشتے نہایت قریبی تھے۔

....

● **ڈاکٹر نجمہ کلیم** (صدر شعبہ اردو اور پروفیسر انچارج ایس ایس ایل این ٹی ویمنز کالج دھنباد جھارکھنڈ، ولادت:۲۴ر دسمبر ۱۹۵۲ء بنت پدم شری پروفیسر کلیم عاجز مرحوم) کا انتقال یکم اگست ۲۰۲۰ء کی صبح غسل خانہ میں گر جانے کے سبب ہوگیا۔انہیں سر میں شدید چوٹ آئی جس سے برین ہیمبریج ہوگیا۔اسی روز بعد نمازِ عشاء شمشیر نگر قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔پسماندگان میں شوہر انجینئر عاصم پرویز اور بیٹا ڈاکٹر عامر پرویز، بہو اور دو پوتے ہیں۔مرحومہ دسمبر ۲۰۱۸ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئی تھیں۔ان کے زیر نگرانی دو تین پی ایچ ڈی ہوچکی ہے۔وہ دو سال ونوبا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ کے پی جی شعبہ اردو کی صدر رہ چکی تھیں۔

....

● معروف ادیبہ، صحافی، کالم نگار اور سماجی خدمت گار محترمہ **سعدیہ دہلوی** (ولادت:۱۲رجون ۱۹۵۷ء، بمقام دہلی بنت جناب یونس دہلوی نبیرہ جناب یوسف دہلوی) کا طویل علالت کے بعد ۵راگست ۲۰۲۰ء کی شام دہلی میں ان کے گھر میں انتقال ہوگیا۔وہ سرطان کے موذی مرض میں گرفتار تھیں۔پسماندگان میں اکلوتا بیٹا ارمان علی، والدہ زینت کوثر دہلوی ہیں۔مرحومہ سعدیہ دہلوی دہلی سے ایک عرصہ تک شایع ہونے والے مشہور فلمی وادبی رسالہ ''شمع'' کی تیسری نسل سے تھیں۔انہوں نے خواتین کے رسالہ ''بانو'' کی عرصہ تک ادارت کی۔ان کی پہلی شادی کلکتے کی

معروف شخصیت خان بہادر محمد جان کے نورِ نظر محمد عثمان سے ہوئی تھی لیکن بہت جلد علیحدگی ہوگئی۔ پھر کراچی کے رضا پرویز سے ۱۹۹۰ء میں دوسری شادی ہوئی جس سے ایک لڑکا ارمان علی تولد ہوا۔ تقریباً بارہ سال بعد اپریل ۲۰۰۲ء میں ان سے طلاق ہوگئی۔ سعدیہ دہلوی مرحومہ کے مضامین اور کالم اردو، ہندی اور انگریزی روزناموں میں تواتر سے شائع ہوتے رہتے تھے۔ اجمیر شریف اور خواجہ ہندالولی کی درگاہ سے بھی انہیں بیحد عقیدت تھی۔ انہوں نے ٹی وی کے کئی پروگرام کیے نیز کئی دستاویزی پروگرام بھی پروڈیوس کیے جن میں ''اماں اور فیملی'' شامل ہیں۔ سعدیہ کو تصوف پر کافی درک تھا اور وہ متصوفانہ رموز کی شارح تھیں۔ ان کی تصوف پر دو کتابیں ''صوفی ازم اور اسلام کا دل'' (۲۰۰۹ء) اور ''صوفی کا آنگن'' (۲۰۱۲ء) ہیں۔ انھوں نے دہلی کی تاریخ پر ایک کتاب "جیسمین اینڈ جنس: یادیں اور ریسیپی کی میری دلی'' (۲۰۱۷ء) لکھی تھیں۔ مرحومہ ممتاز صحافی اور ادیب خشونت سنگھ کی اچھی دوست تھیں۔ خشونت سنگھ نے اپنی ایک کتاب مرحومہ سعدیہ کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''سعدیہ دہلوی کے لیے جس نے مجھے اتنی محبت دی جتنے کا میں مستحق نہیں تھا۔'' آنجہانی خشونت سنگھ کی کتاب ''مین اینڈ ویمن ان مائی لائف'' کے کور پر سعدیہ دہلوی کی تصویر نیز ایک باب ان پر شامل ہے۔ انہیں بہترین صحافی کا ایوارڈ ۱۹۸۹ء میں ملا تھا۔ انہوں نے کئی ٹی وی سیریلز میں اداکاری بھی کی جسے کافی سراہا گیا۔

....

● مطالعاتِ ادب و ثقافت ایرانی کی **پروفیسر صبر جمشید ہویوالا** (ولادت: ۲۱ر فروری ۱۹۴۱ء، بمبئی) کا ۶ر اگست ۲۰۲۰ء کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ مرحومہ ممبئی میں تکمیل تعلیم کے بعد حکومت ایران کے وظیفے پر تہران یونیورسٹی گئیں اور پروفیسر محمد علی اسلامی ندوشن کی نگرانی میں 'ہندوستانی پارسیوں کے ایرانی روابط' پر اپنا تحقیقی مقالہ تیار کرکے پی ایچ ڈی کی سند ۱۹۶۵ء میں حاصل کی۔ جے این یو میں اسکول آف لینگوئجز اینڈ کلچر اسٹڈیز کے تحت آفروشین لینگوئجز کا سنٹر قائم ہوا جہاں یکم جولائی ۱۹۷۱ء کو محترمہ پروفیسر صبر جمشید ہویوالا اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئیں۔ بعدہٗ پروفیسر، چیئرپرسن اور ڈین کی عہدے پر متمکن ہوئیں۔ پروفیسر مرحومہ مذکورہ سنٹر کی اولین معماروں میں سے تھیں۔ ان کا میدانِ تخصیص جدید فارسی ادبیات اور انڈو ایرانی عربی روابط تھا۔ وہ اس میدان میں استناد کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں میں فارسی، گجراتی ڈکشنری کے علاوہ متعدد گراں قدر تحقیقی مقالے اور جدید فارسی داستان ہائے کوتاہ کے تراجم شامل ہیں۔ فارسی زبان و ادبیات میں علمی شغف اور مہارت تامّہ کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے ان کو ۲۰۰۳ء میں سرٹیفکیٹ آف آنر سے نوازا تھا جس کا اعلان ایک سال پہلے ۱۵ر اگست ۲۰۰۲ء کو ہوا تھا۔ پروفیسر محترمہ زرتشتی عقیدہ کی حامل تھیں۔

....

● مشاعرے کے باوقار شاعر **راحت اندوری** (اصل نام راحت قریشی، ولادت: یکم جنوری ۱۹۵۰ء بمقام اندور) کا انتقال ۱۱ر اگست ۲۰۲۰ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوگیا۔ وہ کورونا وائرس سے متاثر تھے۔ انہیں ۱۰ر اگست کی دیر رات مدھیہ پردیش کے اروندو اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ان کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر کے مطابق انہیں قلب اور ذیابیطس کے عارضے تھا نیز نمونیا سے متاثر تھے۔ ان کے بیٹے نوجوان شاعر ستلج راحت کے مطابق گزشتہ

ساڑھے چار ماہ سے گھر پر ہی تھے۔ اردو مشاعرہ کے مقبول شاعر مرحوم راحت اندوری اپنی شاعری میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرتے رہے۔ انہوں نے ادبی اور تہذیبی میراث کو تھامے رہے اور کئی جہتوں سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے۔ وقت اور حالات کا اثر ان کے کلام میں بخوبی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ۴۰ر برس مشاعرے پڑھے اور بیرونی ممالک امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا، سنگاپور، ماریشش، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت، قطر، بحرین، اومان، پاکستان کے مشاعرں میں بھی دھوم مچاتے رہے۔ انھوں نے بھوج پور یونیورسٹی، مدھیہ پردیش سے ۱۹۸۵ء میں ''اردو میں مشاعرہ'' کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔

....

● معروف ادیب **ڈاکٹر حسن الدین احمد** (آئی اے ایس، ولادت: ۱۲ر فروری ۱۹۲۳ء، حیدرآباد) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۳ر اگست ۲۰۲۰ء کو حیدرآباد میں ہوگیا۔ ان کی تدفین قبرستان مسجد الماس میں ہوئی۔ وہ نواب دین یار جنگ کے فرزند اور نواب رکن الدین احمد (اکاؤنٹینٹ جنرل، ریاست حیدرآباد) کے خویش تھے۔ انہوں نے ''انگریزی شاعری کے منظوم اردو تراجم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔ وہ حکومت ہند کے کلیدی عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اپنے علمی وادبی ذوق کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کی پہلی کتاب 'ہندوستان کا معاشرتی نظام' ہے جب کہ دوسری کتاب 'شریمد بھگوت گیتا' کا اردو ترجمہ ہے۔ ان کی اردو اور انگریزی میں ۳۰ر سے زائد کتابیں ہیں۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے معاشیات میں ایم اے کیا تھا۔ ان کے انتقال سے حیدرآباد کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔

....

● اترپردیش کے کابینہ وزیر اور ہندوستانی ٹیم کے سابق سلامی بلے باز **چیتن چوہان** (ولادت: ۲۱ر جولائی ۱۹۴۷ء، بریلی) کا نئی دہلی کے ایک اسپتال میں ۱۶ر اگست ۲۰۲۰ء کو شام تقریباً ۵ر بجے انتقال ہوگیا۔ وہ کورونا سے متاثر تھے۔ پسماندگان میں بیوہ سنگیتا چوہان اور بیٹا ونائک چوہان ہیں۔ انہیں کرکٹ میں ارجن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ اپنے کھیل کے کیریئر کے بعد چوہان کو چنگ کا رخ کیا اور ان کی منیجر شپ میں ۲۰۰۱ء میں کولکاتا میں ہندوستان نے آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ میں فتح حاصل کی تھی۔

....

● **ڈاکٹر اشرف جہاں** (سابق صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی) کا ۱۸ر اگست ۲۰۲۰ء کی صبح ۵ر بج کر ۴۵ منٹ پر انتقال ہوگیا۔ ان کے جنازہ کی نماز بعد نماز ظہر نوری مسجد پٹنہ میں ادا کی گئی۔ ان کا آبائی وطن ارکی، ضلع جہان آباد ہے، لیکن ان کا مستقل قیام نفیس کالونی پٹنہ میں تھا۔ انھوں نے حصولِ تعلیم کے بعد گردانی باغ گرلس کالج میں بحیثیت لکچرر تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ بعد میں ان کی تقرری پٹنہ کالج میں ہوگیا۔ وہاں سے شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی تک کا سفر طے کیا اور صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہوئیں اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئیں۔ ڈاکٹر اشرف جہاں ایک بہترین معلّمہ ہونے کے ساتھ مصنفہ اور ادیبہ کی حیثیت سے اردو حلقوں میں شناخت رکھتی تھیں۔ انہوں نے افسانوی دنیا میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ ان کے

دوافسانوی مجموعے شناخت اور اکیسویں صدی کی نرملا کافی مشہور ہوئے۔اس کے علاوہ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں ان میں ہم اردو کے ٹیچر ہوئے،اردوافسانے کا بدلتا مزاج،صورت الخیال عرف ولایتی کی آپ بیتی :ایک جائزہ، اردوناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ،ادبی حلقوں میں ان کی تصانیف کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

....

● سابق صدر جمہوریہ ہند بھارت رتن پرنب **مکھرجی** (ولادت :۱۱ر دسمبر ۱۹۳۵ء) کا ۳۱ر اگست ۲۰۲۰ء کی شام کو آرمی کے ریسرچ اینڈ ریفرل اسپتال،نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔حکومت ہند نے آنجہانی کی روح کو شانتی کے لئے سات روزہ قومی سوگ کا اعلان کیا تھا۔ان کی موت سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔پسماندگان میں ابھجیت مکھرجی،شرمسٹھا مکھرجی،شبھرا مکھرجی ہیں۔وہ غیر معمولی سوچ کے دھنی،قدیم اور جدید کا ایک انوکھا سنگم تھے۔پانچ دہائیوں کی اپنی عمدہ عوامی زندگی میں متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہتے ہوئے وہ ہمیشہ زمین سے جڑے رہے۔وہ اپنی نرم اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے سیاسی میدان میں مقبول تھے۔پرنب مکھرجی بنگال کے ضلع بیر بھوم کے ایک چھوٹے سے گاؤں میرہٹی میں مجاہدین آزادی کامدا کینکر مکھرجی اور راج لکشمی کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔انھوں نے تاریخ اور سیاسیات میں سند حاصل کی اور کولکاتا یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔اس کے بعد ایک کالج ٹیچر اور صحافی کی حیثیت سے ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا سفر شروع ہوا۔قومی تحریک مین اپنے والد کی خدمات سے حوصلہ پاکر جناب مکھرجی پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں منتخب ہونے کے بعد ۱۹۶۹ء میں پوری طرح سے عوامی زندگی آگئے۔ آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی کی سرپرستی میں جناب مکھرجی نے اپنے سیاسی کریئر میں تیزی سے کامیابیاں حاصل کیں۔انھوں نے وزیرخزانہ،دفاع،امور خارجہ اور کامرس کے وزیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔وہ راجیہ سبھا کے لیے پانچ بار اور لوک سبھا کے لیے دوبار منتخب ہوئے۔

....

● حضرت مولانا **شاہ ہلال احمد قادری مجیبی** پھلواروی (ولادت :۱۹۵۷ء بمطابق شعبان ۱۳۷۷ھ) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۳۱ر اگست ۲۰۲۰ء مطابق ۱۱ر محرم الحرام ۱۴۴۲ھ کو ہوگیا۔پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک لڑکا حافظ وبجت حسین اور چار بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔مولانا شاہ ہلال احمد قادری ایک عالم باعمل،منفرد مقرر،دور حاضر میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے ترجمان اور نمائندۂ خاص تھے،وہ صاحب سجادہ،حضرت مولانا سید شاہ آیت اللہ قادری مدظلہ کے خسر تھے،پھلواری شریف خانقاہ ہی نہیں،بہار کی تمام خانقاہوں کی علمی شخصیات میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔نصف درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف،جن میں احوالِ سیدہ زینب سلام اللہ علیہا،یزید حقائق کے آئینے میں،نغمات الانس فی مجالس القدس وغیرہ کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔ان کی رحلت پر پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق نے ''قطعہ تاریخ وصال'' کہی:

وَاحسرتا کہ شاہ ہلالؔ احمد آہ آہ	بربست چشم، حیف زِ دنیا و در گذشت
صوفی، صافی، عالمِ دین و فقیہ عصر	شخصی کہ از او بود وطن مُفتخر گذشت
مخدوم و شاہ زادہ و مقبولِ پنج پیر	عرفاں مآب، واقفِ و صاحبِ نظر گذشت

خون گشت دل ز حادثۂ فاجعہ ہلال　از آسمانِ قادریہ چون قمر گذشت
رفتند سوئے باغِ جناں کِلکِ برق ہم　''اَطْیَبْ گذشتہ'' کرد رقم سالِ درگذشت

۱۴۴۲ھ

● معروف ناقد، محقق، رثائی ادب کے ماہر اور عصر حاضر کی علمی و ادبی شخصیت **پروفیسر فضل امام رضوی** (ولادت ۷؍اگست ۱۹۴۰ء موضع پائندہ پور، اعظم گڑھ خلف مشتاق حسین مرحوم) کا ۳۱؍اگست ۲۰۲۰ء کی صبح لکھنؤ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا جہاں وہ زیر علاج تھے۔ مرحوم فضل امام اپنی ملازمت کے آغاز میں عرصہ تک راجستھان یونیورسٹی، جے پور کے شعبہ اردو فارسی سے وابستہ رہے بعد ازاں الہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے نیز شعبہ اردو کے صدر رہوئے پھر عزت و افتخار کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ وہ اتر پردیش سکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن کے چیرمین اور دیگر متعدد اداروں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے تحقیق وتنقید پر تقریباً ۷۰ رکتابیں تصنیف وتالیف کیں۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ مذہبی اور سماجی خدمات بھی بحسن وخوبی انجام دیں۔ پروفیسر فضل امام نے رشید احمد صدیقی کے خطوط مشاہیر ادب کے نام پہلے پہل ترتیب دی تھی۔ رثائی ادب پر انہوں نے خاصا کام کیا ہے جس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ شروعاتی دور میں انہوں نے مرثیہ خوانی بھی کی تھی۔ بعد میں وہ تقریر و تحریر کے ہوکر رہ گئے تھے اور کتب بینی ان کا خاص مشغلہ رہا۔ مرحوم پروفیسر فضل امام نہایت نیک اور مخلص انسان تھے۔ ان کی رحلت سے اردو ادب کے روشن باب کا خاتمہ ہوگیا۔

● معروف عالم دین حضرت **مولانا محمد قاسم مظفر پوری** (ولادت: ۱۹۳۷ء خلف جناب معین الحق مرحوم وطن: موضع مادھو پور، ڈاکخانہ: انگواں وایہ جوارہ مظفر پور) کا یکم ستمبر ۲۰۲۰ء کو تین بجے صبح ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ بعد نمازِ ظہر زکریا کالونی مظفر پور میں تدفین عمل میں آئی۔ مولانا مرحوم مدرسہ رحمانیہ سوپول میں تقریباً ۴۶ رسال تک استاد رہے نیز مختلف دینی مدارس و ادارے سے وابستہ تھے۔ وہ قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار، اڈیشہ اور جھارکھنڈ تھے۔ مولانا قاسم مظفر پوری کی شخصیت گوناگوں شخصیت کی حامل تھی۔ تبحر علمی اور سادہ لوحی کا خوبصورت امتزاج انکی شخصیت کا خاصہ تھا وہ ملت کے نایاب گہر تھے۔ مولانا ایک عرصہ سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے کچھ دن قبل انہیں فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے کافی کمزور ہوگیے تھے۔ مولانا کئی کتابوں کے مصنف و مرتب نیز قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے رفیق کار تھے اور متنوع صفات کے حامل تھے۔ ان کے انتقال سے ملک ایک نامور عالم دین بافیض استاذ اور باکمال فقیہ سے محروم ہوگیا۔ دریں اثناء پروفیسر شاکر خلیق نے اپنی تعزیت میں کہا کہ مولانا قاسم مظفر پوری سے کم وبیش پچاس سال سے ان کے خانوادہ سے ہمارے تعلقات تھے۔ والد بزرگوار عبدالخالق خلیق مرحوم کی زندگی میں ہمارے آبائی گاؤں نظر احمد آباد تشریف لاتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں والد صاحب کے انتقال کے بعد بھی حضرت مولانا نے ہم لوگوں کے ساتھ وہی خلوص و محبت رکھا۔ ہماری قیام گاہ محلّہ شاہ سوپن اکثر تشریف لاتے۔ مادھو پور مدرسہ کا ترانہ ان کے حکم پر میں نے لکھا تھا۔ اسی ترانہ کا ایک شعر پیش کررہا ہوں:

اللہ رکھے قائم ہم پر تا دیر یہ قاسم کا سایہ　ہیں ملت کے نایاب گہر اسلاف کے ہیں یہ سرمایہ

● خطیب ایشیاوافریقہ حضرت **مولانا محمد حسین صدیقی** ابوالحقانی صاحب (ولادت: ۲؍دسمبر ۱۹۵۶ء آبائی مکان لوکہا مدھوبنی) کا ۱۲؍ستمبر ۲۰۲۰ء کو پونے نو بجے شب حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کی رہائش گاہ واقع دونار چوک دربھنگہ میں ہوگیا جب کہ نمازِ جنازہ ان کے آبائی وطن لوکہا مدھوبنی میں ادا کی گئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ صاحب زادے مولانا تحسین رضا مصباحی ناظم اعلیٰ (جامعہ فاطمہ، دونار چوک دربھنگہ)، محمد ریحان رضا، محمد فیضان رضا، محمد عادل رضا، محمد واقف رضا اور ایک صاحب زادی ہیں۔ مولانا ابتدا میں آرہ بھوجپور کے مدرسہ فیض الغرباء میں صدر مدرس تھے۔ اس کے بعد تبلیغی دورے میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ تدریس کی فرصت نہیں رہی۔ ان کا تعلق سلسلہ عالیہ قادریہ چشتیہ نوریہ سے تھا جب کہ شہزادہ اعلیٰ حضرت مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مصطفیٰ رضا خاں مرحوم سے بیعت تھی۔ ان کو خلافت مہاجر مدینہ ضیاء الدین مدنی، حضور تاج الشریعہ اختر رضا خان ازہری، حافظ توریت وانجیل علامہ قایم قتیل داناپوری، علامہ تحسین رضا بریلی شریف ودیگر کئی بزرگان دین سے خلافت واجازت حاصل تھی۔ مرحوم کی اہم کتابوں میں خطبات ابوالحقانی، جنتی کون، حاضر وناظر، دینے والا ہے سچا ہمارا نبی، صدقات، زیارات اربعین حقانی وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کی سرپرستی میں سہ ماہی ''خاتونِ جنت'' شایع ہوتا رہا ہے۔ حضرت مولانا ابوالحقانیؒ جامعۃ فاطمۃ الزہرا دونار چوک دربھنگہ اور دارالعلوم رضائے مصطفیٰ کے سربراہ اعلیٰ تھے نیز ان کی سرپرستی میں دیگر کئی ادارے بھی چل رہے تھے۔ مولانا سے راقم الحروف کے والد سابق پولیس افسر ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی مرحوم کے آرہ سے ہی تعلقات تھے اور وہ آرہ نوادہ ٹاؤن تھانے میں آتے اور کئی اہم دینی کتابیں عرفانی تقریروں کی مکمل سیریز پیش کرتے۔ پھر شہر دربھنگہ میں خاکسار سے بھی کافی قربت تھی۔ روزانہ ''تاثیر'' میں خبریں اور مضامین شائع کرنے کے لیے بھیجتے۔ جولائی اور اگست کے اوائل میں 'ادبستان' گنگوارہ دربھنگہ بھی تشریف لائے اور میرے چھوٹے بھائی انجینئر سیّد ظفر الاسلام ہاشمی کے فرزند شفا ہاشمی کی علالت کی جانکاری لی اور صحت وتندرستی کے لئے دعا کی۔ مرحوم نہایت شریف النفس اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ دینی معلومات پر خاصی گرفت تھی۔ مریدان پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔

....

● **ڈاکٹر شاداب رضی** (تلکا مانجھی یونیورسٹی بھاگلپور کے سابق صدر شعبۂ اردو، اصل نام پروفیسر محمد رضی احمد، ولادت جنوری ۱۹۵۵ء) کا ۱۳؍ستمبر ۲۰۲۰ء کی صبح ۵؍بجے ان کی رہائش گاہ (پربتی، بھاگلپور) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا۔ اسی روز ۱۳؍ستمبر ۲۰۲۰ء کو بعد نمازِ مغرب شاہ جنگی قبرستان کے قریب جنازہ کی نماز ادا کی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئے گی۔ پروفیسر موصوف اسی سال جنوری میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاعری اچھی کی سیمیناروں میں مضامین بھی پڑھے لیکن شاعری اور نثری مضامین کا مجموعہ شائع نہیں ہوسکا۔ انہوں نے استاد کی حیثیت سے کئی نسلوں کی آبیاری کی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ مرحوم شاداب رضی اکثر متھلا یونیورسٹی میں وائیوا اور دیگر کاموں کے لیے تشریف لاتے۔ پروفیسر رئیس انور کے زیرِ نگرانی کئی وائیوا میں آئے۔ دوبار خاکسار کے یہاں (''ادبستان'' گنگوارہ دربھنگہ) میں قیام بھی فرمایا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد صاحب کی نگرانی میں ایک وائیوا میں بھی آئے۔ اسی طرح ان کی آمد ورفت کا سلسلہ رہا۔

....

● امریکہ میں تقریباً پچاس برسوں سے مقیم **ڈاکٹر محمد ظفیر الدین** (ولادت ۱۹۲۷ء، خلف جناب نبی اختر مرحوم، مہدولی دربھنگہ) کا انتقال طویل علالت کے بعد امریکہ میں جمعرات ۱۶ر ستمبر ۲۰۲۰ء کو دن کے تقریباً ۲ ربجے ہوگیا اور بعد نمازِ جمعہ ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ بریرہ خاتون عرف گوری بی بی کا انتقال چند ماہ قبل اپریل ۲۰۲۰ء میں ہوگیا تھا۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹے ڈاکٹر انور رشید، ڈاکٹر قیصر رشید انجینئر سرور رشید تین بیٹیاں اور خویش ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر محمد ظفیر الدین صاحب نے دربھنگہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گئے اور ۱۹۷۲ء میں باضابطہ امریکہ چلے گئے جہاں اپنے پیشہ میں کافی نام پیدا کیا۔ امریکہ جانے سے پہلے وہ دیوگھر کے کسی بلاک میں میڈیکل افسر اپنی ذمہ داریاں نبھا چکے تھے۔ امریکہ میں رہ کر انہوں نے میڈیکل خدمات کے ساتھ ساتھ مذہبی ادبیات کی جانب مائل ہوئے۔ ان کا انگریزی میں ۲۴ رصفحے کا کتابچہ ''لائف آف دی پروفیٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' (۲۰۰۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ ''تمثیل نو'' دربھنگہ میں جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء میں اقبال انصاری صاحب دہلی نے اس کتابچہ پر جامع تبصرہ کیا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب کو تمثیل نو باقاعدگی سے جاتا تھا۔ اور وہ اپنی رائے بھی دیتے تھے۔ ان کا ایک طویل خط ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر کے خطوط ''چٹھی آئی ہے'' (مرتب شاہد اقبال) میں شامل ہے۔ مرحوم ڈاکٹر محمد ظفیر الدین صاحب ۴۷-۱۹۴۵ء کے دوران سی ایم کالج دربھنگہ کے اردو ادب کی انجمن کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ حسن امام درد، مظہر امام، شاداں فاروقی اور علی اشرف صاحبان سے گہرے مراسم تھے۔ ہاشم مرحوم کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ ''صبح زندگی'' میں ان کی تخلیقات شایع ہوتی تھیں۔ ان کا تعلق شہر دربھنگہ کے معزز خانوادہ سے تھا۔ وہ جب بھی اپنے وطن دربھنگہ آتے تو محفل آراستہ ہوتی۔

....

● لوجپا کے بانی اور مرکزی وزیر **رام ولاس پاسوان** (ولادت: ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء، کھگڑیا، بہار) کا انتقال دہلی کے ساکیت اسپتال، دہلی میں ۸؍ اکتوبر ۲۰۲۰ء کو ہوگیا۔ ان کے جسدِ خاکی کو نئی دہلی میں جن پتھ پر واقع اُن کی رہائش گاہ پر لایا گیا اور پھر سہ پہر کو اسے ہوائی جہاز سے پٹنہ میں پارٹی کے دفتر لے جایا گیا جہاں دوسرے روز آخری رسوم پٹنہ میں ادا کردی گئیں۔ پسماندگان میں دو بیویاں رینا پاسوان اور راج کماری دیوی، ایک بیٹا چراغ پاسوان (اداکار، سیاستداں اور لوجپا کے صدر، ممبر پارلیمنٹ جموئی) اور دو بیٹیاں آشا پاسوان اور اوشا پاسوان ہیں۔ آنجہانی گزشتہ پانچ دہائی سے زائد سیاست میں سرگرم عمل تھے اور ملک بڑے دلت رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ آٹھ مرتبہ لوک سبھا کیلئے منتخب ہوئے اور اپنے حلقے حاجی پور سے کئی سال تک سب سے زیادہ فرق سے چناؤ جیتنے کا ریکارڈ بھی ان کے نام درج ہے۔ سیاست میں شامل ہونے سے پہلے وہ بہار پولیس سروس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر بھی منتخب ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے عوام کی خدمت کے لئے پولیس سروس کی بجائے سیاست کا انتخاب کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب وہ وزیر ریل تھے تو انہوں نے حاجی پور میں ریلوے کا زون بنایا۔

....

● معروف دیوانی وکیل **سید ولی کریم** (عمر تقریباً ۸۴ رسال، خلف سید عبدالرحیم مرحوم موضع رسول پور حیا گھاٹ دربھنگہ حال مقام رحم گنج ویسٹ) کا ۸؍ اکتوبر ۲۰۲۰ء کو تقریباً ۳ ربجے دن میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کئی دنوں سے سخت

علیل تھے۔ مرحوم کے جنازہ کی نماز ۹؍اکتوبر ۲۰۲۰ء کو صبح ۹؍بجے خانقاہِ سمرقندیہ میں ادا کی گئی۔ مرحوم کی وصیت کے مطابق ۹؍اکتوبر کو بعد نمازِ جمعہ رسول پور حیا گھاٹ میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے سید ارشد کریم، سید اشرف کریم، سید امجد کریم (ایڈوکیٹ) اور سید انظر کریم اور چار بیٹیاں ہیں۔

....

● اردو کے ممتاز شاعر، ناقد، محقق، افسانہ نگار، مترجم **پروفیسر مظفر حنفی** (ولادت: یکم اپریل 1936 وطن: ہسوہ، فتح پور یوپی) کا ۱۰؍اکتوبر ۲۰۲۰ء کو ان کے مکان بٹلہ ہاؤس نئی دہلی میں طویل علالت کے بعد سہ پہر ساڑھے تین بجے انتقال ہوگیا اور آج ہی بٹلہ ہاؤس قبرستان میں بعد نمازِ عشاء تدفین عمل میں آئی۔ پروفیسر مظفر حنفی نے اپنی ادبی شروعات افسانہ نگارسے کی لیکن بحیثیتِ شاعر ان کی شہرت زیادہ ہوئی۔ انہوں نے بچوں کا ادب بھی لکھا اور ان کی وابستگی بعض ادبی رسائل سے بھی رہی۔ جس میں بھوپال کا رسالہ ''جادہ'' اہم ہے۔ انہوں نے تنقید بھی لکھی اور تحقیق اور ترجمہ کا کام بھی کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کے اشتراک سے انہوں نے وضاحتی کتابیات کی ایک درجن سے زائد جلدیں تیار کیں اور انہوں نے انتخاب کا کام بھی کیا اور غزلوں کا کافی ضخیم انتخاب شائع کیا۔ وہ کلکتہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور اقبال چیر کے صدر بھی رہے اور مغربی بنگال کی ادبی فضا میں اپنی کامیاب شرکت کو منظر عام پر لا کر نئی نسل کی آبیاری میں معاون ثابت ہوئے۔ جہاں تک تخلیقات کی اشاعت کا سوال ہے بیسویں صدی کی آخری چار دہائی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وہ بیحد فعال رہے اور شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو جس میں ان کی شعری تخلیقات تواتر سے شائع نہیں ہوئی ہوں۔ ان کا ایک مشہور شعر یوں ہے: وجود غیب کا عرفان ٹوٹ جاتا ہے/صریر خامہ سے وجدان ٹوٹ جاتا ہے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

....

● حضور غوث زماں حضرت سید شاہ رشید علی القادریؒ تالسلہ کے صاحبزادے پیر طریقت حضرت **سید ترشید علی القادری** المعروف بہ چھوٹے حضور (ولادت: ۵؍دسمبر ۱۹۵۵ء) کا وصال ۱۲؍اکتوبر ۲۰۲۰ء کو ساڑھے آٹھ بجے صبح حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوگیا اور تدفین رات کے ساڑھے گیارہ بجے منگل کوٹ، مشرقی بردھمان (مغربی بنگال) نزد امام بارگاہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی نماز جنازہ ان کے چھوٹے بھائی پیر طریقت حضرت سید مرشد علی القادری ممبر مائنوریٹی کمیشن مغربی بنگال نے پڑھائی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ صاحبزادے سید زین علی القادری اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ موصوف ایک اچھے عالم دین تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر گہرا عبور رکھتے تھے۔ نیز شعر و ادب کا بھی بہت ہی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ آپ نے نوحہ، منقبت، سلام اور مرثیہ پر خاص طور سے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تخلیقات اکثر رسالوں کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ مجلسوں میں بھی کثرت سے پڑھی جاتی تھیں موصوف بہت ہی نرم دل، خلیق اور سادہ لوح انسان تھے۔ جس میں ان کے مریدین اور عقیدت مندوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر نجیب اختر (دربھنگہ) مرحوم کے نسبتی بھائی ہیں۔

....

● معروف ادیب، شاعر اور صحافی **ساحر شیوی** (اصل نام محمد عبداللہ ولادت ۲۹؍دسمبر ۱۹۳۶ء شیورتنا گیری، کوکن،

مہاراشٹرا) کا ۱۷؍اکتوبر ۲۰۲۰ء کو لندن میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ساحر شیوی ۱۹۵۴ء میں نیروبی کینیا ساؤتھ افریقہ چلے گئے تھے اور وہیں ٹرانسپورٹ کا بڑا کاروبار شروع کیا تھا جہاں ان کے کئی دشمن پیدا ہو گئے اور ان پر پانچ بار قاتلانہ حملہ ہوا۔ جس کے سبب وہ ۱۹۹۴ء میں برطانیہ چلے گئے اور وہیں لیوٹن میں مقیم ہو گئے۔ پولینڈ سے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ شاعری میں وہ مولانا قمر نعمانی سہرامی اور کالی داس گپتا رضا کے شاگرد تھے۔ اردو زبان وادب کے لیے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا۔ حمد، نعت، غزل، نظم، ہائیکو، سندھیو، ماہیہ، قطعات اور رباعیات میں تجربہ کرتے رہے۔ جس میں ان کے تقریباً ۲۰؍ مجموعے ہیں۔ نثری کتابوں کی تعداد بھی ۱۰؍ ہے اور ان پر ۲۲؍ کتابیں ہیں۔ ان پر ممبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی ہو چکی ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں مقالے لکھے گئے۔ وہ صحافت سے بھی وابستہ تھے۔ ماہنامہ آئینہ، سہ ماہی ترسیل، سفیر اردو، ماہنامہ صدا برطانیہ، سہ ماہی ماہیہ روپ کراچی، سہ ماہی ہائیکو ورلڈ کراچی کی مجلس ادارت سے وابستہ تھے۔ ماہنامہ ''پرواز'' ان کا اپنا رسالہ تھا جو ۲۰۰۰ء سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ان کی شاعری نئی تخلیقیت فنی اقدار کے پس منظر میں رونما ہوتی رہی اور وسیع منظر نامے کو سامنے لاتی رہی جو اپنے دور اور اپنی ذات کی ترجمان ہے۔ عصر زدگی کا اظہار ہے اور اصلاح و تعمیر کے اجتماعی میلانات کے واضح نشانات سے مرصع ہے۔ ان کی نثری اور صحافتی تحریر بھی تفکر اور بصیرت سے نئے زاویے کھولتی ہے اور مظاہر اور محسوسات کو جزویات کا حصہ بناتی ہے۔

....

● **سید مظفر شعیب ہاشمی**، آئی پی ایس (ولادت ۲۵؍ جون ۱۹۴۶ء، مقام: عملہ پٹی، موتی ہاری مشرقی چمپارن، مقیم: پٹنہ) کا جمعہ ۳۰؍ اکتوبر ۲۰۲۰ء کی صبح فجر کے وقت اپنے بیٹے کی رہائش گاہ ایس این راج سرینٹی بیگر روڈ بنگلورو میں انتقال ہو گیا اور اسی روز بعد نمازِ عشاء بنگلورو قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ محترمہ رومی شاہینہ ہاشمی، تین بیٹیاں ماہِ منور ہاشمی، ماہِ منیر شاذی، زبیدہ شاذلی ہاشمی اور بیٹا جہاں زیب قمر الدین ہاشمی ہیں۔ مرحوم مظفر شعیب ہاشمی آئی جی پولیس کے عہدہ سے ۲۰۰۶ء میں سبکدوش ہوئے تھے۔ نہایت شریف النفس انسان اور پرانی قدروں کے امین تھے۔ وہ ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ شاعری کی، افسانے لکھے۔ ان کے افسانے صرف اردو جریدہ ''تمثیل نو'' میں ہی شائع ہوئے۔ انہوں نے خود سرائی جستجو کی خاطر افسانے لکھے اور اپنے عصر کی سرگرمِ عمل کو دردمندی کے ساتھ پہچان دینے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں میں جھنکار اور للکار نہیں ہے، جوش اور ولولہ بھی نہیں ہے بلکہ مقصدیت کا تقدس ان کے یہاں چمک پیدا کرتا ہے اور ذہانت کے رمز و ایما کو پیش کرتا ہے۔ عہد کے مزاج آشنا مظفر شعیب ہاشمی کے انتقال کی خبر سے اردو حلقہ سوگوار ہے۔

....

● معروف شاعر، ادیب اور صحافی **نعیم بازید پوری** (عمر تقریباً ۷۰؍ سال) کا ۱۴؍ نومبر ۲۰۲۰ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا اور ۱۵؍ نومبر ۲۰۲۰ء کو بعد نمازِ ظہر تدفین عمل میں آئی۔ وہ ڈیڑھ سال قبل جدہ میں تقریباً ۴۰؍ سال رہ کر کراچی منتقل ہوئے تھے۔ وہ جدہ میں عرصہ تک اردو نیوز سے وابستہ رہے۔ ان کا آبائی گاؤں بازید پور ضلع نوادہ تھا۔ وہ ایک بار اپنے آبائی گاؤں گئے تھے لیکن اس یاد کو تجویے رہے اور بہار کے لوگوں سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ جدہ کی ادبی نشستوں کی جان اور ہند و پاک میں یکساں مقبول تھے۔ لوگ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ حسرت

دل اور غم زمانہ کے شاعر تھے۔ خاموش طبعی انکے مزاج کا حصہ تھا۔ اردو کے مسایل پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور جدید عصری تقاضے کے تحت شاعری کرتے تھے۔ حالانکہ ان کا واسطہ قدیم عصر سے بھی رہا ہے لیکن احساسات وخیالات کو احساس کا جامہ پہناتے وقت نیی لفظیات کی وجہ سے وہ جدید ہو جاتے تھے اسی لیے ان کی شاعری زبان و بیان کی یکسانیت کا شکار نہیں ہویی۔ ان کا ایک شعر دیکھیے: گھروں کی یاد میں بے چین رہنا خود فریبی ہے/ چلے جاتے ہیں گھر واپس جنہیں گھر یاد آتے ہیں۔ وہ قلندر صفت آدمی تھے۔ ان کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا۔ خاک طیبہ ٹرسٹ، بزم شگوفہ گلبن ڈاٹ کوم کا شاید ہی کویی مشاعرہ ہو جس میں ان کی شرکت نہیں ہوئی ہو۔

....

● بنگالی اور ہندی سنیما کے سپر اسٹار **سمترا چٹرجی** (ولادت: ۱۹ر جنوری ۱۹۳۵ء، کلکتہ) کا طویل علالت کے بعد کولکاتا کے بیل ویو کلینک میں ۱۵ر نومبر ۲۰۲۰ء کو دوپہر میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۱۶ر اکتوبر کو کورونا سے متاثر ہوئے تھے۔ مشہور فلمساز ستیہ جیت رے کے ساتھ مل کر انہوں نے ۱۹۵۹ء میں فلم 'اپر سنسار' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور ۱۴ر مشہور اور آئیکونک فلمیں دیں۔ اس کے علاوہ بنگالی سنیما کے مشہور ہدایت کار مرنال سین اور آکاش کسم کی ہدایتکاری میں بھی کام کیا۔ ۲۰۱۹ء میں ان کی آخری فلم 'سنج باتی' آئی ہے۔ آنجہانی کو پدم بھوشن اور سنگیت ناٹک اکیڈمی ٹیگور رتن ایوارڈ اور بنگ بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا اور ملک کا سب سے بڑا فلمی ایوارڈ ۲۰۱۲ء میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ فرانس نے بھی ۱۹۸۹ء میں آنجہانی کو 'لیگون آف آنر' ایوارڈ سے نوازا جو فرانس کا اعلیٰ شہری اعزاز ہے۔

....

● معروف شاعرہ **ڈاکٹر مینا نقوی** (ولادت: ۲۰ر مئی ۱۹۵۵ء، نگینہ) کا انتقال نوئیڈا میں ۱۵ر نومبر ۲۰۲۰ء کی صبح کو سرطان سے ہوگیا۔ مرحومہ پیشے سے ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھیں۔ ان کی شاعری میں نسائی جذبات اور جذبہ حب الوطنی ملتی ہے۔ مرحومہ مدھیہ پردیش، بھوپال اردو اکیڈمی کی سکریٹری معروف شاعرہ ڈاکٹر نصرت مہدی اور علینا عطرت کی حقیقی بڑی بہن تھیں۔ وہ مرادآباد میں رہ رہی تھیں لیکن عمر کے آخری چند سال انھوں نے معالج کی حیثیت سے نوئیڈا میں گذارے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے اور ان پر جتنے مضامین لکھے گئے تھے، انہیں شائع کرانے کی تیاری بھی جاری تھی۔

....

● ہندی کی معروف ادیبہ اور گوا کی سابق گورنر، بی جے پی رہنما محترمہ **ڈاکٹر مردولا سنہا** (ولادت: ۲۷ر نومبر ۱۹۴۲ء، موضع چھپرا، کانٹی بلاک، مظفر پور) کا انتقال ۱۸ر نومبر ۲۰۲۰ء کو دہلی کے ایک اسپتال میں ہوگیا۔ پسماندگان میں دو بیٹے (نوین سنہا، پروین سنہا) اور ایک بیٹی (بیناکشی سنہا، مقیم امریکہ) ہیں۔ آنجہانی محترمہ بی جے پی کی خواتین شاخ کی سربراہ اور انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں سماجی بہبود کے مرکزی بورڈ کی صدر نشیں بھی رہ چکی تھیں۔ ان کی سسرال اورائی بلاک کے مُنیا نی گاؤں میں تھا۔ وہ ۲۰۱۴ء تا ۲۰۱۹ء گوا کی پہلی خواتین گورنر رہیں۔ ڈاکٹر ایس کے سنہا ویمنس کالج، موتیہاری میں لیکچرار سے اپنی کیریئر کی ابتدا کی۔ ان کے خاوند ڈاکٹر رام کرپال سنگھ، سابق وزیر اعلیٰ آنجہانی کرپوری ٹھاکر کی وزارت اور مرکز میں آنجہانی مرارجی ڈیسائی کی وزارت عظمیٰ میں وزیر رہ چکے ہیں۔ ہندی

میں شاعری، گیت اور افسانہ سمیت مختلف اصناف میں ان کی تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سیاست میں رہتے ہوئے آنجہانی مردولا سنہا مظفر پور کے ادیبوں کے درمیان بے حد مقبول رہیں۔

....

● آسام کے سابق وزیر اعلیٰ **ترون گگوئی** (ولادت: یکم اپریل ۱۹۳۶ء بمقام رنگ مائی، ضلع جورہاٹ، آسام) کا طویل علالت کے بعد گوہاٹی میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل میں ۲۳ر نومبر ۲۰۲۰ء بوقت ۱۰ر بجے شب انتقال ہو گیا۔ ۲۵ر اگست ۲۰۲۰ء کو انھیں کورونا مثبت پایا گیا تھا جس کے کچھ دنوں بعد رپورٹ منفی آ گئی تھی تاہم ان کی طبیعت روز افزوں بگڑتی گئی۔ وہ سینئر کانگریسی رہنما تھے اور ریاست آسام میں طویل ترین عرصہ تک (تین میعاد) وزیر اعلیٰ کے عہدے پر متمکن رہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۶ء تک مرکزی وزیر مملکت برائے فوڈ پروسیسنگ صنعت (آزادانہ چارج) کا قلم دان بھی سنبھالا۔ پسماندگان میں بیوہ ڈولی گگوئی، ایک بیٹی چندریما گگوئی اور ایک بیٹا گورو گگوئی ہیں۔

....

● عظیم فٹ بالر اور ارجنٹائنا کے سابق کپتان **ڈیگو میراڈونا** (ولادت: ۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۰ء بمقام لانوس، بیونس آئرس، ارجنٹائنا) کا گزشتہ شب طویل علالت کے بعد ٹیگرس، بیونس آئرس، ارجنٹائنا میں ۲۳ر نومبر ۲۰۲۰ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی قیادت میں ۱۹۸۶ء میں ارجنٹائنا نے عالمی کپ فٹ بال جیتا تھا۔ فٹ بال کی عالمی تنظیم فیفا نے انھیں ۲۰۰۲ء میں ایک اور عظیم فٹ بالر پیلے کے ساتھ مشترکہ طور پر بیسویں صدی کا عظیم ترین فٹ بالر قرار دیا تھا۔

....

● نامور عالمِ دین، خطیب، اسلامک اسکالر، مصلح قوم وملت، ماہرِ تعلیم اور مبلغ ڈاکٹر مولانا **سیّد کلبِ صادق** (ولادت: ۲۲ر جون ۱۹۳۷ء، لکھنؤ) کا طویل علالت کے بعد گزشتہ ۲۴ر نومبر ۲۰۲۰ء بوقت ۱۰ر بجے شب لکھنؤ کے ایرا ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم گزشتہ ۳ر برسوں سے آنتوں کے سرطان میں مبتلا تھے۔ ۱۷ر نومبر ۲۰۲۰ء کو بسبب عارضۂ نمونیا انھیں داخلِ ہسپتال کیا گیا تھا جہاں طبیعت لگاتار بگڑتی گئی۔ بعدۂ انھیں انتہائی نگہداشت والی اکائی (ICU) اور وینٹی لیٹر پر رکھا گیا جہاں بالآخر ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ نمازِ جنازہ آج ۲۵ر نومبر ۳۰-۱۱ بجے دن یونٹی کالج، واقع حسین آباد میں ادا کی گئی اور تدفین بعد نمازِ ظہر چوک منڈی، امام باڑہ غفران مآب میں ہوئی۔ غیر متنازعہ شخصیت کے حامل مرحوم ہندو-مسلم اور شیعہ-سنی اتحاد کے بڑے علم بردار تھے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر، آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ انھوں نے پوری زندگی محبت، حب الوطنی اور یکجہتی کا پیغام دیا۔ مسلم مسائل اور عورتوں کے حقوق پر عملی تعلیم دینے کی کوشش کی۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں عرفانِ ربانی کی سیر کی۔ اقوام کی بے گانگی پر لوگوں کی توجہ دلائی اور حقوق کی حفاظت کے لیے خود ہی قوت پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ تاریخِ عالم پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور غور وخوض کے نئے راستے دکھلائے جس کی وجہ سے امن کی وسعت اور باہمی مساوات کے ساتھ باہمی تعاون اور عالم گیری اخوت سے ربط پیدا کرنے کی انھوں نے ہمیشہ راہ دکھائی۔ ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتی ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی ادب میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۸۴ء میں غریب اور نادار بچوں کو تعلیمی وظائف

اور امداد فراہم کرنے کے لیے 'توحید المسلمین ٹرسٹ' قائم کیا تھا۔ بہت سے تعلیمی اور طبّی ادارے مثلاً یونٹی مشن اسکول، یونٹی کالج، یونٹی انڈسٹریل سینٹر، ایرا چیریٹبل ہاسپٹل، ایرا میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل (تمام لکھنؤ میں)، مدینۃ العلوم کالج (علی گڑھ)، یونٹی پبلک اسکول (الہ آباد) انھوں نے قائم کیے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

....

● سینئر کانگریس لیڈر جناب **احمد پٹیل** (اصل نام احمد بھائی محمد بھائی پٹیل، ولادت: ۲۱ر اگست ۱۹۴۹ء، بمقام بھروچ، بامبے اسٹیٹ، موجودہ ریاست گجرات) کا انتقال گذشتہ ۲۵ر نومبر ۲۰۲۰ء کو رات کے آخری پہر ۳۰-۳ر بجے میدانتا ہسپتال، گروگرام میں ہوگیا۔ مرحوم کی خواہش کے مطابق انھیں ان کے آبائی گاؤں پیرامن، ضلع بھروچ، گجرات میں ان کے والدین کی قبروں سے متصل دفنایا گیا۔ وہ کانگریس کے دیرینہ کارکن تھے، جنھوں نے پارٹی کے بنیادی مقاصد کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور عظمت و شان سے اپنی زندگی کے راستے کی زلفیں سنوارتے رہے۔ یہ ان کی شخصیت کی ایک بڑی خوبی بھی تھی کہ اپنی پارٹی میں پھوٹ کو روکتے رہے اور خوشبو کی صفت سے آشنا کراتے رہے اور مستقبل کے امکانات پر سیاسی غور و خوض کی دعوت دیتے رہے۔ کانگریس میں تنظیم کو مضبوط کرنے پر وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ طویل عرصہ تک صدرِ کانگریس محترمہ سونیا گاندھی کے سیاسی مشیر رہے اور فی الحال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے خازن کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ انھیں کانگریس کا جدید چانکیہ اور پریشانیوں کا نجات دہندہ کہا جاتا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں صرف ۲۶ر برس کی عمر میں وہ پہلی بار لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے اور آخری لمحوں تک رکن پارلیمنٹ رہے۔ یکم اکتوبر ۲۰۲۰ء کو انھیں کورونا مثبت ثابت ہونے پر داخلِ ہسپتال کیا گیا تھا جہاں کثیر اعضاء کے معطل ہو جانے کے سبب ان کا انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ میمونہ پٹیل، ایک بیٹا فیصل پٹیل اور ایک بیٹی ممتاز پٹیل ہیں۔

....

● اہلسنت والجماعت کے ایک بہترین عالم دین اور قاری القرآن **حضرت امیر حمزہ صاحب رضوی** (استاذ احسن المدارس قدیم کانپور، یوپی و ناظم اعلیٰ دارالعلوم غوثیہ مکیہ بہیڑہ، دربھنگہ بہار) مختصر علالت کے بعد اس دارِ فانی سے ۲۶ر نومبر ۲۰۲۰ء کو کوچ کر گئے۔ ان کے جنازہ کی نماز ۲۷ر نومبر ۲۰۲۰ء کو بعد نماز جمعہ (بہیڑا، بینی پور، دربھنگہ) میں ادا کی گئی۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے۔ ان کے دونوں گردے خراب ہو چکے تھے اور وہ کانپور میں زیر علاج تھے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مرکزی دارالقرات یوپی، دارالعلوم غریب نواز الہ آباد اور تجوید القرآن لکھنؤ میں قاری احمد ضیا، قاری مطلوب قاری محب الدین وغیرہ کی نگرانی اور سرپرستی میں حاصل کی۔ اس کے علاوہ منظر اسلام بریلی شریف میں آپ نے تراویح کی نماز پڑھائی۔ ہری مسجد مدنپورہ (بمبئی) ناخدا مسجد زکریا اسٹریٹ (کلکتہ) اور اٹارسی عیدگاہ جامع مسجد میں اپنی خدمات کو انجام دیا۔ ہر سال بریلی شریف کے عرس رضوی کا آغاز آپ کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوتا تھا۔ آپ اپنے پیچھے تین صاحب زادے اور ایک صاحب زادی چھوڑ گئے۔

....

● **حکیم سید فیضان احمد** (ولادت: ۱۲ر جنوری ۱۹۳۴ء، ولد مولانا شاہ واعظ الدین ابوالعلائی مرحوم، محلّہ شاہ ٹولی داناپور، پٹنہ) کا ۲۸ر نومبر ۲۰۲۰ء کو صبح ۵ر بجے طویل علالت کے بعد کولکاتا میں انتقال ہوگیا اور جنازہ کی نماز بعد نمازِ مغرب

خلیفہ مسجد، رپن اسٹریٹ میں اور تدفین ۱۶ر آنہ قبرستان میں ہوئی۔ حکیم سید فیضان احمد سابق پرنسپل یونانی میڈیکل کالج اور صدر رہتے تھے اور سماجی شخصیت کے ساتھ ساتھ غریبوں اور یتیموں کی مدد کرتے تھے نیز دینی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ کولکاتا شہر میں ہمدرد کے حوالے سے بھی ان کی شناخت تھی اور طبی خدمات میں ان کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ شہر کے کئی اہم اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ بزرگ شاعر اور ادیب جناب علقمہ شبلی صاحب مرحوم سے بیحد قربت تھی۔ انہیں شعر و شاعری سے بھی بیحد شغف تھا۔ ان کی ایک غزل کا ایک مطلع دیکھیے: نگاہ ان کی کبھی اس طرف اٹھی ہی نہیں/خزاں رسیدہ چمن میں کلی کھلی ہی نہیں۔

....

● مشاعرہ کے مقبول شاعر **رہبر جونپوری** (اصل نام منہاج انصاری، ولادت: ۲رجنوری ۱۹۳۹ء، موضع بجگہاں، جونپور) کا طویل علالت کے بعد یکم دسمبر ۲۰۲۰ء کو ساڑھے دس بجے شب لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ تدفین ۲ر دسمبر کو بعد نمازِ ظہر دو بجے دن میں ان کے آبائی گاؤں کھیتاسرائے جون پور میں عمل میں آئی۔ مرحوم رہبر جونپوری شرافت کا نادر نمونہ تھے، اعلیٰ اخلاقی قدروں کو ماننے والے تھے نیز مشاعرہ کے کامیاب شاعر تھے۔ الفاظ کے موتی چن کر سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ہنر انہیں معلوم تھا۔ ان کی شاعری کا اگر جائزہ لیں تو داخلی، خارجی اور نفسیاتی پہلوؤں کو دلفریب انداز میں پیش کرتے تھے۔

....

● معروف شاعر، ناقد اور صحافی **مختار شمیم** (ولادت: ۱۹۴۵ء) کا ۲ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو صبح تقریباً آٹھ بجے بھوپال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کا جسد خاکی بھوپال سے ان کے آبائی گاؤں سرونج لایا گیا جہاں بعد نمازِ ظہر تقریباً تین بجے ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم مختار شمیم نئی سمت اور نئی رفتار کے رسیا تھے۔ نئی جہت کی تلاش میں وہ راہ ہموار کرتے رہے اور کامیابی کے ساتھ اپنی کلیدی حیثیت کو منواتے رہے۔ ویسے وہ ذہین تو تھے ہی، مخلص اور وضعدار بھی واقع ہوئے تھے۔ طبیعت میں یکسوئی اور ٹھنڈک تھی اسی لیے کسی تنازعہ میں ان کا نام شامل نہیں آیا۔ ان پر سرونج سے سیفی سرونجی نے انتساب کا ایک نمبر بھی شائع کیا تھا۔ اسی طرح شاعر، کاروان ادب وغیرہ کے نمبر بھی شائع ہوئے۔

....

● معروف معالج، شاعر اور کالم نویس **ڈاکٹر حنیف ترین** (ولادت یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء، بمقام سنبھل، مراد آباد یوپی مقیم جامعہ نگر، نئی دہلی) کا ۳ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو صبح ساڑھے تین بجے راول پورہ، سری نگر میں انتقال ہوگیا۔ وہ تین ماہ سے سرطان کے مرض میں مبتلا تھے اور اپنی سسرال میں تھے۔ اسی روز بعد نمازِ ظہر تقریباً تین بجے وہیں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ ڈاکٹر شمیم اختر، دو بیٹے ڈاکٹر یاسر خان، انجینئر حماد خان اور بیٹی رباب خان ہیں۔ ڈاکٹر حنیف ترین غزل اور نظم کے شاعر تھے۔ ان کے یہاں مایوسی، بے یقینی اور بے چہرگی کے ساتھ رجائیت پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب شاعری میں جہاں جدید آہنگ کی فراوانی ہے وہیں روایتی شاعری کی روح بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری میں رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ ۷۰ر اور ۸۰ر کے بعد جن شاعروں نے اپنی پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی ان میں حنیف ترین بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے بیشتر ناقدوں نے ان پر مضامین لکھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں وقت کو

پکڑنے کی کوشش کی ہے۔اسی لیے ہمہ جہتی نمایاں ہے۔ان کے کئی شعری مجموعے''رباب صحر''ا''لالہ صحرائی'' وغیرہ شائع ہوکرادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔مرحوم عرصہ تک سعودی عرب کے عرعر شمال میں بحیثیت معالج تھے۔ان کا ایک مشہور شعر ملاحظہ ہو: اڑان ٹوٹے مری فکر کی جہاں یارب وہاں نظر کے پروں کو کھلی فضا دینا

....

● معروف ادیب **ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق** (صدر شعبہ اردو، ویمنس کالج حاجی پور ویشالی مقام پوسٹ: بھیرو پور، بدو پور، حاجی پور، ویشالی، ولادت ۸رفروری ۱۹۶۱ء ولد مرحوم ممتاز احمد) کا ۳ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو بعد نمازِ مغرب پٹنہ کے نجی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔وہاں سے ار بجے شب جسد خاکی بھیرو پور لایا گیا اور ۴ر دسمبر کو بعد نمازِ جمعہ انکی تدفین عمل میں آئی۔پسماندگان میں بیوہ ارشدی فاطمہ ہیں۔مرحوم مشتاق احمد مشتاق بنیادی طور پر نثر نگار تھے اور بعض تنقیدی مضامین بھی لکھے اور کئی کتابیں بھی ترتیب دیں۔الفاظ کے جال بچھانا وہ جانتے تھے۔اسی لیے ان کی شخصیت معلومات کے گرد طواف کرتی ہے۔خاموش طبع فنکار تھے لیکن بعض رسائل اور اخبارات میں ان کی تحریریں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ان کے مضامین کا مجموعہ''ذوقِ ادب'' ہے جب کہ ان کی مرتبہ کتابیں''مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی: شخصیت اور خدمات''،''ذکی احمد: شخصیت اور شاعری'' اور''ممتاز احمد خان: ایک شخص اور کارواں'' ہیں جن کی ادبی حلقوں پذیرائی ہورہی ہے۔

....

● ہندی کے نامور ادیب اور شاعر **منگلیش ڈبرال** (ولادت: ۱۶رمئی ۱۹۴۸ء، تیہری گڑھوال، اتراکھنڈ) کا انتقال ۹ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے ایمس میں ہوگیا۔پسماندگان میں بیوہ سنکیتا، بیٹا موہت اور بیٹی الما ہیں۔آنجہانی ہم عصر ہندی شاعروں میں سب سے اہم نام شمار کیے جاتے تھے۔ان کے پانچ شعری مجموعے'پہاڑ پر لالٹین'،'گھر کا راستہ'،'ہم جو دیکھتے ہیں'،'آواز بھی ایک جگہ ہے' اور'نئے یگ میں شترو' شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے نثری مجموعے'لیکھک کی روٹی' اور'کوی کا اکیلا پن' نیز سفر نامہ'ایک بار آیووا' بھی شائع ہو چکے ہیں۔انہیں ساہتیہ اکاڈمی سمیت کئی انعامات مل چکے ہیں۔انہوں نے آخری دم تک اپنا لکھنا پڑھنا جاری رکھا۔انہوں نے ترجمہ نگاری کی، صحافت سے جڑے اور سفر نامے بھی لکھے نیز ڈراموں کا تجزیہ بھی کیا۔

....

● **سیّد محمد افضل** (آئی پی ایس، اے ڈی جی پی بھوپال، مدھیہ پردیش، ولادت: ۳ر مارچ ۱۹۶۴ء) کا طویل علالت کے بعد ۱۵ر دسمبر ۲۰۲۰ء علی گڑھ کے ایک نجی ہسپتال میں تقریباً ۸ر بجے شب انتقال ہوگیا تھا۔بعد ازاں سینکڑوں افراد نے نمناک آنکھوں کے ساتھ آج انھیں بعد نمازِ ظہر ان کے آبائی وطن مارہرہ، ضلع ایٹا (اتر پردیش) میں سپردِ خاک کیا۔مرحوم خانقاہِ برکاتیہ عالیہ قادریہ مارہرہ کے چشم و چراغ تھے۔۱۹۹۰ء بیچ کے آئی پی ایس تھے اور بطور رجسٹرار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں اپنی خدمات انجام دے چکے تھے۔نیز وہ البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی علی گڑھ کے بانی رکن تھے۔انہیں پولیس سروس میں عمدہ کارکردگی کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔انہیں متعدد زبانوں یعنی انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور ہندی پر خاصہ عبور تھا۔ان کی تحریریں''آج

کل‘‘ اور دیگر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے برادران میں سابق صدر، شعبۂ اردو اے ایم یو پروفیسر سیّد محمد امین اشرف قادری، ممتاز فکشن رائٹر سیّد محمد اشرف (آئی آر ایس) اور سیّد محمد نجیب قادری ہیں۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہے۔

....

● کولکاتا کی مشہور ملی اور سماجی شخصیت **ایس ایم معروف** (عمر تقریباً ۷۷ سال، آبائی وطن شاہ پور رہوا، ضلع ویشالی ولد عبدالحفیظ) کا ۱۶؍دسمبر ۲۰۲۰ء شام ساڑھے سات بجے ان کی رہائش گاہ رپن اسٹریٹ، کولکاتا میں انتقال ہوگیا۔ ان کی نمازِ جنازہ ۱۷؍دسمبر کو بعد نمازِ ظہر اے جے سی بوس روڈ - رپن اسٹریٹ کے چوراہے پر واقع مسجد میں ادا کی گئی اور ایک نمبر گورِ غریباں (گوبرا) قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے ہیں۔ ایک زمانے میں ایس ایم فاروق اور ایس ایم معروف دونوں بھائی کولکاتا کی ملی و سماجی سرگرمیوں کے مرکز ہوا کرتے تھے۔ دونوں بھائی ایک طرح کا کپڑا پہنتے، ایک ساتھ دفتر کے لیے نکلتے اور پروگرام میں ایک ساتھ جاتے۔ وہ منظر بڑا دیدنی ہوتا۔ غربا مساکین اور مدارس والوں میں ان کی سخاوت کے چرچے عام تھے۔ جب بھی دونوں بھائی گاؤں پہنچتے تو دروازے پر جشن کا ماحول ہوتا۔ لوگ اپنی ضرورت بیان کرتے اور بامراد ان کے دروازے سے اٹھتے۔ شاہ میاں رہوا کی مسجد، مدرسہ اور عیدگاہ گاؤں میں ان کی یادگار اور صدقہ جاریہ ہے۔ ایک زمانہ تک مکتب کے معلم، امام اور رمضان میں حافظ کا ہدیہ اور تنخواہ وہی دیا کرتے تھے۔ فاروق صاحب کے دورانِ سفرِ حج انتقال کے بعد وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ ادھر کئی برسوں سے صاحب فراش تھے۔ کولکاتا میں بے شمار مدارس کے ساتھ امارت شرعیہ کے کاموں میں بھی ان کا بھرپور تعاون ملا کرتا تھا۔ اس قدیم وضع کے لوگ اب کم ہی رہ گئے ہیں۔ دریں اثناء معروف سماجی شخصیت جناب بدرِ عالم (صدر، دربھنگہ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، کولکاتا) نے اپنی تعزیت میں کہا کہ مرحوم سوسائٹی ہذا کے بانی رکن اور صدر بھی رہے۔ فی الوقت وہ سرپرست تھے۔ اس محلے ہرن باڑی لین میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۵ء تک ان کا قیام رہا۔ ان کے ساتھ میرا رشتہ باپ بیٹے جیسا تھا۔ سیاسی میدان میں بھی ان کا اور میرا تعلق تھا۔ مرحوم یتیم خانہ اسلامیہ، کولکاتا کے ٹرسٹی اور دو دہائیوں تک اسلامیہ ہسپتال کے صدر رہے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ سے بھی برسوں تک جڑے رہے۔ ایران سوسائٹی کے سابق نائب صدر اور تاحیات رکن رہے۔ چمڑے کے بڑے تاجر تھے اور خدا ترس انسان تھے۔ جناب اخلاق احمد، محمد یونس کے علاوہ، محمد شہاب الدین ویشالوی ادب نواز، محمد آفتاب عالم، مصطفیٰ اکبر، عبدالوارث سفر وغیرہ نے کہا کہ مرحوم کی گوناں گو شخصیت چہار دانگ عالم میں مشہور تھی۔ محمڈن اسپورٹنگ کلب اور کئی دیگر اداروں سے بھی وابستہ تھے۔ ان کی رحلت سے کولکاتا کے ملی حلقوں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔

....

● کانگریس کے قدآور لیڈر، سابق مرکزی وزیر اور مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ جناب **موتی لال وورا** (ولادت: ۲۰؍دسمبر ۱۹۲۷ء) کا ۲۱؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو دہلی کے ایسکورٹس اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ۲۲؍دسمبر کو ان کی آخری رسومات سرکاری اعزاز کے ساتھ چھتیس گڑھ میں ادا کی گئی۔ وہ ایک سچے کانگریسی اور بہترین انسان تھے۔ وہ ۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۸ء تک کانگریس کے خزانچی رہے۔ پسماندگان میں دو بیٹے ارون وورا اور اروند وورا ہیں۔

● محبِ اردو، سماجی خدمت گار، معروف صنعت کار اور دوحہ میں ہندستانی طبقے کی نمائندہ شخصیت سہیل بخاری (محمد صبیح بخاری، ولادت ۳/ اپریل ۱۹۶۳ء، بھوپال، مدھیہ پردیش) کا ۲۲/ دسمبر ۲۰۲۰ء کو قطر کے مقامی وقت کے مطابق صبح ۳/ بجے حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ آج ہی بعد نمازِ عصر ابو ہمور قبرستان، قطر میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ صوفیہ بخاری اور بیٹی صائمہ بخاری ہیں۔ مرحوم دوحہ کی قدیم ترین اردو تنظیم بزمِ اردو، قطر کے سرپرستِ اعلیٰ تھے جس کے جنرل سکریٹری معروف شاعر احمد اشفاق ہیں۔ نیز وہ متعدد انجمنوں سے وابستہ رہے۔ وہ ایک زندہ دل اور خوش اخلاق شخص تھے۔ ان کی رحلت سے ادبی محفلیں سونی ہو گئیں۔ وہ ابنائے قدیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، قطر چیپٹر کی مجلسِ انتظامیہ و مشاورت کے صدر بھی تھے۔ وہ تقریباً تیس برسوں سے قطر میں مقیم تھے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم سے این سی پی یو ایل کی عالمی اردو کانفرنس میں خاصی ملاقات رہی۔ نہایت خلیق اور ملنسار تھے۔ دوحہ، قطر میں اردو والوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔

....

● عصر حاضر کے نامور افسانہ نگار اور ادیب **فاروق راہب** (ولادت: ۴/ ستمبر ۱۹۴۵ء، بمقام موتیہاری، مشرقی چمپارن) کا طویل علالت کے بعد ۲۳/ دسمبر ۲۰۲۰ء کی صبح ۵/ بجے پٹنہ کے پارس ہسپتال میں ہو گیا۔ مرحوم کا جسد خاکی موتیہاری لے جایا گیا جہاں ۲۴/ دسمبر ۲۰۲۰ء کو تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹے، بہو کے علاوہ پوتے اور پوتیاں ہیں۔ مرحوم منفرد طرز کے جدید اور ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔ ان کے آٹھ افسانوی مجموعے اور ایک نثری نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ انھیں متعدد اداروں سے انعامات بھی مل چکے ہیں۔ وہ نہایت مخلص اور شریف النفس انسان تھے۔ معروف ناقد پروفیسر انور پاشا (جے این یو) کے وہ حقیقی ماموں تھے۔ مرحوم فاروق راہب کے افسانے تواتر سے دیگر رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ اردو جریدہ ''تمثیل نو'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

....

● معروف ہومیو پیتھک **ڈاکٹر فیروز خاں** (محلّہ رحم گنج، عمر تقریباً ۶۰/ سال) کا ۲۳/ دسمبر ۲۰۲۰ء کو سٹی ہاسپٹل میں انتقال ہو گیا۔ ۲۴/ دسمبر ۲۰۲۰ء کو ۲/ بجے دن میں خانقاہِ سمرقندیہ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ مرحوم ہومیو پیتھک کے مقبول ڈاکٹر تھے اور لال باغ محلّہ میں سی ایم سائنس کالج کے قریب ان کا مطب تھا۔ ان کی رحلت سے علاقے میں سوگ کا ماحول ہے۔

....

● معروف شاعر، ادیب اور صحافی **حسن چشتی** ولد جناب سمیع احمد مرحوم، حیدرآباد (مقیم شکاگو، امریکہ) کا انتقال ۲۴/ دسمبر کی شام ۹۱/ سال کی عمر میں شکاگو میں ہو گیا۔ تدفین ۲۶/ دسمبر کو ہلروز قبرستان شکاگو میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے جاوید حسن اور واجد حسن اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ مرحوم حسن چشتی عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد میں ڈپٹی رجسٹرار رہ چکے ہیں۔ وہ نہایت ہمدرد اور خلیق انسان تھے۔ مجبوروں، بے سہاروں کی خدمت کو خوب کرتے اور وہ نارتھ امریکہ کے شکاگو کی ادبی اور سماجی محفلوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ انہوں نے اردو کی ترویج و شوق اور ترقی کے لئے کام کیا تھا اور شاعری کے ذریعہ اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے کلام میں

عمل شعور کی انفرادیت ملتی ہے جس میں ہجرت کا کرب اور عصری صورت حال کے اشکال نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال پر انہیں گرفت تھی اور اس کے استعمال سے انفرادیت پیدا کرنا جانتے تھے۔ انہیں دہلی میں منعقدہ پہلی عالمی اردو کانفرنس میں 'اسرار الحق مجاز' سے نوازا گیا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں وہ شکاگو، امریکہ منتقل ہوئے تھے۔ قدیم طلباء جامعہ عثمانیہ کی انجمن کے زیر اہتمام ۱۹۹۶ء میں مرحوم کی صدارت میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر انہیں نمائندہ دکن کا اعزاز عطا کیا گیا نیز اُسی سال شہر شکاگو (امریکہ) کی جانب سے ان کی سماجی خدمات کے اعتراف میں ایک سرکاری ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۹۷ء میں ایلڈرس کونسل آف انڈیا نے ''آرکیٹکٹ آف اُردو'' کا ایوارڈ عطا کیا۔ ایک نیم سرکاری تنظیم کا ۱۹۹۹ء میں دو سال کے لیے وہ ڈائرکٹر بھی مقرر کئے گئے۔ لاس اینجلس کی امریکن اُردو رائٹرس سوسائٹی اور اردو رائٹرس سوسائٹی آف کیلفورنیا کی جانب سے بھی مرحوم حسن چشتی کو دو دفعہ 'لائف ٹائم اچیومنٹ'' ادبی ایوارڈ بھی دیا۔ حسن چشتی مرحوم کے ادبی اور تالیفی کارناموں میں ان کا اہم کام ان کی وہ تالیف ہے جس میں انہوں نے ہندوستان کے ممتاز طنز و مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے چالیس سالہ کالموں کا انتخاب ''مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں'' ہیں جو چار جلدوں میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔

....

● ممتاز نقاد، دانشور، پدم شری **شمس الرحمٰن فاروقی**، آئی آر ایس (ولادت: ۱۵؍جنوری ۱۹۳۵ء، پرتاپ گڑھ، اتر پردیش) کا انتقال ۲۵؍دسمبر ۲۰۲۰ء بروز جمعہ گیارہ بج کر ۲۰ منٹ میں الہ آباد میں ہو گیا۔ آج ہی وہ بذریعہ طیارہ دہلی سے الہ آباد تقریباً ساڑھے دس بجے پہنچے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں ان کی اہلیہ کی قبر کے بغل میں دفن کیا گیا۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی تنقید نگار، صحافی، افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ اردو میں جب جدیدیت کی لہر آئی تو ہندوستان میں اس کی علمبرداری انہوں نے کی اور اپنے رسالہ ''شب خون'' کو جدیدیت کے رجحان کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے جدیدیت سے متاثر ایک نسل کی آبیاری کی اور بہت سارا نیا مواد اردو کے سرمائے میں اضافہ کرنے کے لئے دیا۔ وہ پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی نگاہ کلاسیکی ادب پر بھی تھی اور میر تقی میر کی غزلوں کی انہوں نے خوب خوب تشریح کی جس سے استفادہ کرنے والوں میں پرانے قلم کار شامل رہے ہیں۔ کئی ہفتہ قبل ایک خبر آئی تھی کہ وہ کورونا وائرس کے شکار ہو گئے ہیں اور دہلی میں زیر علاج ہیں حالانکہ کورونا کا ان پر اثر کم تھا لیکن اتنی تعداد میں اموات سے شبہ ہوتا ہے کہ کورونا کا خوف ان کے ذہن و دل میں بس گیا تھا۔ ان کا ایک مشہور شعر اس طرح ہے:

تری دنیا میں اب رہنا نہیں ہے　　بنائیں گے کئی دنیا ہم اپنی

انہوں نے ۱۹۵۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ ان کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا ادبی حلقوں میں خوب چرچا رہا۔ انہیں ۱۹۸۶ء میں 'ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ' سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کی میر تقی میر سے متعلق کتاب ''شعر شور انگیز'' (چار جلدوں میں) پر ۱۹۹۶ء میں 'سرسوتی سمان' ملا جو برصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے۔ انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی سند سے بھی

نوازا تھا۔انہوں نے لغت نگاری، داستان، عروض، ترجمہ یعنی ادب کے ہر میدان میں تاریخی نوعیت کے کارنامے انجام دیئے۔۲۰۰۹ء میں انہیں ''پدم شری'' سے بھی سرفراز کیا گیا۔ان کی تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اردو جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ نے ایک شمارہ ''اردو ادب کے رجحان ساز'' شائع کیا تھا جس میں ڈاکٹر امام اعظم نے ان کی نذر ایک قطعہ کیا تھا جو اس طرح ہے:

وادیٔ اردو میں ہے 'شب خوں' یہ کیا؟ ہاتھ میں اس کے ادب کی تھی زمام

شمس رحماں یعنی فاروقی جناب وہ جدیدیت کے ہیں بے شک امام

....

● اردو کے معروف شاعر **عرش صہبائی** (اصل نام: ہنس راج ابرول، ولادت: ۳؍دسمبر ۱۹۳۰ء، سیری، مقیم: ریشم گھر کالونی، جموں) کا انتقال ۲۵؍دسمبر ۲۰۲۰ء ہو گیا۔دوسرے روز ۲۶؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ آنجہانی نہایت مخلص، پرانی قدروں کے امین اور کلاسیکی لب و لہجے کے شاعر تھے۔کشمیر کے قلمکاروں کے حوالے سے ان کی شناخت تھی۔ماہنامہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی میں وہ مسلسل لکھتے رہے۔دیگر ادبی رسائل میں بھی اپنی موجودگی کا اظہار دلاتے رہے حالانکہ وہ خاموش طبع انسان تھے اور اپنا مخصوص حلقہ رکھتے تھے اسی لئے ان کی طرف بیشتر قلمکاروں نے توجہ نہیں دی۔وہ فن عروض پر دسترس رکھتے تھے اور ایک لمبی عمر تک اردو کی آبیاری کی۔نصف درجن سے زیادہ ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔آنجہانی ہندو پاک دونوں میں ہی مقبول تھے۔

....

● اردو کی تیسری بستی کی مقبول شاعرہ **رشیدہ عیاں** (نیو جرسی، شمالی امریکہ) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۲۶؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو ان کی بڑی بیٹی کے یہاں کنساس میں ہو گیا۔وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔انہوں نے ۱۹۵۰ء سے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ان کے دو شعری مجموعے ''پرواز جاری ہے'' اور ''حرف اعتبار'' شائع ہو چکے ہیں۔دو جلدوں پر مشتمل نثری کتاب ''روشنی کا سفر'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔نیو جرسی میں اردو مرکز کے مشاعروں میں وہ اکثر شریک ہوتی تھیں۔ان کے اندازِ بیان میں تازگی تھی، ہجرت کا المیہ تھا اور حالات حاضرہ کے غم کا دکھ بھی تھا۔ان کے لہجے میں جہاں غنائیت تھی وہیں نسوانی انداز کی شگفتگی بھی تھی۔وہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔

....

● نئے لب و لہجے کے شاعر **سچید انند انساں** (ایڈووکیٹ، بھاگلپور سول کورٹ، عمر تقریباً ۷۵؍سال) کا انتقال ۲۶؍دسمبر ۲۰۲۰ء کی صبح بھاگلپور میں ہو گیا۔اسی روز شام میں ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔وہ اپنے پیشے سے زیادہ اُردو کے شاعر تھے۔اردو میں غزل، نظم اور ماہیہ میں ان کا وافر سرمایہ ہے۔ان کا مجموعہ اشاعت کے لئے تیار تھا لیکن اس سے قبل ان کی رحلت ہو گئی۔حالات کا غم، انسانیت کا درد اور سعیٔ عمل کی روشنی ان کے کلام میں ملتی ہے۔

....

● بزرگ شاعر **کمال جائسی** (ولادت ۱۵؍اپریل ۱۹۳۷ء بمقام جائس، ضلع رائے بریلی، یوپی ولد: عبدالحمید کوثر جائسی، مستند شاعر) کا انتقال ۲۷؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو رات کے ۹؍بجے میرا روڈ، ممبئی کے غازی اسپتال میں طویل علالت کے

بعد ہوگیا۔ ۲۸ر دسمبر ۱۱ر بجے میرا روڈ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک معذور بیٹا ہے۔ وہ کانپور سے ۱۹۹۸ء میں میرا روڈ، ضلع تھانے منتقل ہوئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ مشاعروں میں ترنم سے کلام پیش کرتے اور ڈھیروں داد وصول کرتے۔ ان کے تین مجموعہ ہائے کلام ''نامہ و پیام'' (۱۹۷۰ء)، ''سادہ ورق'' (۱۹۸۵ء) اور ''کھو گیا جواب دوں'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تفصیل سلیم عنایتی اور فاروق جائسی کی مرتبہ کتاب ''تذکرہ شعرائے کانپور'' میں موجود ہے۔ ان کا ایک مشہور شعر اس طرح ہے

اے ساکنانِ شہرِ طرب دکھ نہ دو ہمیں　　فکر و نظر کی دھوپ میں ہم چل کے آئے ہیں

....

● مستند محقق اور ادیب پروفیسر ظفر احمد صدیقی (سابق چیئرمین، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ولادت: ۱۰ر اگست ۱۹۵۵ء بمقام ضلع: بدایوں، وطن: گھوسی، اعظم گڑھ، موجودہ مؤناتھ بھنجن، اتر پردیش) کا انتقال ۲۹ر دسمبر ۲۰۲۰ء دن کے ڈھائی بجے انتقال ہوگیا۔ ۳۰ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو صبح ۹ ر بجے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۲ر بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکی شاعروں کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جن کو اب تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ اہم شعری صنف قصیدہ کی ہیئت اور حدود سے بھی بحث کی تھی۔ ان کی ۷ر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ''شبلی شناسی کے اولین نقوش''، ''تحقیقی مقالات''، ''دیوانِ ناظم''، ''افکار و شخصیات'' وغیرہ اہم ہیں۔ وہ ۱۷ر پی ایچ ڈی اور ایم فل ریسرچ اسکالرز کی نگرانی کر چکے ہیں۔ درس و تدریس سے ان کی وابستگی تقریباً ۴۰ر برسوں کو محیط تھی۔

....

● ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے شعبۂ اردو کے سابق استاد ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی (ولادت: ۳ر نومبر ۱۹۵۳ء بمقام پوناس، کشن گنج، ولد جناب اکمل یزدانی مرحوم) کا انتقال ۳۰ر دسمبر ۲۰۲۰ء شب پارس ہسپتال، پٹنہ میں ہوگیا۔ انہیں ایک ہفتہ قبل فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ان کا جسدِ خاکی پوناس لایا گیا جہاں ۳۱ر دسمبر ۲۰۲۰ء بعد نمازِ ظہر مولانا عابد نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور انھیں وہیں آبائی قبرستان میں سیکڑوں نمناک آنکھوں سے سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ مرحوم نومبر ۲۰۱۸ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی سے سبک دوش ہوئے تھے اور ان دنوں پوناس میں مقیم تھے۔ انھوں نے اس یونیورسٹی میں نومبر ۱۹۸۲ء میں جوائن کیا تھا۔ بڑی باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ طلبہ سے ذہنی قربت رکھتے تھے۔ انھوں نے ''پورنیہ میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی تھی اور ان کے مضامین رسائل و جرائد میں گاہے گاہے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں راقم الحروف کے علاوہ ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر آفتاب اشرف، پروفیسر سیّد احتشام الدین، ہلال عالم غزالی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، احتشام الحق، آفتاب احمد وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان کی نگرانی میں پہلی پی ایچ ڈی ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے ''منظر شہاب: شخصیت اور فن'' کے عنوان سے کیا تھا۔

ادارہ ان حضرات کے سانحۂ ارتحال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔.....................(ڈاکٹر امام اعظم)

☆☆☆

امانؔ ذخیروی (جموئی، بہار)

حمدِ باریِ تعالیٰ

ہر برگ و شجر کے جو رگِ جاں میں بسا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
اُن چاند ستاروں سے عیاں جس کی ضیا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
محتاج یہاں جس کا ہر اک شاہ و گدا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
ہے کون جو ہر کام کا انجام رسا ہے؟
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
ہر پھول کی خوش رنگ ادا جس کی عطا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
ہر بھٹکتے مسافر کی جو منزل کا دیا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
اک جس کے اشارے میں یہ بارش، یہ ہوا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
تاثیر کی محتاج دعا ، جس کی دوا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
ہر حال میں مطلوب ہمیں جس کی رضا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے
صدقے میں امانؔ جس کے رواں تیری نوا ہے
وہ میرا خدا ، میرا خدا ، میرا خدا ہے

عبدالوارث سفرؔ (کولکاتا)

نعتِ پاک

ہو مکرر درود و سلام آپ کا
مشغلہ ہو سفرؔ کا یہ جام آپ کا
پڑھ لو صلِ علیٰ ، پڑھ لو صلِ علیٰ
ذکر میں جب بھی آتا ہو نام آپ کا
آپ کی بات کا مرتبہ کیا کہوں
وحی کی بات ہے سب کلام آپ کا
آپ نے تزکیہ کر دیا اس طرح
جنتی ہے ہر ادنیٰ غلام آپ کا
ہر طرف دیکھیے ہر طرح سوچئے
حق بجانب سدا ہے کلام آپ کا
آپ کے ہم نشیں مثلِ شیر و شکر
تربیت کا ہے اعلیٰ نظام آپ کا
عدل و انصاف کی انتہا آپ ہیں
منصفی میں بھی اوّل ہے نام آپ کا
محترم ہوگئی وہ جگہ اور زمیں
ہوگیا جس پہ تھوڑا قیام آپ کا
ہے محبت کی بھی انتہا ذات پاک
عاشقی میں ہے اول مقام آپ کا
اب سفرؔ کیا کرے مدحتیں آپ کی
رب نے اعلیٰ بنایا مقام آپ کا

حضرت سیّد محمد ولی رحمانی کے خطوط ڈاکٹر امام اعظم کے نام

مونگیر (بہار) مورخہ 11 مارچ 2020ء

برادرعزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اللہ کرے خیر وعافیت کے ساتھ ہوں۔ آپ کی بھیجی ہوئی کتاب ' گیسوئے افکار' ملی۔ پہلی نظر میں تو یہ سمجھا کہ یہ کوئی شعری مجموعہ ہے، یا پھر اس کتاب میں آپ کے افسانے ہیں، مگر الٹا پلٹا، کھول کر دیکھا، کچھ صفحہ گردانی کی تو پتہ چلا کہ اس میں زلف برہم اور گیسوئے پرخم کی کوئی کہانی نہیں ہے، یہ آپ کے اچھے خاصے سنجیدہ مضامین کا مجموعہ ہے اور کام کی چیز ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ قلم کی امانت سے نوازا ہے، اور یہ موقعہ دیا ہے کہ اس کے نقوش کاغذ پہ پھیلاتے رہیں، اور پھر وہ کتاب کی شکل میں لوگوں تک پہنچتی رہے، آپ کی تمام کتابوں اور خاص کر 'گیسوئے افکار' کی طباعت پر مبارکباد قبول کیجئے، یہ کتاب خوبصورت چھپی ہے، ٹائٹل بھی عمدہ ہے، طباعت صاف ستھری اور اچھی ہے، کاغذ بھی بہترین ہے۔ اردو کتاب اگر ان خوبیوں کے ساتھ سامنے آئے تو ''یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔'' بخیر ہوں اور آپ کی صحت وعافیت اور حسن خدمت کا طلبگار! والسلام: محمد ولی رحمانی

(۲)

مونگیر (بہار) مورخہ 10 اکتوبر 2020ء

عزیز مکرم ڈاکٹر امام اعظم صاحب! سلام مسنون

آپ کی بھیجی دو کتابیں ملیں، پہلے ''چٹھی آئی ہے!'' اور بعد میں ''پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار''۔ پہلی کتاب تو میں پڑھ گیا، دوسری کتاب سامنے ہے۔ آپ نے ٹائٹل پر بڑی تاریخی تصویر لگائی ہے۔ یہ تصویر انگریزوں کی بربریت کی گواہ ہے، مجھے افسوس ہے کہ ایسی تصویروں کی تحقیق کر کے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ یہ کون عالم دین ہیں جو توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیے گئے، ہم لوگوں میں نہ اپنی تاریخ کو لکھنے کا جذبہ ہے اور نہ بزرگوں کی قربانیوں کو علمی رنگ میں پیش کرنے کا سلیقہ! یہ تو بہت سی کتابوں میں لکھا مل جاتا ہے کہ دلی سے لے کر پشاور تک علما اور مختلف علاقوں کی نمایاں شخصیتوں کی نعشیں سڑک کے کنارے درختوں پر ٹنگی ہوئی تھیں اور ہر ایک درخت اس کی شہادت پیش کر رہا تھا، مگر کسی نے بھی ان شہیدوں کی کوئی ایسی چیز پیش نہیں کی جسے مضبوط بات کہا جا سکے۔ یہ تعداد کسی نے تو نو ہزار لکھی ہے کسی نے گیارہ کسی نے انیس ہزار کسی نے اکیس ہزار اور چلتے چلتے یہ بھی کتابوں میں مل جاتا ہے کہ ان شہیدوں کی تعداد باون ہزار تھی۔ اب بھلا بتائیے! یہ نو ہزار سے لے کر باون تک کی تعداد ہے کس پر یقین کیا جائے، آدمی اس پر صرف ماتم ہی کر سکتا ہے!

ایک عبرت آمیز واقعہ سن لیجئے۔ میں وزیر اعظم راجیو گاندھی سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے ان شہیدوں کی کوئی تعداد بیان کی، راجیو گاندھی نے مجھے فوراً روکا اور کہا کہ اس تعداد میں بڑا اختلاف ہے۔ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور الگ الگ گنتی بتاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بھارت کی تاریخ کا اندوہناک حصہ ہے مگر تعداد کا یہ فرق لوگوں کے ذہن کو منتشر کر دیتا ہے۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ ایک میٹنگ بلا کر یہ طے کر لیجئے کہ اس واقعہ میں کتنے لوگوں نے

وطن عزیز کے لئے قربانیاں دیں اور پھر ایک طے شدہ تعداد سب لوگ کہا کریں۔

آپ نے اپنے پیش لفظ کے صفحہ نمبر ۱۰ اور صفحہ نمبر ۱۱ پر لکھا ہے: ''اس قومی سمینار میں تصویروں کی زبانی، مفکرین کے ذریعہ سیاست دانوں کے توسط سے، ملک گیر ادبی شخصیتوں کی شرکت سے اور پاکستان کے عظیم شاعر احمد فراز کی موجودگی کے حوالہ سے یہ بتایا گیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہی آزادی کی پہلی جنگ تھی۔''

میں نہیں سمجھتا کہ یہ جو آپ نے ''ہی'' بڑھایا، اس پوری کتاب میں اس ''ہی'' کی کوئی دلیل ہے! اور احمد فراز صاحب چاہے جتنے بڑے شاعر ہوں ان کی موجودگی کو اس ''ہی'' کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا اور نہ احمد فراز صاحب نے تاریخ دانی کا کبھی دعویٰ کیا، نہ ادبی شخصیتوں نے کبھی تاریخ کے اس حصہ پر مغز پاشی کی مگر آپ ماشاء اللہ ان حضرات کے ذریعہ سے ایک تاریخی واقعہ میں ''ہی'' بڑھا رہے ہیں، آپ ہی بتایئے اس ''ہی'' کی کیا قیمت ہے؟

یاد آتا ہے کہ اس سلسلہ میں میں نے آپ کو خط لکھا تھا اور اپنا مضمون بھی بھیجا تھا جو اصل میں آپ کی کسی کتاب کے عنوان سے متعلق تھا جسے آپ نے مجھے بھیجا تھا، (مشکور ہوں کہ آپ نے میرے مضمون کو پیش نظر کتاب کا حصہ بنایا) کم از کم آپ کو اپنے پیش لفظ میں یہ 'ہی' نہیں بڑھانا چاہئے تھا اور آپ کو 'ہی' بڑھانے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ اس 'ہی' کے ذریعہ سے آپ نے نہ جانے کتنے مجاہدین آزادی کے خون کو اپنے جانتے، اپنے قلم کے سہارے دھو ڈالا۔ اس 'ہی' کو سامنے رکھئے اور مجھے بتایئے کہ اس 'ہی' کے بعد ٹیپو سلطان کہاں جائیں گے؟ حافظ رحمت خان کا بلند کردار کس خانہ میں رکھا جائے گا؟ بیگم حضرت محل اور وطن پر جان نثار کرنے والے ان کے ساتھیوں کا کس طرح ذکر کیا جائے گا، اگر یہ 'ہی' صحیح ہے تو بکسر کی جنگ 'ہی ہی' میں ہی چلی گئی۔

تاریخ گرچہ آپ کا موضوع نہیں ہے لیکن کچھ تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ اگر ادب زندگی کے لئے ضروری ہے تو تاریخ بھی قابل قدر چیز ہے اور اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آپ لوگ تو ماشاء اللہ نئے افق و آفاق کی تلاش میں رہتے ہیں، پھر تاریخ میں تقلید کیوں؟ آپ تو جانتے ہیں کہ بھارت میں تاریخ دانوں کے دو دھڑے ہیں، جو اپنی اپنی مصلحتوں سے تاریخ کا جغرافیہ لکھتے رہتے ہیں— کارل مارکس نے کتاب لکھ دی ''بھارت کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' اور سارے لیفٹسٹ کا قبلہ متعین ہوگیا— دہلی میں پہلی مرتبہ ہندوؤں کی تاریخ میں یہ حادثہ ہوا کہ چار ہزار ہندوؤں نے پچیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ حوصلہ اور ہمت دکھائی اور آگے بڑھ کر وطن کی آزادی کے لئے اپنی جان نچھاور کی۔ رائٹسٹ مورخین کے لئے یہ تعداد بہت بڑی چیز تھی اس لئے انہوں نے اسے پہلی جنگ آزدی کا نام دیا، حالاں کہ آزادی کے لئے یہ پہلی نہیں، آخری مسلح جنگ تھی۔

ابھی آپ جواں سال ہیں۔ تاریخ اور اس کی تہوں پر غور کرنے کا موقعہ ہے، اور پڑھنے کے لئے وقت ہے۔ کچھ پڑھ جایئے اور ان لوگوں کے ساتھ انصاف کیجئے جنہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے لئے وطن عزیز پر اپنی جانیں قربان کردیں۔ گرچہ وہ دہلی کی جنگ میں شریک نہیں تھے۔ آپ کی دونوں کتابوں کے لئے بہت شکریہ! ''چٹھی آئی ہے'' پر پھر کبھی۔

والسلام محمد ولی رحمانی

☆☆☆

مشرف عالم ذوقی: سوانحی کوائف

قلمی نام: مشرف عالم ذوقی، اصل نام: مشرف عالم، پیدائش: ۲۴؍مارچ ۱۹۶۳ء، وطن: آرہ (بہار)
والد کا نام: مشکور عالم بصیری، والدہ کا نام: سکینہ خاتون، شریکِ حیات: تبسم فاطمہ، اولاد: عکاشہ عالم

تصانیف

ناول: (۱) عقاب کی آنکھیں، (۲)، نیلام گھر، (۳) شہر چپ ہے، (۴) ذبح، (۵) مسلمان، (۶) بیان، (۷) پوکے مان کی دنیا (۸) پروفیسر ایس کی عجیب داستان، (۹) لے سانس بھی آہستہ، (۱۰) آتش رفتہ کا سراغ، (۱۱) نالہ شب گیر (۱۲) مرگ انبوہ، (۱۳) مردہ خانہ میں عورت، (۱۴) ہائی وے پر کھڑا آدمی، (۱۵) وشت لا یعنی

افسانوں کے مجموعے (اردو): (۱) بھوکا ایتھوپیا، (۲) منڈی، (۳)، غلام بخش، (۴) صدی کو الوداع کہتے ہوئے، (۵) لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، (۶) ایک انجانے خوف کی ریہرسل، (۷) نفرت کے دنوں میں، (۸) منتخب افسانے، (۹) منتخب افسانے، (۱۰) ذوقی کے منتخب افسانے- تین حصے (ویب سائٹ www.oneurdu.com پر، ڈاون لوڈ کیا جا سکتا ہے۔)

(ہندی): (۱) غلام بخش، (۲) فرشتے بھی مرتے ہیں، (۳) فزکس، کیمسٹری، الجبرا، (۴) بازار کی ایک رات، (۵) مت روسا لگ رام، (۶) فرج میں عورت، (۷) امام بخاری کا نیپکن، (۸) لیبارٹری، (۹) ذوقی کی سریشٹھ کہانیاں، (۱۰) ذوقی کی متنوع کہانیاں، (۱۱) شاہی گلدان، (۱۲) ذوقی کی حسیت کہانیاں، (۱۳) بے حد نفرت کے دنوں میں، (۱۴) سارا دن سانجھ (بزرگوں کی کہانیاں)، (۱۵) ایک انجانے خوف کی ریہرسل، (۱۶) شاہکار کہانیاں

تالیف: (۱) سرخ بستی (دو حصے)، (۲) وبھاجن کی کہانیاں، (۳) منٹو پر آٹھ کتابیں، (۴) عصمت کی منتخب کہانیاں، (۵) بیدی کی منتخب کہانیاں، (۶) جوگندر پال کی منتخب کہانیاں، (۷) احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیاں، (۸) مسلم بانی عورتوں کی کتھا، (۹) احمد فراز کی منتخب شاعری، (۱۰) ہنس کا مسلمان نمبر (اصغر وجاہت کے ساتھ معاونت)، (۱۱) اداس نسلیں

تنقید: (۱) جدید افسانہ ۱۹۷۰ کے بعد، (۲) اردو ساہتیہ سنواد کے سات رنگ، (۳) اپنا آنگن، (۴) اردو جگت، (۵) میں، اردو اور مسلمان، (۶) روان کبیر، (۷) تسلسلِ روز و شب، (۸) ادبی اسکرپٹ، (۹) اردو افسانے کے سو برس، (۱۰) اردو ناول کے سو برس

بچوں کا ادب: کنگن **ڈرامے:** (۱) گڈبائے راجنیتی، (۲) اک سڑک ایودھیا تک، (۳) چار ڈرامے

ذوقی پر کتابیں: ۱- ذوقی فن اور شخصیت (شگفتہ پروین)، ۲- لے سانس بھی آہستہ (جہاں نظیر)، ۳- ذوقی تخلیق اور مکالمہ (ڈاکٹر تسنیم فاطمہ)، ۴- معاصر افسانہ اور ذوقی (ڈاکٹر شہزاد انجم)، ۵- مشرف عالم ذوقی: عہد ساز شخصیت (الماس فاطمہ)، ۶- جدید حسیت کا فکشن نگار: ذوقی (ڈاکٹر مشتاق احمد) ۷- جائزہ (سہ ماہی) میں خصوصی گوشہ، ۸- امکان لکھنؤ میں ایک شمارہ ذوقی کے نام، ۹- چہار سو، ۱۰- کسوٹی جدید، ۱۱- تمثیل نو

قسط وار: ۱۰۰ سے زیادہ ڈاکومینٹری، مسلمان، رات چور اور چاند جیسے ناولوں پر سیریل، ۱۹۸۸ سے مسلسل دور درشن اور منسٹری کے لیے مسلسل پروگرام بنانے کا سلسلہ جاری، اردو شاعری، اردو صحافت پر پروگرام، شخصیات پر مختلف پروگرام، قرۃ العین حیدر پر ڈاکومنٹری

انعامات: فروغِ اردو دوحہ قطر انعام 2015، 15 سے زائد دیگر انعامات و اعزازات

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مشرف عالم ذوقی کا آویزش بھرا ناول ''مرگِ انبوہ''

نئی جہت، نئے رجحان اور نئے ماحول کے اثرات کو ناول کی زبان میں بیان کرنے کا نام مشرف عالم ذوقی ہے۔ادب اور آدمیت کے شعوری عمل کا مکمل احاطہ کرنے کا اور طراز البدی امیج کو سمجھنے اور سمجھانے کا ان کا الگ انداز ہے اسی لئے وہ دوسروں سے منفرد ہیں۔

مشرف عالم ذوقی بے پایاں اڑان کے خواہش مندر ہے ہیں۔عمومی اور افقی جہات میں خوشبو کی طرح پھیلتے ہیں اور عصری واقعات وسانحات کو جذباتی خروش کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔وہ ہمہ وقت وجود اور خیال سے تعلق پیدا کر کے لمس آشنا روزن کو بصارت اور بصیرت سے آشنا کرتے رہتے ہیں۔تخلیقی اپج سے کام لے کر شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی نفسیات کی تہہ در تہہ کائنات کی کہکشاں کو مکانی اعتبار بخشنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔لکیروں کے اژدہام میں آشنا اور نا آشنا آواز کو نئی پہچان عطا کرنے کے لئے یافت پر منتج ان کا ناول ''مرگِ انبوہ'' بھی ہے۔ اس میں غائر وعمیق مطالعہ ہے، نکھرتے سنورتے روپ کی دھار ہے اور تہذیب وثقافت کی جاندار، حیات آفریں اور بصیرت افروز عکاسی ہے۔اس ناول میں ماحول، کردار، تخاطب اور متغیر ترکیبی عمل کا جو وحدت پذیر تجربہ ہے وہ برف کے گالے کی طرح بزم آرائی کرتا ہے اور انسلاکاتی طور پر محراب دار آئینہ بن کر عکس در عکس کو معنی خیز اور تجسس آمیز بناتا ہے۔اس لئے کہ اس میں فاشزم اور کمیونزم ہے جس کی بنیاد نیکی اور بدی پر استوار ہے۔حالانکہ اس ناول میں خدا کو لہولہان دیکھنے کی ایلومینائی کوشش بھی ہے۔اخلاقیات کی فضولیات پر طنز ہے۔دہشت، خوف، بارود، تباہی اور زوال کے قدروں کی چاپ ہے۔معاشرے کے فریب کا ڈھلوان ہے اور وہ سب کچھ ہے جو حیرت ناک صورت حال کی تفہیم کو سامنے لاتا ہے۔ساتھ ہی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی امکانی تلازمات کی شدت سے احساس کو مجسم کرتا ہے۔زمانی حالت کے پیش منظر کے معنی خیز اوقاف کی ایک مثال دیکھئے:

> ''میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔یہ دور شیطانوں کا ہے۔آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو شیطان بننا ہوگا۔میں نے ممی سے پوچھا......تم جانتی ہو ایلومنائی کون ہوتے ہیں'' ...... ایلومنائی ...... فلم، اسپورٹس، سیاست، یہاں جو بھی بڑا ہے وہ ایلومنائی ہے۔شیطان کے پجاری۔پوری فلمی دنیا ایلومنائی ہو چکی ہے۔اب یہ لوگ تمہارے خداؤں سے کچھ نہیں مانگتے۔یہ شیطان سے پاور مانگتے ہیں اور شیطان انہیں پاور سے نوازتا بھی ہے۔''

ماحول میں تحرک پیدا کرنے کے لئے مشرف عالم ذوقی بھوتہا حویلی میں لے جاتے ہیں اور حسی پیکر کو متشکل کر کے خوف کے ماحول سے قاری کو نکالتے ہیں اور شکست وریخت کی صورت حال کا اندازہ لگاتے ہیں:

> ''تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔سندھ کی تہذیب مٹ گئی۔سومیرین، میسوپیٹامین، ایرانی تہذیب......
> آج ان کے وجود تک کا پتہ نہیں۔یہ ایلومنائی تھے جنہوں نے آہستہ آہستہ تمام تہذیبوں کے نشان

غائب کر دیئے۔ جو طاقتور ہوگا وہی حکومت کرے گا۔''

آج اکیسویں صدی کا نوجوان طبقہ تجربے کے نام پر اپنے بدن کی مٹی کو قوت نمو سے کس طرح گذارتا ہے، کس طرح پراگندہ ذہن آلودہ ہوتا جارہا ہے اور عملی اطلاق کی اختراعی طاقت دھند کے سحر میں کھوتا جارہا ہے۔ اس کی ایک مثال خودکشی کرنے کے طریقے کو آزمانے میں ملاحظہ کیجئے:

''یہ سوچ اس پر حاوی تھی کہ وہ تجربہ کرنے جارہا ہے یا مرنے جارہا ہے؟ مان لیا گلے میں پھندہ ڈال دیا اور کرسی کا توازن بگڑ گیا۔ اس صورت میں پھندہ گلے میں کس جائے گا اور موت یقینی ہے۔ اس نے سنا تھا، اس طرح خودکشی کرنے والوں کی زبانیں باہر نکل آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ سچ نہیں ہو، مگر سارا زور آنکھوں پر پڑے گا۔ اس نے آوارہ خیالوں کو پرے کیا اور پھندے کو چھو کر دیکھا۔ اب باری گلے میں پھندہ ڈالنے کی تھی۔ اس نے گلے میں پھندہ ڈال دیا اور ہاتھوں سے آہستہ آہستہ پھندے کو کسنے لگا۔ ایک ایسا مقام آیا جب اس کے گلے سے گھڑ گھڑانے کی آواز نکلنے لگی۔ آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ اس نے پھندے کو ڈھیلا کیا۔ ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا کہ پھندہ ڈال کر، کرسی گرا کر بھی دیکھا جائے۔ لیکن ریمنڈ کو یقین تھا، کرسی گرنے کے بعد ساری ترکیبیں ہوا ہو جائیں گی......''

مشرف عالم ذوقی کا کہنا ہے کہ نئی نسل موبائل اور ان گنت کھیل کی وجہ سے موت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے جسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں ہے۔ اندیشے کی بو چاروں طرف پھیلتی جارہی ہے پھر بھی لوگ (گارجین، اساتذہ) ناک بند کئے ہوئے ہیں اور تیزاب جیسے احساس اور جذبے کے رگ و ریشے پر دھیان نہیں دے رہے ہیں:

''ایک گیم ہے، دی پاس آوٹ چیلنج۔ اس میں دو لوگ ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں اور ہر کہانی موت پر ختم ہوتی ہے۔ ایک گیم ہے دی سالٹ اینڈ آئس چیلنج۔ نمک اور برف کے اس کھیل کا اثر سیدھے نوجوانوں کے جسم پر پڑتا ہے۔ نوجوان نسل اپنے کارنامے دکھانے کے لئے اس کے ویڈیو بھی لیتی ہے۔ یہ کھیل بھی موت کے انجام پر ہی پہنچتا ہے۔ اسی طرح ایک گیم فائر چیلنج ہے۔ اس گیم میں جسم کے جل جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن نوجوان اس کھیل کو بھی پسند کرتے ہیں۔ ایک کھیل ہے دی کٹنگ چیلنج، اس میں جسم کے کئی حصوں پر بلیڈ یا چھری سے کٹنگ کرنا ہوتا ہے۔ یہ کھیل بھی موت کو دعوت دینے جیسا ہے۔ وقت کے ساتھ ایسے کھیلوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

مشرف عالم ذوقی نے موت کو کئی انداز سے اس ناول میں ڈسکس کیا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے اور مادی آسائش حاصل کرنے کی تیز دوڑ کا ساتھ دینے کی اخلاقیات کو مسخ کرنے والی طاقت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ جذب و مستی کی از خود رفتگی کے طبقاتی تضاد میں موت کا سایہ ہر قدم پر ہے جو نئی تہذیب کی دین ہے۔ اور دھند کی چادر کے شور میں گم شدگی کی تلاش سے وابستہ ہے:

''میں تسلیم کرتی ہوں کہ انسانی زندگی ابھی بھی ایسا معمہ ہے جسے نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ سمجھایا جاسکتا ہے اور میں سمجھتی ہوں، موت زندگی کی ایجاد نہیں ہے۔ موت میرے لئے ایک دہشت ہے اور اصل

زندگی کا طلسمی انداز ہے۔ جادوئی انداز سے ایک مکمل زندگی تبدیل ہو رہی ہے۔ ہم ایک ایسے دور کے گواہ ہیں جہاں بڑے بڑے پیسے والے لوگ سو سے زیادہ عمر یا کبھی نہ مرنے کے جادوئی نسخوں پر کروڑوں اور اربوں روپے کا سرمایہ خرچ کر رہے ہیں۔ امید بھی جادو اور زندگی بھی۔''

انسان کا سفر روز ازل سے ناپختہ تہوں سے آگ کریدتا رہا ہے۔ تلاش جاری ہے۔ تسکین اور تکمیل پر منتج غیر متزلزل احساس تجسس کی تشفی کو منتہائے مقصود بناتا رہا ہے۔ توسیع پسندانہ جذبے کے بنجر پن کے لئے مشرف عالم ذوقی نے بھی وقوع پذیر تلاش کے سلسلے کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا ہے تاکہ شریک عنصر کی صورت پذیری سامنے آسکے:

''جتنا اپنے پیار کو تلاش کرنا ضروری ہے اتنا ہی اس کام کو تلاش کرنا ضروری ہے جس سے آپ سچ مچ مزہ لیتے ہیں۔ آپ کا کام آپ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہوگا۔ اور Truly Satisfied ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ وہ کریں جسے آپ سچ مچ ایک بڑا کام سمجھتے ہوں۔ اور بڑا کام کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ وہ کریں جسے آپ انجوائے کرتے ہوں۔ اگر آپ کو ابھی تک وہ کام نہیں ملا ہے تو آپ ٹھہریئے مت۔ اسے تلاش کرتے رہئے جیسا کہ دل سے وابستہ ہر چیز میں ہوتا ہے...... وہ جب آپ کو ملے گا تب آپ کو پتہ چل جائے گا...... اور جیسا کہ کسی اچھے تعلقات میں ہوتا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور اچھا ہوتا جائے گا۔ اس لئے تلاش کرتے رہئے۔ ٹھہریئے مت۔''

ذاتیات سے اوپر اٹھ کر مشرف عالم ذوقی نے اپنے ملک کی موجودہ حکومت پر ضرب کاری کی ہے اور تشبیہ اور استعارے سے کام لے کر سیاسی کانٹوں کی نمائش کی ہے اور صورت گر طبقاتی رجحان اور تضاد کے وجود کو الگ طریقے سے پہچاننے کی کوشش کی ہے:

''ایک دلچسپ فنتاسی کا حصہ بی مشن تھا جس نے آہستہ آہستہ سیاست سے سماج، معاشرے اور ثقافت پر قبضہ کر لیا تھا۔ پورا ہندوستان اچانک ان کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ یہ آن لائن ممبرز بنا رہے تھے اور ان کے ممبرز کی تعداد کروڑوں پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد والے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں پھیل گئے۔ انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ صبح 8 بجے سے یہ لوگ دو چار میز کرسیاں لگا کر بیٹھ جاتے اور اسکول کے بچوں سے لے کر طلبا تک کو مشن کا ممبر بنا لیتے۔ ان کی مخالفت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک اسکول سے دوسرے اسکول، ایک شاخ سے دوسری شاخ، ایک ریاست سے دوسری ریاست، یہ پورے ملک بلکہ چپہ چپہ پر پھیل گئے تھے۔ معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ بی مشن نے شہر، گاؤں کی سڑکوں، چوراہوں پر بھی ممبر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس سے ممبر بننے والوں کو کئی فائدے تھے۔ جو کام ڈٹرجنٹ پاؤڈر یا رِن صابن نہیں کر پاتے تھے وہ کام آسانی سے بی مشن کا حصہ بنتے ہی ہو جاتا۔ مجرموں کے گناہ دھل جاتے۔ دست درازی اور ریپ کے گناہگار ملزمین کو آزادی مل جاتی۔ طور طریقے اس حد تک بدل گئے کہ جب ایک مسلم چھوٹی بچی کے ساتھ گینگ ریپ ہوا تو گینگ ریپ کرنے والوں کی حمایت میں وکلا اور دانشوروں نے جلوس نکالا۔ یہ سارے لوگ بی مشن

کے لئے کام کرتے تھے۔اخبار سے لے کر میڈیا تک بی مشن کا حصہ بن گئے تھے اور ان کے ذریعہ مخصوص نظریات پورے ملک میں فروغ دیئے جا رہے تھے۔''

مشرف عالم ذوقی نے معنی خیزی کے عمل سے بہت کچھ باور کرایا ہے۔اس میں منطق نہیں ہے بلکہ سچائی کو منکشف کرنے کا تناؤ ہے۔قرأت اور تجزیہ نبرد آزما ہے کہ یہ سارا سلسلہ گنجلک اور کثیر المعنیت کی آگاہی کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔حقیقی نئے بُعد کو سامنے لاتے ہوئے ان کے لہجے میں سوالیہ نشان کا فطری جذبہ ہے۔اور ان کی سوچ میں اختلاف کی نفسیات ہے:

''معاشی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی تمام ناکامیوں کے باوجود بی مشن کے پاس جیت کے لئے صرف ایک بیانیہ ہے۔اقلیت -ایک ہی تماشہ ہے اقلیت- ایک ہی کھیل ہے اقلیت- ایک مداری ہے۔ایک ڈگڈگی ہے اور ڈگڈگی کی آواز پر رقص کرتی ہوئی اقلیت۔ہوش کھوتی ہوئی اقلیت۔چکرویو میں الجھتے، پھنستے ہوئے اقلیت۔ہزار برسوں کی تاریخ میں مخصوص اقلیت کو لٹیرا کہنے والے آسانی سے فیصلہ لے آئیں گے کہ اقلیتوں کی زمین کیسی؟ محمد بن قاسم سے غزنوی، غوری، خلجی اور مغل بادشاہ تک سارے لٹیرے تھے۔لوٹ کی زمین کو اقلیتوں کا حق نہیں کہا جا سکتا۔اس وقت بی مشن کا ہر نمائندہ میڈیا مسلسل اقلیتوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ہمارے پاس جواب دینے کے لئے کیا ہے؟ ہم تسلیم کر لیں کہ بی مشن میں جو ہمارا نام صفحۂ ہندوستان سے مٹا دینا چاہتا ہے—وائرس ایک خوف کا نام ہے۔یہ زہر بھی ہے جو تیزی سے اپنا شکار کرتا ہے۔''

مسموم آب و ہوا میں مشرف عالم ذوقی اس کیفیت سے دوچار ہیں جب وقت کے بہتے دریا کے اتار چڑھاؤ میں مستقبل کی کسوٹی، دشت وجبل بننے کے لئے میدانِ زیست میں کروٹیں بدل رہی ہے۔سچائی کو نتائج کی مشین سے ناپتے وقت وہ جمہوریت اور سیکولرزم کو شیطانی آگ میں جھلستے ہوئے دیکھ رہے ہیں جب مسلمان اور دلت کی تہذیب وروایت بے رونق دروازے پر کھڑی نظر آ رہی ہے جہاں ملکی سیاست کے سرد و گرم کا صرف احساس ہے اور جہاں زندگی کی کرن خوفناک آندھی کی زد میں ہے:

''پاشا مرزا نے خوفزدہ کر دیا تھا۔جب آپ خوفزدہ ہوتے ہیں تو اس وقت ہزاروں کی تعداد میں جسم پر دیمکوں کا حملہ ہوتا ہے۔میں خود کو مفلوج و بے بس محسوس کر رہا تھا۔ہزاروں کی تعداد میں دیمک جسم سے چپک گئی ہیں—میں نے ایک سفید کاغذ اٹھایا۔ماچس کی تیلی جلائی۔کاغذ سے دھواں اٹھنے لگا۔میں نے کچھ دیر تک دھوئیں پر آنکھیں مرکوز رکھیں۔کیا یہ ہم ہیں؟ ہماری آئیڈیالوجی-یا سلگتا ہوا ملک ہے ہمارا-جمعہ کے روز نائٹ شفٹ جانے کے لئے پاشا مرزا نے کیب بک کرانی چاہی تو جواب ملا- ساری سر، ہماری سروس مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔اس سے ایک دن پہلے پزا آرڈر لینے والے نے بھی یہی جواب دیا تھا۔موسم بدل رہا تھا۔اور اس بدلے ہوئے موسم کو پاشا مرزا بھی محسوس کر رہے تھے۔''

مشرف عالم ذوقی ملک کے سیاسی و ثقافتی منظر نامہ کو تفصیل سے بیان کرنے میں اس لئے کامیاب ہیں کہ

سچائی کا بھیانک بہتا ہوا دریا ان کے پیش نظر ہے۔ وہ ناول نگار ہیں اس لئے جسمانی اور ذہنی زندگی کو درجوں میں بانٹ کر دیکھنے کی کسوٹی رکھتے ہیں۔ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اختتام پر وقت کی راگنی اتنی بے سری ہو چکی ہے کہ سوچنے والے کی عقل و فراست دھند اور آندھی کی لپیٹ میں ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ ظلم و تشدد کی انتہا کی ایک مثال یہ بھی ہے:

''اڑیسہ میں غریب دلتوں کو جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، کچھ غنڈوں نے انہیں زندہ جلا دیا۔ خواتین کی عزت لوٹی۔ جب ایک ڈاکیومنٹری بنانے والے فلم میکر نے جنگلوں کا طویل راستہ طے کر کے اس علاقے کو دیکھنے کی کوشش کی تو اسے پادری کا جلا ہوا گھر نظر آیا۔ بے شمار جلی ہوئی چیزوں کا ملبہ بکھرا پڑا تھا۔ اس کے پیچھے وہی لوگ تھے جن کا ذکر سبحان علی نے کیا تھا۔ ساڑھے تین سو گرجا گھروں یا عبادات کے مقامات کو تباہ و برباد کیا گیا۔ آدی واسیوں کو ان کے معاشرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے لئے الگ اسکول بنوائے گئے۔ حیدر آباد یونیورسٹی کے دلت اسکالر کی موت کو خودکشی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں پسماندہ اور دلتوں کے ساتھ انصاف کی آواز بلند کرنے والی آواز کو خاموش کر دیا گیا۔ اس درمیان کچھ ادیبوں اور صحافیوں کے قتل کی وارداتیں بھی سامنے آئیں — یہ سب کچھ بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔''

مشرف عالم ذوقی بوسیدہ ہوتی ناشناسی کو جس دریافت کا روپ دیتے ہیں اس میں غایت درجہ کی عبرت آفریں اور تاریکی آشنا اعتراف ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ ظاہری نوعیت کے اثرات و محرکات عام ہوتے جا رہے ہیں:

''شمشان گھاٹ سے لے کر کاربنوال تک جانے والی سڑک کا رنگ زعفرانی ہو گیا تھا۔ یہ سب راتوں رات ہوا تھا۔ سڑک پر سادھوسنتوں کی قطار بڑھ گئی تھی۔ کچھ دن قبل ایک 'مہا سبھا' میں لاکھوں عقیدت مند ٹرک میں بھر بھر کر لائے گئے تھے۔ سڑک چوراہوں سے گزرتے ہوئے یہ نعرے بھی لگائے گئے کہ 'ایک دھکا اور دو جامع مسجد توڑ دو'۔ پہلے ان لوگوں کو دیکھ کر خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر یہ بھیڑ اب خوف کا احساس دلانے لگی تھی۔ کالونی سے چار قدم آگے جانے والی سڑک کا نام شیر شاہ سوری روڈ تھا۔ اب راتوں رات اس کا نام بدل کر و دیا شنکر روڈ کر دیا گیا۔ کئی شہروں کے نام تبدیل کئے گئے تھے بلکہ مخصوص اقلیت سے تعلق رکھنے والی نشانیوں کو آہستہ آہستہ مٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پہلے یہ سب آہستہ آہستہ ہو رہا تھا، اب ان کاموں میں بہت تیزی آنے لگی تھی۔''

مشرف عالم ذوقی نے چشم بینا سے کام لیتے ہوئے تغیر کے ایک اور نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہندوستان میں مردم شماری ہونے والی تھی۔ سی اے بل پر عمل ہونا تھا اور پیچیدہ تباہ کن منصوبہ سامنے آنے والا تھا لیکن کورونا وائرس کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں نظریات کا دائرہ اتنا سمٹا ہوا اور بے چین کر دینے والا ہے کہ سوچ کر گھبراہٹ بڑھ جاتی ہے اور زندگی بسر کرنے کا مکان تنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ سی آئی ڈی کا آدمی گھر کے اندر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح تفتیش شروع کر کے خوف میں مبتلا کرتا ہے:

''تمہارا بیٹا باغی تو نہیں۔''

''وہ ایک اسٹوڈنٹ ہے۔''

''اکثر مسلم نوجوان باغی ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس کا کوئی دوست تو نہیں؟''

''نہیں۔''

''چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ وہ کسی غلط ایکٹیوٹی کا شکار تو نہیں؟''

''بالکل نہیں۔''

''غور سے میری بات سنو۔''

میں نے مذاق میں اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ زور سے چونکا ''یعنی پاکستان۔''

''کسی نے کہہ دیا کہ اوپر پاکستان ہے۔''

خفیہ افسر ہنسا۔ اوپر اللہ میاں تو ہیں اور اللہ میاں کا تعلق پاکستان سے ہے۔''

''میں 1951ء میں پیدا نہیں ہوا تھا۔''

''1971ء میں کہاں تھے؟''

''اپنے وطن۔ اس وقت میری عمر زیادہ نہیں تھی۔''

''1951 یا 1971ء میں کیا تمہارے پاس شہری ہونے کے ثبوت ہیں؟''

''1971ء سے پہلے کے تو بالکل نہیں۔ یہ فلیٹ میں نے 2000ء میں لیا ہے۔''

خفیہ افسر زور سے ہنسا۔ ''اس کا مطلب 1951ء یا 1971ء میں سرحد پار سے گھس پیٹھ کر کے آئے تھے۔''

''گھس پیٹھ کیوں۔ ہمارے آباواجداد یہیں کے تھے۔''

''سب کہنے کی بات ہے۔ کاغذ دکھاؤ۔''

''میرے پاس اس فلیٹ کے کاغذات ہیں۔ یعنی 2000ء کے۔''

''اور 1951ء...... ''وہ زور سے ہنسا ''نہیں بتانا پڑے گا کہ اس برس تم کہاں تھے؟''

''میں پیدا نہیں ہوا۔''

''پھر بھی ثابت کرنا پڑے گا اور ثبوت لانا ہوگا۔''

''مرگِ انبوہ'' میں مشرف عالم ذوقی نے کتنے ہی سلگتے مسائل کو درشایا ہے۔ وقت کے تقاضے کے تحت جناتی ماحول کے پُراسرار طریق پر دستک دی ہے۔ اور پُرخوف اور تاریک فضا کی گرم دھار والی خونی بارش سے قاری کو شرابور کیا ہے۔ کھڑکیاں اور بند دروازے وحشت انگیز ہیں اسی لئے انصاف کی تاریخ اور جمہوریت کی شناخت زعفرانی ہے۔

☆☆☆

کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور- 812001

مسعود بیگ تشنہ (اندور)

''مرگ انبوہ'': اکیسویں صدی کا عظیم ناول

مرگِ انبوہ کا نریٹر (داستاں گو) ایک دانشور، ایک سائنس داں، ایک سماجی سائنس داں، ایک اسٹیٹس مین اور سب سے بڑھ کر اکیسویں صدی کا انسان بن کر ابھرتا ہے اور اسی بھیڑ میں شامل اکیسویں صدی کے ہندوستان کا مسلمان بن کر بھی ابھرتا ہے جیسا کہ ناول کے نام ''مرگِ انبوہ'' سے ظاہر ہے کہ اس میں خوش آئند مستقبل کے امکانات یوٹوپیا کی طرح ہی قریب قریب نا قابلِ رسا ہیں۔ داستان گو نے جان بوجھ کر اور بجا طور پر ایسا کیا ہے کہ اس جلتے ہوئے مسئلے کی لپٹ کو شدت سے محسوس کیا جا سکے۔

اے پی جے عبدالکلام کا سپنا 2020 کا کیا تھا اور وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ زمانے کی ستم گری نہیں تو اور کیا ہے کہ ان ہی کے دورِ صدارت میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس ہندوستان کی نیو پڑ گئی جو وہ خود ہیومنسٹ کے طور پر قطعاً نہ چاہتے ہوں گے۔ اپنے عہدے سے سبک دوش ہونے پر ہی انہوں نے اپنا درد بانٹنا شروع کیا ان کے ایک لیکچر کا موضوع ہی ''سب کے لئے رہنے لائق دنیا بنانا'' تھا جو ان کی زندگی کا آخری لیکچر ثابت ہوا کہ وہیں لیکچر دیتے دیتے ہی انہیں دل کا دورہ پڑا اور ان کی زندگی بھی ان کے سپنے کی طرح حقیقت سے خواب میں تبدیل ہو گئی۔ بہر حال خواب کے حقیقت اور حقیقت کے خواب بننے کا عمل روزِ ازل سے لمحۂ موجود تک جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ یہ اوورلیپنگ (overlapping) کا عمل ناگزیر ہے اور چلتا رہتا ہے۔

MCSquare=E (جہاں E توانائی، M مادّہ کی کمیّت، اور C روشنی کی رفتار ہے۔)

مندرجہ بالا مساوات سے ظاہر ہے کہ قدرت کے (ایک نہ بدلنے والے) قانون کے تحت توانائی کبھی بھی زائل نہیں ہوتی، شکل بدل لیتی ہے۔ توانائی اور مادّہ دونوں باہم بدلتے رہتے ہیں اور ایک طے شدہ لمحۂ موجود بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ممکنہ حد تک چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ (مادّہ) اپنی کس شکل میں ہے توانائی کی ترنگ کی شکل میں میں یا ٹھوس ذرّے کی شکل میں۔ تھیوری آف ریلیٹیویٹی اور پرنسپل آف انسرٹینیٹی یہی کہتے ہیں۔ یہ ذرہ اور توانائی کی اوورلیپنگ کی حالت اور ذرہ کا ایک حالت میں نہ ہونا یہ مادّی غیر یقینیت کا قدرت کا اصول تمام سیاسی نظریات و ہر طرح کے نظام پر بھی لاگو ہوتا ہے قیامت کی پیشین گوئی کے باوجود قیامت نکل گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ قیامت نہیں بھی ہے اور ہے بھی۔ دراصل اس کائنات کی مادّی دنیا میں غیر یقینیت بھی خدائی اصول کی طرح ہے۔ اسی روحانی طور پر ہمیشہ بہتر تغیر و تبدیلی کی انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ قابیلی طاقتیں اپنا کام کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ کہیں رنگ و نسل و تہذیب و دین کے نام پر کہیں جنس کے نام پر کہیں علاقے اور جغرافیہ کے نام پر کہیں تواریخ کے نام پر۔ مادی غیر یقینیت پر روحانی یقین کا حاوی ہونا ضروری ہے یہی مرگِ انبوہ سے نجات کا راستہ دکھا سکتی ہے۔

اس قیامت صغریٰ کو بتانے والے اس ضخیم وعظیم ناول کی پزیرائی عام انسان کیا کر پائیں گے کہ اسے دستیاب ہونا ہی مشکل ہوگا لیکن اہلِ نظر ہیومنسٹ برادری کو اس کا مطالعہ وتجزیہ اور اس عظیم ناول کی قدر کا تعین کرنا ضروری ہے اور یہ انگلش اور دوسری بین الاقوامی زبانوں کے ترجمے سے ہی ممکن ہے اور ہندوستان میں بھی اسے دیگر زبانوں میں وقت کے مناسب تقدم وتخیر کو دیکھ کر کرنا چاہئے۔

محترم فاروق ارگلی صاحب اسے صدی کا بہترین اردو ناول قرار دے چکے ہیں مگر انہوں نے کوئی اشارہ اس کے مواد کو لے کر نہیں کیا تھا۔ جناب جاوید اختر نے مشرف عالم ذوقی صاحب کے اس ناول کی چند جھلکیاں شعور کی رو میں (جسے لاشعور کی رو کہنا زیادہ مناسب ہے) اس تاثراتی تبصرے میں دکھائی ہیں۔ میں اس کے لئے انہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ذوقی صاحب کے لئے نیک خواہشات میری بھی خواہش ہے کہ اس کے چرچے بیرون ملک بھی ہوں اور اس کتاب کا جو جائز مقام ہے اس دنیا کے دانشور اور اہلِ ادب واقف ہوں اور یہ عالمی سطح پر کسی نہ کسی انعام کی حقدار بنے۔ ظاہر ہے کہ ملک کے سیاسی حالات اس ناول کی سرکاری سطح پر پزیرائی وانعام واکرام کے لئے ناسازگار ہی رہیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ایم.صلاح الدین

''آتش رفتہ کا سراغ'' ہوش وخرد کی بیداری

جب فنکار عزم کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ ''خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے'' تو پیش منظر و پس منظر کے سچ کو اجالنے میں خوف نہیں کھاتا۔ فنکار فطرتاً بھی صداقت پسند ہوتا ہے وہ انسانیت، اخوت اور صالح اقدار کے خلاف معاشرے میں پیدا پھوڑوں کو فنی پیکروں میں اجال کر ہمیں آئینہ دکھاتا ہے تاکہ ہماری آنکھیں کھلیں اور معاشرہ راہ راست اختیار کرے۔ کھرے فنکار کا یہی طرۂ کمال ہے جس کے سبب وہ معاشرے میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے مگر جب صارفیت پسندی کے رجحانِ عام، اربابِ اقتدار کی نوازشوں کی تمنا و ہوس تو کہیں برسر اقتدار کے جبر واستبداد کا خوف فنکار پر حاوی ہوتا ہے تو ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی'' کا جذبہ ان میں کافور ہو جاتا ہے اور ان سے جو فن پارے سامنے آتے ہیں وہ صداقت سے پرے دل لگی کے لئے یا نمائشی ہوا کرتے ہیں۔ غالباً ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ، بے چارے کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

فن پاروں کی اس روش کو ناول ''آتشِ رفتہ کا سراغ'' نے توڑا ہے۔ ناول نگار مشرف عالم ذوقی نے جس جرأتمندی سے اس کی صورت گری کی ہے وہ نہ صرف قابل داد ہے بلکہ مشعلِ راہ بھی ہے۔

اس ناول کا پلاٹ آزادیٔ ہند کے آس پاس سے بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر تک کے واقعات کو سمیٹتا ہمارے مستقبل کے انجام کو اجالتا ہے۔ ان ۶۷ برسوں سے ہندوستانی مسلمان کن کن عذابوں سے گذرتے رہے، انہیں کمزور و خوفزدہ کرنے کی کارروائیاں کن کن سطحوں پر کی جاتی رہیں اور مستقبل میں کیا کچھ ہو سکتا ہے، یہی دکھانا اس ناول کا مقصد ہے جو اس کی اہمیت وافادیت کو دوچار کرتا ہے۔

پلاٹ بڑے کینواس پر پھیلا ہوا ہے جس میں منظر در منظر قدیم وجدید تہذیبی تصادم، مذہبوں کی آڑ میں سیاسی برتری کی چپقلش، تقسیم ملک کا کرب، اس کرب سے جھانکتا مسلمان ہونے کا درد، داستان عشق ومحبت، طاغوتی قوتوں کی انسانیت سوزی، ہندوتوا کی کارستانی، ہندوستانی مسلمانوں کو غلامانہ زندگی جینے پر مجبور کرنے والی دوراز کارسازشوں کی پرتیں یکے بعد دیگرے اس طرح کھلتی ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، عقل وخرد کو جھٹکے پر جھٹکے لگتے ہیں مگر پلاٹ کا سرا کہیں نہیں ٹوٹتا نہ کہیں جھول کھاتا ہے۔ گرچہ موضوعات کے تناظر میں ماجرہ در ماجرہ روبرو ہوتا ہے مگر ناول نگار بڑی فنکاری سے قاری کو اپنے ساتھ لئے چلتا ہے اور قاری اکتائے بغیر ناول کے مرکزی تھیم کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ کلائمکس پر تو یہ ناول دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ذوقی صاحب نے بڑی بے خوفی اور بے باکی سے ملکی سیاست کے مکروہ چہرے اور فرقہ وارانہ منافرت کی آبیاری کے مختلف النوع منصوبے کو اس پلاٹ میں گودھنے کا ہنر دکھایا ہے۔

پلاٹ کا تانا بانا جس زماں ومکاں کے حدود میں موضوعات کا احاطہ کرتا ہے اس کی رعایت سے ڈھیروں کردار

بھی حسبِ حالات وواقعات آتے ہیں اور اپنا اپنا رول بخوبی ادا کر جاتے ہیں۔ان میں مرکزی کردار ارشد پاشا کا ہے جو واقعات کا راوی اور فکر انگیز کلائمکس کا موجب بھی ہے مگر ناول کے سفر کو مہمیز کرتا ہے ارشد پاشا کا سنِ بلوغ کو پہنچا بیٹا اسامہ پاشا جو دلّی پولیس کے اکساوے کی کارروائی کا مشاہد ہے جس کارروائی کو بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کا جواز بنایا گیا تھا،اسی واقعہ سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔

ہوا یہ کہ بٹلہ ہاؤس کی مسجد سے اسامہ اپنے دوستوں راشد،منیر اور علوی کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر چہل قدمی کو نکلتا ہے تو ڈور پٹلیا کے پاس پولیس چوکی پر بیٹھے پولیسوں میں سے ایک انہیں ''آتنک وادی'' کہہ دیتا ہے۔ راشد پولیس سے الجھ پڑتا ہے پھر چند پولیس انہیں مل کر پیٹنے لگتی ہیں۔لوگوں کی جمع بھیڑ انہیں چھڑا تو دیتی ہے مگر راشد کا بری طرح پیٹا جانا محلے کے لوگوں میں کھلبلی پیدا کر دیتا ہے،نتیجتاً پولیس اپنے دفاع میں ایسا جال بُنتی ہے کہ انہیں واقعتاً آتنک وادی بنا کر ان کا انکاؤنٹر کرتی ہے جس میں راشد اور منیر گولی کھاتا ہے،علوی حراست میں لیا جاتا ہے۔اسامہ انکاؤنٹر اسپاٹ پر نہ ہونے کے سبب بچ جاتا ہے۔مگر انکاؤنٹر کو درست ٹھہرانے کے لئے انکاؤنٹر ماسٹر انسپکٹر ورما کو ہی پیچھے سے گولی ماردی جاتی ہے بنابریں اسامہ بے حد مشکوک ہو جاتا ہے۔اس لئے وہ پناہ گاہوں میں پیچ وتاب کھاتا رہتا ہے۔بالآخر وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے اور پناہ گاہ سے نکل بھاگتا ہے اور ارشد پاشا اپنے بچپن کے دوست اجے سنگھ تھاپڑ کے ساتھ اسامہ کی تلاش میں دور دیشوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے لیکن اسامہ کے جہاں کہیں جس کردار میں دیکھے جانے کا پتہ چلتا ہے وہ قاری کے تجسس کو بڑھاتا اور ناول کو کلائمکس کی طرف مہمیز کرتا ہے۔آتنک وادی مسلمان ہی کیوں ہے؟ اس کے عوارض وعواقب کی جستجو میں ارشد فرقہ وارانہ منافرت کے رجحان کی جڑوں کو کریدتا ہے۔یہ شجر منافرت کس طرح تناور ہوا،اس کے ڈال ڈال اور پات پات کا مشاہدہ دوربین سے کر کے جس طرح 'سچ' کو افسانوی انداز میں اجاگر کرتا چلا جاتا ہے وہ اسے ایک ضخیم مگر کامیاب ناول بنا دیتا ہے۔

ارشد پاشا بنارس کی زہر آلود فضا سے پاشاؤں کی مشہور کوٹھی بیچ کر جائے اماں کی تلاش میں بٹلہ ہاؤس کے دلکشا انکلیو میں اٹھ آتا ہے جو ظاہر ہے گھٹا ہوا مسلم علاقہ ہے مگر اسے یہاں بھی اماں نہیں ملتی۔اسامہ کے سبب جو درد وکرب اسے یہاں سے ملتا ہے انہیں اس کی رفیقۂ حیات رباب، تعلیمی دَور کی محبوبہ رکن راجیہ سبھا وصحافی صوفیہ اور کاشی کی گلیوں کا ہم نوا اجے سنگھ تھاپڑ جس طرح بانٹتے سامنے آتے ہیں،ان کے ماجرے ناول میں جان ڈال دیتے ہیں۔جہاں رباب اور صوفیہ کے توسط رومانوی اور عشقیہ منظرنامے سامنے آتے ہیں وہ داستان منافرت کو ناول بناتے ہیں،وہیں ارشد کے بظاہر ہم پیشہ جگری دوست تھاپڑ کے توسط سے شجر منافرت کی آبیاری کے جو سلسلے سامنے آتے ہیں وہ چشم کشا ہیں اور تجسس سے بھرے ہیں لیکن ناول نگار نے تھاپڑ کے کردار کو جس طرح گھڑا ہے وہ داستانوی کردار قطعی نہیں بلکہ آج کی جیتی جاگتی دنیا کا ایسا کردار ہے جس کی حکمت ہی ہمیں ہم وطنوں کے مدمقابل یہاں رہنے کے لئے جینے کا حوصلہ دے سکتی ہے۔ناول نگار نے اسی لئے نئی نسل کے اسامہ کو اسی طرح کی ڈگر کا مسافر بنا دیا ہے۔اس کا پتہ ناول کے اخیر میں چلتا ہے جب تھاپڑ ارشد کے کردار کو ناپ تول کر مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے اپنے کردار کا دوسرا رخ دکھانے کے لئے اپنی تجربہ گاہ کی سیر کراتا ہے۔

ارشد کو ایک عمارت میں لے جایا جاتا ہے۔جس میں داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سنگھیوں کی جدید ترین تجربہ گاہ ہے۔وہاں تھاپڑ سامنے آتا ہے جو سفید کرتا پائجامہ میں سفید سنگھی ٹوپی لگائے ہوتا ہے۔قبل ازیں ارشد اسے ناستک کے طور پر بچپن سے جانتا تھا۔دونوں آمنے سامنے بیٹھتے ہیں اور تھاپڑ گویا ہوتا ہے:

''میں کالج کے دنوں سے ہی اس تحریک سے وابستہ ہو گیا تھا مگر میری وابستگی کی شکل مختلف تھی۔ میں نے سنگھ جوائن کرنے کے بعد ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ مجھے مسلمانوں کو سمجھنے دیجئے۔مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم بغیر مسلمانوں کو سمجھے اپنا کام کئے جا رہے ہیں...... سنگھ کی طرف سے ہری جھنڈی ملتے ہی میں کام میں لگ گیا۔ مجھے مسلمانوں کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے اور جاننے کے لئے ایک مسلم گھر کی ضرورت تھی اور تم میری مشکل آسان کئے دے رہے تھے...... میں کیفیت، اپنے تجربے تحریری طور پر سنگھ کو دے رہا تھا۔میرا مقصد واضح تھا۔ہم ایک بڑی جنگ اس وقت نہیں لڑ سکتے جب تک مسلمان فکر کو اندر اندر تک سمجھ سکنے سے محروم رہتے۔ میں نے کہہ رکھا تھا، میر زندگی اس تجربے میں ختم بھی ہو سکتی ہے مگر میری تحریریں سنگھ کے کام آئیں گی کیونکہ آزادی کے بعد کے مسلمانوں کو سمجھنا آسان کام نہیں۔ یہ کئی حصے میں بٹے ہوئے لوگ ہیں۔ایک بڑی آبادی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔مڈل کلاس مذہب اور سیکولرزم کے درمیان پناہ تلاش کر رہا ہے۔ایلیٹ کلاس کی فکر الگ ہے۔ایک ایسا نظام بھی ہے جہاں اسلام کی ترویج وارتقا کے لئے باہر سے پیٹرو ڈالر آ رہے ہیں۔ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے ہیں مثلاً تم کن سطحوں پر سوچتے اور جھکتے ہو؟ تمہیں کیسے کمزور کیا جا سکتا ہے، تمہیں کیسے داس بنایا جا سکتا ہے اور کہہ سکتا ہوں، یقینی طور پر اس تجربے میں تم میرا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے...... ہم تمہیں یعنی ایک عام مسلمان کو اتنا ہی جانتے تھے جتنا باہر کی دنیا میں دیکھتے تھے، پھر تمہاری کمزوریوں سے، تمہاری روٹین سے واقف کیسے ہوتے اور ان کے بغیر تم پر حکومت کیسے کرتے...... ہم شانتی سے رہنے والے لوگ تھے۔ یہ ہماری زمین تھی۔آریہ ورت۔اور تم نے یہاں ناپاک پاؤں پھیلا دیئے۔سات سو برسوں کی غلامی ہمارے نام لکھ دی۔ہم سب کچھ برداشت کرتے رہے، یہ سوچ کر کہ ایک دن...... ایک دن ہم تمہارے وجود سے اس زمین کو پاک کر دیں گے۔سمجھ رہے ہو نا تم...... اس کام میں وقت لگے گا لیکن...... یہ کریں گے ہم۔ہم بھارت کو ایک جمہوری ملک کے بجائے ایک ہندو راشٹر بنانا چاہتے ہیں اور اسی لئے آزادی کے بعد سے ہی ہم نے سابق فوجیوں کو ملانا شروع کیا۔چھوٹی موٹی کامیابیوں سے ہمارے حوصلے بلند ہوئے۔ناکامیوں سے ہم گھبراتے نہیں۔ کیونکہ ہرنا کامی آگے آنے والی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے لیکن...... تمہارے بیٹے نے سب گڑبڑ کر دیا۔وہ اسی راستے پر چلا جس راستے پر ہم چلے تھے۔ہم اسے مار سکتے تھے لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔اس نے وہ کیا ہے جو سو سال میں ہم نہیں کر پائے۔اس نے ہندو تیرتھ استھانوں کو چنا، مندروں اور آشرموں کو چنا اور اپنی شناخت کے ساتھ ہمارے دھرم گروؤں کا دل جیتتا چلا گیا...... اسامہ ہم سے دُور دو قدم

آ گئے ہے۔ جانے انجانے وہ اپنی قوم کے لئے ہمارے مشن جیسا کام کر رہا ہے، ہر جگہ اپنی پہچان کو محفوظ رکھتے ہوئے اور ہم...... اب تک ناکام اس لئے رہے کہ ہم مہرے تو چلتے رہے لیکن اپنی پہچان چھپا کر...... وہ ایک ادھین کیندر ہے...... اس کو مار دیں گے تو بہت کچھ سمجھنے سے ونچت رہ جائیں گے۔ اسے سمجھنا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ چھپ کر اس کی کارروائیوں کو دیکھنا اور مورکھ...... تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہاری مدد کر رہا ہوں، جبکہ میں اپنے سوارتھ میں تمہارے ساتھ اسے تلاش کر رہا تھا۔''

(ص:۶۹۴ تا ۶۹۷ کے مکالمے سے ماخوذ)

ان مکالموں کے بعد ٹھاپڑ ارشد کو عمارت کے دوسرے حصے میں لے جاتا ہے۔ ایک ہال میں کمپیوٹرس پر متعدد سیوک اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں جن کے اسکرین پر عربی، اردو کے الفاظ جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے ہال میں خالص مسلمانی شباہت میں سیوکوں کی ایک جماعت عربی لہجے کی قرأۃ کے ساتھ نماز پڑھ رہی ہوتی ہے۔ ارشد پوچھتا ہے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تو ٹھاپڑ بتاتا ہے۔ ایک طرف تمہیں خوفزدہ اور کمزور کرنے کے مہرے چلے جا رہے ہیں جن میں ایک اہم مہرہ ہماری پولیس ہے۔ دوسری طرف کمپیوٹر ہال میں تمہاری طرف سے ملک مخالف تحریکیں ڈیزائن ہو رہی ہیں، اسلامی ویب سائٹس تیار کئے جا رہے ہیں اور دوسرے ہال میں تم سے بڑی جنگ لڑنے کے لئے تمہارا Shadow تیار کیا جا رہا ہے۔ ٹھاپڑ کے سنجیدہ و تلخ مکالماتی تیور سے اور جو کچھ دیکھا اس سے ارشد خوف زدہ اور ہکا بکا ہو جاتا ہے۔ ٹھاپڑ ارشد کو پہلی بیٹھک میں لاتا ہے اور نرم لہجے میں کہتا ہے:

''ڈرو مت۔ جیسے تمہیں باعزت لایا گیا ہے ویسے ہی تمہیں باہر نکالیں گے۔ کیونکہ ہمیں تم سے کوئی ڈر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دو باتیں ممکن ہیں۔ یا تو تم باہر کے لوگوں کو یہ باتیں بتاؤ گے یا نہیں بتاؤ گے۔ نہیں بتاؤ گے اس کی امید زیادہ ہے کیونکہ کاشی سے دلّی تک تم میں ایک نپنسک صحافی کو دیکھا ہے میں نے۔ جس کے پاس بے خوف قلم بھی نہیں اور اگر تم بتاؤ گے تب بھی، ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کسے بتاؤ گے؟ کس کس کو بتاؤ گے؟ ممکن ہے جسے تم بتا رہے ہو گے وہ تمہارے حلیے میں ہمارا آدمی ہی ہو...... تمہارے نام میں ہمارا ہو، تمہارے مذہب میں ہمارا ہو......''

یہ کہہ کر حقارت سے قہقہہ لگاتا ہے۔

ان مکالمے میں جہاں ٹھاپڑ نے مسلمانوں کے فکری انتشار کی جڑ کی نشاندہی اور مستقبل کے اندیشے کو پختہ کیا ہے وہیں ارشد پاشا کے کردار کو بھی روشن کر دیا ہے جو بچپن سے ادھیڑ عمر تک سہما سہما سا رہا، خواہ والدین اور بھائی انور سے منہ لگانے کا معاملہ ہو، صوفیہ سے عشق لڑانے کا مرحلہ ہو، اپنی مذہبی شناخت برتنے کا مسئلہ ہو، بیٹے اسامہ کی مذہب پسندی اور حق پسندی کے تیور سے خوفزدہ رہنے کی روش ہو یا اپنی صحافتی زندگی میں صداقت پسندی کے اظہار کا رویہ ہو، وہ زندگی بھر ادھیڑ بن میں پھنسا رہا۔ ارشد کا کردار ناول میں مرکزی ہونے کے ناطے بظاہر کمزور لگتا ہے مگر یہ کردار میرے خیال میں آزادی کے بعد کے انٹلیکچوئل مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہی ناول نگار غالباً دکھانا بھی چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے ارشد پاشا کا کردار گٹھا ہوا اور پیغام رسا ہے۔ ارشد ترقی پسندوں کا نمائندہ ہے تو اس

کے والدین گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے ہیں جو اپنی تہذیبی روایت کے ٹوٹنے سے کرب میں جی رہے ہوتے ہیں۔

ناول نگار نے ابھئے کمار دوبے، ایس پی بھوانی سنگھ اور انسپکٹر ورما کے کردار کے ذریعہ آتشِ رفتہ کا سراغ لگایا ہے تو تھاپڑ اور اسامہ کے کردار کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ ان دونوں نے جس طرح تدبر اور حکمت عملی کو راہ دی، اسی راہ سے خوف زدہ زندگی سے نکلنا ممکن ہے۔ تھاپڑ کا کردار منفی رویے پر مبنی ہونے کے باوجود تنفر پیدا نہیں کرتا بلکہ تدبر و حکمت اپنانے کا پیغام دیتا ہے اور اسامہ کا کردار میرے خیال میں صوفیت کی توسیع کرتا نظر آتا ہے جو ہندوستانیوں کے دلوں پر صدیوں سے راج کرتا رہا ہے۔ ملک کے سیاستدانوں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی مذہب کو سیاسی حربہ بنایا ہے۔ سادہ لوح ہندوستانی خواہ ہندو ہو یا مسلمان دونوں بھٹکائے جاتے رہے ہیں ورنہ علامہ اقبالؒ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل دل و نظر جو مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

لہٰذا نئی نسل کو کوا اسامہ بن لادن نہیں بلکہ اسامہ پاشا بننے کی ضرورت ہے کہ وہ بھی بڑا جہاد تھا جو صوفیائے کرامؒ نے انجام دیا مگر بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں اب ایسی تربیت گاہیں ناپید ہیں۔ اس موڑ پر یہ ناول دونوں کرداروں کے حوالے سے ہمیں لمحۂ فکر یہ عطا کرتا ہے۔

اس کے مکالمات شستہ، برجستہ، حسب حال و کردار اور پر تجسس ہیں اور اس کا نقطۂ نظر واضح۔ اسامہ کا لاپتہ رہنا کلائمکس کو المیہ تو بناتا ہے مگر حزنیہ نہیں بلکہ ہماری غفلت پر ضرب لگاتا ہے۔ یہ نہ صرف جمہوری ہندوستان کے سیکولرزم کے لبادے میں ڈھکے سچ بلکہ CAA، NPR، NCR کے شاخسانے کا بھی عکاس ہے اور ملک کے ایک بڑے طبقے کی دردناک و دلدوز داستان پر مبنی ایک بڑا ناول ہے، جس پر باتیں کرنے کو تو بہت کچھ ہیں کہ اس کا ہر ماجرہ تجزیے کا مستحق ہے مگر ایک مضمون کی تنگ دامانی مانع ہے۔ اب جبکہ مسلمانوں کے تئیں عصبیت کا زہر ملک کے ہر سسٹم میں سرایت کیا جا چکا ہے جو ہمارے مستقبل کو اندیشوں سے گھیر رہا ہے ایسے میں اپنی سوچ کو اس شعر کے حوالے کرتا ہوں کہ:

صرف آنکھوں سے ہی دنیا نہیں دیکھی جاتی دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

....

موضع: رام نگر، پوسٹ: نہرا، دربھنگہ -847233 (بہار)

محمد کامران شہزاد

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''بیان'' تنقیدی جائزہ

''بیان'' مشرف عالم ذوقی کا ناول ہے جو پہلی دفعہ ہندوستان سے 1993ء میں شایع ہوا جب کہ پاکستان میں صریر پبلی کیشنز نے 2020ء میں شایع کیا۔ ناول کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''ڈراؤنا خواب'' کے عنوان سے ہے۔ ناول کے اس حصے کے نمایاں کردار ''بالمکند شرما جوش'' ہیں، جو ہندو ہیں اور شاعری کا بھی شغف رکھتے ہیں۔ دوسرا کردار برکت حسین کا ہے۔ اس کے علاوہ جوش کے گھر والے ہیں۔

ذوقی نے ناول کے پہلے حصے میں ہندو پاک جنگ کے بعد کے اثرات کی تصویر کشی کی ہے۔ مرکزی کردار حساس شخص ہے، جو ابھی تک ہیلی کاپٹروں کی پرواز کو محسوس کرتا ہے اور وہ ہر لمحہ اس نفسیاتی دباؤ کا شکار رہتا ہے کہ کہیں پھر ان پر بم باری نہ کر دی جائے۔ وہ کہیں بھی جاتا ہے۔ اسے ہیلی کاپٹروں کی اڑان اور اسلحے کی چمک اور گھن گرج خوف زدہ کر دیتی ہے۔ ذوقی کا اندازِ بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ انہوں نے ایک معصوم انسان کی علامتی طور پر جنگ کی تباہ کاریوں سے خوفزدہ ہونے کی کہانی کو باریک بینی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ اس انسان کا مذہب چاہے ہندو ہو یا مسلمان، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ عام انسان ہے جس کے دکھ کا مداوا سیاسی لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''برکت بھائی بچوں کی طرح انہیں دیکھ کر ہنستے ہیں......اور کیا رہ گیا ہے جوش بھائی! زندگی میں اب ......بس جنگ ہی تو ہے...... بچے کاروبار دھندے سے فارغ ہو کر آتے ہیں تو جنگ کی باتیں، ریڈیو کو لگاؤ تو وہی چنگھاڑتی دل دہلا دینے والی خبریں، ٹی وی سنو تو وہی قصہ......ایک ہم تھے، ہمارا بھی زمانہ تھا۔ جوان تھے تو جوانوں جیسی باتیں کرتے تھے، یہ نہیں کہ جنگ کا قصہ ہے تو بس جنگ کا قصہ ہے۔''

ناول نگار نے روایات کے بدلنے اور ''جنریشن گیپ'' کا تذکرہ بھی دردمندی سے کیا ہے۔ موجودہ نسل کے آتے ہی روایات اور اقدار بدل گئیں۔ لوگوں کے اذہان منافقانہ ہو گئے۔ عصر حاضر کے بچوں کے نزدیک والدین موجودہ زمانے کی جدید روایات سے نابلد ہیں۔ اس لیے اکثر گھروں میں بزرگوں کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے کیونکہ بزرگ بھی اپنے آپ کو باطنی ضمیر کو تسلی دے لیتے ہیں کہ ان کی اولاد نے انہیں گھر میں رکھا ہوا ہے۔

ناول میں ایک طرف باپ اور بیٹے میں ذہنی افتراق کے سبب بڑھتے فاصلوں کا ذکر ہے۔ تو دوسری طرف پوتی اور دادا کے دل میں امڈتی محبت کو بھی سلیس اور سادہ اسلوب میں قلم بند کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذوقی نے ایک اور پہلو کی طرف دل گداز انداز میں اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہندو والدین کی طرف سے بچوں کی مسلمانوں کے خلاف اذہان سازی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ جوش اور ان کی پوتی ''مالو'' کے درمیان ہونے والے مکالمے سے لگایا جا سکتا ہے، جو ''مالوا'' نھیں بتاتی ہے کہ مسلمان غلیظ ہوتے ہیں کیوں کہ وہ کئی کئی ماہ غسل نہیں کرتے۔ جوش نے پوتی سے پوچھا کہ اسے یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں تو اس نے بتایا کہ اس کے والدین یعنی جوش کے بیٹے اور بہو نے یہ برین واشنگ کی ہے۔

پچاس کی دہائی کی نسل جس کے نمائندہ ''جوش'' اور ''چودھری برکت حسین'' ہیں۔ اس نسل کے اصول، اقدار اور روایت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ چودھری برکت حسین فطرت سے مرغوب شخصیت ہے، جو گھر کے دروازے کے دونوں طرف پھلواری لگاتے ہیں لیکن بچوں کا جوان ہوتے ہی اس باغیچے کی جگہ دکانیں بنانے اور ان کا کرایہ وصول کرنے کی داستان جس غم زدہ انداز میں رقم کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی خطے کی موجودہ نسل کے نزدیک قدیم روایات اور اقدار دم توڑ چکی ہیں۔ ناول کے اس حصے میں دونوں نسلوں میں اپنی مٹی سے وفا اور دولت کمانے کی ہوس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''سب سنکار کا فرق ہے...... ہم تھے تو سنکار بھی تھے...... اور جب سنکار سیکھتے تھے تو اونچ نیچ بھی سیکھتے تھے...... ادب اور تہذیب بھی سیکھتے تھے۔ نئے بچے اڑن کھٹولے پر سوار ہیں...... ریڈیو وغیرہ تو پرانے پڑ گئے میاں...... اب کیبل ہے سٹار ہے۔''

عشق بھی ناول کے بیانیہ کا حصہ ہے۔ جوش کے چچا ''انیر دھ شرما'' کا ہمسایہ خاتون سے عشق کا چرچا ہوا تو جوش کے دادا نے اعلان کر دیا کہ جب تک وہ زندہ ہیں ''انیر دھ'' ان کے سامنے نہ آئے۔ عشق میں ناکامی یا باپ کی ناراضی کے سبب انیر دھ شرما نے خودکشی کر لی اور چند روز بعد جوش کے دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ناول نگار نے ایک اور خوفناک حقیقت بھی بیان کی ہے۔ ہندوستان میں پہلے فرقہ واریت کی زد میں مسلمان آئے۔ ان پر ظلم و ستم ہوئے۔ اس کے بعد ان ہندوؤں گھرانوں پر بھی ظلم ہوا جو مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے یا سب مذہب کے ماننے والے تھے۔

ناول کا دوسرا حصہ بعنوان ''شہر آشوب'' ہے۔ ذوقی نے ہندوستان میں بسنے والی دو بڑی قوموں میں بڑھتی کشیدگی اور فرقہ واریت کے نتیجے میں ہونے والے ظلم کی تصویر کشی کی ہے۔ مسلمانوں کو نماز سے روکنے، مسلمان لڑکوں کو اغوا کے بعد قتل کرنے، مسلمانوں خواتین کی بے حرمتی اور مسلم اقلیتی علاقوں سے مسلمانوں کے گھر بار چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں کے ہاں پناہ لینا جہاں ہندو اقلیت میں ہیں۔ وہاں ہندوؤں کے متعلق ایسی افواہوں کے ہونے کی کہانی کو اس منظر میں ملاحظہ کیجیے:

> ''کہاں کون زیادہ سہا تھا، یہ کہنا مشکل تھا مگر شہر کے وہ محلے، جہاں مسلمانوں کی تعداد کم تھی، یا نہیں کے برابر تھی، ضرور ضرورت سے زیادہ سہمے ہوئے تھے۔ فضا خراب ہوتی تو اسی طرح کے منظر بھی پاکستانی محلوں میں عام ہو جاتے۔ گٹھری، گٹھری، اٹیچیاں اور بندھے سامانوں کے ساتھ ہانپتی کانپتی برقع اوڑھے مسلمان عورتیں چھوٹے بچوں کا ہاتھ پکڑے یا اپنی جوان ہوتی بچی کو لپٹائے کسی گھر میں داخل ہو رہی ہیں...... جو بھاگ کر، گھر بار چھوڑ کر پناہ لینے کے بہانے، عزیز رشتہ داروں کے یہاں چھپتے۔ وہ اپنے ساتھ جھوٹی خبروں اور افواہوں کی گٹھریاں بھی لاتے۔''

مشرف عالم ذوقی کے ہاں تجسس کا مادہ بھی پایا جاتا ہے اور ناول کی فضا بنتے وقت انہوں نے اس سے بھی کام لیا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں بڑھتی کشیدگی اور اسی تناظر میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور کرفیو لگنے کا منظر اتنا متحرک ہے کہ قاری خود کو اسی فضا میں رچتا بستا پاتا ہے۔ چودھری برکت حسین کے بیٹے تنویر

حسین کا اکھڑ مزاج، بڑھتے ہوئے بجلی کے بل اور عوام کی نکلتی ہوئی چیخیں؛ آر ایس ایس کے غنڈوں کے مسلمانوں پر مظالم؛ تنویر حسین پر ہونے والا حملہ؛ مسلمانوں کی اپنی بچاؤ کی کوشش اور پولیس اور آر ایس ایس کے گٹھ جوڑ کو پہچان کر تنویر حسین کے ان کی پارٹی میں شامل ہونے کی التجا؛ یہ سب تمام مناظر ایک طرف متحرک ہیں تو دوسری طرف بھارت میں ہونے والی مسلم کش پالیسیوں کا کچا چٹھا کھولتے ہیں۔ علاوہ ازیں آر ایس ایس کے عہدہ داروں کی مسلمانوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کے لیے سوچ میں تبدیلی لانے اور عالم بخت جیسے مسلمانوں کی ہندوؤں میں عزت سے رہنے کے لیے آر ایس ایس کی تعریفیں کرنے اور ان کے حق میں بولنے کی کہانی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر مشرف عالم ذوقی نے بیان کی ہے۔

ناول کے تیسرے حصے کا عنوان ''حیرت کدہ'' ہے۔ اس حصے میں مصنف کا مشاہدہ عمیق تر نظر آتا ہے۔ انہوں نے جہاں مسلمانوں کے خلاف آر ایس ایس کی گھناؤنی چالوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں بالمکند شرما جوش کے دو بیٹوں کانگریس سے لگاؤ رکھنے والے انیل اور آر ایس ایس کے نمائندے نریندر کے کرداروں کے ذریعے دونوں پارٹیوں میں بڑھتی کشیدگی اور اس کشیدگی کے نتیجے میں سگے بھائیوں کے درمیان پھیلتی نفرت کا تذکرہ بھی باریک بینی سے کیا ہے۔ نریندر کی بیٹی مالو سخت بیمار ہے لیکن اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے اس کا سگا چچا انیل تیار نہیں ہے۔

ناول کا چوتھا حصہ ''الزیمرس'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں ناول نگار نے جوش کے بھلکڑ ہونے، اس کے بیٹوں کے جائیداد کا بٹوارہ کرنے؛ ہندو اور مسلم میں نظریاتی دوری، تنویر حسین کا نفسیاتی طور پر خوف زدہ ہونے پر برکت حسین کی بے چینی کو قلم بند کیا ہے۔ سادہ اور عام فہم انداز میں گزشتہ ادوار میں مندر کی توڑ پھوڑ کر کے مسجد بنانے، پھر مسجد کو شہید کر کے مندر بنانے کی دل خراش منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں ہندوستانی مسلمانوں کے سوچنے کے انداز پر بھی قلم فرسائی کی ہے جو اب دنگا فساد نہیں چاہتے بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اگر مسجد کی جگہ مندر بن جانے سے مسلمانوں کو سکون سے رہنے دیا جائے تو یہ فیصلہ بھی ان کے لیے قابلِ قبول ہے۔ بالمکند شرما جوش کی نفسیاتی تحلیل نفسی بھی ذوقی نے بھرپور کی ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیب کی جگہ نئی آنے والی تہذیب کو قبول کرنا ان کے لیے بڑا مسئلہ ہے کیونکہ یہ نئی تہذیب بزرگوں کی عزت واحترام اور اقدار کو بالکل بھول چکی ہے۔

ناول کا آخری حصہ ''اتیت'' کے عنوان سے ہے۔ یہاں یہ بات کھٹکتی ہے کہ پہلے برکت حسین کے بیٹے کا نام ''تنویر حسین'' بتایا گیا لیکن مذکورہ حصے میں تحسین حسین کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ناول نگار نے اس حصے میں ایک طرف جوش کی نفسیاتی کیفیات واحساسات کی عکاسی کی ہے کہ وہ الزیمرس جیسی بیماری کا شکار ہو کر لوگوں کو پہچاننے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ دوسری طرف اس کی اولاد جائیداد کے بٹوارے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس بات کو بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے خیالات جان کر ان کے بوڑھے باپ پر کیا گزرے گی۔ یہاں مصنف نے عہد حاضر کی نسل کے دو غلے رویوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، جو اپنی آسائشوں کی خاطر اپنے والدین کا بڑھاپا سکون سے گزارنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہاں منظر نگاری اپنے عروج پر ہے۔ موت کی آہٹ سننے والے بوڑھے جوش کے کردار کو تراشنے میں ذوقی نے کمال ہنر مندی دکھائی ہے۔ والد اور بیٹوں کے درمیان ہونے

والے مکالمے جاندار اور مبنی بر حقیقت ہیں۔

تنویر حسین عرف منا کو ایک کرائے کے قاتل کے ذریعے مروا دیا جاتا ہے، جو ایک مسلمان کا روپ دھارے ہوئے ہے جس سے اس خیال کو تقویت دی گئی ہے۔ منا جس سیاسی تنظیم کا رکن تھا وہ مسلمانوں کی دشمن تھی۔ اس لیے ایک مسلمان نے اسے قتل کر ڈالا کیوں کہ وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔

ناول کے اسی حصے میں پانچ دوستوں کا بھی ذکر ہے، جو مسلمان ہیں۔ وہ کام کرنے کے بجائے خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ مصنف نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والوں کی کیفیات و احساسات کا ایسا عکس دکھایا ہے، جو خود کچھ کرتے نہیں لیکن باتیں انقلاب کی کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں نوجوان نسل میں خوف، مایوسی اور انتشار کے بڑھتے اندیشوں کی تصویر کشی کی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار ''جوش'' ایک بیان قلم بند کرانا چاہتا ہے۔ اسی بیان پر ناول کی کہانی تخلیق کی گئی ہے لیکن اختتام پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ جوش کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے نے ان کی کتب ردی میں فروخت کر دی۔ ایک چھوٹی سے کاغذ کے ٹکڑے پر جوش نے کچھ لکھا تھا۔ وہ کاغذ بھی کہیں کھو گیا۔ یوں ناول کے اختتام پر یہ تشنگی قاری کو مضطرب کر دیتی ہے کہ ایک ایسا انسان جو انسانیت کو اہمیت دیتا تھا بغیر کچھ کہے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول ایک طرف جنریشن گیپ کے المیے کو پوری سفاکی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف ایک ہی خطے میں مقیم دو قوموں کے مابین نفرت اور محبت کی داستان رقم کی ہے۔ ناول کا تیسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک ہی گھرانے میں پرورش پانے والے دو بھائیوں کے دو مختلف سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے منشور کی عکاسی کرتا ہے، جو محبت کے بجائے نفرت کو فروغ دیتی ہے۔

☆☆☆

حواشی: ۱- مشرف عالم ذوقی، ''بیان''، اسلام آباد، صریر پبلی کیشنز، 2020، ص:10

۲- ایضاً، ص 24 ۳- ایضاً، ص 38 ۴- ایضاً، ص 74 ۵- ایضاً، ص 94

....

پی ایچ۔ ڈی۔ اسکالر، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد (پاکستان)

ڈاکٹر امام اعظم

ناول ''مرگِ انبوہ'' شاہکارِ وقت

فکشن کی دنیا میں مشرف عالم ذوقی اپنے فکر وفن کے اعتبار سے بھی منفرد و ممتاز شناخت کے حامل ہیں۔منفرد اس لحاظ سے کہ لگا تار کئی ناولوں میں ملک کے سیاسی منظرنامے کو موضوع بنایا اور ممتاز اس حیثیت سے کہ سیاسی منظر نامے کو دلکش فنی پیکروں میں ڈھالا ہے۔یوں اُردو ناول نگاری کو پیش پا افتادہ روایتی فضا سے نکال کر فی الوقت جوجھتی عام لوگوں کی زندگی کا عکاس بنا رہے ہیں۔ان میں ان کی Dynamic سوچ فن کو اور فکر کو متحرک کر دیتی ہے۔ان کا ہنر اس شعر کے مصداق ہے کہ :

کاٹ آگاہیوں کی فصل مگر
ذہن میں کچھ نئے سوال اُگا

جب ہر خواب شکستہ ہو تعمیر نشیمن کا،تو صالح فکر اپنا ہنر صرف بازار میں رہنے کے لئے خود کو نمایاں کرنے سے گریزاں ہی ہوا کرتی ہے۔اسے مشرف عالم ذوقی نے ناول ''مرگِ انبوہ'' میں ایسی ہی تخلیقی کاوش کی ہے۔اس میں آگاہیوں کی فصل اس طرح کاٹی ہے جو قاری کے ذہن میں نئے نئے سوالات قائم کرتی ہے اور لمحۂ فکریہ عطا کرتی ہے۔

آج ملک میں ہندوتو کی سیاست گنگا جمنی اور صالح معاشرتی اقدار کو جس طرح تہس نہس کر رہی ہے، جمہوریت پر فاشزم اور سرمایہ داری کو جس طرح نافذ کر رہی ہے۔نئی نسل سیاست کی اس چال اور نئی ایجادات کے جال میں پھنس کر فکری طور پر کیسے خباثت کا شکار ہو رہی ہے اور موت اور حیوانیت کو گلے لگا رہی ہے، یہ سب کچھ اس ناول ''مرگِ انبوہ'' میں فنتاسی بن گیا ہے۔انسانی افتادِ طبع نے سائنس اور ٹکنالوجی کو فروغ دے کر اقوام عالم کو ایک ایسے گلوبل ولیج میں سمیٹ دیا ہے جس میں بقول ڈاکٹر شہناز شورو: ''پیسہ خدا، انٹرنیٹ کائنات اور گوگل گرو بن گیا ہے۔'' تو دوسری طرف ہوسِ اقتدار و زرگری نے طاغوتی شکل لے لی ہے اور ان سب کے کرشمے انسان کو مرگِ انبوہ کی طرف ہانک رہے ہیں۔وہ کیسے، اس ناول میں دیکھیں۔

اس ناول کا تانا بانا دو کردار پاشا مرزا اور اس کا باپ جہانگیر مرزا کو مرکز میں رکھ کر بنا گیا ہے۔پاشا مرزا کے حوالے سے مڈل کلاس کی اس نئی نسل کو سامنے کیا ہے جو منچورین، پیزا اور برگر پر پلتی ہے، جس کی زندگی ایپل، لیپ ٹاپ، ڈیٹنگ اور بریک اپ کی غلام گردش میں کٹتی ہے، جس کی روحانیت اور انسانیت سے خالی زندگی کہیں آزادانہ سیکس تو کہیں ڈرگز میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔جن کی انگلیاں ہمہ دم طرح طرح کے گوری گیمز میں مصروف رہا کرتی ہیں، کسی کے سر میں ڈیتھ گیم کا جنون سمایا ہوا ہے اور خود کو بلو وہیل کے جڑے میں سر دیئے بیٹھا ہے تو کسی کی انگلیاں اور انگوٹھے فینسی ہتھیاروں سے کھیلنے کے جنون میں مبتلا ہے، جو اپنی تخلیق کی منشا سے گریزاں ہے، رب اور خالق کائنات کے بنائے نظامِ زندگی پر سے جس کا ایقان اٹھ گیا ہے، جس کے تخیل سے، تصور سے، عمل سے، نیکی اور بدی کا فرق مٹ گیا ہے، جس کے اندر کے وہ احساسات جو مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانیت، دردمندی، اخلاص اور

محبت کے جذبے کو ابھارتے ہیں انہیں آزادروی، ہوسِ زن وزر اور انٹرنیٹ کے جنون نے نگل لیا ہے۔اس لئے جو نسل پنپ رہی ہے۔اس کی رنگارنگ تصویر دکھا کر مشرف عالم ذوقی نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کس طرح از خود مرگِ انبوہ کی طرف گامزن ہے۔وہیں اس گمراہ نسل میں پیدا ہورہے کچھ مثبت پہلو کی بھی تصویر پیش کی ہے، مثلاً زعفرانی تنظیم کے ایک سربراہ راکیش وید اور پاشا مرزا کی اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ گمراہ پاشا مرزا نے اپنے باپ کی ڈائری پڑھنے اور پرکھنے کے بعد وقت وحالات سے آنکھیں چار کر کے جینے کا حوصلہ پیدا کر لیا ہے۔یہ اقتباس دیکھیں:

''اسمارٹ ہو۔بی مشن میں کیوں نہیں آجاتے؟''

''آجاؤں گا سر''

''گڈ!'' راکیش وید مسکرائے۔''ہاں! تم نے بتایا تھا کہ تم جہانگیر مرزا کے بیٹے ہو۔''

''جی سر''

''میں نے (جہانگیر کو) جی مشن چھوڑنے سے منع کیا تھا۔''

''جی! مجھے پتہ ہے۔''

''وہاں سے اٹھ کر سُرخوں (کمیونسٹ) کے پاس چلا گیا۔کیا ملا؟''

''دراصل وہ چار قتل......'' میں کہتے کہتے رک گیا۔''

''قتل کہاں نہیں ہوتے۔راکیش وید مسکرائے......چیچنیا میں، فلسطین میں، لبنان میں، پاکستان میں، افغانستان میں......''

''کشمیر میں......میں آہستہ سے بولا۔''

''کچھ قتل واجب ہوتے ہیں۔'' راکیش وید میرے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

''لیکن ہر قتل سیاسی نہیں ہوتا۔''

''آپ آخری بار اُن (جہانگیر مرزا) سے ملنے گھر بھی گئے تھے......؟''

''میں......؟'' راکیش وید اچانک چونک گئے......''نہیں تو......''

''آپ یاد کرنے کی کوشش کیجئے سر۔''

''دو برس ہوگئے کچھ یاد نہیں آرہا۔''

''وہ سرخ کتاب......موت کا فارم......''

راکیش وید ہنسے......''سب پرانی بات ہوگئی۔پرانی کتاب کب تک چلتی۔سرخ کتاب آگئی مگر یہ سرخ رنگ بہت حد تک زعفران سے ملتا جلتا رنگ ہے۔تمہاری کمیونسٹ پارٹی کا رنگ نہیں۔''

''میں کمونسٹ پارٹی سے نہیں ہوں سر۔''

''گڈ!'' راکیش وید مسکرائے۔''تم نوجوان ہو۔اس لئے اتنا تو سمجھ ہی سکتے ہو کہ تم میں اور ہم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ہے یا نہیں؟ تم خدا کی پرستش کرتے ہو۔ہم پتھروں کو پوجتے ہیں۔تمہارا

رہن سہن، طور طریقہ الگ ہے۔ ہمارا الگ ہے۔ تم گوشت کھاتے ہو، ہم گھاس پھوس۔ تم لٹیرے بن کر آئے اور ہم میں سے کچھ لوگوں کو گوشت کھانا سکھا دیا۔'' راکیش وید زور سے ہنسے ''تم لوگوں نے ایسا بہت کچھ کیا، جو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہم وہی کام کریں تو اپرادھی۔ جزیہ مغلوں نے لگایا۔ ہم یہ کام کریں تو اپرادھی...... تم نے ہمارے مندر توڑے، ہم مسجد توڑیں تو اپرادھی۔ ہم نے سب کچھ تم لوگوں سے سیکھا۔''

''نہیں سر۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم میں آپ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم آپ دونوں اسی سرزمین کا حصہ ہیں۔ ہم باہر سے آئے تو آپ بھی باہر سے آئے۔ مغلوں نے جزیہ لگایا تو تحفظ بھی دیا۔ اکبر نے دوبارہ جزیہ ختم کیا۔ کسی بھی مسلمان ملک میں غیر مسلموں پر کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ مجھے معاف کیجئے گا سر، یہ سب آپ نے کہیں اور سے سیکھا۔''

''تم میں اور جہانگیر مرزا میں فرق ہے۔'' راکیش وید مسکرائے۔

''یہ فرق جنریشن کا بھی ہے سر۔ ہم بہت جلد ایموشنل نہیں ہوتے۔''

''ہاں، ایموشنل۔'' راکیش وید کچھ سوچ رہے تھے۔ ''تمہاری نسل کے لئے مرنا بھی کھیل جیسا ہے۔''

''یہ سچ ہے، مگر ہماری نسل کی چمڑی موٹی ہے سر۔'' میں مسکرایا۔

''اب اتنی بھی موٹی نہیں۔'' راکیش وید ہنسے۔

''کیا پانچویں موت میرے ڈیڈ کی تھی؟''

''انہیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔''

''خوف اور صدمے سے بھی ہارٹ اٹیک آتا ہے سر۔''

''ہوسکتا ہے۔'' راکیش وید بغور میرے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔...... ''مگر آخری ملاقات کے بعد میں محسوس کر رہا تھا کہ موت اس کے آس پاس ناچ رہی ہے۔''

''اور اس موت کو قریب آپ نے کیا تھا...... میں موت کا فارم کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ راکیش وید اب بھی پر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔''

(ص:17-416)

یہ گفتگو اس وقت کی ہے جب پاشا ڈائری کے واقعات کی صداقت جاننے کے لئے اس کے کرداروں کو ٹٹولنے جاتا ہے۔ اسی طرح کا دلچسپ مثبت واقعہ ابونصر اور ڈیتھ گیم کے شکار چلتی ریل کی پٹریوں پر پڑے پاشا مرزا کے دوست ریمنڈ کا ہے جو ریمنڈ کی حیثیت میں رہتے ہوئے بھی ایک ماب لنچنگ کی زد میں اپنی زبان کٹا لینے والے ابونصر کا بیٹا بن گیا ہے اور شاندار ریستوران کا مالک ہے۔ یوں ریمنڈ اور پاشا کی آنکھیں اپنی بیتی کھول دیتی ہے۔ دونوں نے فاشزم اور کیپٹلزم کے مکر جال کو سمجھ لیا ہے۔ اب کے ان کے رویے اور حوصلے سے امید کی کرن پھوٹتی ہے یہ ناول کا ایک رُخ ہے۔

دوسرے رُخ کو شرف عالم ذوقی نے گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ نسل کے نمائندہ جہانگیر مرزا کے واسطے سے پیش کیا ہے۔ شروع میں پرانی نسل اور نئی نسل کے درمیان زندگی برتنے کے نئے سسٹم نے جو جنریشن گیپ پیدا کیا ہے اس کے ردعمل کو باپ بیٹے کے باہمی روابط و رویے سے فطری اور فکر انگیز طور پر نمایاں کیا ہے۔ چونکہ مختلف الخیال ہونے کے سبب باپ بیٹے کے تعلقات خوشگوار زندگی کے مین اسٹریم میں نہیں ہوتے، اس لئے دونوں کی زندگی کے دھارے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پاشا مرزا اپنے باپ سے برگشتہ رہتا ہے، جہانگیر مرزا اپنے بیٹے کے رویے سے نالاں رہتا ہے۔ دونوں کے درمیان مل بیٹھ کر افہام و تفہیم کی گنجائش بھی نہیں نکلتی البتہ ماں سارہ جہانگیر دونوں کے درمیان بحسن و خوبی پل کا کام کرتی رہتی ہے۔ اس کا کردار اس ناول میں حقیقی زندگی کا رنگ بھر دیتا ہے اور ناول کو دلچسپ موڑ دیتا رہتا ہے۔

جہانگیر مرزا ترقی پسند، تیز فہم اور دیانت دار اردو صحافی ہے۔ اپنے قلم کی بدولت خاص نام پیدا کر لیا ہے اور ایلیٹ طبقے میں پیٹھ بنالی ہے۔ مگر انہدام بابری مسجد کے بعد پیدا ملک میں سیاسی حالات کے تحت اخبارات میں اپنے مشاہدات کے مطابق اظہارِ فکر کی جرأت نہیں کر پاتا کہ پیش آئے کچھ واقعات اسے سہما دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو ڈائری میں قلمبند کرنے لگتا ہے۔ زندگی کے آخری پڑاؤ پر زعفرانی تنظیم کے انڈر کرنٹ کو سمجھنے کے لئے اپنی محبوبہ تارا دیش پانڈے کی وساطت سے بی مشن کا حصہ بھی بنتا ہے جو اس کی بے وقت موت کا سبب بنتا ہے۔ آخری لمحے میں بیوی سارہ کو وہ ڈائری تھما تا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ میرے مرنے کے دو سال بعد یہ ڈائری پاشا مرزا کو دے کر اسے توجہ سے پڑھنے کی تاکید کرنا۔ پاشا بادل نخواستہ ڈائری پڑھنے لگتا ہے۔ ڈائری کے واقعات ناول کے سفر کو تیز گام کرتے ہیں۔ یہ ڈائری مسلمانوں کو دیوار سے لگانے کی کارستانیوں اور اس کے طفیل واقع ہوئے دلدوز و انسانیت سوز حادثات و واقعات کا رپورتاژ نہیں لگتی۔ جہانگیر مرزا نے اپنی تیز فہم و فراست سے جیتے جاگتے ہمارے درمیان کے کرداروں کے ذریعہ بی مشن کی سرکار کے تمام تر مشینریوں کو اور اکثریتی طبقے کے ذہن کو مسخر کرنے کی کارگذاریوں کو اس طرح رقم کیا ہے کہ یہ تخلیقی داستان بھی نہیں لگتے بلکہ وہ حقائق ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے گذرتے رہے ہیں اور آج تک سامنے آرہے ہیں۔ بی۔مشن عنان حکومت ہتھیانے میں کس طرح کامیاب ہوئی اور کامیابی کے بعد کس طرح اپنے ایجنڈے نافذ کر رہی ہے اور عوام کو مسحور کر کے نیند میں چلنے والی قوم بناتی جارہی ہے کہ جسے سرکار کے فسطائی رویے اور قول و فعل میں تضاد کے مضر اثرات سے کوئی سروکار نہیں۔ فاشزم اور سرمایہ داری کے سہارے گنگا جمنی تہذیب، معاشرتی یگانگت، سیکولرزم حتیٰ کہ عدل اور راج دھرم سب کے تانے بانے دلیری سے توڑے جارہے ہیں۔ لگتا ہے پوری قوم، نظام حکومت کے سارے عملے و کارندے نیچے سے اوپر تک کے ارباب عدلیہ اور قومی میڈیا سب ہپناٹائز ہو چکے ہیں۔ کشمکش اقتدار کے حصہ دار، سیکولرزم کے علمبردار حزب مخالف بکھرتے جارہے ہیں۔ سب پر زعفرانی رنگ چڑھتا جارہا ہے۔ یکے بعد دیگرے سب ساحر کے حصار میں آتے جارہے ہیں۔ طرح طرح سے مسلمانوں کو دبانے اور ٹھکانے لگانے کی چالیں چلی جارہی ہیں اور قوم نیند میں چل رہی ہے کیسے؟ اور بی مشن کی ایسی کامیابیوں کے بھید کیا ہیں؟ اس ڈائری سے کھلتے ہیں۔ ناول نگار نے بڑی

فنکاری سے اس پہلو کو برتا ہے اور جہانگیر مرزا کے کردار کو گڑھا ہے۔

میرے خیال میں جہانگیر مرزا کا رویہ آج کے ادیبوں اور قلمکاروں پر تازیانہ ہے۔ جہانگیر مرزا نے جو جانا، جو محسوس کیا ان کا اظہار اگر بروقت کرنے کی جرأت نہ کر سکا تو وہ انہیں ڈائری بنا کر اگلی نسل کو تو سونپ گیا کہ شاید اگلی نسل کی آنکھیں کھلیں اور نیند میں چلنے سے باز آئے۔ یہ ناول حال سے آشنا کر کے ہمیں مستقبل کی جھلک دکھاتا ہے کہ کن کن حربوں سے ہندوستانی قوم کو ہندو مسلمان میں بانٹا جا رہا ہے اور ساری دہشت گردی اور انسانیت سوزی کا ٹھیکرا مسلمانوں کے سر پر پھوڑا جا رہا ہے۔ ان کے تئیں برادران وطن میں نفرت کا زہر گھول کر ان کے مستقبل کا فیصلہ ماب لنچنگ سے طے کیا جا رہا ہے اور انہیں مرگِ انبوہ کی طرف ہانکا جا رہا ہے۔ لہٰذا کیا یہ سب کچھ ادب کا موضوع نہیں بن سکتے؟ کیا ادب صرف دل بہلانے، حصول تلذذ و تفریح کا وسیلہ ہے؟ یہ ناول اس طرح کے سوالات کو بھی جنم دیتا ہے اور حالات کی سنگینی کو بے باکی سے اجاگر کر کے لمحۂ فکریہ عطا کرتا ہے۔

اس لئے میں اسے وقت کا بڑا ناول تصور کرتا ہوں کہ یہ اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے انوکھے تجربے کا حامل ہے۔ انوکھا اس لئے کہ اس میں ایک طرف بارود کے ڈھیر سے نکلنے کا شغل ہے تو نئے زمانے کے مطابق رومانس اور جنسی تلذذ کا سامان بھی ہے جس سے حسب روایت ناول کی تکمیل ہو جاتی ہے اور سیاسی موضوع کے روکھے پن کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہاں موساد جس طرح بی مشن کی ہینڈلنگ کر رہا ہے اس تناظر میں دنیا بھر میں مسلمانوں کو آگ اور خون سے کھیلنے پر اکسانے کی موساد کی کارستانیوں کا تصور بھی از خود اُبھر آتا ہے۔ علاوہ ازیں عالمی سطح پر سرمایہ داری کے کرشمے اور انٹرنیٹ کے نئی نسلوں پر مرتب مضر اثرات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول عالمی منظرنامے کا بھی عکاس ہے۔ تیسرے ناول کا کلائمکس یہ باور کراتا ہے کہ محبت، نفرت پر کس طرح فتح پاتی ہے۔ یوں کلائمکس مثبت درس دے جاتا ہے۔ اس لئے یہ ناول شاہکارِ وقت بن کر ابھرتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کے حالات جس میں برسرِ اقتدار جماعت سے عدل کا تقاضا کرنے، ان کی کارکردگی پر سوال کرنے اور راج کاج کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرنے کا حق سلب کر لیا گیا ہو ایسے میں سنگین سیاسی موضوع پر سنجیدگی سے قلم اٹھانا جان جوکھم میں ڈالنا ہے۔ ایسا جوکھم اٹھانے کا حوصلہ حالات کی حساسیت نے مشرف عالم ذوقی میں پیدا کر دیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے اور اسی بنیاد پر ناول تمام ہوتے ہی 'دولفظ' میں اربابِ ادب کو برجستہ ایسا حوصلہ پیدا کرنے کی ترغیب بھی دے ڈالی ہے۔ ان کی یہ دونوں کاوشیں میرے نزدیک قابل تحسین و تقلید ہیں۔

☆☆☆

موبائل: 9431085816 / 8902496545 ؛ ای میل: imamazam96@gmail.com

● ڈاکٹر ایوب راعین کے والد بزرگوار جناب **محمد مطیع الرحمٰن** (عمر تقریباً ۸۵ سال۔ محلہ: مرزاپور، لال باغ، دربھنگہ) کا انتقال ۲۳ راگست ۲۰۱۹ء دن کے سوا دو بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ مرحوم نہایت نیک، دیندار اور ملنسار تھے۔ ۲۴ راگست ۲۰۱۹ء، بروز ہفتہ کی صبح دس بجے جنازہ کی نماز خانقاہ چوک مسجد کے پاس ادا کی گئی اور تدفین لال باغ قبرستان میں عمل میں آئی۔

ڈاکٹر امام اعظم

ذوقی کے ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'': ایک طائرانہ نظر

کہانی کار کو سمجھنا آسان ہوتا ہے لیکن کہانی کو سمجھنا اس لئے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وقت تیز رفتار منظروں کو سامنے لاتا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر منظر دوسرے منظر کا عکس ہے یا ہر منظر دوسرے منظر کو بے رونق کرنے پر آمادہ ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانوی مجموعہ ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'' بھی نگاہوں کے سامنے ایسے مناظر لاتا ہے جنہیں حادثات کہہ کے بھولنے کو جی نہیں چاہتا۔ حادثات و واردات کی کڑیوں کو جب کوئی تاریخ داں پیش کرتا ہے تو وہ اس عہد کا منظر نامہ ہوتا ہے لیکن جب کوئی کہانی کار حادثات و واردات کی کڑیوں کو جوڑتا ہے تو وہ محض منظر نامہ نہیں ہوتا، وہ دل دہلانے والی چیخیں نہیں ہوتیں، وہ روتی بلکتی، سسکتی زندگیاں نہیں ہوتیں، وہ ماتم کرتی ہوئی مرثیہ نگاری بھی نہیں، وہ کوئی نوحہ بھی نہیں بلکہ وہ تمام سرحدوں کو پار کرتی ہوئی تمام نظریات، تمام اخلاقیات سے پرے ہوتی ہیں اور وہ یہ دکھاتی ہیں کہ ہم تہذیب اور ترقی کے جس بلند ترین زینے پر ہیں اس سے نیچے دیکھنے پر ہم کتنے بونے نظر آتے ہیں۔ کتنے غیر انسان دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ شاید دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم اور دنیا کی سب سے قدیم گہوارہ کے لوگ بھی نہیں کر سکتے۔ ذوقی نے ان تمام نظریوں، تمام مبلغین، تمام ترقیاتی قوموں اور تمام قدیم تہذیبی گہواروں کو ننگا کھڑا کر دیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم وہیں ہیں جہاں قابیل نے ہابیل کا قتل کر دیا تھا، ہم وہیں ہیں جہاں نظریوں کے نام پر لاکھوں لوگ قربان کر دیئے گئے۔ ہم جینے کی للک رکھتے ہیں لیکن مرنے کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ ہم محبت کی باتیں کرتے ہیں لیکن نفرتوں کی فصلیں اگاتے ہیں۔ ذوقی بلبلا اٹھتے ہیں اور لینڈ اسکیپ گھوڑوں کی بے سمتی کو کوئی سمت دینا چاہتے ہیں۔ یہی ان کی کہانی کا موضوع ہے جو آفاقی سچائی لئے ہوئے ہر دور کی کہانی ہے۔ ان کے مجموعہ میں شامل یہ کہانیاں لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، فریج میں عورت، بھورے بالوں والی لڑکی، انارکلی عمر ۵۴ سال، ایک مٹھی خاک، لیباریٹری، احمد آباد، ۳۰۲ میل وغیرہ ان ہی حقائق کو اجاگر کرتی ہیں۔

ذوقی کو کہانی بننے کا فن معلوم ہے۔ ان کے یہاں نیا انداز بھی ہے اور کہانی کا نیا تیور بھی، حساس طبیعت کو تلملا دینے والا بھی اور انبساط دینے والا بھی، درد کے گہرے سمندر میں کروٹیں بدلتا ہوا انسانی وجود کس قدر بے بس ہو جاتا ہے اس کا نقش بھی ابھرتا ہے۔ ذوقی نے کہانی کے Treatment کو نئے فنی لوازمات سے بھی آراستہ کیا ہے جس سے کہانی کا ذائقہ ایک نیا Test دیتا ہے اور یہ پیرایۂ اظہار ذوقی کو صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ مجموعہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے قابل قدر ہے۔

....

Hasnain Sialvi

سوانحی کوائف: اشرفؔ گل

قلمی نام : **اشرف گل** نام : محمد اشرف گل

جائے ولادت: موضع: جوڑہ سیان، تحصیل وزیرآباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب، پاکستان۔

تعلیم: (۱) بی۔اے۔ڈگری، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان (۲) ڈپلوما: فاضل فارسی، دارالعلوم السنہ شرقیہ، لاہور، پاکستان (۳) اکاؤنٹنگ ڈگری، سٹی کالج فریزنو، کیلیفورنیا، امریکہ۔

ذریعہ معاش: پاکستان میں، ملازمت یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ۔ نیویارک میں: دوحہ بینک لمیٹڈ۔ کیلیفورنیا میں: مختلف سرکاری اور پرائیویٹ ملازمتوں کے بعد اب خوشگوار ریٹائرڈ زندگی کے مزید ارلمحات کے دوران لکھائی پڑھائی میں طبع آزمائی اور موسیقیت میں گیت وغزل سرائی میں وقت گذارنا۔ گھریلو کاموں کی انجام دہی کے علاوہ ٹی۔وی۔ کے مختلف پروگراموں میں خبریں، موسیقی اور ڈراموں وغیرہ سے دل بہلانا اور وقت کاٹنا۔ دیگر مشاعروں اور موسیقی کی محافل میں شمولیت بھی ہوتی رہتی ہے۔

موجودہ پتہ : 2348 W. Carmen Ave., Fresno, California-93728 (USA)

Youtube: ashrafgill1; Phone: (559)389-6750; Email: ashgill88@aol.com

تصنیفات و دیگر تحریریں: پنجابی غزلیات کی کتابیں: (۱) کرلاندی تان (۲) جیون رُت کنڈیالی (۳) سوچاں۔
اردو غزلیات کی کتابیں: (۴) وفا کیوں نہیں ملتی؟ (۵) چلو اک ساتھ چلتے ہیں (۶) وہ ملا کے ہاتھ جدا ہوا۔
گرمکھی میں غزلیات کتابیں: (۷) تولویں بول (منتخب پنجابی غزلیات) (۸) سازو سوزِ سخن (منتخب اردو غزلیات)
ہندی میں غزلیات: کتاب (۹) سلگتی سوچوں سے (منتخب اردو غزلیات) (۱۰) ''میری زندگی کی یادداشتیں'': اردو میں خودنوشت سوانح حیات کا: حصہ اول۔ ان کے گاؤں جوڑہ سیان تحصیل وزیرآباد۔ ضلع گوجرانوالہ سے لاہور تک کی داستانیں ہیں۔ سوانح حیات کا دوسرا اور آخری حصہ جس میں ان کی امریکہ آمد کے دوران کے واقعات جہاں ان کی تمام تر تخلیقی اور موسیقارانہ صلاحیتیں پیدا ہوئیں، درج ہیں۔ ☆ منتخب اردو غزلیات انگریزی زبان کی رُو سے ڈھال کر ایک کتاب اشاعت کے لئے تیار ہے ☆ بھارت میں ان کے چار سفرناموں پر مشتمل کتاب بھی آخری مراحل میں ہے۔ ان سفرناموں میں انھیں مشرقی پنجاب میں امرتسر، جالندھر، پٹیالہ، لدھیانہ، نواں شہر، گرداسپور، ملوٹ، چنڈی گڑھ، گرداسپور، نیودہلی، تاج محل آگرہ، لکھنؤ، بھوپال، ممبئی، کلکتہ، حیدرآباد میں رہنے کا موقع ملا۔

ان کے انشائیوں اور افسانوں کی کتابیں (اردو اور پنجابی) اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ چند انگریزی کہانیوں کے ترجمے بھی کر چکے ہیں۔ میوزک کی کچھ البم بھی ریکارڈ ہو چکی ہیں جن میں غلام علی، حامد علی خاں، ریاض علی خاں اور ان کی آواز کے ساتھ پاکستان کی معروف خواتین گلوکارائیں بھی نغمہ سرا ہو چکی ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اشرفؔ گل کی شاعری میں تہہ داری

اشرف گل اردو کی تیسری بستی کے شاعر ہیں۔ کیلی فورنیا میں رہتے ہیں اور بنیادی طور پر غزل گو ہیں۔ ان کی غزلیں تجربہ، تفکر اور تخیل کے ساتھ مشاہدہ کا پرتو ہوتی ہیں۔

زیر تبصرہ مضمون میں اشرف گل نے اپنی غزلوں میں جن بحروں کا استعمال کیا ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے:
ہزج، متدارک، متقارب، رمل، مضارع، مجتث، رجز، کامل، خفیف، مدید، عمیق، مشاکل، مقضب منسرح اور وافر۔

جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے نفس انسانی کے اعمال میں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن تفکر و تخیل میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ تفکر میں نفس، افکار کے باہمی ربط پر غور کرتا ہے اور تخیل میں وہ افکار کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور ان کو اجزائے ترکیبی کے طور پر استعمال کر کے ان سے نئے افکار پیدا کرتا ہے۔ مؤخر الذکر ترکیب کا اصول ہے کہ جو چیزیں اس کے دائرۂ عمل میں آتی ہیں وہ کائناتِ فطرت اور عالم وجود کی عام اشکال و صورتیں ہیں۔ اس کے برخلاف مقدم الذکر تحلیل کا اصول ہے اور اس کا سروکار چیزوں کے باہمی علائق سے ہے۔ اس کے لئے افکار بذاتِ خود سالم وحدتیں نہیں ہوتے بلکہ مجری علامتیں ہوتی ہیں جن سے بعض نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ تفکر چیزوں کے باہمی اختلافات کا لحاظ رکھتا ہے اور تخیل ان کی مشابہتوں کا۔ تخیل عامل ہے اور تفکر اس کا آلہ۔ تخیل روح ہے اور تفکر جسم۔ تخیل ایک ٹھوس چیز ہے اور تفکر اس کا سایہ ہے۔ P. B. Shelly کے کہنے کے مطابق شاعری کی عام معنوں میں پوری تعریف کی جاسکتی ہے کہ یہ تخیل کا اظہار ہے اور ان معنوں میں شاعری نوع انسانی کی ہم خلقت ہے۔

انسان ایک ایسا ساز ہے جس پر خارجی اور باطنی محرکات کا ایک سلسلہ اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح ہوا کی لہریں ایک باؤ ترنگ کے تاروں کو چھیڑ کر ان میں سے نت نئے نغمے پیدا کرتی رہتی ہیں لیکن انسان کے اندر بلکہ تمام ذی حس ہستیوں کے اندر ایک ایسا اصول مضمر ہے جس کا عمل ایک باؤ ترنگ کے تاروں کی جھنکار سے مختلف ہوتا ہے۔ ان مختلف ارتعاشوں، آوازوں اور محرکات کے درمیان اشرف گل کا فن کار، شاعرانہ وجود انگڑائیاں لیتا ہے۔ وہ تطابق قائم کر کے نہ صرف انسانی زندگی کے ساز پر انگلی رکھتے ہیں بلکہ ہم آہنگی بھی پیدا کرتے ہیں:

جفائیں کر کے طلب ہے اسے وفاؤں کی   وہ بھولپن سے، مرا اختیار مانگے ہے
بکاؤ! ہر آدمی یہاں پر   الگ الگ سب کی قیمتیں ہیں
گردش حالات سے صورت مری نکھری   اب مجھے پہچاننا، آسان ہوا ہے
کوئی چیز رکھتی ہے اندر   جو رہتا ہے آنکھوں میں پانی
کام اپنے وہاں ہوتے رہتے اگر تو دیگر بات تھی   بے سبب تو نہیں، ترے پردیس میں گھر بنانا پڑا

اشرف گل کی غزلوں میں یادوں اور خواہشوں کا مفہوم منتہی نظر آتا ہے۔ یہ قلبی اضطراریت کو اجاگر کرتا ہے۔

وہ تاروں کو مضراب کی حرکتوں کے مطابق ٹھیک کرتے ہیں تاکہ آواز کی ایک مخصوص مقدار پیدا ہو۔ وہ اپنے محرک عکسی تمثال پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں:

یقین میرا ، نہ تجھ کو آئے نہ مجھ کو تیرا		زبان و دل کا مزا ہے شاید بہم نہیں ہے
آگ ، بارود ، دھواں ، لاشوں کی بدبو ہر سو		جائے انسان تو کس سمت خدایا جائے
خزاؤں میں صیاد ، رکھ دے قفس کو		بہاروں نے بے بال و پر کر دیا ہے
خوف کی اک جنگ ہے ہر ذہن میں		خون سے خوں ، برسر پیکار ہے
لوگ کیا جانیں کسی محبوب کی ہر سانس سے		دھڑکنیں منسوب ہوں، تو گنگنائے زندگی
نقصان و منافع کی فقط کرتے ہیں باتیں		ملتے ہی نہیں لوگ، حسابوں سے نکل کے

اشرف گل کا اسلوب اور ان کی تصویر سازی ان کے مجموعی اثرات اور ان کے ادراک کی خارجی تمنائیں ہیں۔ جذبات لذات کا موضوع مزید حسیاتِ اظہار کے گنجینے میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے اشعار سے معانی کا نیا جہاں طلوع ہوتا نظر آتا ہے جس سے ان کی ذہنی حالت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ تجربی نوعیت، رمزیت اور بدیعیات کا ایک نظام سامنے ضرور آتا ہے جو تمثالوں سے حسن اور تعمق پیدا کرتا ہے:

ہوش میں بھی ہونے لگیں، لغزشوں پہ لغزشیں		عاشقی نے پاؤں جب سے، خون میں پیار لئے
آئی ہے تری یاد، مجھے جاگتے سوتے		آتی ہے مہک جیسے گلابوں سے نکل کے
زندگانی گزارنے کے لئے، مسکراہٹ سجائے چہروں پر		یوں تو ملتے ہیں لوگ ہنس ہنس کر، پر نہیں جانتے ہنسی کیا
تیری چاہت، وفا، پیار، ایثار میں		زندگانی گنوانے کا موقع ملا
محبت باخدا! بچوں کی سی یاری نہیں ہے جو		کبھی جھوٹی، کبھی سچی، کبھی کچی، کبھی پکی

اشرف گل کی غزلوں میں عالم معانی کی نظارگی اور شکل تراشی کے فنون بیک وقت اظہار اور وسیلۂ اظہار بنتے ہیں جو مزاحم اور متصادم ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اس فنی اور ذہنی رویئے کا سبب ان کا یہ ایقان لگتا ہے کہ لمحۂ موجود کی آنکھ مچولی تہذیب، ماحول اور وقت کی سولی پر لٹکی ہوئی ہے:

انسان کا تو سانس بھی لینا محال ہے		پھیلا فضا میں ہرطرف، بارود ہے یہاں
ورق اس کا ہر اک کرے ترجمانی		ہے دو دھاری، ہتیاری، بیوپاری دنیا
ہر شام نیند بن کے چراتی ہے گو نظر		ہر صبح پھر سے آنکھ ملاتی ہے زندگی
گیہوں بارود مل کر بھوک کیا کم کریں گے		اس عمل سے بڑھیں گی مفلسی کی قطاریں
جہان بھر میں ترقی کی داد دیتا ہوں		بموں سے لوگ مریں اب یہاں، وبا سے نہیں

اشرف گل کی غزلوں کی چابت پھرت میں، بندش میں، زبان کی ترکیبوں میں اور سماجی رشتے کو نئی سطح سے جانچنے پرکھنے میں غیر معمولی قوت اور سحر سے کام لینے کی لحۂ بے زبانی ملتی ہے۔ اس طرح وہ وجود کے اثبات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور وقت اور معاشرے کی صورت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کمال گویائی کی شرط سے واقفیت بھرے اشعار دیکھئے:

خود اپنے آپ میں صاحب، کرو خودی پیدا — یہاں پہ ہوتا کوئی کام، التجا سے نہیں
خود کمایا نہیں، اسلاف نے جو بخشا ہے — ہم اسی نام کی پہچان، لئے پھرتے ہیں
تجھ کو مجھ سے نہیں مطلب، نہ مطلب، نہ مجھے تیری طلب — دوستی کرتے ہیں سب، اپنی ضرورت کے لئے
پہلے چیزیں سستی، بھی لگتی تھیں مہنگی — اب ہے بازاروں میں، رونق مہنگائی کی
خوش کا پیکر لہولہو ہے، غموں کا دامان بھی رفو ہے — عجب دنیا میں ہاؤ ہو ہے، ہے خوف جس سمت دیکھتے ہیں

معاشرے یا فطرت کی طرف سے اشرف گل پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس سے فہم کو جس طرح مہمیز ملتی ہے اس کا استعارہ ان کی غزلیں ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات کے علائق کے ادراک کو ایک مستقل حیثیت بخشتے ہیں اور ورمند بن کر رشتے کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ اکیسویں صدی کی دو دہائی کی دہلیز کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش ہے، عملی زندگی کا تقاضہ ہے اور سماجی بندھنوں کا شدید احساس ہے۔ شعور اور تہذیبی روایت کی فکری لہر دیکھئے:

سبھی کچھ جہاں میں طبیعت مطابق تو ہوتا نہیں — پسند آئے گر نہ کوئی کام تم کو، رکو! مت کرو
دوستی بچی نہ ہاتھ آئی ، مگر — باقی ساری دوستیں آئیں ، گئیں
شناسا روایاتِ الفت سے ہونا ضروری — پڑیں گی ادا ایک دن ، یہ رسومات کرنا

مجھے یاد ہے آج بھی اپنا بچپن، تھا آسان کہنا، کہ بھوکا ہوں اماں
مگر کتنا مشکل جوانی میں دیکھا، صنم سے محبت کا اظہار کرنا

اشرف گل کی غزلوں میں راہ ورسم میں محبت کا ظہور تنوع پیدا کرتا ہے۔ احساسات میں لذت کی چاشنی ایک الگ ذائقہ رکھتی ہے، خود اعتمادی پیدا کرتی ہے۔ سیاق وسباق میں امنگ کو بیدار کرتی ہے اور لہجے کی صلابت کا ضامن بنتی ہے۔ اسے تطابق پذیری کا نام دیا جاسکتا ہے:

رفاقت، غم، خوشی، حسرت، تمنا، آرزو فرقت — محبت کی وساطت سے مجھے حاصل ہوا سب کچھ
مجھ کو بخشی نہیں ہے بصارت فقط عشق نے — میرے احساس میں اس سے پیدا بصارت ہوئی
جتنے مضبوط پختہ تیری بخشش کے وعدے — اتنی کمزور اپنی بندگی دیکھتا ہوں

چاند کی سمت دنیا کا رخ آجکل، اور اپنے یہاں حکمراں ہیں
ملک اندھیر کر کے وہ مشغول ہیں، روشنائی کی رسہ کشی سے

بے منتہا کا ذائقہ دراصل وہ نقش قدم ہیں جو متعدد مضامین پر ثبت ہیں۔ یہ وہ قوت ہے جو ان کا ادراک کرتی ہے اور ان بدیہی صداقتوں کا ذخیرہ ہے جو سارے علم انسان کا مشترک سرمایہ ہیں۔

اشرف گل کی غزلیہ شاعری ان تمام اصول وضوابط کی چاندنی بکھیرتی ہے جو تازگی کی نئی صورت نکھارتی ہے۔ عزم وایقان کا درس دیتی ہے اور نئی سمت کی تہہ داری کی ضامن بنتی ہے۔

☆☆☆

کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور-812001

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

اشرفِ گل کی شاعری میں عصری آ گہی

معاصر اردو شاعری کے افق پر اشرف گل نمایاں طور پر نظر آنے والے فن کار ہیں۔شاعری اور موسیقی سے گہری وابستگی کے سبب حلقۂ احباب میں مقام ومرتبہ پاتے ہیں۔ان کی غزلوں کو معروف گلوکاروں نے آواز دی ہے۔انہیں خاص وعام تک اپنی شاعری کے ذریعہ رسائی کا اعزاز حاصل ہے۔اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں میں حدیث دل بیان کرتے ہوئے قارئین وسامعین کو انہوں نے محظوظ کیا۔اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے بھی ان کا نام توانا اور معتبر ہے۔زندگی ان کی شاعری کا خاص محور ہے اور آج کی زندگی تو بطور خاص ان کی شاعری میں موجود ہے۔غزل کی دنیا وسیع ترین ہے۔محبوب سے گفتگو اور حسن کے چرچے اس صنف کے پسندیدہ موضوعات ہو سکتے ہیں لیکن عصر اور روح عصر کے بغیر کوئی بھی شاعری مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔یہ وہ حقیقت ہے جس نے فن کاروں کو اپنے عہد سے وابستہ رکھا ہے۔جناب اشرف گل نے موضوعاتی رنگا رنگی بکھیرنے میں عصری رنگ کو نمایاں کیا ہے۔ان کے یہاں معاشرے کی ابتری، نئے سیاسی نظام کی سیاہ کاریاں، عالمی تناظر میں انسانیت کی زبوں حالی، فرد کا بکھراؤ، سماج کے بدلتے تیور، نوجوانوں کے مسائل، حکومت وقت کی ستم گری، غربت وافلاس، مہنگائی اور ان سب کے بیچ محبت واخوت کے ساتھ جینے کی خواہش رکھنے والا انسان موجود ہے۔موصوف تجربہ کار شاعر وگلوکار ہیں اور نگاہِ بسیط کے مالک بھی۔اس لئے ان کی غزلوں کے اشعار میں بین الاقوامی مسائل اور آفاقی افکار کی جلوہ گری صاف دکھائی دیتی ہے۔آج کے دور میں محبت کی ضرورت ہے تو اپنا حق چھین کر لینے کی ہمت کی بھی ضرورت ہے۔شاعر کے نزدیک آج کا دور مکمل انسان بن کر جینے اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے سے عبارت ہے:

جو ملک ایٹم بنا رہے ہیں وہ مفلسی کو بڑھا رہے ہیں
دل کی دھرتی حسین تر ہے دلوں کا نقشہ بدل کے دیکھ

زندگی اپنی تھی پر ڈور کسی اور کے ہاتھ
خود غرض لوگ رہے دیتے ہدایات مجھے

یہاں منت سماجت سے حصول حق بھی ناممکن
یہاں پر لوگ کوئی شئے بنا چھینے نہیں دیتے

اس کی ہر پل نئی کہانی ہے
آدمی! آج کی خبر ہی نہیں

اشرف گل موجودہ زمانے کی کثافتوں کو اظہاریہ میں شامل کرتے ہیں۔یہ فانی دنیا بے شمار برائیوں میں ملوث ہے۔آج کا انسان اپنی بداعمالی سے اس دنیا کو جہنم نما بنانے میں لگا ہوا ہے۔معاشرے میں علمی وفکری انحطاط اس قدر ہے کہ ایک دوسرے پر یقین اور خبرگیری ناپید ہوتی جارہی ہے۔دولت مندوں نے اپنے ماتحتوں کا خیال ترک کردیا ہے تو مزدوروں نے بھی اپنی مشقت کو وقت اور زر کے تابع کرلیا ہے۔اب معاشرہ بس آپسی لین دین اور اپنی غرض پر ٹکا ہوا ہے۔شاعر کے نزدیک اس عالمِ رنگ وبو میں جینا ہے تو ان چیزوں سے اجتناب ضروری ہے:

کل تلک جس میں رہ نہ پائیں گے
اس کو اپنا مکان کہتے ہیں

دیکھ کر زردار کی ہر وقت بے انصافیاں
آج کا مزدور بھی محنت کشی سے ڈر گیا

ہیں یوں تو کہنے کو ہم لوگ اشرف المخلوقات
ہم اپنے دور کی ہر جنس سے بھی سستے ہیں

اشرف گل دور حاضرہ کی بے راہ رویوں کو شعر کے پیکر میں ڈھالتے ہیں۔اس زمانے کی عام برائیوں پر ان

کی نگاہ پڑتی ہے تو اس کے منفی پہلو کو اجاگر کرنے سے خود کو روک نہیں پاتے ہیں۔ دنیا بھر میں مجبوروں پر ستم ڈھائے جارہے ہیں یہ ایک حقیقی بیان ہے مگر معصوم شاعر یہیں پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کی جڑ تک پہنچتے ہیں اور جنگ وجدال وور بارود کو انسانیت کے لئے سم قاتل قرار دیتے ہیں۔ یہاں ان کی دردمندی آفاقی افکار کی غمازی کرتا ہے۔ ہجرت کے درد کو بھی انہوں نے سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے:

ستم کرنے کو جائز جانتے ہو		غلط اک فیصلہ کرنے لگے ہو
ہوتی حیات دلکش انساں حسین ہوتے		بارود کا جہاں میں جو نہ کارخانہ ہوتا
زمانے کے دیکھے ہیں اپنے تقاضے		کسی کو دیا کب قرینے سے جینے؟
کام اپنے وہاں ہوتے رہتے اگر تو دیگر بات تھی		بے سبب تو نہیں، آ کے پردیس میں، گھر بنانا پڑا

انسانی جذبات وخواہشات کے بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ گردوپیش کا بھی خیال ہے کہ فضائیں آلودہ ہیں۔ یہ آلودگی ہر طور پر ہے اور سوچنے والوں کی ذہنی افتاد کے مطابق معنوی تہہ داری سے لبریز ہے۔ انسان کے جیتے رہنے کا خواب اور اس خیال کی منافی کے باوجود حیات ابدی کے لئے بے چینی ہماری نفسیات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دور کے ایک اہم المیے پر شاعر نے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا ہے کہ بے شمار ملنے جلنے والوں میں ہم خیال اور ہم طبیعت لوگ کم ہی ملتے ہیں۔ چند اشعار سے محظوظ ہوئیے:

انسان کا تو سانس بھی لینا محال ہے		چاروں طرف فضاؤں میں بارود ہے یہاں
سب ہیں تلاشِ عمر خضر میں یہاں مگر		لاچار ہیں کہ زندگی محدود ہے یہاں
ہو سارے محلے سے شناسائی تو کیا ہے		چند ایک ہی انسان طبیعت سے ملیں گے
محنت سے رک جائے گی بدحالی گھروں کی		مہنگائی کے تحفے جو حکومت سے ملیں گے

اشرف گل کے اشعار میں غنائیت بھرپور ہوتی ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں وہ بڑی ہی چابک دستی سے کام لیتے ہیں۔ مانوس الفاظ سے نئی معنوی جہات پیدا کرتے ہیں۔ مشکل اور ادق الفاظ سے اجتناب کی وجہ شاید یہی ہے کہ شاعری کو عام فہم اور سادگی سے پُر بنایا جائے۔ دراصل سادگی کا اپنا ایک الگ حسن ہے اور یہ حُسن ہر نگاہ کو عزیز ہے۔ ان کی سادگی تو دلوں پر کٹار چلاتی ہے۔ اس سے سہل اور دل کو چھو لینے والا شعر کیا آسانی سے مل سکتا ہے؟

تمہیں اتنا بتانا چاہتا ہوں		تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں

شاعری دلوں تک رسائی حاصل کرلے تو اسے کامیاب تصور کیا جانا چاہئے۔ ان کے یہاں موجود جذبات اور احساسات تیزی سے اثر کرتے ہیں۔ ان جذبوں میں آج کی دنیا اور دنیا کے آباد خرابے نیز جھلمل کرتی الفت سایہ بن کر ساتھ چلتی ہے۔ انہیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ فن میں فکر کی پیوستگی کا حسن کتنا دلکش ہوسکتا ہے۔ ''وفا کیوں نہیں ملتی''، ''چلو ایک ساتھ چلتے ہیں''، ''وہ ملا کے ہاتھ جدا ہوا'' کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی شاعری میں جذبہ دل کا بیان ایک خاص ماحول کی تشکیل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ شاعری ہماری فکر میں ایک ارتعاش پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے:

آپ جانیں ممکن و ناممکنات		مجھ کو اشرفؔ گل محبت چاہئے

ڈاکٹر امام اعظم

اندازِ دیگر کا غزل گو: اشرف گل

تخلیقی شعور کو طبع موزوں کے ساتھ لسانی، فنی اور جمالیاتی مضمرات کی آگہی ہو جائے تو اپنے احساسات و جذبات، تجربات و مشاہدات کو شعری پیکر میں ڈھالنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ سحر آگیں شعریت اور حیات آفریں حکمت سے معمور شاعری جو ذوقِ جمال کو زرخیز اور ذہن و ضمیر کو روشن کرلے ایسی شاعری تو نابغہ اور جینیس شعراء کے حصے میں آتی ہے۔ البتہ مروجہ معیار، ذوق اور لسانی آگہی کی سطح کے لحاظ سے ذات، زندگی، زمانہ کے پیچ و خم کے اسرار، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے زیر و بم کے تئیں پیدا جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کے شعری اظہار کی عمدہ کاوشیں فی زمانہ قدرے ضرور دیکھنے کو ملتی ہیں جو ملتفت اور متاثر کرتی ہیں۔ ایسی ہی کاوش اشرف گل کے توسط بھی سامنے آرہی ہے۔ اس لئے یہ مقبولیت رکھتے ہیں۔

اشرف گل پنجابی نژاد ہیں۔ پاک و امریکہ کی شہریت رکھتے ہیں۔ بینک کی اعلیٰ ملازمت کو وسیلہ روزگار بنایا ہوا ہے۔ ساز و آواز کے رسیا ہیں۔ اردو اور پنجابی میں تخلیقی اظہار کرتے ہیں۔ مشرقی موسیقی اور گلوکاری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ امریکہ میں متعدد اردو اور پنجابی ادبی تنظیموں اور موسیقی کی انجمنوں سے وابستہ و سرگرم ہیں۔ اب تک اردو غزلیات کے مجموعے ''وفا کیوں نہیں ملتی؟'' دوبار لاہور سے ''چلو اک ساتھ چلتے ہیں''، تین بار لاہور سے ''وہ ملا کے ہاتھ جدا ہوا'' پہلی بار لاہور سے دوسری بار دہلی سے، انتخابِ غزل ''ساز و سوزِ سخن''، گرمکھی رسم الخط میں چنڈی گڑھ سے منتخبہ غزلیات ''سلگتی سوچوں سے'' ہندی رسم الخط میں حیدرآباد، تلنگانہ سے، پنجابی غزلیات کے مجموعے:
(۱) ''کرلاندی تان'' فارسی اور گرمکھی رسم الخطوط میں دوبار لاہور سے، (۲) ''جیون رُت کنڈیالی'' فارسی رسم الخط میں، (۳) ''سوجاں'' فارسی رسم الخط میں لاہور سے، ''تولویں بول'' گرمکھی رسم الخط میں برنالہ، بھارتی پنجاب سے اور اس سال اپریل ۲۰۲۰ء میں انہوں نے اپنی آپ بیتی ''میری زندگی کی یادداشتیں'' کا پہلا حصہ اپنے پیدائشی گاؤں سے لے کر لاہور تک کی یادداشتیں (۱۹۵۸ء تا ۱۹۸۲ء) درج کی ہیں۔ لاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔ خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ (۱۹۸۲ء تا ۲۰۲۰ء) بھی جلد شائع کروانا چاہتے ہیں۔ ان کے افسانوں، انشائیوں، خاکوں کا مجموعہ اور پنجابی کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی منتظرِ اشاعت ہے۔ مزید برآں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے چار سفر نامے......۲۰۰۰ء میں بھارتی پنجاب، امرتسر، جالندھر، لدھیانہ، چنڈی گڑھ، ۲۰۰۴ء میں امرتسر، پنجاب، نیو دہلی، لکھنؤ، بھوپال، ۲۰۰۸ء میں امرتسر، چنڈی گڑھ، جالندھر، پنجاب، نیو دلی، تاج محل آگرہ، ممبئی اور ۲۰۱۴ء میں امرتسر، پنجاب، کلکتہ، حیدرآباد کے مسودے بھی تیار کر چکے ہیں۔ امید قوی ہے کہ یہ سفرنامے بھی جلد طباعت کے مرحلے سے گزریں گے۔ اس لئے ہندوستان، پاکستان اور امریکہ میں معروف و مقبول ہیں اور اپنی فنکارانہ کاوشوں کے طفیل تینوں ممالک سے متعدد اعزازات یافتہ ہیں۔

یوں غزل ان کا خاص وسیلہ اظہار ہے۔ فنِ شعر پر دسترس رکھتے ہیں اس لئے غزل کے روایتی اسلوب کو ہی

محبوب نہیں رکھا بلکہ نئے نئے فنی تجربے کا بھی شوق رکھتے ہیں اور غیر مرجہ بحور میں بھی گل کھلاتے رہتے ہیں۔ غیر مرجہ بحور کا آہنگ عموماً غیر مانوس لگتا ہے اور عروضیوں کے نشانے پر آتا ہے مگر موزونیت ایسی ہوتی ہے کہ ان غیر مانوس بحور میں کہی ہوئی ان کی غزلیں موسیقی کی دھن پر الگ الگ کیفیت سے سامع کو گداز کرتی ہیں۔ خیال والفاظ اور ارکان و اوزان کی موزونیت غنائیت سے سرشار کردیتی ہے۔ اس لئے اپنے تجربے میں موزونیت کا یہ خاص خیال رکھتے ہیں۔ کہا ہے:

غزل جس کو کہیں، موزونیت اس کی ضروری ہے
روایت میں، سلاست میں، فصاحت میں، بلاغت میں

''بے مزہ افکار میں پیدا نئی لذت کریں گے'' کا عزم کارفرما ہوتا ہے جس سے ان کی غزلیں لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہیں اور وصف خاص یہ کہ مجموعہ کی غزلوں کے بحور کا اندراج بھی کر جاتے ہیں جس کا رواج نہیں ہے۔ اس بابت رؤف خیر کی یہ باتیں بجا لگتی ہیں کہ:

''اشرف گل پنجاب کی مردانہ وجاہتوں، نسائی صلابتوں اور فطرت کی فیاضیوں کو اپنے استقبالی مزاج کی رنگینی سے آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے فکر وفن کا بنیادی حوالہ حسن کی خوش آہنگی ہے۔ بصری پیکروں، سماعتی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ لطفِ شامہ ولذت لامسہ کا موسیقی ریز اظہار اشرف گل کی شناخت ہے۔ (دیباچہ شعری مجموعہ ''وہ ملا کے ہاتھ جدا ہوا'')

تخلیقی عمل میں لفظوں کے موزوں ومتوازن لسانی، فنی اور جمالیاتی برتاؤ سے حسن کی خوش آہنگی حاصل ہوتی ہے۔ اشرف گل اس ہنر سے خوب واقف ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں کہ ان میں لفظ کی چستی اور مضمون کی علویت کتنی پرکشش ہے:

ہمارے دل کو، عطا ہوئیں جو ۔۔۔ کہاں سمندر میں، وسعتیں ہیں
کوئی چیز، دُکھتی ہے اندر ۔۔۔ جو رہتا ہے، آنکھوں میں پانی
تنہا، تنہائی میں، ان سے ملتے تھے ۔۔۔ اب بھٹکو تنہا! تنہائی، اشرف گل!
روشنی، رعد و کڑک، خشکی، نمی، غمزہ و ناز ۔۔۔ آنکھ! جس میں اس قدر موسم نہیں، تو کچھ نہیں ہے
یہ غریب مفت ہے پٹ رہا، مرے ساتھ چسپاں ہوا ہوا! ۔۔۔ یہ نصیب شے بھی عجیب ہے، نہ رقیب ہے نہ حبیب ہے

مذکورہ اشعار میں متداول اور غیر متداول دونوں بحور کی کرم فرمائی ہے مگر ان کے اندر حسن کی خوش آہنگی میں کہیں کمی نہیں آئی ہے کیوں کہ اشرف گل عمومی احساسات وجذبات کو بھی ندرت کے ساتھ برتنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یہ چند اشعار اس پر دال ہیں۔

یہ تخلیقی اظہار کے لئے صناعانہ کاریگری اور فلسفیانہ تاویل کے پھیر میں نہیں پڑتے بلکہ سیدھے من سے من کی بات کرتے ہیں جس میں جمالیاتی حظ بھی ملتا ہے اور حکمت بھی۔ ویسے اب اسی روش کا چلن ہے۔ پھر بھی اشرف گل کے یہاں کچھ ایسا ہے جو اوروں سے انہیں الگ کرتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

ملنے پہ ترے برسے، ساون کی طرح آنسو
ہم تم سے کبھی آنکھیں، دو چار نہ کر پائے

آنکھیں سوکھ جائیں گی، لب بھی نہ مسکرائیں گے
دل کی سرزمین میں جو نم نہیں، تو کچھ نہیں ہے

خطا کاری اگر انسان کا شیوہ نہیں ہوتا
کبھی ہوتی نہ بندے کی، خدا سے بندگی پکی

مانگنے کا فن اشرف، آ ہی جائے گا فوراً
دل میں گر ریا بھر لیں، لب پہ گڑگڑاہٹ سی

کل تلک کربلا کا تھا اک سانحہ
آج سارا جہاں کربلا ہو گیا

آج غزل اپنے روایتی منصب سے پرے وہی متوجہ کرتی اور لبھاتی ہے جو اپنے پرگداز لب و لہجے میں وقت اور حالات کے پیدا کردہ 'درد' کو بخوبی اجالتی ہو کیونکہ اب عشق و عاشقی کا وہ زمانہ رہا نہ محبوب کے ویسے ناز و غمزے رہے۔ چنانچہ اس باب میں غزل جمالیاتی حس کو محظوظ کرنے تک مکتفی ہے۔ اس لئے کہ بقول اشرف گل:

نقصان و منافع کی فقط کرتے ہیں باتیں
ملتے ہی نہیں لوگ حسابوں سے نکل کے!

انسانوں کی ترقی نے جذبہ محبت، شفقت، الفت، اخوت و مروت سب کو اس حساب و کتاب میں ڈال دیا ہے۔ دیکھئے:

کیسے اُگیں گے، پیار کے پودے دماغ میں
زرخیز جب زمین ہی مفقود ہے یہاں

اسی سبب وقت و حالات کے ضرب کے درد کی سحر کارانہ عکاسی ہی غزل کا منصب طے ہو گیا ہے اور اشرف گل اس منصب کو بخوبی ادا کر رہے ہیں۔

اشرف، مشرق و مغرب کے مشاہد ہیں۔ مشرق سے مغرب تک یعنی زوال پذیر تہذیب سے ترقی یافتہ تہذیب تک کے بشر، معاشرے اور ماحول میں زندگی کو پل پل جیا، ان کے رویے اور رجحانات سے حاصل احساسات و تجربات کو پل پل چنا، نشاط و درد سے جو جھے تو دنیا کو یوں پایا:

ورق اس کا ہر اک، کرے ترجمانی
ہے دو دھاری، ہتیاری، بیوپاری دنیا

منتقل ہو کر مشینوں میں، جہاں سمٹا، مگر
مفلسی کی مستطیلیں، دائرے بڑھنے لگے

زمین ہے جو کہ اپنی دھن میں، اُگا کے سب کو کھلا رہی ہے
مگر زمیں کے مکین اشرف ہی ایک دوجے کو کھا رہے ہیں

یوں دنیا تو خوب ترقی کر رہی ہے مگر بقول گل:

دورِ ترقی آ گیا، انسانیت جاتی رہی
دولت جہاں پہنچی وہاں سے، عافیت جاتی رہی

سو انسانی رویے کا بدلاؤ مذہب، ثقافت، سیاست، معاشرت اور اخلاقیات کے سارے اقدار کو نابود کرتا جا رہا ہے۔ ہوا و ہوس نے مذہبی کردار کا رنگ بھی بہ نظر گل یوں بدلا ہے:

ان کی رغبت، غمِ انسان سے کم دیکھی
جن کو نسبت، فقط دیر و حرم سے ہے

عمر بھر عبادت سے، دور ہو سکے شاید　　خیر و شر کی من اندر، جو ہے اک ملاوٹ سی

غیر ملکی بخششوں سے، دولتِ زردار بڑھی　　محل بن گئے وہاں پر، جس جگہ خیرات گئی

خود کمایا نہیں، اسلاف نے جو بخشا ہے　　ہم اسی نام کی، پہچان لئے پھرتے ہیں

انسانیت کی بقاو سلامتی کا نگہبان علم وادب ہوتا ہے مگر علم نے عیش واستراحت ،فطرت سے بغاوت اور انسانی ہلاکت کے سامان بہم کرنے کی تگ و دو اختیار کرلیا ہے اور ادب کا حال بقول گل:

اجارہ دارئی کم عقل خود پرستوں سے　　سسکتا، چیختا، روتا ہوا ادب دیکھا!

دیکھ کر ڈھنگ، اہلِ قلم کے یہاں　　دنگ و بے رنگ، شعر و ادب ہو گیا!

سیاست میں ایسا رنگ جمایا گیا کہ:

کوئی زر کی بھوک میں مبتلا، تو کسی کو خون کی پیاس ہے　　ہے گر سنگی کہیں تشنگی، یہاں کوئی سیرِ شکم نہیں

بکاؤ! ہر آدمی یہاں پر　　الگ الگ سب کی قیمتیں ہیں!

اور آدمیت اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ:

بے کسی، بے بسی، بے حسی، بے کلی
آدمیت کا، شجرہ نسب ہو گیا

معاشرے کا کردار یوں بدلا کہ ''یہاں یار کوئی بھی جب ملا، وہ ہاتھ ملا کے جدا ہوا'' کہ یہاں اس شعار کا تقاضہ ہوتا ہے:

جو چاہئے پاسِ دوستانہ
تو جھوٹ سچ میں ملا کے رکھئے!

بہر کیف ان کے یہاں زمانے کا جو درد ہے وہ بطور خیر نہیں بلکہ ان میں سوز ہے، گداز ہے جو دل کو چھوتا ہے اور عبرت دیتا ہے۔ ان میں یاسیت نہیں رجائیت کا پہلو ہویدا ہے۔ حقائق کے آئینہ میں سنورنے کی تحریک ہے، فکر انگیز نکتے ہیں جیسے:

سکوں، قرار، چین اگر چاہئے تمہیں　　ہوس، ہوا، فتور کے پر کاٹ ڈالئے

سنورتے ہیں ہمارے دن تو مثبت کام کرنے سے　　نہ سمجھو صرف، اپنی سوچ و فکر و نظریہ سب کچھ

المختصر اشرف گل کی غزلوں میں زندگی کے حسن کی جستجو ملتی ہے، کیفیات، جذبۂ محبت والفت کی نیرنگیاں ہیں، وفا و جفا کی جھلکیاں ہیں جو غزل کا وصف خاص ہے۔ ان میں عام انسانی جذبات کو احساسات کی ترجمانی بخوبی ملتی ہے اور سب سے بڑھ کے یہ گل کا اسلوبِ اظہار ایسا ہے جو لگتا ہے کہ غزلیں ہم سے براہِ راست باتیں کرتی ہیں۔ یہ اوصاف انہیں ''اندازِ دیگر'' کا غزل گو ٹھہراتے ہیں۔

☆☆☆

موبائل: 9431085816 / 8902496545 ای میل: imamazam96@gmail.com

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

امام اعظم کے نام مشاہیر کے خطوط : دھنک رنگ

اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ خط و کتابت سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ خط کو دماغ اور تحریر کی آنکھ کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں جب مقفّیٰ اور مسجع نثر کا رواج تھا تب خط میں بھی یہ رنگ پایا جاتا تھا مثلاً والد کو خط لکھتے وقت بیٹا یہ انداز اختیار کرتا تھا:

''جناب قبلہ و کعبہ معزز و مکرم والد صاحب محترم مدظلۂ العالی! کورنش خادمانہ کے بعد نہایت ادب سے یہ عرض پرواز ہوں کہ بندہ آپ کی غلامی میں حاضر ہونا چاہتا ہے......''

وقت کے ساتھ اردو عبارت میں سادگی آتی گئی اور یہ اثر خط و کتابت پر بھی پڑا۔ غالب نے خصوصی طور پر سہل انداز اختیار کیا اور بے تکلفی کو راہ دی۔ حالانکہ غالب اپنے اردو خطوط کی اشاعت سے مطمئن نہیں تھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ منشی شیو نرائن نے پہلے پہل غالب کے خطوط شائع کرنے کی کوشش کی اور ان سے اجازت مانگی تو غالب نے جواب میں لکھا:

''اردو خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں، یہ زائد بات ہے کہ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔''

اور یہ سچ ہے کہ غالب کے خطوط نے خطوط نویسی اور اردو نثر کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔

بہت بعد میں ''زیر لب (صفیہ کے خطوط جاں نثار اختر کے نام)''، ''لیلیٰ کے خطوط'' (قاضی عبدالغفار)، ''غبارِ خاطر'' (ابوالکلام آزاد) اور اقبال و شبلی کے خطوط عطیہ فیضی کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کے بعد نذیر فتح پوری کے خطوط، اختر شاہجہان پوری کے نام خطوط اور بعض دیگر کرم فرماؤں کے ساتھ سہیل عظیم آبادی کے خطوط مناظر عاشق ہرگانوی کے نام اور مشاہیر کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام منظر عام پر آکر سربستہ رازوں کو زندگی کے بنیادی رموز تک پہنچاتے رہے اور ادب کی پیش رفت کی حقیقت سے روشناس کراتے رہے، جن میں تہذیبی اور ثقافتی تصورات نمایاں ہیں۔ اسی کی پیش رفت شاہد اقبال کی مرتب کردہ کتاب ''چٹھی آئی ہے'' بھی شمار قطار میں ہے جس میں ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر کے خطوط شامل ہیں۔ امام اعظم فعال شخصیت کا نام ہے۔ محسوس کو بازوؤں کی زینت بنانا جانتے ہیں اور نفسیاتی طور پر کسی بھی شخصیت سے زندگی کا حسین طریقہ معلوم کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ رسالہ ''تمثیل نو'' کے مالک و مدیر بھی ہیں۔ ان کے نام مشاہیر کے بیشتر خطوط اسی رسالہ کے مشمولات سے متعلق ہیں۔ ان خطوط کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ذہن کا کوئی نہ کوئی گوشہ ضرور سامنے آجاتا ہے۔ ان میں تصورات کی دنیا نہیں ہے بلکہ عملی مطالعہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ اسی لئے تخلیقات کی لہریں ان میں اتار چڑھاؤ رکھتی ہیں۔ وجود میں آنے

والے گہر ہائے آبدار کی تابندگی ملتی ہے اور ان میں دوصدی کی گراں قدر ادبی روایات کی علمبرداری دیکھی جاسکتی ہے۔ ان میں نئی نسل کے فعال ادیبوں اور صحافیوں کو مستفیض ہونے کا علم وآگہی سے بھرپور مواد ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر نے تخلیقی عمل کے باطنی پہلو پر زیادہ توجہ دی ہے۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر جدید تصورادب کی معنی آفرینی پیش کی ہے اور بصیرت کے بعض اہم گوشے پیش کئے ہیں۔ ساتھ ہی بعض نے تجزیاتی مطالعہ سے کام لے کر نئے منظر کو متصادم بھی کیا ہے۔ ایسے بہت سارے قلم کاروں میں بعض روشن نام اس طرح ہیں: ملک راج آنند، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، خشونت سنگھ، جگن ناتھ آزاد، نظیر صدیقی، قمر رئیس، مظہر امام، عبدالعزیز خالد، شکیل الرحمٰن، شمس الرحمٰن فاروقی، ستیہ پال آنند، حامدی کاشمیری، باقر مہدی، بلراج کومل، فضیل جعفری، وہاب اشرفی، اسلوب احمد انصاری، احمد سعید ملیح آبادی، سلیمان اطہر جاوید، شارب ردولوی، شارق جمال، عبدالصمد، عبدالقوی دسنوی، نظام صدیقی، عتیق احمد عتیق، عنوان چشتی، فہیم اعظمی، ف س اعجاز، مجتبیٰ حسین، مولانا ولی رحمانی، مشرف عالم ذوقی، ملک زادہ منظور احمد، منظر شہاب، نادم بلخی، ندا فاضلی، نقشبند قمر نقوی اور کل ملا کر 434 قلمکاروں کے خطوط شامل کتاب ہیں۔

اس کتاب کا اہم حصہ شاہد اقبال کا مقدمہ ہے۔ اس میں انہوں نے مکتوب نگاری پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور یادگار، شاندار اور تاریخی اہمیت کا حامل مواد پیش کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ خط کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود تحریر کی تاریخ ہے۔ ویسے تحقیق کے لحاظ سے خطوط کا زمانۂ تحریر تین ہزار سال پرانا ہے۔ شاہد اقبال نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ:

> ''برطانوی مصنف ولیم رابرٹس نے ایرانی شہنشاہ اور ہخامنشی سلطنت کے بانی کورش اعظم (Cyrus the Great) کی بیٹی اور داریوش یا دارا اول کی ملکہ اتوسا (Atossa) وفات: 475 قبل مسیح کو مکتوب نگاری کا موجد قرار دیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر پاؤلا سیکاریلی (شعبۂ یونانی تاریخ ثقافت، ڈرہم یونیورسٹی، برطانیہ) کی کتاب Ancient Greek Letter Writing: A cultural History (600BC-150BC) میں ایک قدیم مصری خط کا نمونہ ملتا ہے جو تقریباً 260-250 قبل مسیح کے دوران کسی ڈرومن نامی شخص کے ذریعہ فرعون بطلیموس دوئم فلاڈلفیس کے وزیر خزانہ اپلونیوس کے مشیر خاص زینن کو لکھا گیا تھا۔''

عہد نامہ جدید (New Testament) میں مسیحیت کی تبلیغ واشاعت کے لئے سینٹ پال کے ذریعہ اور عوام کے ذریعہ کیتھولک مکاتیب لکھنے کا سلسلہ جاری رہا جسے Epistle کا اصطلاحی نام دیا گیا تھا۔ یعقوب کا، پطرس کا، یوحنا کا اور یہودہ کے خط محکمۂ آثار قدیمہ میں اب بھی محفوظ ہیں۔ شاہد اقبال نے حضرت محمدؐ کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''نبی کریم حضرت محمدؐ نے صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی توسیع وتبلیغ کے لئے اس وقت کے عظیم بادشاہوں یعنی شاہ حبشہ نجاشی، بازنطینی شہنشاہ قیصر ہرقل، شاہ ایران خسرو پرویز، شاہ اسکندریہ وغیرہ کے نام

خطوط لکھ کر نہیں مشرف بہ اسلام ہونے کی دعوت دی۔ علاوہ ازیں آپ مکہ اور عرب کے عام لوگوں کے نام بھی تبلیغ دین کے لئے خطوط لکھواتے تھے۔''

ہندوستانی میں خطوط نویسی کی تاریخ قبل مسیح چوتھی صدی سے مانی جاتی ہے۔ سنسکرت کے شاعر کالی داس کے ڈراما ''وکرما اروشیم'' میں مکتوب نگاری کا تذکرہ ملتا ہے۔ مسلم سلاطین اور مغلیہ بادشاہوں نے ڈاک کا نظام قائم کیا۔

اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ بقول پروفیسر انیس الحق قمر، رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر کو اردو کا پہلا مکتوب نگار کہا جاسکتا ہے لیکن ڈاکٹر لطیف اعظمی کے لکھنے کے مطابق کرناٹک میں ارکاٹ کے نواب والا جاہ کے چھوٹے بیٹے حسام الملک بہادر نے اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم کے نام 6/دسمبر 1822ء کو خط لکھا تھا اور یہی اردو کا پہلا خط ہے۔ بعد میں یہ سلسلہ آگے بڑھا جس کی مکمل تفصیل شاہد اقبال نے اپنے مقدمہ میں دی ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی پیش رفت اور ان کے نام مشاہیر کے خطوط پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

حروف تہجی سے شروع ہونے والے خطوط میں پہلا خط ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا ہے۔ کتابوں کے موضوع اور مزاج و نہاد کا ذکر کرتے ہوئے وہ یہ سچائی بھی بیان کرتے ہیں:

''گاؤں میں اب بھی چوک چوپال زندہ ہیں سماجی زندگی کی سانسیں چل رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے رابطہ رہتا ہے۔ اگر ایک دن کسی سے ملاقات نہ ہو تو دوسرے دن ہی شکایت کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ گاؤں گھر میں بجلی کا مسئلہ بھی رہتا ہے۔ اور پھر دیہاتوں میں دیر رات تک کام کرنے کا چلن بھی تو نہیں ہے۔ ان دنوں میں کالج کی مصروفیات میں گھرا رہتا ہوں۔ لوٹتے لوٹتے عصر کا وقت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیہاڑی والی نوکری کیا غضب کی ہے۔ نام ہی ہے، دام صفر۔ حکومتوں کے اعصاب پر تعلیمی نج کاری کا ایسا نشہ سوار ہو گیا ہے کہ وہ مستقل ملازمت دینے سے کتراتی ہے اور ایسا شارٹ کٹ راستہ اختیار کرتی ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا۔''

تجسس پسند ذہن کے شاعر احسان ثاقب ہیں۔ انہوں نے علم و ادب کے بنیادی حوالہ کی روشنی میں اردو زبان کے سلسلے میں حائل دشواریوں اور الجھنوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

''کتاب سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں کوئی گائیڈ نہیں۔ کسی زبان اور اس کے ادب کو سمجھنا ہتھیلی پر سرسوں جمانے والا معاملہ ہوتا ہے۔ اور جو زبان فی زمانہ اپنے رنگ و روپ بدلتی رہی ہے کسی دلہن کی طرح سجتی سنورتی ہی ہے۔ اس کو تابع کرنا یا اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنا آفاقی شعور و آگہی کی وابستگی اور کلی ہوش مندی کی واقفیت لازمی ہے۔ آج ہزاروں کی تعداد میں جن ہوش مندوں نے اردو زبان و ادب کا تخلیقی مورچہ سنبھال رکھا ان سے پوچھئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کسی ہوا ہوائی کا معاملہ نہیں ہے۔''

اقبال انصاری افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن امام اعظم کے نام لکھے ایک خط میں انہوں نے ''تمثیل نو'' میں شائع شدہ غزلوں پر جس باریکی اور شاعرانہ نقد سے گرفت کی ہے اس سے ان کے آفریں مطالعہ اور شاعرانہ درک کا چہرہ سامنے آتا ہے:

''اس بار کچھ عجیب وغریب غزلیں نظر آئیں مثلاً ایک غزل کا شعر ہے: ''اس گماں پہ کہ میں کچھ کہتا نہیں سچ کے سوا'' (مصرعہ کا وزن؟)، چھین لی مجھ سے کسی نے تاب گویائی مری'' (تاب طاقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو کسی بھی طرح جائز سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی ناتوانی کے سبب جب کچھ کرنے کی طاقت اور سکت نہیں رہتی تب ''تاب'' کا استعمال کرتے ہیں)۔ اس غزل کا ایک اور مصرعہ توجہ طلب ہے: ''اس سے بڑھ کر راس نہ آئی شناسائی مری''۔

''نہ'' کو اگر ''نا'' پڑھا جائے تبھی وزن پورا ہوتا ہے۔ ایک اور غزل کا ایک مصرعہ ہے ''پلٹ کر نہیں آئی اک بھی صدا تک'' (بڑی آسانی اور ذرا سی فکر سے مصرعہ یوں کہا جا سکتا تھا ''کبھی اک صدا تک پلٹ کر نہ آئی'')۔ ایک اور غزل میں ردیف ''ہوئیں'' بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ مثلاً ''جا بہ جا ہیں پتیاں بکھری ہوئیں'' اسے نثر میں یوں لکھا جائے گا ''جا بہ جا پتیاں بکھری ہوئی ہیں'' نہ کہ ''بکھری ہوئیں ہیں''۔ ایک غزل کا ایک شعر ہے ''زمین مانگے گی جب اپنی نعمتوں کا حساب''، ''خدائے اہل زمیں تو جواب کیا دے گا۔'' بھائی! یہ خدائے اہل زمیں کون ہے؟ ہم تو صرف ایک خدا سے واقف ہیں۔ وہی زمین کا خدا ہے، وہی اہل زمین کا خدا ہے۔ ایک اور غزل میں ایک مصرعہ ہے ''شبنم کی بوند پیاس کو پانی نہ دے سکی''۔ ایسے مصرعوں کے ساتھ ان کے معنی بھی شاعر (شاعرہ) سے پوچھ کر لکھ دیا کیجئے تاکہ ہم جیسے کم فہموں اور کج فہموں کی رہنمائی ہو سکے۔''

''تمثیل نو'' توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ اور اس میں شائع شدہ مشمولات پر اہل نقد و نظر اور کمال فن کے زبان و بیان داں گرفت کرتے رہے ہیں تاکہ اظہار کی محبوبیت پیش نظر رہے۔ اور اثرات کی آمیزش صنم خوباں بنی رہے۔ سید امین اشرف نے سرسید اور دو قومی نظریے کے سلسلے میں اپنی جانکاری کے بارے میں بتایا ہے:

''راقم الحروف نے اب تک یہی سن رکھا تھا اور پڑھ رکھا تھا کہ بقول سرسید، ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے۔ ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ اگر پھوٹ جاتی ہے تو دلہن بھی بدصورت نظر آئے گی یعنی ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں مگر محمود احمد کریمی نے نہایت محکم دلیل پیش کی ہے کہ دو قومی تصور کے بانی سرسید ہیں۔ ممکن ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سرسید کے رجحانات میں تبدیلی آئی ہو۔''

عرق ریزی، جاں فشانی اور معنویت و ادبیت کو سامنے رکھ کر انجم عظیم آبادی نے قوت گویائی کو مشمولات کی نشاندہی کر کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے جس میں تاریخی سچائی جاں گزیں ہے:

''بزم شاکری ۱۹۳۶ء میں نہیں ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ ''مغربی بنگال میں اردو غزل کا منظر نامہ'' میں ڈاکٹر نصرت جہاں نے جدید نظریات کے اسیر ہونے والوں میں اشک امرتسری کو بھی شامل کر لیا ہے جب کہ ان کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہو گیا تھا اور جدیدیت کی لہر ۱۹۶۰ء کے آس پاس چلی تھی۔ ''مغربی بنگال میں اردو صحافت'' میں امتیاز احمد راشد نے لکھا ہے کہ شروع میں ''اخبار مشرق'' احسن مفتاحی کی ادارت میں نکلتا تھا جبکہ وسیم الحق اس کے تاسیسی مدیر ہیں۔ ''قرطاس وقلم'' کے مدیر وکیل احمد علیمی نہیں بلکہ احمد کمال حشمی ہیں۔''

''تمثیل نو'' میں امام اعظم طویل اداریہ لکھتے ہیں اور پوری اردو دنیا کا ہمعصر منظرنامہ پیش کرتے ہیں۔ان کے اداریہ کی پذیرائی ہوتی رہی ہے۔اداریہ پسند کرنے والوں میں ڈاکٹر انور سدید بھی تھے:

''تمثیل نو'' کا ادرایہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' بھارت کی پوری ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ میں اس کا ایک ایک لفظ بالاستیعاب پڑھتا ہوں اور اپنے مضامین میں اس سے استفادہ بھی کرتا ہوں۔''

اداریہ معلومات سے بھرپور ہوتا ہی ہے اس میں بیک وقت جتنی کتابوں پر تبصرے ہوتے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔اس کا اعتراف ایم نصر اللہ نصر نے اس طرح کیا ہے:

''تمثیل نو'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سال بھر کی وفیات، سانحات، واقعات اور تقریبات کی تفصیل اس میں درج ہوتی ہے۔علاوہ ازیں قیمتی ادب پارے کی تو اس میں اچھا خاصا ذخیرہ محفوظ ہوتا ہے۔ایسے اور اتنے تبصرے کسی رسالہ میں نہیں شائع ہوتے جتنے کہ آپ کے رسالے میں جگہ پاتے ہیں۔''

پروفیسر ثوبان فاروقی موضوعات کے افہام وتفہیم کی راہ ہموار کرنا جانتے تھے۔اسی لئے ان کی تحریر دعوتِ فکر دیتی ہے۔پروفیسر عبدالمنان طرزی نے ''رفتگاں وقائماں'' کے عنوان سے دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ قسط وار لکھی تھی جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔اور طرزی صاحب کی قادرالکلامی کے بھی قائل ہوئے۔حالانکہ بعض کم فہم نے ''رفتگاں وقائماں'' ترکیب پر اعتراض کیا تھا جنہیں عربی اور فارسی کا علم نہیں ہے۔اس قسط وار مضمون اور ترکیب پر ثوبان فاروقی کا یہ خط توجہ طلب ہے:

''فردوسی نے ''پارسی'' میں عجم کو زندہ کیا، طرزی نے ''ریختے'' میں دربھنگہ کو دوام بنادیا۔وہ بھی اس طرح کہ رفتگاں کو قائماں اور قائماں کو دائماں بنادینے کا بھی ہنر اہل دنیا کو دکھادیا۔میں اسے ایک ایسے آئینے سے تعبیر کرتا ہوں جس میں ہر شخص ماضی وحال کے مانوس وغیر مانوس چہروں کا بیک وقت دیدار بھی کرسکتا ہے۔''

''تمثیل نو'' کے لمبے اشاعتی سفر میں کتنے ہی تخلیقی عمل کی بازیافت ہوئی ہے جس کی افادیت لامحدود وسعت رکھتی ہے اور امام اعظم کے صحافتی وادبی نیز شخصی رنگوں کی عکاسی کرتی ہے۔مشاہیر کے تمام خطوط ٹھنڈی چاندنی کی طرح جگمگا اور جھلملا رہے ہیں اور ادبی صداقت کی خوشبوؤں کے دھنک رنگ بکھیر رہے ہیں۔

☆☆☆

کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور- 812001

● معروف نقاد حقانی القاسمی کی بیٹی **انیقہ قاسمی** (عمر:۱۴/ سال) کا انتقال ۲/ ستمبر ۲۰۱۹ء ہوگیا۔مرحومہ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینئر فارویمن کنڈینسڈ کورس کے آٹھویں درجے کی طالبہ تھی اور روزمرہ کی طرح اسکول جاتی تھی۔اچانک کلاس سے باہر گئی جہاں وہ گرگئی۔سر میں شدید چوٹیں آئیں۔بے ہوشی کی حالت میں داخل اسپتال کیا گیا جہاں ڈاکٹروں نے موت کی توثیق کردی۔نماز جنازہ بعد نماز ظہر اوکھلا، نئی دہلی کے شاہین باغ قبرستان میں ادا کی گئی جہاں ادباء، شعراء، اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں صحافی، سیاسی، سماجی اور ملّی رہنماؤں نے نمناک آنکھوں سے سپردخاک کیا۔پسماندگان میں والدین کے علاوہ دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

پروفیسر مجید بیدار

مکتوب نگاری کی دیرینہ روایت کی امین کتاب ''چٹھی آئی ہے''

شعر و ادب اور صحافت کے علاوہ ذرائع ابلاغ کی وجہ سے اردو دنیا کے ادبی سرمایہ میں یادگار اضافہ ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے فاصلے چاہے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں' لیکن انسانیت کے بل بوتے پر سب بندگانِ خدا ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ اس کے باوجود بیگانگی کی وجہ سے آپسی تعلقات کو استوار نہیں رکھتے جنہیں ذرائع ابلاغ نے قربت عطا کی ہے۔ انسان کی سستی اور کاہلی اُسے باہمی تعلقات فراہم کرنے کے بجائے تعلقات کو منقطع کرنے کے جذبے نے انسانوں کو ایک دوسرے سے دور کردیا ہے' جبکہ موجودہ دور الیکٹرانک میڈیا سے مربوط ہے اور خط و کتابت رفتہ رفتہ قصہ پارینہ کا درجہ حاصل کرتا جارہا ہے۔ موجودہ دور میں اگر کسی سے ربط قائم کرنے کے لئے نہ تو فاصلے حائل ہوتے ہیں اور نہ وقت کی تنگی کا احساس ہوتا ہے۔ کیوں کہ قدیم زمانے کی خط و کتابت کی روایت دن بہ دن مسدود ہوتی جارہی ہے اور اس کے مقابلہ میں سوشل میڈیا نے حد درجہ کہرام مچادیا ہے جس کی وجہ سے آن واحد میں ربط و تعلق استوار کرنے کا موقع فراہم ہوگیا ہے۔ تیز رفتار ترقی کے اس ماحول میں اگر کوئی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے 752 صفحات پر مشتمل کتاب شائع کرکے ملک کے مشاہیر کے خطوط کی درجہ بندی کے توسط سے انتخاب کا کارنامہ انجام دیتا ہے تو بلاشبہ وہ مبارکباد کا مستحق ضرور ہے' کیوں کہ عصر حاضر میں انسان کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے باوجود اس نے آج کے انسان کو ماضی کا آئینہ دکھا کر روایت کی پاسداری کا حق ادا کیا ہے۔ غرض ترتیب و تدوین کا کارنامہ انجام دینے والے شاہد اقبال جیسے جواں سال ادیب کو مبارکباد دی جانی چاہئے کہ انہوں نے سہ ماہی رسالے ''تمثیل نو'' کے مدیر اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کولکاتا ریجنل سینٹر کے ریجنل ڈائریکٹر امام اعظم کے نام وصول ہونے والے خطوط کو یکجا کیا ہے۔ بڑے ہی اہتمام کے ساتھ دورِ حاضر کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے ''چٹھی آئی ہے'' جیسی جامع کتاب کے ذریعہ 434 ادیبوں اور شاعروں کے خطوط کی ترتیب کے ذریعہ عصر حاضر میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب کے مکتوب نگاروں میں ملک کے مختلف علاقوں کے پروفیسر، ڈاکٹر، شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور تخلیق کار ہی شامل نہیں' بلکہ ادب کی تحقیقی و تنقیدی سرگرمیوں میں مصروف مصلحین اور دانشوروں کے افکار کو پیش کرنے کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ تحقیقی اور تدوینی خصوصیت کی حامل کتاب ستائشی خطوط کا مرقع قرار دی جائے گی جس کا طویل مقدمہ اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ تحریر کی ہمہ گیری اور مکتوبات کی کثرت پر توجہ دینے سے زیادہ شاہد اقبال نے اس کتاب کے مقدمہ ''مکتوب نگاری کی روایت اور چٹھی آئی ہے'' کو 44 صفحات پر محیط رکھا ہے' جو نہ صرف جامع' بلکہ تاریخی پس منظر میں دنیا میں مکتوب نگاری کا آغاز اور اردو زبان میں مکتوب نگاری کی صنف کے ہر دور کے نمونوں کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی وجود کے ساتھ ہی مکتوب نگاری کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ اس صنف کی ترقی میں عوام الناس ہی نہیں' بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

شاہد اقبال کی بیشتر تصانیف کا جائزہ لینے کا موقع ملتا رہا ہے۔ وہ نہ صرف تازہ کار محقق اور تدوینی کارنامے انجام دینے والے ایسے ادیب ہیں جن کا تعلق کولکاتا کی سرزمین سے ہے اور انہوں نے اپنے دور کے تقاضوں کی تکمیل کرنے کے لئے تحقیق و تنقید کے رویے کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو اور انگریزی میں ایم اے کرنے کے علاوہ یو جی سی کا نیٹ امتحان کامیاب کیا اور کئی اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں۔ ان کی دیگر کتابوں اور زیر تبصرہ کتاب میں بنیادی فرق یہی محسوس ہوتا ہے کہ دوسری کتابوں میں انہوں نے وقت اور حالات کے پس منظر میں شاعروں اور ادیبوں کی تحقیقی و تنقیدی شناخت کو مکمل کیا ہے لیکن ''چٹھی آئی ہے'' کے ذریعہ بیک وقت انہوں نے اردو کے 434 اہل قلم حضرات کے خطوط کو نہ صرف یکجا کیا ہے' بلکہ ڈاکٹر امام اعظم کے سہ ماہی جریدے ''تمثیل نو'' کے مشمولات کے حوالے سے لکھے گئے اہم خطوط کی تدوین بھی کی ہے۔ ان کے اسی کام کو ملک کے کونے کونے سے سراہا جا رہا ہے کیوں کہ اس ترتیب و تدوین میں حق پسندی شامل ہے۔ آزادی سے قبل ادبی صحافت کی خدمت انجام دیتے ہوئے نیاز فتح پوری نے اپنے ماہانہ رسالہ ''نگار'' کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ انہیں بھی لاتعداد خطوط موصول ہوئے ہوں گے' جن کی تدوین عمل میں نہیں آئی' تاہم مشاہیر کے مکتوبات پر مشتمل کتاب کو شاہد اقبال نے مدون کر کے ایک اہم اشاریہ تیار کیا ہے۔ عالمی سطح پر مکتوب نگاری کی تاریخ اور پھر مختلف علاقوں میں خطوط نویسی اور ان کی ترسیل کے رویوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مرتب نے اپنے مقدمہ کو جامع اور تاریخی حیثیت سے حامل بنا دیا ہے۔ اردو میں مرزا غالب کے توسط سے فروغ پانے والی مکتوب نگاری کی صنف کو عالمی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہونے کے مختلف جواز بھی مقدمہ کا حصہ ہیں۔ شاہد اقبال نے اس مقدمہ کی پیشکش کے دوران عالمی ادبیات اور مختلف ممالک میں قبل مسیح سے لے کر دورِ حاضر تک ڈاک کے نظام کی تاریخ کا حوالہ ہی نہیں دیا' بلکہ مکتوب نگاری کی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے تمام شواہد کو یکجا بھی کیا ہے۔ اس خصوص میں شاہد اقبال کی جستجو اور ان کی محنت کا استقبال کیا جانا چاہئے۔

اردو کی نثری اصناف میں قصہ، کہانی اور ماورائی باتوں کے ذکر کو افسانوی نثر یا فکشن کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بجائے دنیا کی حقیقتوں کو پیش کرنے والی نثر کو غیر افسانوی نثر یعنی Non Fiction کا موقف حاصل ہوتا ہے۔ چوں کہ خطوط نگاری میں حقائق سے کام لینا اور کہانی قصے سے پرہیز کرنا لازمی ہے' اس لئے فن کے اعتبار سے خطوط نویسی کو غیر افسانوی نثر میں شمار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر خطہ اور ہر زبان کے علاوہ ہر قوم و مذہب کے لوگوں میں ترقی اور علم و ادب سے دلچسپی کا معیار تحریر یا لکھنے سے دلچسپی کا امین ہے۔ چنانچہ قوم علم و ادب کے علاوہ اپنے تاثرات بیان کرنے کے لئے مکتوب نگاری کا سہارا لیتی ہے تو اسے دنیا کی مہذب قوموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو قومیں مہذب نہیں ہوتیں' وہ مکتوب نگاری کے اصول اور طریقوں سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ عصر حاضر میں مکتوب نگاری یا خطوط نویسی کے لئے Letter Writing جیسی اصطلاح کا رواج عام ہے۔ کسی زمانہ میں جب عیسائی پادری اپنے مذہبی اور شرعی احکامات میں پیدا ہونے والی تفریق کو معلوم کرنے کے لئے دوسرے پادریوں سے رابطہ قائم کرتے اور خطوط کے ذریعہ وضاحت کا سہارا لیتے تو ان کے درمیان خط و کتابت کے وسیلہ کو Epistle کی حیثیت سے شہرت حاصل

تھی۔ جبکہ Epistle کی مذہبی روایت کونظر انداز کر کے عصر حاضر میں Letter Writing کے طریقہ کو عالمی سطح پر فروغ دیا جانے لگا۔ اخبارات اور رسائل ہی نہیں' بلکہ کسی بھی محکمہ جات کی کارکردگی میں فرق پیدا ہوتو توجہ مرکوز کرنے کے لئے لکھے جانے والے خطوط کو'' شکایتی خطوط'' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ مکتوب نگاری بے مقصد نہیں ہوتی اور مقصد کی تکمیل کے لئے ہی اس نثری صنف کا استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے توسط سے نہ صرف توجہ مبذول کروانا مقصود ہوتا ہے' بلکہ تعریف وتوصیف اور تنقید کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے وضاحتوں کے ساتھ ساتھ انکشافات کے امکانات بھی جاری رہتے ہیں۔ انسان جس قدر پڑھا لکھا ہوگا اور جس قدر علم وفضل کا دلدادہ ہوگا اُسی قدر اس کے خطوط میں دانشوری اور فکر وخیال کی گہرائی وگیرائی ہی نہیں' بلکہ مسائل کے حل اور وسائل کی تلاش کا انداز شامل ہوتا جائے گا۔ اس طرح مکتوب نگاری کی صنف کو صرف دو انسانوں کے درمیان کی بات چیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس صنف کے توسط سے علم وعرفان کے سرچشمے پھوٹنے کے امکانات بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ غرض مکتوب نگاری کو نثر کی ایک صنف اور غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کرنے والی باضابطہ فطری خصوصیت کو پیش کرنے کا وسیلہ قرار دیا جائے گا۔ جس کے ذریعہ باضابطہ علم وفن کے ماہرین اپنی فکر اور شعور کی بلندی کو پیش کرتے ہوئے اور شعر وادب کی دنیا کی توضیحات اور تشریحات کو نمایاں کرتے ہیں۔ اردو دنیا میں مکتوب نگاری کے مختلف انداز موجود ہیں' سب سے پہلے مہدی افادی نے اپنے خطوط کے ذریعہ رومانیت کا انداز اختیار کیا جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے احمد نگر جیل میں نظر بند رہنے کے دوران جو خطوط تحریر کئے' وہ کتابی شکل میں ''غبار خاطر'' کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ ان خطوط میں ایک جانب انشائیہ نگاری کی خصوصیت جلوہ گر ہے تو دوسری جانب افسانہ طرازی اور کہانی کی پیشکش کے انداز کے ساتھ تاریخی شہادتوں کا ثبوت بھی موجود ہے۔ اس طرح مکتوب نگار جس قدر علم ودانش کے علاوہ فکر وحکمت کا مالک رہے گا اُسی قدر اس کے خطوط میں علم وحکمت اور دانائی کے موتی اثر انداز ہوں گے۔

مکتوب نگاری درحقیقت دو اشخاص کے باہمی تعلقات کی نشاندہی کرنے والی صنف ہے۔ خط لکھنے والے کی حیثیت کاتب کی ہوتی ہے اور جس کو خط لکھا جاتا ہے وہ بنیادی طور پر مکتوب الیہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں ''چٹھی آئی ہے'' کا جائزہ لیا جائے تو اس تدوینی کارنامے میں شامل تمام خطوط کا مکتوب الیہ ایک ہی ہے یعنی تمام مشاہیر نے ایک ہی شخص یعنی ڈاکٹر امام اعظم کے نام خطوط لکھے ہیں۔ غالب کے خطوط یا پھر سرسید اور حالی کے خطوط ہی نہیں' بلکہ شبلی نعمانی کے مکتوبات اور مختلف دانشورانِ علم وفن کے خطوط کا مشاہدہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خطوط درحقیقت کسی ایک شخصیت کے نام سے نہیں لکھے گئے' بلکہ ہر ادیب نے مختلف قسم کے مکتوب الیہ سے رابطہ قائم کرنے خط وکتابت جاری رکھی اور بعد میں اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ دوسرے خطوط کے مجموعوں کے مقابلہ میں ''چٹھی آئی ہے'' کا محبوب ایک ہی ہے جو ڈاکٹر امام اعظم کی حیثیت سے اردو کا استاد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کولکاتا مرکز کا سربراہ ہونے کے علاوہ شاعر وادیب اور ''تمثیل نو'' کے مدیر اعزازی کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ لازمی ہے کہ ان کے رسالے کا دور بھی اکیسویں صدی کے آغاز کا دور ہے۔ اس کے

باوجود بھی ''چٹھی آئی ہے'' کے خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام اعظم کو لکھے ہوئے خطوط ''تمثیل نو'' کی اشاعت سے مربوط نہیں ہیں' بلکہ رسالے کے آغاز سے بھی پہلے سے امام اعظم کی ادبی سرگرمیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس تدوینی خطوط کے مجموعہ میں شائع ہونے والے خطوط کا سلسلہ 2020ء تک جاری ہے لیکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا 1987ء میں لکھا گیا خط پرانے خطوط کی نمائندگی کرتا ہے۔ کتاب میں شامل بیشتر خطوط 2001ء سے لے کر 2019ء کے دوران لکھے گئے۔ 1996ء اور 1997ء کے مکتوب نگاروں کی تعداد بہت کم ہے' پھر بھی ڈاکٹر پریمی رومانی، جاوید دربھنگوی رحمانی کے علاوہ ڈاکٹر حنیف ترین کے خطوط 1993ء کے ہیں۔ جس سے انداز ہوتا ہے کہ امام اعظم کو مکتوب الیہ کی حیثیت سے مخاطب کرنے والوں نے 1987ء سے قبل ہی ان سے مراسلت کا آغاز کر دیا تھا۔ مرتب نے اپنے مقدمہ میں یہ واضح کیا ہے کہ امام اعظم کے نام آئے ہوئے ہزار ہا خطوط میں سے انہوں نے 916 خطوط کا انتخاب کیا ہے' جب کہ ان خطوط کے مکتوب نگاروں کی کل تعداد 434 ہے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں شامل سب سے پہلا خط ڈاکٹر امام اعظم کے والد بزرگوار محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم کا ہے جو 10 اپریل 1978ء کو تحریر کیا گیا تھا' جب کہ سب سے آخری خط سید محفوظ عالم (کولکاتا) کا تحریر کردہ ہے جو 10 فروری 2020ء کو لکھا گیا۔ ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' کی اشاعت مارچ 2001ء سے ہوئی۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کے 19 برسوں کی تکمیل کر کے ادبی صحافت کے معیار کو برقرار رکھنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔
''چٹھی آئی ہے'' میں برصغیر ہی نہیں' بلکہ عالمی سطح پر شہرت یافتہ مکتوب نگاروں کے خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ مقدمہ میں نامور اشخاص کے خطوط کے اقتباسات بھی بطور حوالہ پیش کئے گئے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ ڈاکٹر امام اعظم کی کوششوں کو منظر عام پر لایا جا سکے۔ امام اعظم کو شاعر اور ادیب ہی نہیں' بلکہ تخلیقی صلاحیتوں اور ایجادی خصوصیات کا حامل قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ وہ ہمیشہ رسالہ ''تمثیل نو'' کے ذریعہ ادب کی رجحان سازی کا حق ادا کرتے رہے ہیں جس کا ثبوت ''تمثیل نو'' کا ''سہرا نمبر'' ہی نہیں بلکہ ''پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار'' کی اشاعت سے بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم ہمیشہ نئی سوچ اور نئے افکار کو منظر عام پر لانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم کے نام مکتوب لکھنے والے یورپی دنیا سے تعلق رکھنے والے کاتبین خطوط کے اہم ناموں کا اظہار ضروری ہے۔ یوروپی دنیا کے علاوہ ملک گیر سطح پر بھی ڈاکٹر امام اعظم کو خطوط لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ذیل میں بیرونی ممالک کے ادیبوں نے ڈاکٹر امام اعظم کے نام جو خطوط تحریر کئے ان کے نام درج ہیں: احسان سہگل (دی ہیگ' ہالینڈ)، ڈاکٹر احمد سہیل (پلسٹائن' امریکہ)، ارشد اقبال آرس (اٹلی)، اشرف گل (کیلیفورنیا، امریکہ)، اشفاق قلق (دوحہ' قطر)، افروز عالم (کویت)، ڈاکٹر ریوریند افضال فردوس (ٹیکساس' امریکہ)، امان خان دل (نیویارک: امریکہ)، انور آفاقی (العین' متحدہ عرب امارات)، انور شیخ (کارڈف، لندن)، اوم کرشن راحت (سڈنی' آسٹریلیا)، پروفیسر ایس ایم یونس شرر (نیویارک' امریکہ)، ایم آئی ساجد (لاکرنگن' جرمنی)، آصف الرحمن طارق (نیوجرسی' امریکہ)، پروین شیر (ونیپک' کینیڈا)، ترغیب بلند (کوپن ہیگن' ڈنمارک)، جتیندر بلو (لندن'

برطانیہ)، جعفر امیر سید (امریکہ)، حسن اللہ ہما (ابوظہبی' متحدہ عرب امارات)، ڈاکٹر حسن شکیل مظہری (لندن)، ڈاکٹر حنیف ترین (عرعر' شمالی سعودی عرب)، حیدر قریشی (ہیٹرشیم' جرمنی)، سبط اختر (نیوجرسی' امریکہ)، پروفیسر ستیہ پال آنند (کولمبیا' امریکہ)، سعید روشن (کویت)، سلطانہ مہر (برمنگھم' یوکے)، سوہن راہی (سرے' انگلینڈ)، سیما عابدی (امریکہ)، پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰی (ٹورنٹو' کناڈا)، شاہد نعیم (جدہ' سعودی عرب)، شاہین (اونٹاریو' کینیڈا)، شمس کمال انجم شمس مدنی (دوحہ' قطر)، شین صغیر ادیب (بلیک برن' انگلینڈ)، صوفیہ انجم تاج (امریکہ)، ظفر محمود ظفر (ریاض' سعودی عرب)، عاطر عثمانی (کوالالمپور' ملیشیا)، عاکف غنی (پیرس)، قیصر تمکین (آکسفورڈ' برمنگھم' انگلینڈ)، گنیش کھنہ (لندن)، محمد سالم (نیویارک' امریکہ)، ڈاکٹر محمد ظفیر الدین (کولمبیا' امریکہ)، ڈاکٹر محمد مظفر مہدی (سنسناٹی' امریکہ)، مقصود الٰہی شیخ (براڈفورڈ' انگلینڈ)، نقشبند قمر نقوی بخاری (تلسا' امریکہ)، ہلال غزالی (دمام' سعودی عربیہ)، یعقوب تصور (ابوظہبی' متحدہ عرب امارات)، یوسف امام (شارجہ' متحدہ عرب امارات) وغیرہ

مذکورہ بالا اہم شخصیات کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ دربھنگہ کی سرزمین سے اردو زبان وادب اور ادبی صحافت کی ترقی کا سودا لے کر اٹھنے والا ڈاکٹر امام اعظم کی مسلّمہ خدمات اس حد تک اہمیت کی حامل ہوگئی ہیں کہ عالمی سطح کے شعر وادب سے تعلق رکھنے والے اردو ادیبوں نے انہیں خطوط لکھ کر ادب دوستی کا حق ادا کیا۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ بے شمار شاعروں اور ادیبوں کے ایک ایک خط کا انتخاب کیا گیا ہے جبکہ چند مکتوب نگاروں کے پانچ، چھ یا اس سے زیادہ خطوط شائع کئے گئے ہیں۔ غرض ان خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی خدمات انجام دینے والے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ محققین اور نقادوں نے امام اعظم کو خط لکھ کر اپنا فریضہ انجام دیا تو شاہد اقبال نے اس کی تدوین کا کارنامہ انجام دے کر عالمی سطح پر مقبول اردو دوستی کے حق کو وسعت عطا کردی۔ اگر ہر مکتوب نگار کے خط کے ساتھ ان کا ڈاک کا پتہ اور اس کے ساتھ ای میل آئی ڈی بھی شائع کردیا جاتا تو بلاشبہ اس کتاب کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا۔ اس کتاب کا انتساب دو ادب نواز افراد ڈاکٹر محمد منصور عالم مرحوم اور انجینئر محمد شکیب عالم سے معنون کیا گیا ہے۔ مکتوب نگاری پر پروفیسر نظیر صدیقی، عفت موہانی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور ڈاکٹر امام اعظم کی رائے پیش کرتے ہوئے دائیں فلیپ پر شاہد اقبال اور بائیں فلیپ پر امام اعظم کی تصاویر اور ان کی مرتبہ کتابوں کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں جس سے دونوں اشخاص کی ادب دوستی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف ذہنی سکون میسر آتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ''چھٹی آئی ہے'' کے مطالعہ کے ذریعہ دورِ حاضر میں خطوط نویسی کی روایت کو ملک گیر سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اہمیت حاصل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ بلاشبہ اس اہم کارنامے کی تکمیل پر ''چھٹی آئی ہے'' جیسی کتاب کے مرتب شاہد اقبال کو دل کی گہرائی سے مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔

☆☆☆

سابق صدر، شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

ڈاکٹر ایم.صلاح الدین

ادب کا نادر سرمایہ ''چٹھی آئی ہے''

''ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں، اس کی بے شمار ادائیں ہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوط میں جو جادو ہے وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔''

(بابائے اردو مولوی عبدالحق ،مکتوبات حالی، حصہ اول، مرتبہ خواجہ سجاد حسین ،ص:۱۴)

اس لئے کہ خط ایسے دو نفوس کے درمیان راست ترسیلِ خیال و جذبات کا وسیلہ ہے جن کے باہمی تعلقات بے تکلف کھل کر باتیں کرنے کے متحمل ہوں۔ یہی باہمی بے تکلفانہ تکلم و تخاطب خط میں دلکشی بڑھاتے ہیں اور جادو جگاتے ہیں۔ اس وصفِ ساحرانہ کی توجیہہ مشہور امریکی مورخ کارل بیکر نے یوں کی ہے:

''انسانوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیے ہیں، ان واقعات کا ریکارڈ تو ہر صورت میں مل جاتا ہے لیکن ان واقعات کو رونما کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیات کا کتنا حصہ ہے، اس کا علم صرف خطوط سے ہو سکتا ہے۔ جذبات اور جبلتوں کے پیچیدہ اور پوشیدہ رازوں کو خطوط ہی میں کھلنے کا موقع ملتا ہے۔''

(مضمون ''آ گہی و بے باکی'' باقر مہدی، گوشہ ادب، بمبئی، شمارہ ۱۹۶۵ء، ص:۲۱۲)

لہٰذا نجی زندگی کے متحرک اور رنگا رنگ تصویریں خطوط میں جتنی واضح نظر آتی ہیں، ادب کی کسی اور صنف میں نظر نہیں آتیں۔ خطوط کی یہی خوبیاں اسے ادب کا اہم حصہ بنا دیتی ہیں۔ اسی بنا پر مشاہیر علم و ادب کے مجموعہ ہائے خطوط منظر عام پر آیا کرتے ہیں اور اپنی افادیت اور اہمیت کے نقوش ادب میں ثبت کر جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دلکش مجموعہ بنام ''چٹھی آئی ہے'' ابھی سامنے آیا ہے۔ اسے کولکاتا کے جواں سال قلمکار شاہد اقبال نے مرتب کیا ہے اور اپنی سلیقہ مندی اور قلم کی جولانی سے اسے نادر الوجود بنا دیا ہے۔

بیسویں اور اکیسویں صدی کے نقطۂ اتصال پر موجود مشاہیر علم و ادب کی جو ''چٹھی آئی ہے'' معروف قلمکار ڈاکٹر امام اعظم کے نام انہیں کتابی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ نام عکس و نقش اور حجم و حزم کے اعتبار سے پرکشش ہے۔ اسم با مسمّٰی اور نقش شکیل و جمیل ہے۔ حجماً ۵۲۷ صفحات پر محیط ۴۳۴ رہستیوں کے ۹۱۷ رخطوط پر مشتمل ہے اور حزم یہ کہ مقدم و مؤخر، معروف و غیر معروف، اکبر و اصغر کے بکھیڑے سے دامن بچا کر مکتوب نگار کو باعتبار اسم ابجدی ترتیب میں سمویا ہوا ہے۔ جس میں مرتب نے ۴۴ رصفحے کے پرمغز ''مقدمہ'' کا طرہ لگایا ہوا ہے اس خبر کے ساتھ کہ:

''ڈاکٹر امام اعظم کے نام ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے خطوط کی کمپوزنگ ہو چکی تھی لیکن بخوفِ ضخامت بہت سارے خطوط کو شامل نہیں کیا گیا۔'' (ص:۵۶) ظاہر ہے اتنی بڑی تعداد میں آئے خطوط کا سلسلہ یک طرفہ نہیں ہو سکتا، یقیناً مکتوب الیہ کی فطرت میں ہمکتے جرثومہ مکتوب نگاری نے اس ہمہ گیر سلسلہ کو پروان چڑھایا ہوگا ورنہ ہیں اور بھی سخنور و ادیب و صحافی بہت اچھے۔

مجموعہ کے خطوط موضوعاتی ہی نہیں جغرافیائی حدود کو بھی پار کرتے ہیں۔ برصغیر ہندو پاک و بنگ کے علاوہ مشرق وسطی و یوروپی ممالک، امریکہ، کنیڈا اور آسٹریلیا کی ہواؤں اور فضاؤں کی نوع بہ نوع لہر و مہک سے یہ خطوط ہمیں گدگداتے ہیں۔ بیتے چالیس برسوں کے سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی پیش رفت، رویے اور رجحان کی جھلک دکھاتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر شکیل الرحمٰن کے خط مرقومہ ۱۲ر فروری ۲۰۰۲ء کا یہ حصہ دیکھیں:

''ایک مقالہ ''اردو، مسلمان اور نیا سیاسی تناظر'' بھیج رہا ہوں۔ دس صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے پڑھ کر اپنی رائے دیجئے نیز یہ کوشش کیجئے کہ اس کی کچھ کاپیاں بن جائیں اور آپ بہار اور بنگال کے بعض احباب اور اداروں کو بھیج سکیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی میں ہاتھ بٹائیں، یہ ثواب کا کام ہوگا۔ اتنی جرأت کے ساتھ اردو کے تعلق سے اب تک کسی نے بات نہیں کی تھی۔ نیا سیاسی تناظر انتہائی خوفناک بنتا جارہا ہے۔ قومی وحدت کے لئے ایک بڑا خطرہ!

اردو کے دانشور لوگ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کر رہے ہیں۔ سیمینار کر رہے ہیں، ایوارڈز لے رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا غالباً احساس ہی نہیں ہے کہ اردو کی جڑیں کٹ چکی ہیں، یہ لوگ اگر کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں تو انہیں کچھ باتوں کی خبر تو ہوگی ہی۔ ان لوگوں کی جانب جب بھی میری نظر جاتی ہے یہ سب شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپائے ہی ملتے ہیں۔ کوشش فرمایئے کہ اس مقالے کی نقل ان مدرسوں اور کالجوں تک بھی پہنچے جہاں اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی عمدہ تعلیم ہورہی ہے۔''

(ص:۳۳۴)

یوں یہ خطوط بیسویں صدی میں ڈوبتی، بیسویں صدی کے ربع آخر اور اکیسویں صدی کی شروعات میں ابھرتی تین نسلوں کے اثاثے ہیں جو فکر و نظر کی تراوش سے شرابور، شعر و ادب کی ہمہ گیر رو اور روش سے آشنا اور مکتوب الیہ کے برتاؤ اور سبھاؤ سے روشناس کراتے ہیں۔ مکتوب نگاروں کی عظمت و مرتبت اپنی جگہ مکتوب الیہ کی شخصیت کی پرتیں بھی ان میں کھلتی ہیں۔ اب یہی دیکھیں کہ اتنی کثرت میں لوگوں سے سلسلۂ جنبانی قائم رکھنا اور موصولہ خطوط کو سلیقے سے سنبھالے رکھنا ایک کرشماتی فعل ہے لیکن یہ مکتوب الیہ کے معمول میں داخل رہا ہے۔ جا بجا مکتوب الیہ کے برتاؤ اور سبھاؤ کا جادو سر چڑھ کر بولتا دکھتا ہے۔ مثلاً کشمیری شاعرہ سیّدہ نسرین نقاش پر جب ان کا جادو چلا تو یوں دعا گو ہوئیں:

الٰہی بخت تو بیدار بادا　　ترا دولت ہمیشہ یار بادا
گلِ اقبال تو دائم شگفتہ　　بچشمِ دشمنانت خار بادا

اور سبکدوش استاد ایم جے کالج بتیا (مغربی چمپارن)، پروفیسر راحت حسین بزمی پر مکتوب الیہ کے برتاؤ سے رقت طاری ہوئی تو ۱۴ر مارچ ۲۰۰۹ کو یوں لکھ گئے:

''۱۹۷۷ء کے ایک ہونہار شاگرد کا اب تک ایک بڈھے کھوسٹ استاد کو یاد رکھنا فی زمانہ ''آٹھواں عجوبہ'' ہی کہلائے گا۔ جڑ اپنی پروردہ شاخوں اور پتیوں کو فراموش کر سکتا ہے لیکن پتیاں جڑ کو نہ بھولیں تو یہ درخت کے لئے مژدۂ جاں فزا ہی کہلائے گا لیکن یہ صفت شاخ شاخ اور پتی پتی میں بہر صورت

یکساں نہیں ہوتی۔آپ کے دل میں آج بھی میرے لیے عزت واحترام کا جذبہ کارفرما ہے اسے میں
اپنی خوش بختی ہی سے تعبیر کرتا ہوں۔" (ص:۲۳۸)

یہ خطوط دلالت کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ قدیم اشرافیہ تہذیب کا پاسدار، نئی فکر ونظر کا شاعر، محقق، نقاد، مصنف، مؤلف، مترجم، ایک مقبول ادبی رسالہ کا ایڈیٹر، متعدد تنظیموں اور ٹرسٹوں کا محرک وبانی اور "مانو" کا مقبول ریجنل ڈائرکٹر ہے، فطرتاً اور عملاً بقول سکندر علی وجد ہے:

جستجو میں گرمیٔ برق تپاں
گفتگو میں کیف روح شہد وقند

جس کے سبب روابط اور مراسم کا دائرہ شعبہ ہائے مختلف اور خطہ ہائے دور دراز تک پھیلا ہوا ہے۔ ان متنوع اور بسیط دائروں کے مختلف زاویے مشمولہ خطوط میں منعکس ہوتے ہیں۔ ان میں انسانی جذبات اور جبلتوں کے پیچیدہ اور پوشیدہ راز افشا ہوتے ہیں اس لیے تسکین ذوق کی رنگارنگ بہاریں دکھاتے خطوط سے جگہ جگہ معانقہ ہوتا ہے۔ فنی وفکری مباحث، تخلیق کار وتنقید نگار کی چھیڑ چھاڑ سے علم کی افزائش ہوتی ہے۔ مثلاً "تمثیل نو" دربھنگہ شمارہ اپریل و جون ۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر نگار عظیم کی کہانی "بیل" چھپی تو اس کی فحش نگاری پر بہتوں چیں بہ چیں ہوئے۔ اس پر ڈاکٹر نگار عظیم کی جھنجھلاہٹ جو سامنے آئی وہ محظوظ ہونے کے قابل ہے:

"آج ہی آپ کا خط موصول ہوا۔ اتفاق سے پچھلے ہفتے آپ کو خط تحریر کر چکی ہوں۔ عفت موہانی صاحبہ یا شوکت خلیل اور جمال اویسی صاحب کی "بیل" پر جو بھی رائے ہے، اس سے ہمیں قطعی حیرانی نہیں ہوئی۔ اور بہت سے ایسے افراد ہیں جو آج بھی وکٹورین عہد میں جینا چاہتے ہیں اور جی رہے ہیں۔ ان کو کہیے کہ بہشتی زیور پڑھیں جو شریف گھرانوں میں لڑکیوں کو جہیز میں دیا جاتا ہے۔ اپنی ہی تخلیق پر اپنی رائے زنی اتنی اہمیت کی حامل نہیں۔ آپ چند اور افسانہ نگاروں اور ناقدین سے اس بارے میں رائے طلب کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔" (ص:۲۳۶۔۷)

اکثر خطوط سے فکر وفن کو مہمیز کرنے والی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ مثلاً شاعر زماں پروفیسر عبدالمنان طرزی کی منظوم ادبی تاریخ "رفتگاں وقائماں" میں در آئیں کچھ فروگذاشتوں پر مظہر امام نے جس طرح گرفت کی ہے، اس کا لب و لہجہ اکیسویں صدی کی نسل کے لئے مشعل راہ ہے۔ ۷؍جون ۲۰۰۱ء کے طویل خط سے ماخوذ یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

"دربھنگہ ضلع (سابق) کی شعر وادب اور علم و دانش سے وابستہ شخصیتوں کو تقریباً ڈیڑھ سو اشعار میں سمیٹ لینا کوئی آسان کام نہیں۔ حواشی محنت سے لکھے گئے ہیں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بطور خاص کارآمد ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح کے کام میں کچھ فروگذاشتیں در آئیں تو ان سے درگذر کرنا چاہئے۔ بہرحال، ان میں سے چند کی نشاندہی کر رہا ہوں تا کہ انہیں نظر ثانی کے بعد دور کیا جا سکے۔
(ا) قائماں، زندہ یا جو باحیات ہیں کے معنوں میں میرے لئے غریب اور اجنبی ہے۔ کم از کم میری نظر سے پہلے نہیں گذرا۔ 'قائم' کے معنی برقرار، تو ہیں لیکن جو برقرار ہیں کہنا مناسب نہ ہوگا۔ جمع کی یہ

شکل بھی میرے لئے قطعی اجنبی ہے۔

(۴) 'بہتر' کئی جگہ 'اچھا' اور 'عمدہ' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ 'بہتر' اسی وقت استعمال ہوگا جب کسی دوسری شئے سے مقابلہ مقصود ہو مثلاً ان کی نظم ان کی غزل سے بہتر ہے یا وہ نظم نگار سے بہتر غزل گو ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں 'بہتر' کا استعمال درست نہیں:

ململ کے اک تھے احقر　　شاعر تھے وہ بھی بہتر
اک کاظمی تھے منظر　　افسانے ان کے بہتر

(۵) ایک شعر ہے:

تخیّل کے تھے روکش　　یعنی جناب دلکش

'روکش' مقابل، ہمسر، حریف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً اس کی تخیّل کی بلندی، روکشِ آسماں، ہے یا اس کا حسن 'روکشِ ماہتاب' ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں 'روکش' بالکل بے محل ہے۔ یوں بھی بغیر اضافت کے 'روکش' کا استعمال گراں گزرتا ہے۔

(۶) شعر ہے:　　بے شک کلامِ شبنم　　اک زخم دل کا مرہم

'اک' غیر ضروری ہے۔ اسے 'ہے' سے بدلا جا سکتا ہے۔

(۷) اس شعر کا قافیہ محلِ نظر ہے:

عاجزؔ بھی شعر کہتے　　باشوق سب تھے سنتے

'کہتے' اور 'سنتے' کا قافیہ درست نہیں۔ دوسرا مصرع اس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ ہر درد دل پہ سہتے، اگر قافیہ درست ہوتا تب بھی دوسرا مصرع اس طرح کہنا بہتر تھا: سب شوق سے تھے سنتے۔ ویسے دونوں (مصرعوں 'باشوق' اور 'شوق سے') میں ایک بڑا عیب موجود ہے۔ 'تھے سنتے' قطعی غیر فصیح ہے۔ لکھتے تھے، آتے تھے کی جگہ تھے لکھتے، تھے آتے ہرگز نہیں لکھنا چاہئے۔ شعری ضرورت کا بہانہ عجز بیان کا دوسرا نام ہے۔

(۱۳) شعر ہے:　　عبدِ حفیظ ناسیؔ ہے گیت، نعت اچھی

پہلے مصرع میں عبدالحفیظ بھی وزن میں ہوگا وہی بہتر ہے۔ دوسرے مصرع کی نسبتاً بہتر صورت یہ ہوگی: گیت اور نعت اچھی۔..............وغیرہ وغیرہ۔" (ص:۶۳-۶۶۱)

علیٰ ہذالقیاس بعضے خطوط چونکاتے ہیں، کہیں لمحۂ فکریہ عطا کرتے ہیں، کہیں تاریخی چوک کا احساس دلاتے ہیں۔ ان میں فکری آویزش کی مختلف نوعتیں سامنے آتی ہیں۔ فکر وفن کی کلیوں کے چٹکنے کی صدائیں آتی ہیں۔ اخلاص، مروت، شفقت والفت کے رس گھولتے بول سے معانقہ ہوتا ہے۔ ان میں جذبات وخیالات کی لہروں کا مدوجزر قابل دید ہوتا ہے۔ رسمیات نباہتے خطوط ہیں تو حظ ولطافت کی چاشنی سے لبریز کراتے خطوط بھی ہیں۔ اظہار کے انداز واسلوب کی نیرنگیاں لسانی تنوع اور ترفع سے آشنا کراتی ہیں۔ یہاں تنگ دامانی مانع ہے ورنہ ہر رنگ کی پچکاریاں کرتا۔

بہر کیف! ہزارہا خطوط سے ادبی ذوق کو سیراب کرنے والے خطوط کا انتخاب اور ان کی حسن ترتیب، پتہ پانی کئے بغیر ممکن نہیں، شاہد اقبال نے اس کی جسارت کر دکھائی اور مکتوباتی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کر دیا۔ اگر جستجو میں گرمیِ برق تپاں ہو تو کامیابی ایسے ہی قدم چومتی ہے۔ شاہد اقبال کی جستجو کی گرمی سے اس کے 'مقدمہ' کا رنگ بھی چوکھا آیا ہے۔ مقدمہ کے پہلے حصہ میں قدیم ترین ادبِ عالیہ کے حوالے سے اردو ادب تک، مکتوب نگاری کی ابتداء و ارتقاء، اس کی اہمیت وافادیت اور انٹرنیٹ کے دور میں اس کی نوعیت کو اجمالاً جس سلیقے سے پیش کیا ہے وہ نوخیز قلمکار کے نکھرتے تحقیقی جوہر اور ترسیلی قوت کا مستحسن نمونہ ہے۔ مقدمہ کا دوسرا حصہ مکتوب الیہ کو فوکس کرتا ہے۔ مرتب نے مکتوبات کے حوالے سے مکتوب الیہ کی حیات و عادات و خدمات کے متعدد گوشوں کی ایسی اسکیچنگ کی ہے کہ سینکڑوں مکتوب نگاروں کی جھرمٹ میں مکتوب الیہ قطب تارہ کی مانند چمک اٹھا ہے۔ یہ اسکیچنگ جستجو بڑھاتی ہے، ''چٹھی آئی ہے'' کے اندر جھانکنے پر اکساتی ہے اور اس کی ضخامت کی سرگرانی کے احساس کو دفع کرتی ہے۔ یوں یہ مقدمہ اس مجموعۂ خطوط کو طرۂ امتیاز بخشتا ہے۔ مرتب کی جگر کاوی سدا قابل پذیرائی ٹھہرے گی۔ رسم خطوط نگاری اپنی تہذیب کے ساتھ انٹرنیٹ کلچر کے لئے جگہ خالی کر رہی ہے، ایسے میں اکیسویں صدی کی نسل تازہ کے لئے یہ مجموعہ گرانقدر اثاثہ ٹھہرے گا اور مشعل راہ بنے گا، ایسی صفت و کشش اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

☆☆☆

موضع رام نگر، پوسٹ رام نگر دھونسی، وایا نہرا، ضلع دربھنگہ-۸۴۷۲۳۳ (بہار)

● ممتاز نقاد پروفیسر عبدالوہاب اشرفی کی بیوہ محترمہ **نسیمہ اشرفی** کا انتقال ۲۹ ستمبر ۲۰۱۹ء کو دوپہر سٹی اسپتال ہارون نگر، پٹنہ میں طویل علالت کے بعد اسّی سال کی عمر میں ہو گیا۔ نماز جنازہ ۳۰ ستمبر کو بعد نماز عصر ہارون نگر، سیکٹر-۲ کی مسجد میں ادا کی گئی اور حاجی حرمین قبرستان، نیا ٹولہ، پھلواری شریف میں سپرد خاک کی گئیں۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور پوتے پوتیاں ہیں۔

....

● **قمر امام ہاشمی ایڈوکیٹ** عرف شمیم (عمر تقریباً ۶۵ سال) کا ۱۲ نومبر ۲۰۱۹ء کی رات تقریباً سوا دس بجے دہلی کے اسکاٹ ہسپتال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کا جسدِ خاکی ان کی رہائش جی این گنج، دربھنگہ میں ۱۳ نومبر کی رات نو بجے لایا گیا۔ جنازے کی نماز ۱۴ نومبر صبح ساڑھے نو بجے جی این گنج، لہریا سرائے، دربھنگہ میں ادا کی گئی جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مرحوم کے بڑے بھائی جناب کوثر امام ہاشمی (سینئر ایڈوکیٹ) اور چھوٹے بھائی جناب عنبر امام ہاشمی عرف چھوٹے صاحب (سینئر ایڈوکیٹ) اور ان کے بھانجہ آشکار ہاشمی ہیں۔

....

● نامور صحافی 'روزنامہ آزاد ہند' اور سابق ایم پی جناب احمد سعید ملیح آبادی کی اہلیہ **حبیبہ خاتون** (عمر تقریباً ۸۰ سال) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۳۰ دسمبر ۲۰۱۹ء کی صبح ان کے آبائی وطن ملیح آباد (یوپی) میں ہو گیا۔ تدفین ملیح آباد کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحومہ نیک اور پرہیزگار خاتون تھیں۔

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی

مکتوباتی ادب کا سرنامہ: 'چٹھی آئی ہے!'

مشہور شاعر و ادیب اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم کے نام مکاتیب کا مجموعہ ''چھٹی آئی ہے'' اپنی نوعیت و ماہیت سے مجموعہ مکاتیب ہی ہے، مگر وہ اپنے محتویات و مشمولات اور مختلف الخیال افراد کی یک جا شمولیت کی وجہ سے، ایک دستاویزی اور حوالہ جاتی کتاب سے کم نہیں ہے۔ یہ ضخیم مجموعہ نئے الفیہ کا اہم مکتوباتی ادبی سرمایہ کہلانے کا مستحق ہے، جس میں شخصی نقش گری کے ساتھ ہم عصر ادبی، ثقافتی اور علمی مسائل اور سماجی و سیاسی آشوب پر اظہار رائے کے ساتھ اہم فنی نکات کو بھی مس کیا گیا ہے اور انھیں صوت و حرف کے شجی میں ڈھالا گیا ہے۔

مجموعہ کے مرتب شاہد اقبال متحرک و فعال اور جواں سال ہیں، تالیف و تصنیف کا عمدہ ذوق اور ترتیب و تدوین کا ادیبانہ تجربہ رکھتے ہیں، انھوں نے اس تاریخی ادبی سرمایہ کے تحفظ و ترسیل کی جو بساط دکھائی ہے، وہ کوہ کنی کے مترادف ہے۔ یہ تدوینی عمل نو آموزوں اور نو واردان علم و ادب کے لیے ہی نہیں، ان مشاہیر علم و ادب کے لیے بھی خضر راہ ہے، جنھوں نے شعری اور نثری بیاض کو تو بشکل کتاب گلے کا ہار بنا کر رکھا ہے، مگر مکاتیب کے سرمایہ کی تدوین و اشاعت کی طرف اتفاق سے توجہ نہیں کی ہے کہ وہ انھیں فضائل نہیں، زوائد کے درجے میں شمار کرتے اور چیزے دیگراں سمجھتے ہیں، علمی و ادبی شخصیات کے مراسلات کا تحفظ اور ان کی اشاعت اس لیے بھی لابدی امر ہے کہ خط اپنی فنی تعریف کے سبب، گرچہ ذاتی ذریعۂ اظہار اور شخصی بیانیہ کے دائرے میں آتا ہے، مگر یہ مراسلات/مکتوبات اس عہد کا روز نامچہ اور بعدہ تاریخی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ مکتوب نگار اپنی ذات کے حصار سے نکل کر جہانِ دیگر کی سیر بھی کراتا ہے، قرب و جوار، احباب و اغیار، علمی و ادبی نشستوں، یاران بزم، معاصرانہ چشمک، سیر و تفریح، ادبی بحث و مباحثہ، علمی نوک جھونک اور ملک و بیرون ملک کی اپنی یادداشتوں کو بھی موقع محل کی مناسبت سے خط کی تحریروں میں پیوست کرتا رہتا ہے کہ خط مضمون سے جدا صنف ہے، اس میں ضبط و ترتیب کی نارسائی، انتشار مضامین پر انگشت نمائی بھی نہیں کی جا سکتی، جب کوئی ادیب و شاعر خط لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ زمان و مکان کی حدود و قیود سے اوپر اٹھ کر سارے پردے گرا دیتا ہے اور بعض اوقات ایسی باتیں رقم کر جاتا ہے جس میں علم و ادب کی بہت سی جہات پنہاں ہوتی ہیں۔ پھر کوئی شاعر و ادیب کسی خطہ اور منطقہ تک محدود بھی نہیں ہوتا۔ ان مکاتیب کو مرتب کرتے وقت شاہد اقبال کی منشا یہی ہوگی کہ یہ خطوط بیاض کی شکل میں کہیں خدانخواستہ گرد و غبار کی غذا نہ بن جائیں، بلکہ طباعت کا لباس پہن کر علم و ادب کے وسیع جہان کو نئی معلومات کی سوغات دیں اور شائقین علم و فن کو اس عہد کی مخفی جہات سے روشناس کرائیں۔

۷۵۲ صفحات کے رقبہ میں پھیلے مجموعۂ ہذا میں اہم افراد کے (۴۳۴) خطوط شامل ہیں، جنھیں تقدیم و تاخیر کے لاینحل مسئلہ سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے الفبائی اعتبار سے جگہ دی گئی ہے، یہ سارے خطوط شخص واحد یعنی ڈاکٹر امام اعظم کے نام ہیں کہ مکتوب نویسی کے عمل میں یہ جبر بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اس کا مرسل الیہ متنوع نہیں ہوسکتا، ورنہ وہ مکتوب نہیں مضمون بن جائے گا، مگر جب ان خطوط کی سطروں کی خواندگی کا سفر کیا جاتا ہے، تو یہ

دو افراد کی بے تکلف باہمی گفتگو کی سرحدوں کو توڑ ڈالتا ہے، مراسلت مکالمت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اسی دو نفری جہان میں پورا عہد بولتا اور سانس لیتا نظر آتا ہے۔ یہ سارے خطوط بھی اپنے عصر و عہد کا اشاریہ ہیں۔ ہم عصر احوال و ظروف کا خزینہ ہیں۔ مجھے تمام مکتوب نگاروں کی نام شماری سے تحریر کے طول و عرض کا خوف دامن گیر ہے اور ایسا نہ ہو کہ نام ستانی کے چکر میں مواد و مشمول تک رسائی سے پہلے ہی قاری کے صبر کا بندھن ٹوٹ جائے کہ یہ صارفیت و مادیت کا دور ہے، یہ خطوط بیسویں صدی کے ربع آخر اور اکیسویں صدی کے دو دہوں کے ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی حالات کا آمیختہ ہیں۔ اگر دیدۂ بینا سے محرومی نہ ہو تو ان خطوط کی روشنی میں نصف صدی کی علمی و ادبی اور سماجی ثقافتی سرگرمیوں کی روداد مرتب کی جا سکتی ہے۔

ابتدا میں مرتب موصوف کا طویل مقدمہ ہے، جو صفحہ ۱۳-۵۶ پر محیط ہے۔ مرتب نے اس مقدمہ کو واقعی مقدمہ کی طرح لکھا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ 'من تو شدم تو من شدی' کے بعد ہی قلم ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ مکتوب نگاری پر مشاہیر ادب کی آرا، خط کی مختلف الاقسام تعریف، اس کے آغاز و ارتقا، اس کے فروغ و عروج سے مباحثہ کرتے ہوئے زیر نظر مکاتیب کی معنویت اور اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ مرتب زمانہ شناس ہیں اور نئی اطلاعاتی صدی کے انقلابات سے واقف بھی، اس لیے مکتوب نگاری کی تغیر پذیر اشکال میل، فیس بک، ٹویٹر وغیرہ اور اس کی مثبت و منفی جہات کو بھی حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور یوں ماضی اور حال کا مصافحہ کرانے کی کوشش بھی برآمد ہوتی ہے۔ یہ مقدمہ رسمی اور خانہ پری سے بھی جزوی طور پر پاک ہے، ہر سطر کا کتاب سے لفظاً و معناً تعلق ہے اور یہی اس طویل مقدمہ کا جواز بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ مقدمہ اتنا عالمانہ اور مجتہدانہ ہے کہ اس کی روشنی میں اہم مکتوباتی مجموعوں کا اشاریہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ مکتوب نگاری کی تعریف کرتے ہوئے شاہد اقبال اپنے مدعا کو اس طرح پیش کرتے ہیں، جس میں مکتوب نگاری کی کلیت آشکار ہوتی ہے اور ان جملوں سے مکتوب کی مثبت و منفی صفات روشن ہو جاتی ہیں:

> ''مکتوب نگار خط لکھتے وقت اپنے جذبات و احساسات کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ کی صورت میں بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اس عمل میں راقم کی نفسیات و عادات کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ مثبت باتیں رقم کرتا ہے تو ذاتی عیش و آرام سے لے کر احباب و اقارب کی سرمستیوں کا بھی ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتا اور منفی لکھنے بیٹھتا ہے تو کرب جاں سے آلام جہاں تک کا احاطہ کر بیٹھتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھوٹی اور معمولی باتوں کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کرتا ہے اور بعض اوقات غیر معمولی طور پر اہم امور کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔'' (مقدمہ، ص:۲۱)

مکتوب الیہ (امام اعظم) کی رائے بھی خط کی فنی تعریف کے حوالے سے بڑی اہم ہے اور جامع بھی اور اس قابل ہے کہ اس کو اس مختصر تبصراتی تحریر کا ٹکڑا بنایا جائے۔ لکھتے ہیں:

> ''مکاتیب شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ مکتوب نگار کے مزاج، افتادِ طبع، اندازِ فکر، ذوق، پسند، ناپسند، اس کی حس مزاح، اس کی خوشیوں، مایوسیوں اور محرومیوں سب کا انعکاس اس کے خطوط میں ہوتا ہے۔'' (کتاب ہذا)

مکرر عرض ہے کہ جن مشاہیر شعر وادب اور شناسان علم ومعرفت کے خطوط کو اس ضخیم مجموعہ میں جگہ مل سکی ہے، ان تمام کے اسماوامالکن کا تذکرہ وتعارف نہ صرف طوالت پر منتج ہوگا، بلکہ بعض اختصار پسند افراد واحباب مجھ پر نام پرستی کا تبرا بھی بھیجیں گے اور اگر اس ہمہ ہمی میں نادانستہ بھی کسی کا نام مجھ ہیچ مداں ذہن سے محو ہو گیا تو آج کل کی شہرت خورد دنیا میں مجھ جیسوں کی خیر نہیں، اور یہ تفریق قرین قیاس بھی نہیں لگتی۔ سچ کہوں تو کتاب میں شامل سبھی مکتوب نگار اہم ہیں، کیوں کہ اگر یہ اہم نہ ہوتے تو انھیں اس انتخاب میں جگہ نہیں ملتی، وہ دوسرے مجموعہ کی اشاعت یعنی وعدۂ فردا کی نذر ہو جاتے، کیوں کہ ابھی فاضل مکتوب الیہ کے نام خطوط کے ذخیرے میں اور بھی بہت کچھ ہے، جس کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ جیسا کہ خود مرتب نے لکھا ہے:

''راقم الحروف نے ان (امام اعظم) کے نام لکھے گئے ہزارہا خطوط میں سے ۹۱۶ کا انتخاب کرکے یہ مجموعہ ''چٹھی آئی ہے!'' کے نام سے ترتیب دیا ہے، جس میں ۴۴۳ مکتوب نگار شامل ہیں۔'' (ص: ۳۰)

اس کے باوجود چند اہم مکتوب نگاروں کے نام اور ان کے مکاتیب کا اقتباس اس مختصر تحریر کی جامعیت کے لیے ضروری ہے۔ 'دروغ برگردن کاذب' کے مصداق مجھے اس کے اعتراف میں تذبذب نہیں کہ جس طرح مرتب شاہد اقبال نے اپنی دلچسپی کے نتیجے میں مکتوب الیہ کی حیات وخدمات، تصنیفی فتوحات اور ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات پر اپنا مقدمہ مرکوز رکھا ہے، اسی طرح میری رائے میں یہ تمام مکتوب نگار بھی اپنی ادبی کارگزاریوں کے ذیل میں، مکمل نہ سہی، سرسری سوانحی تعارف کے متقاضی ہیں، شعر وادب کی دنیا میں ان کا قد اتنا اونچا ہے کہ صرف نام کا ذکر اپنی کم علمی اور نارسائی کے اظہار کے مترادف ہوگا، مگر پھر وہی مسئلہ سر اٹھائے گا کہ یہ مجموعہ مکاتیب ہے یا سوانحی تذکراتی مضامین کا مجموعہ اور پھر یہ مجموعۂ خطوط، ہاتھی کا پاؤں بھی تو نہیں جس میں سب کا پیر سما جائے۔

عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کل کو حاصل کرنے کے فراق میں جز سے بھی ہاتھ دھو لینا عقل مندی نہیں ہے۔ اس لیے چند اہم مکتوب نگاروں کا نام لینے میں کیا حرج ہے، تاکہ کتاب کا ہیولیٰ بیک نظر متشکل ہو جائے اور لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیا جائے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، جوگندر پال، خلیق انجم، پروفیسر قمر رئیس، ملک راج آنند، پروفیسر شکیل الرحمٰن، عبدالقوی دسنوی، ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر منصور عمر، ندا فضلی، نظام صدیقی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر عتیق اللہ، مجتبیٰ حسین، کرامت علی کرامت، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، مولانا محمد ولی رحمانی، اسلوب احمد انصاری، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، پروفیسر رئیس انور، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر ہمایوں اشرف وغیرہ وہ مکتوب نگار ہیں، جو ادبی دنیا میں شہرۂ آفاق حیثیت کے حامل ہیں۔

یہ تمام خطوط تین ادبی تحریکات، تین ادبی نسل یا ایک عوامی جملے میں کہہ لیجیے کہ اردو ادب کی نصف صدی کے نشیب وفراز سے معمور سفر کا مرقع پیش کرتے ہیں۔ مکتوب نگاروں میں کوئی مکتوب الیہ کا عزیز وقریب ہے، تو کوئی حبیب ورفیق، کوئی ہم وطن ہے تو کوئی ہم منصب، کوئی استاد ہے تو کوئی شاگرد۔ کوئی کرم فرما ہے تو کوئی دست گرفتہ۔

کسی کا تعلق برصغیر ہندو پاک سے ہے تو کوئی اردو کی نئی بستیوں افریقہ اور امریکہ میں سکونت پذیر ہے۔ کوئی سات سمندر پار بیٹھ کر جام جہاں نما کی مدد سے ہندستان میں ادبی بساط پر رونما ہونے والی حرکت وفعالیت کو اپنی آنکھوں سے گزارتا ہے۔ کوئی شعروشاعری کا امام ہے، تو کوئی اردو نثر اور نقد وتنقید کا تاج دار۔ کوئی سیاست داں ہے تو کوئی ادب نواز۔ کوئی سماجی کارکن ہے تو کوئی اردو کا خدمت گزار۔ بعض مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں اتنے عمیق اور مستحکم رشتے ہیں کہ انھوں نے اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس خطوط لکھے ہیں۔

مشہور بزرگ اور نظریہ ساز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ سے مکتوب الیہ کے مراسم دوامی طور پر استوار رہے ہیں۔ ان سے خط وکتابت کا عرصہ ۹۰ رکی دہائی سے ہنوز جاری ہے۔ ان سے تعلقات کی ہمہ گیری کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ایک دو نہیں، ۹ خطوط اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ بعض مختصر ہیں تو بعض مطول، فنی اور ادبی بحث پر مبنی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آپ کا خط ملا، نظیر صدیقی صاحب کی کتاب بھی ملی، آپ کا بہت شکریہ۔ آپ ہمیشہ زحمت فرماتے ہیں۔ نظیر صدیقی صاحب کو جلد خط لکھوں گا۔ ہندی مضمون کے لیے ڈاکٹر ہری ونش ترون جی نے آپ کو زحمت دی، آپ کی قابلیت کے پیش نظر۔ آپ نے تمام ضروری باتوں کو سمیٹ لیا ہے۔ 'تشکیل' کا شعار ہے کسی نہ کسی کو گالی دیتے رہنا۔ یہ لوگ Frustration کے مارے ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں قصیدہ نما خط لکھا کرتے تھے، کوئی توقع پوری نہ ہوئی ہوگی (تعریف وتحسین کی) اب گالی بکتے رہتے ہیں۔“ (ص: ۵۲۷)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ہرفن مولا شاعر وادیب ہیں۔ غزل، نظم اور افسانہ وناول نگاری کے ساتھ تنقیدی مسائل خصوصاً نظریاتی تنقیدی امور پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ مکتوب الیہ سے ان کے بھی گہرے روابط ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی ادبی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، رسالوں اور کتابوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مطبوعات پر اظہار خیال بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ۴ ر خطوط اس مجموعہ کے اندرونی صفحات پر موجود ہیں۔ ایک بار ۱۵ ر کتابیں بھیجنے کے بعد یہ خط (مؤرخہ ۱۲/۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء) لکھتے ہیں، دیکھیے ایک دوسرے سے کس طرح کھل کر بات کرتے ہیں اور کتنا اعتماد ظاہر کرتے ہیں:

”آپ کی خدمت میں پندرہ کتابیں روانہ کر رہا ہوں۔ الگ الگ موضوعات پر بھرپور اور تفصیلی مضامین جلد سے جلد بھجوائیے۔ منتظر ہوں۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت یا لکھاتے وقت خیال رکھیں گے کہ ”دوستی“ کی کہانیاں اصلاحی ہیں لیکن ”ملا نابالغ، گدھ کے پنجے، کھیل ہی کھیل میں اور جنگل کے ڈاکو“ وغیرہ جاسوسی کہانیاں ہیں۔ جاسوسی کہانیوں پر الگ سے مضمون لکھوائیں اور 'دوستی' کی کہانیوں پر الگ سے! مجھے یقین ہے، وہاں کے احباب سے مضامین لکھوانے میں آپ کامیاب رہیں گے۔ اگر کوئی کرم فرما میری نظم نگاری اور آزاد غزل گوئی پر یا ہائیکو نگاری پر لکھنا چاہیں تو مواد بھجوادوں؟ افسانہ نگاری پر کئی لوگ لکھ رہے ہیں۔ وہاں بھی کوئی لکھنا چاہے تو مطلع کریں۔“ (ص: ۴۷۶)

مقدمہ اور مندرجہ مکتوبات میں ڈاکٹر امام اعظم کی ذات وصفات اور ان کی نجی واردات سے متعلق اتنی ساری بنیادی اور اساسی معلومات کا حوالہ اکٹھا کر دیا گیا ہے کہ اس سے روشنی اخذ وجذب کر کے ان پر سوانحی کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے۔ گر چہ ان کی حیات اور ادبی وشعری خدمات پر عرصہ قبل ہی ڈاکٹریٹ کا وقیع مقالہ لکھا جا چکا ہے اور جو بعنوان 'دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے' (از ڈاکٹر سرور کریم) منظر عام پر بھی آچکا ہے۔ مرتب لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعہ کے بہت سارے خطوط سے مکتوب الیہ کے ذاتی معاملات مثلاً ان کی تعلیم وتدریس، افرادِ خانہ کی خیریت، بچوں کی ولادت، صحت، ملازمت جیسے نکات پر بھی روشنی پڑتی ہے، جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مکتوب نگاروں اور مکتوب الیہ کے درمیان تعلقات اور مراسم صرف سرسری نہیں تھے۔'' (ص: ۴۶)

شاہد اقبال کا یہ اہم تدوینی اور تحقیقی کارنامہ ہے، اس سوشل میڈیائی عہد میں جب کہ قلم وقرطاس کا رشتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے، مکتوب نگاری کی دیرینہ روایت کو زندہ کرنے کی سمت ایک پیش رفت ہے، جس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہونی چاہیے۔ خطوط کے انبار سے یہ انتخاب تیار کیا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی بہت سے خطوط ہیں، جو الماریوں میں، گھر کے کونے کھدروں میں، بوسیدہ کتاب کے سینۂ اوراق میں محفوظ ہوں گے۔ کارڈوں اور انتر دیسیوں میں کسی متلاشی کی نظروں میں آنے کے لیے سراپا انتظار ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ مزید خطوط کی تلاش بھی وہ جاری رکھیں گے اور مختصر مقدمہ کے ساتھ ان کی اشاعت کو بھی تکمیل تک پہنچائیں گے۔ کیوں کہ خطوط اپنی عمر کا ایک مرحلہ مکمل کرنے کے بعد نجی نہیں، عوامی ملکیت ہو جاتے ہیں اور ایک تاریخی دستاویز بن کر سبھی کی دلچسپی کی متاع بن جاتے ہیں اور وہ بزبان حال اسکالرس کو یہ دعوت دیتے رہتے ہیں کہ 'اے اہل ادب آؤ، یہ جاگیر سنبھالو'

☆☆☆

شعبۂ اردو، بی. ایم. کالج، رہیکا، مدھوبنی (بہار)

''چٹھی آئی ہے!'' پر مختلف قلم کاروں کے مختصر تاثرات

پروفیسر سیّد احمد شمیم

جمشید پور: ۶؍اگست ۲۰۲۰ء

عزیز گرامی قدر!

''چٹھی آئی ہے!'' مل گئی۔ محنت کی گئی ہے۔ مکاتیب، جیسا کہ سب جانتے ہیں، دو اشخاص کے درمیان کچھ اپنی کچھ پرائی باتوں کی وجہ سے دلکش ہو جاتے ہیں۔ مکاتیب کی دوسری قسم بھی ہے اور یہ بہت Known ہے۔ اس قسم کے خط لکھنے کی غایت مراسلت کی نہیں ہوتی مثلاً حضرتِ مخدوم جہاں کے مکاتیب، ''غبارِ خاطر''، ''نہرو کی "Glimpses of the World History" یا "Discovery of India"۔ ظاہر ہے مخدوم جہاں کا مقصد اپنے مکاتیب کے ذریعہ تصوف کی تعلیم تھا۔ نہرو نے ہندوستان اور دنیا کی تواریخ لکھی تھی۔ نوجوان ادیب و شاعر شاہد اقبال نے مقدمہ ''مکتوب نگاری کی روایت اور ''چٹھی آئی ہے!'' کی ابتدا اچھے ڈھنگ سے کی ہے۔ پھر آپ کے کارنامے بیان کرنے لگے۔ یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ کوئی بھی شئے کتنی بھی دلکش کیوں نہ ہو، بار بار نگاہوں سے گزرے تو اپنی دل فریبی کھو دیتی ہے۔

مجھے مکاتیب کی اس کتاب کا نام ''چٹھی آئی ہے!'' بہت ہی دلکش محسوس ہوا۔ اس سے پہلے خطوط پر مبنی کتابوں کے نام ''من آنم'' (فراق گورکھپوری) اور صفیہ اختر کے خطوط ''زیرِ لب'' مجھے بہت پسند تھے لیکن ''چٹھی آئی ہے!'' میں جو انتظار کی لذت پوشیدہ ہے، اس کا ذائقہ وہی محسوس کر سکتے ہیں جنھیں کسی کے خط کا انتظار بھی ہوتا ہے۔ اس نے ہماری روایتی تہذیب میں بھی ایک دل کشی پیدا کی ہے۔ ''کاگا...... خط آئے گا تو تجھے دودھ بھات کھلاؤں گی۔'' یہ اکثر سہاگنیں 'کاگا' سے منّت کیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر امام اعظم کے نام آئے ہوئے مشاہیر کے خطوط کے مجموعہ ''چٹھی آئی ہے!'' کا سرنامہ مجھے بہت ہی رومانٹک محسوس ہوا۔ کتاب کا گیٹ اپ خوب صورت ہے اور معنی خیز بھی۔ آپ کی ذات سے بہتر توقعات ہیں۔ خدا آپ کو صحت مند رکھے۔ آپ کی فعالیت دائم رہے۔ بہت طویل عرصے کے بعد قلم ہاتھ میں لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر رعشہ کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہوں۔ آپ کا حکم تھا، بجا لایا۔

نوشی (ڈاکٹر زہرہ شائل) کو بہت سی دعائیں، نواسوں (ڈاکٹر نوا امام، انجینئر فضا امام) اور میری نواسی (حیا فاطمہ) کے لیے پیار۔

دعا گو: سیّد احمد شمیم

....

ابو اللیث جاوید (نئی دہلی)

ڈاکٹر امام اعظم ادبی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ موصوف بیک وقت شاعر، ناقد اور صحافی کے علاوہ مولانا

آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کلکتہ کے ریجنل ڈائرکٹر بھی ہیں۔ پچھلے تقریباً انیس برسوں سے مجلّہ ''تمثیل نو'' پابندیٔ وقت اور معیاری ادبی تخلیقات کے ساتھ دربھنگہ سے شائع ہورہا ہے جس کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ادبی، غیر ادبی اور سماجی اداروں، تنظیموں سے ان کی گہری وابستگی ہے جس کی فہرست ماشاء اللہ بہت طویل ہے۔ ایسی علمی، ادبی اور سماجی شخصیت کی مقبولیت یقینی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'چٹھی آئی ہے' ڈاکٹر موصوف کے نام ہر حلقے سے آئے ہوئے مکتوبات کا مجموعہ ہے جس کی تعداد تقریباً 917 ہے۔ خط لکھنے والوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ہندو پاک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں مثلاً ہالینڈ، امریکہ، اٹلی، قطر، کویت، انگلینڈ، آسٹریلیا، جرمنی، کنیڈا، ڈنمارک، سعودی عرب، ملیشیا، ابوظہبی اور شارجہ سے بھی اچھی خاصی تعداد میں خطوط موصول ہوئے ہیں جو زیادہ تر مجلّہ 'تمثیل نو' سے متعلق ہیں۔ مجلّہ ہذا کا یہ وصف رہا ہے کہ اس کے اوراق پر نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کو بھی مناسب جگہ ملی ہے اور اس طرح ان کی حوصلہ افزائی بہتر طریقے سے ہوسکی ہے۔ تخلیق کاروں کی نئی نسل کو سامنے لانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ مجلّہ 'تمثیل نو' کا اسے ایک محسن ادبی کارنامہ کہا جاسکتا ہے جس کے در پردہ ڈاکٹر امام اعظم کی شخصیت جلوہ گر ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں شامل زیادہ تر خطوط ادبی نوعیت کے ہیں جن کا براہ راست تعلق مجلّہ 'تمثیل نو' کے مشمولات سے ہی ہے۔ تخلیقات پر کبھی تنقید کی گئی ہے، کبھی کچھ مشورے دیے گئے ہیں اور کبھی ناپسندگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ کچھ مکتوبات خالصتاً نجی ہیں جن میں کبھی گرتی ہوئی صحت کا ذکر کیا گیا ہے تو کبھی خانہ داری کے معاملات میں نیک مشورے اور قیمتی ہدایات دی گئی ہیں۔ چند مکتوب نہایت مشفقانہ پیرائے کے بھی ہیں جن سے مکتوب نگار کی محبت آشکار ہوتی ہے۔

محترمہ عفت موہانی کے مکتوب مرقومہ 9 فروری 2005ء کا ایک اقتباس دیکھئے:

> ''اب تمہارے شہر کی شدید سردی کا کیا حال ہے؟ قابل برداشت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو ہمت کر کے چلے آؤ۔ مجھے کوئی غیر ہستی نہ سمجھو۔ اپنی بڑی بہن ہی سمجھو۔ جس کے پاس چھوٹا بیٹے سا بھائی آسکتا ہے۔ غور کرنا اس تجویز پر بھی۔ ہمارے شہر میں سردی ہے مگر نا قابل برداشت نہیں۔ کیا خیال ہے شروع کردوں تمہارا ابھی انتظار؟
>
> برا نہ ماننا، میں نے بڑے ادب سے تم کو آپ جناب نہیں لکھا۔ تم میرے اپنے بچے کے سے ہو۔ میرا لڑکا خالد تم سے کچھ ہی چھوٹا ہوگا، تم بھی خالد کے سے ہو۔ تم سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے۔ کم سے کم میری ہی محبت کا خیال کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔ تمہارا خط آتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تم کو ہمیشہ صحت مند، تندرست اور خوش رکھے۔'' (ص: 454)

حد درجہ شفقت اور اپنائیت جھلک رہی تھی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے دوسرے خط میں ڈاکٹر امام اعظم کو شوگر جیسے موذی مرض کا شکار ہونے کی خبر پا کر اپنے خط مرقومہ 7 مئی 2005ء میں لکھتی ہیں:

> ''جب سے تمہاری طبیعت کے بارے میں پڑھا ہے کہ تم کو اللہ نہ کرے شوگر کا مرض ہوگیا ہے، میرا

دل بیتاب ہے۔ آخر یہ مرض تم کو ہوا کیوں کر؟ تمہاری عمر اتنی نہیں کہ بڑھاپے کے امراض تکلیف دیں۔ اردو اب تفصیلی طور پر لکھ کر کیا کر رہے ہو؟ انجکشن لے رہے ہو یا کوئی دوا استعمال کر رہے ہو؟ اب زائد شکر، چاول، آلو اور میٹھی چیزوں کا مسلسل پرہیز کرو......۔" (ص:455)

ڈاکٹر امام اعظم نے اردو دنیا کے کتنے معروف مشاہیر قلم کو محض اپنے بلند اخلاق اور پر خلوص ادبی کاوشوں کے ذریعہ اپنا گرویدہ بنایا ہے اس کا اندازہ ان ملکی و غیر ملکی مکتوبات کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ خطوط کے مضامین مختلف النوع قسم کے ہیں اس لئے ان کا احاطہ کرنا دشوار نہیں تو دقت طلب ضرور ہے۔ اردو زبان میں ابتدا سے اب تک جتنے بھی خطوط پر مشتمل مجموعے شائع ہوئے، اُن تمام سے زیر تبصرہ مجموعہ بالکل مختلف اور کچھ اپنے ہی قسم کا ہے۔ دیگر مجموعے یا تو ایک مکتوب نگار کے اپنے کسی دوست یا اپنی شریک حیات کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہیں یا لکھے گئے خطوط کے جوابات بھی شامل ہیں لیکن 'چٹھی آئی ہے' جس میں 434 مکتوب نگاروں کے 917 خطوط شامل ہیں، کو اپنی انفرادی حیثیت عطا کرتا ہے۔ اتنی کثیر تعداد اور مختلف النوع مضامین پر مشتمل خطوط کا مجموعہ اس سے قبل شاید شائع نہیں ہوا ہے۔ اس مجموعے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کا قاری بہت تھوڑے وقت میں ساری دنیا کے ادبی ماحول، ادبی سرگرمیوں اور تخلیق کاروں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ ادب کے مختلف اصناف اور تحریکات سے بھی متعارف ہو جاتا۔ بین الاقوامی سطح پر ادب کی کیسی تخلیقات وجود میں آ رہی ہیں اور تخلیق کاروں کی کیا سوچ اور موقف ہے۔ یہ اس مجموعہ کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

ان تمام ادبی محاصل کی کامیابی کا سہرا ڈاکٹر امام اعظم کے سر جاتا ہے۔ اس مجموعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر امام موصوف میں کتنی ادبی تشنگی ہے جس کے لئے وہ پوری دنیا کی اردو دنیا کی نئی بستیوں کی خاک چھان مارتے ہیں۔ یہ مجموعہ یقیناً ان کے ادبی قد کو اور بلند کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں ایک اور اہم بات کہہ دوں کہ خطوط کی دوسری کھیپ بھی ڈاکٹر موصوف کے پاس موجود ہیں جس کی اشاعت کے بھی امکانات ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں خطوط کا موصول ہونا اور اُسے محفوظ رکھنا کسی عام آدمی کے بس کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس عمل میں بھی یکتا ہیں۔

اردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والوں کو اس مجموعہ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ اُنہیں یقیناً فائدہ حاصل ہوگا۔ تمام لائبریریوں، یونیورسٹیوں اور اردو دوستوں کے Book Shelves کی اس مجموعہ کو زینت بننا چاہئے۔ ادبی افادیت کے پیش نظر قیمت واجبی ہے۔ اس کی ہر حلقہ میں پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

پروفیسر علیم اللہ حالی (پٹنہ)

نئی موصولات میں ایک ضخیم قیمتی کتاب "چٹھی آئی ہے" کا ذکر اس حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں وہ خطوط پیش کر دئے گئے ہیں جو مختلف مشاہیر اور معاصرین نے ڈاکٹر امام اعظم کو لکھے ہیں۔ اس سے اگر ڈاکٹر امام اعظم کے وسیع تعلقات اور اردو شعر و ادب اور نقد و بصر کے حوالے سے ان کے تفاعل کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف

عہدِ نو کی ادبی سرگرمی اور نئے ذہنوں کے دانشورانہ امکانات کا عکس بھی سامنے آجاتا ہے۔ اردو زبان ہندوستان میں اضمحلال کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کے پڑھنے اور لکھنے والوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہو چکا ہے۔ لیکن آج بھی پوری دنیا میں ایسے مراکز اور افراد موجود ہیں جو اردو کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ان خطوط میں ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں کے اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کے مکتوبات سے ان علاقوں کی بیداری اور اردو کے لئے ان کی فکرمندی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ مرتبِ کتاب جناب شاہد اقبال نے چالیس پینتالیس صفحات میں مکتوب نگاری کی تاریخی تہذیبی اور لسانی اہمیت کا ذکر مناسب حوالوں کے ساتھ کیا ہے۔ سات سو صفحات کی یہ کتاب مسلسل تو نہیں پڑھی جاسکتی لیکن جستہ جستہ اس کا مطالعہ مکتوب نگاروں کے مکتوب الیہ سے ذاتی مراسم اور علم وادب کے بہت سے نکات سے قریب کرتا ہے۔ شاہد اقبال کی اس افادیت بردوش محنت کی داد دینی چاہیے۔

....

پروفیسر مشتاق احمد (دربھنگہ)

عالمی ادب میں دیگر اصنافِ ادب کی طرح مکتوب نگاری کو بھی ایک علمی اور ادبی حیثیت حاصل ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کے اکابر ادبا اور شعرا نے اس فن کو نہ صرف جلا بخشی ہے بلکہ فنِ خطوط نویسی کو اعتبار و وقار بھی بخشا ہے۔ غالبؔ سے لے کر عہدِ حاضر تک ہزاروں ادبا اور شعرا کے مکتوبات کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ غالبؔ، سرسید، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط تو ادب کے علاوہ دیگر موضوعاتی مطالعے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ دراصل خط ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان کی ذہنی روش اور پروازِ تخیل کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ باطنی جوہر کی حقیقت سامنے آتی ہے اور شخصی کیفیات سے آشنائی کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تصویر بھی اجاگر ہوتی ہے جس عہد میں خط لکھا جاتا ہے۔ مغرب میں مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خطوط کو موضوعاتی اعتبار سے کتابی صورت دینے کی روایت رہی ہے لیکن اردو میں بیشتر مکتوباتی ادب بڑے ادبا اور شعرا کے خطوط پر مبنی ہیں اس لیے اب جب کبھی مکتوباتی ادب کا نیا نسخہ سامنے آتا ہے تو ذہن میں کئی طرح کے سوالات ایک ساتھ جنم لینے لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں غالبؔ، حالیؔ، سرسیّد، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ روزگار شخصیات کے خطوط کا سرمایہ موجود ہے اور ان خطوط کی علمی، ادبی اور سماجی وسائنسی حیثیت بھی مسلم ہے۔ اس لیے عہدِ حاضر میں جو ادبا اور شعرا اپنے علمی وادبی روابط کی تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے خطوط پر مبنی کتابیں شائع کر رہے ہیں، وہ ایک بڑا جوکھم بھرا حوصلہ ہے۔

بہر کیف! اس وقت میرے پیشِ نظر شاہد اقبال (کولکاتا) کی مرتبہ کتاب ''چٹھی آئی ہے!'' اس کتاب میں عہدِ حاضر کے ایک فعال و متحرک ادیب، ناقد اور شاعر ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیرِ ادب کے خطوط شامل ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم تقریباً تین دہائیوں سے لکھ پڑھ رہے ہیں اور علمی وادبی حلقے میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ خطوط کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک منظم ذہن کے مالک ہیں۔ مشمولہ خطوط میں اکابرین اور ہم عصر ادبا اور شعرا کے خطوط شامل ہیں۔ بیشتر خطوط ذاتی اور شخصی نوعیت کے ہیں لیکن ان

خطوط سے بھی ڈاکٹر امام اعظم کے علمی و ادبی کارناموں سے آشنائی ہوتی ہے اور ان کے تخلیقی سمت و رفتار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ ذکر پہلے ہی آچکا ہے کہ خط انسان کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے ان تمام خطوط کے مطالعے سے ماضی اور حال کے کئی نامور ادبا اور شعرا کی شخصیت اور ان کی ذہنی روش سے آشنائی ہو جاتی ہے۔ کتاب کے مرتب شاہد اقبال نے آغاز میں ایک پر مغز علمی مقدمہ لکھا ہے اور مکتوب نگاری کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص اردو ادب میں خطوط نویسی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے اور اس کی علمی و ادبی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ایک اچھا قلم کار مکتوب نگاری کے میدان میں بھی اپنے اشہبِ قلم کے جوہر دکھا سکتا ہے۔" (ص:۲۱)

آج جب ہم سائنسی انقلابات کے دور میں جی رہے ہیں اور بالخصوص اطلاعاتی تکنالوجی کی حیرت انگیز ایجادات نے ہر شخص کے ہاتھوں میں جامِ جم تھما دیا ہے۔ ایسے وقت میں مکتوب نگاری کا فن تو اب اثاثۂ قدیم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ انٹرنیٹ اور واٹس ایپ ہی ہمارے لیے وسیلۂ اظہار بن گیا ہے۔ ایسے وقت میں "چٹھی آئی ہے!" کے خطوط عنقا ہوتی خطوط نویسی کی روایت کو استحکام بخشتی ہے اور ممکن ہے کہ اس علمی و ادبی کاوش سے تحریک پا کر عہدِ حاضر کے دیگر ادبا اور شعرا بھی اس طرح کے علمی و ادبی خزینے سے جہانِ ادب کو روشناس کرانے کی طرف متوجہ ہوں کہ مکتوبی ادب اب عمرانیات مطالعے میں بھی مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اس علمی کاوش کے لیے نہ صرف مرتب شاہد اقبال قابلِ مبارک باد ہیں بلکہ ڈاکٹر امام اعظم کی ہمہ جہت و فعال شخصیت کا اعتراف بھی لازمی ہے کہ مشمولہ خطوط ایک عہد کی تاریخی دستاویز ہے۔

(بشکریہ ریسرچ جرنل "جہانِ اردو" دربھنگہ اپریل تا جون ۲۰۲۰ء)

....

ڈاکٹر رضیہ حامد (مدیرہ "فکر و آگہی" نئی دہلی، بھوپال)

شاہد اقبال مغربی بنگال کے مشہور شہر کلکتہ میں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے اردو اور انگریزی میں ایم اے کی اسناد حاصل کی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ امام اعظم کے نام آئے خطوط کو جمع کر کے شاہد اقبال نے "چٹھی آئی ہے!" کتاب مرتب کی ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم مصنف، مؤلف، مترجم، صحافی اور شاعر ہیں نیز "تمثیل نو" رسالہ کے مدیر ہیں۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں مشاہیر اور اہلِ علم کے خطوط آئے ہوں گے اور آرہے ہوں گے۔ خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ وہ پابندی سے ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کو چوں کہ مکتوب نگاری سے دلچسپی ہے، اس لیے ان کی دو کتابیں بھی اس موضوع پر طبع ہوئی ہیں۔

کمپیوٹر کے دور میں کسی کاغذ کا محفوظ رکھنا کارِ دارد ہے۔ وہ کبھی بھی خراب ہو سکتا ہے لیکن خلوص دل سے لکھے خط کی تحریر قاری کو جو احساسِ محبت اور یگانگت دیتی ہے اس کا لطف ہی الگ ہے۔ خط کو بار بار پڑھنے اور سراہنے اور آنکھوں کا سرمہ بنانے کو جی چاہتا ہے۔ کمپیوٹر و موبائل کے دور میں دھیرے دھیرے خط لکھنے کا رواج ختم ہوتا جا رہا

ہے، یہ لمحۂ فکریہ ہے۔

شاہد اقبال نے ڈاکٹر امام اعظم کے پاس محفوظ ہزاروں خطوط کا مطالعہ کیا اور ان میں سے ۴۳۴ر مشاہیر کے ۷۱۹ر خطوط کا انتخاب کر کے انھیں مکتوب نگاروں کے نام بلحاظِ حروفِ تہجی ترتیب دے کر شائع کرایا۔ یہ خطوط اپنے زمانہ کی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں اور بیسویں صدی کے اواخر سے لے کر موجودہ ادبی منظرنامے کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ مرتب شاہد اقبال ڈاکٹر امام اعظم کے نام آئے باقی خطوط کا بھی انتخاب جلد شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اردو میں مکتوب نگاری کی روایت کے متعلق مرتب نے ۴۴ر صفحات کا مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں انھوں نے خطوط نگاری کی روایت سے گفتگو کی ہے جب کہ دوسرے حصے میں ڈاکٹر امام اعظم کی شخصیت اور ان کے تخلیقی کاموں کے حوالے سے لکھے گئے خطوط پر روشنی ڈالی ہے۔ ان خطوط کا دائرہ موضوعات کے ساتھ ہی جغرافیائی اعتبار سے بھی وسیع ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک سے ان کے نام خطوط آئے ہیں جن سے ان ملکوں میں وہاں کی صورت حال اور اردو زبان و ادب کے ارتقا کا علم ہوتا ہے۔ یہ کتاب خطوط نگاری اور مشاہیر کے خطوط کی اشاعت میں گراں قدر اضافہ ہے۔ آفسیٹ پر چھپی اس کتاب کی طباعت اور سرورق دیدہ زیب ہیں۔

....

احتشام الحق (دربھنگہ)

دربھنگہ: ۲۸ر ستمبر ۲۰۲۰ء

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ......

میں خیریت سے رہ کر خداوند تعالیٰ سے آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں۔

لکھنا ضروری یہ ہے کہ شاہد اقبال صاحب کی مرتبہ کتاب ''چٹھی آئی ہے'' آپ کی معرفت موصول ہوئی اور ورق گردانی سے ساری کیفیت معلوم ہوئی۔ پتا چلا کہ شاہد اقبال مغربی بنگال کے کولکاتا سے تعلق رکھنے والے جواں سال اور ابھرتے ہوئے قلم کار ہیں جو گزشتہ دس بارہ برسوں سے بڑے انہماک کے ساتھ تصنیفات و تالیفات میں مشغول ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب سے بھی ان کی دلچسپی ہے۔ اس کتاب سے قبل پانچ کتابوں کی تصنیف و تالیف کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کی چھٹی کاوش ہے۔ ان کے علاوہ واجد علی شاہ اختر اور کولکاتا کے سو مشاہیر پر بھی وہ کام کر رہے ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آئیں گی۔

شاہد اقبال نے مشہور ناقد، شاعر و ادیب اور ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' کے مدیر ڈاکٹر امام اعظم کے نام آئے مختلف افراد و شخصیات کے خطوط کو سات سو باون صفحات کی ضخیم کتاب میں ''چٹھی آئی ہے'' کے نام سے جمع کیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ اس وقت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کولکاتا ریجنل سینٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔ درس و تدریس سے بھی ان کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ وہ دورِ طالب علمی سے ہی اردو زبان کا رشتہ زمین سے استوار کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شغل بھی ان کا بڑا قدیم ہے۔ اب تک ان کی درجنوں کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ شعر و ادب اور تحقیق و تنقید میں ان کی اپنی منفرد شناخت ہے۔

اس کتاب میں شاہد اقبال نے ڈاکٹر امام اعظم کے دورِ طالب علمی سے لے کر اب تک ان کے نام آئے مشاہیر اور اقربا کے خطوط کو جمع کیا ہے۔ اس میں کل ۶۱۹ رخطوط ہیں جن کو ۴۳۴ رلوگوں نے الگ الگ سال اور تاریخوں میں تحریر کیا ہے۔ اس میں ۱۰ راپریل ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۰ رفروری ۲۰۲۰ء تک کے خطوط شامل ہیں۔ ۱۰ راپریل کا خط ڈاکٹر امام اعظم کے نام ان کے والد محمد ظفر المنان ظفر فاروقی کا لکھا ہوا ہے جو محکمہ پولیس میں افسر تھے اور اردو فارسی ادبیات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے جب کہ ۱۰ رفروری کا خط سید محفوظ عالم کا تحریر کردہ ہے۔ ان خطوط کو لکھنے والوں کے نام کے اعتبار اور حرف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلا خط ابرار احمد اجراوی کا اور آخری یٰسین احمد کا ہے۔

ان مکتوبات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر خطوط رسمی قسم کے ہیں جو ''تمثیل نو'' میں شائع بھی ہوئے اور ''تمثیل نو'' کے مشمولات کے سلسلے میں توصیفی انداز میں یا پھر بعض کمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن بعض خطوط بڑے دلچسپ ہیں جن میں ذاتی قسم کی واردات اور حالات و کیفیات بیان کیے ہیں۔ ایسے خطوط بطور خاص ان کے والد اور اقربا کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض دیگر مشاہیر کے خطوط میں یہ جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ بعض رسمی خطوط میں بھی خط کا منفرد ڈھب اور بے ساختگی موجود ہے۔ پہلے خط میں ہی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ مکتوب نگار نے اپنی ذاتی مصروفیات کو بے ساختہ اور بول چال کی زبان میں تحریر کیا ہے جس سے ماضی میں لکھے جانے والے خطوں کا مزہ ملتا ہے۔ یہ خط ابرار احمد اجراوی نے تحریر کیا ہے۔ والد کا خط بھی ذاتی نوعیت کا ہے جس میں مخاطب کو دادی کی صحت اور دیکھ ریکھ پر ابھارا گیا ہے تو اپنی اور چھوٹے بھائی کو محنت سے پڑھنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اسی طرح ایک خط میں ظفر فاروقی مرحوم نے اپنے سفر کی روداد بھی بیان کی ہے۔ مظہر امام کے خطوں میں کچھ اسی انداز کی گفتگو ہوئی ہے۔ ایسے کئی خطوط ہیں جن میں لکھنے والے نے ادبی سرگرمیوں پر گفتگو تو کی ہے لیکن اس میں ان کی نفسیات اور عادات و اطوار کا بھی بے ساختہ اظہار ہو گیا ہے۔ بہر حال ان خطوط کو پڑھنے سے اردو زبان وادب کی کئی اہم شخصیت کی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کی زندگی کے بعض ایسے پردے وا ہوئے ہیں جنہیں ہم دیگر ذرائع سے نہیں جان سکتے۔ خود مکتوب الیہ (ڈاکٹر امام اعظم) کے بعض اہم پہلو بھی اس میں اجاگر ہوئے ہیں۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو مجموعہ مکتوبات یا آرکائیوز کہیے اردو زبان وادب میں ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

بھئی! اب ویڈیو کال اور ای میل کے اس عہد میں خط لکھنے کی روایت رہی اور نہ ضرورت۔ حالانکہ ترسیل و ابلاغ کا یہ قدیم ترین ذریعہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب خط کے لیے ہفتوں لوگوں کی نظریں دروازے سے لگی رہتی ہے اور ڈاکیہ کی چاپ، آہٹ اور دستک سننے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ خط موصول ہونے میں ذرا دیر کیا ہوئی کہ چاہنے والوں کے دلوں میں اندیشہ ہائے دور دراز گھر کرنے لگتے تھے۔ جیسے ڈاکیہ کی آواز آتی ''ڈاک'' لوگوں کے دل خوشیوں سے بلیوں اچھلنے لگتے تھے۔ خط حاصل کرنے سے لے کر خط کو کھولنے اور پہلی نظر ڈالنے تک کے وقفہ میں خوشی و سرشاری کی جو حالت ہوتی تھی اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزر چکے ہیں۔

خطوط تو خیر سے اب بھی لکھے جا رہے ہیں لیکن ہاتھ سے لکھنے اور ڈاک یا دستی طریقے سے بھیجے گئے خط میں

جو لذت وسرمستی تھی وہ ان میں کہاں۔ ان خطوط میں رنگ ورس ملے ہوتے تھے جن سے بصارت، سماعت، لمس اور احساس سب کچھ فرحت وانبساط کے جذبے سے 'النکرت' اور سرشار ہوا ٹھتے تھے۔

کتاب کی ابتدا میں مرتب شاہد اقبال نے بڑا علمی مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں مکتوب نویسی کے آغاز وارتقا کا مبسوط جائزہ لیا ہے۔ اس حوالہ سے دنیا میں خط کے ابتدائی نقوش اور نمونوں کی وضاحت کرنے کے ساتھ ہندوستان میں ویدک عہد سے لے کر مغلیہ دور، نوابوں اور بیگمات کے خطوط، ادیبوں اور شعرا کے خطوط، غالب کی خطوط نگاری اور ان کے عہد میں خطوط نگاری کی روایت پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک حوالے کی چیز بن گئی ہے۔

مرتب نے مکتوب الیہ ڈاکٹر امام اعظم کی شخصیت، علمی وادبی اور صحافتی خدمات کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان کی خدمات کے تمام گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ایسی وقیع علمی کتاب کے لیے مرتب اور ڈاکٹر امام اعظم کو مبارکباد نہ دینا بخل ہی کہلائے گا۔ اور بھئی! میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب زبان وادب کے طالب علم اور اساتذہ کے علمی ذخیرہ کا حصہ ہونی چاہیے۔

فی الحال اتنا ہی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ فقط والسلام

خیر اندیش: احتشام الحق (انچارج ہیڈ ماسٹر، ہائرسیکنڈری اسکول، مجھولیا، حیا گھاٹ، دربھنگہ)

....

ڈاکٹر منصور خوشتر (مدیر ''دربھنگہ ٹائمز'' دربھنگہ)

ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر کے خطوط پر مبنی کتاب ''چٹھی آئی ہے'' (مرتب: شاہد اقبال، کولکاتا) میں ادبی مسائل کی نشاندہی ملتی ہے۔ ان خطوط میں اظہارِ ذات ہے اور تخلیقات کی آئینہ داری بھی ہے۔ لکھنے والے مشاہیر نے بے ساختگی اور بے تکلفی سے ''تمثیل نو'' میں شائع شدہ مضامین کا جائزہ لیا ہے اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ایک طرح سے یہ تفہیم کی کوشش ہے جس کی نوعیت جداگانہ ہے کیونکہ ان خطوط میں دریافت کے اجالے ہیں، اشارے اور امکانات ہیں اور الگ الگ زاویے ہیں۔ یہ خطوط تقلیدی، مصنوعی یا اقتصادی نہیں ہیں بلکہ نئے رجحانات کے متصادم ہیں جن کی ناگزیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان خطوط میں اظہار کی تصدیق و تردید بھی ہے کہ بیشتر خطوط میں ان کے رسالے سے مشمولات پر رائے ہے۔

''چٹھی آئی ہے'' میں ۴۳۴؍لوگوں کے خطوط ہیں جو ۵۲۷ صفحات پر محیط ہیں۔ مرتب نے ۴۴؍صفحات پر اپنا پیش لفظ قلم بند کیا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انہوں نے کتاب کو یوں ہی ترتیب نہیں دیا بلکہ اس کے لئے انہوں نے محنت بھی کی ہے۔ خطوط کو مشاہیر ادب کے ابجدی نام کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم صاحب کا بھی یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اتنے سارے خطوط کو اس طویل عرصے تک سنبھال کر رکھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ بیشتر خطوط بھیجے جاتے ہیں اور پڑھ کر تلف کر دیے جاتے ہیں لیکن موصوف نے سنبھال کر اسے دستاویز کی صورت میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ''چٹھی آئی ہے'' ایک دستاویزی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

کتاب کے مرتب شاہد اقبال نے اپنے پیش لفظ میں مکتوب نگاری کی طویل تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے مختلف ادوار کا تذکرہ کیا ہے۔ مرتب کے بیان کا ایک مختصر سا حصہ یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ کریں:

''1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ڈاک نظام میں اصلاحات اور جدید کاری نے مکتوب نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ دورِ سرسیّد سے اردو مکتوب نگاری کروٹ لیتی نظر آتی ہے۔ علی گڑھ تحریک جیسی اصلاحی تحریک کی کامیابی میں مکاتیب نے بڑا کردار ادا کیا۔ یہی سبب ہے کہ سرسیّد اور ان کے رفقائے کار بالخصوص حالی، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، نذیر احمد وغیرہ کے مکاتیب کو اردو ادب میں بڑی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں امیر مینائی، اکبر الہ آبادی، داغ دہلوی وغیرہ کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔...... بعد میں علامہ اقبال، مولانا آزاد، نیاز فتح پوری، مولوی عبدالحق، مہدی افادی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، محمد علی جوہر، شاد عظیم آبادی، سیّد سجاد ظہیر، عبدالغفور شہباز، صفیہ اختر، رضا علی وحشت، پرویز شاہدی، مظہر امام، نظیر صدیقی، گوپی چند نارنگ، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ کے خطوط نے مکتوب نگاری کو ایک باضابطہ صنفِ ادب تسلیم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔'' (ص:۱۹)

عصر حاضر میں مکتوب نگاری کا سلسلہ تقریباً ختم ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی جگہ اب فیس بک، ای میل اور وہاٹس ایپ وغیرہ نے لے لی ہے۔ کاغذی طور پر یہ تحریر نئی نسل کے لئے ایک مثالی یادگار کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن اہمیت کی حامل اس لئے ہے کہ نئی نسل والے ابھی اس سے واقفیت حاصل کریں اور یہ جانیں کہ خطوط کس طرح لکھے جاتے رہے ہیں۔

پیش نظر کتاب ''چٹھی آئی ہے'' میں بہت سے خطوط نامور ہستیوں مثلاً ابراہیم اشک، ابوالکلام قاسمی، ابوذر ہاشمی، احمد سجاد، احمد سہیل، ارتضیٰ کریم، ارمان نجمی، افروز عالم، اقبال حسن آزاد، ایم کمال الدین، پریمی رومانی، جگن ناتھ آزاد، جمال اویسی، حقانی القاسمی، حلیم صابر، خلیق انجم، رؤف خیر، رئیس انور، سلیم انصاری، سیما عابدی، شاکر خلیق، شارب ردولوی، شمس الرحمٰن فاروقی، شموئل احمد، شوکت خلیل، شوکت حیات، شہپر رسول، صوفیہ انجم تاج، طلحہ رضوی برق، عبدالمنان طرزی، عبدالقوی دسنوی، عفت موہانی، فراز حامدی، قمر اعظم ہاشمی، قمر رئیس، شان بھارتی، مشرف عالم ذوقی، مظفر مہدی وغیرہ کے ہیں تو کچھ خطوط نئی نسل کے قلمکاروں مثلاً عارف اقبال، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ابرار احمد اجراوی، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر احمد معراج، عصمت آرا وغیرہ کے بھی ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر کچھ نامور ہستیوں کے خطوط پیش کر رہا ہوں:

☆ ابوالکلام قاسمی: برادر عزیز ڈاکٹر امام اعظم صاحب! سلام مسنون

دہلی سیمینار میں آپ سے ملاقات ویسی ہی سرسری رہی جیسی ہر بار ہوتی ہے۔ آپ کا پرچہ اچھا تھا۔ سیمینار کے پرچوں کے عام معیار کے مقابلے میں آپ کا پرچہ کسی طرح فروتر نہ تھا بلکہ بہتر تھا۔ اگر ایسے ہی دو چار معروضی نوعیت کے مضامین ہر سال لکھ لیا کریں تو آپ سنجیدہ قاری کی توجہ مرکوز کر لیں گے۔

آپ کا: ابوالکلام قاسمی

☆امان خاں دل: محترم ڈاکٹر امام اعظم صاحب! السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کا روانہ کردہ ''تمثیل نو'' مع رقعہ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے دوبارہ ارسال کیا۔ اللہ کرے آپ کا رسالہ جاری و ساری رہے۔ ایک نظم آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کو پسند آئے گی انشاء اللہ۔ فون پر گفتگو ہوگی۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

خیر اندیش: امان خاں دل

☆ ڈاکٹر خلیق انجم: امام اعظم صاحب! آداب

آج صبح کی ڈاک سے آپ کا ارسال کردہ سہ ماہی رسالہ ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ رسالے میں میری کتاب ''خواجہ احمد فاروقی'' پر پروفیسر محمد منصور عالم صاحب کا تبصرہ پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ یہ خوشی اس بات کی نہیں کہ انہوں نے میرے حقیر کام کی تعریف کی ہے بلکہ خوشی اس بات کی ہے کہ انہوں نے پوری کتاب پڑھ کر تبصرہ کیا ہے۔ میں یہ تبصرہ شائع کرنے کے لئے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

آپ کا: خلیق انجم

اس طرح اس کتاب ''چٹھی آئی ہے'' میں ۱۹۷ خطوط شامل ہیں۔ اتنے سارے خطوط نے اس کتاب کو دستاویزی حیثیت کی حامل بنا دیا ہے۔ موجودہ دور میں خطوط کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ موبائل اور ٹی وی نے ہر ذہین فنکار کو اپنی طرف راغب کر لیا ہے۔ ایسے میں ''چٹھی آئی ہے'' جیسی ضخیم کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر امام اعظم کو مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے کیونکہ ان خطوط میں رنگ اور رعنائی کے ساتھ منطقی اور ادبی ربط کے عناصر بھی نمایاں ہیں۔

☆☆☆

● ڈاکٹر محمد حسن امام فاروقی عرف چھوٹے بابو (سابق ہیڈ ماسٹر لال باغ مڈل اسکول، دربھنگہ ساکن 'فاروقی ہاؤس' چک رحمت بھگو، دربھنگہ ولادت: ۱۳ مئی ۱۹۵۴ء، مولد: پرکھوپٹی، لہریا سرائے، دربھنگہ، ولد: محمد علی اصغر مرحوم) کا ۷ جنوری ۲۰۲۰ء کو صبح ۳۰-۸ بجے طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ۸ جنوری کو بعد نمازِ عصر آبائی قبرستان واقع پرکھوپٹی، دربھنگہ میں سینکڑوں سوگواروں نے نمناک آنکھوں کے ساتھ انہیں سپردِ خاک کیا۔ قاری محمد عثمان نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ مرحوم فریضۂ حج سے فارغ ہو چکے تھے۔ نہایت نیک، ملنسار اور خوش اطوار انسان تھے۔ سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ مئی ۲۰۱۴ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ انھوں نے پروفیسر منصور عمر مرحوم کی نگرانی میں ''غیاث احمد گدی کے افسانوں میں ساختیاتی تغیرات'' کے موضوع پر ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔ چند برسوں قبل اہلیہ کے داغِ مفارقت دے جانے کے بعد سے ہی وہ لگاتار علیل رہنے لگے تھے۔ پسماندگان میں ۲ بیٹیاں (شادی شدہ) اور ۲ بیٹے ہیں۔ مرحوم جناب محمد فاروق صاحب رئیس پرکھوپٹی کے فرزند جناب روح القدس مرحوم کے خویش تھے۔ ان کے بھائیوں میں حافظ علی امام، محمد مرتضیٰ علی اور محمد شبیر علی اور بھتیجا ذیشان فاروقی (مکھیا، پریم جیور پنچایت) ہیں۔

....

احسان ثاقب (آسنسول)

کتاب ''چٹھی آئی ہے'' منظوم تجزیہ

دروازے کی کنڈی کھولو دیکھو چٹھی آئی ہے
اردو کے بے باک نقیبو دیکھو چٹھی آئی ہے

دیکھنے سے ہی لگتا ہے اردو کی یہ سچی تصویر — جیسے خواب کا اک گلدستہ آ پہنچا زیر تعبیر
یک جہتی اور کلچر کی ہو جیسے یہ زندہ تصویر — ہوئی نہ ہوگی شاید اب تک لفظوں کی ایسی تعمیر
اردو کے سب ویڑن دیکھو ایسی چٹھی آئی ہے

تحریک و تحقیق ہے روشن اے شاہد اقبال یہاں — لہجہ اور ترسیل کا درپن اے شاہد اقبال یہاں
نئی جہت کا یہ ہے مخزن اے شاہد اقبال یہاں — جھونک دیے ہیں تو نے تن من اے شاہد اقبال یہاں
موضوعاتی نقش ٹٹولو ایسی چٹھی آئی ہے

شاہِ اودھ کے شہرِ قلم کی کھٹی میٹھی بات یہاں — آئی ہوگی اردو گھر سے کچھ تو نئی سوغات یہاں
کتنے اچھے کتنے پیارے ہیں قلمی لمحات یہاں — چاروں جانب سجے ہوئے ہیں لفظوں کے باغات یہاں
دیکھو، پرکھو، جانچو، تولو ایسی چٹھی آئی ہے

پھیلے ہوں گے ورق ورق پر اہلِ سخن کے نام ضرور — ہر خطے کی گلی گلی کے ہوں گے کچھ پیغام ضرور
ادبی منظر ''تمثیل نو'' ریختہ کا انعام ضرور — لیکن سب سے اوپر ہوگا اعظم تیرا کام ضرور
اس سے آگے سوچ کے بولو ایسی چٹھی آئی ہے

ہر خطے کا ذائقہ اس میں ہر وادی کی خوشبو ہے — دیکھو آکر پنہاں اس میں چاروں سمت کی اردو ہے
اس چٹھی کا ہر موضوع بھی کوئل، آہو، جگنو ہے — لفظ لفظ امام اعظم ہیں اور حرف حرف شاہد تو ہے
لطف سخن کے اُڑن کھٹولو ایسی چٹھی آئی ہے

زیر نظر مجموعہ جس کا ہر گوشہ نایاب ہوا — مکتوباتی جوشِ خرد سے ہر حصہ شاداب ہوا
بہت مکمل بڑا مدلل اس کا اک اک باب ہوا — روئے سخن خورشید اگر ہے روئے نظر مہتاب ہوا
گرد و پیش سے باہر آؤ ایسی چٹھی آئی ہے

مختار الدین، مناظر عاشق اور عفت موہانی بھی — ہیں نظیر بھی، احمد سجاد اور سعید رحمانی بھی
انیس رفیع، شمیم فاروقی اور ریاض شیروانی بھی — طبع کی مشاقی میں ہیں یہ سب کے سب لاثانی بھی
بینائی کے دھند کو کھولو ایسی چٹھی آئی ہے

ہیرانند بھی، ہری ونش بھی اور ششی ٹنڈن بھی ہیں — گوپی چند نارنگ بھی اس میں اور ملک آنند بھی ہیں
وشوناتھ طاؤس بھی اس میں، ستیہ پال آنند بھی ہیں — اس دریا کا شاہد بھائی خوب کئے منتھن بھی ہیں
ان کے قد کو ناپو جانو ایسی چٹھی آئی ہے

حقانی القاسمی کا ہے کچھ اونچا معیار یہاں　　اور ولی رحمانی کا ہے ایک الگ اظہار یہاں
شیخ عقیل کے زورِ قلم میں غالب کی رفتار یہاں　　ہر پہلو سے سجا ہوا ہے مکتوبی اظہار یہاں
اس گلدستے کو بھی دیکھو ایسی چٹھی آئی ہے

مظہر کا اظہار بھی اس میں منظر کی تحریر بھی ہے　　شمس الرحماں فاروقی کے خوابوں کی تعبیر بھی ہے
اس میں حسن امام کے دل کی اک سچی تصویر بھی ہے　　پوشیدہ ان تحریروں میں اعظم کی توقیر بھی ہے
ادبی نام کے پیکر دیکھو ایسی چٹھی آئی ہے

امریکہ کے اشرف، گل، سیما بھی اور افضال بھی ہیں　　پاکستان کے رفیع ہاشمی، لندن کے سوہن بھی ہیں
حنیف ترین سعودی کے ہیں، جرمن کے حیدر بھی ہیں　　اور اس میں کویت کے بھائی ایک سعید روشن بھی ہیں
اڑتی چڑیا کے پر تولو ایسی چٹھی آئی ہے

علقمہ شبلی صاحب بھی ہیں اور اقبال انصاری بھی　　حرفِ نظر میں یکتا ہیں اسرار اکبر آبادی بھی
ہیں اس میں منظر شہاب بھی اور ظفر فاروقی بھی　　اور ان ہی آداب میں شامل قمر نقوی بخاری بھی
مکتوبی انداز کو جانو ایسی چٹھی آئی ہے

اہلِ قلم میں سیّد احمد اور شکیل الرحماں ہیں　　دیپک کنول اور خشونت جی بھی اس کتاب کے مہماں ہیں
ثاقب اس مکتوبی فن پر اللہ خوب مہرباں ہیں　　اس کتاب میں شامل ہو نوشاد نوری بھی شاداں ہیں
اس موضوع کے رنگ کو دیکھو ایسی چٹھی آئی ہے

ہر چھٹی کا ہوگا ثاقبؔ بے شک اک انداز نیا　　ایجاد و ترسیل الگ اور معیار و اعجاز نیا
ڈھونڈو گے تو مل جائے گا تمہیدی آغاز نیا　　سب نے اپنے فن میں بخشا مکتوباتی راز نیا
پڑھ کر اس کو جانچو پرکھو ایسی چٹھی آئی ہے

☆☆☆

قطعات

حلیم صابر	انجم عظیم آبادی
چٹھی آئی ہے امام اعظم کے نام ہے جو تحریرِ مشاہیرِ ادب روشن الفاظ و معانی اس میں ہیں پھوٹتی ہے جس سے تنویرِ ادب (مطبوعہ "اخبارِ مشرق" کولکاتا، ۹ر ستمبر ۲۰۲۰ء)	ان کی شخصیت نمایاں ہوگی اور ہر ورق میں ہے امام اعظم کی بات ہو مبارک شاہد اقبال آپ کو "چٹھی آئی ہے!" بہت عمدہ کتاب (مطبوعہ "اخبارِ مشرق" کولکاتا، ۱۶ر جولائی ۲۰۲۰ء)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

گوپی چند نارنگ کے نام مشاہیر کے خطوط: تخلیقیت افروز روحِ کائنات

خط لکھنا نفسیاتی اور ادبی ضرورت ہے۔ بیانیہ کا یہ عقلی استدلال ہے جس میں ہستی کا وجود تصورات و توقعات کے ساتھ رشتے کا عمل تفہیم کی نشانیاتی حدود کو حسنِ صورت عطا کرتا ہے، اردو میں اس کی روایت بہت پرانی ہے۔

گوپی چند نارنگ کے نام مشاہیر کے خطوط اس روایت میں اضافہ ہیں کیوں کہ گوپی چند نارنگ فلسفی، محقق، فکر و تفکر کے ناقد اور لسانیات کے ذہنی صورت گر ہیں۔ ساتھ ہی ادبی خطابت کے سائنسداں بھی ہیں۔ انوکھاپن ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ ساختیات اور اسلوبیات کے بنیاد گذار ہیں اور اظہار کی سطح پر بے حد فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ شاید ہی کوئی فنکار ہو جس نے ان کے نام خطوط نہیں لکھے ہوں گے۔ دو جلدوں میں ایک سو دو مشاہیر کے ڈھیروں خطوط منظرِ عام پر آئے ہیں مثلاً مالک رام کے 56 خطوط، سید محی الدین زور کے 45، مختار الدین آرزو کے 37، مسعود حسین خاں کے 26، نجیب اشرف ندوی کے 27، انتظار حسین کے 62، سردار جعفری کے 39، شمس الرحمٰن فاروقی کے 25، قمر رئیس کے 29، نثار احمد فاروقی کے 35، وارث علوی کے 25، جمیل الدین عالی کے 25 اور دیگر مشاہیر کے کئی کئی خطوط سے جہاں گوپی چند نارنگ سے وابستگی و پیوستگی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں کئی دہائیوں کی اردو ادب کی پیش رفت بھی سامنے آتی ہے۔ یہ معنوی عمل ہے جس میں طلسمی حقیقت نگاری ہے اور لفظ و معنی کا خزانہ ہے۔
بعض میں حسرتیں بھی ہیں مثلاً آل احمد سرور 16 ستمبر 1981ء کو لکھتے ہیں:

> ''امید ہے کہ تم یورپ اور امریکہ کے سفر سے بخیریت واپس آ گئے ہو گے۔ ادھر تمہاری دو کتابیں ملیں۔ ایک افسانے کے متعلق اور دوسری انیس کے۔ دونوں کتابیں ایسی اچھی چھپی ہیں کہ آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ بلکہ افسانے والی کتاب تو اور بھی بہتر ہے۔ ان دونوں پر دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ مجھے تو واقعی رشک آیا کہ ایسی اچھی کتابیں میں کبھی نہ چھپوا سکا اور میری کوئی کتاب بھی ایسی شاندار نہ چھپی۔ آپ چھپوائیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی وساطت سے اس ادارے کو کوئی کتاب دی جائے۔''

بعض خط میں معروض بروئے کار کی صفت ہے جو پیکر سازی اور مقصد براری کرتی ہے۔ قرأت کی علمیاتی صورت حال احمد فراز کے خط میں ملاحظہ کیجئے:

> ''کیسے ہو؟ میں اِدھر اُدھر آوارہ گردی کر کے لوٹا تو پھر انگلستان ہی میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ تمہارے ایک خط کا جواب میرے اوپر تھا سو قرضہ واپس لو۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ تم نے اس خط میں مجھ سے کیا کیا مطالبے کئے کیونکہ تمہارا خط لندن میں ہے اور میں یہ تحریر تمہیں برمنگھم سے لکھ رہا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ریتو لکھوا رہی ہے کہ اب ''کھت'' لکھ دو نارنگ صاحب کو کیونکہ وہ کل واپس جا رہی ہے اور اس لفاف کے ہمراہ۔ ادھر آنے کا کب ہو رہا ہے۔ میری بعض نظموں کا انگریزی ترجمہ کتابی صورت میں

کنیڈا سے چھپ چکا ہے۔لیکن میں نہ خوش ہوں نہ مطمئن۔اس لئے کسی کو اور خاص طور پر تم جیسے دوستوں کو بھیجنا نہیں چاہتا......۔" (1972ء)

احمد ندیم قاسمی کے افسانے میں پیچیدہ کثیر الجہت تخلیقی عمل ملتا ہے جس کی زیریں سطح میں سماجی کردار ملتے ہیں، عہد کی ترجمانی ملتی ہے اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی فضا سازی ملتی ہے۔وہ اپنے افسانوں کا ترجمہ انگریزی میں چاہتے تھے اسی لئے گوپی چند نارنگ سے رجوع ہوتے ہیں:

"کیا عرض کروں، آپ سے کتنا شرمندہ ہوں۔آپ کی اپنی مجبوریوں کی تفصیل لکھوں گا تو اسے آپ عذر تراشی قرار دیں گے سو تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔غیر مشروط طور سے عفو خواہ ہوں۔امید ہے آپ درگزر فرمائیں گے۔

اردو افسانوں کے انگریزی تراجم کی ضرورت پر میں نے ہمیشہ زور دیا ہے۔مجھے یاد ہے پطرس (بخاری) مرحوم نے چھ سات اردو افسانوں کا انتخاب کیا تھا اور انہیں انگریزی میں منتقل کرنے کے لئے بے قرار تھے مگر شاید موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ان کے انتخاب میں عصمت، کرشن، بیدی، منٹو، غلام عباس، ہاجرہ اور احمد ندیم قاسمی کا ایک ایک افسانہ شامل تھا۔ممکن ہے انہوں نے ایک آدھ افسانے کا ترجمہ کیا بھی ہو۔مجھے تو صرف ان کے ارادے کا علم ہے۔

بہر حال میں خوش ہوں کہ اب آپ نے یہ بیڑا اٹھایا ہے۔یہ بڑا مبارک کام ہے۔ہمارا افسانہ اتنا موثر، بھرپور اور متنوع ہے کہ میری رائے میں ہم کسی سے بھی پیچھے نہیں ہیں۔صرف ہمیں مغرب سے متعارف ہونے کی ضرورت ہے اور آپ اسی ضرورت کو پورا کریں گے۔

......میرے کسی افسانے کا کوئی (انگریزی) ترجمہ میری نظر سے نہیں گزرا۔صرف ہندی اور بنگالی اور شاید مراٹھی میں تراجم ہوئے ہیں یا میرے افسانوں کے دو مجموعے روسی میں چھپ چکے ہیں......

مظفر علی سید صاحب نے میرے افسانوں کا جو انتخاب کیا ہے ان میں سے میں ان افسانوں کو انگریزی میں منتقل دیکھنا چاہتا ہوں۔منظر، رئیس خانہ، وحشی، گھر سے گھر تک، سلطان......کاش آپ کے پاس میرے افسانے "ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" الحمد للہ، بھرم، پہاڑوں کی برف اور 'پاگل' بھی ہوتے......میں ایک بار پھر اس بے معنی اور جاہلانہ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔" (1965ء)

گوپی چند نارنگ رجحان ساز اور علم پرور قلمکار ہے۔ان کی ادبی گہرائی مثالی ہے لیکن ان کی تدریسی شخصیت بھی اخلاق و کردار کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔اس کا اندازہ بزرگ محقق و ادیب امتیاز علی عرشی کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے۔عرشی صاحب نے سفارشی خط لکھا ہے مگر ذہن پر مسلط ہونے والا ترجیحات بھرا یہ خط بہت کچھ سیکھنے کے لئے ہے:

"سنا ہے آپ کے محکمے میں اردو لکچرر کی دو جگہیں خالی ہیں۔یہ سوچ کر کہ آپ کے ساتھ کام کرنے والا آپ کے علم سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔جی چاہتا تھا کہ اس شرف کے لئے اپنی ذات کو پیش کروں مگر

اس خیال سے بالاتر رکھا کہ ''پیروی وصد عیب چنیں گفتہ اند۔''
اس محرومی کی تلافی کے طور پر یہ بات دماغ میں آئی کہ اپنے کسی دوست کو آپ کے سامنے پیش کروں۔
اگر آپ نے انہیں موزوں جان کر اپنا رفیق کار بنالیا تو یہ بھی گویا میرا نام بن جانا ہوگا۔
میرے یہ دوست اسناد کے لحاظ سے اس اسامی کے لئے موزوں سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ کیا اچھا ہوگا
میری یہ مراد برآئے۔ کبھی رامپور تشریف لاکر رضا لائبریری بھی دیکھئے۔ ہم سب کتنے خوش ہوں گے،
یہ دیدنی حالت ہوگی۔'' (2 دسمبر 1975ء)

یہ سبھی جانتے ہیں کہ گوپی چند نارنگ کے اندر علم کا دریا موجزن رہتا ہے۔ ان کی کھلی کائنات تازہ ہوا ہی نہیں، تازہ افکار بھی عطا کرتی ہے۔ بظاہر یہ گواہی زندگی کی نئی ترجیح ہے اور زندگی خود اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ سوچنے والوں کے حصے میں یہ کچھ زیادہ آتی ہے اور سوچنے اور دیکھنے والوں کو ضرورت سے زیادہ برتتی ہے۔ گوپی چند نارنگ ظاہر کو ٹٹولنے، چھپی معنویت کھولنے اور نئے تحیر سے نئی طرز ادا خلق کرنے کا گُر اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی شخصیت سے نامور قلمکار بھی استفادہ کرتے رہے ہیں۔ انتظار حسین کا یہ خط دیکھئے:

''کل جمیل جالبی کی معرفت آپ کا مرتب کردہ مجموعہ جسے دیکھنے کا اتنا اشتیاق تھا، موصول ہوا۔ جس نفاست سے چھپا ہے اس نے الگ متاثر کیا۔ پھر جب اس کی ورق گردانی کی تو پتہ چلا کہ سیمینار کے مضامین کے ساتھ ساتھ آپ نے اور مضامین کا اضافہ کیا ہے اور اب یہ اتنا جامع مجموعہ بن گیا ہے کہ پریم چند سے اب تک کے افسانے پر سند ٹھہرے گا۔

آپ نے میرے افسانوں پر جو مقالہ پڑھا ہے ہے ایک مرتبہ پھر اسے شوق سے دیکھا۔ ہاں، آپ نے بہت اچھا کیا کہ ایک نام کی اصلاح کردی۔ اصل میں مارکنڈے کا تذکرہ میں نے تو انگریزی میں پڑھا تھا۔ بہت ادھر ادھر تانکا جھانکا کہ اس کے صحیح تلفظ کا پتہ چل جائے۔ ستم دیکھو کہ اپنی بغل میں دبی ہوئی ایک کتاب سے اس کے صحیح تلفظ کا پتہ چلا مگر اس وقت جب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور افسانہ چھپ چکا تھا۔

یہ نام مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ انہیں دنوں مجھے کیا سوجھی کہ مہابھارت سے کچھ ترجمہ کر ڈالا۔ اب وہ ترجمہ میرے سامنے نہیں ورنہ کئی ناموں کے تلفظ آپ سے پوچھتا۔ بہر حال اس وقت جو کتاب میرے سامنے ہے اس میں سے دو تین نام لکھتا ہوں۔ ان کا تلفظ آپ مجھے بتادیجئے ورنہ عذاب ثواب آپ کی گردن پر ہوگا:

Yadanya Walkya　Maitreyee, Katy ayanee

یہ اسمائے گرامی Brihadaranyaha نامی اپنشد سے ماخوذ ہیں۔ اس نام کا بھی صحیح تلفظ مطلوب ہے۔'' (9 ستمبر 1981ء)

گوپی چند نارنگ کی ادبی شخصیت کے عقب میں پھیلی خوشبو اور معنویاتی تنوع سے استفادہ کرنے والوں میں

جاں نثار اختر بھی ہیں۔ نارنگ صاحب نے معلم کی عبا پہن کر اور مصلح کا عصا لے کر کتنوں کو فائدہ پہنچایا ہے اس کا شمار ممکن نہیں ہے۔ وہ ساری زندگی یہی سب کچھ کرتے رہے ہیں اور تسکین پاتے رہے ہیں۔ اسے صوفی منشی کہہ سکتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد حسن بمبئی آئے تھے اور میری غزلوں کی کاپی مع اپنے مقدمے کے واپس کر گئے ہیں۔ اب آپ کی باری ہے۔ کتاب تو سو، سوا صفحات کی ہوگی۔ دیباچوں کے ذریعہ حجم بڑھایا جاسکتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ آپ کو سپرد کر دیتے۔ بہر کیف مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ بغیر آپ کے مضمون کے کتاب نہیں چھپے گی۔ دہلی کے Red Fort کے مشاعرہ کا ہر سال بلاوا آتا ہے لیکن اس سال ابھی تک دعوت نامہ نہیں ملا۔ کل مجھ سے جعفری کہہ رہے تھے کہ امسال اس مشاعرے کے کرتا دھرتا نارنگ صاحب ہیں۔ اگر آپ نے یاد کر لیا اور میرا دہلی آنا ہوا تو وہ مجموعہ اب کے آپ کے سپرد کر جاؤں گا۔''

(10 جنوری 1974ء)

نگاہِ نکتہ چیں بیدار کرنے والی شخصیت کا نام گوپی چند نارنگ ہے۔ وہ لمحۂ موجود میں جینے کے عادی رہے ہیں اور تحقیقی و تنقیدی ریاضت سے نئے باطنی جزیرے کا ظہور کرتے رہے ہیں۔ ان کے نام علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کا خط انکشافی ہے۔ اس میں نیا جواز ہے جسے انہوں نے معرضِ اظہار سے روشن کیا ہے:

''آپ کا خط ملا اور یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ آپ بخیریت ہیں اور آج کل وائس چانسلر کے فرائض بحیثیت قائم مقام انجام دے رہے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو بلند مراتب پر فائز کرے اور زندگی کی خوشیاں عطا کرے۔ ہند کے وزیر خارجہ سے لاہور میں مجھے آغا شاہی صاحب نے ملوایا تھا۔ کچھ دیر تک باتیں بھی ہوئیں۔ جناب نرسمہا راؤ خود بھی ادیب اور مصنف ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں علامہ اقبال پر ایک انگریزی تصنیف حکومت نے شائع کرائی تھی جسے شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم نے عبدالستار صاحب سفیر پاکستان کو دیا۔ یہ کتاب مجھ تک نہ پہنچی تھی لیکن ابھی پرسوں ہی سفیر ہندوستان نٹور سنگھ نے اسے اسلام آباد سے بھجوایا ہے۔

آپ کو ''زندہ رود'' کی جلد دوم آج بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ارسال کر دی ہے۔ کتاب کی وصولی پر مجھے اطلاع دیجئے گا۔ امید ہے آپ بھی اس جلد کو پہلی جلد کی طرح دلچسپ پائیں گے۔ آج کل میں تیسری جلد لکھنے میں مصروف ہوں جو اس سلسلہ آخری جلد ہوگی۔ پہلی جلد نے پاکستان میں Literary Award بھی حاصل کیا ہے اور سال 1977ء سے لے کر سال 1979ء تک اردو میں بہترین کتاب قرار دی گئی ہے۔''

(25 جون 1981ء)

گوپی چند نارنگ کے نام خطوط میں مضامین نو اور فکر آفرینی کی چہل پہل دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے جلو میں کئی دھندلے، کئی واضح اور کئی تیکھے عکس ملتے ہیں جن میں رنگ اور خوشبو کا اثبات ہے۔ موجود اور وجود کے عناصر کی شمولیت ہے اور انکشافِ ذات کی نامکمل جھلکیاں ہیں۔ جمیل الدین عالی کے خطوط طول طویل ہیں لیکن ان میں لطافت اور داخلی نزاکت کی سچائی اور شیفتگی ہے۔ ایک خط سے یہ اقتباس دیکھئے:

"لندن کے مزے یاد آ رہے ہوں گے اور کہیں اور کے لئے پر بھی تول رہے ہوں گے۔ نومبر میں مجھے ٹورنٹو بلایا گیا ہے۔ پتہ نہیں جا سکوں یا نہ جا سکوں۔ بہ ظاہر کوئی رکاوٹ تو نہیں لیکن اب میرے لئے لباس کا مسئلہ ذرا پریشان کن ہے۔ تین برس سے کرتا پاجامہ صدری پہن کر مغرب میں گھومتا ہوں کہ موسم معقول ہوتا ہے۔ بس ایک سوٹ ساتھ رکھ لیتا ہوں وہ بھی اس لئے کہ کپڑے دھلنے دوں تو سوٹ پہن لوں۔ اب وزن بڑھ گیا، پیٹ نکل آیا، سوٹ میں بہت برا بھی لگوں گا اور نئے بھی بنوانے پڑیں گے۔ سو تین چار ہزار روپے کیوں خرچ کروں۔ پچھلے اٹھارہ پڑے ہیں کوئی فٹ نہیں آتا۔ مشاعرے والے کیا دیں گے۔ نئے مقامات، شیڈول میں نہیں۔ وہیں چیپٹر، قناٹ، ٹورنٹو، اوٹوا، مانٹریال اور وینکوور...... وہاں اتنے دن ٹھہرے رہتے ہیں کہ کسی احباب میں بیٹھ کر باب ناب کیا جائے۔ پھر امریکی مشاعرے ابھر آتے ہیں۔ جاؤ تو خراب ہو نہ جاؤ تو احباب کو دکھ پہنچاؤ۔ سردی ہمارے حساب سے سخت ہوگی۔ لانگ جان ایک سے زیادہ تو نہیں پہنی جا سکتی سو کرتے پاجامے کے ساتھ کافی نہ ہوگی۔ اگر ان تین مہینے میں وزن معقول حد تک کم نہ ہوا تو جاؤں گا ہی نہیں۔ سوٹ جبراً نہیں شوقیہ پہن سکتا ہوں۔ اوور کوٹ پرانا ہو گیا ہے۔ چینی اس سال دسمبر میں بلاتے تھے۔ معذرت کر لی۔ بیجنگ میں ہر وقت کمرے میں تو بند نہیں رہ سکتا۔ اور اس بار وہ تبت لے جانا چاہتے ہیں۔ سوچا اگلی گرمیوں میں جاؤں گا۔

یہ میری کہانی ہوئی۔ آپ کی کتاب تیار ہے مگر معذرت کہ میرا مقدمہ پورا نہیں ہوا۔ میں نے اپنی طرف سے پورے موضوع اسلوبیات پر لکھنا شروع کیا تھا جو آپ جدید لوگوں نے وضع کر لیا ہے کہ ہر بات کو Clieche کہہ کر نئے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اے بھائی پہلے اسلوب ہوتا تھا۔ آپ نئے لوگوں نے Stylistics کا چکر شروع کر دیا کہ کچھ Specialization کا ڈھونس رہے۔ میں نے سوچا کچھ بات چیت اسلوبیات پر کر لی جائے کیونکہ جدید دور میں اس طرح کا مطالعہ کرانے میں آپ نے اختصاص حاصل کیا ہے۔ آپ سے پہلے اردو میں اسلوبیات کو مضمون بنانے کا سائنٹفک کام شروع نہیں ہوا تھا۔"

(8 اگست 1984ء)

سوچ کا ہلکا جھونکا چھو کر گذر جائے تو رنگ روپ کی بہار مسکرا اٹھتی ہے اور اعتماد کی سچائی آئینہ بن جاتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کی شخصیت سے امیدیں وابستہ کی جاتی رہی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی شہریار کے لئے سفارش کر کے اعتماد کو قابل فہم جانا تھا۔ انہیں یا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ خواجہ احمد فاروقی کے نام اگز امن کرنے کے لئے جو کاپیاں آتی تھیں انہیں نارنگ صاحب ہی جانچتے تھے۔ یہ اعتبار کا سچا آئینہ تھا جو نارنگ صاحب کے حصے میں آیا تھا۔ اس میگنیفائنگ احساس میں آشنائی اور کشش ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خط ملاحظہ کیجئے:

"یہ خط ایک ذاتی غرض کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ میرے ایک عزیز امسال ایم اے فائنل (اردو) کے امتحان میں شریک ہو رہے ہیں۔ پچھلے سال پریویس میں ان کی فرسٹ پوزیشن تھی۔ امسال بھی

پرچے اچھے ہوئے ہیں لیکن یہ فکر دامن گیر ہے کہ یہ پوزیشن برقرار رہے۔ ان کا ایک پرچہ خواجہ احمد فاروقی صاحب کے یہاں بھی گیا ہے۔ اگر آپ اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر (بغیر میرے حوالے کے) ان کے لئے کچھ کرسکتے ہیں تو کردیجئے۔ لیکن اسی صورت میں جب آپ کو پورا یقین ہو کہ کام ہوجائے گا۔ ان کا رول نمبر (204) ہے۔ امید ہے کہ آپ اس معاملے میں دلچسپی لے کر مجھے ممنون احسان فرمائیں گے۔ اس سلسلے میں جو بھی کیفیت ہو مجھے لکھئے گا۔" (18 اپریل 1961ء)

اردو کی اپنی مملکتیں رہی ہیں لیکن انگریزی کی وسعت اپنی جگہ پر ہے۔ عصری تقاضے کے منظرنامہ کے لئے اور آفاقیت کے لئے راجندر سنگھ بیدی "ایک چادر میلی سی" کا انگریزی ترجمہ چاہتے تھے۔ ان دنوں گوپی چند نارنگ امریکہ میں تھے اور تازہ خیالی اور دوربینی ان کی تلاش میں تھی۔ نامعلوم کی دریافت تب بھی ان کے آس پاس پھٹکتی رہتی تھی۔ اور وہ علم کی زبان کے سفر پر تسلیم اور شناخت کا عمل دہراتے رہتے تھے۔ اسی لئے راجندر سنگھ بیدی بھی ان سے استفادہ چاہتے تھے:

"میں نے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' پر آپ کا تبصرہ پڑھا تھا۔ تبصرہ بیک وقت شعر مسلسل تھا۔ اور دقت نظر کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ کتاب سے قطع نظر، نقد و نظر کی دنیا میں اس کی اپنی ایک حیثیت ہے۔

میں نے دوبارہ ناولٹ کا ترجمہ انگریزی میں کروایا اور اس پہ خاصے پیسے بھی صرف کیے لیکن دونوں بار تراجم ناکام رہے۔ وہ کھردراپن اور فلسفیانہ معنی جو میں نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہیں مفقود ہوگیا۔ پھر میں نے سوچا سردار خوشونت سنگھ کو زحمت دوں۔ کسی نے ان سے بات بھی کی۔ انہوں نے توجہ بھی فرمائی لیکن پھر یہ سب حوادث کی نذر ہوگیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب چیزیں آپ ہی کی التفات کی منتظر تھیں۔

میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ کی مدد سے وہاں کے پڑھنے والوں تک پہنچوں۔ ناولٹ کی کاپی آپ کے پاس ہو تو بہتر ورنہ مجھے لکھئے میں ڈاک سے بھجوا دوں گا۔ ترجمے بھی بھجوا دیتا لیکن سودمند ہونے کی بجائے ابتری پھیلائیں گے۔ امریکا میں یا انگلینڈ میں اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں کسی لٹریری ایجنٹ کی ضرورت پڑے تو اس کے مصارف بھی میں دینے کو تیار ہوں۔ اس کے علاوہ ترجمے کے سلسلے میں کوئی بھی معقول Terms مجھے منظور ہوں گی۔

آپ کے گرامی نامے سے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہاں بھی لوگوں کو ہندوستانی ادبیات سے دلچسپی ہے۔ غالباً جیسے وہاں بہت سے لوگ ہندوستان کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ ہم میں سے بہت سوں کی نظر میں امریکا تمول کے سوا اور کچھ نہیں۔ خیر، ہم نے تو وہٹ مین، مارک ٹوئین وغیرہ سے لے کر beetniks اور ہالڈون تک سب پڑھا ہے، وہاں ہمارے سلسلے میں لوگ نہ معلوم کہاں تک پہنچے ہیں پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانیوں نے ادب کے سلسلے میں اب تک کیا کیا ہے۔"

(9 دسمبر 1963ء)

بعض تحریریں بطون میں تازہ دم معنویت رکھتی ہیں، جن سے نئی اور تحیر خیز فضا کے ساتھ کبھی کبھی بے ادبی اور مکدر فضا کی بو باس بھی آتی ہے۔ حالانکہ ان میں تجلی اور مرنجاں مرنج گفتگو نمایاں رہتی ہے لیکن رنج کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ معقولات اور منقولات منتقل کرنے اور بصیرت کے بعد سے لبریز ساقی فاروقی کا خط نارنگ صاحب کے نام ملاحظہ کیجئے، ذہنی کج روی کی ایک مثال یہ بھی ہے:

''وہ...... چودباقر مہدی اتنا کمزور آدمی ہے کہ کیا بتاؤں۔ میں نے اس کی شاعری پر رائے دی تھی کہ اس کی شاعری بالکل لوکل، نہایت لچر اور بکواس ہے اور اسے شاعری چھوڑ کر نثر کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں دوستوں سے جھوٹ کیسے بولوں۔ اس بات پہ روٹھ گیا ہے۔ اسے خط لکھ کر یہ بتائیے کہ اگر ساقی کی یہ رائے ہے تو ٹھیک ہی ہوگی۔

اس کی جہالتِ مدیرانہ کا عالم یہ ہے کہ میری نظم ''خرگوش کی سرگزشت'' جو دو حصوں میں تھی۔ 1۔ رقص 2۔ موت۔ اس کے پہلے حصے کو وہ پوری نظم سمجھا اور چھاپ دیا۔ رسالہ آیا تو میں بالکل بجھ گیا یعنی آدھی نظم کو پوری نظم سمجھتا ہے حرامی۔ پھر سارتر کی محبوبہ اور مشہور فرانسیسی مصنف Simone یعنی سیمون کو سیمونی لکھتا ہے۔ عجیب چوتیا ہے یار۔'' (5 اپریل 1977ء)

گوپی چند نارنگ کے نام سبھی خطوط میں جرأتِ اظہار، انتخابِ الفاظ، آپ بیتی کے بعض گوشے، ادبی لب کشائی کی پہچان، عہد کی تخلیقیت پرور اور تخلیقیت افروز روحِ کائنات، جمالیاتی بازدید اور احساسِ خیال کی تازگی سے آگہی ہوتی ہے۔ ان میں بے کراں تخلیقی آرزومندی بھی ہے۔ گوپی چند نارنگ کا ادبی اور تدریسی قد اتنا اونچا ہے اور ان کے کام کا پھیلاؤ ایسا ہے کہ خط لکھتے وقت وقیع ترین آفاقی شعور کی تہہ در تہہ کیفیت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ یہ خطوط تخلیقی اور تنقیدی ترسیل میں مدد و معاون ہیں۔

☆☆☆
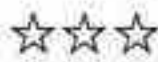
کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور- 812001 (بہار)

● جناب **غضنفر کاظمی** کا ۱۲؍مارچ ۲۰۲۰ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً ۵۸؍سال تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے ہیں۔ واضح ہو کہ غضنفر کاظمی ۱۲؍مارچ کو رات کے ۱۲؍بجے اپنے آبائی گاؤں کے لئے کلیان- پٹنہ سپر فاسٹ ٹرین میں تھے جہاں انہیں قلب کا شدید دورہ پڑا۔ وہیں انہوں نے جلگاؤں میں ٹرین چھوڑ دی اور وہاں کے ٹائیٹن اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ان کا جسد خاکی بذریعہ ایمبولینس جلگاؤں سے ان کے آبائی وطن دربھنگہ لایا گیا جہاں ۱۳؍مارچ کی شب میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم غضنفر کاظمی پبلک ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بھیونڈی، ممبئی کے بانی صدر تھے اور اس سوسائٹی کے تحت چل رہے خواجہ غریب نواز اردو ہائی اسکول کو چند برسوں میں ہی آگے بڑھایا۔ وہ برسوں تدریس خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر منظر کاظمی مرحوم، اطہر کاظمی، اختر کاظمی اور ڈاکٹر افسر کاظمی کے مرحوم حقیقی بھائی تھے۔

....

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مظہر امام کی تنقید نگاری اور اس سے خوشہ چینی

مظہر امام کی تنقیدی بصیرت کو اجاگر کرنے سے پہلے ان کا ایک جواب یہاں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے انٹرویو لیتے وقت سوال کیا تھا:

''آپ کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''آتی جاتی لہریں'' اور ''ایک لہر آتی ہوئی'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں اور رسائل میں چھپے آپ کے بعض بڑے فکر انگیز مضامین ہیں۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ ادب کے ساتھ تنقید کا کیا تعلق ہے۔''

مظہر امام کا جواب ملاحظہ کیجئے:

''تنقید ادب کے لئے ہی نہیں زندگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ تنقید، محاسبہ، تجزیہ — ان سب کے بغیر نہ زندگی ارتقا پذیر ہو سکتی ہے اور نہ ادب آگے بڑھ سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر پرکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میری تنقید میں خوب سے خوب تر کی جستجو کا اشاریہ ہیں۔ میرے خیال میں تنقید کا کام جمالیاتی شعور پیدا کرنا ہے۔ اسی جمالیاتی شعور کے ذریعے ہم ادب کو پرکھ سکتے ہیں، اور اچھے اور برے ادب میں تمیز کر سکتے ہیں۔ اگر ہم میں جمالیاتی شعور نہ ہو تو ادب کے نام پر لکھی جانے والی ہر تحریر قابلِ اعتنا ٹھہرے گی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ تنقید اکثر نہ صرف یہ کہ جمالیاتی شعور پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے بلکہ اس نے جمالیات کا غلط اور مکروہ تصور پیش کیا ہے۔ اس نے اکثر فتوے صادر کئے ہیں اور اپنی پسند اور ناپسند کو پڑھنے والوں پر تھوپنا چاہا ہے۔ یعنی ہماری تنقید نے ذوق کی تربیت میں اتنا حصہ نہیں لیا، جتنا ہمارے ذوق و شعور میں انتشار پیدا کیا ہے۔ تنقید کو معروضی اور غیر منصفانہ ہونا چاہئے۔ ذاتی دشمنی اور دوستی کے اظہار کا ذریعہ نہیں۔ علم، ذوق اور تجربے کے بغیر صحیح تنقید ممکن نہیں۔ تنقید ادبی اقدار کے تعین میں مدد دیتی ہے۔ لیکن تنقید بہر حال تخلیقی ادب کی دست نگر ہے۔ ''تخلیقی تنقید'' وغیرہ جیسی اصطلاحیں بے معنی نہیں۔ تخلیقی ادب کے بغیر نہ تنقید کا کوئی جواز ہے نہ اس کا وجود ممکن ہے۔''

یہ مظہر امام کا محرکات بھرا نظریہ ہے۔ اپنی غیر معمولی تنقیدی بصیرت اور بالغ نظری کی وجہ سے انہوں نے نئے انداز میں صنم گری اور صنم شکنی کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تنقید میں حسیت و بصیرت کی ترسیل کے ساتھ ادب کی صحیح جہت اور میلان کی نشاندہی ملتی ہے۔ ان کی تنقید کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ روایتی موضوعات روشن نہیں ہوتے بلکہ امتیازات کے کئی پہلو نمایاں رہتے ہیں جن سے استفادہ کی حد تک خوشہ چینی ہوتی رہی ہے۔

خوشہ چینی کی مثال دینے سے قبل یہ بتا تا چلوں کہ مظہر امام کی تنقیدی کتابوں کے نام ''آتی جاتی لہریں''، ''ایک لہر آتی ہوئی'' اور ''تنقید نما'' ہیں۔ ''آتی جاتی لہریں'' ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کے ۱۸ مضامین کے عنوان اس طرح ہیں:

''آتی جاتی لہریں، ترقی پسندی سے جدیدیت تک، اردو شاعری میں صورت کی جلوہ گری، آزاد غزل پر ایک نوٹ، شاد عظیم آبادی: نئی غزل کے پیش رو، داغ کا ایک غیر معروف شاعر: سعادت پیغمبر پوری، شاد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو، ناقدوں کے مقتول: پرویز شاہدی، سلام مچھلی شہری: طوفانِ بہاراں کا شاعر، آنکھ کا اشاعر: محمد علوی، نیا اردو افسانہ، علی عباس حسینی کا اولین افسانہ، اختر اورینوی کا بہترین افسانہ، عصمت چغتائی: زبان کی افسانہ نگار، مخمور جالندھری کی شاعری کا دور اولین، کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر، ادب اور بہاریت، اور 'کرشن چندر: سرائے سے باہر''!

دوسرے مجموعہ ''ایک لہر آتی ہوئی'' میں سولہ مضامین ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۱ء تک کے لکھے ہوئے ہیں جن کے نام یوں ہیں:

''ایک لہر آتی ہوئی، ادبی تنقید: گمراہی کا منشور، آج کا ادیب، کتنا ادیب!، غالب بے رنگ، اقبال: تیسری دنیا کے لئے، حسرت کی غزل کا نشانِ امتیاز، جوش: جاہ و جلال کا شاعر، فراق پر چند خیالات، شاد عظیم آبادی کا ایک عاشق شاگرد، یکے از شارحین غالب: مولانا سُہا، جدید نسل اور احتشام حسین، فیض کی تنقیدیں، 'آفتابِ تازہ' اور جگن ناتھ آزاد، حامدی کاشمیری: شاعر نقاد، بہار میں اردو افسانہ: ۶۰ء کے آس پاس، اور 'مغربی بنگال میں اردو شاعری: آزادی کے بعد''۔

تیسرا مجموعہ ''تنقید نما'' میں ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۳ء تک کے پچیس مضامین کی شمولیت ہوئی ہے:

''تخلیقی فن کار کی بحالی، اردو ادب میں اولیت کے سہرے، ہندی میں اردو، جموں و کشمیر میں اردو شاعری کا نیا مزاج، اردو شاعری: ۱۹۹۷ء کی، شاعری: اقبال کی پہلی شناخت، وحشت اور غالب، مجروح کی ایک غیر مطبوعہ غزل، سردار جعفری: شخصیت اور شعری اظہار، پرویز شاہدی کا ارتقائی سفر: ۱۹۵۲ء تک، امجد نجمی: شاعرِ اڑیسہ، سہیل عظیم آبادی اور شاعری، پانی پت: رفعت سروش کی طویل نظم، منظر شہاب: پیراہنِ جاں اور تیز ہوا، عرفان صدیقی اور آہنگ غزل، قاضی عبدالودود اور افسانوی ادب، بلا نگار دیوندر ستیارتھی، زکی انور کے ابتدائی افسانے، ہرچرن چاؤلہ کے افسانوی کردار، مجتبیٰ حسین کا نامۂ سفر، مشفق خواجہ عرف خامہ بگوش، میر شناس نثار احمد فاروقی، اردو میں فرانسیسی صنفِ سخن: ترائیلے، دربھنگے میں اردو ادبی صحافت، اور 'نگار خانوں کی یادیں: یادوں کے نگار خانے''۔

مظہر امام کی ایک تنقیدی کتاب ''جمیل مظہری'' بھی ہے۔ یہ مونوگراف ہے۔ اس میں درج ذیل عنوانات کے تحت تجزیے ہیں:

''جمیل مظہری کی غزلیں، جمیل مظہری کی نظم نگاری، جمیل مظہری کی مثنویاں، جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری، جمیل مظہری کی طنزیہ اور ہجویہ شاعری، اور 'جمیل مظہری کی افسانہ نگاری''!

ویسے مظہر امام کی ایک اور کتاب ''نگاہِ طائرانہ'' ہے جس میں کتابوں اور رسائل پر تبصرے ہیں۔

مظہر امام کی تنقید میں بے باکی ہے، کھرا پن ہے، تیکھا پن ہے، اشاریت بھی ہے۔ اسی لئے بصیرت کے ساتھ نئی سج دھج ملتی ہے اور فکر و فن کے چراغ روشن ہوتے نظر آتے ہیں۔ نئی جہت کی ترجمانی سامنے آتی ہے ساتھ

ہی اعتدال پسندی کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عصمت چغتائی کے سلسلے میں ان کا تبصرہ بھی اس طرح ہے:
''عصمت چغتائی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ زبان کی افسانہ نگار ہیں، ایک طرح کی تنقیدی سہل نگاری ہے۔ کیوں کہ زبان کو تخلیقی ادب پارے کی کلیت یعنی Totality سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔''

آزادغزل سے متعلق امکانات سے بحث کرتے ہوئے بتاتے ہیں:
''آزادغزل کی تخلیق کسی فنی اور فکری پابندی سے فرار کا نتیجہ نہیں ہے۔ اچھی آزادغزل کہنے کے لئے غیر معمولی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔''

جدیدیت پر اپنا موقف بیان کرتے ہوئے مظہر امام نے اس کے بعض پہلو پر یوں نظر ڈالی ہے:
''جدیدیت کا کوئی قطعی مفہوم متعین کرنا نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ کسی اصطلاح کی تعریف ضروری ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ عصری زندگی کی پیچیدگیوں کے شعور کا نام جدیدیت ہے۔ اب اس کی تعبیر وتشریح جس طرح بھی کی جائے۔ یہ رجحان نئے انسان کی مضطرب روح کا تقاضہ ہے۔''

اردو میں تنقید کے عمومی رویہ سے بحث کرتے ہوئے مظہر امام اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:
''لفاظ مفتیان تنقید ادب کے میدان میں دندناتے پھرتے ہیں، اور بے چارہ تخلیق کار ایک کونے میں کھڑا اپنی بے مائیگی کا ماتم کرتا رہتا ہے۔ گزشتہ پندرہ بیس سال کے دوران تخلیقی فن کاروں کو جتنا نقصان تنقید نگاروں سے پہنچا ہے اتنا نہ سماج سے پہنچا ہے، نہ حکومت وقت سے اور نہ کسی تنظیم کے احتساب سے۔''

مظہر امام اردو ادب میں نئی لہر کے خواہاں تھے اسی لئے اپنے تنقیدی نظریات سے احتجاجی لہر کو نمایاں کرتے تھے۔ ان کی تنقید نگاری پر ڈاکٹر امام اعظم نے منجملہ رائے اس طرح پیش کی ہے:
''مظہر امام کی تنقید کو ہم Inductive method of criticism کہہ سکتے ہیں جسے اردو میں آزاد سائنٹفک طرز کی تنقید کہا جا سکتا ہے۔ اس تنقید میں پہلے سے کسی اصول یا نظریے کی بنیاد نہیں ہوتی فن پارے کے مخصوص پہلوؤں کے تجزیے اور تشریح کے ذریعہ اس کی خصوصیت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس تنقیدی طرز میں تنقید نگار کسی مخصوص تخلیق کی جمالیات سے متاثر ہوتا ہے اور اسی طرح کی معیاری تخلیق سے اس کا موازنہ کرتا ہے اور فن پارے میں پوشیدہ تجربات کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس عمل سے تنقید نگار فن پارے کے حسن کو محسوس کرتا ہے اور اسے ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ مگر کہیں کہیں مظہر امام Impressionistic یعنی تاثراتی تنقید نگار کے طور پر نظر آتے ہیں۔''

مظہر امام کی تنقید کی ایسی ہی جمالیات سے خوشہ چینی کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ میں اپنی لائبریری میں پرانے اخبار ورسائل الٹ پلٹ رہا تھا کہ جنوری ۱۹۸۳ء کے ''خبرنامہ'' مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ پر نظر ٹھہر گئی۔ صفحہ ۱۸ پر درج تحریر اپنی طرف توجہ کھینچتی ہے:
''مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مضمون نویسی کا جو مقابلہ طلبا کے درمیان کرایا تھا اس میں کالج و یونیورسٹی کی سطح پر محترمہ تحسین اختر کا مضمون ''پرویز شاہدی اور ان کا فن'' پہلے انعام کا مستحق قرار پایا تھا اور اس

کا اعلان اخبارات میں شائع کرایا گیا تھا۔ مضمون کی اشاعت بھی اکاڈمی کے خبر نامہ میں کر دی گئی تھی۔
بعد میں کئی شکایتیں موصول ہوئیں کہ محترمہ تحسین اختر کا مضمون طبع زاد نہ تھا بلکہ مختلف مضامین سے اقتباس لیا ہوا تھا۔ تحقیق کے بعد یہ شکایت درست ثابت ہوئی تھی اور ہمیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑی اور افسوس کے ساتھ محترمہ تحسین اختر کے حق میں اعلان شدہ اعلان باطل کرنا پڑا۔ نظر ثانی شدہ فیصلے کے مطابق مندرجہ ذیل طلبا انعام کے مستحق قرار دیئے گئے:

جناب اکبر حسین اکبر (اول) جناب شہنواز شبلی (دوئم) جناب ظریف قاسمی واشرف احمد (سوئم)''

''خبر نامہ'' کے اسی شمارہ میں صفحہ ۴۵ سے صفحہ ۴۸ تک اکبر حسین اکبر کا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مظہر امام کا مشہور زمانہ مضمون ''پرویز شاہدی ناقدوں کے مقتول'' یاد آ گیا۔ پہلے پہل مظہر امام کا یہ مضمون جنوری ۱۹۶۹ء میں ماہنامہ ''مریخ'' پٹنہ کے ''پرویز شاہدی نمبر'' میں چھپا تھا۔ اس کے بعد مختلف اخبار ورسائل میں یہ مضمون شائع ہوا اور سب سے آخر میں ان کے مقالات کے مجموعہ ''آتی جاتی لہریں'' مطبوعہ ۱۹۸۱ء (صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۴) میں شامل ہوا۔

یہاں میں دونوں مضامین سے چند اقتباس پیش کر رہا ہوں کہ اول انعام پانے والا یہ مضمون بھی چوری کا ہے۔ آج طالب علم کتنے سہل پسند ہو گئے ہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اکاڈمی کے سکریٹری ہر الزام سے بری ہیں کہ انہوں نے انعامی کمیٹی کے ممبران سے مضمون کی جانچ کرائی ہوگی۔ ممکن ہے کمیٹی کے ممبران کی نظر سے مظہر امام کا مضمون نہیں گزرا ہو یا کنبہ پروری اور اقربا پروری کو راہ دی گئی ہو لیکن اس کی گنجائش کم نظر آتی ہے کیونکہ تحسین اختر کی مثال سامنے تھی۔ بہر حال مظہر امام کے مضمون پر اکبر حسین اکبر کی ڈاکہ زنی ملاحظہ ہو۔ مظہر امام کے تین پیراگراف دیکھئے:

''موضوع اور مواد سے قطع نظر پرویز شاہدی کے یہاں فنکارانہ محاسن اتنے ہیں کہ اس وقت کے کسی ترقی پسند شاعر کے یہاں شاید ہی اس حد تک موجود ہوں۔ انہوں نے ایک ماہر صناع کی طرح الفاظ کے پیکر تراشے ہیں۔ ان کے یہاں خوبصورت اور نادرہ کار ترکیبیں، ٹکڑے اور مصرعے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کی مختصر فہرست پیش کرنا بھی یہاں مشکل ہے۔ کچھ نظموں اور غزلوں سے یہ چند نمونے ملاحظہ کیجئے: حشمت پناہ، سبک دستیٔ تاجداری، ذہن شب گزیدہ، ترانہ ساز خیال، نشاط رفاقت، غیرت تشنہ کامی، غرور سجدہ ریزی، مرگ زاعقیدے، نفس صبح دشمن، غلام جام زریں، تضاد روبہ شدت، برف ہوش تمدن، منجمد تہذیب، تمازت دل انساں، روایتوں کی یہ روح شام یخ بستہ، ژالہ بار تخیل، فردکی واہمہ آلودگی، ردائے شرم میں لپٹی ہوئی عروس بہار، سرخوشیٔ موسم شبنم چکاں وغیرہ۔ اس طرح کی شاعرانہ صناعیوں سے پرویز شاہدی کا کلام بھرا پڑا ہے۔ ان کی صناعی اور قادر الکلامی کا سب سے بہتر نمونہ ان کی نظم ''تضاد'' ہے۔ ایک چابک دست مشاطہ کی طرح انہوں نے اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ لفظی و معنوی التزام، ظاہری آرائش اور صحت فن کے باب میں جوش کے علاوہ اس دور کا شاید ہی کوئی شاعر ان کا حریف ہو سکے۔ ''تثلیث حیات'' پرویز شاہدی کی شاعری کے دوسرے موڑ کا واضح اشاریہ ہے۔ یہ نظم انہوں نے ۱۹۵۶ء میں اپنی بچی کی ولادت پر کہی تھی۔ یہاں سے ان کی شاعری میں ایک نوع کا سوز و

گداز پیدا ہوا، جس نے انہیں زیادہ پرتاثیر اور حقیقی شاعری کی طرف راغب کیا۔ اب وہ اپنے اندر اتر کر اپنے مقدس محسوسات کو شعری جامہ پہنانے کی کوشش کرنے لگے۔ ۶۲-۱۹۶۱ء تک انہوں نے براہ راست شاعری کے بدلے بالواسطہ علامتی انداز شاعری اختیار کیا جو ان کے فعال ذہن پر ہی نہیں ان کے بدلے ہوئے شعری مزاج پر بھی دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں مجھے لکھا تھا۔"

درج بالا اقتباس مظہر امام کے مضمون سے ہے۔ اب اکبر حسین اکبر کے مضمون سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"پرویز شاہدی کے یہاں موضوع اور بلند پروازی کے ساتھ ان کا فن بھی اپنی عظمت کی سطح کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے فن کے سلسلے میں بلا جھجک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں فنکارانہ محاسن اس قدر عروج پر ہیں کہ شاید کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی وہاں تک ممکن ہو۔ انہوں نے ایسی صناعی کے ساتھ الفاظ سے پیکر تراشے ہیں کہ نگاہیں حیرت واستعجاب میں ڈوبی جاتی ہیں۔ ان کی ترکیبیں اور تشبیہیں کچھ ایسی نادرہ کار ہوتی ہیں کہ شعور و جوانی کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ چند خوبصورت ترکیبیں بطور مثال: ژالہ بار تخیل، ذہن شب گزیدہ، خرد کی واہمہ آلودگی، تضاد روبہ شدت، برف پوش تمدن، ترانۂ ساز خیال، سبک دستی، تاجداری، لطافت احساس کا کفن، سازش تیرنیم شبی، سرخوشی موسم شبنم چکاں، مرگ زاعقیدے وغیرہ جیسی خوبصورت تراکیب اور لفظی صناعیوں سے پرویز کی تقریباً پوری شاعری بھری پڑی ہے۔ پرویز شاہدی کی نظم "تضاد" ان کی شاعرانہ صناعیوں کا بہترین نمونہ کہلانے کی مستحق ہے۔ پرویز کی یہ فنکارانہ چابک دستی، فکری التزام اور یہ الفاظ کی آرائش و زیبائش قابل قدر ہے۔ صحت فن کے باب میں جوش کے علاوہ اس دور کا شاید ہی کوئی شاعر ان کا مد مقابل ہو۔ ۱۹۵۶ء میں بچی کی ولادت پر نظم "تثلیث حیات" کی تخلیق اس بات کی کا بھی اشارہ ہے کہ پرویز خود اپنی ذات کی تہوں میں اتر کر مقدس محسوسات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس دور میں مظہر امام کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔"

اکبر کا پورا مضمون مظہر امام کے مضمون کی نقل ہے۔ یہاں تک مضمون کے اندر اشعار بھی وہی ہیں جو مظہر امام کے مضمون میں ہیں۔

اکبر تو خیر طالب علم تھے لیکن جموں یونیورسٹی سے وابستہ شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر تہمینہ اختر کی کتاب "علی عباس حسینی: حیات اور ادبی کارنامے" ادارہ فکر جدید، نئی دہلی سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے مظہر امام کی کتاب "آتی جاتی لہریں" مطبوعہ ۱۹۸۱ء سے صفحہ کا صفحہ لے لیا ہے اور حوالہ تک نہیں دیا ہے۔ مظہر امام کے مضمون "علی عباس حسینی کا اولین افسانہ" سے ہو بہو نقل کر کے اپنی کتاب کو ضخیم بنایا ہے۔ "آتی جاتی لہریں" کے صفحہ ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹ اور ۱۸۰ سے ہو بہو نقل ہے۔ تہمینہ کی کتاب "علی عباس حسینی: شخصیت اور فن" کے صفحہ ۶۶ کا آخری پیراگراف اور صفحہ ۶۷ کا پورا صفحہ (آخری تین سطر کو چھوڑ کر) مظہر امام کی کتاب "آتی جاتی لہریں" کے صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱ اور ۱۸۴ سے ہو بہو لے لیا گیا ہے۔ تہمینہ کی کتاب کا صفحہ ۶۸، مظہر امام کی کتاب کے صفحہ ۱۵۸ کی نقل ہے۔ تہمینہ کی کتاب کے صفحہ

۷۰ کی آخری دو سطریں اور صفحہ ۷۱ کا پورا صفحہ اور صفحہ ۷۲ کی ابتدائی دس سطریں، کتاب ''آتی جاتی لہریں'' کے صفحہ ۱۸۳ اور ۱۸۴ سے ہو بہو نقل ہیں۔ تہمینہ کی کتاب کے صفحہ ۷۱ اور ۷۲ کی پوری تحریر ''آتی جاتی لہریں'' کے صفحہ ۱۸۸ اور ۱۸۹ سے لفظ بہ لفظ نقل ہے۔ تہمینہ کی کتاب کا صفحہ ۱۰۷ ''آتی جاتی لہریں'' کے صفحہ ۱۸۶ کی آخری ۱۱ سطروں اور صفحہ ۱۸۷ کی ابتدائی ۹ سطروں سے نقل ہے۔ ان کے علاوہ بھی تہمینہ نے مظہر امام کے بہت سے جملوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔

مظہر امام کی تنقیدی تحریر سے اپنی شناخت قائم کرنے والے اوران کے طریقۂ نقد سے خود ساختگی کی روش اپنانے والے خوشہ چیں اپنے اپنے خزانے بھرتے رہے ہیں۔

☆☆☆

کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور- 812001 (بہار)

● عامر سبحانی (ایڈیشنل چیف سکریٹری، محکمہ داخلہ، حکومت بہار) پٹنہ کی والدہ محترمہ کا ۱۵/اپریل ۲۰۲۰ء صبح پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ مرحومہ کی تدفین بعد نماز ظہر پٹنہ میں ہی کی گئی۔ مرحومہ ایک نیک سیرت اور پابند شریعت خاتون تھیں۔

……………………

● محترمہ بریرہ خاتون عرف گوری بی بی بنت جناب ابوالبرکات مرحوم (بلاس پور حیا گھاٹ، دربھنگہ) کا انتقال امریکہ میں ہندوستانی وقت کے مطابق ۱۷/اپریل ۲۰۲۰ء کی صبح ہوگیا۔ اللہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور پسماندگان میں خاوند ڈاکٹر محمد ظفیر الدین، تین بیٹے ڈاکٹر انور رشید، ڈاکٹر قیصر رشید، انجینئر سرور رشید اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحومہ تعلیم یافتہ، نیک سیرت فعال اور متحرک خاتون تھیں۔ شہر دربھنگہ میں تعلیم نسواں کے لئے جدوجہد کرتی رہیں۔ صغریٰ گرلز ہائی اسکول کے قیام میں ان کا بھی اہم رول ہے۔

……………………

● حافظ عزیز الرحمٰن رحمانی (خلف محمد تسلیم، مقام اصلی کھیری بانکا، ضلع مدھوبنی عمر تقریباً 70 سال) کا طویل علالت کے بعد ۲۲/اپریل ۲۰۲۰ء کی صبح ۴ بج کر ۵۰/منٹ پر انتقال ہوگیا۔ اسی شب ۹/بجے ان کے آبائی گاؤں میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے رفیع احمد شکیل احمد اور کلیم احمد اور تین بیٹیاں نجمہ خاتون، جمشیدہ خاتون اور کلیمہ خاتون کے علاوہ پوتے پوتیاں اور نواسہ نواسیاں ہیں۔ اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ مرحوم حافظ صاحب تقریباً ۵۰/برس بھیرو پور، ویشالی کی جامع مسجد میں خطیب اور امام تھے۔ ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان کا ایک کتابچہ ''یادداشتیں ۱۹۵۲ء تا ۲۰۱۳ء'' شائع ہو چکا ہے جو فاروقی اورینٹل لائبریری، گنگوارہ، دربھنگہ میں موجود ہے۔

……………………

● مشکور حسن عرف مسّو مرحوم کی اہلیہ محترمہ عفت ناز افروزی (عمر تقریباً ۵۵/سال، بنت اعجاز حسن مرحوم، موضع علی نگر بنی پور، دربھنگہ) کا انتقال دوران علاج دہلی کے صفدر جنگ ہسپتال میں ۲۷/اپریل ۲۰۲۰ء کو ہوگیا۔ وہاں سے جسد خاکی بذریعہ ایمبولینس شاہین باغ لایا گیا اور ۲۸/اپریل کی صبح ۸/بجے شاہین باغ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جنازہ کی نماز ان کے پھوپھی زاد بھائی محمد حفظ الرحمٰن ربانی نے پڑھائی۔ پسماندگان میں ۵/بیٹے نادر، انجم، عنبر، رہبر، خوشتر اور ۴/بیٹیاں ہیں۔ ان کی والدہ اور اکلوتا بھائی طفیل احمد مدھوبنی میں ہیں۔ ایک بیٹا انجم انقلابی جھارکھنڈ میں ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مجتبیٰ حسین: یادیں باتیں

مجتبیٰ حسین کے قلم کی چلت پھرت میں جتنی توانائی تھی اتنی ہی دلبرائی ان کی شخصیت میں تھی۔ مجتبیٰ حسین سے میری پہلی ملاقات 1975ء میں پٹنہ میں ہوئی تھی۔ غالباً شفیع مشہدی کی کتاب کا اجرا تھا۔ پٹنہ کے بیشتر شاعر وادیب مجتبیٰ صاحب کو دیکھنے اور ملنے کے لئے موجود تھے۔ مجتبیٰ صاحب نے اپنا کوئی طنزیہ سنایا تھا۔ ان کے سنانے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے اور دوسروں کو بھی مشاعرہ سے زیادہ مزہ آیا تھا۔ یہ قطرۂ تخلیقیت ہی تھی جس کی بار آوری میں ہم نے سرشاری محسوس کی تھی۔ مجتبیٰ صاحب کا ورقۂ تحمید بے حد تاثر انگیز، بت شکن، تخلیقیت آفریں اور وجود و عرفان شناس تھا۔ ان کی تحریر اور پڑھنے کے انداز نے انہیں ہماری نظر میں جمالیاتی اور اقداری منبعِ نور کا تخلیقیت گزار بنا دیا تھا۔

پروگرام کے اختتام پر مجتبیٰ حسین نے خواہش ظاہر کی کہ وہ قاضی عبدالودود صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ کسی نے ملانے کی حامی نہیں بھری کہ قبل سے وقت لینا ہوتا تھا۔ تبھی رضوان احمد نے کہا ''مناظر صاحب ملاقات کرا سکتے ہیں۔''

میں نے مجتبیٰ صاحب سے کہا کہ آپ جب چاہیں۔ کل ساڑھے دس بجے کا وقت طے ہوا۔ میں انہیں لے کر قاضی صاحب کے بڑے سے مکان پر پہنچا۔ نوکر مجھے پہچانتا تھا۔ میں نے اپنا نام لکھ کر دیا۔ قاضی صاحب نے فوراً اوپر بلا لیا۔

واپسی پر مجتبیٰ صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایم اے پٹنہ یونیورسٹی سے کرنے کے دوران میں قاضی صاحب کے گھر اتنی بار گیا ہوں کہ اجنبیت ختم ہو گئی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ 1976ء میں پٹنہ شہر میں رضا نقوی واہی نے جشنِ ظرافت منعقد کیا جس میں ہندوستان کے بیشتر طنز و مزاح نگار شریک ہوئے تھے۔ ان دنوں میں بھی طنزیہ مضامین رسائل میں لکھ رہا تھا اس لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس جشن میں مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم سے میری قربت بڑھی اور ہم دوست بن گئے۔ یوسف ناظم نے بعد میں میری طنز و مزاح نگاری پر مضمون لکھا اور مجتبیٰ حسین نے اس دوستی کا بھرم اس طرح رکھا کہ میں جب بھی دہلی گیا اور میرا قیام مظہر امام کے یہاں ہوا تو مجتبیٰ حسین مجھ سے ملنے ضرور آتے تھے۔ یہ ملاقات رسمی نہیں ہوتی تھی بلکہ تین چار گھنٹے ہم ادب کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ ایک بار کی ملاقات میں انہوں نے جاپان میں اردو کے موضوع پر معلوماتی گفتگو کی تھی۔ ان کی گفتگو کو میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا۔ چند باتیں اس طرح ہیں:

> ''اوکاسا یونیورسٹی لائبریری میں مشرقی علوم سے متعلق کتابوں کی تعداد ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ شعبۂ اردو کے گریجویٹ طلبہ پہلے دو برسوں کے دوران ابتدائی اردو بات چیت اور انشا نگاری سیکھتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے سال میں زبان کے علاوہ ادبیات بھی پڑھتے ہیں۔ ساتھ ہی انٹرنیٹ سے بھی خاطر خواہ استفادہ کرتے ہیں اور اردو کے حوالے سے مختلف ویب سائٹ کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں اردو شاعری کی بیس اصناف پڑھائی جاتی ہیں:

قصیدہ، غزل، مثنوی، نظم، مرثیہ، رباعی، قطعہ، ریختی، بارہ ماسہ، زٹل گوئی، واسوخت، شہر آشوب، ہجو، پیروڈی، گیت، سانٹ، دوہا، تضمین اور ہائیکو۔

اور اردو نثر کی درج ذیل اصناف سے متعارف کرایا جاتا ہے:

تمثیل نگاری، داستان، ناول افسانہ، انشائیہ، ڈراما، تذکرہ نگاری، تنقید، تحقیق، سوانح نگاری، آپ بیتی، خاکہ نگاری، خطوط نگاری، رپورتاژ اور مضمون نگاری۔

اس طرح ذوقِ ادب کی آبیاری کی جاتی ہے اور اردو کی محبت کا بیج دلوں میں بویا جاتا ہے۔''

مجتبیٰ حسین پڑھتے بہت تھے اور برملا اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔ ایک بار کی گفتگو سے سرسید احمد خان کی خوبیوں اور ان کے عملی اقدام کا ہم ذکر کر رہے تھے۔ تبھی مجتبیٰ حسین نے کہا کہ سرسید کے مدمقابل ہم ایک اور شخصیت کو رکھ سکتے ہیں۔ میں نے اور مظہر امام نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ تب انہوں نے مسکرا کر بتایا کہ لاہور میں ایک مستشرق ان ہی خطوط پر کام کر رہا تھا جو سرسید کا مقصد تھا۔ جدید علوم سے بہرہ ور کرنے والی اس شخصیت کا نام گوٹلیب ولہلم لائٹز تھا۔ اس نے 1864ء میں پنجاب کے گورنمنٹ کالج (لاہور) کے پرنسپل کا چارج سنبھالا تھا۔ اس کی پیدائش 1840ء میں بوڈامیسٹ میں ہوئی تھی۔ تعلیم کے دوران اسلامی معاشرے، طریق تعلیم اور تہذیب وتمدن سے اس کی شناسائی ہوئی۔ بعد میں کنگز کالج، لندن میں بطور پروفیسر السنہ عربی مرکز کی خدمات انجام دیں۔ وہ اسلامی قانون بھی پڑھاتے تھے۔ 1864ء میں جب وہ لاہور آئے تو علمی تخم کاری کے لئے ہمہ گیر تحریک کا انہوں نے آغاز کیا۔ آزاد اور حالی کے انجمن پنجاب کا قیام 21/جنوری 1865ء کو لائٹز کے ہی مشورے سے عمل میں آیا تھا۔ وہ قدیم مشرقی علوم کا احیا چاہتا تھا۔ اس نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ایک پبلک لائبریری بھی قائم کی تھی اور ایک اورینٹل یونیورسٹی کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ 18 نومبر 1882ء کو پنجاب یونیورسٹی کی پہلی کانووکیشن میں ڈاکٹر لائٹز نے اپنی رپورٹ اردو میں پیش کی تھی۔ وہ مزید بہت کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن صحت کی خرابی کے باعث 1877ء میں انگلینڈ واپس چلے گئے۔

مجتبیٰ حسین دنیا گھومے ہوئے تھے اسی لئے ان کی معلومات میں وزن ہوتا تھا اور وہ ایک قلم کار کی حیثیت گفتگو کا معیار برقرار رکھتے تھے۔ ایک ملاقات میں بات امتیاز علی تاج پر آ کر رک گئی۔ مجتبیٰ حسین افسوس ظاہر کرنے لگے کہ امتیاز علی تاج کو بچوں کے مدیر اور کہانی کار کی حیثیت سے وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ مجتبیٰ صاحب جواز اور دلیل رکھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بچوں کا رسالہ ''پھول'' لاہور سے 1909ء میں جاری ہوا تھا۔ 1935ء میں مولوی ممتاز علی کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادہ امتیاز علی تاج اس کے نگراں مقرر ہوئے۔ بچوں کے ادب کو پروان چڑھانے میں اس رسالے نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ 'پیسہ لائبریری'' کا قیام بھی انہوں نے کہا تھا۔ ''پھول'' امتیاز علی تاج 1957ء تک باقاعدگی سے نکالتے رہے اور خود کہانیاں اور ڈرامے لکھتے رہے۔ 19 اپریل 1970ء کو دہشت گردوں نے انہیں قتل کر دیا تھا۔

مجتبیٰ حسین سے بہت سی یادیں اور باتیں وابستہ ہیں۔ ایک بار میں دہلی گیا تو مظہر امام صاحب نے بتایا کہ

اس بار مجتبیٰ حسین صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہوگی۔ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور ایک ہاتھ اور ایک پیر میں پلاسٹر لگا ہوا ہے۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ اگلی صبح دس گیارہ بجے مجتبیٰ صاحب سے ملنے جائیں گے۔ لیکن اسی شام مجتبیٰ صاحب ٹیکسی کر کے ملنے چلے آئے۔ پچھلی سیٹ پر وہ لیٹے ہوئے تھے۔ ڈرائیور، مظہر امام اور میں نے مل کر انہیں ٹیکسی سے اتارا اور کسی طرح کوارٹر کے اندر لانے میں کامیاب ہوئے۔ صوفہ پر لیٹنے کے بعد وہ بولے "یار مناظر، تم آئے ہوئے ہو۔ ملنا ہی تھا۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ایسی محبت دینے والی شخصیت اب کہاں؟

آج بھی غور کرتا ہوں تو ایسی ادبی شخصیت کے بطون میں جھانکنا ہی پڑتا ہے۔ صنف خاکہ نگاری اور طنز و مزاح نگاری میں مجتبیٰ حسین کی فعال شرکت، جاں نثاری کی حد تک رواداری اور مسلسل سرگرمی عمل میں ذہانت و فراست کی وجہ سے وہ اعلیٰ درجہ کے فن کار تھے۔

ازل سے حیات کے ذائقہ میں ردعمل جڑا رہا ہے۔ اثرات میں رنج و راحت اور غم و مسرت کی وابستگی رہی ہے۔ تہذیبی ڈھانچہ میں یہی عناصر کام کرتے رہے ہیں۔ جن سے ایک فنکار کا سابقہ پڑتا رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین حساس فنکار تھے۔ مثبت اور منفی تصادم کو جھیلتے اور دیکھتے رہے اور داخلی و خارجی زندگی کے مسلسل ٹکراؤ سے دوچار ہوتے رہے تھے، جنہیں خوشگوار بنانے کے لئے انہوں نے طنز و ظرافت اور خاکہ سے کام لیا ہے اور نشتریت کے وار سے سلیقے سے دوچار ہونا سکھلایا ہے۔ انہوں نے دلکش اور معنی خیز فضا کے لئے اظہار کا جو اسلوب اپنایا ہے اس میں مقصدیت ہے، افادیت ہے اور معنویت ہے۔ محتاط اور متوازن یکجائی ہے اور ارفع و اعلیٰ روحانی اور اخلاقی سچائیاں ہیں۔ بشری نفسیات ہے اور تخلیقی جسارت ہے۔ وہ اپنی بے پناہ تخلیقی قوت کے ذریعہ عصری تہذیبی زندگی اور عہد کے معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کی تعمیر و تفسیر متانت کے ساتھ کرتے تھے اور منفرد انداز پیش کش سے خاکہ اور طنزیات و مضحکات کی روایت کو نیا استحکام بخشتے تھے، جمالیاتی رفعت و عظمت عطا کرتے تھے اور برجستہ و بے تکلف تحریر کی پاکیزہ مثال قائم کرتے تھے۔ ان کی شوخی، جدت طرازی، شگفتگی طبع، برجستگی اور سلاست نے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ سرمائے اور خاکے کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔ وسعت اور نئی منزلت بخشی ہے۔ ان کے وضع کردہ کرداروں نے اور منتخب کردہ شخصیات نے زندگی کی گرمی اور سرگرمی کو نمایاں کیا ہے اور معاشرت کی متعدد خوبیاں اور کمزوریاں اجاگر کی ہیں۔

غور و فکر، تجربہ کی گہرائی، مخصوص فلسفیانی انداز اور لہجہ کی سنجیدگی نے مجتبیٰ حسین کے خاکے اور طنز و مزاح میں برجستگی اور بے ساختگی کی نئی فضا قائم کی ہے۔ ان کے فقرے بے حد نپے تلے ہوتے تھے اور تجزیہ، دلائل اور براہین کے آہنگ سے وضع ہوتے تھے جن میں معنوی تہیں ہوتی ہیں، نئے قالب کے دائرے ہوتے ہیں اور جدت و ندرت کا بہاؤ ہوتا ہے۔ گلبرگہ، حیدرآباد اور دلی کی تہذیب میں جذب ہونے کے بعد مجتبیٰ حسین کے طرز بیان میں جو روانی، سادگی، تصویر کشی، شوخی اور لطافت ملتی ہے ویسا سماں اردو کے بہت کم خاکہ نگار اور طنز و مزاح نگار کی تحریر میں آئینہ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین خاکے میں لطیف پیرایۂ بیان اپناتے ہیں اور حقائق حیات کی تلخیوں کو جذبہ واحساس کی لطیف کرنوں، اسلوبی ملاوٹوں کے برتاؤ سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ جن اصحاب کے خاکے انہوں نے لکھے ہیں ان کی صفائی میں وہ خود تحریر کرتے ہیں:

''میں نے یہ خاکے کسی کے حق میں یا خلاف بالکل نہیں لکھے۔ جس طرح دل ودماغ سے کسی شخصیت کو قبول کیا، اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کردیا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکے میں خاکہ نگار کا زاویۂ نگاہ بھی در آتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو وہ انجانے طور پر اپنا خاکہ لکھ ڈالتا ہے۔'' (آدمی نامہ:1985ء)

مجتبیٰ حسین زیر موضوع شخصیت کو اپنی نگاہ سے دیکھتے، سمجھتے اور پرکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی باریک بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کرشن چندر کے خاکہ سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ان کے (کرشن چندر کے) ایک ہاتھ پر انگریزی میں ان کا نام بڑے حرفوں میں گدا ہوا تھا: KRISHN CHANDER۔ میں نے ایک بار مذاق میں ان سے کہا تھا'' کرشن بھائی، یہ اپنے ہاتھ کو وزیٹنگ کارڈ کیوں بنا رکھا ہے۔ اور پھر یہ بتایئے کہ جب آپ کا ایک ہاتھ مطبوعہ ہے تو دوسرے ہاتھ کو کیوں غیر مطبوعہ رکھا ہے۔ اس پر بھی کچھ لکھئے۔ بلکہ اردو میں لکھئے۔ کیوں کہ آپ تو اردو کے ادیب ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں اردو کو اس کا جائز مقام ملنا چاہئے۔''

میری بات سن کر پہلے تو زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر گمبھیر ہو کر بولے'' ہاتھ میں انگریزی میں نام لکھا ہو تو کیا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ تو اردو لکھتا ہے۔'' اردو کے معاملے میں وہ فوراً گمبھیر ہو جایا کرتے تھے۔

مجتبیٰ حسین نے خاکہ نگاری میں مزاح اور سنجیدگی کے امتزاج سے جو توازن قائم کیا ہے اور اردو والوں کو جو نیا اسٹائل دیا ہے یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ سجاد ظہیر کے خاکہ میں ان کی مسکراہٹ کا ذکر دیکھئے:

''بنّے بھائی کی مسکراہٹ کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بے شمار پہلو تھے۔ اور بے شمار رنگ تھے۔ ایسا تنوع تھا کہ ہر بار ان کی مسکراہٹ پچھلی مسکراہٹوں سے الگ معلوم ہوتی تھی۔ کبھی یہ مسکراہٹ معصومیت کا لباس پہن لیتی، کبھی یہ سراسر شفقت بن جاتی، کبھی محبت، کبھی حوصلہ، کبھی نرمی، کبھی شائستگی، کبھی عقیدہ، کبھی طنز اور کبھی کبھی تو یہ مسکراہٹ سراسر درد وکرب کا روپ دھارن کر لیتی تھی۔''

مخدوم محی الدین کے خاکہ میں ان کی شگفتہ مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین یہ انکشاف کرتے ہیں:

''مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا مذاق آپ اڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل پہنچ کر بیرے سے پوچھا:

''نہاری ہے؟''

''نہیں ہے۔'' بیرا بولا۔

''آملیٹ ہے؟'' مخدوم نے پوچھا۔

''نہیں ہے۔'' بیرا بولا۔

''کھانے کے لئے کچھ ہے؟''

''اس وقت کچھ بھی نہیں ہے۔'' بیرے نے کہا۔

اس پر مخدوم صاحب بولے: ''یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

فقرہ بازی اور فقرہ طرازی سے انداز نگارش کو آراستہ کرنے کا ہنر مجتبیٰ حسین کو خوب آتا ہے۔ پختگی تحریر، شادابیٔ اسلوب اور شگفتگیٔ خیال سے عبارت آرائی ان کے خاکے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے خاکے میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو ملاحظہ کیجئے:

> ''بات یہ ہے کہ بیدی صاحب ہمیشہ جذبوں کی سرحد پر رہتے ہیں۔ اور سکنڈوں میں سرحد کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر عبور کر لیتے ہیں۔ ان کی ذات ''جھٹپٹے کا وقت'' ہے۔ برسات کے موسم میں آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہوگا کہ ایک طرف تو ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اور دوسری طرف آسمان پر دُھلا دھلایا سورج چھما چھم چمک رہا ہے۔ اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تو سمجھئے کہ آپ اس منظر میں نہیں، بیدی صاحب کی شخصیت میں دور تک چلے گئے ہیں۔ ان کی ذات میں ہر دم سورج اسی طرح چمکتا ہے اور اسی طرح ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔''

مجتبیٰ حسین نے حیات انسانی کا مشاہدہ بہت قریب اور انہماک سے کیا ہے۔ مشاہدات کی باریکی ان میں ایک بڑا وصف ہے۔

مجتبیٰ حسین کا ہر رنگ شوخ اور گہرا ہے اور ہر پہلو انفرادیت رکھتا ہے۔ ان سے میری ملاقات پچیسیوں بار کی تھی۔ ہر ملاقات میں تنوع اور گونا گونی کا عکس ضرور ملتا تھا۔ ان کی موجودگی میں دو ایک لطیفے بھی ہوئے جس کی دلچسپی سے انکار نہیں کیا جا سکتا:

بانکی پور کلب، پٹنہ میں مجتبیٰ حسین، قمر رئیس، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شگوفہ کے مدیر مصطفیٰ کمال، مسرور جمال اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سہیل عظیم آبادی گفتگو میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ مجتبیٰ حسین نے شکیلہ اختر کو اشارہ کیا کہ سہیل صاحب سو رہے ہیں۔ شکیلہ اختر نے سہیل صاحب کو مخاطب کر کے کہا ''آپ بہت سوتے ہیں۔''

''سوتا نہیں ہوں بلکہ سنی مسلمان ہوں، اس لئے صرف سنتا ہوں۔'' سہیل عظیم آبادی نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

مشہور محقق قاضی عبدالودود کے یہاں مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، قاضی مسعود احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو ابوالکلام آزاد پر ہونے لگی تو قاضی صاحب نے بتایا ''ایک بار، ایک ڈنر میں ذاکر حسین بھی موجود تھے۔ کسی نے کھانے کے دوران کہا کہ آزاد فرانسیسی بھی جانتے تھے۔''

''جی ہاں، فرانسیسی سے واقف تھے۔'' ذاکر حسین نے برجستہ جواب دیا۔ ''لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے۔''

مجتبیٰ حسین سے میری آخری ملاقات حیدرآباد میں ان کے فلیٹ میں ہوئی۔ میں کسی پروگرام میں حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ اور ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں علیم صبا نویدی بھی آگئے۔ پروگرام کے اگلے دن میں نے علیم صبا سے کہا کہ مجتبیٰ حسین صاحب سے ملنا ہے۔ وہ رہنمائی کے لئے تیار ہو گئے اور بغیر اطلاع کے ہم ان کے یہاں پہنچ گئے۔ مجتبیٰ صاحب نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہو گئے۔ بہت دیر تک لپٹائے رہے۔ کئی گھنٹے ہم وہاں بیٹھے۔ کھانا کھایا اور فوٹوگرافی بھی ہوئی۔ باتیں ہوئیں تو حیدرآباد کا بھی ذکر آیا۔ وہاں کے احباب سے وہ ملول تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ''سیاست'' میں کالم لکھتے تھے لیکن یکا یک بلاوجہ بتائے ان سے کہا گیا کہ ان کا کالم بند کیا جارہا ہے۔ مصطفیٰ کمال ان کے بہت اچھے دوست تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے لئے ان دونوں نے مل کر کام کیا تھا اور ''شگوفہ'' کی آبیاری میں ان کا بڑا ہاتھ ہے لیکن اب مصطفیٰ کمال ان کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتے۔ دیگر احباب نے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

میں ان سے ملنے خوشی خوشی گیا تھا لیکن لوٹتے وقت اداس تھا۔ تعلقات کی تہہ داری اور رشتہ کی خودداری کی اہمیت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو تنہائی میں ماضی کو آئینہ بناتا ہو اور مخصوص زاویۂ نگاہ سے صورت گری کرتا ہو۔

☆☆☆

کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور-812001 (بہار)

● محترمہ **زرینہ خاتون عرف منی بی بی** (شہر دربھنگہ کے ممتاز سرجن اور معروف ملّی وسماجی شخصیت ڈاکٹر عبدالوہاب کی اہلیہ عمر تقریباً ۸۴؍سال، حال مقیم: محلہ رحم خاں، بنت مرحوم عبدالودود ایڈوکیٹ، بندھ پورہ، کٹرا، مظفرپور) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۳؍مئی ۲۰۲۰ء کو دن ۱؍بجے سٹی ہسپتال میں ہوگیا۔ اسی روز بعد نمازِ عصر ان کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے ڈاکٹر احمد نسیم آرزو، احمد شمیم تمنا، ڈاکٹر احمد نعیم آفاق اور ۵؍بیٹیاں ڈاکٹر نزہت پروین و دیگر ہیں۔ مرحومہ نیک اور غریب پرور خاتون تھیں۔ دربھنگہ میں خواتین بیداری اور تعلیم نسواں کی ابتدائی کوششوں میں ان کا بھی تعاون رہا ہے۔

....

● اردو کے معروف ادیب و ناقد پروفیسر خواجہ محمد اکرام شعبہ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کی **والدہ محترمہ** کا ۳؍مئی ۲۰۲۰ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحومہ کی عمر تقریباً سو سال تھی۔ مرحومہ نیک اور شریعت کی پابند خاتون تھیں۔

....

● جناب **شاہ نور کریم اختر عرف منّے** (ریٹائرڈ ڈپٹی منسٹریٹیو افسر ایل سی لہریاسرائے عمر تقریباً ۷۴؍سال خلف شاہ اختر حسین توکلی سید صاحب مرحوم وطن نام نگر فرداہا، ہائش محلہ چک رحمت، دربھنگہ) کا طویل علالت کے بعد ۷؍مئی ۲۰۲۰ء بوقت ۱۱؍بجے شب سٹی اسپتال ملان چوک جاتے ہوئے انتقال ہوگیا۔ جسد خاکی ان کے آبائی گاؤں فرداہا لے جایا گیا جہاں اگلے روز ۸؍بجے صبح تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۳؍بیٹے اور ۲؍بیٹیاں ہیں۔ مرحوم نہایت نیک اور شریف النفس انسان تھے اور ڈاکٹر سہیل اختر، سابق استاد شعبہ اردو ایل ایس ایم کالج دربھنگہ کے بڑے بھائی اور پروفیسر رئیس انور صاحب کے سمدھی تھے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

شاکر خلیق کے منطقی بیانیہ میں کئی پہلو

پروفیسر شاکر خلیق محبت کے آدمی ہیں لیکن وہ تخلیق کار بھی ہیں، زندگی اور ادب کی تصویر کشی کرنا جانتے ہیں۔ تمناؤں کو دامن گیر رکھتے ہیں۔ خوابوں کی تعبیر کے تعاقب میں رہتے ہیں اور نیا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی ازلی صداقت کی مشابہت اور افلاطونیت بھی ہم رشتہ نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا پہلو ہے۔

لیکن میری نظر میں وہ شاعر ہیں اور تنقید نگار بھی ہیں۔ جہاں تک تنقید کی بات ہے بکھرے اور سمٹے ہوئے رنگوں کو آئینۂ صفتی عطا کرتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے ماقبل اور عصری صداقت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ خاص کر وجود کی Reliability کی قدر فکری پیانے سے معتبر ہوتی ہے۔ ان کے ایسے مضامین کے چند عنوان اس طرح ہیں: ’’سر سید احمد خاں: پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے چشم دید گواہ‘‘، ’’مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نابغۂ عصر‘‘، ’’مولانا سید نظام الدین اور مدرسیہ امدادیہ‘‘، ’’علی محمود کی افسانہ نگاری‘‘، ’’لطیف بود حکایت دراز تر گفتم‘‘، ’’مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی لسانی پالیسیاں اور اردو‘‘، ’’متھلانچل میں قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی‘‘، ’’بہار کے تین قاسم‘‘، ’’پریم چند کے ایک معتبر ہم عصر: حیات اللہ انصاری‘‘، ’’سہیل عظیم آبادی: یادوں کے آئینے میں‘‘، ’’وہاب اشرفی: شخصیت کے چند منفی پہلو‘‘، ’’تعلیم نسواں کے مختلف پہلو‘‘، ’’سہرے کی عظمت وادبی معنویت‘‘، ’’فلم انڈسٹری کے فروغ میں اردو کا حصہ‘‘ فاطمی رپورٹ: سمت ورفتار‘‘، ’’تمہید: حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل‘‘، ’’ڈاکٹر ظہیر ناشاد کا تحقیقی مقالہ‘‘، ’’عین العروض: ایک تاثر‘‘، ’’وہ پرانی قدروں کے مظہر اور نئی قدروں کے امام تھے‘‘، ’’ادب و زندگی‘‘ وغیرہ متنوع مضامین نمایاں خوبی اور وصف لئے ہوئے ہیں۔ سانس لیتی ہوئی نمایاں حرمت کو شاکر خلیق نے رچاؤ بخشا ہے اور ناقدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے موضوعات کے نئے Ideas تک رسائی حاصل کی ہے۔ شخصیت اور فن پر نگاہ ڈال کر بطون سے موتی نکالنے کی خیال افروزی دیکھئے:

> ’’سر سید نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ قوم کو میدان کار میں اترنے کے لئے نہ صرف اکسایا بلکہ ملک کے اندر اپنی خامیوں کی اصلاح وتدارک کا جذبہ پیدا کیا تو دوسری طرف صبر واستقامت، راست بازی، خود شناسی وخود اعتمادی پیدا کر کے اس میں زندگی کی رمق، حرکت اور حرارت پیدا کی۔ سر سید احمد کی یہ تحریریں پہلی جنگ آزادی میں اردو کے کردار کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔‘‘

معروف شاعر اور ملت کالج دربھنگہ کے پرنسپل اجتبیٰ رضوی کی عملی زندگی، ان کی خوبیوں اور ان کی فلسفیانہ شاعری کے بارے میں شاکر خلیق لکھتے ہیں:

> ’’آج ملکی سطح پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی بڑی بڑی باتیں پروپیگنڈہ کے طور پر کی جاتی ہیں۔ اجتبیٰ صاحب بالکل غیر سیاسی آدمی تھے۔ ادب اور فلسفہ کی زلفوں کو سنوارنے میں انہوں نے اپنی ساری زندگی صرف کردی۔ ان کی فلسفیانہ شاعری اپنے اندر تہہ در تہہ معنی رکھتی ہے۔ ان کے تبحر علمی کا پتہ لگانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ فکر وفلسفہ کے خوبصورت امتزاج سے ان کی

شاعری کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔ سادگی ان کے مزاج کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے ہر کام میں نفاست کا عنصر غالب تھا۔''

شاکر خلیق کے مضامین پڑھ کر خیال افروزی کی حد تک ان کے مطالعہ اور ان کی نظر کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ پھولوں کو سمیٹتے ہیں اور کانٹوں سے دامن بچاتے ہیں لیکن استدلال پیش کرتے وقت طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت تسلسل کو مجروح ہونے نہیں دیتے بلکہ اردگرد کے ماحول کو فنی چابک دستی عطا کرتے ہیں:

''مولانا آزاد اسم بامسمّیٰ تھے۔ آزادی فطرت انسان کا خاصہ ہے۔ غلامی ومحکومی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی راہ میں کوہ گراں ہے۔ مولانا آزاد نے آزادی وطن کی خاطر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی نہ صرف وکالت کی بلکہ اس پر تمام عمر گامزن رہے۔ آزادیٔ وطن کو مولانا دینی فریضہ کے حصول سے کم نہیں سمجھتے تھے...... بعد کے دنوں میں جب دو قومی نظریہ نے سر اٹھانا شروع کیا تو مولانا نہ صرف اس سے کبیدہ خاطر ہوئے بلکہ اس کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھا۔ وہ متحدہ قومی نظریہ کے زبردست حامی اور علمبردار تھے...... وطن آزاد ہوا مگر اس کے ساتھ ہی تقسیم ہند کی لعنت بھی رونما ہوگئی۔ ایک طرف تو ہم انگریزوں کی سازش کا شکار ہوئے دوسری طرف خود ہماری ناعاقبت اندیشی نے وہ کچوکے لگائے کہ وطن عزیز میں ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہ گئے۔''

تنقیدی مضمون ایک محدب عدسہ ہے جو تخلیق کی جزئیات کو ریزہ ریزہ صورت میں دکھاتا ہے اور درست حقائق اپنے تئیں دریافت کرتا ہے۔ شاکر خلیق اپنی تنقید میں تیکھی موجودگی کا بانکا اور نرالا احساس قائم رکھتے ہیں۔ مظہر امام کی شخصیت، تنقید اور شاعری پر لکھتے ہوئے انہوں نے خود کا حوالہ اس طرح پیش کیا ہے:

''مرحوم مظہر امام سے ہماری قرابت داری یوں ہے کہ ان کی بیگم محترمہ مبینہ امام بنت وصی احمد (مولانا محمد شفیع داؤدی کے چھوٹے بھائی) اور راقم حروف کی والدہ ماجدہ مرحومہ جن بی بی صفیہ خاتون بنت انوار احمد ساکن بھیرو پور، حاجی پور سگی خالہ زاد بہنیں تھیں۔ اس رشتہ سے مظہر امام ہمارے خالو تھے۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ ہمارے خاندان میں ایک ساتھ دو اموات ہوئیں۔ دہلی میں مظہر امام صاحب اور مظفر پور میں مولانا شفیع داؤدی کی منجھلی بہو سعد یہ فاطمہ زوجہ عطاء الرحمٰن داؤدی مرحوم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یعنی بڑے بھائی کی بہو اور چھوٹے بھائی کے داماد ایک ساتھ رخصت ہوئے۔ ۳۱ر جنوری بروز منگل ۲۰۱۲ء کو بعد نماز ظہر ہی دونوں مرحومین کی نماز جنازہ علی الترتیب میور وہار، دہلی اور مدرسہ جامع العلوم، مظفر پور میں ادا کی گئی۔''

شاکر خلیق کا ذہن منطقی، تربیت اخلاقی اور مزاج تمدنی ہے اسی لئے مشاہدے اور تجربے کو صریحاً نئے رخ سے پیش کرتے ہیں۔ وہ داخلی عمل کے متحمل ہیں اور لمحۂ موجود کو اختصاصی اور انتسابی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ساتھ ہی بعض مشورے بھی دیتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی پر لکھتے وقت انہوں نے بعض سوالات قائم کئے ہیں جس کی نشاندہی سے تلاش و جستجو کی سمت کا اندازہ لگانے میں یقیناً آسانی ہوگی:

''جہاں تک سہیل عظیم آبادی صاحب کے فن کا تعلق ہے تو صرف یہ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ وہ پریم چند اسکول کی آخری کڑی تھے۔ ہمیں اس بات کا تعین کرنا ہوگا کہ اردو افسانے کو تکنیکی اعتبار

سے سہیل صاحب نے کس حد تک برتا۔فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا۔اپنی کہانیوں کا مواد خام انہوں نے کس طرح حاصل کیا۔اپنی تخلیقات سے سماج کے کس طبقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ نظریاتی طور پر کس حد تک ترقی پسند تھے۔اپنے ناولوں اور افسانوں میں کس طرح کی زبان استعمال کی۔یہ چند بنیادی سوالات ایسے ہیں کہ ان پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔''

کھلی ادبی کائنات تازہ ہوا ہی نہیں،تازہ افکار بھی عطا کرتی ہے۔خیال بدلنے،ظاہر کو ٹٹولنے،چھپی ہوئی معنویت کو کھولنے اور نئی طرزِ ادا تخلیق کرنے کا گر بھی سکھاتی ہے۔شاکر خلیق ادبی کائنات کی گواہی بنتے ہیں اور معنی خیز ذوق تجسس سے کام لے کرنئی توجیح کا ردِعمل پیش کرتے ہوئے تلاش وجستجو کی جبلت کو اور ذوق آگہی کے ساتھ حصول و طلب کے فلسفہ کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

''تمام آسمانی کتابیں بہ شمول قرآن پاک اور حدیث نبویؐ و دیگر صحیفے ماحولیات کے ادراک اور فطرت سے مکمل ہم آہنگی کا نہ صرف درس دیتے ہیں بلکہ قوانین قدرت سے انحراف کو تمام ذی روح کے لئے سم قاتل قرار دیتے ہیں۔قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر چرند و پرند کا تذکرہ ملتا ہے۔چند سورتیں تو جانوروں کے نام سے بھی موسوم ہیں۔جیسے البقرہ (بچھڑا)،الفیل (ہاتھی)،النحل (شہد کی مکھی)،النمل (چیونٹی)،العنکبوت (مکڑی) وغیرہ۔دنیا کی قدیم و جدید زبانوں میں انسان کے اطوار و افعال، ساخت و پرداخت، اشکال و شبیہ کو اکثر جانوروں اور پیڑ پودوں سے تشبیہ دینے کا چلن رہا ہے۔ سنسکرت میں گج گامنی (مست ہاتھی جیسی چال)،مرگ نینی (ہرن جیسی آنکھ)،فارسی میں چشم غزالی، سرو قد،غنچہ دہن اور اسی طرح عربی میں بے شمار الفاظ و ترتیب کے ذریعہ انسان و حیوانات و طیور سے تشبیہات کی مثالیں ملتی ہیں۔''

تجسس،تشویش،مخفی مفہوم،مضطرب کیفیت اور تنوع کا احساس شاکر خلیق کی فکری و نظری چہل قدمی میں سلامت روی سے ملتا ہے۔تمدنی ماحول سے بھی کشف حاصل کرتے ہیں اور حکایت کی نوخیزی کو حوالہ بناتے ہیں۔مضمون ''ملت کالج میں ملا جان محمد کی آمد'' سے یہ اقتباس دیکھئے:

''ملا جان محمد کلکتہ کے ایک سربرآوردہ سماجی وملّی کارکن تھے۔بڑے اثر و رسوخ کے آدمی تھے۔سادہ لوح و سچے اور پکے مسلمان کی حیثیت سے ان کی ایک منفرد پہچان تھی۔ایک دن ہم لوگ کلاس کر رہے تھے تو ایک سیدھے سادے مسلمان کو کرتا پاجامہ پہنے ہاتھ میں ایک گٹھری لئے ہوئے رکشہ سے آتے دیکھا۔وہ اجنبی بغیر اپنا پروگرام بنائے ہوئے آیا تھا۔بعد میں معلوم ہوا کہ ملا جان محمد آئے ہوئے ہیں۔ملا صاحب کا نام میں ابا مرحوم (عبدالخالق خلیق) سے سن چکا تھا اور ان کے قیام کلکتہ کے زمانے میں دونوں کے درمیان گہرے مراسم تھے۔تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ پرنسپل اجتبیٰ صاحب ان کو ساتھ لے کر کالج کے گرد گھوم رہے ہیں اور اس کی خستہ حالی کا نظارہ کرا رہے ہیں۔''

شاکر خلیق کے منطقی بیانیہ اسلوب میں سنجیدہ اٹکھیلیاں ملتی ہیں۔جس سے مرنجا مرنج تحریری گفتگو سامنے آتی ہے۔

☆☆☆

کوہسار، بھیکن پور-3، بھاگلپور-812001 (بہار)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

محمد گوہر کے اداریے میں چیرہ دستی اور چکا چوند

اُردو میں ڈاکٹر محمد گوہر جیسے وجیہہ، باوقار، متین، تعلیم یافتہ اور دنیا گھومنے والے صحافی نہیں ہیں۔ وہ دانا و بینا ہونے کا ثبوت دیتے رہے ہیں اور اجتماع و انبوہ میں ایکتا کو تلاش کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد گوہر کو سائنس سے شغف رہا ہے اور ڈگریاں حاصل کرنے کے شوق میں الگ الگ یونیورسیٹیوں میں امکانات ڈھونڈتے رہے ہیں۔ ریاضی میں بی ایس سی، ایم ایس سی، ایم بی اے، ایم سی اے، ایم ایس سی آئی ٹی، بی ایڈ، ایم اے ان ایجوکیشن، ایم ٹیک ان کمپیوٹر سائنس اور ماسٹر آف آرٹس جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری انہوں نے حاصل کی ہے۔ یہ عرفانی لمحات تھے جو صدیوں میں حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر محمد گوہر نے تنوع، شدت اور تندی کو بادِ بہاری کا لطیف جھونکا بنا کر اپنے اردگرد لپیٹ لیا ہے تا کہ پہچان اور شناخت کی اساس استوار ہو سکے اور خودشناسی کے برق کے ید بیضا سے منور انکشاف ان کے توسط سے سامنے آ سکے۔

انسان کے لئے عرفان ذات کا سفر طویل اور کٹھن ضرور ہے لیکن شعور ذات سے کام لے کر ڈاکٹر محمد گوہر جیسی شخصیت کائناتی مساوات کا کردار بن کر نمودار ہوتی ہے اور انفرادیت کو جنم دیتی ہے۔

اندیشہ ہائے دور دراز کو سامنے رکھ کر علم اور جانکاری کے حصول کے لئے محمد گوہر نے امریکہ، انگلینڈ، دبئ، مصر، سنگاپور، ملیشیا، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، چین، جنوبی افریقہ، مکاؤ، سری لنکا، مالدیپ، فرانس، نیدرلینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ، آسٹریا، اٹلی، آسٹریلیا وغیرہ ممالک کے سفر کے بعد خود کو وحدت افکار کا حامل بنالیا ہے۔ شاید ان کے نظام فکر سے اردو والوں کو فائدہ پہنچنا تھا اسی لئے انہوں نے روزنامہ ''تاثیر'' نکالا جو دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ شہروں سے بیک وقت شائع ہو رہا ہے۔ جس کے ذریعہ سلیت کی دشمن طاقت کو قومی یک جہتی کا آئینہ دکھلاتے رہتے ہیں۔ نئی نسل کے ذہن کو ناجائز استحصال کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ کوتاہ اندیش عناصر کی زہرناکی کو اجاگر کرتے رہتے ہیں۔ غربت، ناداری اور بے روزگاری کی کسمپرسی کے ذمہ داروں تک برہنہ الفاظ سے اپنی آواز پہنچاتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ان رجحانات کے سدباب میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ جو علاقائی ذہنیت سے کھلواڑ کرنے اور قومی و ملی شعور کو دبانے کا سبب بنتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد گوہر ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ اسی لئے خود اداریہ لکھتے ہیں اور نا آشنا سیاست دانوں اور دانشوروں کی نوحہ کناں قبا کی پیوند کاری کرتے ہیں تا کہ نظریاتی اساس کے آبگینے کی معقولیت کے قائل اور معترف ہو سکیں۔ انہوں نے خود لکھا ہے:

> ''ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی اور درپیش مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان میں خطرے کی شہریت، مہاراشٹر کا نسلی تشدد، ۳ رطلاق بل التوا کا شکار، سسکتی قومی معیشت، سپریم کورٹ کا تنازعہ اور اس کا حل، لرزہ براندام سرکاریں، ٹوٹتا در کتا اتحاد، چیف جسٹس کا مواخذہ، کاس گنج کا اصل قصوروار کون؟، مایوس

کن بجٹ، ایک اور بینک گھوٹالہ، ہم کہاں جارہے ہیں، ہندوستانی کرکٹ کا نقصان، ایک اور مسلم پرسنل لاء بورڈ، انا کے آندولن کا انت، کون بگاڑ رہا ہے کھیل، سی بی ایس ای پیپر لیک، آصفہ کو انصاف کی امید، دلتوں کی منہ بھرائی، مایا کوڈنانی بھی بری، تاریخی لال قلعہ کا سودا، دین بچاؤ دیش بچاؤ کانفرنس، سپریم کورٹ کو سلام جیسے مضامین کافی اہم اور دورحاضر کے سلگتے ہوئے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔''

جذبات کی حقیقی ترجمانی کا فریضہ اداریہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد گوہر کے اداریے تاثیر و تاثر کے حوالے سے توانا اور فکر و خیال کی معنی خیزی سے مرصع ہوتے ہیں۔ ان کے بیشتر اداریے میں ملکی حالات کی ناسازگاری کا شکوہ ملتا ہے۔ وہ بہتری کے امکانات کے خواہاں ہیں لیکن زندگی کے طوفان کی انگڑائیاں انہیں بے چین کئے رہتی ہے اور وہ ردعمل کی چادر تان کر، سچائی کے متلاشی، منافقت آمیز رویے کی چادر کو پکڑنا چاہتے ہیں اور قلم کی سیاہی کو علامت بناتے ہیں:

''ملک میں نئی سرمایہ کاری کی رفتار تھم سی گئی ہے اور یہ گذشتہ چار برسوں کی سب سے نچلی سطح پر پہنچ گئی ہے۔ بینکوں کی ساکھ 63/سال کی کمترین سطح پر ہے۔ جبکہ روزگار گذشتہ 8 برسوں کے دوران سب سے نچلی سطح پر آ گئی ہے۔ مالی خسارہ بھی گذشتہ 5 برسوں کے دوران کافی تیز رفتاری سے بڑھا ہے۔ شرح ترقی میں کمی نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کے نتیجے میں آئی ہے۔ جس کے بارے میں حکومت کا یہ دعویٰ تھا کہ اس سے شرح ترقی میں تیزی آئے گی اور ملک کی معیشت مضبوط ہوگی۔ ساتھ ہی غیر ملکی سرمایہ کاروں کی اندرون ملک سرمایہ کاری میں دلچسپی بڑھنے سے بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوگا ...... نئے منصوبے اور ان کے لئے سرمایہ جٹانے یا روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے بجائے ساری توجہ ہندو کے فروغ اور ملک کے چپے چپے پر بھگوا پرچم لہرانے پر صرف کی جارہی ہے......''

آج ہر طرف کھیتوں میں اداس فصلیں اُگی ہوئی ہیں۔ یہ کھیت مسلمانوں کے ہیں، دلتوں کے ہیں، مزدوروں کے ہیں اور کمزور طبقے کے ہیں۔ دیار وحشت کے چمن میں کبھی کبھی گل و یاسمین مہکتے ہیں تو ڈاکٹر محمد گوہر جیسے صحافی اسے خوشبو کے ادارتی آنگن میں لے آتے ہیں:

''انسداد دہشت گردی دستہ اے ٹی ایس کے سربراہ اتل چندر کلکرنی نے مسلم نوجوانوں، خاص طور پر زیر تعلیم اور تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ براہ راست یا سوشل میڈیا کے ذریعہ مذہب کے نام پر کسی بھی قسم کے بہکاوے میں نہ آئیں۔ سوشل میڈیا کا استعمال بہت محتاط طریقہ سے کریں، سوشل میڈیا پر انجان لوگوں سے گفتگو کرنے یا دوستی کرنے سے بھی گریز کریں اور اگر کوئی اسلام کے نام پر انہیں بہکاتا ہے یا سبز باغ دکھاتا ہے تو انہیں چاہئے کہ اسلام کی صحیح معلومات کے لئے وہ معتبر علمائے کرام اور مقامی مسجدوں کے خطیب و امام سے رجوع کریں۔ اے ٹی ایس چیف کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انٹرنیٹ پر آپ سے کون مخاطب ہے یہ جاننا بھی آپ کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ تکنیکی انقلاب کے اس دور میں روبوٹ بھی انٹرنیٹ پر گفتگو کرسکتے ہیں۔ ایسے میں مسلم نوجوانوں کو ہر مشتبہ

شخص، کال، میسج، میل اور سرگرمی سے دور رہنا چاہئے۔ ان کا یہ مشورہ بھی قابل قدر ہے کہ مسلم نوجوانوں کو سرکاری ملازمت کے حصول کے لئے آنا چاہئے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی حصہ لینا چاہئے۔''

ہندوستان کی عدلیہ میں زرد موسم آ گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد گوہر نمو کی خواہش رکھتے ہیں تا کہ مآل کار ساعتیں نئے سانچے میں ڈھل کر باعث آزار نہ بن جائیں بلکہ مثبت طرز فکر اور تعمیری رجحانات کا پلڑا بھاری رہے۔ وہ راہ ہنر اور باب اثر پر ضرب کاری اس طرح کرتے ہیں:

''سپریم کورٹ کے 4 سب سے سینیئر ججوں نے جس طرح ملک کی سب سے بڑی عدالت میں سب کچھ ٹھیک نہ چلنے کا معاملہ اٹھاتے ہوئے عدالت عظمیٰ کا موجودہ صورت حال کو جمہوریت کے لئے خطرہ بتایا ہے۔ اس سے پورا ملک سکتے میں آ گیا ہے۔ حالانکہ ایک طبقہ جلد ہی دفاعی موڈ میں بھی آ گیا ہے اور اس معاملے کو عوام کی عدالت میں پیش کئے جانے اور اس پر اپوزیشن کی طرف سے معاملے کی تحقیقات کر کے حقائق سامنے لانے کے مطالبے کو سیاست سے متاثر بتانے سے بھی گریز نہیں کر رہا ہے...... وہ واقعیت پسند ہوتے تو اس بات پر دھیان ضرور دیتے کہ ججوں نے اپنی پریس کانفرنس میں ہی یہ بات صاف کر دی ہے کہ انہوں نے گذشتہ دو ماہ کے دوران سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو اپنی بات بتانے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اور جب ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تب انہیں پریس کانفرنس کا سہارا لینا پڑا تا کہ مستقبل میں کبھی ان کے طویل عدالتی کیریئر پر سوال نہ اٹھے اور کوئی یہ نہ کہے کہ انہوں نے اپنا ضمیر بیچ دیا تھا۔''

ڈاکٹر محمد گوہر اظہار مدعا کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ زندگی میں تحرک اور حرارت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے رجائیت کی وادی میں لوگوں کو لے جانا چاہتے ہیں تا کہ وسیع تر ذہنی افق سامنے آ سکے اور گوناگوں درپیش مسائل پر غور و فکر کی عادت سامنے آ سکے۔ اظہار کی نمائندگی کے لئے وہ اپنے اداریہ میں مؤثر الفاظ سے کام لیتے ہیں تا کہ درد خواہی کی منزل کو سمجھا سکے۔ اب حج سبسیڈی کو ہی لیں تو مرکزی حکومت نے یکا یک اسے ختم کر دی اور یہ کہا گیا کہ سپریم کورٹ کی ہدایت پر ایسا کیا گیا ہے۔ جبکہ عدالت کے فیصلہ میں کہا گیا تھا کہ مرحلہ وار طریقے سے 2022 تک ختم کیا جائے۔ متبادل میں سمندری جہاز کی بات کہی گئی تھی لیکن یہ انتظام بھی نہیں ہوا۔ محمد گوہر جائزہ لیتے ہوئے اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں:

''سبسیڈی ختم کرنے کا فیصلہ بیک وقت صحیح بھی ہے اور غلط بھی ہے۔ صحیح اس لئے ہے کہ مذہب اسلام میں کسی بھی مذہبی امر کی انجام دہی کے لئے چندہ، قرض، بھیک یا سبسیڈی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ حج سارے مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ صرف انہیں پر فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہیں...... اسی لئے مسلمانوں نے کبھی بھی سبسیڈی کا مطالبہ حکومت سے نہیں کیا۔ جب تک حجاج کرام سمندری جہاز سے حج کے لئے جایا کرتے تھے، یہی روایت قائم تھی مگر بعد میں جب سمندری جہاز سے سفر حج

کا سلسلہ بند ہوا اور بذریعہ طیارہ سفر حج کا آغاز ہوا تو حکومت نے اضافی رقم کی ادائیگی اپنی طرف سے کر کے حاجیوں کو راحت دینے کا فیصلہ کیا، جسے سفری رعایت مان لیا گیا۔ لیکن بعد میں یہ ظاہر ہوا کہ یہ رعایت حجاج کرام کو نہیں مل رہی ہے۔ بلکہ اس کا فائدہ ایئر انڈیا کو غلط طریقے سے پہنچایا جا رہا ہے اور اسے خسارے سے باہر نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

ملکی سیاست ہو، عالمی برتری کی کش مکش ہو، جوہری معاہدہ ہو، مجرموں کی حمایت ہو، اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہو، مذہب کی بنیاد پر شہریت دینے کی بات ہو، دین بچاؤ دیش بچاؤ کا نعرہ ہو، سی اے کا سیاہ باب ہو، سی بی ایس ای پیپر لیک کا معاملہ ہو، ٹوٹتا درکتا اتحاد ہو، ہندوستانی کرکٹ کا نقصان ہو، سری لنکا میں فساد ہو، کشمیر کا معاملہ ہو، ملک کے مستقبل پر نظر ہو، مصالحت یا خود سپردگی ہو یا پھر صرف وعدوں کی بہار ہو، ڈاکٹر محمد گوہر نے نگاہ شوخ سے منبع نظام پر انگلی رکھی ہے اور مختلف احساس کو مہمیز کیا ہے۔ ساتھ ہی ٹوٹتے بنتے رشتے کی سچائی کو اجاگر کیا ہے۔ آئینہ در آئینہ پھیلتے ہوئے عکس اور فکر و احساس کی کش مکش کو انہوں نے گھر گھر کی کہانی میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ایک اداریہ سے یہ اقتباس دیکھئے:

"کوئی بھی رشتہ ہو سمجھوتہ بہت ضروری ہے، شادی شدہ زندگی میں تو یہ سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر آپ کسی بات پر ساتھی سے متفق نہیں ہیں تو ٹھنڈے دماغ سے بھی مسئلہ پر بات چیت کریں۔ ہر کامیاب رشتے میں خیالات کا تبادلہ مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ کوئی بھی گھریلو مسئلہ ہو شوہر کو چاہئے کہ بیوی کو بتا دے اور بیوی کو چاہئے کہ شوہر کو آگاہ کر دے۔ اس سے آپس میں اعتماد بڑھے گا اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی ہمت بھی پیدا ہوگی۔ مشکلات کا سامنا کرنا سیکھیں۔ کیونکہ جب تک زندگی ہے مشکلات سے چھٹکارہ ممکن نہیں۔"

زندگی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے۔ اس کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے محمد گوہر جیسا سچا صحافی زندگی کی منزل کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی دور دور تک ویرانی اور درد کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یافت اور نایافت، حاصل اور لاحاصل، سراب اور حقیقت بھنور اور کنارہ جیسے سخت مقام آتے رہے ہیں لیکن وہ سمت درسمت رواں دواں ہیں اور ایک بیدار ذہن صحافی کی طرح سمت نما بنے ہوئے ہیں۔

اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کے قلمکاروں پر بھی اداریے لکھے ہیں اور نئی معنویت کی پرتیں کھولنے کی کوشش کی ہے۔ معصوم شرقی اسیر کی رحلت پر ان کے وصف کو بیان کرتے وقت سوچ کی غمازی اس طرح ملتی ہے:

"وہ 80 برس کے تھے اور گذشتہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ ان کی نماز جنازہ درگاہ شاہ ارزانی پٹنہ میں بعد نماز جمعہ ادا کی گئی اور تدفین شاہ گنج قبرستان میں ہوئی۔ معصوم شرقی اسیر 12 دسمبر 1937ء کو خانقاہ محلّہ بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام محمد ظہیر عالم تھا۔ لیکن بعد میں ان کا نام اور مسکن دونوں بدل گیا۔ وہ محمد ظہیر عالم سے معصوم شرقی اسیر بن گئے۔ اور عظیم آباد پٹنہ کو اس طرح اپنایا کہ موت کے بعد بھی پٹنہ سے تعلق قائم رہا کیونکہ وہ پٹنہ کی خاک میں ہی آسودہ ہوئے۔ وہ ایک اچھے

شاعر، حکیم، تحریک کار اور اردو کے سچے عاشق تھے۔ اردو کے فروغ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے......
ان کے دو شعری مجموعے "داغ مسکراتے ہیں" اور "شعلوں کے پھول" منظرِ عام پر آچکے ہیں لیکن ان کی شاعری کا قابل لحاظ حصہ اب بھی پٹنہ کے اردو اخباروں کی فائلوں میں دبا پڑا ہے۔ انہیں یکجا کر کے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تنگی اور عسرت میں زندگی گذاری۔"

ڈاکٹر محمد گوہر سماج، معاشرہ، ملک اور شخصیت کے کسی بھی پہلو پر لکھنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا انداز بیان سماعت پر گراں نہیں گذرتا۔ ان کے وسیع تجربے، گہرے مشاہدے اور زندگی کے مثبت رویئے آئینہ بنتے ہیں۔ وہ حسیات کی شیرازہ بندی کرتے ہیں اور سیاست و فرد کے تاریک گوشے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ وہ فلسفی نہیں مگر فلسفۂ حیات کی نقش کے منظر......اور پس نظر پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے اداریے، آئینہ، چراغ، مشعل نور اور سمت نما بنے ہوئے ہیں۔ جن کی تمام تر جزئیات میں کارگہہ شیشہ گری کی چیرہ دستی اور چکا چوند دیکھی جا سکتی ہے۔

☆☆☆

"کوہسار"، بھیکن پور-۳، بھاگلپور- 812001 (بہار)

● ڈاکٹر ارمان عالم (ڈیمونسٹریٹر، شعبۂ کیمیا، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ، عمر تقریباً ۶۱ رسال، موضع دانی حال مقام چک رحمت بھیگو، دربھنگہ) کا ۷ ر مئی ۲۰۲۰ء کی شب ا ربجے طویل علالت کے بعد مہابیر کینسر اسپتال پٹنہ میں انتقال ہوگیا۔ پٹنہ سے بذریعہ ایمبولینس ان کا جسد خاکی دانی پہنچا جہاں ۳ ر بجے کے قریب تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم ارمان عالم بیحد خلیق اور ملنسار تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔

....

● معروف ادیب اور صحافی انوار الحسن وسطوی کی والدہ ماجدہ **صابرہ خاتون** (زوجہ محمد داؤد حسن مرحوم) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۲۰ رمئی ۲۰۲۰ء کو ڈیڑھ بجے شب ہوگیا۔ مرحومہ کی نماز جنازہ ساڑھے دس بجے دن میں حسن پور وسطی (مہوا، ویشالی) کے امام و خطیب قاری مرشد عالم نے پڑھائی اور آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور چھ بیٹیوں کے علاوہ درجنوں پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہیں۔

....

● معروف محقق اور مورخ جناب شاداں فاروقی مرحوم کے بڑے خویش **احمد کریم شرفی** (ریٹائرڈ ٹیچر کپلیشور استھان ہائی اسکول دربھنگہ مقیم رحم گنج ویسٹ عمر تقریباً ۷۶ رسال) کا یکم جون ۲۰۲۰ء کی شب ۱۱ ربجے روبن ہاسپٹل پاٹلی پتر پٹنہ میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ جسد خاکی بذریعہ ایمبولینس دربھنگہ لایا گیا جہاں بعد نمازِ ظہر ۲ ربجے دن مسجد نور کے احاطہ میں حضرت شمس اللہ جان بابو حضور نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور اسی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم احمد صاحب نہایت نیک اور مخلص انسان تھے۔ مرحوم مکندی چودھری ہائی اسکول میں عرصہ تک رہے۔ مرحوم نے ۱۹۸۳ء سیشن میں ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ ۲۰۱۴ء میں اسکول سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ۲۰۱۵ء میں حج بیت اللہ سے مشرف بہ دید بھی ہوئے۔ مرحوم کا آبائی وطن شیورہ ضلع سمستی پور تھا۔ بڑے ہی باغ و بہار انسان تھے۔ جنازہ میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

نقشبند قمر نقوی بخاری (ٹلسا، امریکہ)

ڈاکٹر امام اعظم کے سہرے

یک نہ شد دو شد...... میں نجانے 'تمثیل نو' کی کن خوبیوں کے گن گا رہا تھا کہ عین اس کے درمیان گل دیگر شگفت ......اور مجھے سہروں کی ادبی معنویت پڑھنے پر مجبور کر دیا گیا...... چہ سہرا اور چہ معنویت...... جناب اس خاکسار کی شادی خانہ آبادی کے نہایت پُرشکوہ موقع پر نہ تو سر پر سہرا باندھا گیا، نہ پھولوں کے ہار پہنائے گئے، ایک شیروانی سے ہی سارا کام چلا لیا گیا اور باوجودیکہ اس نہایت عشق بیز و محبت آفریں تقریب میں تین عدد مسلمہ شعراء بھی موجود تھے لیکن کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ کم از کم ایک سہرا ہی لکھ کر سنا دیتے...... مجھے یقین ہے ان تینوں کو شعر کہنا ہی نہیں آتا ہوگا جو کچھ پڑھتے تھے کسی سے لکھوا کر لاتے ہوں گے۔

سہرے کے بغیر کیا شادی!

لیکن دیکھئے بعض سہروں نے تو عین شادی اور جشن آبادی کے موقع پر نہایت نازک صورت حال پیدا کر دی ہے......مثلاً ایک شادی میں نکاح کے بعد شاعر کو سہرا پڑھنے کا موقع دیا گیا، اس نے ایک شعر پڑھا......

کون کہتا ہے کہ نو عمر ہیں نوشاہ میاں ان کی داڑھی سے ہی دراصل بنا ہے سہرا

صاحب دولہا کے بھائی تو بگڑ گئے اور شاعر سے دھینگا مشتی پر آمادہ ہو گئے کہ اس نے دولہا کی عمر کے بارے میں سب کو مغالطے میں ڈال کر بدنامی کر دی۔

اردو ادب میں پہلے کبھی سہروں کو ایسی عزت نہیں ملی تھی جیسی ڈاکٹر امام اعظم نے عطا کر دی بلکہ کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ سہروں میں بھی ادبی معنویت کا کوئی عنصر ہو سکتا ہے۔

وہ جو سہرا غالب نے کہا اور اس میں نعرہ لگایا...... دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا...... اس سہرے میں بھی کوئی ایسی غیر معمولی لفظ و بیاں کی خوبی نہیں تھی، لیکن ذوق پہلے ہی غالب پر دانت پیسے بیٹھے تھے، ان کو ایک بہانہ مل گیا اور انہوں نے بھی ایک لغو سا سہرا کہہ دیا...... دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا...... اگرچہ ان کے اس مصرع میں ایک زبان کی غلطی ہے......یعنی، دیکھ اس طرح ''سے''......نہایت غیر فصیح اور غیر استادانہ بیان ہے۔''اس طرح'' کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ میں جو کتاب ''رموز البحر'' تالیف کر رہا ہوں، اس میں یہ کوتاہی بالتفصیل بیان کی گئی ہے، عنقریب شائع ہوگی ان شاء اللہ! اس مضمون کا تعلق نہ غالب سے ہے نہ ذوق سے، یہ تو امام اعظم سے منسوب مضمون ہے۔

بھائی امام اعظم صاحب...... آپ تو واقعی ایک معجز صفت امام صحافت، معلوم ہونے لگے ہیں، ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہیں، اور بحرِ علم سے گوہر شاہوار نکال لاتے ہیں...... کیا موتی کو گوہر کہتے ہیں؟ نہ کہتے ہوں تب بھی کیا فرق پڑے گا...... تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولھو......نہ سہی کھاٹ...... گوہر شاہوار کہنے سے یہ تو معلوم ہی ہو جائے گا کہ مراد موتی سے تھی۔ در شاہوار لکھ دیتا تو بہتر ہوتا۔

خیر، تو سہرے میں بڑے بڑے ادبیت افزا اور ادب خور اشعار نکلے، میرا اجدی وطن قصبہ آسیون، جو سابق ممالک متحدہ کے ضلع اناؤ کا ایک قصبہ ہے، اس میں ایک شگفتہ گو شاعر ہوتے تھے......اب کسی کو ہزل گو شاعر کہنا اس کی توہین کرنے کے برابر ہے اب مذاقیہ اشعار کہنے والے کو شگفتہ مزاج شاعر کہتے ہیں، انہوں نے سہرے کے دو اچھے شعر کہہ دیئے:

روئے روشن ہے کہ اک سہرے کے اندر سہرا — باندھ کر بیٹھا ہے جو ایک مچھندر سہرا
کاٹ کر لے گئی پیچھے سے چھچھوندر سہرا — اپنی دلہن کے تصور میں جو نوشاہ تھے محو

سہرا کہنا آسان نہیں، ایک عرصہ تو مجھے سہرا کہنا ہتک محسوس ہوتی رہی، میں سمجھتا تھا سہرا کہہ کر عین شادی کے دن باراتیوں کے درمیان پڑھنا میری شان کے خلاف ہے، واقعہ یوں بھی ہے مجھے شادیوں میں شرکت کا موقع ہی کم ملا، سب سے پہلی تو وہ شادی تھی جو بھوپال کے حمیدیہ کالج کے انگلش پروفیسر اور اس کی ایک دوشیزہ طالبہ کی تھی۔ سارے ہی جوان طالبان علم کو اس پروفیسر سے سخت عداوت ہوگئی کہ اس نے ہم جوانوں کو تو الگ بٹھایا اور کلاس میں اس لڑکی سے نظربازی کر کے اپنا کام بنالیا۔

حمیدیہ کالج میں مخلوط تعلیم اس طرح تھی کہ کلاس روم کے وسط میں لکڑی کی ایک دیوار پردے کے لئے بنادی گئی تھی، ایک حصہ مردانہ دوسرا حصہ زنانہ، البتہ پروفیسر کا مقام ایسا تھا کہ دونوں حصوں کو دیکھ سکے، اس بدمعاش پروفیسر سے لڑکیاں پردہ کیوں نہیں کرتی تھیں یہ معلوم نہیں ہوسکا۔

ہم سب طلبا اس کی دعوت نکاح میں شریک ہوئے اور گوشت کی بوٹیاں خوب چبا چبا کر ایسے کھائیں جیسے ہم اس پروفیسر کا گوشت چبا کر اس سے انتقام لے رہے ہوں، پھر ویسے کی بوٹیاں بھی یہی سوچ کر چبائیں۔ رقیب روسیہ......

لیکن سہرے کا موقع نہیں آیا، اب جو امام اعظم برادرم نے سہرے کی بابت اتنا کچھ مواد مہیا فرما کر ایک کتاب شائع کر دی تو سہرے کی اہمیت کا احساس ہوا یعنی یہ معلوم ہوا کہ سہرا بھی ایک صنف سخن ہے، اور اچھے شعرا نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ کتاب میں کئی اچھے شعراء کے اچھے سہرے ہیں۔ جن کو پڑھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ سہرا کہنے والے زیادہ تر شعرائے کرام کا تعلق بہار یا اطراف کے علاقوں سے ہے، شاید ان علاقوں کی فضا میں سہرے کے پھولوں کی خوشبو موج زن ہوتی ہوگی، وہ فضا کس قدر عاشقانہ اور معشوقانہ ہوگی۔ سہرا بھی تو عشق کی شگفتہ مزاجی کا مرقع ہوتا ہے۔ وہ عشق جس کا آغاز نکاح مسنونہ سے ہوتا ہے......اس کا خیال ہی بہت نکہت بیز ہوتا ہے......پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے خوب لکھا ہے:

"معاصر ادبی منظرنامہ کی زنبیل لمبی ہے، سہرا سے بھی شعرا کی گہری وابستگی ہے جہاں ایک طرف نئی طرز کا استعاراتی اظہار ہے، وہیں دور از کار تلازماتی سلاسل ہے، شعور کہ روکا بہاؤ، بھی ہے، مرجہ اور منحرف لسانی شکلیں ساتھ ہی ساتھ سیدھے اور براہ راست اسالیب کا استعمال ہے، اور مصورانہ نوع کی چشم تحسین ہے۔"

واہ واہ، میں نے یہ عبارت دو تین بار پڑھی۔ اور دریائے حیرت کے عین درمیان تیرنے لگا......تیرتا ہی رہا۔

یہی ہے وقت بہاروں کے جھوم جانے کا — کلی کے کھلنے کا پھولوں کے گنگنانے کا

ایک مدت ہوئی جب میں عہد طفلی میں تھا، واللہ کیا زمانہ تھا امام اعظم صاحب، میں نے اس عہد کو کئی آوازیں دیں مگر اس نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں غرض اس زمانے میں کچھ تاجران راہ پیا بچوں کی دلچسپی کے مختلف کھلونے وغیرہ لے کر محلے محلے گشت کرتے تھے اور بچے ان سے غبارے، اور کھلونے چند پیسوں میں خریدتے تھے، ان کے پاس لچک دار آہنی تاروں سے بنا ایک کھلونا ہوتا تھا میں دو حلقے سے ہوتے تھے۔ اس کو ''گورکھ دھندا'' کہتے تھے، ایک چھوٹے حلقے کو مختلف زاویوں سے دوسرے بڑے حلقے میں پہنایا جاتا تھا اور حیرت انگیز طریقے سے چھوٹا حلقہ بڑے حلقے میں داخل ہو جاتا تھا۔

بعض عبارتیں بھی گورکھ دھندے سے کم نہیں ہوتیں، لیکن کتنی سچی بات ہے...... چنانچہ میں نے بھی گرہ لگا ہی دی...... ملاحظہ کیجئے:

شاعرانِ سہرا گو سارے ہی دربھنگہ میں ہیں کچھ گذشتہ میں ہیں کچھ ان سے پیوستہ میں ہیں

اس قدر سہرے پڑھے میں نے کہ دولھا بن گیا سارے ہی جذبات گویا حال خود رفتہ میں ہیں

میں نے یہ سہرے کے اشعار گویا اس عمر میں پہلی بار کہے وہ بھی فی البدیہہ، محض خون لگا کر شہدائے کرام میں بے موقع شمولیت کے لئے، بے موقع اس لئے کہ جتنے 'سہرائی' جمع ہونا تھے وہ تو ہو چکے، اب میں لکھوں تو کیا فائدہ ...... گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔

آپ نے تو مجھے اطلاع کی تھی کہ سہرا لکھا ہو تو ارسال کروں، اگر میں نے اس وقت سہرا لکھ دیا ہوتا تو مجھے بے نام ونشاں کا نام بھی اس تاریخ ساز شمارہ سہرائی میں شامل ہوتا...... اب ہاتھ ملے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں ...... یہ محاورہ جس نے بھی اختراع کیا اس کی طبیعت میں شاعرانہ موزونیت نہیں تھی، اس لئے اس نے ''ہوت'' کے ساتھ قافیہ ''کھیت'' لگا دیا اور اپنی بدمذاقی ثابت کر دی۔ اگر مجھ سے مشورہ کیا ہوتا تو میں یقیناً ایک ہم قافیہ لفظ مہیا کر دیتا، میں نے ساری عمر عزیز تخلیق ادب میں صرف کر دی اور کتابوں کی تعداد اتنی نہیں ہو سکی کہ میں کسی کو بتاؤں، اب میں نے سوچا ہے، دس بیس صفحے کی دس بیس کتابیں شائع کرا دوں جب بھی کسی کو اپنی کتابوں کی تعداد بتاؤں گا تو وہ یہ تھوڑی پوچھے گا کہ کتنے صفحے کی کتابیں، تعداد کے بوجھ سے ادب کا تانگہ ''الار'' تو ہو ہی جائے گا۔

اردو میں تو سہرے ہو گئے...... میں سوچتا رہا، کیا فارسی میں 'سہرا' کہا گیا، میرا جتنا مطالعہ ہے اس کے پیش نظر میں کوئی فارسی سہرا نہیں دیکھا، لیکن میرا مطالعہ ہی کتنا ہے، نہایت قلیل، ممکن ہے جو لوگ وسیع مطالعہ رکھتے ہیں انہوں نے دیکھے ہوں، اسی طرح عربی میں بھی مجھے سہرا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، اگر چہ میں نے عربی شعر و ادب بھی ملاحظہ فرمائے۔ البتہ قلیل...... خنسا نے مرثیوں کے انبار لگا دیئے، میں نے کسی عربی شاعر کا لکھا ہوا سہرا نہیں دیکھا۔ انگریزی میں بھی سہرا نہیں نظر آیا......

بھائی امام اعظم...... آپ کو مبارک باد...... تہنیت۔ بدھائی، آفریں، مرحبا، آپ نے بڑا کام کیا۔

لیکن...... مزے کی بات یہ ہے کہ...... بعض شعرا جو کچھ کہتے ہیں اس کے مفہوم کی طرف توجہ نہیں دیتے...... مثلاً سہیل ارشد کے سہرے کا ایک شعر ہے:

پھر تاج محل بنوانے کو اک شاہ چلا ہے سہرے میں ہے لہر خوشی کی پھولوں میں ایک اہل وفا ہے سہرے میں

تاج محل تو شاہ نے ممتاز محل کی موت کے بعد بنوایا تھا، سہیل نے دلہن کو گویا مرنے کی دعا دے دی...... واہ واہ۔افسوس کہ دولہا دلہن کے والدین معنی آفریں نہیں تھے ورنہ شاعر میاں کی تو بڑی پٹائی ہوتی۔

برادرم اعظم صاحب، یقین کیجئے میں عنقریب سہرا کہوں گا...... ان شاء اللہ...... اپنا سہرا کہوں گا، اگر چہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے دو مرتبہ شادی کی اور دونوں حسیناؤں میں سے ایک میرے ساتھ بائیس سال اور دوسری بیس سال رہ کر جنت نشیں ہوگئیں، اب میں سہرا کہوں تو کس کا...... پہلی کا کہ دوسری کا...... یا دونوں کا، واللہ ہے نا مضحکہ خیز بات ......لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں ضرور کہوں گا، اور ایک ہی سہرے میں دونوں کو پرودوں گا......

سب نے اک دولھا دلہن لکھے قمر نقوی نے تو دو دلہنوں اور اک دولھا کا سہرا لکھ دیا

ہائے کیا تقدیر تھی دو بار دولھا بن گیا اور پھر طرفہ ستم، خود اپنا سہرا لکھ دیا

تہنیت کہتی ہوئی دو بار حوریں آئیں اور اولیں کا مرثیہ، دوئم کا سہرا لکھ دیا

یہ تو نمونہ دکھا دیا، اب میں اس کو مکمل نو شعر کا سہرا بناؤں گا ان شاء اللہ، اور اب جب بن جائے گا تو آپ کو ارسال کروں گا اس لئے کہ اس دور میں میرے خیال کے مطابق آپ واحد سہرا شناس ہیں، اللہ سلامت رکھے۔لیکن...... بھائی جی...... آپ نے جیسا کچھ کیا، بہت خوب کیا، واہ واہ یعنی سبحان اللہ بھی۔

آپ کی ادب نوازی، ادب پروری، ادب شناسی اور ادب نگاری قابل قدر ہے، اس لئے کہ آپ نے جس کدوکاوش سے یہ سہرے اس تعداد میں جمع کئے ہوں گے اس سے دانتوں میں پسینہ آ گیا ہوگا۔ واللہ! میں تو جب سوچتا ہوں تو میرے سر پر سہرے کے پھول برسنے لگتے ہیں، اور سارے مہکتے ہوئے۔امریکہ میں ایک بڑی کمی ہے، یہاں پھول تو بہت رنگین ہوتے ہیں، نہایت نظر بیز، دل فریب، نظر نواز لیکن...... خوشبو سے قطعاً محروم!

میرا ذوق قلم بہت ضدی ہے، خواہ مخواہ چھ صفحے لکھوا دئے، جب کہ وہ بات جو این جانب کہنا چاہتے تھے، وہ ایک ہی صفحے میں کہی جا سکتی تھی...... لیکن برادرِ مکرم! کیا آپ کو فارسی آتی ہے؟ خیر۔ایک فارسی کا شعر تو لکھے ہی دیتا ہوں:

من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را

کس غضب کا شعر ہے...... آپ اس منظر کو سوچئے، اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کا نور سامنے...... درخت کی شاخ پر تجلی الٰہی اور موسیٰ سر تسلیم خم کئے باادب سراپا تصویر بندگی بنے کھڑے، لاٹھی ہاتھ میں...... اللہ تعالیٰ سبحانہ نے پوچھا...... موسیٰ...... تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ کا جواب تو یہ ہوسکتا تھا...... مولا لاٹھی ہے...... لیکن ہوشیار آدمی تھے...... بولے...... مولا یہ ایک درخت کی شاخ سے کاٹ کر بنائی ہوئی لاٹھی ہے، اس کو میں اپنی اور اپنے ریوڑ کی حفاظت کے لئے ساتھ رکھتا ہوں، اس سے درخت کی شاخوں سے پتے پتیاں بھی جھاڑ لیتا ہوں جو بکریاں کھا لیتی ہیں...... اللہ تعالیٰ سبحانہ ضرور ان کی لسانیت پر مسکرایا ہوگا۔

اس پس منظر میں آپ اوپر لکھا ہوا شعر دوبارہ پڑھئے...... طبیعت خوش ہوگئی ہوگی۔

☆☆☆

ڈاکٹر تاج پیامی

ابواللیث جاوید کے افسانے

(’کنارے کٹ رہے ہیں‘ کے حوالے سے)

(ڈاکٹر تاج پیامی معروف ناقد، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”صائقہ طور“ ہند و پاک میں بہت مقبول ہوا تھا۔ دراصل یہ کتاب پروفیسر کلیم الدین احمد کے تنقیدی موقف پر ایک جواب کے طور پر لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی وفات سے کچھ دنوں قبل مضمون ”ابواللیث جاوید کے افسانے“ ’تمثیل نو‘ کو ارسال کیا تھا جسے شائع نہ کیا جا سکا۔ یہ مضمون اب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔) .... ادارہ

یورپ، ایشیا اور ہندوستان میں بھی داستان کی روایت بہت پرانی ہے۔ ’رامائن‘ اور ’مہابھارت‘ ہندوستان کی مشہور داستانیں ہیں۔ گو ’الف لیلہ‘ اور ’داستان امیر حمزہ‘ ہندوستان کی داستانیں نہیں لیکن اُردو میں یہ داستانیں ہندوستان میں ہی پروان چڑھیں۔ میر امن کی کتاب ’باغ و بہار‘ بھی بہت مشہور ہوئی۔ داستان میں بھی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ ’الف لیلہ‘ میں بغداد کا خلیفہ شہریار اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے کیونکہ اُس نے خیانت کوشی کی۔ شہریار کا عورت پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا، وہ ہر روز شادی کرتا اور صبح اپنی بیوی کو قتل کر دیتا۔ محض اُسے ایسی سزا ڈرائے، وزیر زادی شہر بانو تیار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی بہن دُنیازاد کے ساتھ محل میں شادی کے بعد آتی ہے۔ دنیازاد ملکہ شہر بانو سے کہانی سنانے کی فرمائش کرتی ہے۔ کہانی شروع کرتی ہے۔ بادشاہ دلچسپی سے سنتا ہے۔ کہانی ختم نہیں ہوتی اور صبح ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ ہزار رات چلتا ہے۔ شہر بانو بچ جاتی ہے۔

داستان کے اس پہلو میں افسانے کے سارے عناصر موجود ہیں۔ کہتے ہیں ’باغ و بہار‘ کے پہلے چہار درویش کی کہانی میں بھی افسانے کے عناصر موجود تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ افسانہ کی ماں داستان ہے تو غلط نہیں ہے۔ اردو میں پہلے رومانی افسانے لکھے گئے جو تخیل کی پیداوار تھے۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے نام اس سلسلہ میں بہت مشہور ہیں۔ ’بیسویں صدی‘ اور ’شمع‘ میں محبت آمیز رومانی افسانے لکھے جاتے تھے۔ افسانہ کی دنیا میں پریم چند نے انقلاب پیدا کیا۔ رومانی اور محبت آمیز افسانے کی جگہ زندگی اور سماج کے مختلف مسائل پر افسانے لکھے۔ افسانوں میں دیہات میں رونما ہونے والے مسائل کو پیش کیا۔ غریب کسان، زمیندار اور تحصیلدار پر بہت سارے افسانے لکھے۔ دلتوں پر ناول ’گئودان‘ میں بھی ذکر کیا اور خاص کر ’کفن‘ دلت کی مفلسی اور اُن کی نفسیات پر بڑے فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک مارکس اور فرائڈ کے زیر اثر اقتصادی اور جنسی مسائل پر کئی افسانے لکھے گئے۔ مزدور اور سرمایہ دار کے تنازعہ کے علاوہ غریبی اور بھوک پر کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے سامنے آئے۔ کرشن چندر نے بھولا بھنگی پر کہانی یعنی غریب کی صورت حال اور اُس کی نفسیات پر روشنی ڈالی۔ فرائڈ سے متاثر ہو کر منٹو اور عصمت چغتائی نے جنسی افسانے لکھے۔

۱۹۶۰ء میں جدیدیت کی تحریک چلی۔ اس میں خارجیت کے برعکس داخلیت پر زور دیا گیا۔ اس تحریک کے زیر اثر علامت نگاری بھی پروان چڑھی۔ احمد ہمیش کا افسانہ 'مکھی' ایک علامتی افسانہ ہے۔ ابواللیث جاوید نے بھی علامتی افسانے لکھے۔ ''کنارے کٹ رہے ہیں'' کے چند افسانوں پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

'تماشا' میں ایک شخص برہنہ ہو کر تماشا دیکھنے کے لئے ٹکٹ حاصل کرتا ہے۔ دراصل اس افسانہ سے افسانہ نگار یہ دکھانا چاہتا ہے کہ 'بے حیاباش پر چہ خواہی کن' یعنی بے حیا ہو جاؤ اور جو چاہو کرو۔ آج کل عام آدمی اور سیاسی آدمی بے حیا بن گیا ہے اور اپنا ہدف بے حیا بن کر حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ اور ساری اخلاقی قدروں کو بھول گیا ہے۔ خاص کر سیاست داں اس قدر بے حیا ہو گئے ہیں کہ ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ صرف کرسی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

'پتھر' ایک بھرپور علامتی افسانہ ہے۔ مصنف خود کہتا ہے ''شہر سے لایا ہوا وہ پتھر بستی والوں کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ شہر سے پڑھ کر لڑکا واپس آتا ہے۔ سب کو مختلف چیزیں تحفہ میں دیتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہتا ہے — 'بابا! میں شہر سے آپ کے لئے بھی ایک تحفہ لایا ہوں۔' اُس نے اپنے باپ کو ایک خوبصورت سا مربع نما پتھر دیتا ہے۔ اس پتھر کو دروازہ کی سیڑھی کے نیچے رکھ دیا گیا۔ پھر یہ پتھر نالے پر رکھدیا گیا اور وہاں سے اُٹھا کر مسجد میں رکھ دیا گیا۔ مسجد میں اس پتھر کی لمبائی بڑھنے لگی۔ دراصل یہ پتھر درآمد کئے ہوئے اعتقاد کی علامت ہے جو شروع میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا لیکن بعد میں اس نئے اعتقاد پر عمل کرنے والے بڑھتے گئے۔ اگر میں صاف لفظوں میں کہوں تو یہ عقیدہ عرب ملک سے درآمد کیا گیا اعتقاد ہے جسے پہلے لوگ نہیں پسند کرتے لیکن بعد میں اس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

'کنارے کٹ رہے ہیں' ایک ندی کناروں کو کاٹتی ہوئی بستی کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہ ندی دراصل علامت ہے ظلم وستم کی جس سے بستی تباہ ہو جاتی ہے۔ اس ندی کو فساد سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ندی کی فساد بھی بستی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم نے دیکھا کہ علامتی افسانے داستانوں، ترقی پسند تحریک اور پریم چند کے افسانوں سے کس قدر مختلف ہیں۔ 'کنارے کٹ رہے ہیں' میں ایک افسانہ ہے 'لفافہ' جسے علامتی افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک شادی شدہ آدی واسی کے پاس ایک لفافہ آتا ہے۔ وہ بہت خوش ہے کہ اس کے فوجی شوہر کا لفافہ ہے۔ وہ بن سنور کر اُسے پڑھوانے شہر آتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کا شوہر آرہا ہے لیکن دراصل یہ اُس کے مرنے کی خبر تھی جسے پڑھ کر پڑھنے والا بھی رو دیتا ہے۔

ابواللیث جاوید ایک عمدہ افسانہ نگار ہیں جنہیں ہر قسم کے افسانے لکھنے پر قدرت حاصل ہے۔ 'لفافہ' میں ماجرہ سازی بھی ہے اور کہانی پن بھی۔ اس افسانہ میں آدی واسیوں کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مزید آنکہ اس میں Irony (المیہ) بھی ہے۔ وہ لفافہ پا کر جتنا خوش ہے خبر سن کر اتنا ہی غم ناک ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار زندگی کے اس غم ناک پہلو کو بہت چابک دستی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ابواللیث جاوید لفظوں سے نہیں کھیلتے، بلکہ اپنے ارد گرد سے اتنا متاثر رہتے ہیں کہ اُسے بیان کرنے میں نہایت محتاط، موزوں اور توانا الفاظ کا استعال کرتے ہیں جن کی مدد سے کہانی ہمارے ذہنوں میں تصویر کی طرح اُبھرنے لگتی ہے۔ یہی وصف اُنہیں اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں منفرد بناتے ہیں۔ افسانے بھی اُتنے معمہ صفت نہیں بلکہ اُن کی علامتیں ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتیں۔

علامتی افسانوں کے علاوہ بامحاورہ افسانے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جن میں 'تھکن'، 'سوئمبر'، 'بچھو' اور 'پانی' قابل ذکر ہیں۔ افسانہ 'تھکن' ایک نوجوان کے خوابوں کی شکست کا المیہ ہے۔ جس نے کم عمری میں ہی بڑے بڑے مظالم برداشت کئے ہیں۔ کہانی کا کلائمکس نہایت قدرتی ہے۔ 'سوئمبر' ایک تعلیم یافتہ دولت مند لڑکی کی آزاد خیالی کا بیانیہ ہے۔ اس کی پیش کش نہایت خوبصورت ہے۔ 'بچھو' میں آج کل کے ڈاکٹروں کی تاجرانہ ذہنیت کا خوبصورت نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ عوام کے تئیں ان کی بے توجہی کا خوبصورت بیان ہے۔ 'پانی' دراصل دلت ادب سے متعلق ہے۔ اس کہانی کا پلاٹ، اسلوب، ٹریٹمنٹ اور نقطۂ عروج نہایت خوبصورت ہے۔ اس افسانہ کو ابواللیث جاوید کے اچھے افسانوں میں شمار کیا جانا چاہئے۔

ابواللیث جاوید یقیناً نئی نسل کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہیں۔ ان کے یہاں ذاتی تجربے، عمیق مشاہدے اور افسانہ لکھنے کا سلیقہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

....

● 'دارالادب'، محلہ مہیا دیوا، آرہ (بھوجپور) -802301، موبائل: 9973040921

● **محمد غلام ربانی** (عمر تقریباً ۶۲ رسال، خلف ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم، موضع برہولیہ، دربھنگہ) کا ۱۰ رجون ۲۰۲۰ء کی شب ۸ ربجے حرکت قلب بند ہوجانے سے نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ اسی شب ۱۱ ربجے باٹلہ ہاؤس قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں ڈاکٹر شکیل تمنا، اشرف حسین، سیوٹی بابو، محمد نعمان، اے آر انتولے، محمد سمیع الدین اور مرحوم کے بیٹے انجینئر امروز، انجینئر گل روز، انجینئر شیروز، انجینئر مہروز اور خویش نصر کریم شامل ہوئے۔ مرحوم گزشتہ ۱۰ ربرسوں سے بچوں کے ساتھ نفیس روڈ ہری مسجد، اپارٹمنٹ نمبر-R8، باٹلہ ہاؤس، نئی دہلی میں مقیم تھے۔ مرحوم بیحد خلیق، ملنسار اور مرنجا مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ مرحوم غلام ربانی صاحب انجینئر نورالاسلام نشتر مرحوم بیچی باغ دربھنگہ کے نسبتی بھائی تھے اور سید متین اشرف بی بی پاکر نورالحسن لین دربھنگہ کے بہنوئی تھے۔ مرحوم نے عرصہ تک کولکاتا میں کاروبار کیا۔ وہاں سے واپس آئے اور دربھنگہ مرزاپور میں پارٹس کی دکان کھولی۔ پھر گاؤں برہولیہ واپس جا کر سن فلاور اسکول کھولا اور دس برسوں تک چلایا۔

....

● معروف سماجی شخصیت **سید رشاد احمد رشی بابو** (عمر تقریباً ۷۲ رسال ولد حکیم سید عابد حسین مرحوم محلّہ قادر آباد، دربھنگہ) کا ۲ راکتوبر ۲۰۲۰ء بوقت ۴ ربجے شام طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ۳ راکتوبر کو بعد نمازِ ظہر قادر آباد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مرحوم نہایت مخلص انسان تھے۔ مرحوم غلام سرور صاحب کیوٹی سے امیدوار ہوتے تو رشی بابو کے گھر پر شیر بہار کا قیام ہوتا یا معروف سرجن ڈاکٹر اعجاز احمد شیودھارا پر قیام کرتے۔ رشی بابو کا گھر راجد کے لیڈران کی آماجگاہ تھی۔ وہ خود بھی سیاست میں راجد سے قریب تھے۔ مہمان نواز تھے۔ ان کے گھر پر لوگوں کی آمد ورفت رہتی۔ تمام لوگوں سے خلوص سے ملتے اور تواضع بھی کرتے۔ سابق سول سرجن مدھوبنی ڈاکٹر شبیر احمد قادر آباد سے بیحد قربت تھی۔ مرحوم پرانی قدروں کے امین تھے۔

پروفیسر سیّد احمد شمیم

مختار احمد مکی کا علمی شغف

ڈاکٹر مختار احمد مکی سے میری ملاقات کا پہلا حوالہ کریم کالج آف ایجوکیشن ہے۔ وہ کشمیر سے اس کالج کو جوائن کرنے آئے تھے۔ جنوری کا آخری زمانہ تھا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ کریم سٹی کالج کے صحن میں جاڑے کی لذت بخش دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو ہم دونوں کی آنکھیں ملیں۔ مختار احمد مکی اس وقت اگر نوخیز نہیں تو نوجوان ضرور تھے۔ انتہائی اخلاق سے بڑھ کر ملے پھر تعارف کا سلسلہ کچھ آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ دربھنگہ کے رہنے والے ہیں اور میرے نام سے مرحوم منظور الحق تبسم کے ذریعہ واقف ہیں۔ منظور کو مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ دربھنگہ میں یوں تو میرے بھانت بھانت کے دوست تھے جن میں ابھی بھی کچھ سلامت ہیں اور اللہ انہیں سلامت رکھیں لیکن منظور سے زیادہ باصلاحیت اور شریف النفس دوست کوئی دوسرا نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ مختار احمد مکی ان کے خاص عزیزوں میں ہیں۔ اس طرح روز اولین ہی مکی میرے دل و ذہن کے بالکل قریب آگئے۔ یہ قربت اللہ کا شکر ہے کہ آج صرف قائم ہی نہیں بلکہ مضبوط سے مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

کسی کالج میں لیکچرر ہو جانا تو مقدر اور مقدور کی بات ہوتی ہے لیکن اس کی ذمہ داریوں کو نبھانے والے کم ہی لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنے دوستوں کے درمیان اس بات کا بار بار اظہار کیا ہے کہ کریم سیٹی کالج میں مختار احمد مکی واحد ٹیچر ہیں جن کو پڑھانے سے ہی نہیں بلکہ پڑھنے اور لکھنے سے بھی والہانہ عشق ہے۔ میرے لئے یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ اس دیوانگی میں مکی آج بھی مبتلا ہیں اور ابتدائے عشق کو جھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے جو موضوعات چنے ہیں وہ اتنے آسان نہیں ہیں۔ ان کی گراں باری کو سنبھالنے میں اچھے اچھوں کے شانے جھول جاتے ہیں۔ کہانیاں لکھنا، اشعار موزوں کر لینا اور ان پر الٹے سیدھے مضامین لکھ دینا تو اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے درمیان عام سی بات ہے۔ میں اس پر کوئی زیادہ متعجب نہیں ہوتا۔ ہر دس اردو جاننے والوں میں دو چار شاعر اور ادیب نکل ہی آتا ہے۔

مختار احمد مکی کا خانوادہ عالموں اور ادیبوں کا رہا ہے جن کا خاص علاقہ مذہب تھا۔ جبکہ مختار احمد مکی نے اپنے لئے سماجی علوم اور تعلیمات کا انتخاب کیا۔ اب تک ان کی نصف درجن سے زائد کتابیں اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں تحریک آزادی اور ہندوستانی مسلمان تحریک آزادی کے نمائندہ مسلم مجاہدین تحریک آزادی کے مسلم شہداء، ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی، جھارکھنڈ کے ادیباسی کے علاوہ ادبیات کے تعلق سے ان کی اہم کتاب علامہ اقبال چند جہتیں بھی ہیں۔ انگریزی میں انہوں نے مسلم ایجوکیشن اور خواجہ غلام السیدین کے تعلیمی نظریات پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان سب کے علاوہ ان کی دو کتابیں محمد قدیم مذہبی کتابوں میں اور اردو ادب کے اصناف زیر طبع ہیں لیکن اس وقت میری گفتگو کا اصل موضوع ان کی ایک کتاب ''تدریسِ اردو: اصول وضوابط'' ہیں جو زیر تربیت اساتذہ اور اردو معلّمین کے لئے لکھی گئی ہے جس کا پیش لفظ مشہور دانشور، شاعر اور نقاد پروفیسر منظر شہاب نے

لکھا ہے۔منظر شہاب صاحب لکھنے لکھانے کے معاملہ میں خاصے بخیل واقع ہوئے ہیں۔مقدمہ،پیش لفظ یا تقاریض جیسی دوسری قسموں سے بہت دور بھاگتے ہیں۔میں نے جب منظر شہاب کا نام دیکھا تو از خود اس کتاب کی اہمیت مجھ پر روشن ہوگئی اور میں نے بالاستیاب اور بغور اس کتاب کا مطالعہ کیا۔حالانکہ اس کتاب کا موضوع میرے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے گر چہ اردو درس وتدریس سے تمام عمر وابستہ رہا اور ہوں لیکن میں نے درس وتدریس کو اپنے ذوق کی تسکین اور فن کے طور پر اپنایا ہے۔سائنسی انداز سے جاننے کی نہ تو کوشش کی اور نہ ہی جان سکا ہوں جب کہ یہ کتاب جومختار احمد مکی نے لکھی ہے۔خاصی سائنسی اور علمی ہے لیکن کتاب کی قرائت کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ مختار احمد مکی نے اپنے صاف ستھرے اور سجل اسلوب سے بے رس موضوع کو خوش ذائقہ بنادیا ہے۔

اس کتاب میں سولہ عنوانات ہیں اور ان عنوانات کے تحت تعلیم خصوصاً زبان کی تعلیم کی اہمیت اور مقاصد، زبان کی تدریس کے نفسیاتی اصول،مادری زبان کی اہمیت ،اردو زبان کی ابتدا اور رسم الخط ،اردو کا دستوری موقف اور موجودہ ہندوستان میں اس کی حیثیت،اردو زبان کی تعلیم کے اصول و مقاصد،اردو کی درسی کتابیں، معلّمین اردو کی شخصیت اور ان کے اوصاف،عبارت خوانی،ہم نصابی مشاغل،دوران تعلیم امدادی وسائل،امتحان اور تعین قدر، اردو کا کتب خانہ،تدریس اردو کی ترکیبیں،تدریس کا ضابطہ،سبق اردو کے اشارات نمونے اور منصوبہ سبق پر بہت دلکش انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر میں کتابیات کے حوالے موجود ہیں۔ان تمام چیزوں نے تدریس اردو۔ اصول وضوابط کو ایک وقیع کتاب بنادیا ہے۔اردو میں ایسی کتابیں کم لکھی گئی ہیں۔شائد یہ میری کم مائیگی اور نا آگہی ہو مگر میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ میرے مطالعہ کی حد تک اس سے بہتر کتاب زیر تربیت اساتذہ اور اردو معلّمین کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔

میں یہ یقین کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ مختار احمد مکّی کے اندر جو علمی شغف ہے اور لکھنے لکھانے سے جو انہیں والہانہ عشق ہے اگر یہ قائم رہا تو وہ اور کئی کار آمد کتابیں لکھیں گے۔میں دعاء گو ہوں کہ ان کی یہ دیوانگی قائم رہے اور ڈاکٹر مختار احمد مکی کے لئے پرویز شاہدی کی زبان میں یہ کہنا چاہوں گا کہ:

راہ گذر ہی راہ گذر ہے راہ گذر سے آگے بھی

☆☆☆

سابق صدر،شعبۂ اردو،کریم سٹی کالج،جمشید پور (جھارکھنڈ)

پروفیسر عبدالمنان

''خیمۂ بہار'' کی مرغوبیت

شاعری دل میں اُبھرنے والی شگفتہ بہار کا ایسا سرمایہ ہے جس کی تزئین میں ارتعاشی کیفیت' اضطراب حیات اور تصورات زماں کا شوق ہر گام نظر آتا ہے۔ شگفتہ جبینوں کی سجدہ گاہی احساس کی پیشانی پر یادوں کی لکیروں کا ذوق پیدا کرتی ہے تو دنیا کے پردے شاعر کی نگاہ سے اُٹھ جاتے ہیں اور وہ حقائق زماں وزمن کو اس لذت دید کے ساتھ دیکھتا ہے جس طرح بگلا پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھتا ہے۔ شاعر دائرہ حیات اور رقص زماں کی گہرائیوں پر نظر ڈال کر دریافت کی شبنم افشانی کے مرحلے میں افکار کی ضیائے پُر نور پر توجہ دیتا ہے اور شوق کی رنگارنگی کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ پُر فکر شاعر دریافت اور شانہ کشی کے مراحل میں گل خنداں کی بہار کا خیمہ دیکھتا اور شوق کی لذت کا سامان تازہ کرتا ہے تو اس کی فکر کا دائرہ محدود نہیں ہوتا اور ''منزل دشوار'' کو طے کرتا ہوا ''شجر سایہ دار'' کو اپنا پڑاؤ نہیں سمجھتا بلکہ ہر گام میں ذوق وجستجو کا سبب مہیا کرتا ہے۔ اس عبوریت کے مرحلے میں رنگارنگ بزم آرائیوں کے جلوے کی بہار کی مرغوبیت میں جس طور پر دزدیدہ نگاہی کا سامان مہیا کرتا ہے، وہ شاعر کے ذوق مطالعہ کی رغبت کی ایک مثال ہے۔

مرغوب اثر فاطمی کی شاعری نہ ترقی پسندی کا نعرہ ہے نہ ہی جدیدیت کا پشتارہ ہے اور نہ ہی قدامت پسندی کے ذوق کا سامان، بلکہ جمالیاتی حس کا ایسا پر کشش جوہر ہے اور ادائے خاص کا ایسا حلول جو شوق دید کو نہ صرف ابھارتا ہے بلکہ خیال کے خوشنما پھول کی پاسداری کے علاوہ اظہار بیان کی تجدید کرتا ہے۔ اچھے شاعر کی معراج یہ ہے کہ تجسس برائے خوبی اور رنگارنگ بزم آرائیوں کا سامان اور تکمیل آرزو کا ذوق ابھارے۔ کمال فن کی منزل میں ارتقا کا خیال ہر گام پر رکھتا ہوتا کہ ہر کمال گرد راہ نظر آئے۔ آفاقی مسائل کا حسن اس وقت کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہوتا ہے جب محسوسات کے دائرے سے گزرتا ہے اور دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ مثبت قدروں کی امانت، نئے دور کی زندگی کی حرماں نصیبی، رہ گزر شوق کی پرخاری، موسم گل میں جنوں کی پامالی کا سامان، احساس کی شکستگی اور شب کی سیاہی مٹانے کے لئے چراغ دل کی روشنی وغیرہ ایسے تفکرات ہیں جو اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے:

مطالبات کی وادی کی شوخ دوشیزہ — یہ زندگی تو مسلسل سوال کرتی ہے
میں حاشیہ ہوں ورق کا، ذرا نہ کم جانو — اسی کی ضد سے تو تحریر بھی نکھرتی ہے
کئی جہان دکھاتی ہے صورت آواز — ندائے اذن خلاؤں میں جب اُبھرتی ہے
بڑے تپاک سے چڑھتا ہے بام پر سورج — بچاری دھوپ کئی سیڑھیاں اترتی ہے

اگر ''خیمۂ بہار'' کے کلام کا موصوف کے دوسرے مجموعوں سے موازنہ کیا جائے تو ان کی شاعری فکری لحاظ سے ارتقا کے زینے طے کرتی نظر آئے گی اور تفکرات کی بلندی میں احساس کی شدت اور خیال کا تموج قوس قزح کا کام کرتا دکھائی دے گا۔ ارتقائے حیات کا تخم ذہنی بالیدگی کی آب وگل میں پروان چڑھ کر جمالیاتی حس کو گدگداتا اور دلوں کے تار کو لرزاں کرتا ہے تو ایسی آواز ابھرتی ہے جو دل ودنیا کو شگفتہ بنا دیتی ہے۔

تقلید واتباع اور اختراعی نظام کا سلسلہ روزازل سے جاری ہے۔ فنکار اپنی متاع فکر کی جھولی درآمد مال سے نہیں بھرتا۔ اس کا نجی اثاثہ اس کی ذات یا محسوسات کا Sublimated سرمایہ ہوتا ہے۔ اس پر کائنات کی زیریں لہروں کا جوش اور شوق کی رنگارنگی کا ابال اس منزل پر لاتا ہے جہاں زبان کی چاشنی بلاتی ہے اور افکار کی تازہ کاری کا جلوہ عیاں ہوتا ہے۔ اس خیال کی روشنی میں مرغوب اثر فاطمی کے اشعار کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت مترشح ہوگی کہ انہوں نے جس انداز سے زمانے کی چال پر نظر ڈالی ہے اور عصری کوائف کا مطالعہ کیا ہے، اس کی پیش کش کی جسارت کا عکس ملتا ہے:

خیال فردا سے ہے بزم میں وہ سنجیدہ — طرب کے بعد ہی سناٹگی پسرتی ہے
خوابوں کا ممکنات سے رشتہ نہ نبھ سکا — بوجھل توقعات بوقت سحر گئے
فرزانگی کے تن کو کیا سب نے بے لباس — الزام ویسے چند دوانوں کے سر گئے

شاعروں کے تجرباتی عوامل اور مشاہدے کی برق رفتاری کا طور خیالی دنیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے، اس میں حقائق کی تابندہ کرن چھپی ہوتی ہے۔ یہ کرن عصری صورتحال سے توانائی حاصل کر کے اپنی ضیاپاشی کا ثبوت دیتی ہے۔ ادب اپنے عہد کا آئینہ بھی ہے اور جلوہ ساماں بھی۔ اس کی جلوہ سامانی زمانے کی آڑی ترچھی لکیروں سے غذا حاصل کر کے ایک شکل بناتی ہے۔ اگر اس میں خط منحنی کی کارفرمائی ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ زمانے کی رفتار خط مستقیم کی راہ اختیار نہیں کررہی ہے۔ ادب حال کا اشاریہ اور مستقبل کی بشارت کا ضامن بنتا ہے تو دید کی ایک نئی کرن ابھرتی ہے، جو نئے خیالوں کے پیدا ہونے کی ضامن بنتی ہے۔ فنکار اس دنیا کی دید پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ نئی راہ کی ہمواری کا جتن کرتا ہے۔ اس کے Shades ''خیمۂ بہار'' میں نظر آتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

عجیب حوصلے زندہ ہیں شوخ دریا کے — یہ کون پوچھے ارادہ ادھر کہاں کا کیا
وہ نقش پا ہی بتا دیں گے داستان فراق — ہوائے تند نے رخ موڑ کے کہاں کا کیا
کج ادائی کے بدن پر ہے لباس زرق و برق — خیر گئی چشم میں روح بصیرت کھو گئی
کارزارِ دہر میں ہیں ہر قدم پر رنگ و بو — کیوں کروں ترک جہاں دامن بچانے کے لئے
گفتگو کا سلسلہ کیوں کر چلے — ان کی فطرت میں ہے تہہ داری بہت
مرے سامنے کر کے اس کی شکائت — وہ ردّ عمل جاننا چاہتا ہے

ان کی شاعری نہ پہیلیاں بجھاتی ہے نہ اکہرے قصے سناتی ہے، نہ فلسفہ کی طومار ہے نہ ہی حسن دلربائی کی داستان۔ ایسا وتیرہ نہیں ہے کہ فلسفہ کل کی حقیقت ہر گام پر عیاں ہے بلکہ چیدہ چیدہ خیالات کا عکس نمایاں ہے۔ کیوں نہ ہو شاعر کا شعور حیات جس قدر اکہری صفت کا حامل ہوتا ہے اسی قدر کلی خوبی کی جلوہ گری بھی ملتی ہے۔ یعنی ہر ذرّہ آفتاب کی چمک رکھتا ہے۔ جس کا عکس مرغوب کی شاعری میں نمایاں ہے۔

مرغوب اثر فاطمی کی شاعری غزلوں کو اپنے دل کا سرمایہ بنا کر خاموشی اختیار نہیں کرتی بلکہ نظم میں منفرد زاویوں کے سہارے فن کا پرکشش جوہر دکھانے کا ملکہ منظر عام پر لاتے ہیں۔ انہوں نے پابند نظموں میں بھی فکر کا جہان روشن

کیا ہے اور غیر پابند نظموں میں بھی خیالات کی رنگا رنگی بکھیری ہے۔ افکار کی تومندی اور مشاہدوں کی چنگاری کو بروئے کار لا کر اور ادراک حیات میں درد کی لہر بھر کر ان کی شاعری ایک ایسا جہان بناتی ہے، جس میں داخلی ارتعاش اور عصری بدعنوانیاں نیز قلبی وارداتوں کا سلسلہ ارضی صداقت کی فسوں سازی اور حساس کی دل کی ترجمانی کا عکس ہویدا ہوتا ہے۔ اس بات کی ایک کامیاب جھلک ان کی نظموں کی جان ہے۔ مثلاً ''ضیائے الماس''، ''آڑی ترچھی لکیریں''، ''کار جہاں جاری ہے''، ''بیٹی''، ''اسکی جادوگری میں کیا شک ہے''۔ علاوہ ازیں دوہا، قطعہ اور مشاہیر ادب کے خیالات خیمہ، بہار کے اندراج سے منور ہیں، جن کی مشمولیت سے بھی مرغوب آثر فاطمی کی شعری لیاقت اور فنی جودت کا علم ہوتا ہے۔ ان کا فن جمود و تعاطل کا شکار نہیں ہے کہ اس میں موضوعات کی رنگا رنگی اور احساسات کی بو قلمونی خارجی حقائق اور داخلی کیفیات کے ارتباط کا عکس پیش کرنے میں اس منزل تک قاری کو لے جاتی ہے، جہاں حیات و کائنات کی گرہوں کا عکس کھلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تفکر کو مہمیز ہی نہیں کرتے بلکہ ایک نصب العین عطا کرتے ہیں۔ بلند مقصد اور عظیم اقدار کی پاسبانی کے لئے ان کی شاعری تقاضائے بشریت اور نازک حالت زار پر مضطرب شعلہ زاری دکھانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ لفظوں کی تراش اور ترکیبوں کی مہارت میں نظموں کی صنعت گری کی چمک ہماری نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ طول کلامی قطعیت کے ساتھ کہنے کے حسن کو ماند کر دیتی ہے اور غنائیت کی لہر پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ عظیم المیہ کی یورش جس نے ہماری تہذیب کا پردہ چاک کیا ہے، اس کی روداد شاعری کی فکر کی وہ پہچان ہے جسے دور حاضر کے تمدنی نظام نے جلا بخشی ہے اور جس کی وجہ سے آج کا انسان سکون اور طمانیت کا متلاشی ہے۔ ان باتوں کا علم جس انداز سے ان کی شاعری پیش کرتی ہے، وہ اُردو ادب کا پیش بہا سرمایہ ہے۔ عصر حاضر کے سلگتے موضوعات کے پس منظر میں احساس زیاں کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی تازہ کاری کے جوہر ابھارنے کے لئے نئے موڑ کی تلاش سے منہ نہیں موڑتے۔ وہ فکر و احساس کے پیدا کرنے میں عرفانیت اور لطیف کائنات کی سیر کرتے ہیں۔ تخلیقی مزاج وہ مذاق میں موضوعاتی تنوع کے علاوہ لفظوں کی دلنوازی، توانا شعری روایت کی شناخت کی جدت کاری کو جس بلوغیت کے ساتھ جنم دیتی ہے اس کا پُر فکر سماں، مرغوب صاحب کی شاعری پیش کرتی ہے:

سامنا ان کا ہوا جب تو نظر نیچی تھی — بے قراری میں مرے دست طلب بول اٹھے

قتل میرا بھی ہوا اور شہِ وقت کا بھی — اک پہ خاموش رہے ایک پہ سب بول اٹھے

کون بچا سنسار میں جس کو ڈسیں نہ غم کے ناگ — عمل سے زہر کو امرت کر لو جاگ اٹھیں گے بھاگ

ان کی شاعری میں فنی اور فکری تجربوں کی دلاویزی اور ارتقائی نظام حیات کی جلوہ گری شوق عصر کی نباضی کو جگہ دے کر ایک ایسی فکری دنیا کی تخلیق کرتی ہے جس کی بزم آرائیاں دعوت نظارہ بھی دیتی ہیں اور نگاہوں میں تمیز دید بھی پیدا کرتی ہیں۔ ع ''یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر''

اُمید ہے ادبی حلقوں میں اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

☆☆☆

سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی موبائل: 9007171781

ڈاکٹر جمال اُویسی

حیدر وارثی کی غزل گوئی

حیدر وارثی بہت زمانہ سے شعر کہتے تو آرہے اور اب تک ان کے چھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ تمام اصناف شاعری میں غزل کے عاشق ہیں اور اب تک صرف غزل کہی ہے۔ اپنے ادبی کیریئر میں حیدر وارثی صاحب نے ذرا دیر سے شروعات کی اور غزل گوئی کی طرف ملتفت ہوئے۔ ان کے ادبی ذوق کی آبیاری میں علامہ اجتبیٰ حسین رضوی کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ''شعلۂ ندا'' کی غزلوں اور رباعیات کا اہم حصہ رہا ہے۔ ان کی شاعری کا باضابطہ کوئی استاد نہیں رہا اور انہوں نے صرف اپنی وجدانی صلاحیت پر انحصار کر کے شعر کہے ہیں۔ ان کی شاعری کے تعلق سے بعض مشاہیر کی آراء بھی سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک دو یہاں پیش کی جاتی ہیں:

بقول پروفیسر لطف الرحمٰن:

''حیدر وارثی کے یہاں اپنا ایک سلیقہ ہے۔ انہوں نے تشبیہ، استعارہ اور کبھی علامت کے ذریعہ حیات و کائنات کے نازک مسئلوں کو تخلیقی سطح پر سادگی اور طرح داری کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی ایسی کوششوں میں بسا اوقات وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ فارسی ہو کہ اردو غزلیہ اسلوب مجاز سے حقیقت کی آئینہ داری میں سب سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ حیدر وارثی کے یہاں مجاز اور حقیقت کے سنگم پر الفاظ وسیلۂ اظہار بنتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت عکس ہے اس بے آباد تخلیقی باطن کا عارفانہ باز آبادکاری کی کوششوں کا جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

اور پروفیسر وارث کرمانی کے مطابق:

''علاء الدین حیدر وارثی صاحب کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزل وقتی تحریکوں کے بدلتے ہوئے اثرات سے محفوظ رہی ہے۔ یہ ان کی شاعری کی وہ خصوصیت کہی جاسکتی ہے جو استقامت اور پائداری عطا کرنے کے ساتھ شاعر کو گھاٹے میں بھی رکھتی ہے کیونکہ اس میں قارئین کو متوجہ کرنے کا چمتکار نہیں ہوتا ہے۔ حیدر وارثی نے ہماری شعری روایت میں رہ کر اپنے شعر نکالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے جسے انہوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے شعر میں ڈھالا ہے۔ حیدر وارثی کی شاعری چونکانے والی نہیں بلکہ دھیمی دھیمی آنچ دیتی ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے صبر اور تامل کی ضرورت ہے۔''

ان مشاہیر کی آراء سے اتفاق یا اختلاف کی کوئی راہ میرے لئے ضروری نہیں کہ وا ہو ہی جائے۔ سوائے اس کے کہ میں حیدر وارثی صاحب کے کلام کے حوالے سے ان مشاہیر کے مشوروں کا انطباق کرنے بیٹھ جاؤں۔ ادبی تنقید ذرا مشکل کام ہے۔ اس کام کے لئے شاعر کی شریف النفسی کوئی ہدایت نہیں دے سکتی اور نہ ہی اس کی اخلاق مندی اور سماجی زندگی کسی قسم کی رہبری کر سکتی ہے۔ شاعر کا کلام اس کا کل سرمایہ ہوتا ہے جس کی روشنی میں معیار متعین

کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ روایت کا کتنا اثر شاعر نے لیا ہے اور اس کے کلام کے وسیلے سے کس طرح کے فکری ابعاد سامنے آتے ہیں یہ باتیں اس کی شاعری کی کھلی قرأت کے بعد ہی سامنے آتی ہیں۔ حیدر وارثی صاحب غزل جیسی مشکل صنف کے شاعر ہیں۔ یہ صنف شاعری ہر زمانہ میں اپنی نا قابل تبدیل ساخت کے باوجود بدلتی رہی ہے۔ اس کا قالب نئے تجربوں سے مالا مال ہوتا رہا ہے۔ غزل کے دائمی مضامین میں نارسائی اور لاحاصلی مستقل رہے ہیں اور یہ غزل کی جان کہے جاتے ہیں اس کے باوجود بڑے شاعروں نے زندگی کے اثبات میں اپنے نادر تجربات پیش کیے ہیں۔ فرق صرف شاعر کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ کون کس طرح دیکھتا ہے، اس کے تجربوں کی نوعیت کیا ہے یہ غزل کی وسیع دنیا میں اہمیت رکھنے والے سوال ہیں۔ غزل کی شاعری پوری طرح ڈوب جانے کا پیغام دیتی ہے اور یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہ وہ اپنی ذات کو پوری طرح فنا کردے۔ میر اور غالب کے بعد اس طرح کا حوصلہ دکھانے والے کسی تیسرے شاعر کا وجود اردو میں نہیں کے برابر ہے۔ بقول غالب ع از موج گرد رہ نفس ایجاد کردی آسان کام تو ہرگز نہیں۔

راہ حیات کے گرد و غبار میں گھل مل کر کوئی لافانی سراغ حاصل کرنا وہی شاعر کرسکتا ہے جس کو جیتے جی زندگی سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ میر نے کہا تھا :

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

عشق میں اپنی جان اس قدر مبتلا کرنا کہ روتے پھرتے رہنا ہی روزگار ہو جائے میر کے بعد اور کس نے کر دکھایا ہے۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں دوسرا تو دکھائی نہ دیا۔ البتہ غالب نے میر کی روایت میں اتنا ضرور اضافہ کیا ہے کہ میر کی دیوانگئ عشق میں فرزانگئ حیات و کائنات کی آمیزش کر ڈالی ہے۔ غالب کی شاعری کا پورا طلسم اب تک لوگ سمجھ نہیں پائے ہیں اور بلا شبہ میر بھی پوری طرح دریافت نہیں ہو پائے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ تنقید خبر سے زیادہ کام لیتی ہے اور وجدان سے کم۔

حیدر وارثی پر لکھتے ہوئے میر اور غالب چلے آئے۔ یہ دو بڑے میرا کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ اگر یہ دونوں ہیں تو ہمیشہ رہیں گے، خواہ حیدر وارثی کی غزل سے کوئی چہرہ نکالنا ہی مقصود کیوں نہ ہو۔ میں نے ابھی لکھا ہے کہ پروفیسر لطف الرحمٰن اور پروفیسر وارث کرمانی کی رایوں سے اختلاف یا اتفاق کی راہ مجھے نکالنی نہیں ہے اور نہ ہی یہ جاننا مقصود ہے کہ حیدر وارثی صاحب کی شاعری نے کس زاویہ سے ان دونوں کو متاثر کیا۔ ایلیٹ نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ ہر شاعر کی انفرادیت اس کی روایت کے وسیلے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حیدر وارثی کے کلام میں ان کی کوئی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ غزل کی شاعری میں اس قسم کی جستجو آسان بھی نہیں۔ شعر اگر مکمل ہے اور پرتاثیر ہے تو یہ غزلیہ شاعری کی عظیم روایات کے سمندر میں جا گرے گا۔ وہاں اسے اس کے خالق کے نام سے تلاش کرنا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب اس نے اپنی فکر کا کوئی نقش چھوڑا ہوگا، مزید برآں اس کا اسلوب اس کی شاعرانہ شخصیت کا غماز ہوگا۔ مجھے حیدر وارثی کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے کسی نئے تجربہ سے ہمکنار نہیں ہونا پڑا اور نہ

ہی کسی ایسے اسلوب سے متعارف ہوا جسے کوئی اسم دیا جا سکے۔ البتہ ان کی خوش گوئی اور روایات کی پاسداری مجھ پر منکشف ضرور ہوئی۔ بعض اشعار نے متاثر بھی کیا:

کوئی نہ ملا ایسا جو موڑ لے منہ اپنا — تکرار کہاں کوئی جھگڑا ہے کہاں کوئی
جو رنگ ملا تجھ کو وہ رنگ حنا کا ہے — اس رنگ حنائی میں مکھڑا ہے کہاں کوئی
اوصاف سے تو اپنے تمثیل محبت ہے — اک پل جو ملا تجھ سے بچھڑا ہے کہاں کوئی
عین ممکن ہے وہ اوصاف حمیدہ ہوجائے — نقش اس وقت ہے ابھرا ہوا گمبھیر کوئی
مری مٹھی میں بھر جائے اجالا — میں ظلمت کو ڈرانا چاہتا ہوں
تیرگی ہی تیرگی ہے ہر طرف اے وارثی — کاش مل جاتا وہی جو روشنی بردار ہے
یہ سانحہ بھی عجب ہے کہ جی رہا ہوں میں — تمام چاک گریباں کو سی رہا ہوں میں
یہ کیسی چشم عنایت ہے تم ذرا دیکھو — پلا رہا ہے کوئی اور پی رہا ہوں میں
ایوانِ دل میں بس گیا جب کوئی مجتہد — تجدید عصر کا تو وہی اعتبار ہے

ان اشعار کی روشنی میں پروفیسر لطف الرحمٰن اور وارث کرمانی کے بعض خیالات کی تصدیق ہو سکتی ہے مثلاً بقول لطف الرحمٰن ''حیدر وارثی نے حیات و کائنات کے نازک مسئلوں کو تخلیقی سطح پر سادگی اور طرح داری کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے۔'' اور بقول وارث کرمانی ''حیدر وارثی کی شاعری چونکانے والی نہیں بلکہ دھیمی دھیمی آنچ دیتی ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے صبر اور تامل کی ضرورت ہے۔'' یہ دھیمی دھیمی آنچ کا پیدا کرنا دراصل غزل کا بنیادی وصف ہے اور حیدر وارثی نے اپنے اکابر شعراء سے اس ہنر کو سیکھا اور سمجھا ہے۔ انہیں اس ہنر کے اندر وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو یقیناً گہرے تجربے اور مشاہدے کے بعد ہی ممکن ہے۔

حیدر وارثی اکثر مجھ سے اپنی گفتگو کے دوران اپنے روحانی مکاشفوں اور تجربوں کا بیان کرتے ہیں اور ذات و کائنات کی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس تذکرہ میں میر و غالب کے علاوہ اجتبیٰ رضوی بھی چلے آتے ہیں۔ شاید یہ اجتبیٰ صاحب کا فیضان ہی ہے جو ان کے یہاں کچھ مابعد الطبیعاتی لشکارے دکھائی دے جاتے ہیں۔ جس غزل کے اشعار ذیل میں درج کر رہا ہوں وہ خود حیدر وارثی کی غزل کائنات میں ایک نادر دریافت کی حیثیت رکھتی ہے:

نہا گئی کوثر میں رات — آئی ہے نوری برسات
عام ہوئی ہے بادہ کشی — حیرت میں ہے میری ذات
کیسی دوری اس نے بڑھائی — ہو نہیں پائی کھل کر بات
کام آئی تنہائی مجھے — کہئے اس کو سرِّ حیات
جب جب حیدر کیف میں آئے — وجد میں آئی اپنی ذات

میں بہت حیرت میں ہوں کہ حیدر وارثی نے اس لب ولہجہ کو بالآخر پا ہی لیا جو غزل کا اختصاص ہے۔ کتنی آسانی

سے چھوٹی بحر میں روانی کے ساتھ گہرے مکاشفے اور روحانی تجربے کی بات وہ پیش کر گئے ہیں۔ جب شاعر ایسی کسی منزل میں پہنچ جائے تو تنقید بھی حد ادب کے ساتھ پیچھے چھوٹ جاتی ہے۔ میری تمنا ہے کہ حیدر وارثی غزل کے رمزو ایماء کو پوری طرح پا جائیں اور اس کے اندر جدت بھی پیدا کریں۔ ظاہر ہے کہ جدت پیدا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ سینکڑوں سال پر مبنی روایات کے ساتھ غزل کے بعض کلیشے اور ہزار بار برتی گئیں اصطلاحات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ ان سے صرف نظر کر کے آگے بڑھنا اتنا آسان نہیں اور ہر زمانہ میں کوئی غالب پیدا ہو جائے اور وہ گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج ہو بہت مشکل ہے۔ غالب نے غزل کی اندرونی ساخت کو اپنے جدلیاتی عمل سے توڑا اور ایک نیا قالب بنایا۔ یہ ممکن نہیں کہ حیدر وارثی تاریخ کے اس دور میں غالب کی سی مجتہدانہ تخلیقی مہمیز کو اپنائیں کیونکہ یہ ان سے ہو نہیں سکتا لیکن علامہ جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کے دکھائے ہوئے راستوں سے ضرور فیضیاب ہو سکتے ہیں اور مندرجہ بالا غزل جو اس بات کا علامیہ ہے کہ انہوں نے اپنے قریب ترین پیش روؤں سے فکر اور اسلوب کی سطح پر مثبت انداز میں کچھ سیکھا بھی ہے۔ درج ذیل اشعار ان باتوں کے ثبوت کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

وہ کون تھا جو ضرب لگا کر چلا گیا — باقی ہے گونج اس کی ابھی تک دیار میں
ہے ساز کائنات بھی سوز حیات میں — اس آنچ میں جگر کو جلاتا رہا ہوں میں
راز حیات کس سے کہوں اجنبی ہیں سب — ہمراز میرے کوئے خموشاں چلے گئے
الفت کے نخل جس نے اگائے تھے جا بہ جا — مجھ کو جگا کے سوئے شبستاں چلے گئے
جانے کیسی بہار آئی ہے — آج خاروں کی رونمائی ہے
دیکھ اس پر بھی ہنس پڑی دنیا — جس نے میری ہنسی اڑائی ہے
آسماں کے بدل گئے تیور — مشکلوں میں زمین آئی ہے

جناب حیدر وارثی کی شاعری واحد متکلم کے تجربات و احساسات پر مبنی ہے۔ کاش یہ واحد متکلم پوری کائنات کی ترجمانی پر کمر بستہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ شاعری زندوں میں شامل ہوگی اور ایک بسیط دنیا کا آئینہ خانہ بنے گی۔

☆☆☆

صدر، شعبۂ اردو، ایم آر ایم کالج، دربھنگہ (بہار)

● شہر کی معروف شخصیت جناب نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم) محلہ کرم گنج دربھنگہ کی اہلیہ محترمہ **صدیقہ خاتون** (نبیرہ جناب بیرسٹر محمد شفیع مرحوم یکہتہ مدھوبنی) کا انتقال ۵ر اکتوبر ۲۰۲۰ء صبح ساڑھے چار بجے ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور پسماندگان میں شوہر اور تین بیٹے ڈاکٹر آصف اقبال، کاشف اقبال اور اشرف اقبال کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین۔ مرحومہ کی عمر تقریباً ۷۲ رسال تھی اور برسوں سے صاحب فراش تھیں۔ مرحومہ کے جنازہ کی نماز بعد نماز ظہر ۲ ربجے دن میں کرم گنج کے معصوم نگر قبرستان میں ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔

....

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

سر سید اور سنہ ستاون

1857ء کا غدر نہیں ہوتا تو نہ سر سید ہوتے اور نہ ان کا نظریہ تعلیم ہوتا، نہ ان کی تعلیمی سرگرمیاں ہوتیں اور نہ ان کی معروف درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہوتی۔ یا اگر کچھ ہوتا تو بہت معمولی اور نا قابلِ ذکر ہوتا۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سر سید کے عہد میں مسلم علماء اور دانش وروں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی، ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کوئی اٹھتا اور ڈوبتی قوم کی نیاں کو پار لگا کر اسے ترقی کی راہ پر ڈال دیتا۔ لیکن عہد سر سید پر نظر ڈالنے کے بعد کچھ ایسے نکات سامنے آتے ہیں جو ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ پہلا نکتہ یہ کہ سر سید کا انگریزوں سے جس نوعیت کا ربط و تعلق تھا اس سے نہ تو کسی کو اتفاق تھا اور نہ کوئی اس نوع کے تعلق کے لیے کسی طور آمادہ تھا جس سے مشرقی اقدار اور مذہب اسلام کو خطرے کا سخت اندیشہ ہو۔ دوسرا نکتہ فکر اور زاویۂ نظر کا تھا۔ سر سید دینی مزاج اور مذہبی وضع قطع رکھنے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان ایک نئی اور بالکل تازہ کار ذہن لے کر منصۂ شہود پر وارد ہوئے تھے اور دوسری طرف ان کے معاصر علماء اور دانش وران تھے جو انھیں کسی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

1857ء کا غدر حصول آزادی کا وہ ناپختہ اور نا مکمل پریاس تھا جس نے ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ تاریخ کے صفحات ابھی روشن ہیں کہ غدر میں ہندوستان کا کم وبیش ہر طبقہ شریک تھا، لیکن برق کو گرنا تھا تو مسلمانوں پر۔ اس لیے مسلمان ہر طرح سے معتوب اور مغضوب ہوئے۔ سرعام انھیں قتل کیا گیا، علماء کو پھانسیاں دی گئیں، مراعات واپس لے لی گئیں، جاگیریں ضبط ہوئیں۔ یعنی حصول آزادی کے لیے چھیڑی گئی اس کمزور اور ناتواں بغاوت نے الٹا کام کیا اور مسلمانوں کے لیے قیامت صغریٰ کا ماحول تیار کر دیا۔ اس اچانک کی آفت کے وقت جبکہ پوری قوم خوف و دہشت، مایوسی اور تنگ حالی کی کیفیت میں مستغرق تھی، اس وقت سر سید نے مسلمانوں کو اس مایوسی، تباہ حالی اور پستی سے باہر نکلنے کا ذریعہ صرف اور صرف حصول علم اور بالخصوص جدید علوم کو قرار دیا۔

سر سید کی اس ابتدائی کوشش کی راہ میں تین رکاوٹیں سامنے تھیں۔ پہلی یہ کہ انگریزوں کی نظر میں مسلمان بغاوت کے مجرم تھے، دوسری یہ کہ یہ ٹوٹ چکے تھے اور کسی طرح کی حمایت اور مدد پہنچانے کے لائق نہیں تھے۔ تیسری رکاوٹ تھی کہ مسلمانوں کے بیشتر مذہبی پیشوا سر سید کو ان کے مشن اور کاز سے باز رکھنے کے لیے ان کے خلاف مورچہ بند ہو چکے تھے۔ ان حالات میں سر سید اپنے تعلیمی مشن اور طے شدہ اہداف کی طرف کیوں کر بڑھ سکتے تھے، اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ لیکن سر سید کی بڑی خصوصیت ان کی سخت جانی اور ثابت قدمی تھی، لہٰذا ان حالات میں بھی ان کے پاؤں نہیں اکھڑے۔ انھوں نے اسبابِ بغاوت ہند اور سرکشی بجنور جیسی تصنیفات کے ذریعے انگریز حاکموں کو یہ باور کرایا کہ مسلمانوں کو غدر کا مجرم ٹھہرانا غلط ہے نیز یہ کہ مسلمان امن پسند اور تاج برطانیہ کے بدخواہ نہیں ہیں۔

سر سید اپنے عہد کے نبض شناس تھے۔ انھوں نے پہلی دفعہ مسلمانوں کا تقابل ترقی یافتہ قوموں سے کر کے دیکھا اور اپنے عوام کو دکھایا۔ وہ خود بھی ملول ہوئے اور قوم کو بھی اس باریکی اور نزاکت کا احساس کرانا چاہا۔ لیکن قوم تو قدامت پرستی اور فرسودہ خیالی کی پرفریب وادی سے باہر نکل کر حقیقت کی ٹھوس اور نئی زمین پر پیر ٹکانا ہی نہیں چاہتی

تھی۔سرسید کے متعلق عام خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے بھٹکانا چاہتے تھے۔اس لیے انگریزوں سے مل کر وہ مسلمانوں کے گھروں میں انگریزی کی لعنت کو پہنچانا چاہتے تھے جبکہ سب جانتے ہیں کہ ان کا وِژن بہت وسیع اور خیال بہت متنوع تھا۔انگریزی ان کے لیے صرف ایک ذریعہ اور میڈیم تھی،وہ تو اس کے ذریعے مسلمانوں میں سائنسی علوم کو پہنچانا چاہتے تھے۔وہ سائنسی شعور کی بیداری کے لیے قوم کو آمادہ کرنا چاہتے تھے۔وہ اس بات پر شدت کے ساتھ زور دیتے تھے کہ ہر شئے کو سائنٹفک اور عقلی نظریہ سے دیکھیں اور پھر انھیں پرکھیں۔سرسید مغرب کے بدلتے ہوئے مزاج اور اس کے رخ کو معلوم کر چکے تھے۔انھیں علم تھا کہ دنیا کی دیگر قوموں کی ترقیوں اور خوش حالیوں کا دارومدار ان کی جدت فکر اور سائنسی مزاج و عقلی طریقۂ کار ہے۔

اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور اس میں ہر مذہب کے ذی علم اور ذی شعور اشخاص کو شامل کیا۔اس سوسائٹی کے قیام کا مقصد روایتی تعلیمی نظام کی فرسودگی اور قدیم علوم وفنون کی Irrelevancy کی جگہ جدید سائنسی انداز کے ساتھ سیاسی،سماجی اور تمدنی مسائل اور ان کے سدباب پر گفت وشنید کرنا اور اس سمت میں عوام کی ذہن سازی کرنا تھا۔سوسائٹی کے اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی'' میں سرسید نے سوسائٹی کے قیام کی غرض وغائت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''ہندوستان میں علم کو پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کر کے چھاپے۔''

مذکورہ سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے سرسید اور ان کے رفقا نے عوام میں سائنسی رغبت پیدا کرنے کے لیے ان کے درمیان جا کر متعدد سائنسی تجربات کے مظاہرے کیے۔کئی جلسے برپا کئے،تبادلۂ خیال کا سلسلہ چلا اور فی زمانہ سائنس کی نعمتوں اور سہولتوں کی بابت عوام کو جانکاریاں فراہم کی گئیں تا کہ وہ غدر کی طویل مایوسی اور ضرب کاری کے مجس سے باہر نکلیں اور رفتہ رفتہ دنیا کے مقابل کھڑا ہونے کی اپنے اندر طاقت پیدا کرلیں۔

سرسید کا نظریہ تعلیم بہت واضح اور روشن تھا۔اس میں کوئی ابہام اور اغلاق کا شائبہ نہیں تھا۔وہ توازن اور اعتدال کے قائل تھے۔وہ جدید علوم کے حامی تھے۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ مذہبی یا مشرقی علوم کے مخالف تھے۔محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت وہ جدید علوم کے حصول پر زور دیتے تھے۔وہ ہر طبقے کی تعلیم کے حامی تھے۔وہ کشادہ قلب اور وسیع ذہن کے مالک تھے اور اس کے شواہد بہ آسانی دستیاب بھی ہیں۔

سرسید کے تعلیمی نظریات کے متعلق بعض اہالیان علم کو اعتراض ہے۔ان کے مطابق سرسید تعلیم نسواں کے خلاف تھے اور عورتوں کی تعلیم کو غیر ضروری اور کارِ فضول قرار دیتے تھے۔یہ اعتراض سرسید کے پورے مشن پر ایک بڑے سوالیہ نشان کی طرح ہے۔اس کی توضیح کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سرسید جنسی تعصب کے تحت عورتوں کو تعلیم و تعلم سے دور رکھنا چاہتے تھے۔اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمیں سرسید کے عہد کو دیکھنا چاہیئے جہاں عورتوں کی پردہ داری،باہر نکلنے پر پابندی اور مردوں کے سایے سے دوری کا چلن عام تھا۔مسلمانوں کی اکثریت اپنی عورتوں اور بچیوں کو گھر کی چہار دیواری میں محفوظ دیکھنا چاہتی تھی۔پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کھلی فضا مہیا کرائی جاتی۔جبکہ سرسید کے انتقال کے بہت بعد بھی یہ ممکن نہیں ہو پایا۔جب 1916ء میں شیخ

عبداللہ نے لڑکیوں کا ہاسٹل قائم کر کے اس میں داخلے کا اعلان کیا تو ان کی درخواست صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ہاسٹل میں خود اپنی تین لڑکیوں کو داخل کروایا تب جا کر رفتہ رفتہ ماحول بدلنا شروع ہوا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سرسید تعلیم نسواں کے حمایتی تھے۔ وہ اکثر اپنی فکر مندی کا اظہار بھی جگہ بہ جگہ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے عہد اور ماحول کے پیش نظر کھلے ماحول کے بدلے محفوظ مقام پر ان کی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ وہ اس لیے کہ یہ عہد کا بھی تقاضا تھا اور مذہبی مزاج کا بھی۔ سرسید نے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اپنے مختلف اسفار کے دوران عوام کے روبرو اس موقف کا اظہار بھی کیا۔ پنجاب کے سفر کے دوران انھوں نے عورتوں کو مخاطب کر کے کہا کہ:

''اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو...... تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے''۔

(سرسید کا سفر نامۂ پنجاب، سید اقبال، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس 1884ء، ص:103)

اتنا ہی نہیں سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں عورتوں کی تعلیم پر مضامین تحریر کیے۔ سائنٹفک سوسائٹی لکچر سیریز کے تحت تعلیم نسواں کو ضرورت اور اہمیت پر تقریریں کیں۔ ایک مقام پر انھوں نے لکھا کہ:

''یورپی عورتوں کو یہ سن کر کہ ہندوستانی عورتیں عموماً ناخواندہ ہوتی ہیں ویسا ہی صدمہ ہوگا جیسے کسی ہندوستانی کو بازار میں ننگی عورت کو چلتے پھرتے دیکھ کر ہوتا ہے''۔

(تہذیب الاخلاق، جلد 35 شمارہ 10 اکتوبر 2016ء)

اس اظہار تاسف اور کم مائیگی کے باوجود سرسید اپنی حیات میں چاہ کر بھی عورتوں کی ماڈرن تعلیم کے لیے کوئی آزاد ادارہ قائم نہ کر سکے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد خواجہ غلام الثقلین، کرامت حسین، نذیر احمد اور سب سے بڑھ کر شیخ عبداللہ جیسے ان کے ہم نواؤں اور پیروکاروں نے ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا اور آج اس کی بہترین مثالیں ہم ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ جدید علوم ہوں، سائنسی علوم ہوں یا تعلیم نسواں کا مسئلہ ہو، ان تمام امور کی طرف سرسید کو 1857ء کے غدر نے متوجہ ہونے کے لیے مہمیز کیا۔ اور اسی ناکام بغاوت نے سرسید احمد کو سرسید احمد خان بنایا اور بالآخر وہ ایک مصلح قوم اور تعلیم وتربیت کا روشن مینارہ بن کر دنیا بھر میں چمکے اور دمکے۔ آج ملکی اور عالمی سطح پر غدر سے بھی زیادہ بڑے اور سنگین حالات وسانحات قوم کے سامنے موجود ہیں۔ آج عالمی سطح پر ہر وہ حربہ استعمال ہو رہا ہے جو مسلمانوں کو پستی، گمنامی اور تباہی کے آخری سرد ہانے تک پہنچا دے۔ لیکن آج عام مسلمان کیا سرسید کے افکار کے پروردہ اور ان کی درسگاہ کے بے شمار باکمالوں اور خوش حالوں کو بھی قوم کی کوئی پروا نہیں۔ کوئی نہیں جو سرسید کے کاز کو بڑے پیمانے پر آگے بڑھائے۔ کیا ہماری قوم اور فرزندان علی گڑھ کا یہی خراج ہے سرسید کو؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ضرور سامنے آنا چاہیئے تا کہ اس کی روشنی میں قوم کی آئندہ تعلیمی اور معاشرتی صورتحال کا ہم صحیح صحیح اندازہ کر سکیں۔

....

Near Mirshikari, Toli Masjid, Kali Bagh, Bettiah-845438, Mob. 7011548240

ڈاکٹر عشرت بیتاب

عشرت ظہیر کی ابھرتی ڈوبتی تحریریں

عشرت ظہیر، مجھ سے عمر میں ایک سال چھوٹے ہیں۔ان کی سنہ پیدائش ۲۰ر جنوری ۱۹۵۳ء کی ہے اور میری پیدائش یکم جنوری ۱۹۵۲ء کی ہے۔ہوئے نا ایک سال چھوٹے، مگر اپنی تحریروں میں مجھ سے کئی سال بڑے نظر آتے ہیں۔ویسے ان سے ہماری ملاقات دو ایک بار ہی رہی ہے لیکن ذکر میں ہمیشہ رہے ہیں۔کبھی عبدالمتین صاحب معروف فکشن نگار، جن کا قیام عرصہ تک آسنسول میں رہا۔اپنی گفتگو کے دوران اکثر اپنے بھیجتے عشرت ظہیر کا ذکر کرتے، کبھی موصوف کے افسانوں کے حوالے سے ان کا ذکر چھڑ جاتا۔اس طرح عشرت ظہیر ہمیشہ ہم لوگ کے بیچ رہے ہیں اور سب سے بڑی بات، نام کی یکسانیت نے میرے ذہن کے نہاں خانوں میں انہیں ہمیشہ محفوظ رکھا۔

آج ان کا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے قیدی'' کی دستیابی نے ذہین کے بند دریچوں کی بہت ساری پرتیں کھول دیں۔حالانکہ گذشتہ ہفتے اچانک ان کا فون بھی آیا تھا کہہ رہے تھے۔

''عشرت بھائی! میں عشرت ظہیر بول رہا ہوں۔''

''اچھا، اچھا...... عشرت ظہیر صاحب ہیں، بہت دنوں کے بعد میری یاد کیسے آئی۔ان دنوں کہاں ہیں آپ''؟

''فی الحال تو میں دلی میں ہوں۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس میں آپ کی کتابوں کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔یہیں سے آپ کا نمبر حاصل کیا۔''

''تو گیا سے رخصت لے لی کیا؟''

''نہیں، نہیں...... وطن کی مٹی تا حیات کبھی چھوٹی ہے نہ چھوٹے گی۔یہاں دہلی میں بچے رہتے ہیں۔اکثر آنا جانا رہتا ہے اور پھر میری کتاب بھی یہیں چھپ رہی ہے، آپ سے گذارش ہے کہ اپنا پتہ whatsapp پر بھیج دیں۔اپنی کتاب بھجوا دوں گا۔''

''اس عمر میں واٹس اپ تو نہیں کر سکتا۔آپ چاہیں تو پتہ نوٹ کر سکتے ہیں، بول رہا ہوں۔''

اور پھر ہفتے کے اندر ہی ان کی تازہ کہانیوں کا مجموعہ ڈاک کا ہرکارہ لے کر حاضر ہو گیا۔''

ڈاک سے کئی کتابیں آئیں تھیں۔جہاں مناظر عاشق ہرگانوی کی تازہ کتابوں کا بنڈل تھا وہیں محترم عشرت ظہیر کی کتاب ''خوابوں کا قیدی'' کی بھی ایک جلد تھی۔عادت کے مطابق میں نے لفاف کھول کر کے بعد دیگرے ساری کتابوں کا سرسری جائزہ لیا۔اور پھر اپنی فکشن نوازی سے مجبور ہو کر عشرت ظہیر کی کتاب پر نظریں گاڑ دیں کہ مناظر صاحب پر تو کل ہی ایک مضمون مکمل کیا تھا۔

عشرت ظہیر کے افسانوں کا میں شروع سے ہی اسیر رہا ہوں۔گرفتاری کا سبب بیان نہیں کر سکتا لیکن یہاں مطالعہ کے بعد قرض کی ادائیگی کا خیال لاحق ہو گیا۔کاغذ، قلم ٹٹولا اور میز پر بیٹھ گیا۔میری یادداشت کے مطابق ان کی پہلی کتاب بھی میری ذاتی لائبریری میں موجود ہونی چاہئے تھی مگر تلاش بسیار کے باوجود کتابوں کی ڈھیر سے اسے نکال نہیں پایا۔ممکن ہے کہ کسی طالب علم کو مطالعہ کیلئے دیا ہو اور واپسی نہیں ہوئی۔بہرحال تازہ مجموعہ کو یکسوئی سے پڑھنے لگا۔

''خوابوں کا قیدی'' عشرت ظہیر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے اس سے قبل موصوف کے تین افسانوی مجموعے آ چکے ہیں۔ اول ''ابھرتی ڈوبتی لہریں'' (۱۹۷۹)، دوئم ''متوازی خطوط'' (۱۹۸۹)، سوئم ''خوشبو کا جال'' (۲۰۱۶) اور تازہ انتخاب ''خوابوں کا قیدی'' (۲۰۱۹) جو زیر مطالعہ ہے۔ اس میں کل ۱۸؍افسانے شامل ہیں افسانے کے ابتدائی صفحے پر درج ''انتساب'' ان کی ندرت تحریر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس صفحہ کو موصوف نے اپنی خلد آشیاں والدہ محترم کے نام منسوب کیا ہے جسے پڑھ کر ان بوڑھی آنکھوں میں بھی آنسو امنڈ آئے کہ کبھی میں نے بھی اپنی ماں کو کھویا تھا جس کی تلاش آج تک جاری ہے۔ عشرت ظہیر کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''میرے دونوں ہاتھوں میں مٹی ہے۔
میں نے اپنے ہاتھوں کی مٹی ماں کی قبر پر ڈال دی ہے۔
اندھیرا سمٹ آیا ہے اور میرے اندر تحلیل ہو رہا ہے'
میرا پورا وجود مٹی کی خوشبو میں ڈوبا ہوا ہے۔
ماں —'
میں دھیرے سے پکارتا ہوں۔'' ص/۳

مجموعہ میں شامل تعارفی مضمون ''عشرت ظہیر ایک جائزہ' بدنام نظر کی تحریر ہے جسے موصوف نے نہایت پر خلوص انداز میں رقم کیا ہے۔ بدنام نظر معروف شاعر و ادیب ہیں۔ ان کے مضمون سے عشرت ظہیر کی فن کارانہ بصیرت پر روشنی پڑتی ہے نظر صاحب کی یہ تحریر ملاحظہ کریں:

''عشرت ظہیر کے اندر ایک افسانہ نگار بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں ان کی اپنی سوچ ہے، اپنا پیرایۂ اظہار ہے، زندگی کے بارے میں ان کا اپنا رویہ ہے جو ان کی 'بند مٹھی' میں مقید ہے جسے وہ جب چاہتے ہیں کھولتے ہیں اور کبھی جگنوؤں کی روشنی سے قاری کے اندر جینے کی للک پیدا کرتے ہیں اور کبھی خوشبو سے قاری کو نہلا دیتے ہیں۔'' (ص:۱۳)

عشرت ظہیر کے افسانوں کے سلسلے میں مدیر شاعر کے خیالات بھی ملاحظہ کیجئے:

''عشرت ظہیر نے اپنے افسانوں کی سادگی، حسن، ٹھہراؤ اور ذہنوں میں سرایت کر جانے والے فوری عمل کی وجہ سے اعتبار کی معروف فضا بنالی ہے ان کے یہاں انفرادی تجربے اجتماعیت کی زبان ہے۔ موضوعات گوندھنے کا سلیقہ ہے، مگر شعور اور لاشعور تخلیقی رویوں سے جگہ جگہ اس طرح متصادم ہوتے ہیں کہ افسانہ ڈوبتا ابھرتا ہوا کوئی خوبصورت پیکر لمحہ یا منظر نامہ بنا ہی لیتا ہے۔'' (ڈسٹ کور ۱۹۸۱ سے ماخوذ)

عشرت ظہیر پڑھے لکھے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کے دادا محترم حکیم سید محمد ظہیر صاحب کی تربیت نے کئی شاعر و ادیب پیدا کئے۔ انتخاب کے دوسرے صفحے پر عشرت ظہیر نے اپنے چھوٹے چچا جمیل ظہیر کے اشعار قلم بند کئے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

کئی دنیا نہیں خوابوں کے جہاں سے آگے
ایک حد ہے، نہ گیا کوئی وہاں سے آگے

سید شاہ محمد عشرت ابن سید محمد ظفیر کی پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۵۳ء کو گیا میں ہوئی۔ آپ عشرت ظہیر کے نام سے ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ آپ ایک مدت تک کلام حیدری کی اشاعتی ادارے سے منسلک رہے۔ آپ ادبی دنیا میں بچوں کے ایک ادیب کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کا سلسلہ ۱۹۶۷ء سے شروع کیا۔ بچوں کے حوالے سے آپ کی پہلی کہانی بعنوان ''نمک'' کلیاں (لکھنؤ) میں ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد تواتر کے ساتھ آپ کی کہانیاں ''پیام تعلیم'' (دہلی)، ''اردو کومک'' (مالیگاؤں) جیسے معیاری رسالوں میں شائع ہوتیں رہیں۔

بچوں کا ادب لکھنا نہایت دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے بڑوں کے لئے ادب لکھنا تو ذرا آسان ہے مگر ادب اطفال خشک زمین میں بیج بونے کے مترادف ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ جوئے شیر لانے کے مصداق ہے خالد سرحدی ادب اطفال کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> ''جس ادب میں قلم کار اپنی فکروں کو جمع کرنے کے بعد اسے بچپن کی سرسبزیوں اور شادابیوں سے سجا کر اپنی قابلیت اور شہرت کو بھلا کہ بچپن کی طرف لوٹ جائے اور خود ایک بچہ بن جائے اس ادب کو ادب اطفال کہتے ہیں۔''

سچ ہے بچوں کا ادب لکھنا ذرا مشکل کام ہے یہاں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ عبارت کہیں سے بھی بچوں کے معیار سے نہ ہو جائے۔ تحریر سروں کے اوپر سے نہ چلی جائے وغیرہ وغیرہ۔

عشرت ظہیر کی کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو اس مرحلے سے گزرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔ آپ درس و تدریس کے پرائمری شعبے سے جڑے تو نہیں لیکن بچوں کے نفسیات سے خوب خوب واقف ہیں بچوں کی کہانیاں یہاں لکھتے وقت ممکن ہے ان کا بچپن عود آتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف سیدھے سادے لفظوں اور دل نشیں انداز میں کہانی بیان کرتے ہیں ان کی کہانیاں ادب اطفال میں خوش گوار اضافہ ہیں۔

بچوں کی کہانیوں کے بعد عشرت ظہیر ۱۹۷۱ء کے انقلابی تحریک سے متاثر ہو کر بڑوں کے ادب کی طرف متوجہ ہوئے ۱۹۷۱ء کا واقعہ زبان کے تحفظ سے وابستہ تحریک ہے انسان اپنی زبان سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا اگر اس پر غیر صوبائی زبان مسلط کی جائے تو احتجاج کے ساتھ ساتھ انقلابی نعرے بلند ہونے لگتے ہیں اور یہی سب کچھ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے ساتھ ہوا اور پھر احتجاج کے سائے میں نیا سورج طلوع ہوا جس سے بنگلہ دیش کا وجود عمل میں آیا۔

ایک ادیب جو ہمیشہ سچ بولتا ہے، سچ سوچتا ہے اور یہی سچ احتجاج کی نیو ہے احتجاج وہ سچا لفظ ہے جو تقدس آمیز ہوتا ہے۔ احتجاج وہ بلند بانگ خاموش آواز ہے جس سے گنبد بے پایاں کی دیواریں بھی ہل جاتی ہیں۔ احتجاج قلم کی وہ نب ہے جو خون دل کی سیاہیوں سے قرطاس پر پھیلتی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ عشرت ظہیر کا افسانے کی طرف راغب ہونا، اس وقت کے حالات کے خلاف ایک احتجاجی نعرہ ہے۔ عشرت ظہیر کا افسانہ ''ساعتوں کا سمندر'' بنگلہ دیش کے سانحہ پر ایک عالم گیر احتجاج ہے۔ موصوف کا یہ پہلا افسانہ ہے جو ۱۹۷۱ء میں رسالہ ''معمار'' (ارمور) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک انہوں نے سینکڑوں افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں جدید دور کے کرب اور اضطراب کی کیفیت ملتی ہے۔ ''ساعتوں کا سمندر'' کا یہ

اقتباس ملاحظہ کریں :

''کمرے کی لائٹ آف ہے لیکن پنکھا ست رفتار سے چل رہا ہے۔ اچانک وولٹیج بڑھ جاتا ہے، پنکھا تیز ہو جاتا ہے۔ اب کمرے میں آندھیاں چل رہی ہیں۔ آندھیاں؟ یہ آندھیاں میرا پیچھا ازل سے کر رہی ہیں۔ کیا انہیں کوئی اور نہیں ملتا؟ بغل کے کمرے میں میرا بڑا لڑکا ریڈیو پر نیوز سن رہا ہے۔''

(خوابوں کا قیدی سے ماخوذ ص:۶۱)

عشرت ظہیر ۷۰/۸۰ کی دہائی کے پیداوار ہیں کہا جاتا ہے کہ جس طرح ساتویں دہائی طلوع ہوتے ہوتے ترقی پسند تحریک کا زوال ہو گیا تھا اسی طرح اٹھویں دہائی آتے آتے جدید افسانے کا ڈھانچہ بھی بکھرنے اور ٹوٹنے لگا تھا تب ہی نئے قاری کی نئی نسل پیدا ہوئی اور پھر نئے اذہان کی تخلیق عمل میں آئی۔ ویسے بھی روایت میں تبدیلی اردو افسانے کی تاریخ رہی ہے۔

عشرت ظہیر اسی تبدیلی کا ایک حصہ ہے۔ اسی ٹوٹتی پھوٹتی قدروں کے ترجمان ہیں جہاں نئے زاویے اور نئے اسلوب برتے جا رہے تھے جیسا کہ بدنام نظر لکھتے ہیں۔

''اس درمیان جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا جھگڑا شروع ہو گیا کئی اچھے رسالے بند ہو گئے کئی نئے رسالے وجود میں آئے، اکاڈمیوں اور کئی دوسرے اداروں میں، کرسی، انعام اور اسناد کی چھینا جھپٹی پہلے سے کچھ زیادہ تیز ہو گئی۔ کئی لوگوں کے پاؤں دور دراز کا سفر کرتے کرتے جوتوں سے خالی ہو گئے۔ تلوؤں میں چھالے پڑ گئے اور کئی لوگوں کے جوتوں کی پوجا ہونے لگی۔ یہ سارا تماشہ دیکھ کر بے چارہ تخلیقی فنکار ہکا بکا اپنی تخلیق کو دیکھتا اور کبھی ادب کے اسٹیج کو، جہاں طرح طرح کے تماشے ہو رہے تھے۔ اوپر اسٹیج پر جانے کی نہ اس میں ہمت تھی نہ لیاقت۔ اب جب تماشے کم ہوئے تو پھر وہ کہیں کہیں نظر آنے لگے ہیں۔ شاید عشرت ظہیر بھی ایسے ہی فنکاروں میں سے ایک ہیں۔''

(خوابوں کا قیدی سے ماخوذ ص:۱۳)

عشرت ظہیر کا پہلا افسانوں مجموعہ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل انیس افسانے شامل ہیں۔ جس میں ''کپل وستو''، ''میں گوتم ہوں''، ''مٹی''، ''بوجھ''، ''اندر کی آواز''، ''وہ اور میں''، ''ابھرتی ڈوبتی لہریں'' قابل ذکر ہیں۔ ''ابھرتی ڈوبتی لہریں'' ان کے مجموعہ کا ٹائٹل افسانہ ہے۔ یہ افسانہ شاعر ممبئی میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کو موصوف کا ہی نہیں اردو ادب کا ایک نمائندہ افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''سمندر کا سکوت و جمود اور اس کی ہر ہر موج کی پرچھائی میری سانسوں کی آمد و شد کا پتہ دے رہی ہے گویا میری زندگی، سمندر کی زندگی، سمندر کی زندگی، میری زندگی اور یوں سمندر کی زندگی اور میری زندگی ایک ہی کہانی کے دو روپ ہیں۔ لیکن آج سمندر کی شانتی کو میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں اور مجھے بڑی الجھن ہو رہی ہے میرے اندر کوئی بیٹھا ہے جو میری اس الجھن میں مزید اضافہ کر رہا ہے اور پیہم احساسات کے اذیت ناک سانپوں سے مجھے ڈسوا رہا ہے۔''

(''ڈوبتی ابھرتی لہریں ص:۱۵۶)

موصوف کے افسانوں کے سلسلے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی اپنی تحقیقی کتاب ''بہار میں اردو، افسانہ نگاری'' میں لکھتے ہیں:

''جدید افسانہ نگاروں میں ایک عشرت ظہیر بھی ہیں ان کے افسانوں کا رنگ و آہنگ تجریدی ہے یہ افسانہ جدید دور کے کرب و اضطراب اور آج کے معاشرے کی گھٹن کو پیش کرتے ہیں۔ بعض افسانے شعور کی رو کی تکنیک سے متاثر ہو کر لکھے گئے اور بعض میں تحلیل نفسی کے امور ہیں۔ ان کے چند اچھے افسانے ہیں ساعتوں کا سمندر، ابھرتی ڈوبتی لہریں، وہ اور میں، رشتوں کا حصار، کپل وستو۔'' (ص:۵۵)

دوسرا افسانوی مجموعہ ''متوازی خطوط'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں موصوف کی اسی کی دہائی کے افسانے شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۰ء آتے آتے اردو افسانہ اسلوب اور ہیئت کے کئی تجربوں سے گذرا مثلاً اصلاحی افسانے، رومانی افسانے ترقی پسند افسانے، جدید افسانے، بیانیہ افسانے، علامتی افسانے اور تجریدی افسانے لیکن اس دور میں بھی کئی افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھے۔ اس ضمن میں عشرت ظہیر کے بیشتر افسانے رکھے جا سکتے ہیں۔ عشرت ظہیر بالیدہ شعور اور بے دار حسیت کے مالک ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے تخلیقی لاشعور میں اُبلتے ہوئے وہ نشتر ہیں جو زندگی کے مسائل سائل کی جراحی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تیسرا مجموعہ ''خوشبوؤں کا جال'' ۲۰۱۶ء کی اشاعت ہے اس میں کل ۲۰/افسانے ہیں۔ اس کتاب کو موصوف نے اپنی شریک حیات کے نام منسوب کیا ہے۔ پیش لفظ اردو کے معروف افسانہ نگار حسین الحق نے لکھا ہے حسین الحق خود معروف افسانہ نگار اور محقق ہیں۔ ادب پر ان کی پکڑ بڑی مضبوط رہی ہے موصوف، عشرت ظہیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''عشرت ظہیر کا بیانیہ سادہ بیانیہ نہیں ہے اس میں تشبیہ، پیکر، محاکات تلمیح، دیومالائی اور ارد گرد کے مختلف جمالیاتی عناصر سے فنکار نے اپنے بیانیہ کو حتی الامکان دولت مند بنانے کی کوشش کی ہے۔''

(خوشبوؤں کا جال سے ماخوذ ص:۱۲)

عشرت ظہیر کے یہاں جدید انسان کا فطری سفر اور داخلی کرب کی جھلک ملتی ہے۔ صنعتی معاشرے میں مضطرب انسانوں کے ٹوٹتے ہوئے رشتے پر روشنی پڑتی ہے جیسا کہ انور سدید لکھتے ہیں:

''عشرت ظہیر کے افسانے داخل کی یاترا کے افسانے ہیں اس یاترا میں وہ ڈوبتے ہیں تو ابھرتے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کے ساتھ چلنے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔''

(انور سدید، ڈسٹ کور، خوشبوؤں کا جال سے ماخوذ)

غرض یہ کہ عشرت ظہیر کے یہاں آگہی اور بصیرت کی نئی جہتیں دکھائی پڑتی ہیں جن میں وہ سماج اور اس کی تفریق، مذہب اور مذہبی انتشار، سیاست اور سیاسی بے راہ روی اور اس طرح کے بے شمار تاریک گوشوں کا اُجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو موصوف کی کامیابی کی دلیل ہے۔

☆☆☆

''زیب کدہ''، جہانگیری محلہ، آسنسول-۲ موبائل: ۹۸۵۱۴۳۹۶۳۹

سلطان احمد ساحلؔ

اُردو کا گمنام شاعر

کراچی میں ۱۳/اکتوبر ۱۹۷۰ء کو شاعری، عاشقی اور قتل کا ایک بڑا خوفناک ڈراما ہوا تھا۔ اُس دن صبح لاہور کے ڈپٹی کمشنر سید مصطفےٰ حسین زیدی جو تیغ الہ آبادی کے نام سے شاعری بھی کرتے تھے اپنے فلیٹ کے ایک کمرے میں مردہ پائے گئے۔ اُن کے قریب ہی ایک نوجوان حسین عورت شہناز بے ہوش پڑی تھی۔ اخباروں میں اُسی شام کو مصطفےٰ زیدی کی موت کی خبر بڑے نمایاں انداز سے چھاپی گئی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بنیاد پر یہ لکھا گیا کہ انہوں نے اپنی محبوبہ کے ساتھ خودکشی کی تھی لیکن وہ مر گئے اور ان کی محبوبہ زندہ بچ گئی۔ اخبارات میں یہ بھی لکھا گیا کہ جب سے صدر پاکستان یحییٰ خاں نے ۳۰۳/اعلیٰ افسران کے ساتھ اُن کو برطرف کیا تھا ملازمت کے سلسلے سے وہ بہت پریشان رہتے تھے، انہوں نے اپنی جرمن نژاد بیوی اور بچوں کو بھی جرمنی بھیج دیا تھا اور وہ اکثر اپنے دوستوں میں بیٹھ کر یہ کہا کرتے تھے کہ وہ خودکشی کرلیں گے۔ انہوں نے اپنے چند دوستوں کو زہر کی ایک شیشی بھی دکھائی تھی جسے وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

مسٹر زیدی کے شہناز سے انتہائی قریبی تعلقات تھے۔ حالانکہ شہناز خود شادی شدہ تھی اور دو بچوں کی ماں بھی تھی — اور اس طرح یہ سمجھ لیا گیا کہ ایک شاعر نے مصائب سے اکتا کر خودکشی کرلی اور زندگی سے نجات حاصل کرلی۔ لیکن چار دن بعد جب پولس کو یہ معلوم ہوا کہ شہناز صرف زیدی مرحوم کی محبوبہ ہی نہیں تھی وہ پاکستان کے کئی اعلیٰ افسروں اور مالدار اسمگلروں کی بھی محبوبہ رہ چکی ہے تو پولس نے شہناز سے ملاقات کر کے اپنی تفتیش جاری رکھی — اس سے قبل شہناز کے خلاف اقدام خودکشی کے الزام میں ایک مقدمہ درج ہو چکا تھا۔!

شہناز نے پولس سے کہا ''میری ملاقات مسٹر زیدی سے جب ہوئی تھی جب وہ لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے، میری یہ ملاقات میرے شوہر سلیم خاں نے کرائی تھی کیونکہ وہ اُن سے کچھ کام لینا چاہتے تھے۔ مسٹر زیدی نے پہلی ہی ملاقات کے بعد مجھ سے محبت شروع کردی اور میں نے بھی خود کو اُن کے سپرد کردیا تھا۔ موت کی رات میں بھی اُن کے ساتھ ہی تھی۔ اُس رات انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اُن سے شادی کرلوں لیکن میں نے انکار کردیا۔ اُس کے بعد انہوں نے خود بھی زہر پی لیا اور مجھے بھی دھوکہ سے پلا دیا'' — شہناز کے اس بیان سے پولس کو اچانک یہ شک ہوگیا کہ بہت ممکن ہے کہ زیدی نے خودکشی نہ کی ہو بلکہ اس کو قتل کردیا گیا ہو — اب پولس نے شہناز کے شوہر سلیم خاں سے جرح کی، سلیم خاں نے کہا ''زیدی صاحب — میری خوبصورت بیوی کے پیچھے پڑ گئے تھے، وہ اب ہر وقت اس کے تصور میں ڈوبے رہتے تھے، مجھے شہناز کی بربادی کا بڑا غم تھا'' سلیم خاں کے اس بیان سے زیدی کی موت ایک معمہ ثابت ہونے لگی۔

اسی اثناء میں زیدی کی جرمن بیوی ویرا نے جرمنی سے کراچی آ کر ایک اخباری بیان میں کہا ''مجھے پورا یقین ہے کہ میرے شوہر نے خودکشی نہیں کی ہے بلکہ اُن کا قتل کیا گیا ہے، مجھے معلوم تھا کہ اُن کے اور شہناز کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی لیکن اس کے باوجود مجھے اُن سے محبت تھی، انہوں نے مجھے جرمنی بھیج دیا تھا وہ خود میرے ساتھ اس لئے نہیں جاسکے تھے کہ حکومت نے اُن کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی تھی'' —!

ویرا زیدی نے آنسو بھری غمناک آنکھوں سے مزید یہ بھی کہا ''میری اور اُن کی پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں لندن

میں ہوئی تھی، میں اُن کے ساتھ کراچی آئی اور ۱۹۵۷ء میں میری اُن سے شادی ہوگئی۔ مجھے انہوں نے کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔وہ برے آدمی نہیں تھے‘‘ــــ!

ایک ہفتہ تک پولیس خفیہ طور پر تحقیقات کرتی رہی۔اس تحقیقات کے دوران پولیس کو پتہ چلا کہ شہناز کے معدہ میں جو دوا پائی گئی تھی وہ زہر نہیں بلکہ صرف بے ہوشی کی دوا تھی اور اس کے کھانے سے موت ہو ہی نہیں سکتی جبکہ مسٹر زیدی کے معدہ سے زہر برآمد ہوا تھاــــ اس انکشاف نے تحقیقاتی عملہ میں ایک ہلچل مچادی۔انکشاف کی روشنی میں پولیس نے مزید چھان بین کی تو یہ پتہ چلا کہ کراچی کے چند بڑے اسمگلر مسٹر زیدی سے بڑے خوف زدہ تھے کیونکہ ایک مرتبہ مسٹر زیدی نے یہ کہا تھا کہ جب وہ جرمنی جائیں گے تو کراچی میں ایک خفیہ خط چھوڑ جائیں گے جو کراچی کے بڑے بڑے کئی لوگوں کی زندگی برباد کردے گاــــ!

پولیس شہناز سے دوبارہ ملی، شہناز نے جرح کے دوران بتایا کہ وہ لندن بھی جاچکی ہے اور شیریں قادر اس کی دوست ہے جو ایک مرتبہ اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار ہوچکی ہےــــ پولیس نے اس کے بعد شہناز سے مزید کوئی سوال نہیں کیاــــ ایک اعلیٰ افسر نے آگے بڑھ کر شہناز کو فوراً گرفتار کرلیا۔شہناز حراست میں آتے ہی بے ہوش ہوکر فرش پر گر پڑی تین دن تک لگاتار شہناز سے جرح ہوتی رہیــــ آخر اُس نے تسلیم کرلیا کہ وہ مسٹر زیدی کی قاتل ہے ــــ اُس نے اپنے اقبالیہ بیان میں کہاــــ ’’مصطفےٰ زیدی کے پاس میری چند قابل اعتراض تصویریں تھیں، وہ مجھے دھمکی دیتے تھے کہ اگر میں نے اُن سے شادی نہ کی تو وہ میری زندگی برباد کردیں گے۔۱۳؍۱۲ اکتوبر کورات میں اُن کے پاس گئی، میں نے اُن سے محبت بھری باتیں کیں اور پھر میں نے ان کو پانی میں زہر ملا کر پلادیا۔زہر لیتے ہی اُنہیں احساس ہوگیا کہ میں نے بے وفائی کی ہے۔چنانچہ انہوں نے ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُن کے سر پر گلاس مار کر انہیں نیچے گرادیا۔اس کے بعد میں نے بے ہوشی کی دوا کھالی تاکہ میں بھی بے ہوش ہوجاؤں۔‘‘!

مصطفےٰ زیدی یعنی تیغ الہ آبادی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔انہوں نے ایم۔اے تک وہیں تعلیم پائی تھی، وہ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آئے تھے،۱۹۵۴ء میں انہیں سول سروس پاکستان کے لئے منتخب کرلیا گیا تھاــــ انہوں نے مرنے سے چند دن قبل جو غزل کہی تھی اس کے یہ تین شعر بطور خاص بہت پسند کئے گئے تھےــــ!

کسی آنکھ کو پکارو کسی زُلف کو صدا دو　　بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو　　میرا مجلسی تبسم میرا ترجماں نہیں ہے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ　　مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

تیغ الہ آبادی مرحوم کے تین اکلوتے شعر میں مطالعۂ زندگی، عشق اور محبت کا ایسا عمل تصوّر میں آتا ہے جس میں رعنائی اور لطافت ضرور ہے لیکن یاسیت اور محرومی کا احساس گہرا ہےــــ خواہشیں، تڑپ، امنگ اور تمناؤں کی تشنگی انگڑائی لیتی ہیں لیکن دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں......!

تیغ الہ آبادی مرحوم کے قتل کی یہ داستان غالباً ۱۹۷۰ء کے عشقیہ قتل کی سب سے انوکھی داستان ہے۔!!!

☆☆☆

نیوڈی۔ایس۔کیبل، فلیٹ نمبر:34، کیبل ٹاؤن، گولموری، جمشید پور-831003 موبائل:9135707097

ڈاکٹر نشاں زیدی

بچوں کا ہمراز: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

محمد اطہر مسعود خاں کا شمار عہد حاضر کے ممتاز ادباء میں ہوتا ہے۔ وہ جہاں ایک اچھے افسانہ نگار ہیں وہیں انشائیہ بھی خوب لکھتے ہیں۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی ان کا قلم رواں ہے اور اشاریہ سازی ان کا اہم کام ہے۔ علاوہ ازیں ادب اطفال میں انہوں نے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتابوں میں ''کھلتی کلیاں'' (1987ء)، ''جھوٹ کے پیر'' (1990ء)، ''موم کا دل'' (2015ء)، ''سنہری فیصلہ'' (مرتبہ: ایمن تنزیل 2015ء) اور ''غریب شہزادی'' (2016ء) بچوں کی کہانیوں کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات ملک و بیرون ملک کے رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔

محمد اطہر مسعود خاں کی کہانیوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے جہاں کہانی کے ذریعے معلومات فراہم کرائی ہیں، وہیں بچوں کی ذہنی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا ہے اور دلچسپی کا دامن بھی نہیں چھوڑا ہے۔ بچوں سے متعلق کامیاب تخلیق وہ ہوتی ہے جو ان کے ذہن و دل کو متاثر کر سکے۔ اطہر مسعود خاں کی کہانیاں اس کسوٹی پر کھری اترتی ہیں۔ بچے معصوم ہوتے ہیں ان کے لئے ہر بات نئی ہوتی ہے اس لئے ان کے ذہن میں ہزاروں طرح کے سوال ہوتے ہیں وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور اس سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ بچوں کے ذہن کچی مٹی کے مانند ہوتے ہیں۔ بچپن میں جو باتیں انہیں بتائی جاتی ہے وہ ان کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ اطہر مسعود خاں نے اپنی کہانیوں میں بچوں کی معصوم فطرت کا کا خاص خیال رکھا ہے۔ بچوں کی کہانیوں کے متعلق ان کا نظریہ ہے:

> ''بچوں کے لئے کہانی لکھنے کے کئی مقاصد ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک سب سے اچھی کہانی وہ ہوتی ہے جو عام فہم ہو یعنی آسانی سے بچوں کی سمجھ میں آ جائے۔ کہانی کی زبان آسان ہو، کہانی میں تفریح کا سارا سامان موجود ہو اور خاص بات یہ کہ کہانی میں اخلاقی اور اصلاحی باتوں کے علاوہ کچھ سکھانے کا مقصد بھی پوشیدہ ہو۔''

(مقدمہ ''غریب شہزادی'' مصنف: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، ص: 7)

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کی کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کہانیوں میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں اخلاقیات کا درس بدرجہ اتم موجود ہے۔ پاکیزہ سفر، میزان، مٹی کا لوتھڑا، اور معصوم مسیحا اسی طرح کی کہانیاں ہیں۔ 'پاکیزہ سفر' ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں دو دوست اینم اور علیشا کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ دونوں دوست اپنی مقدس عبادت گاہ کے سفر پر رقم لے کر نکلتے ہیں لیکن یہاں بیچ میں ایک ایسا گاؤں پڑتا ہے، جہاں پر قحط پڑا ہوا تھا۔ لوگ دانے دانے کو ترس رہے تھے۔ یہ دونوں ایک ایسی جھونپڑی میں پہنچتے ہیں، جہاں پر لوگ بھوک کی وجہ سے بیمار پڑے تھے۔

علیشا ان کی خوب خدمت کرتا ہے، غذا فراہم کراتا ہے، جس میں اس کی ساری رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ اینم عبادت گاہ کی زیارت کے لئے چلا تو جاتا ہے لیکن وہ بھیڑ کی وجہ سے مقام مقدسہ تک نہیں پہنچ پاتا اور اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دوست علیشا مقام مقدسہ کے اندر کھڑا ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ انسانیت ہی سب سے بڑی عبادت ہے اور خدمت خلق سے ہی روح کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ’ہتھکڑی‘ بھی اسی نوعیت کی کہانی ہے جس میں خدمت خلق کو عظیم نیکی قرار دیا گیا ہے اور حاتم طائی کی سخاوت کے قصے کو کہانی کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔

لالچ بری بلا ہے اور لالچی آدمی ہر جگہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ’میزان‘ کہانی میں اسی پیغام کو مصنف نے کہانی کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی کا تانا بانا ایک ایسے آدمی کو لے کر بُنا گیا ہے جو نہایت ہی لالچی ہے۔ وہ لالچی ہونے کے ساتھ ساتھ جھوٹا اور مکار بھی ہے۔ فریب اس کے مزاج میں شامل ہے۔ جب اس کا سو اشرفیوں سے بھرا بیگ گم ہو جاتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اعلان کراتا ہے کہ جو اس کا بیگ واپس لا کر دے گا اس کو وہ دس اشرفی انعام میں دے گا۔ ایک ایماندار شخص اس کا بیگ لا کر دیتا ہے تو وہ بہت خوش ہو جاتا ہے لیکن جب وہ ایماندار شخص انعام کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ انعام دینے سے انکار کرتا ہے ساتھ ہی اس پر چوری کا الزام لگاتا ہے، وہ ایماندار شخص شہر قاضی کے پاس شکایت لے کر جاتا ہے۔ آخر کار جیت ایمانداری کی ہوتی ہے اور اس کنجوس شخص کو ذلیل ہو کر خالی ہاتھ واپس جانا پڑتا ہے۔ کہانی کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

”ہونہہ، ثبوت......؟ قاضی طنز کے ساتھ بولا- میں نے ایک نظر میں ہی اس بیگ کا جائزہ لے ڈالا تھا اور یہ پایا کہ یہ کسی اور آدمی کا گمشدہ بیگ ہے اور اس لئے تمہیں فوراً اس بیگ کا خیال چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ بقول تمہارے اس میں ایک سو دس اشرفیاں تھیں۔ میرے خیال سے تو تم ہی جھوٹے ہو کیونکہ یہ بیگ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں ایک سو اشرفی کے علاوہ مزید ایک بھی اشرفی نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے یہ بیگ تمہارا نہیں۔“

انسان اپنی لالچی طبیعت سے کتنا نقصان اٹھاتا ہے یہ بات مصنف نے مختلف انداز میں بیان کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کے پاس چاہے کتنی ہی دولت جمع ہو جائے اگر اس کی طبیعت میں لالچی پن ہے تو وہ کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ’مٹی کا لوتھڑا‘ ایک ایسی کہانی ہے جس میں بادشاہ کی لالچی اور حریص طبیعت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار یونان کا بادشاہ میڈاس ہے جس کے پاس بے شمار دولت ہے لیکن وہ رعایا کا خیال نہیں رکھتا اور دولت کے نشے میں چور رہتا ہے اور مزید دولت حاصل کرنے کی تدبیر سوچتا رہتا ہے۔

ایک دن جب وہ اپنے محل کے تہہ خانے میں بیٹھ کر سونے چاندی کی اشرفیوں کو نہارتا ہوتا ہے اور سوچتا ہوتا ہے کہ کاش! ایسا ہو کہ میری یہ دولت اور سونا سب دوگنا ہو جائے کہ تبھی ایک دیوتا ہرمیز تہہ خانے میں آ جاتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ کیا تم اس بے شمار دولت سے مطمئن ہو میڈاس انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ایسا بنا دو کہ میں جس چیز پر ہاتھ رکھوں وہ سونے کی ہو جائے۔ دیوتا اس کو وچن دے کر چلا جاتا ہے۔ بادشاہ جیسے ہی کسی شے پر ہاتھ لگاتا ہے وہ سونے کی ہو جاتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوتا ہے اور خوشی خوشی ہر چیز کو چھوتا رہتا ہے اور سب چیزیں

سونے کی ہو جاتی ہیں۔ اچانک اسے خیال آتا ہے کہ اس نے صبح سے کچھ کھایا نہیں وہ بھوکا ہے اور جب وہ کھانا منگاتا ہے تو وہ جیسے ہی روٹی پر ہاتھ لگاتا ہے روٹی بھی سونے کی ہو جاتی ہے۔ آخر تھک ہار کر وہ سوچتا ہے چلو پانی پی کر ہی کام چلا لوں لیکن جیسے ہی پانی کو چھوتا ہے وہ بھی سونے کا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بغیر کچھ کھائے پئے کئی روز گزر جاتے ہیں۔

اس کے جسم کی ساری قوت ختم ہو جاتی ہے۔ آخر کار اسے سونے اور ہیرے جواہرات سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ روتا رہتا ہے کہ اسی درمیان دیوتا دوبارہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کو بادشاہ کی حالت پر ترس آجاتا ہے اور وہ اس کو صحیح کر دیتا ہے۔ بادشاہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنی ساری دولت ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیتا ہے۔ کہانی کا اختتام مؤثر انداز میں ہوا ہے:

''میڈاس فوراً وہیں تپتی ریت پر بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو گیا جس نے اس کے جسم سے پارس یعنی سونا بنانے کی خاصیت واپس لے لی تھی۔''

اطہر مسعود خاں کی کہانیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ زیادہ تر کہانیوں میں انہوں نے بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور فراہم کی ہیں جیسے اس کہانی میں وہ یونان کے بادشاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''......اور یہ میڈاس ہی تھا جس نے اس شکریئے کے بدلے میں اپنی رعایا کو خوش حال رکھنے کی غرض سے اپنے پورے ملک میں صرف ایک سال میں بے شمار اسپتال، اسکول، کالج، سرائیں، سڑکیں اور غریبوں کی رہائش کے لئے سیکڑوں مکانات بنوا ڈالے اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے لگا۔ اب میڈاس دوسروں کو خوشی دے کر خود بھی خوش رہنے لگا۔''

'مٹی کا لوتھڑا' مصنف کی ایک بہترین کہانی ہے جس میں مصنف نے بچوں کو اہم میسیج دیا ہے کہ انسان دوسروں کو خوشی دے کر ہی خوش رہ سکتا ہے۔ پوری کہانی دلچسپ پیرائے میں ہے۔ اطہر مسعود بچوں کی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ بچوں کو جادوئی چھڑی، پری، دیوتا وغیرہ سے دلچسپی ہوتی ہے، جو اس کہانی میں موجود ہے۔ 'معصوم مسیحا' اور 'انوکھا مرتبان' بھی اسی نوعیت کی کہانیاں ہیں جن میں مصنف نے بچوں کی نفسیات کا بھرپور خیال رکھا ہے۔

'آنسوؤں کی قیمت' ایک نصیحت آمیز کہانی ہے جو خط کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ یہ کہانی ان کے مجموعے 'سنہری فیصلہ' میں شامل ہے۔ جس کو نوجوان ادیبہ ایمن تنزیل نے مرتب کیا ہے۔ ایمن تنزیل خود بھی کہانیاں اور نظمیں لکھتی ہیں اور ان کی تخلیقات مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ 'بنات' یعنی بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم کی بھی ممبر ہیں اور بہت متحرک رہتی ہیں۔ 'آنسوؤں کی قیمت' ایک ایسی کہانی ہے جس میں بچوں کے لئے ایک سبق بھی ہے اور نصیحت بھی۔

اس کہانی میں مصنف نے بڑے سلیقے سے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ بچوں کو بری صحبت سے دور رکھنا والدین کا اہم فریضہ ہے۔ بری صحبت کا اثر بچوں کے خیالات کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا بچہ ہے جو ایک برے دوست کے کہنے پر والدین سے پیسوں کا مطالبہ کرتا ہے اور والدین پر اپنے احسانات جتاتا رہتا ہے۔ 'چھوٹے نواب' میں بادشاہ، نواب اور درزی کے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے، اس کہانی میں آخر تک

تجسس بھی قائم رہتا ہے اور قاری کے ذہن میں یہ رہتا ہے کہ اب کیا ہوگا لیکن کہانی کے آخر میں کرداروں کو مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ البتہ کہانی دلچسپ پیرائے میں لکھی گئی ہے۔

محمد اطہر مسعود خاں نے تاریخی واقعات کو بھی کہانی کے پیرائے میں دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ''سنہری فیصلہ'' اسی طرح کی کہانی ہے، جس میں خلیفہ ہارون رشید کے عدل وانصاف اور ان کے بیٹوں مامون اور امین کی فرماں برداری سے روشناس کرایا گیا ہے، ساتھ ہی اساتذہ، بزرگ اور والدین کی عزت سے بچوں کو کیا حاصل ہوتا ہے، اس کا بھی درس دیا ہے:

> ''وہ جانتا تھا کہ خدمت سے ہی عزت حاصل ہوتی ہے اور خاص کر وہ لوگ جو اپنے بزرگوں، استادوں اور والدین کا ادب واحترام کرتے ہیں، ان کو تو دنیا جہان میں ضرور ہی عزت وشہرت اور ناموری ملتی ہے۔'' (کہانی 'سنہری فیصلہ'، ص:73)

اسی طرح اس کہانی میں ہارون رشید اور ان کے اہل خانہ کے کارناموں کو بھی بڑے سلیقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیں یہ اقتباس:

> ''یہ خلیفہ ہارون رشید تھے جو اپنی رعایا پروری اور نیک نفسی کے لئے مسلمانوں میں آج بھی عقیدت و احترام سے یاد کئے جاتے ہیں اور یہ دونوں شہزادے مامون اور امین تھے، جن کے اندر خلیفہ ہارون رشید جیسے باپ کی خوبیاں تھیں تو زبیدہ جیسی نیک سیرت، سخی اور عبادت گزار ماں کی خصوصیات بھی موجود تھیں جس نے زر کثیر خرچ کر کے طائف سے مکہ شریف تک، غریب عوام کے لئے ایک طویل نہر کھدوائی تھی، نہر زبیدہ!'' (کہانی 'سنہری فیصلہ' ص:74)

فاتح یورپ، میٹھا ناسور، سچا تیرتھ اور دہلے پہ دہلہ بھی اصلاحی اور دلچسپ کہانیاں ہیں۔ اطہر مسعود خاں کی کہانیوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ ان کہانیوں میں بچوں کی نفسیات، ان کا حوصلہ، معصومیت سب چیزوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں نصیحت بھی ہے اور سیکھ بھی لیکن لہجہ کہیں بھی ناصحانہ نہیں ہونے پایا ہے۔ اسلوب بالکل سادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ تلاش وتجسس بچوں کی فطرت کا اہم حصہ ہے جسے وہ دلچسپ انداز میں پڑھنا اور سننا پسند کرتے ہیں۔ اطہر مسعود کی کہانیوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے!

☆☆☆

بی-۶۳/ایس-۲، ڈی ایل ایف کالونی، صاحب آباد، غازی آباد-201005 موبائل:9873297860

● جناب بدر عالم سلفی کے بڑے بھائی جناب **مصطفیٰ تابش** (عمر تقریباً ۶۰ رسال ولد مرحوم ثناء اللہ مقام کھرایاں کیوٹی بلاک دربھنگہ حال مقام دہلی) کا طویل علالت کے بعد ۷ راکتوبر ۲۰۲۰ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا اور اسی روز بعد نمازِ مغرب دہلی میں ہی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

....

خان حسنین عاقب

ممبئی ڈائری: فرحان حنیف وارثی کی حق شناسی کا ثبوت

ممبئی عالم میں انتخاب! ممبئی شکم پرور شہر! ممبئی جرائم کا اڈا! ممبئی جود وسخا کا مرکز! ممبئی، حرص و ہوا کا ہیڈ کوارٹر! غرض ممبئی صرف ایک جغرافیائی مظہر ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ بھی بہت کچھ ہے۔ اتنا کچھ کہ چند صفحات پر اسے سمیٹنے کی کوشش ناکافی ہوسکتی ہے۔ ممبئی شہر سے میرا تعلق بہت گہرا رہا ہے۔ میں نہ صرف یہ کہ کسی زمانے میں ممبئی شہر میں مقیم رہا ہوں اور یہاں ملازمت کی ہے بلکہ کئی اہم اور تاریخی شخصیات سے مراسم بھی رہے ہیں جن کی یاد حافظے کو مہکا دیتی ہے۔ ممبئی شہر سے مجھے اتنی ہی انسیت ہے جتنی اپنے آبائی شہر سے۔ اس کا ثبوت وہ نظمیں ہیں جو میں نے وقتاً فوقتاً ممبئی شہر پر لکھی ہیں اور جو مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہوئی ہیں۔ دراصل یہ نظمیں اس قرض کی ادائیگی کی چھوٹی سی کوشش ہے جو مجھے ممبئی نے دیا ہے۔ اپنے قیامِ ممبئی کے دوران کا ایک شعر مجھے یاد آرہا ہے۔

پونہ ہے، ممبئی ہے، سفر ہے، قیام ہے
چکر بندھا ہے اک مرے پاؤں میں ان دنوں

اس مختصر سی تمہید کے بعد آمدم برسرِ مطلب!

دو روز قبل ڈاکیہ ایک کتاب دے گیا۔ یہ کتاب ممبئی سے برادرم فرحان حنیف وارثی نے ارسال کی تھی۔ کتاب کا عنوان تھا 'ممبئی ڈائری'۔ عنوان سن کر یا پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید یہ کسی روزنامچے کے اندراجات ہیں۔ دراصل ہے بھی ایسا ہی۔ لیکن قدرے فرق کے ساتھ۔ یہ کتاب ایسی چھوٹی چھوٹی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جس کا مرکزی عنوان ہی ممبئی ہے۔ مصنف نے اپنی ان تحریروں میں ممبئی شہر اور اس کے لوگوں کا بغور مشاہدہ اور ممبئی کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ چونکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ فرحان بھائی سے میری گفتگو ممبئی کے موضوع پر ہو چکی تھی اور وہ ممبئی پر میری ایک کتاب کے مواد کے سلسلے میں معاونت کا وعدہ کر چکے تھے، لہٰذا ان کی یہ کتاب اپنے عنوان کے اعتبار سے بھی میرے لیے دلچسپی کا سامان تھی۔ ہزار ہا مصروفیات کے باوجود اس کتاب نے ترجیحی طور پر خود کو مجھ سے پڑھوالیا۔ یعنی میں نے سب کام چھوڑ کر کتاب ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی اور پھر جو تاثرات میرے ذہن پر مرتسم ہوئے، ادبی ذوق نے یہ تحریر دو ہی دنوں میں مکمل کروالی۔ 'ممبئی ڈائری' کی یہ تحریریں دراصل لفظی تصویریں ہیں جو فرحان وارثی نے روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی کے مستقل کالم 'ممبئی ڈائری' کے لئے 1997 سے 2000 کے درمیانی چار برسوں میں بنائیں۔ اس موقعہ پر شکیل بدایونی نے اگر یہ شعر کہا تھا تو کچھ غلط نہیں کہا اس لئے درج کرنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتا۔

بھیج دی تصویر اپنی ان کو یہ لکھ کر شکیل
آپ کی مرضی ہے چاہے جس نظر سے دیکھیے

فرحان وارثی نے ٹکڑوں ٹکڑوں میں ممبئی کی ایسی خوبصورت تصویریں بنادی ہیں جنہیں ہر شخص اپنی اپنی نظر،

اپنے زاویے سے دیکھ سکتا ہے۔ یہ ساری لفظی تصویریں اپنے بیانیہ اسلوب میں ایسی خوبصورت ہیں کہ عکسی تصویروں کی ضرورت کو ختم کر دیتی ہیں۔ فرحان وارثی کی یہ لفظی تصویریں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے کالمس میں ممبئی شہر کی گونا گوں اور مختلف صفات، اس کے مناظر، اس کی عمارتیں، یہاں بسنے والے لوگ، ان لوگوں کی اچھی بری عادات وفطرت، یہاں کی تہذیب، یہاں کا تمدن۔ غرض ان تمام عناصر کو روزانہ کی بنیاد پر قلم بند کیا ہے۔ ان کے یہ احساسات صحافتی تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ کا بھی حصہ بن گئے ہیں۔

پھر آیئے ممبئی کے موضوع پر:

ممبئی اپنے قلب میں اور اپنے بدن میں ان لوگوں کو بھی پناہ دیتی ہے جو اپنے اپنے گاؤں سے دیرینہ خواہشات کا اژدھام لئے بغیر کچھ سوچے سمجھے، اپنی حسرتوں کو سنجوئے چلے آتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی حسرتِ ناکام کو دو کپڑا جوڑی کے ساتھ اپنے بیگ میں ڈالے واپس چلے جاتے ہیں، کچھ لوگ جو اپنی کشتیاں جلا کر آئے ہوتے ہیں، وہ یہیں رہ کر زندگی کی بے سود دوڑ کا حصہ بن جاتے ہیں اور پھر یہیں کہیں بے نام سی زندگی گزار کر مر کھپ جاتے ہیں۔ جی ہاں، ممبئی شہر زندگی کی ایک بے سود دوڑ اور نا آسودہ تگ ودو کا منبع ہے۔ اس شہر کی خاصیت ہی یہ ہے کہ یہاں ناکام اور نا آسودہ لوگ تو احساسِ شکستہ پائی کے سبب اندھیروں میں کہیں گم ہو جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جو اپنی مرادیں پا کر کامیابی کے نشے میں چور ہو جاتے ہیں، وہ بھی نہ جانے کیوں اپنی زندگی سے ہار جاتے ہیں۔ یہاں آکر کامیابی کی دلہن سے شادی رچانے والے بہت سے دولہے اور بہت سی دلہنیں نہ جانے کیوں خودکشی کر لیتے/ لیتی ہیں لیکن یہ بات صاف ہے کہ ممبئی شہر زندگی کی بے سود دوڑ کا شہر ہے۔ مجھے مجید اوحدی کا ایک فارسی شعر یاد آ رہا ہے:

در تلاشِ زندگی سودی بجز حسرت نبردن
از پئ مقصودِ نا معلوم روز و شب دویدن

یعنی زندگی کی تلاش میں سوائے حسرتوں کے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ زندگی کی تلاش ایک نامعلوم مقصود کے لئے دن رات دوڑنے کے علاوہ اور کیا ہے؟ بس، یہی خلاصہ ہے ممبئی کی زندگی کا!

مصنف نے کتاب جن معروف اہلِ علم واہلِ قلم کے نام کی ہے ان میں سے تقریباً تمام سے میرے مراسم ہیں، کچھ سے برادرانہ اور کچھ سے مربیانہ روابط۔ 'ممبئی ڈائری' ممبئی شہر کا ایک طائرانہ Bird-view نظارہ دکھاتی ہے۔ لیکن طائرانہ نظارے میں گہرائی نہیں ہوتی، بلکہ سطحی پن ہوتا ہے جب کہ ممبئی ڈائری میں مصنف نے جتنے بھی واقعات درج کئے ہیں ان سب میں ممبئی کا روزمرہ ہے، لوگوں کا معمول ہے، ان اندراجات کو پڑھ کر یہاں رہنے والے لوگوں کے مزاجوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ فرحان وارثی نے ممبئی کے 'بہت اندر' کی باتیں کی ہیں۔ یہ اندراجات مختلف شکلوں میں مختلف روپ دھارتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے فرحان وارثی لوکل ٹرین کے اندر قلم کاغذ ہاتھوں میں لیے لوکل کے اندر روزانہ سفر کرنے والے مسافروں کی 'چہرہ خوانی' بھی کر رہے ہیں، ان کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ بھی کر رہے ہیں اور ان سے گفت وشنید یہاں تک کہ ان سے مصاحبہ بھی کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ 'لوکل' سے باہر کی ممبئی کا بھرپور نظارہ بھی کر رہے ہیں اور ان سب تجربات ومشاہدات کو اردو ٹائمز کے دفتر پہنچتے ہی اپنے اخبار کے

کالم کے حوالے کررہے ہیں۔ یہ اندراجات بیک وقت 'کلوز سرکٹ کیمرا یعنی سی سی ٹی وی' بھی ہیں اور 'مووِنگ سیٹلائٹ بھی جو سب کچھ 'کور' کررہا ہے۔ فرحان وارثی نے خود اپنی اس کتاب کے بارے میں آخری فلیپ پر لکھا ہے:

''ممبئی ایسا شہر نہیں ہے کہ جسے آپ اچٹتی نظروں سے دیکھیں اور آگے بڑھ جائیں۔ میں نے اس شہر کو بچوں کی طرح ٹھہر کے Kaleidoscope سے دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے، اسے اس کتاب میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔''

'ممبئی ڈائری' زندگی کی اسی دوڑ کی عکاسی کرنے والی لفظی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ہر تحریر کا عنوان زندگی کے نامعلوم مقصود کی تلاش میں بھٹکنے والے افراد، تاریخ اور اس کے مختلف گوشوں کی عقدہ کشائی ہے۔

کئی جگہوں پر مصنف نے اپنی تحریروں میں فلسفۂ حیات کی دانشمندانہ آمیزش بھی کی ہے۔ مثلاً

صفحہ 30 پر ''بھائی، میں تم سے کہہ رہا تھا کہ جب بھی تم غصے میں ہوتے ہو، تب کچھ نہ کچھ کھوتے ہو۔''

صفحہ 42 ''ممبئی شاید ایسے ہی نیک انسانوں کی وجہ سے محفوظ ہے ورنہ سمندر کا پانی کنارے کو غصے سے چھوتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔''

صفحہ 90 ''زندگی میں حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ دھوپ چھاؤں آتی جاتی رہتی ہے۔''

صفحہ 97 ''دیپاولی ان لوگوں کے لیے خوشی کا تہوار ہے جن کی تجوری میں لکشمی ہوتی ہے مگر دو وقت کی روٹی جٹانے میں مصروف افراد کے لیے دیپاولی اور پٹاخوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، انھیں بس فکر ہے تو چند کھنکتے سکوں اور نوٹوں کی۔''

کچھ کڑوی سچائیاں:

صفحہ 32 ''بتایا جاتا ہے کہ ان کی (محمد علی جناح کی) زندگی جب آخری ہچکی لے رہی تھی تب وعروس البلاد (ممبئی) کو یاد کررہے تھے۔''

صفحہ 33 ''عروس البلاد کے لوکل ریلوے اسٹیشنوں پر ٹکٹ چیکروں کو اپنا شکار ڈھونڈنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی کیوں کہ ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے والوں کی ایک مخصوص پہچان ہوتی ہے۔''

صفحہ 47 ''بھائی صاحب، ہمارے ملک میں دہلی سے لے کر ہر جگہ ملاوٹ کا دور دورہ ہے۔''

صفحہ 79 ''بالی ووڈ میں مندار کرولکر جیسے فنکاروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں بہروپیوں کی قدر ہے۔''

صفحہ 84 ''زیادہ تر ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کے نزدیک سمندروں، تالابوں اور جھیلوں میں گنیش کا وسرجن نقصان دہ ہے۔ کاش! مچھلیوں کو قدرت نے بولنے کی صلاحیت بخشی ہوتی تو یہ پتا چل جاتا کہ گنیش وسرجن ان کی موت کی وجہ بنتا ہے یا نہیں۔''

صفحہ 88 ''ممبئی میں یوں تو کئی کبوتر خانے ہیں مگر ان میں پانجرہ کا کبوتر خانہ بے حد مشہور ہے۔ عموماً کبوتر خانوں میں کبوتروں کے لئے پانی اور دانے کی سہولت موجود رہتی ہے لیکن گندگی بھی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔

صفحہ 98 ''ممبئی بڑی تیزی سے ایڈس کے شکنجے میں جکڑتے جارہی ہے۔ایک اندازے کے مطابق روزانہ شہر میں دوسو سے تین سو کے درمیان افراد ایچ آئی وی پازیٹیو کا شکار ہورہے ہیں۔''

افسانوی اسلوب:

کہیں کہیں فرحان وارثی کا اسلوب افسانوی ہوجاتا ہے۔یہاں ان کی تخلیقی صلاحتیوں کے درشن بھی بخوبی ہوجاتے ہیں۔مثلاً صفحہ 65 کا اندراج دیکھیں۔

''جہاں وہ رہتی تھی، اب وہاں اداسی بھرا سناٹا ہے۔سیاحوں کا استقبال کرنے والی اس کی کلکاری اب سنائی نہیں دیتی۔جو بھی اس سے ملا ہے، اس کی معصومیت سے پُر شیطانی حرکتوں کو بار بار یاد کرتا ہے مگر وہ اپنے نئے بلم کے ساتھ اوَدھ کی شاموں کو گلزار کررہی ہے۔ان دنوں وہ خوابوں کے سفر پر ہے۔''

آپ اگلا جملہ پڑھیں گے تب جا کر علم ہوگا کہ بھائی، فرحان وارثی 'مادہ گبن gibbon یعنی مادہ لنگور یا چھوٹی جسامت کی بغیر دُم کی بندریا کے بارے میں بات کررہے تھے، کسی افسانوی کردار کے بارے میں نہیں۔

صفحہ 66 ''اب گرمی کا موسم ممبئی میں اپنا غصہ دکھانے لگا ہے۔کبھی کہا جاتا تھا کہ یہاں ہر موسم ایک جیسا ہوتا ہے مگر اب وہ دن کہاں اور وہ بات بھی کہاں؟ گرمی کا موسم ممبئی اور ممبئی والوں کو ہر وقت آنکھیں دکھاتا رہتا ہے۔''

صفحہ 72 ''لیکن جینے کا فیصلہ کرنے میں انھوں نے بہت دیر کردی تھی کیونکہ موت کے دھویں نے زندگی کے دروازے میں سوراخ کردیا تھا۔''

صفحہ 73 ''برکھارانی نے پہاڑوں کی گھاٹیوں میں ہریالی کی چادر بچھادی ہے۔کھیت کھلیان اور پیڑوں نے سبز پتوں کی چھتری پکڑ رکھی ہے۔''

صفحہ 86 ''سنیچر کی رات تھی۔لگ بھگ بارہ بجے کا وقت تھا۔تھکن سے نڈھال مسافروں کا ہجوم لوکل سے اتر کے گورے گاؤں اسٹیشن سے باہر آرہا تھا۔آٹو رکشا ڈرائیور اپنی مرضی سے کرایہ طے کررہے تھے۔۔اوپر سے یہ شرط بھی عائد تھی کہ یہاں جائیں گے اور وہاں نہیں جائیں گے۔ایک بس کھڑی تھی جس میں مسافر بیٹھنے لگے تھے۔''

ممبئی ڈائری کی ان عبارتوں میں درج بالا تین عنوانات یعنی فلسفہ، کڑوی سچائیاں اور افسانوی اسلوب، تینوں کی مزید امثال آپ کو بہ آسانی مل جائیں گی لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کتاب کا مکمل مطالعہ کریں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ فرحان وارثی کی اس کتاب میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی عکاسی بھی دکھائی دیتی ہے۔یعنی وہ بات کو بات بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔انہوں نے ان تمام عبارتوں میں ممبئی کی روح کو مختلف واقعات کی شکل میں دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اگرچہ ان کی نوعیت واقعاتی ہے لیکن ان کا طرز و اسلوب ادبی، نیم ادبی، افسانوی اور کہیں کہیں کچھ کچھ شاعرانہ ہے۔یہی اس کتاب کی عبارتوں کی خوبصورتی بھی ہے۔اس کتاب پر شاہد صدیقی اور جمیل فاضلی نے مضامین لکھے ہیں۔کمال یہ ہے کہ نہ شاہد صدیقی ممبئی سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی جمیل فاضلی۔شاہد صدیقی دہلی

سے ہیں اور جمیل فاضلی کراچی سے۔اس کے باوجود انہوں نے ممبئی کے بارے میں لکھا۔ یقیناً انہوں نے ممبئی کو فرحان وارثی کی آنکھوں سے ہی دیکھا ہوگا۔ البتہ فلمی گیت کار سمیر اور سدھارک اولوے، شیام بینیگل اور سائرس ساہوکار ممبئی ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

فرحان وارثی ان چند لوگوں میں ہیں جنہوں نے ممبئی شہر کے احسانوں کو یاد رکھا ہے اور اس شہر سے متعلق کچھ لکھنے کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ انہوں نے خود یہ قبول کیا ہے کہ ان کی شہرت اور ناموری میں اس شہر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ احسان شناسی کی صفت ہے جس کا استحسان جتنا بھی کیا جائے، اتنا کم ہے۔ ممبئی میں مقیم نوجوان شاعر، باصلاحیت نثر نگار اور مقبول ناظمِ مشاعرہ شاگردِ محسن ساحلؔ کا برمحل شعر یاد آرہا ہے جو اس تحریر کے موضوع سے انصاف کرتا معلوم ہوتا ہے۔

تو نے اے ممبئی! جو کچھ بھی دیا ہے مجھ کو
وہ مرا شہر تو صدیوں بھی نہ دے پائے مجھے

☆☆☆

● معروف افسانہ نگار اور صحافی آچاریہ شوکت خلیل چیرمین متھلا مائنوریٹی ڈینٹل کالج منسکھ نگر، ایکمی لہریا سرائے دربھنگہ کی اہلیہ محترمہ **زاہدہ بانو** اور متھلا مائنوریٹی ڈینٹل کالج کے ڈائریکٹر انبساط شوکت کی والدہ ماجدہ (عمر تقریباً ۷۵ رسال) کا طویل علالت کے بعد ۱۲؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو دن کے ۱۱ بجے انتقال ہوگیا اور اسی روز مرحومہ کی وصیت کے مطابق ان کے مائیکہ میں بعد نمازِ عصر بہرہ، بینی پور، دربھنگہ جامع مسجد کے قریب آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں خاوند کے علاوہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحومہ نیک ملنسار کنبہ پرور تھیں۔

....

● شہر کے مشہور تاجر **سعید الزماں گلاب** (عمر تقریباً ۶۳ رسال ولد جناب شمس الزماں مرحوم اردو بازار دربھنگہ) کا ۱۲؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو پٹنہ کے روبن اسپتال میں تقریباً دو بجے انتقال ہوگیا۔ جسد خاکی بذریعہ ایمبولینس دربھنگہ لایا گیا جہاں ان کی تجہیز و تکفین ۱۳؍دسمبر کو ہوئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ''گلاب شوا سٹورس'' لال باغ کے مالک سعید الزماں گلاب سید تقی احمد مرحوم کے خویش اور شہر کے نامور وکیل عرفان الرحمٰن بسمل (ایڈووکیٹ) مہدولی کے سمدھی تھے۔ نہایت خلیق، مہمان نواز اور ملنسار تھے۔ وہ عرصہ سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ کنبہ پروری اور سخاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

....

● ڈاکٹر وکیل احمد کے بڑے بھائی **محمد نسیم** ولد محمد مقیم مرحوم (عمر تقریباً ۷۰ ربرس، مقام بابو سلیم پور، ریام، دربھنگہ) کا انتقال ۲۱؍دسمبر ۲۰۲۰ء بوقت ۱۱ بجے دن ہوگیا۔ پسماندگان میں دو بیٹے محمد طارق اقبال اور ساجد افضال اور تین لڑکیاں ہیں۔ تمام شادی شدہ ہیں۔ ان کی نمازِ جنازہ ان کے آبائی قبرستان میں ۲۲؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو بوقت ۱۰ بجے صبح ادا کی گئی اور جنازہ کی نماز حضرت مولانا محمد عرفان مدنی صاحب نے پڑھائی۔

نذیر احمد یوسفی

ایم نصر اللہ نصر اور تخلیقی حسن کاری

ایم نصر اللہ نصر کا شمار بنگال کے اہم اور جدت پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے جدید لب و لہجے سے استفادہ کیا ہے اور اپنی شاعری کو جدت کے مخصوص اقرار واطوار سے مملوکرتے ہوئے وجدان کا حصہ بنایا ہے پھر اپنے تجربات ومشاہدات اور تخلیقی خود اعتمادی کے وسیلے سے اپنی شعری کائنات کو تابنا کی عطا کی ہے۔

نصر اللہ نصر ایک فعال ادبی شخصیت کے بطور تو جانے ہی جاتے ہیں اس کے علاوہ ایک گن اور ہے کہ وہ درس و تدریس سے جڑے ہوئے ہیں اور اپنے اس کام کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔سیاست سے گہرا تعلق تو نہیں لیکن ادبی سرگرمیوں سے شغف رکھتے ہیں۔ادبی ادارے بھی ان کی مصروفیات کا حصہ ہیں۔ہوڑہ کے بہت ہی قدیم' فعال اور متحرک ادارہ رائٹرز ایسوسی ایشن کے وہ رکن خاص (سابق جنرل سکریٹری) ہیں اسی لیے اس کی توسیعی کارگذاریوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔

نصر ان دنوں دو محاذوں پر برسرِ پیکار ہیں۔ایک طرف وہ اپنے شعری افکار کے دائرۂ عمل کی توسیع کر رہے ہیں تو دوسری طرف اردو زبان و ادب کی نثری تخلیقات میں جدت کی سچائی اور روایات کی ندرت کی تلاش میں اپنی علمی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔یہ تخلیقی انہماک انھیں ایک نمایاں شناخت بخش رہی ہے۔

انھوں نے اپنی فکری دھارے کی راہ متعین نہیں کی ہے۔یہ شاعری کی شاہراہ سے گذرتے ہیں تو گلستانِ نثر کی بھی سیر کر لیتے ہیں۔انھوں نے جہاں شعری اصناف کی طغیانی سنبھالی ہے وہاں نثر نگاری کو بھی امتیازی شان سے ہمکنار کیا ہے یعنی فکری دھارے کو ہر محاذ پر اس طرح سنبھالا ہے کہ بے راہ روی کا طعنہ نہ لگے بلکہ اعتدال مقدم رہے یعنی جہاں شاعری میں توزن اور اعتدال کی کارفرمائی کو اہمیت بخشی ہے وہیں نثری شجر کاری میں بھی مکمل ہوشیاری روا رکھی ہے۔

چار سال قبل (۲۰۱۱ء) شائع ہونے والا اولین شعری مجموعہ ''امکان سے آگے'' نصر اللہ نصر کے شعری تجربوں اور مشاہدوں کا نقیب ہے۔ان کے فکری میلان اور ہیئتی تجربوں کا مرقع ہے۔انھوں نے اس شعری مجموعے میں جدید رجحانات کی توسیع کی ہے اور رشتہ بنائے رکھا ہے۔وہاں روایت اور کلاسیکیت کی شیرینیت اور غزلیاتی کیفیت کو بھی جائز تصور کیا ہے اور اس کی نزاکت' لطافت' جاذبیت اور سحر انگیزیت سے معانی کی نئی جہت قائم کی ہے۔''افہامِ ادب'' نصر اللہ نصر کی تازہ نثری تجربوں کا شاہکار ہے۔جس میں قابلِ قدر عنوانات کے زیرِ ترتیب اردو ادب کے درجنوں قلم کاروں کی ادبی کارگذاریوں اور سرگرمیوں کی خوبصورت روداد بند ہے۔صالح علمی ادبی اور دینی حلقوں میں ان کی نئے انداز کی قلمی آئینہ گری کی جم کر پذیرائی ہو رہی ہے اور قدر و منزلت کا پیمانہ بلند ہو رہا ہے۔

'افہامِ ادب' تحقیقی اور تاثراتی مضامین کا بڑا خوبصورت اور دیدہ زیب مجموعہ ہے جس میں چھوٹے بڑے مختلف عنوانات کے تحت ستائیس مضامین شامل ہیں۔تمام ہی مضامین نئے موضوعات کے غماز ہیں۔

کم سے کم لکھتے وقت صاحبِ قلم نے اس بات کو ذہن نشیں رکھا ہے کہ کوئی نئی بات کہیں۔ ایسی بات جس پر اس سے پہلے کم توجہ دی گئی ہے۔ جیسے اللہ تعالی کی تعریف وتوصیف اور مدح وثنا میں کہی باتیں ''حمد'' کہلاتی ہیں۔ اس موضوع پر لکھتے وقت انھوں نے لکھا ہے کہ اللہ اور صرف اللہ کی مدح سرائی اس کی بزرگی کا اعتراف اور بے شمار اوصاف حسنہ کی تعریف ہی دراصل حمد ہے۔ بے شک حمد کی تخلیق کے لیے نہ صرف طبیعت کی موزونیت بلکہ ذہن کی پاکیزگی، روح کی تازگی اور عمیق سنجیدگی کے ساتھ جذباتِ عشق الٰہی کی فراوانی بھی ضروری ہے۔

'ایک شاعر ایک شعر' کے زیرعنوان انھوں نے سرمحمد اقبال کا یہ مشہور شعر زیرِ بحث رکھا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نظم 'طلوع اسلام' کے دوسرے بند کا یہ شعر جس کی اصلاح نیاز فتح پوری نے یوں کی ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی دشواریوں سے چشمِ نرگس وا ہوئی ہوگی

مولانا ماجد دریا آبادی نے نیاز فتح پوری کی اس تنقید پر اپنی رائے یوں دی ہے:

''اقبال کا یہ شعر تو مجھے مہمل بالکل نظر نہیں آیا اور نہ کوئی وجہ اشکال نظر آئی۔ مطلب تو بالکل صاف ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے شعر میں جو حسن ہے وہ قاری شعر کو پڑھتے ہی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس میں معنویت بھی ہے اور جاذبیت بھی۔ نصر کا بیان بھی اس کی حمایت میں درست ہے۔

علیم صبا نویدی ''حصارِ غزل'' میں فرماتے ہیں کہ ''غزال کی آنکھیں تو خوبصورت ہوتی ہی ہیں لیکن اس کی شناخت مشکِ ختن سے بھی ہوتی ہے۔ چاند اپنے حسنِ بے مثال ہی سے نہیں بلکہ اپنی نرم اور مسرت بخش شعاعوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ گلاب کی خوبصورتی ہی اس کی شناخت نہیں بلکہ اس کی دل آویز مہک بھی اس کی پہچان ہے۔ انسان کے یہاں بھی ایسی ہزاروں خوبیاں ہوتی ہیں جو اس کی منفرد شناخت قائم کرتی ہیں۔ علیم صبا نویدی بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جن کی پہچان ان کی علمی اور فکری صلاحیت سے ہوتی ہے۔

''کوثر مظہری کی شاعری کے کچھ روشن پہلو'' میں رقمطراز ہیں کہ کوثر مظہری کی شاعری رنگ ہائے بے شمار کا مجموعہ ہے جو ذہن ودل کو دیر تک گرفت میں رکھتی ہے۔ ہر ذائقے کے اشعار ان کے یہاں حاضر ہیں اس لیے انھیں سراپا شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہونا چاہیے۔''

''سوہن راہی: شہر گیت کا شہریار'' کے رسیلے' کٹیلے گیتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب ہم سوہن راہی کے گیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی انفرادیت اور اہمیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ان کے گیتوں میں اشک' آہیں اور چھالے بھی ہیں اور چندا کی صورت خوشبو کی کیاریاں بھی۔ چنچل اور شیتل ندی کے دھارے' کڑکتی دھوپ' پیپل کی چھاؤں' مہکتی انگنائی' سہانی شام اور راتوں کی تنہائی' سرد وگرم ہواؤں کی لہریں' برسات کی دہکتی راتیں' سہانے سپنے اور شرم آگیں مسکان بھی۔

یعنی وہ سب کچھ جو گیت کو رسیلے اور کسیلے بناتے ہیں۔''

بہر حال اس بات کے اقرار میں ذرا بھی تذبذب نہیں کہ نصر اللہ نصرؔ نے پوری دیانت داری اور جرأت مندی سے اپنی قلمی کاوشوں کو سپرد قرطاس کرتے وقت ہر قلمی کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف ہی نہیں کیا ہے بلکہ فنی اور شخصی جائزے میں ذرا بھی تساہلی کی ہے اور نہ ہی کسی کے ساتھ غیر متوازن رویہ روا رکھا ہے۔

اس معاملے میں واقعی نصر اللہ نصرؔ کافی فعال اور متحرک ہیں بلکہ قابلِ ستائش بھی ہیں کہ موضوع و مواد کی چھان بین میں نہ جانے کتنے کنویں جھانکے ہیں یعنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تمام ہی تجزیاتی، تنقیدی اور تاثراتی مضامین میں اپنے بے مثال اسلوب اور اظہارِ بیان کی نئی نئی راہیں اور مضامین کی دروں بینی میں اپنی جان کاری اور فنکاری کے آبشار بہائے ہیں کہ ہر قاری اچھا تاثر سمیٹتا ہے۔

بس یوں جانئے کہ نصر اللہ نصرؔ کے شعری اور نثری تخلیقاتی روانی میں کافی تیزی آئی ہے۔ اس سونامی کے سکون کے بعد اس کے بطون سے کیسے کیسے صدفِ گہر دار نکلیں گے انتظار رہے گا۔

☆☆☆

اردو دربار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول-۷۱۳۳۰۲

سلیم انصاری

شموئل احمد کے ناول ''گرداب'' پر ایک نظر

''گرداب'' شموئل احمد کا نیا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے تین ناول ''ندی''، ''مہاماری'' اور ''اے دلِ آوارہ'' منصۂ شہود پر آ کر ناقدینِ ادب سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔ شموئل احمد ایک ایسے versatile تخلیق کار ہیں جو بیک وقت کئی سطحوں پر فکر و عمل اور تخلیق میں مصروف رہتے ہیں اور چونکہ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک سول انجینئر ہیں لہٰذا ان کی تخلیقات میں ایجاز و اختصار کے ساتھ اظہار میں precision اور accuracy کو بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اپنے مطالعے، مشاہدے، تجربات اور محسوسات کو بنیاد بنا کر اپنی زندگی رنگ تخلیقی کائنات کو منور کرنے والے شموئل احمد کے یہاں مرد اور عورت کے درمیان جسمانی اور روحانی رشتوں کی سچائی اور تقدس کے اظہار کی خوش سلیقگی اور ہنرمندی ہی ان کا تخلیقی وصف ہے۔ میں نے ان کے پہلے تینوں ناول نہیں پڑھے ہیں مگر ان پر ہونے والے مباحث سے میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ ان کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی شعور اور بصیرت، ان کی تخلیقات میں زندگی کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عورت کے اندر ایک نئی عورت کی تلاش انہیں صنف نازک کی جنسی نفسیات اور پیچیدگیوں کی تفہیم اور ترسیل پر آمادہ کرتی ہے۔

''یوں تو شموئل احمد کے افسانے ایک عرصہ سے ادب کے سنجیدہ قارئین کے مطالعے کا حصہ بنتے رہے ہیں مگر ''سنگھاردان'' کی اشاعت کے بعد ان کے افسانوں کی تفہیم کا نیا رویہ سامنے آیا ہے اور پھر ''اونٹ'' نے تو کمال ہی کر دیا۔ ان پر جنسی موضوعات کو شدت سے برتنے کا الزام ہی عائد کر دیا، مگر اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ مرد و عورت کے درمیان جنسی رشتہ فطری ضرورت اور عالم گیر تہذیبی صداقت ہے، شرط ہے اس موضوع کو سلیقے اور ہنرمندی سے برتنے کی۔

زیرِ نظر ناول ''گرداب'' بھی عورت اور مرد کے درمیان نامعلوم جنسی رشتوں کی ضرورت اور اس کی نفسیات پر مبنی ہے، جو جسم سے شروع ہو کر ذہن اور پھر روح تک پھیلتا چلا جاتا ہے، مگر اپنی تمام تر پیچیدگیوں اور الجھنوں کے ساتھ۔ یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ شموئل احمد ایک ماہر نجومی (پامسٹ) اور ٹیرو کارڈ ریڈر (reader) ہیں لہٰذا اپنے افسانوں اور ناولوں میں اپنی اس علمی لیاقت اور مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے کرداروں کی کنڈلی یا زائچہ بنا کر اس کے ستاروں کی چال اور ان کی پوزیشن کے اعتبار سے رنگ بھرنے میں ماہر ہیں جس سے ان کی تخلیقات نئے مظاہر سامنے آتے ہیں اور ان کی کہانیوں کا کینوس کئی دشاؤں میں روشن ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر ناول ''گرداب'' کی کہانی بھی مرد و عورت کے درمیان جنسی ضرورت اور اس کی نفسیات کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے۔ اپنے اس ناول میں بھی انہوں نے پامسٹری کے علم کا استعمال نہایت عمدگی اور ہنرمندی سے کیا ہے، بلکہ گرداب کے سب سے زیادہ مضبوط کردار ساجی سے ان کی ملاقات اور رشتہ کا ذریعہ بھی ان کا یہی علم ہے۔ دراصل ناول کا مرکزی کردار جو واحد متکلم ہے، جو ناول نگار بھی ہو سکتا ہے۔ صوبائی حکومت میں ملازم ہے اور اس کا

تبادلہ اکثر بہار کے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ہوتا رہتا ہے،لہٰذا وہ اپنی بیوی اور بچوں کو پٹنہ میں ہی رکھ کر خود آنا جانا کرتا ہے۔اس بار اس کا تبادلہ لال گنج میں ہو جاتا ہے جہاں کرائے کا مکان لیتے ہوئے اس کی ملاقات ساجی سے ہو جاتی ہے جو مالک مکان کی بیوی ہے۔ساجی ناول کا ایک ایسا ضروری کردار ہے جو کہانی کا لازمی حصہ ہے اور اس ساتھ ساتھ آخر تک سفر کرتا ہے اور جس کے بغیر کہانی کا تصور بھی ممکن نہیں۔شموئل احمد کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے ساجی کے کردار کو نہایت ہنر مندی اور چابک دستی سے تراشا ہے۔

ناول میں ساجی کو ایک کم پڑھی لکھی عورت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس کے پیچھے ناول نگار کی کیا سوچ ہے اس کا اندازہ ناول کو پورا پڑھنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔کہانی کے مطابق ساجی کی شادی ایک ایسے گھر میں ہوئی ہے جہاں سارے لوگ مڈل فیل ہیں مگر شادی سے پہلے خود کو تعلیم یافتہ ظاہر کرتے ہیں۔خود اس کا شوہر یعنی درجات بھی کم پڑھا لکھا ہے اور ساجی سے یہ جھوٹ بھی بولتا ہے کہ اس کے پاس کتابوں سے بھری الماری ہے،لیکن سچائی یہ ہے کہ ایک اخبار تک گھر میں نہیں آتا۔شاید اسی لئے درجات کے کردار کو احمق،بیوقوف،گاؤدی اور کم آئی کیو والے شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار سے ساجی کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنی کنڈلی میں ستاروں کا حال جاننے کے لئے آئی تھی مگر ناول نگار کچھ حال بتا کر اس کی کنڈلی کے نامکمل ہونے کی بات کہتا ہے اور خود صحیح کنڈلی بنانے کا وعدہ کرتا ہے اور یہ تعجب بھی کرتا ہے کہ اسے ناول نگار کے نجومی ہونے کی بات کیسے معلوم ہوئی؟ درجات انکشاف کرتا ہے کہ اسے ناول نگار کے آفس کے ہیڈ کلرک نے یہ جانکاری دی،مگر درجات سے ہیڈ کلرک کی ملاقات کہاں،کب اور کیسے ہوئی یہ پتہ نہیں چلتا۔پھر ساجی سے دوسری اور باقاعدہ ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی بیٹی رینو کی کنڈلی دکھانے آتی ہے اور اس بار اس کا شوہر ساتھ نہیں ہوتا،اور یہیں سے ساجی اور ناول کے مرکزی کردار کے درمیان ایک بے نام سی قربت کا آغاز ہوتا ہے۔ساجی کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گذار کر اسے احساس ہوتا ہے کہ پانچ بچے جننے کے بعد بھی ساجی کے اندر کی عورت مری نہیں تھی۔وہ سادہ لوح اور معصوم تھی،وہ ساجی کو چھونا چاہتا ہے اور یہیں سے ساجی کی زندگی میں موجود ادھورے پن اور خالی پن کے اندھیروں کو بھرنے کے لئے جسمانی رشتوں اور ضرورت کے لئے ناول میں سازگار ماحول بنانے لگتا ہے۔ناول کے صفحہ ۱۴۰ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ’’مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرے لئے اس عورت کو چھونا آسان ہے۔ہر عورت اپنے لاشعور کے نہاں خانوں میں ایک مثالی مرد کی تصویر سجائے رکھتی ہے۔وہ اس شخص سے قربت محسوس کرتی ہے جس میں مثالی شبیہ نظر آتی ہے،ظاہر ہے درجات میں یہ خوبیاں برائے نام بھی نہیں تھیں اور مجھ میں......؟ میرے پاس کتابوں سے بھری شیلف تھی۔میں اس کی نظر میں ہیرو تھا......اعلیٰ درجے کا رئیس......ایک ہاتھ میں کتاب......انگلیوں میں سگریٹ......خدمت گذار پاؤں دباتے ہوئے اور جالیوں سے تکتی وہ......!‘‘

ناول کے مرکزی کردار اور ساجی کے درمیان قائم ہوتے رشتوں نے کئی آسانیاں بھی فراہم کر دی ہیں۔اس کے لئے چائے،ناشتہ اور کھانا وغیرہ گاہے بگاہے ساجی کے یہاں سے آنے لگتا ہے اور اس کے کپڑے وغیرہ بھی ساجی کے یہاں دھلنے لگے ہیں۔

ناول کا مرکزی خیال عورت اور مرد کے درمیان گمشدہ رشتوں کی تلاش اور اس کی بازیافت پر مبنی ہے اور یہ رشتہ ناول میں کئی سطحوں پر نمودار ہوتا ہے۔ ناول نگار اپنی بیوی نصیب سے بھی بہت محبت کرتا ہے، جو پٹنہ میں اپنے دو بچوں سیفی اور کیفی کے ساتھ رہتی ہے مگر ساجی سے اس کے رشتوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ محض جنسی اور جبلی خواہشوں کی تکمیل کی کوشش ہے؟ کیا یہ رشتہ ناول نگار کی اپنی ذاتی زندگی میں کسی کمی یا ناآسودگی کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوتا ہے، یا پھر اس رشتے میں کوئی دوسرا پہلو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے، اس کا جواب ناول کے مطالعے سے واضح طور پر مل جاتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ فرمائیں۔

''میں صرف دوستی چاہتی ہوں......اور بس......!'' (صفحہ: ۴۷)، ''ایک دیا آپ کے نام کا بھی جلاؤں گی۔'' (صفحہ: ۴۸)، ''میں جانتی ہوں آپ میرے دوست نہیں ہو سکتے۔'' (صفحہ: ۴۸)، ''میں صرف دوستی چاہتی ہوں۔'' (صفحہ: ۴۹)، ''آپ حد سے گذرنا چاہتے ہیں مگر میں شادی شدہ ہوں۔'' (صفحہ: ۴۹)

ان جملوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ساجی اپنی زندگی کے خالی پن اور ادھورے پن کو تو بھرنا چاہتی ہے مگر جسم کی قیمت پر نہیں مگر کمار جو ساجی کا نہ صرف مجازی ہیرو ہے بلکہ اس کا آدرش بھی ہے، اس کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا ہوتا ہے۔ وہ ساجی کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ دوستی اگر دل سے ہو تو اس میں جسم بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں اس کے مطابق ''اصل میں عورت سے تعلق استوار ہوتا ہے تو بیچ میں لچھمن ریکھا بھی ہوتی ہے جو فوراً عبور نہیں ہوتی تو وقت کے ساتھ گہری ہونے لگتی ہے اور عمر بھر قائم رہتی ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اس لکیر کو مٹا دینا تھا ورنہ یہ تعلق محض دوستی تک محدود رہتا۔'' یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس سے ناول نگار آخر تک خود کو الگ نہیں کر پاتا بلکہ اس کو زندگی کا سچ ثابت کرنے کے لئے شعوری کوششیں بھی کرتا ہے۔

ناول میں جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے سارے منظر اپنے آپ صاف اور واضح ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں ناول نگار کی تعریف اس لئے بھی لازم ہے کہ اس نے نہایت ایمانداری اور صاف گوئی سے ساجی کے دل میں روشن اس بے نام رشتے کی نوعیت واضح کر دی کہ وہ اس رشتے کو محض دوستی تک محدود رکھنا چاہتی ہے، ورنہ اس کا اپنا یقین تو یہی ہے کہ جسم کے خلوص سے بڑھ کر کوئی خلوص نہیں اور وہ اپنے اس مشن پر ہی آگے بڑھتا ہے حالانکہ وہ کہیں نہ کہیں اس انجانے خوف سے بھی دوچار ہے کہ ''عمر کے اس حصے میں اس قسم کے تعلقات......؟ بات کبھی تو طشت از بام ہوگی۔ نصیب پر کیا اثر ہوگا۔''

ان سب خوف اور تذبذب کے باوجود ناول نگار ساجی کے جسم کے خلوص کا منتظر ہے۔ وہ ہر رات اس کا انتظار کرتا ہے مگر کیا عورت اپنا جسم اتنی آسانی سے پیش کر دیتی ہے جتنی آسانی سے مرد خود کو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے پیش کر دیتا ہے؟ ایک رات جب ساجی اس سے ملنے آتی ہے اور یہ شرط رکھتی ہے کہ:

''مجھے سیندور لگاؤ۔''

''سیندور؟'' میں مسکرایا۔ ''اتنی سی بات؟''

''اتنی سی بات......؟ تم اسے اتنی سی بات کہتے ہو؟'' وہ تقریباً رو پڑی۔

میں نے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ''اے چاند! تو گواہ ہے۔ میں اس عورت کو اپناتا ہوں

......!'' اور میں نے چٹکی بھر سیندور اس کی مانگ میں بھر دی۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''میں تو دروپدی ہوگئی۔'' اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔''

ناول میں یہاں سے ایک نیا زاویہ روشن ہوتا ہے۔ ساجی جو ایک کم پڑھی لکھی اور سادہ سی عورت ہے اسے ایک طرح کے تحفظ کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ بقول ناول نگار اپنے جسم کا خلوص دینے کو راضی ہو جاتی ہے اور اب ناول کا مرکزی کردار ساجی میں اپنی بیوی سے الگ ایک نئی عورت دیکھنے لگتا ہے۔ ایک ایسی عورت جو مرد کی جنسی تسکین کو نقطۂ عروج تک پہنچا کر خود بھی جنسی تسکین حاصل کرتی ہے۔ وہ ساجی کے ساتھ اپنی ناآسودہ جنسی خواہشات پوری کرنا چاہتا ہے۔ وہ ساجی کو مکمل طور پر برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی تمام تر منت وسماجت کے باوجود، اس کے اس اعتراف اور انکشاف کے باوجود کہ وہ برہنہ ہو کر کولڈ ہو جاتی ہے، ناول کا مرکزی کردار اسے برہنہ کر کے ہی سیکس کرنے پر آمادہ رہتا ہے اور اس کے لئے دلائل بھی دیتا رہتا ہے۔

''میں نے اسے کپڑوں سے بے نیاز کرنا چاہا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی...... پلیز مجھے اور عریاں مت کرو۔ میں پوری طرح برہنہ نہیں ہوسکتی...... کمار...... کمار...... مجھے ننگا مت کرو۔!''

آخرکار ناول نگار ساجی کو یہ اطمینان دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ عورت ہمیشہ اسی طرح ننگی کی گئی ہے۔ اب اسے اپنی بیوی نصیب اور ساجی میں ایک واضح فرق نظر آنے لگا تھا، وہ نصیب کے سامنے سگریٹ اور شراب کا شغل نہیں کر سکتا تھا، جب کہ ساجی اسے خود اپنے ہاتھوں سے سگریٹ کیا شراب کے پیالے بنا کر پیش کرنے پر راضی رہتی ہے۔

ناول کا مرکزی خیال عورت اور مرد کے درمیان جسمانی اور جنسی رشتوں کے گرد ہی گھومتا ہے، مگر کیا یہ رشتہ پوری کہانی کے درمیان کبھی جسم سے روح کی طرف بھی سفر کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ناول نگار کے اس دعوے کے باوجود بھی نہیں ملتا کہ محبت ہمیشہ روحانی ہوتی ہے۔ جسم وسیلہ ہوتا ہے۔ جسم سے گذرے بغیر کوئی روح تک نہیں پہنچ سکتا اور کئی بار یہ احساس قوی ہوتا چلا جاتا ہے کہ ساجی اور کمار دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کسی اور ہی ضرورت کے سبب ہم رشتہ ہیں اور اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ جن کا اندازہ ان چند اقتباسات سے ہوسکتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ساجی مجھ تک میری محبت میں نہیں پہنچی ہے۔ عدم تحفظ کا احساس اسے میری بانہوں تک کھینچ لایا ہے۔ میری بازوؤں میں وہ محفوظ ہے لیکن کیا میں بھی اس کے پہلو میں محفوظ ہوں؟''

(صفحہ: ۷۰)

''مجھے درجات سے نفرت ہو رہی تھی، اس شخص کا سینہ ناکام آرزوؤں کا مسکن ہے۔ ایک ناکام آدمی، کہیں سے ساجی مل گئی جو اس کے جھوٹ کو جی رہی ہے اور خود بھی جھوٹ ہوگئی۔ ایک نمبر کی ہائپوکریٹ پتی...... پتی...... پتی...... اور خود پرائے مرد سے ہم بستر ہوتی ہے۔

''میں مسکرایا لیکن خاموش رہا۔ مجھے یاد ہے میں نے ایسا کیا تھا لیکن یہ میری محبت نہیں تھی یہ میری اداکاری تھی۔ میرے دل نے نہیں کہا تھا اسے سینے سے لگالو۔''

''خود تو میری بانہوں میں عیش کرے گی۔ ساجی کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ کیا ہوگی......؟ ایک بیوی کسی کی داشتہ ہوگئی۔ عورت کی تنزلی کی انتہا ہے۔ کیا محبت عورت کو ڈیگریڈ کرتی ہے۔؟''

''میں کیا کروں......؟ عورت کا جسم ایک گرداب ہے، جس میں میں اتر چکا ہوں۔''

''ساجی مجھے دل سے چاہتی ہے لیکن میں اسے دماغ سے چاہتا ہوں۔''

محولہ بالا اقتباسات سے یہ نتیجہ نکالنا کوئی مشکل نہیں کہ ناول کے مرکزی کردار یعنی ساجی کے کمار کے ذہن میں محبت کا جو تصور ہے وہ روحانی بالکل نہیں، بلکہ وہ جسمانی ضرورتوں اور جنسی ضرورتوں کی تکمیل کا خواہش مند ہے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا جھکاؤ ساجی کی طرف محض نوکری میں اکیلے رہنے کے سبب ہوا ہے یا پھر اس کا تعلق کسی گہری نفسیاتی الجھن سے ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ ساجی اور کمار کے درمیان قائم ہوئے رشتے میں شدت اور Intimacy ضرور تھی اور یہ رشتہ اس سطح پر تھا کہ ایک دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر اور لازم وملزوم ہو گئے تھے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان اس طرح کے رشتے بہت دنوں تک برقرار نہیں رہتے اور جسموں کی ضرورت ختم ہوتے ہی جذباتی سطح پر بھی مر جاتے ہیں اور پھر مرد اور عورت دونوں اپنی اصل زندگی میں واپس چلے جاتے ہیں۔

ناول میں ایک نیا اور گمبھیر موڑ اس وقت آیا جب ساجی نے اپنی بیٹیوں کو اچھی تعلیم دینے کی غرض سے پٹنہ منتقل ہونے کا پروپوزل رکھا اور منطق یہ دی کہ پٹنہ میں رہ کر وہ اپنے کمار سے ہمیشہ مل سکے گی اور اپنی بیٹیوں کو بھی اچھے اسکول میں تعلیم دلا سکے گی۔ ظاہر ہے ساجی کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے بل بوتے پٹنہ میں مکان، تعلیم اور گھریلو اخراجات کا بوجھ برداشت کر سکے۔ لہٰذا یہ سارا بوجھ ناول کے مرکزی کردار کو ہی برداشت کرنا تھا اور یہ سب کچھ understood تھا۔ مکان کا انتظام، بیٹیوں کے داخلے اور گھر کے اخراجات تک بات محدود رہتی تو الگ بات تھی، ساجی کی شرط اور خواہش یہ تھی کہ اس کا کمار جب بھی پٹنہ آئے تو اپنی بیوی نصیب سے ملنے سے پہلے ایک دو دن اس سے مل کر جائے اور پٹنہ سے لال گنج واپس جاتے ہوئے بھی اس سے ملے۔ شروع میں یہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ پٹنہ آ کر پہلے ساجی یعنی اپنی داشتہ کے گھر آنا، گھر میں ضروری سامان مہیا کرنا، ساجی اور بچوں کو گھمانا، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا...... پھر اپنے گھر یعنی نصیب اور اپنے بچوں سے ملنا۔ ظاہر ہے اب ناول کے مرکزی کردار کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں اور وہ جسم کا خلوص حاصل کرتے کرتے خود دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا، جس کے سبب ذہنی پریشانی لازم تھی جس کا اظہار ناول کے آخری حصہ میں کئی بار کیا گیا ہے۔

''اب ساجی پوری طرح میری دسترس میں تھی تو میں اس کی قربت میں ایک طرح کی الجھن محسوس کر رہا تھا۔''

''ساجی میری دسترس میں تھی یا میں اس کے قبضے میں تھا۔''

''دس دنوں کا راشن خریدا۔ اپنے لئے وہسکی لی۔ گھر آیا تو ایک نامعلوم سا غصہ میرے اندر دھوئیں کی طرح پھیل رہا تھا گویا سارے کنبے کا بوجھ......؟ مجھے زنجیر صاف نظر آ رہی تھی جس کا سرا ساجی کے ہاتھوں میں تھا۔''

ناول نگار کی الجھنیں اور ساجی سے اکتاہٹ کا سبب محض مالی بوجھ نہیں تھا بلکہ اس کے لاشعور میں ایک طرح کا احساسِ شرمندگی بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہے اور یہ احساسِ جرم ایک ایسی نفسیاتی الجھن تھا جو کمار کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ:

''کیا میں اس عورت سے محبت کرتا ہوں......؟ یا ہمارے درمیان محض سیکس ہے؟ سیکس نے مرد کو بھی ادھورا رکھا ہے اور عورت کو بھی......ہم دونوں ادھورے ہیں اور ہمیں ملانے والی کڑی سیکس ہے...... شاید ہم کسی اور طرح ایک نہیں ہو سکتے......ہماری روح میں سناٹا ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ روح کا سناٹا پرائے جسم کی روشنی سے پُر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اپنے آپ کو بہت دن تک اس دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے کہ روح تک پہنچنے کا راستہ محض جسم سے ہو کر گزرتا ہے۔ ساجی جو اس ناول میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے ادھورے پن کو مکمل کرنے کے لئے ایک پرائے مرد کا سہارا لیا۔ ساجی کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، مطالعے کا شوق تھا، اچھی زندگی گزارنے کی خواہش تھی، ایک پڑھے لکھے شوہر کا خواب دیکھا تھا اس نے مگر یہ سب کچھ وہ اپنی زندگی میں حاصل نہ کر سکی، کم سنی میں اس کی شادی ایک کم پڑھے لکھے اور معمولی آدمی سے ہو گئی اور پانچ بیٹیوں کی ماں بھی بنی، اپنی تمام تر نا آسودگیوں اور خالی پن کے باوجود اس نے اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر اپنی بیٹیوں کی آنکھوں میں روشن کر دی اور انہیں اچھی تعلیم دلانے کا منصوبہ بنایا جس کے لئے اسے کمار کی صورت میں ایک سہارا مل گیا۔

ناول کا کلائمکس بہت کنونسنگ (convincing) نہیں ہے اور مصنوعی لگتا ہے۔ چوں کہ ناول کا ہیرو ساجی سے اکتا چکا ہے اور دو کشتیوں میں سوار ہونے کے سبب بہت ساری ذہنی پریشانیوں اور نفسیاتی دباؤ کا شکار بھی ہے لہٰذا ساجی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے، جس کے لئے ساجی کے گاؤں میں ایک شادی میں پہاڑی پر اپنی بیوی نصیب، درجات اور دیگر لوگوں کی موجودگی میں ساجی کے ذریعہ تصویریں لینے کے دوران میسمرزم کے ذریعہ suggestion بھیج کر خودکشی پر آمادہ کرنے کا عمل قابلِ ستائش نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ایک طرح کا فرار ہی ہے۔ ناول نگار کے میسمرزم کے علم کی اطلاع پورے ناول میں کہیں نہیں دی گئی ہے۔ خیر یہ ایسا ضروری جز بھی نہیں کہ ناول کی کہانی پر اثر انداز ہو سکے۔ اس طرح کے اختتام کو ناول نگار کی مجبوری ہی سمجھنا چاہئے ورنہ ناول کو انجام تک پہنچانے کے لئے کئی اور گھماؤں سے گذرنا پڑتا مگر اچھی بات یہ ہے کہ ناول نگار نے ساجی کے شوہر درجات کے سامنے ایمانداری سے یہ قبول بھی کر لیا کہ:

''آتم ہتیا نہیں تھی......یہ ہتیا تھی ہتیا......میں نے اس کی ہتیا کی احمق آدمی۔''

شموئل احمد کے اس ناول گرداب کا بیانیہ دلچسپ ہے اور قاری کو پورا پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کی کڑیاں قاری کو نہیں جوڑنا پڑتیں، بلکہ کہانی اپنے آپ ہی قاری کے ذہن میں سفر کرنے لگتی ہے۔

HIG-3, Anand Nagar, Adhartal, Jabalpur-482004 (M.P.); Mob 7070135643

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

سید منظر امام: منفرد شخصیت

ادبی اور صحافتی مرکز 'امیر منزل'، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ کی آخری کڑی ٹوٹ گئی، یعنی سید منظر امام (بن سید امیر علی، متوفی: ۱۹۳۸ء، بن ڈاکٹر پیر بخش) نے ۲۴؍ اگست ۲۰۱۸ء مطابق ۱۲؍ ذی الحجہ ۱۴۳۹ھ بروز جمعہ بوقت ۷ بجے شام فاطمہ ہاؤس، قمر مخدومی روڈ، واسع پور، دھنباد میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ کی نماز ۲۵؍ اگست کو بعد نماز عصر شمشیر نگر، دھنباد میں امام مسجد نے پڑھائی اور مقامی قبرستان شمشیر نگر میں تدفین عمل میں آئی۔ اپنے دونامور بھائی جناب حسن امام درد (متوفی: ۲۰۱۲) اور مظہر امام (متوفی: ۲۰۱۲) کے دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ اس خانوادہ کے آخری چشم و چراغ تھے۔ پس ماندگان میں بیوہ ڈاکٹر شاہینہ امام، ایک بیٹی ڈاکٹر زہرہ شمائل (جو تدریس کے مشغلہ سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے شوہر مشہور شاعر، ادیب، نقاد اور مورخ ڈاکٹر امام اعظم ہیں)۔ دو بیٹے راشد امام اور خالد امام کو چھوڑا۔

سید منظر امام کی ولادت ۱۰؍ اگست ۱۹۳۸ء کو 'امیر منزل'، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں ہوئی۔ ان کی نانیہال رسول پور نستہ بھرواره، دربھنگہ تھی، ان کے نانا مولوی سید عبد العلی ناصری مرحوم تھے۔ ان کی والدہ کا نام سیدہ کنیز فاطمہ تھا۔ اس خاندان کی رشتہ داری ناصر گنج میں بانی مدرسہ امدادیہ حاجی سید منور علیؒ خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خانوادہ سے تھی۔ سید منظر امام کی ولادت کے کچھ دنوں بعد ہی والد ماجد سید امیر علی کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اس لئے ان کی تعلیم و تربیت والدہ سیدہ کنیز فاطمہ کی نگرانی میں معروف ادیب وشاعر حسن امام درد اور ممتاز شاعر مظہر امام کے زیر سایہ ہوئی۔ تعلیم کے تمام مراحل دربھنگہ میں ہی طے ہوئے، گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور امیر منزل اس زمانہ میں ساری علمی اور ادبی تحریکوں کا مرکز، اس لئے ادب وشاعری سے تعلق بچپن سے ہی قائم ہو گیا۔ ادبی ماحول کے باوجود کم عمری میں جو مشغلۂ سخن جاری کیا، اس کو لکھتے اور پھاڑتے رہے، بڑوں کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے تھے، کچھ تو معیار کی فکر اور کچھ بڑوں کا ادب واحترام مانع رہا۔ ان کی پہلی نظم بچوں کے رسالہ ''کھلونا'' میں ''عزمِ جواں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اہل ذوق میں پذیرائی ملی، حوصلہ بڑھا، شعر کہتے رہے۔ ان کی ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

جب تک تیرا خیال شریکِ سفر نہ تھا　　رستے میں تیز دھوپ تھی کوئی شجر نہ تھا
جب تک جئے مسیح کئی تھے مرے قریب　　مرنے لگے تو پاس کوئی چارہ گر نہ تھا

لیکن شاعری سے جلد ہی انہوں نے خود کو الگ کر لیا اور افسانہ نگاری شروع کر دی۔ مظہر امام صاحب جب کلکتہ چلے گئے تو ان کی لائبریری اب سید منظر امام کی دسترس میں تھی، کتابیں اس میں ہر فن کی تھیں، لیکن طبیعت کو کہانیاں بھا گئیں۔ اس عمر میں محبت وعشق کی داستانیں اچھی لگتی ہیں، مطالعہ کیا، خوب کیا، لکھا اور خوب لکھا، ان کا پہلا افسانہ ۱۹۵۳ء میں ''چندن'' دہلی میں چھپا، پھر ان کے افسانے مسلسل چندن، سہیل گیا، صنم پٹنہ، صبح نو پٹنہ، کہانی کلکتہ اور جامِ نو کراچی میں شائع ہوتے رہے۔ اس درمیان وہ بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھتے رہے جو کھلونا، آج کل اور پھلواری میں چھپے۔

ان کی پذیرائی علمی وادبی حلقوں میں بڑھتی رہی۔انہوں نے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے دوران دربھنگہ سے سہ ماہی ''رفتارِ نو'' کا اجراء کیا جس کے پانچ شمارے ہی نکل پائے،لیکن ان شماروں کے مشمولات نے ملک کے نامور ادباء وشعراء کو اس رسالہ کی طرف متوجہ کردیا اور انہیں مشہور قلم کاروں کا تعاون حاصل ہوگیا۔قابل ذکر ہے کہ مظہر امام کی ایجاد کردہ پہلی آزاد غزل ''رفتارِ نو'' میں ہی شائع ہوئی تھی،اس طرح شاعر،افسانہ نگار کے ساتھ وہ ادبی صحافی کی صف میں شامل ہوگئے۔

۱۹۶۴ء میں فکر معاش نے انہیں جمشید پور پہنچا دیا۔یہاں ان کی دوستی منظر کاظمی سے گہری رہی۔دونوں کے اشتراک سے چینی جارحیت کے خلاف لکھے گئے افسانوں کا انتخاب 'ہمالہ کے آنسو' کے نام سے طبع ہوکر کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔جمشید پور کے دوران قیام ایک رسالہ ۱۹۷۲ء میں ''ترسیل'' کے نام سے نکالا،لیکن اس کا پہلا شمارہ ہی آخری شمارہ بن گیا اور اس رسالہ کو حیاتِ جاودانی تو کیا حیات طولانی بھی نصیب نہیں ہوئی۔۱۹۷۶ء میں شہر آہن جمشید پور سے وہ بلیک ڈائمنڈ کوئلے کے شہر دھنباد چلے آئے اور یہاں گرونانک کالج میں بحیثیت لکچرار تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔۲۰۰۰ء میں دھنباد سے سہ ماہی رسالہ ''وقت'' نکالنا شروع کیا اور ان میں خصوصی گوشے ادباء شعراء پر آنے لگے،جس کی خاصی پذیرائی ہوئی،لیکن اس کے بھی آٹھ شمارے ہی شائع ہوسکے اور قارئین کی کمی اور وسائل کی قلت نے اس رسالے کے سفر کو مسدود کردیا یعنی اس رسالہ کی حیات مستعار بھی دو سال سے زائد نہیں ہوسکی۔

سید منظر امام کی شاعری،افسانے،تنقید اور صحافت معیاری تھی،لیکن معیار کی برقراری کے لئے یکسو ہوکر لگ جانا ضروری تھا مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ کسی ایک فن کے ہوکر نہ رہ سکے،اس لئے ساری خوبیوں کے باوجود وہ ادبی دنیا میں اپنے برادران کی طرح بڑا نام نہیں کرسکے۔انہوں نے 'تمثیل نو' میں بڑے دلچسپ انداز میں اپنی آپ بیتی ''دربھنگہ: دل سے جاتی ہی نہیں یاد تیری'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔کئی قسطیں اس کی آئی تھیں۔ زبان وبیان اس قدر عمدہ تھا کہ کئی لوگ 'تمثیل نو' پڑھنا اسی مضمون سے شروع کرتے تھے،لیکن یہ آپ بیتی بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی۔آپ بیتی مکمل کبھی نہیں ہوتی کیوں کہ موت کے احوال اس میں نہیں آپاتے،لیکن بیشتر زندگی آجاتی ہے۔سید منظر امام کی یہ آپ بیتی اس مرحلہ تک بھی نہیں پہنچ سکی،۱۹۹۹ء میں وہ گرونانک کالج سے سبکدوش ہوکر دھنباد میں ہی مقیم ہوگئے تھے اور وہاں کی ادبی مجلسوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ان کے جانے سے دھنباد کی مجلس بھی سونی ہوگئی ہے،لیکن ان کی ادبی،علمی خدمات کو ان کے ہزاروں شاگرد تسلسل بخشیں گے،ایسا یقین ہے۔''سید منظر امام کی شخصیت اور ادبی کارگزاریوں'' کے عنوان سے احمد معراج نے شعبۂ اردو ایل این متھلا یونیورسٹی،دربھنگہ میں ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔اس مقالہ کی اشاعت کے بعد سید منظر امام کو ہم زیادہ بہتر انداز میں جان اور سمجھ سکیں گے،تب تک ہمیں انتظار کرنا چاہئے اور مغفرت کی دعا کرنی چاہئے کیوں کہ یہ ''ادبی سرمایہ'' کی قیمت جو کچھ ہے دنیا میں ہی ہے،آخرت میں ''ادب'' کا نہیں ''عمل'' کا سکہ چلتا ہے، جس پر مغفرت کا مدار ہوتا ہے۔اقبال کا شعر برجستہ نوک قلم پر آگیا:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

....

بہ شکریہ: ایڈیٹر ہفتہ وار نقیب، پھلواری شریف، پٹنہ۔ مورخہ ۲۲؍اکتوبر ۲۰۱۸ء

انوارالحسن وسطوی

مونوگراف ''مظہرامام'': ایک مطالعہ

ساہتیہ اکادمی، دہلی کے زیرِاہتمام ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت شائع کتاب ''مظہرامام' اردو کے معروف ادیب، شاعر، محقق، مترجم اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم کی تصنیف (مونوگراف) ہے۔اس سے قبل موصوف کی درجنوں کتابیں منظرعام پر آکر قارئین و ناقدینِ ادب سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔موصوف ادبی جریدہ ''تمثیلِ نو' دربھنگہ کے مدیرِاعزازی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے کولکاتا ریجنل سینٹر کے ڈائریکٹر جیسے عہدے کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی نبھارہے ہیں۔تصنیف وتالیف سے ان کا شغف جسم وروح کے تعلق جیسا ہے۔جس تواتر سے ان کی کتابیں منظرِعام پر آرہی ہیں اسے دیکھ کرانھیں ''مجنونِ اردو'' کا خطاب دیا جاسکتا ہے :

دلوں کو فکردوعالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

مظہرامام اردو کے ممتاز شاعر، ناقد، محقق، افسانہ نگار، خاکہ نگار، انٹرویونگار، مکتوب نگار اور ادبی صحافی تھے۔ اردو شعروادب کی بقاوفروغ کے لیے ان کی خدمات اور کارنامے نہایت وقیع اور عظیم ہیں۔وہ مرنجامرنج شخصیت کے بھی مالک تھے۔چنانچہ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی اس تصنیف میں مظہرامام کی مختلف حیثیتوں کے پیش نظر ان کے تعلق سے اس مونوگراف میں کئی باب متعین کیے ہیں۔موصوف نے سب سے پہلے ان کی شخصیت کوموضوع بنایا ہے۔''شخصیت'' کے اس باب میں ڈاکٹر امام اعظم نے مظہرامام کے سوانحی کوائف کے تعلق سے اتنا بھرپور لکھا ہے کہ کہیں پرقاری کو تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔اس باب میں مظہرامام کی پیدائش، تعلیم، ملازمت، تصانیف، خدمات، اعزازات اور انعامات سے لے کر رحلت تک کے حالات وواقعات درج ہیں۔ساتھ ہی ان کے آباواجداد اوران کے بزرگوں کا بھی تفصیلی ذکر اس باب میں موجود ہے۔مظہرامام کا تعلق جس علمی خانوادے سے تھا، اس خانوادے کے افراد علم وفضل کی دولت سے بہرہ ور تھے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مظہرامام کی شخصیت کی تعمیر میں جہاں فیضانِ نظر کا حصہ تھا وہیں مکتب کی کرامت بھی شامل تھی۔ان دونوں کے امتزاج سے جوشے وجود میں آسکتی تھی اُسی کا نام مظہر امام ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے اس حقیقت کے تعلق سے صحیح تحریر فرمایا ہے:

''کوئی شخصیت تبھی ابھرتی ہے جب اس کے خمیر کو معقول آب وگل اور سازگار ماحول میسر آتا ہے۔ مظہرامام ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اونچی نسبت اور صحبت صاحبان علم وکمال دونوں حاصل ہوئے۔ پھر حالات نے ان میں اکتسابی تڑپ پیدا کی تو وہی جوہرِ خفتہ نکھرتا چلاگیا۔'' (ص:۱۱)

مظہرامام کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔پھر ان کا رجحان نظم نگاری کی جانب مائل ہوا۔نئی صنف ''آزادغزل'' کے تو وہ موجد ہی تھے۔ان کے پانچ شعری مجموعے ''زخم تمنا'' (نظمیں/غزلیں)، ''رشتہ گونگے سفر کا'' (نظمیں/غزلیں)، پچھلے موسم کا پھول (شعری مجموعہ)، ''بند ہوتا ہوا بازار''

(کلیات نظم) اور ''پالکی کہکشاں کی'' شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان کے شعری مجموعہ ''پچھلے موسم کا پھول'' پر ۱۹۹۴ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ بحیثیت شاعر مظہر امام کی حیثیت مسلم ہے۔ دیگر اصناف سے شغف ہونے کے باوجود بحیثیت شاعر ہی ان کی شناخت رہی اور اسی حیثیت سے وہ مشہور بھی ہوئے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے اس مونوگراف میں مظہر امام کی شاعرانہ عظمت کو اُجاگر کرنے کے لیے تین ابواب قائم کیے ہیں۔ ''بحیثیت غزل گو''، ''بحیثیت نظم نگار'' اور ''بحیثیت آزاد غزل گو''۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کی شعری خدمات پر ڈاکٹر امام اعظم نے تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ شاعری سے مظہر امام کے شغف کی روداد ڈاکٹر امام اعظم کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''غزل ایسی صنف شاعری ہے جو گہرائی و گیرائی اور دروں بینی کے اعتبار سے مشکل ضرور ہے مگر تکنیکی اعتبار سے آسان بھی ہے کہ موزوں طبع کی شعوری کوشش اسے متشکل کر دیتی ہے۔ اسی لیے غزل نے مظہر امام کو بھی مشقِ سخن کی راہ پر تب ڈال دیا جب یہ تیرہ سال کے تھے...... شعور کے ارتقا کے ساتھ غزل کا رنگ بھی بدلتا رہا کہ طبیعت قانع نہیں تھی۔ ذاتی، سماجی، سیاسی حالات اور ادبی تحریکات کے اثر سے فکر میں تموج برپا ہوا...... انفرادیت کی چاہ بھی ندرت وجدّت کی راہ تلاشتی رہی جس نے ابتدا ہی سے انھیں تجربے کی شعوری کاوشوں پر گامزن کر دیا۔ آزاد غزل کا تجربہ ایسی ہی کاوش کا نتیجہ تھا۔'' (ص:۳۲)

مظہر امام کی حیثیت ایک ناقد کی بھی تھی۔ چنانچہ اس مونوگراف میں ''مظہر امام: بحیثیت تنقید نگار'' بھی ایک باب مختص ہے۔ جس میں ڈاکٹر امام اعظم نے مظہر امام کے تنقیدی کارناموں اور ان کی تنقیدی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ''آتی جاتی لہریں'' (تنقیدی مضامین)، ''ایک لہر آتی ہوئی'' (تنقیدی مضامین)، ''تنقید نما'' (تنقیدی مضامین) اور ''نگاہِ طائرانہ'' (تبصرے، دیباچے، تنقیدی اشارے) جیسی کتابیں مظہر امام کی تنقید نگاری کی عمدہ دلیل ہیں۔ تنقید میں مظہر امام نے جس طرح اپنے قلم کی جولانی دکھائی ہے اس کی بنا پر ڈاکٹر امام اعظم کی رائے ہے کہ:

''اردو میں ''نقاد شاعر'' تو بہت ہیں مگر ''شاعر نقاد'' خال خال ہی ملتے ہیں۔ ان میں مظہر امام سب سے کشیدہ قامت ''شاعر نقاد'' تھے۔ اس سے انحراف مشکل ہے۔'' (ص:۱۰۴)

مظہر امام کی شناخت ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی تھی۔ ان کی اس سلسلے کی تصنیف کا نام ''اکثر یاد آتے ہیں'' ہے۔ جس میں انھوں نے جگر مرادآبادی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، اشک امرتسری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، کرشن چندر، اختر قادری اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسی شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں۔ مظہر امام کے ان خاکوں کو مروجہ ڈگر سے ہٹ کر ہونے کے سبب ڈاکٹر امام اعظم نے انھیں آزاد خاکہ مانا ہے اور اسے خاکہ نگاری کے دائرے میں وسعت و تنوع قرار دیا ہے۔ ان خاکوں کے زبان و بیان کے تعلق سے امام اعظم لکھتے ہیں:

''خاکوں کے بیان میں اسلوب کی جو دلکشی ہے اور باتوں کے کہنے کا جو سلیقہ ہے وہ کہیں سفرنامہ کی چاشنی، کہیں رپورتاژ کا ذائقہ تو کہیں Irony کی لطافت کا اسیر کرتا ہے۔'' (ص:۱۱۴)

ڈاکٹر امام اعظم کے مونوگراف کا آخری باب ''مظہر امام: افسانہ نگار'' ہے۔ گرچہ یہ باب بے حد مختصر ہے لیکن اس کے مطالعہ سے افسانہ نگاری کے فن سے مظہر امام کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ مظہر امام نے اوائل عمری میں ہی افسانہ لکھنا شروع

کیا تھا لیکن انھوں نے اپنے تمام افسانوں کو ضائع کر دیا جس کا انکشاف کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم نے لکھا ہے:

''مظہر امام نے تیرہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ پہلے افسانے لکھے اور تقریباً ۳۵-۳۰ افسانے لکھے مگر بقول مظہر امام سب کے سب ضایع کر دیے۔ صرف دو افسانوں کو انھوں نے قابلِ اعتنا سمجھا۔ ''آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟'' ماہنامہ ''مضراب'' کراچی کے دسمبر ۱۹۴۸ء کے شمارے میں ایم. امام کے نام سے شائع ہوا جس کے مدیر ش. مظفر پوری تھے...... ان کا ایک اور افسانہ ''وصال کے بعد'' انجمن ترقی اردو بہار کی جانب سے ۱۹۵۰ء میں منعقدہ ایک کل ریاستی انعامی مقابلہ میں شامل ہوا اور اوّل انعام کا مستحق قرار پایا لیکن مسودہ کہیں گم ہو گیا...... راقم الحروف کی تلاش بسیار کے بعد جولائی ۲۰۱۸ء میں یہ افسانہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے دستیاب ہوا۔'' (ص: ۱۱۵)

مونوگراف میں مظہر امام کی جن دیگر تصانیف کا ذکر ملتا ہے وہ ہیں ''آزاد غزل کا منظر نامہ'' (تحقیقی اشاریہ) ''جمیل مظہری'' (مونوگراف)، ''نگارشات آرزو جمیلی'' (ترتیب و مقدمہ) اور ''تثلیثِ حیات: پرویز شاہدی'' (شعری مجموعہ ترتیب)۔

مختصر یہ کہ مظہر امام کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر محیط ڈاکٹر امام اعظم کا تحریر کردہ یہ مونوگراف بلاشبہ مظہر امام جیسے اہم ترین شاعر و ادیب کے مقام و مرتبہ کو متعین کرتا ہے۔ مونوگراف کے مطالعہ سے مظہر امام کی شخصیت اور اردو زبان و ادب کے لیے ان کی خدمات سے قاری کما حقہٗ واقف ہوتا ہے۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی نے ہندوستانی ادب کے معمار سیریز میں بہار کے عظیم سپوت مظہر امام کو شامل کرنے کا جو منصفانہ قدم اٹھایا ہے اس کے لیے جہاں ساہتیہ اکادمی اہالیان بہار کی جانب سے شکریہ کا مستحق ہے وہیں مظہر امام جیسی بلند قامت شخصیت پر مونوگراف تحریر کرنے کا شرف حاصل ہونے پر ڈاکٹر امام اعظم بھی ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

آشیانہ کالونی، باغ ملی، حاجی پور (ویشالی) بہار، رابطہ: 9430649112

۱۷ مارچ ۲۰۱۷ کو قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی ''عالمی اردو کانفرنس'' میں شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر امام اعظم

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

شخصیت شناسی کے نئے ابواب اور ''تمثیل نو'' دربھنگہ

ادبی رسائل و جرائد کے مقاصد میں شعر و ادب کی ترویج، تخلیق کاروں کے تعین قدر کی راہ ہمواری اور شخصیت شناسی بنیادی اجزا قرار پاتے ہیں تو بلا مبالغہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ کا تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء) اس کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ مشمولات کی نیرنگی اسے وقیع و منفرد بنانے میں معاون ہے تو پیش کش کا نرالا انداز اسے دل پذیر بناتا ہے۔ منظر شہاب پر گوشہ اور مظہر امام، سید منظر امام اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے تعلق سے خصوصی پیش کش نے اس شمارے کو شخصیت شناسی کے حوالے سے ایک یادگار مجلّہ بنا دیا ہے۔ منظر شہاب اور ان کے فکر و فن پر سولہ مضامین کے ساتھ ایک مکتوب انہیں جاننے اور سمجھنے کے لئے بہت نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ مظہر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی کے لئے تین تین اور سید منظر امام پر چار مضامین کے مطالعے کا سفر افکار تازہ کی ہم نوائی اور معلومات کی آسودگی کا حسن رکھتے ہیں۔

منظر شہاب کی غزلیں کئی خصوصیتوں سے آراستہ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا وصف غنائیت ہے۔ نوشاد نوری کا مشمولہ مکتوب بنام منظر شہاب اس کو اور بھی روشن کرتا ہے۔ کانفرنس کی روداد میں ان کی شاعری کو فوکس کرتے ہوئے مراسلہ نگار لکھتے ہیں کہ:

''مختلف زبانوں میں غنائیہ پروگرام پیش ہوئے تھے لیکن پانچ ہزار کے سرکاری افتتاحی اجتماع میں اس غزل نے دھوم مچا دی۔ بے خودی کا وہ عالم طاری ہوا کہ مجمع نے گانا شروع کر دیا۔ ایک حسین اور جمیل اور خوش آواز گلوکارہ نے سات ایشیائی ملکوں کے مسائل زدہ لیڈروں کی طرف اشارہ کر کے ''پیراہن جاں چاک رہے'' کی تان لی تو ایک عجیب سماں بندھ گیا۔ سب سے زیادہ لطف اس وقت آیا جب ''جتنے بھی دریچے ہیں'' کی تان بھرتے ہوئے گلوکارہ نے پاکستانی وفد اور ''دل سنگ ملامت'' کی تان بھرتے ہوئے ہندوستانی وفد کی جانب بازو پھیلائے۔ مختلف زبانوں کے نصف درجن گانوں میں اس کی ہنوز تعریف ہو رہی ہے۔ یہ اب گانا تھا جس نے ٹائم شیڈیول توڑ دیا اور ہر شعر پر بار بار فرمائش ہوئی۔ مہمانوں کیلئے آخری تقریب جہاز کا دریائی سفر تھا جسے کانفرنس کی زبان میں Retreat کہتے ہیں۔ اگر چہ یہ اجتماع ڈھائی سو سے زیادہ نہ تھا مگر اس میں تمام ملکوں کے مندوبین، وزراء، ارکان پارلیامنٹ، اعلیٰ سرکاری افسران اور چیدہ چیدہ شہری شامل تھے۔ آرٹسٹوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ یہاں بھی غنائی پروگرام اسی طرح ترتیب دئے گئے تھے اور کئی زبانوں کی چیزیں پیش کرنی تھیں مگر تمہاری غزل نے بھوٹان اور مالدیپ سے ان کا حق چھین لیا اور سری لنکا کو نامکمل پروگرام کر کے ہٹ جانا پڑا۔''

(ص: ۷۶)

نوشاد نوری نے سارک کانفرنس میں منظر شہاب کی غزلوں کی دھوم کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نہ صرف معنی آفرینی اور غنائیت سے آراستہ ہے بلکہ فوری طور پر اپیل کرنے اور پسند کئے جانے والی آواز ہے۔ انور عظیم یادوں کا تانا بانا جوڑتے ہوئے موصوف کی نظریاتی وابستگی اور فکری آزادی پر بے باکی سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

''یاد کروان لحات کی گرمیٔ احساس کو اور دیکھو تمہارے نوجوانی کے جذبات میں کتنی حسن کاری اور تخلیقی سپردگی تھی جس کے بغیر کوئی شاعری نہیں ہوسکتی، یہ میرا خیال ہے۔ یہ کوئی عالمانہ مسلمہ نہیں، تمہیں تمہارا نظریاتی شعور ہاتھ پکڑ کر اٹھائے گا اور تم کو احساس ہوگا کہ اگر نظریہ پرستی تخلیق کار کو اس کے قدرتی رومان سے الگ کردے تو یہ بہت بڑا ظلم ہے اور ایسا ظلم صرف سنیاس اور بن باس کے عہد میں روا ہوسکتا ہے۔''

(ص:۷۸)

مظہر امام نے ایک تفصیلی مضمون ''منظر شہاب: پیراہن جاں اور تیز ہوا'' سپرد قلم کیا اور ان کی تخلیقات کے انہاج و افکار پر روشنی ڈالتے ہوئے ''بالواسطہ اظہار سے مملو شاعری قرار دیا ہے جس میں انفرادی احساس اور تجربہ موجود'' ہے۔ اشتراکی تحریک سے وابستگی کے باوجود نعرے بازی سے پرہیز، رجائیت میں بھی امید و یاس، فسادات کی خونچکاں شاعری، انسانیت کی سربلندی اور سماجی پس منظر اور پیش منظر میں حساس دل کی کیفیت کا بیان کے ذکر سے مزین اس تحریر سے جو خاکہ ابھرتا ہے اس میں منظر شہاب اور ان کی شاعری کی قدر و منزلت کا پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ ۲۰۰۴ء میں مظہر امام نے جو لکھا وہ آج بھی کتنا حقیقت ہے ملاحظہ کیجئے:

''منظر شہاب تہذیب فن کے شاعر ہیں۔ یہ بات زور دے کر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آج کی شاعری میں خوش کلامی کا عنصر عنقا ہو چکا ہے اور زبان و بیان کے حسن کو روایتی ذہن کی علامت سمجھ کر بہ نظر تحقیر دیکھا جا رہا ہے۔ منظر شہاب زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لئے بھی شیریں بیانی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے حساس فنکار ہیں جس کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا رہا ہے۔ اپنے کلام میں اثر پیدا کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں: معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود۔ خون جگر ہی ہر فن کو ثبات دیتا ہے۔ اسی خون جگر نے منظر شہاب کے کلام میں بھی لطف و اثر پیدا کیا ہے۔ یہ خوش کلامی، یہ اثر آفرینی، تیز ہوا میں پیراہن جاں چاک رکھنے کی ادا منظر شہاب کی شاعری کو درجۂ اعتبار بخشتی ہے۔ ایسے دور میں جب بہت سے سود بخش کام کئے جا سکتے ہیں، شاعری سے رشتہ استوار رکھنا واقعی بڑی جرأت چاہتا ہے۔ آج کے زمانے میں شعر کہنا، کفر اور کافری سے کم نہیں۔'' (ص:۸۴)

رفعت سروش نے منظر شہاب کی غزلوں کا مجموعہ ''مجروح پرندے کی صدا'' کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے یہاں موجود 'اسلامی تاریخ و روایات کے خوبصورت حوالوں' کا ذکر کیا ہے اور ان کی منظر نگاری کا بطور خاص حوالہ رکھا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ:

''منظر شہاب کی ایک خصوصیت غزل میں منظر نگاری کی ہے جو نظموں کا لطف دیتی ہیں۔ ایسے مناظر

غزلوں میں بہت کم ملتے ہیں۔شہاب مناظر قدرت سے ایسے خیالات کی ترسیل اور تنقید کا کام لینے کا
فن جانتے ہیں۔'دیوار زنداں سے ادھر' ردیف والی غزل تو (شاید) ان کے ایام اسیری کی غزل ہے۔
خوبصورت مناظر کے ساتھ ان کے دل کی کسک اور زخموں کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے۔'' (ص:۸۷)

منظر شہاب کی نظم نگاری کے حوالے سے مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ''منظر شہاب کی نظموں میں الفاظ کا پیکر''
اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں عمیق مطالعے اور شعری وصف کی تلاش کا ہنر مندانہ اظہار موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''منظر شہاب کی نظموں میں امکانی بیداری اور شعوری جدوجہد سے آگاہی ملتی ہے۔ان کے تصورات
کی وسعت اور احساس کی بے پناہ شدت میں ان کا فن مضمر ہے۔'' (ص:۹۰)

انہوں نے نظم 'ہدیۂ خلوص' کے اشعار پیش کئے ہیں اور تخلیق کی سربلندی سے سروکار رکھا ہے۔

''منظر شہاب کے مجروح پرندے کی صدا'' اقبال انصاری کا ایک تبصراتی مضمون ہے۔مضمون نگار کے ''خیال
میں منظر شہاب کی شاعری بے لاگ شاعری ہے، اس لئے بڑی بے دردی سے متوجہ اور بڑی بے رحمی سے متاثر کرتی
ہے۔'' پروفیسر سید احمد شمیم کا مضمون بعنوان ''منظر شہاب: جینے کی ادا کا شاعر'' شعری مجموعہ ''پیراہن جاں'' کے تفصیلی
مطالعے پر محیط ہے۔مضمون نگار نے ان کی نظموں کے موضوعات اور بنت سے گفتگو کرتے ہوئے تخلیقی ہنرمندی
سے تعبیر کیا ہے۔ان کی غزلوں میں الفاظ کی معنوی تہداری کا بطور خاص ذکر میں وہ مانتے ہیں کہ:

''منظر شہاب لفظوں کے رمز شناس ہیں۔ان کے ہاں خنجر، لہو، رہ گزار، رات، راگنی، شجر، جنگل، آواز
کی تصویر، دھوپ، خواب، پہاڑ، آگ، بگولا وغیرہ کبھی زندہ پیکر، کبھی بامعنی نشانات بن کر ابھرتے ہیں۔
ان پیکروں کو جھارکھنڈ کے چاروں طرف دوڑتی ہوئی سرمئی پہاڑیوں، ہرے بھرے جنگلوں، بل کھاتی،
رقص کرتی گنگناتی ندیوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو خوبصورتی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے اور
پھر یہ کہ آہستہ آہستہ جو آگ سلگ رہی ہے ان کی معنویت بھی دعوت فکر دیتی ہے۔'' (ص:۹۹)

سید منظر امام نے ''ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی منظر شہاب شناسی'' میں محقق اور ممدوح دونوں کی کاوشوں کا تجزیہ
کیا ہے جس میں حقیقت پسندانہ اظہار خیال کی خوبی موجود ہے۔ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب ''منظر شہاب:
حیات اور فن'' کا انہوں نے سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے اور اسے اور بہتر بنانے کے مشورے دیے ہیں۔ان کی رائے میں:

''منظر شہاب کی شاعری جمالیت اور مقصدیت کے خوبصورت امتزاج سے نمو پذیر ہوئی۔وہ الفاظ
کے مزاج داں ہیں۔ان کی قدر و قیمت کو پہچانتے ہیں، ان میں پوشیدہ ساحل کو محسوس کرتے ہیں اور
انہیں انتہائی مشاقی اور خوش سلیقگی سے استعمال کرتے ہیں۔ان کے یہاں الفاظ محض لفظوں کی
ترتیب کے قواعدی اصولوں کے پابند نہیں ہوتے۔وہ اپنی دنیا رکھتے ہیں اور جذبات کی کیمیا سے گذر
کر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ان کے یہاں نادر تشبیہات اور تازہ
کار استعاروں کا عجیب نظام ملتا ہے۔رمز و کنایہ کا یہ استعمال حد درجہ uncommon ہے جس کی
بہت سی مثالیں ''پیراہن جاں'' میں جگ مگ نظر آتی ہیں۔'' (ص:۱۰۱)

ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی نے منظر شہاب کی شاعری میں روح عصر کی پاسداری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''منظر شہاب کی شاعری میں زندگی کے نو بہ نو موضوعات کی جلوہ گری ملتی ہے۔ واقعات عالم اور گرد و پیش میں رونما ہونے والے سانحات کی تصویر کشی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ انہوں نے کئی سماجی اور سیاسی انقلابات کا مشاہدہ کیا ہے۔ شہاب نے ان سے جو اثرات قبول کئے ہیں ان کو ایماندارانہ طور پر اپنی شاعری کے ذریعے دلنشیں انداز میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ پراثر اور سحر انگیز ہے جس کا احساس خود انہیں بھی ہے۔ کہتے ہیں: ترے اشعار میں اعجاز تاثر ہے شہاب رگ افکار کو تو خون جگر دیتا ہے۔''

(مضمون ''عصری آگہی کا شاعر: منظر شہاب'' ص: ۱۰۳)

شمس فریدی نے ان کے مضامین کا مجموعہ ''اور پھر بیاں اپنا'' کا جائزہ لیا ہے اور ان کے ''اظہار بیان اور طرز نگارش میں بے پناہ دلکشی اور جاذبیت'' کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نثر کو ''جادو بیانی'' سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے ''اردو ڈراما کے فروغ میں منظر شہاب کا کردار'' کے عنوان سے اپنی تحریر میں ڈراما اور اسٹیج سے ان کی گہری دلچسپی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون منظر شہاب کو ایک نئے زاویے سے جاننے میں معاون ہے۔ ''منظر شہاب کی نثر نگاری'' کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے احمد بدر نے ان کی نثری تحریروں میں اپنا پن، متن سے قاری کی وابستگی، لہجے میں پوشیدہ اصرار کا پہلو اور غیر محسوس طریقے سے اسٹیج اور تھیٹر کی تکنیکوں کا استعمال جیسی خوبیوں کا احاطہ کیا ہے۔ ایم نصر اللہ نصر نے ایک مختصر مضمون کے ذریعے ان کی ادبی خدمات کو خراج پیش کیا ہے۔ ''جلتے شبدوں کی آنچ اور کومل لہجے کا شاعر: منظر شہاب'' میں ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم نے موصوف کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''منظر شہاب کی تخلیقات زندگی، کائنات کے حسن، انسانی احساس و جذبات اور سماج کے مسائل سے براہ راست سروکار رکھتی ہیں۔ شعر کا لہجہ شعور کے سمندر کا استعارہ ہے۔ بیشتر غزلیں اور نظمیں نغمگی اور شعریت سے لبریز ہیں اور مقصدی ہونے کے باوصف اصول جمالیات اور تہذیب عشق و تزئین حسن و جمال سے آراستہ ہیں۔ شدت جذبات کا شعری اظہار فن کے تمام تر رچاؤ اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے جو انسانی احساس کی علامت ہیں سماجی و سیاسی استحصال کے خلاف احتجاج و انحراف کو بیان کرتے ہیں۔'' (ص: ۱۲۵)

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی (مضمون: آسمان شاعری کا درخشندہ 'شہاب') نے منظر شہاب کی شاعری سے گفتگو میں ان کے چیدہ اشعار کوٹ کئے ہیں اور ان کی تخلیقی زبان کو 'بجا طور پر ہندوستانی زبان' قرار دیا ہے۔ بلاشبہ منظر شہاب کے ذخیرۂ الفاظ میں کئی زبانوں کا حسن موجود ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کی تحریر میں منظر شہاب کی تخلیقی جولانی کا اجالا ہے جس میں نظم و غزل دونوں کی معنویت سے سروکار موجود ہے۔

منظر شہاب کے متذکرہ گوشے میں ڈاکٹر امام اعظم اعزازی مدیر رسالہ ہذا کی جامع تحریر شامل ہے۔اس میں عنوان کے مطابق شخصیت اور فنکاری کے نمایاں خطوط پوری طرح واضح ہیں۔اگر یہ تحریر شامل اشاعت نہ ہوتی تو یہ گوشہ تشنہ رہ جاتا۔

مظہر امام کے لئے مختص خصوصی پیش کش میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، اختر جاوید اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کی تحریروں میں اس نمائندہ شاعر کی بازیافت کا منفرد انداز ملتا ہے۔پروفیسر ہرگانوی نے ''مظہر امام کی شاعری سے چربہ اور سرقہ'' کو موضوع بنایا ہے اور مثالوں سے اپنی گفتگو کو اعتبار بخشا ہے۔ان کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ ''مظہر امام نے اردو شاعری کو نیا لب ولہجہ، نیا آہنگ اور نئی کیفیت اور فضا سے روشناس کرایا ہے۔معمولی سے معمولی بات کو غیر معمولی اور محدود کو لامحدود بنا دینے کا فن انہیں خوب معلوم ہے۔ان کے الفاظ سے امکانات کی وسعتوں اور گہرائیوں کی بشارتیں ملتی ہیں اور آفاقی سچائیوں سے مملو غور وفکر اور خیال کے ارتفاع کی برگزیدگی کا سورج روشن ہوتا ہے۔!(ص:۱۴۸) اختر جاوید کا منظوم اظہاریہ اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کا مختصر مضمون ان کو یاد کرنے کی سبیل ہیں۔ اسی طرح سید منظر امام کے تعلق سے سید احمد شمیم، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، نجم عثمانی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد کے مضامین میں ان کی ذات سے محبت، چاہت اور تخلیق سے اپنائیت کا جذبہ روشن ہے۔ان تحریروں کے مطالعے سے یادوں کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے جو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔نصر اللہ نصر (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی: ادب کا کوزہ گر)، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ (پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی چار کتابیں) اور ڈاکٹر امام اعظم (مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں جاگتے احساس کی چبھن) کے مضامین پروفیسر ہرگانوی کی ادبی خدمات کے مختلف گوشوں کو سمیٹنے کی کوشش دراصل ان کے اقرار واعتراف کی تمثال ہے۔

''تمثیل نو'' دربھنگہ کا یہ شمارہ مذکورہ اہم ادبی شخصیات کے حوالے سے معلومات کا خزینہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔اس رسالے میں شعرا وادبا پر گوشے شامل ہوتے رہے ہیں، تحریکات پر بحث ومباحثے کا سلسلہ رہا ہے اور شعر ونثر کے مختلف اصناف کے تخلیق کاروں کو جگہ دی جاتی ہے۔۶۹ویں شمارے کی اشاعت کے ساتھ اس کی پذیرائی اور مقبولیت کا گراف بھی وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔مجھے یقین ہے جب بھی کوئی ادبی مورخ رسائل وجرائد میں شخصیت شناسی کی تلاش وجستجو دیانت داری سے کرے گا تو اس رسالے کی خدمات کا اعتراف ناگزیر ہوگا۔

☆☆☆

Mohalla- Faizullah Khan, Hamid Colony, Darbhanga-846004(Bihar)
Mob.: 9430898766, e-mail: mojeerazad@rediffmail.com

ممتاز انور غزالی

بہار میں اردو تحقیق: سمت و رفتار

تحقیق کیا ہے؟ لغات میں تحقیق کے معنی کھوج، تفتیش، دریافت اور چھان بین دیئے گئے ہیں۔ تحقیق کا عمل بنی نوع انسان کے بچپن تا حال نیز ایک فرد کے بچپن سے حین حیات جاری رہتا ہے۔

قدیم قبائلی انسان نے مظاہر فطرت مثلاً سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، رات ہونا، آندھی بارش، سیلاب، زلزلہ وغیرہ کی اپنی سمجھ کے مطابق تاویلیں لیں۔ زلزلے کے متعلق کہا گیا کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر رکھی ہے۔ وہ سینگ بدلتی ہے تو زلزلہ آتا ہے۔

بچے بھی فطرت اور صنعت انسان کو سمجھنے کے لئے بڑوں سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں۔ اور بچے ہی کیوں ہم بڑے بھی زندگی میں طرح طرح کی چھان بین کرتے ہیں۔ مثلاً سامنے پڑوسی کے گھر یا باہر گاڑی آکر رکے تو ہم اپنی کھڑکی سے تانک جھانک کرتے ہیں کہ اس کے یہاں کون آیا ہے یا شوروغل سن کر جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہاں کون لڑ رہا ہے۔ ڈرائی کلین والا دھوبی کپڑوں کے دھبوں کو دیکھ کر دریافت کرتا ہے کہ یہ داغ دھبہ کیسا ہے۔ سبزی سے، چائے سے یا تیل وغیرہ سے اور اس کی تشخیص کرنے کے بعد اس کا ازالہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے گھر کے باغیچہ کے پودوں کے پتوں کو سڑا ہوا یا کرم خوردہ دیکھ کر قیاس کرتے ہیں کہ اس کا کیا سبب ہے اور اس کے علاج کے لئے کون سی دوا چھڑکی جائے۔ اسی طرح حکیموں، ڈاکٹروں کے کے علاج کے عمل کی تحقیق بھی ہے وہ دریافت کرتے ہیں مریض کو کن اسباب کی بنا پر مرض لاحق ہوا ہے۔ تشخیص، تحقیق نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک اہم غیر علمی تحقیق جرائم سے متعلق ہوتی ہے۔ پولیس کسی جرم کے ذمہ دار شخص کی دریافت اور اس کے لائحہ عمل کے انکشاف کے موقعہ واردات پر جاکر جو چھان بین کرتی ہے۔ مختلف گواہوں کے بیانات لیتی ہے۔ تھانے میں لاکر ملزموں کو زدوکوب کر کے انتھک استفسار کرتی ہے وہ بھی تحقیق ہے جسے تفتیش کا نام دیتے ہیں۔ اگر دریافت کے اس طریقے سے یعنی سائنس کا پریوگ شالہ کی مدد لی جائے تو یہ تفتیش ایک سائنسی تحقیق بن جاتی ہے۔ گویا تشخیص ہو کی تفتیش یہ دونوں بھی ایک قسم کی تحقیق ہیں۔

لیکن ہمیں یہاں ہر قسم کی چھان بین سے سروکار نہیں۔ ہم تحقیق کو بطور ایک علمی اصطلاح کے استعمال کر رہے ہیں۔ ہمارا سروکار ادبی تحقیق سے ہے۔ مولانا کلب عابد، پروفیسر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی نے اپنی کتاب ''عمادۃ التحقیق'' میں تحقیق کے لفظ کی یہ تشریح کی ہے۔

> ''تحقیق عربی لفظ ہے۔ یہ باب تفصیل کا مصدر ہے۔ اس کے اصلی حروف ح۔ ق۔ ق ہیں۔ اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا۔ یا حق کی طرف پھیرنا۔''

حق کے معنی سچ ہیں۔ مادہ حق سے دوسرا لفظ حقیقت بنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تحقیق سچ یا حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق تحقیق کے لغوی معنی کسی شئے کی حقیقت کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے

طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

قاضی عبدالودود کہتے ہیں۔ تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ اس تعریف کے الفاظ کافی نہیں۔ اگر حقیقت افشاء ہے تو اس کی اصل شکل کو دیکھنا تحقیق نہیں اگر میں میز، کرسی پر بیٹھا لکھ رہا ہوں اور گردن گھما کر ایک طرف پڑی کرسی کو دیکھتا ہوں تو یہ کوشش بھی ہے اور کرسی اپنی اصل شکل میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ تحقیق نہیں کہنا چاہئے جب کسی امر کی اصلی شکل پوشیدہ یا مبہم ہو تو اس کی اصل شکل کو دریافت کرنے کا عمل تحقیق ہے جیسا کہ مولانا کلب عابد نے واضح کیا۔ تحقیق کا مادہ ح۔ق۔ق ہے۔ عربی میں اس کا مصدر اور اردو میں اس کا حاصل مصدر تحقیق ہے۔ اسے حق کی دریافت یا اثبات کہہ سکتے ہیں۔

انگریزی لفظ ریسرچ کو لیجئے۔ اس کے ایک معنی توجہ سے تلاش کرنا ہے۔ دوسرے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہے۔ روبرٹ راس کے مطابق یہ فرنچ لفظ Recher-cher سے نکلتا ہے۔ جس کے معنی ہیں پیچھے جا کر تلاش کرنا۔ To search back

شیریڈن بیکر نے لکھا ہے کہ ریسرچ کے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہے۔ یعنی جہاں دوسروں نے تلاش کی وہیں پھر تلاش کر کے ایک نئی کھوج نکالنا جو دوسرے نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔

ہندی میں اصول تحقیق کی کتابیں بڑی تعداد میں ہیں۔ ان میں تحقیق کے مفہوم اور ماہیت کے بارے میں بھی بحث ہے۔ ہندی میں اس کے لئے کئی اصطلاحیں ہیں۔ نوسندھان اس کا مادہ دھا ہے جس کے معنی برقرار رکھنا۔ سندھان کے معنی لکچھش Target یعنی مقصود برقرار رکھنا یا نشانہ لگانا۔ انو کے معنی ہیں پیچھے یعنی کسی مقصود یا نشانے کا تعاقب کرنا انوسندھان کے معنی ٹوٹے، بکھرے دھاگوں کو جوڑنا بھی ہے۔ شدھ اس کا مادہ۔ شدھ یعنی خالص ہے۔ شدھ کے معنی میل کچیل دور کر کے خالص کرنا۔ صاف کرنا جیسے کسی دھات مثلاً سونے چاندی کو صاف کیا جائے۔

اس طرح اردو اصطلاح تحقیق کے معنی سچ یا حقیقت کی دریافت ہے۔ یعنی انگریزی اصطلاح ریسرچ کے معنی ہیں۔ کھوج اور دوبارہ کھوج ہندی اصطلاح۔ انوسندھان کے معنی کسی مقررہ نشانے کو حاصل کرنے کے لئے اس کا تعاقب کرنا اور اصطلاح میں سچ کے ارفع معنی پوشیدہ ہیں۔ انگریزی میں محض کھوج ہے۔ تلاش کسی عام یا غیر اہم چیز کی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً زمین پر کوئی چھوٹا سکہ گر جائے تو اسے ڈھونڈنا یا کسی مکان کا تلاش کرنا۔ ہندی اصطلاح انوسندھان سب سے زیادہ ڈھیل ہے۔ کسی مقصود کا تعاقب کرنا۔ یہ مقصود خاصہ پست بھی ہو سکتا ہے مثلاً کسی ایم۔ ایل۔ اے۔ کا وزیر بننے کی کوشش، ہندی اصطلاح شدھ منزہ ہے لیکن یہ انوسندھان کے مقابلے میں مات کھا رہی ہے۔ اس طرح اردو اصطلاح تحقیق یا ادبی تحقیق سب سے بلند سطح پر فائز ہے۔

بہار ہر دور میں اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ ادبی خدمات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بلکہ اب تو اس میں بہت حد تک تیزی آ گئی ہے۔ اردو زبان پڑھنے لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی یہ ملک کی دوسری ریاستوں سے آگے ہے۔ جہاں تک بہار میں اردو تحقیق سمت و رفتار کا سوال ہے تو اس اعتبار سے بھی یہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ چاہے وہ اردو صحافت ہو، کتابت ہو، انٹرنیٹ کی سہولیات حاصل ہو جانے کے بعد تو اس

میدان میں ایک انقلاب آ گیا ہے۔اور بہار کے کئی اہم اور باصلاحیت اپنی محنت ،لگن اور ایمانداری سے صحافت کی خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ بہار سے نکلنے والے اردو اخباروں کے پاس بہت سارے اپنے کالم نگار ہیں۔ اب یہاں سے نکلنے والے اخبارات کمزور نہیں ہے۔

کیفی اعظمی: بہار میں ایسے شعراء بھی پیدا ہوئے جنہوں نے فلمی اور ثقافتی خدمات انجام دیئے اور انشاء نگاری، ڈراما اور شعرو شاعری کے میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔سنجیدہ شاعری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے کئی فلمی نغمے لکھے جو کافی مشہور ہوئے۔ (نو بھارت ٹائمز دہلی، ۱۵ر نومبر ۱۹۹۲ء)

سید حسنین عظیم آبادی ۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔انہیں بہار کے پہلے ریسرچ اسکالر ہونے کا شرف حاصل ہے۔مگدھ یونیورسٹی، گیا کے صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں۔آپ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اسلام آباد (پاکستان) میں وفات پا گئے۔آپ نے بہت سے اصناف ادب میں طبع آزمائی کی لیکن اردو انشائیہ نگاری ان کا خاص میدان رہا۔وہ بہار میں انشائیہ نگاری کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں انہوں نے نہ صرف انشائیے لکھے بلکہ صنف انشائیہ پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔''صنف انشائیہ اور انشائیے'' ان کی ایک ایسی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے، جس کے کئے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(تنقید کی زبان، پروفیسر کمال الدین، مطبوعہ ۲۰۰۰ء، ص:۷۹)

انشائیہ نگاری کے میدان میں احمد جمال پاشا ایک ممتاز انشائیہ نگار تھے۔احمد جمال پاشا انشائیہ کے پیرائے میں جب اپنی بات قارئین کے سامنے رکھتے ہیں تو وہ ہنستے مسکراتے اپنی اصلاح کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کچھ انشائیہ نگار اس طرح مزاح پیش کرتے ہیں کہ وہ مسخرہ بن جاتے ہیں اور ان کی نگارشات کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ احمد جمال پاشا ہنسی ہنسی میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو نشانے پر لگ جاتے ہیں۔

(ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی جنوری ۲۰۰۷ء، ص:۲۲)

سید محسن ملک و بیرون نفسیات کے مضمون میں بیسوں ریسرچ مقالے انگریزی میں شائع کروائے، ریڈیائی تقریروں میں نفسیاتی مقالے نشر کرواتے رہے۔اکثر رسالوں میں ان کے نفسیاتی مقالے اور غزلیں شائع ہو چکے ہیں۔یوں تو انہوں نے زیادہ تر نفسیاتی افسانے ہی لکھے۔انہیں افسانوں نے شہرت اور مقبولیت عطا کی لیکن انہوں نے کچھ افسانے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر بھی لکھے۔ جو ان کے افسانوی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔

جدیدیت کی وفا نے معیار پست کر دیا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ نجات ملتی جا رہی ہے۔ادھر دس سالوں کے اندر ایسا کوئی شاہکار افسانہ نہیں شائع ہوا جسے بقائے دوام حاصل ہونے کی امید ہو۔

(سوال نامہ بنام قیام نیر مورخہ ۲۳ر اگست ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر وہاب اشرفی: اردو زبان و ادب کا جب بھی ذکر ہوگا تو ڈاکٹر وہاب اشرفی کا نام بڑے ہی ادب و احترام سے لیا جائے گا۔انہوں نے مختلف نوعیت کی بیسویں کتابیں لکھیں۔تاریخ ادبیات عالم سات جلدوں میں، تاریخ ادب اردو تین جلدوں میں لکھ کر انہوں نے بڑا کام انجام دیا۔مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب اور مابعد جدیدیت مضمرات و

ممکنات دونوں کتابیں اردو میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے علاوہ تنقیدی مضامین اور اردو افسانوی ادب پر کئی کتابیں منظرعام پرآچکی ہیں۔

جس تیز رفتاری سے بہارم یں اردو افسانہ ترقی کر رہا ہے اس لحاظ سے بہار کے افسانوی ادب پر زیادہ کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ڈاکٹر وہاب اشرفی اس لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ (ازتحقیق وتنقید،ڈاکٹر قیام نیر)

ڈاکٹر منصور عمر:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہی بات ڈاکٹر منصور عمر کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔اس کا نام منصور عالم تھا۔ابتدا میں منصور بندھولوی کے نام سے لکھتے تھے بعد میں انہوں نے اپنا قلمی نام منصور عمر اختیار کرلیا اور اسی نام سے اخیر وقت تک لکھتے رہے۔ خاص وعام میں بھی اسی نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

ان کے والد کا نام محمد عمر تھا۔آپ کی پیدائش ۱۷ر فروری ۱۹۵۵ءکو دیورا بندھولی جالے ضلع دربھنگہ میں ہوئی، آپ ایک اچھے استاد، خلیق اور ملنسار تھے۔آپ ہمیشہ نئے قلم کاروں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ڈاکٹر ارشد جمیل فرماتے ہیں:

”ڈاکٹر منصور عمر بڑے سلجھے ہوئے ذہن اور محنت کرنے والے آدمی تھے۔قلم برداشتہ مضامین لکھتے تھے۔کردار کے کھڑے آدمی تھے ان میں حق گوئی اور بے باکی تھی۔“

(بحوالہ زبان وادب، جون ۲۰ر جون ۱۹۱۴ء)

ڈاکٹر محمود عالم انصاری کی پیدائش ۲۱ر دسمبر ۱۹۴۹ءکو ان کے نانیہال موضع ناری میں ہوئی۔یہ موضع کہنی تھانہ گھنشیام پور ضلع دربھنگہ کے رہنے والے ہیں۔آپ نے مکمل بود و باش دربھنگہ میں اختیار کرلیا۔ان کی لکھی ہوئی کئی کتابیں نثر ونظم میں موجود ہیں۔مثلاً گنگا جمنا، آج کا مسلمان نظموں کا مجموعہ اور حضرت عمرؓ ارکان ثلاثہ سے طلاق ثلاثہ تک۔نثر میں ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

اس طرح پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، قیام الدین نیر، ڈاکٹر رئیس انور، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد وغیرہ بہار کے بڑے ادیب وفنکار، محقق دانشور بہار کی اردو تحقیق سمت و رفتار کو بڑی تیزی سے آگے کی طرف لے جارہے ہیں۔

☆☆☆

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ایل. این. متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

ڈاکٹر احمد علی جوہر

عظیم مجاہد آزادی رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ وہ غیر منقسم ہندوستان کے ان سیاسی رہنماؤں میں سے ایک تھے جن کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان کا شمار مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی اعظم حضرت علامہ کفایت اللہ، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، نقیب انقلاب سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ کے ممتاز رفیقوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت جدوجہد آزادی کی نمایاں ترین شخصیت تھی جن سے جدوجہد آزادی کی نمایاں اور شاندار روایات وابستہ ہیں۔ ملک میں جب سیاسی بیداری کی روشنی پھیلی، مختلف فرقوں و جماعتوں نے برطانوی سامراج کے خلاف اعلیٰ پیمانے پر منصوبے بنائے اور منظم طریقے سے تحریکیں چلائیں، اس وقت مجاہدین آزادی کی قیادت جن بہادر اور جری رہنماؤں نے کی ان میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے ذکر کے بغیر تحریک آزادی کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے لدھیانہ کے مشہور علماء و مجاہدین کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ وہ بروز اتوار 11 صفر 1310 ہجری مطابق 3 جولائی 1892ء کو مفتی اعظم پنجاب حضرت مولانا محمد ذکریا صاحب کے گھر پیدا ہوئے جو اپنے وقت کے صاحب نسبت بزرگ اور بڑے پایہ کے عالم دین تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کے گھر کا ماحول علمی، مذہبی، اخلاقی اور انقلابی تھا۔ ان کی علمی اور اخلاقی تربیت بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں بہت جلد ان کی شخصیت اعلیٰ کردار کی حامل ہوگئی۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ بچپن ہی میں انھیں دینی و عصری علوم پر دسترس حاصل ہوگیا۔ وہ صاف دماغ اور روشن فکر کے مالک تھے اور بااصول اور وضع دار شخصیت رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت و ذکاوت اور قوت فیصلہ کی پختگی ضرب المثل تھی۔ الجھے ہوئے مسائل و معاملات کو سلجھانے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ نازک اور مشکل وقت میں ان کی دیدہ وری کی عجیب شان ہوتی تھی۔ فکری رہنمائی میں ان کا جواب نہیں تھا۔ وہ اس دور میں غزالی کا دماغ اور ابن خلدون کی زبان لے کر پیدا ہوئے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک خط میں اس بات کا اقرار کیا کہ مولانا حبیب الرحمٰن اپنے افکار میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ وہ بہت ہی سوچ سمجھ کر کسی بات کا فیصلہ کرتے تھے۔ لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو ان کے فیصلہ کو بدل دیتی۔

مولانا حبیب الرحمٰن کے سیاسی افکار کی خوبی یہ تھی کہ اس میں تعصب اور تشدد کو کہیں دخل نہ تھا۔ ان کی فکر مستقبل کی نشان دہی کرتی تھی۔ وہ عزم صمیم کے پہاڑ اور حق و صداقت کے علم بردار تھے۔ ذہانت و فراست، سیاسی بصیرت، جرات و دلیری اور بہادری ان کی شخصیت کی ممتاز خصوصیات تھیں۔ وہ ایک نرالی شان اور آن بان کے لیڈر، رہنما اور قوم کے قائد تھے۔ وہ اپنی پرتاثیر تقریروں کی بنا پر سارے غیر منقسم ہندوستان میں مشہور ہوگئے تھے۔ وہ اعلیٰ انسانی اوصاف کے حامل اور مجسمہ اخلاق تھے۔ جو بھی ان کے پاس آتا، ان کا ہوکر رہ جاتا۔ ان کی شخصیت ایک ایسے مکتب

خیال کی حیثیت رکھتی تھی جہاں ہندو، مسلمان، سکھ شرنارتھی، کمیونسٹ، سوشلسٹ، کانگریسی، ملحد ومومن سبھی آتے اور ان کے منجھے دھلے افکار سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے ماننے والے کمیونسٹوں میں بھی تھے اور جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا میں بھی۔ وہ الجمعیۃ، نئی دنیا، پرتاپ اور ملاپ کے دفتروں میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ملک کے مسلمہ لیڈر تھے۔ علماء قومی رہنماؤں، وزیروں اور سیاست دانوں غرض ہر طبقے میں انھیں عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ان کی رائے کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، پنڈت نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور اس وقت کے دیگر تمام سیاستداں دل سے ان کی قدر کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو گوش وہوش سے سنتے تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت، فہم وفراست اور دور بینی کے سب لوگ قائل تھے۔ دراصل مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سیاست میں گہرے رسوخ کے حامل تھے۔ وہ عمومی سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات دونوں میں ذی اثر تھے اور ہر بنیادی مسئلہ میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت کا انتہائی تابناک پہلو یہ تھا کہ وہ ہندو، مسلمان اور سکھ غرض تمام طبقوں میں یکساں مقبول تھے اور ان کے دلوں میں محبوب و ہر دلعزیز شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ دراصل مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بڑے پایہ کے سیاستداں ہوتے ہوئے بھی زبردست انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے لوگ ان کی سیاسی اور مذہبی شخصیت سے بیحد متاثر ہوئے۔ ان کی باتیں مسلم اور غیر مسلم دونوں کے جذبات کو اپیل کرتی تھیں۔ ہمارے ملک میں اس پایہ کے سیاستداں کم پیدا ہوئے ہیں۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی برسوں مجلسِ احرار ہند کے صدر رہے جو ملک کی مقبول ترین جماعت تھی۔ اس جماعت میں ہر مکتب خیال کے رہنماؤں کا اجتماع، دین وسیاست کا امتزاج، عوام سے تعلق، احرار کے رہنماؤں کا جذبہ حریت و جہاد اور انگریز دشمنی، احرار کارکنوں اور رہنماؤں کی جرات وہمت ان ہی کی قیادت ورہنمائی اور کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ اس جماعت کے ذریعے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ملک کے بگڑے ہوئے حالات میں ہندوستان کی جو خدمات کیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس وقت جنگ آزادی کے میدان میں کود پڑے جب ملک پر پوری طرح انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ایسے وقت میں انہوں نے شہر کے ایک بڑے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے برطانوی حکومت کے خلاف ایسی مدلل اور جذبات انگیز تقریر فرمائی کہ ان کی تقریر سے انگریز سامراج کے خلاف عوام کے جذبات بھڑک گئے اور پورے شہر میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ 1921ء سے 1947ء تک انگریزی سامراج نے انہیں کئی بار گرفتار کیا۔ انہوں نے تیرہ سال چھ ماہ کی عمر جیلوں میں گزاری۔ جیلوں کی زندگی بھی انہوں نے عجیب نرالی شان سے بسر کی بقول جگر:

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہوگیا

تحریک آزادی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تحریک آزادی کے مصائب اور مشکلات کو دیکھ کر بڑے بڑے اولوالعزم اور اصحابِ بصیرت لیڈروں کے قدم ڈگمگا گئے، اس وقت مردِ مجاہد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ڈٹے رہے اور ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ ان کی قیادت ورہنمائی میں مجلسِ احرار کے کارکن جرات اور بہادری کے ساتھ انگریزوں کے مقابلے میں سینہ سپر اور سر بکف ہوکر آزادی کے راستے پر گامزن ہوئے۔ ملک

کی آزادی کے لئے تحریک احرار نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی قیادت میں جس قدر قربانیاں دیں، تاریخ کے اوراق ان سے روشن ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انگریز تحریک احرار کے خوف سے ملک چھوڑ گیا تو شاید غلط نہ ہوگا۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک سچے محب وطن، عظیم انقلابی قائد، وطن پرور اور ملک کے بہی خواہ تھے۔ ملک کی آزادی میں ان کا زبردست حصہ تھا۔ انہوں نے ہمیشہ جمہوری قدروں پر زور دیا۔ انہوں نے تمام ہندوستانیوں کو ہمیشہ اس کی تلقین کی کہ وہ فرقہ پرستی کو ترک کریں اور اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر گامزن ہوں اور سچے ہندو، مسلمان اور سکھ کی طرح سچے ہندوستانی بنیں۔ یہی صحیح جمہوریت ہے اور صحیح عافیت کا راستہ ہے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ملک میں اقوام آپس میں لڑنے جھگڑنے کی بجائے آزادی کی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متفق اور متحد ہو جائیں۔ ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے لوک راج قائم ہو اور اس ملک کی باگ ڈور غریب اور دیانت دار عوام کے ہاتھ میں ہوتا کہ لوگوں کو عدل و انصاف اور سکھ چین مل سکے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دوسرے مجاہدین آزادی سے منفرد و ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ قوت عمل کے قائل تھے۔ ان کے ہاں منصوبے اور پلانوں کی حیثیت دوسرے درجہ کی تھی۔ انہوں نے صرف گفتار ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے کردار اور قربانیوں سے پوری ہندوستانی قوم کو عملی زندگی کا راستہ دکھایا۔ انہوں نے ہر لحہ ملک وقوم کی خدمات میں صرف کیا:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی زندگی قربانیوں اور جاں کاہیوں کا مرقع تھی۔ انہوں نے وطن اور اس کے عوام کی خدمت کو سب سے بڑی عبادت سمجھا۔ ان کی زندگی ہندوستان کے سیاسی مفکرین کو ایک نئے اور غیر جانبدارانہ غور سے فکر کی دعوت دیتی ہے۔ وہ چالیس سال تک بھرپور سیاسی بصیرت اور عظیم منفرد شعور کے ساتھ وطنِ عزیز کی جدوجہد آزادی اور اس کے عروج وترقی کی تحریک میں جانباز سرفروش اور بےغرض حوصلہ مند کی حیثیت سے ممتاز قومی رہنماؤں کی صف میں شریک رہے۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شخصیت تحریک آزادی کی جلیل القدر شخصیت تھی جسے ہمارے عظیم سیاستدانوں، صحافیوں اور علماء وادباء نے اس طرح یاد کیا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو رقم طراز ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن کی وفات سے ملک ہی کا نقصان نہیں ہوا، بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ سب ہی کے محترم رہے۔ وہ ایک جواں مرد کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کئے جاتے رہیں گے۔''

راجندر پرشاد لکھتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا شمار ہمارے نامی سماجی اور سیاسی کارکنوں میں ہوتا ہے۔''

ملک کے مشہور اخبار نویس شری رنبیر نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شخصیت کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''جہانِ فانی سے جانا سب کو ہے، لیکن جب ملک کا خدمت گار جاتا ہے تو لاکھوں آنکھیں پرنم ہو جاتی

ہیں۔ ہزاروں دل چلا اٹھتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے ہی سجن تھے۔ انھوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے وقت اپنے سامنے رکھا تھا وطن آزاد ہونا چاہئے، ہندوستانیوں کو ایک متحد قوم بن کر آگے بڑھنا چاہئے۔ اس کے لئے وہ جیون بھر لڑتے رہے، جدوجہد کرتے رہے۔''

مہاشہ کرشن (ایڈیٹر روزنامہ پرتاپ) لکھتے ہیں:

''وہ جتنے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے اتنے ہی سچے نیشنلسٹ، ان کی قوم پرستی حقیقی تھی نمائشی نہیں۔ ہر سوال کو وہ قوم پرستی کے زاویہ سے دیکھتے تھے اور ان مسائل سے جو بظاہر فرقہ وارانہ نظر آتے تھے، ایسا خوبصورت قوم پرورانہ پہلو نکالتے تھے کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے تھے۔ آزمائش کے کئی مواقع آئے لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔''

عتیق الرحمٰن عثمانی رقم طراز ہیں:

''ملک کو آزاد کرانے کی سعی و جدوجہد میں جن ہستیوں نے جان کی بازی لگائی تھی ان میں رئیس الاحرار ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ وطن کے اس جاں باز سپاہی کی جوانی کا بہترین حصہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے میں گزرا۔ جنگ آزادی کا کوئی قابل ذکر محاذ ایسا نہ تھا جس میں مولانا مرحوم اپنے حصے کی ہنگامہ خیزیوں اور فکرانگیزیوں کے ساتھ پیش پیش نہ رہے ہوں۔''

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان کی شخصیت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اپنے سیاسی شعور، جوشِ عمل، اولوالعزمی اور جدوجہد کے امتیاز سے ہمیشہ نمایاں رہے۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور اس راہ میں بارہا قید و بند کی شدید صعوبتیں برداشت کیں۔''

مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''مجاہد جلیل رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جہاد آزادی کے جلیل القدر سپاہ سالار تھے۔ مرحوم جوان تھے کہ جنگ آزادی کا بگل بجا اور وہ مردانہ وار میدانِ کارزار میں کود پڑے، انتہائی مصائب، ناقابلِ بیان کڑیاں جھیلیں لیکن چتون کبھی میلی نہ ہونے پائی، راہِ حق میں بڑی بڑی منزلیں طے ہوگئیں۔''

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شخصیت جدوجہد آزادی کی عظیم ترین شخصیت تھی جس کی نئے ہندوستان کو بہت ضرورت تھی۔ ایسی ہی عظیم شخصیتوں کے متعلق شاعر مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی 2 ستمبر 1956ء کو اگرچہ چل بسے مگر وہ اپنے عظیم کارناموں کی بدولت آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کی شخصیت ہماری تحریک آزادی کی تاریخ کا وہ روشن باب ہے جس پر ہمارے ملک و قوم کو بجا طور پر ناز ہے۔

☆☆☆

موبائل نمبر: 9968347899

ڈاکٹر عارف حسن وسطوی

''سہرے کی ادبی معنویت'' ایک مطالعہ

''سہرے کی ادبی معنویت'' ڈاکٹر امام اعظم کی ایک اہم کتاب ہے جو ۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ کتاب کیا ہے برسوں کی محنت و مشقت اور تلاش و بسیار کی منھ بولتی تصویر ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے کس قدر تگ و دو کے بعد اس کتاب کو اشاعت کے مرحلے سے گزارا ہے، کتاب کا ورق ورق اس کا گواہ ہے۔ ظاہر ہے جس کتاب کی تیاری میں ایک دہائی کا مرحلہ گزر جائے اس کی ادبی و فنی خوبیاں بھی بہت اعلیٰ ہوں گی۔ میں ڈاکٹر امام اعظم کو اس خوبصورت، دیدہ زیب اور مواد سے بھرپور کتاب ترتیب دینے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

چچا غالبؔ اگر اردو شاعری کے مرکز و محور ہیں تو شاعری کے وہ اصناف بھی ادب میں داخل ہیں جن پر غالبؔ نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اب یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ سہرے کی ادبی معنویت کا کیا جواز ہے؟ پھر بھی یہ سوال اگر باقی ہے تو اس کتاب کے مطالعہ سے قبل عہدِ حاضر کے تین معروف، مقبول اور جید ادیب و دانشور کی آرا کا مطالعہ ضروری ہے جس سے سہرے کی ادبی حیثیت کا بخوبی علم ہوتا ہے:

☆ ''سہرابندی و سہرا خوانی کی رسم عام محافل شادی سے عروج پا کر لال قلعہ میں شہزادوں کی بزم شادی تک پہنچ گئی۔ درباری شعرا میں اسد اللہ خاں غالبؔ اور بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ بھی سہرا پڑھتے نظر آنے لگے۔ شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر غالبؔ نے سہرا کہا اور پڑھا۔ مقطع میں بات سخن گسترانہ آ گئی۔ استاد ذوق نے سمجھا مجھے چیلنج کیا ہے۔ بس ۱۵ ر شعر کا سہرا ذوق نے بھی لکھ مارا۔'' (پروفیسر سیّد شاہ طلحہ رضوی برق)

☆ ''اخلاقی اقدار سے مالامال صنفِ سخن 'سہرا' شخصیت کی عظمت کا اعتراف کراتا ہے، جذباتِ صادق سے بہرہ مند کراتا ہے، شعور و عرفان اور بصیرت و ایمان کی روشنی سے تسخیر ذات کراتا ہے اور احوالاتی بنیادیں دریافت کراتا ہے۔..... ''سہرا'' ایک حقیقت ہے جس میں دوئی کو مٹانے کا بکھان ہوتا ہے۔ خراجِ تحسین ہوتا ہے۔ وابستگی کے وسیلے کی آمادگی ہوتی ہے اور انفرادی سطح پر سیرت اور صورت کی تعریف ہوتی ہے۔ ساتھ ہی شاعرانہ خلوص کی اثر پذیری ہوتی ہے۔'' (پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی)

☆ ''اردو میں جس کثرت سے شادی کے تہنیت نامے لکھے گئے، غالباً کسی دوسری علاقائی زبان میں نہیں لکھے گئے۔ اس اعتبار سے ''سہرا'' اردو کی ایک باقاعدہ صنفِ سخن کہلا سکتا ہے۔ ہندوستان بھر میں بکھرے ہوئے سہروں کو یکجا کر کے شائع کیا جائے تو ہمارا سرمایۂ نقد و نظر ایک نئی جہت سے آشنا ہو۔'' (پروفیسر کرامت علی کرامت)

سہرے کا تعلق ایک خاص موقع سے ہے۔ شادی بیاہ کا موقع ہر گھر میں آتا ہے۔ خوشیاں منانے کے ان اوقات کو لوگ اپنی اپنی پسند کے مطابق گزارتے ہیں اور کچھ ایسا ضرور کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لمحہ ان کے لیے یادگار بھی ہو اور تاریخی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں شادی کے خوبصورت پلوں کو لوگ کیمروں میں قید کیا کرتے تھے۔ اب جدید شکل میں ویڈیوگرافی ہو رہی ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع سے ڈھول، موسیقی، قوالی اور پھر رقص وغیرہ کی نمائش کم و بیش ہر زمانے میں رہی ہے۔ شادی کے موقع سے وہ تمام اخراجات یا لوازمات جو ضرورتاً ہوتے ہیں یا

شوق کی تسکین کے لیے کیے جاتے ہیں ان کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔خوشی کے انہی لمحات کو یادگار بنائے رکھنے کا ایک دوسرا ذریعہ سہرا بھی ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے کتاب کے مقدمہ ''میں پیامِ نشاط لایا ہوں'' میں سہرے کی ادبی حیثیت،فنی مہارت اور سماجی ضرورت پر کھل کر گفتگو کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''سہرے میں مسرت،خوشبو،پھول،دعائیں،جذبے،خوشیاں وغیرہ موضوعات ہوتے ہیں۔اس میں بھی جذبات کے زیر و بم دیکھے جاسکتے ہیں۔غنائیت کے ساتھ شعریت بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے اور تازگی،توانائی،دلکشی اور شگفتگی کے گل بوٹے بھی ملتے ہیں۔سہرا لکھنا کوئی نئی روایت نہیں ہے لیکن تہذیب یافتہ قوم کی جاگیر ہے۔اس لیے سہرے کی روایت کو نظر انداز کرنا اور خوشی کے اظہار کا کوئی الگ طریقہ اختیار کرنا دونوں میں تہذیبی تضاد ہے۔'' (ص:۲۶)

شادی کی محفلوں کے لیے سہرے کی گنجائش باقی رکھنے کا تعلق ادب سے کم ذوق سے زیادہ ہے۔اور اس میں بھی شادی کے موقع سے سہروں کو یکجا کرنا اور انھیں ترتیب دے کر کتابچہ کی صورت میں شائع کرانا یہ اور بھی زیادہ ذوق کا طلبگار ہے۔ایسے باذوق اردو داں گھرانے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ڈاکٹر امام اعظم نے اس کتاب کے ذریعہ یہ مشکل کام بھی سہل کردیا اور ایسی زائد از ۸۰رشادیوں کی کھوج کر ڈالی جس موقع سے سہروں کا گلدستہ کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔بڑا کام ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے کس قدر محنت کے بعد سہروں کے ایسے گلدستوں کو یکجا کیا ہوگا اس کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ان سہروں کے اشاریہ کے بعد تقریباً ۲۵۰رشعراء کے ایک ایک سہرے کی شمولیت کتاب کی وقعت وعظمت کو دوبالا کرتا ہے۔غالب سے لے کر اکبر تک،وحشت کلکتوی سے بازغ بہاری تک اور ناوک حمزہ پوری سے ولی اللہ ولی تک ہماری شاعری کی صحتمند روایت کا امین صنفِ 'سہرہ' سرسبز و شاداب ہے۔یہاں متعدد ایسے شعرا کے سہرے بھی پکی روشنائی میں محفوظ ہوگئے ہیں جو شاعری کے حوالے سے مقبول عام نہیں ہیں،لیکن ان کے کلام میں شاعری کے رنگ موجود ہیں۔

سہرے کی روایت،اہمیت،معنویت،فن کاری اور اسلوب سے متعلق ادبی مضامین کی شمولیت کتاب کی اہمیت و افادیت کو بڑھاتے ہیں۔مرتب نے ان ادبی مضامین کو موقع و مناسبت کے اعتبار سے بڑے سلیقے سے کتاب میں جگہ دی ہے۔ان مضامین کے مطالعے سے سہرے کی مکمل تاریخ،اس کی روایت،عظمت اور عصری معنویت سے قاری بخوبی واقف ہوتا ہے۔کتاب کا مقدمہ لکھتے ہوئے مرتب نے سہرا گوئی اور اس کے فن سے متعلق مشاہیر ادبا کی آرا کو اپنی تحریر میں سمیٹ کر کتاب کی ادبی حیثیت کو خاصا وقیع کیا ہے۔صنف سہرا پر ڈاکٹر امام اعظم سے ڈاکٹر امتیاز وحید کا ایک طویل مصاحبہ بھی کتاب کی زینت کو بڑھاتا ہے۔اس دلچسپ انٹرویو میں امام اعظم صاحب نے سہرا جیسی جز وقتی صنف پر ایک مربوط اور مسلسل تحقیقی کام کرنے سے متعلق تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے کس طرح ایک چیلنج سے بھرے کام کو اپنے مقبول عام رسالہ ''تمثیلِ نو'' کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا۔پھر اسی کام کو وسعت دیتے ہوئے کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کا قابلِ تحسین کارنامہ انجام دیا۔

☆☆☆

موبائل: 7654443036 ای میل: arifhasan2211@gmail.com

استوتی اگروال

ہمدردی اور انسانیت کے پیکر: اختر الواسع

عام طور پر لوگ ہر کس و ناکس پر عظیم شاعر یا ادیب کا ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ میں نے اکثر دس بیس غزلیں کہنے والے اور دس پندرہ مضامین لکھنے والے شاعروں ادیبوں کے لئے بھی عظیم شاعر لکھا ہوا دیکھا ہے، جبکہ عظیم کسے کہتے ہیں یہ لکھنے والا بھی نہیں جانتا۔ عظمتیں آدمی کو یوں ہی نہیں ملتی بلکہ، اس کی پوری زندگی اور اُس کے مختلف کارناموں کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد عظیم لکھا جائے تو کوئی بات نہیں بحر حال میں یہاں ایک ایسی عظیم شخصیت کا تذکرہ کرنے جا رہی ہوں جس کو عظیم کہنے اور لکھنے کے لئے ان کے سینکڑوں کارنامے دنیائے ادب میں روشن ہیں مثلاً وہ جامعہ ملیہ میں ذاکر حسین اسلامک ادارے کے ڈائریکٹر بھی رہے ہیں۔ دہلی اردو اکادمی کے نائب چیئر مین کی حیثیت سے کئی سال کام کیا، چشتی صوفی درگاہ کے صدر خزانچی بھی رہے 65 ملکوں کا سفر کر چکے ہیں۔ وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا علم کا دریا بہہ رہا ہے ان کا اسلامیات پر اتنا گہرا مطالعہ ہے کہ اکثر حکومت بھی ان سے مشورہ لیتی ہے وہ جس موضوع پر بولتے ہیں اُس موضوع سے متعلق ان کی معلومات اتنی وسیع ہوتی ہے کہ درمیان میں کوئی اگر سوال کر دے تو اس کا جواب اتنی تفصیل سے دیتے ہیں کہ سامنے والا لاجواب ہو جاتا ہے۔ ساہتیہ اکادمی سیمینار سے متعلق جس میں سیفی سرونجی صاحب کے ساتھ میرے پاپا انل اگروال بھی موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اختر الواسع صاحب جب تقریر کر رہے تھے اور پورا مجمع ہمہ تن گوش تھا کہ درمیان میں بھارتی نام کی ایک صحافی نے سوال کر دیا، بلکہ نارنگ صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا، ”انہوں نے چھانٹ چھانٹ کر بوڑھے اور ناکارہ لوگوں کو بلایا ہے، جن سے بات کرنا کرنا تو دور کی بات وہ ٹھیک سے کھڑے بھی نہیں ہو پاتے۔“ وہ زور زور سے ہنگامہ کرنے لگی لیکن اختر الواسع صاحب نے اسے دلائل سے ایسا مطمئن کیا کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے کہا، ”بھارتی! آپ کا اعتراض غلط ہے۔ ہم نے نئی نسل کے بہت سے لکھنے والوں کو بھی اس سیمینار میں بلایا ہے جن میں حقانی القاسمی، راشد انور راشد، سیفی سرونجی، مولا بخش، مشتاق صدف جیسے کئی لوگ ہیں۔ اگر آپ میں صلاحیت ہے تو آپ کو بھی موقع دیا جائے گا۔“

اس طرح ان کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں روز ہی پاپا سے اور سیفی صاحب سے سنتی رہتی ہوں، بلکہ دس پندرہ سال پہلے جب وہ خالد محمود انکل کے ساتھ ایک مرتبہ سرونج تشریف لائے تھے تو انہوں نے میرے والد انل اگروال کو بغیر ملاقات کئے پہلی مرتبہ دیکھتے ہی انہیں ان کے نام سے پکارا تھا۔ چونکہ واسع صاحب ایک بڑے چہرہ شناس بھی ہیں یہ ہی نہیں یہاں ان کے اعزاز میں کئی پروگرام منعقد کئے گئے تھے۔ انتساب پبلی کیشنز کی جانب سے سیفی لائبریری میں بھی ”ایک شام اختر الواسع کے نام“ کا بھی انعقاد کیا گیا اور اہلِ سرونج ان کے اخلاق اور تقریریں سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ پروفیسر خالد محمود صاحب کے رشتے دار ہونے کی وجہ سے اکثر وہ سرونج بھی تشریف لاتے رہے ہیں افسوس! میں ان کی تقریر اور اُن سے ملاقات نہ کر سکی کیونکہ میں اُس وقت پیدا ہی نہیں ہوئی تھی، لیکن سیفی صاحب سے اکثر ان کا تذکرہ سنتی رہتی ہوں انہوں نے بتایا کہ اختر الواسع صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں سے نا صرف بہت محبت کرتے ہیں، بلکہ نئی نسل کے باصلاحیت فنکاروں کی حوصلہ افزائی بھی دل کھول کر کرتے ہیں اس کی مثال میں خود ہوں کہ ابھی میں صرف ایک

طالب علم ہوں لیکن میرے چند مضامین، تبصرے وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ جب میرا مضمون ''نارنگ انکل: انٹرویو کے آئینے میں'' عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر خالد محمود کے علاوہ اختر الواسع صاحب نے بھی میری ہمت افزائی کی اور میرے ساتھ میرے والد اور والدہ کو بھی ڈھیروں مبارکباد دیں اور میں نے ان سے جب اپنی کم علمیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انکل اب تک میں 70 رسالوں میں چھپ چکی ہوں، تو انہوں نے بڑی محبت سے مجھ سے کہا، ''بیٹا! پہلے آپ خوب مطالعہ کیجئے، کیونکہ جس طرح ایک پہاڑ ہزاروں بارشیں اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے اس کے بعد ہی اس میں کہیں جا کر ایک چشمہ پھوٹتا ہے اسی طرح جب آپ لکھیں گی تو آپ کو مضبوط مطالعہ چاہئے تاکہ آپ کی تحریر میں گہرائی پیدا ہو۔ واسع صاحب نے پاپا سے بھی بات کی اور اُن سے فارسی کا ایک شعر بھی کہا جو مجھے یاد تو نہیں ہے لیکن انہوں نے معنی بھی بتا دیے تھے اور اس کے معنی کچھ یہ تھے، ''جو کام باپ نہیں کر سکا، بیٹی نے کر دکھایا۔''

اختر الواسع صاحب چھوٹوں سے بھی بہت محبت کرتے ہیں کہ مجھ جیسی طالب علم کا بھی حوصلہ بڑھاتے ہیں بھلا انہیں کیا ضرورت؟ میں کہاں اور کہاں عظیم شخصیت لیکن یہ اُن کی محبت ہی ہے۔ ایک ماہرِ تعلیم ایک بڑی شخصیت خدایوں ہی نہیں بناتا، بلکہ اس میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں اور اُن میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ اختر الواسع صاحب کے علاوہ سیفی صاحب، ڈاکٹر مہتاب عالم، مختار شمیم، اقبال مسعود، پروفیسر نعمان صاحب، خالد صاحب اور ناظر نعمان بھائی بھی اپنے مفید مشورے دیتے رہے ہیں جن پر میں عمل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے بچپن سے ہی بڑی عظیم شخصیات کی سوانح حیات پڑھنے کا بہت شوق رہا ہے یہی وجہ ہے کہ میں سیفی صاحب سے صابر دت کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ 'فن اور شخصیت' کا آپ بیتی نمبر لے کر بار بار اسے پڑھتی رہی ہوں جس میں غالب، جوش ملیح آبادی، فراق، گورکھپوری کنہیا لعل کپور، پریم چند، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، گوپال متل، جیلانی بانو، بیدی، ڈپٹی نذیر احمد، علی سردار جعفری وغیرہ کے علاوہ آپ بیتی نمبر میں نے کئی فلمی شخصیات جیسے دھرمیندر، منوج کمار، امیتابھ بچن، جاوید اختر، ہیما مالنی، سلیم خان وغیرہ کی سوانح کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اُن آپ بیتیوں کو پڑھ کر مجھے کیا سبق ملتا ہے یہ میں ہی جانتی ہوں۔ جب سیفی صاحب نے بتایا کہ میری طرح واسع صاحب نے بھی غربت بھری زندگی گزاری ہے۔ بی اے، ایم اے میں داخلہ لینے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں تھے تو والدہ نے کان کی بالیاں بھی نکال کر دے دیں اور پیسوں کا انتظام کرنے کے لئے انہوں نے تالوں سے بھری پیٹیاں اٹھا کر مزدوری بھی کی ہے اور بقول واسع صاحب کے انہوں نے اسلامک کورس کا مجبوری میں انتخاب کیا کیونکہ اُس وقت انہیں اس میں پچیس روپئے اسکالرشپ ملتی تھی، لیکن اسی انتخاب کی وجہ سے آج پوری دنیا انہیں ماہرِ اسلامیات اور ایک عظیم شخصیت کے نام سے پکارتی ہے۔ واسع صاحب نے ہمیشہ اپنی نظریں ستاروں پر رکھیں بقول تھیوڈور روزولٹ:

"Keep your eyes on the stars,and your feet on the ground."

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ وہ دنیا کے 65 ملکوں کا سفر کر چکے ہیں اور ہر ملک میں اپنی تقریر کا جادو جگا چکے ہیں مثلاً وہ مانٹریل، لویولا یونیورسٹی، چکاگو، سنسناٹی یونیورسٹی، نیویارک کی ہوفسٹرا یونیورسٹی، انڈونیشیا کی ملنگ یونیورسٹی میں اور پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ سینکڑوں تقاریر کر چکے ہیں جن میں ساہتیہ اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، یوپی اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی کے درجنوں سیمیناروں میں ان کی تقریروں کی گونج آج بھی موجود ہیں۔ اب تک

ان کی اسلامیات پر 40 سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی۔ ہیں اس کے علاوہ وہ چار مشہور رسالوں کے ایڈیٹر ہیں جن میں 'اسلام اینڈ دا ماڈرن ایج' (انگلش) 'اسلام اور عصرِ جدید' (اردو) 'جامعہ' اور اسلامک یوگ (ہندی) نمایاں نام ہیں۔ انہیں درجنوں ایوارڈس مل چکے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ 2013 میں پدم شری سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔ اختر الواسع صاحب کے ادبی کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اگر ہم اُن کے ایک ایک پہلو پر بھی لکھنا شروع کر دیں تو ہر پہلو پر ایک ایک مضمون ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اُن کی علمی، ادبی اور مضامین کی کتابوں کا معاملہ ہے تو ان کے پانچ سو سے زیادہ مضامین ہندی، اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور پرشین میں شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف کتابوں پر پیش لفظ، دیباچے، مضامین، اداریے الگ ہیں۔ 'جامعہ' جو ان کی ادارت میں نکلتا تھا اُس کے ایک اداریے میں الیکٹرانک میڈیا سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک بڑا مسئلہ قدیم متون کے ساتھ یہ ہوا کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں کیونکہ انہیں مختلف زمانوں میں مختلف کاتبوں نے تحریر کیا ہوتا ہے۔ ان تمام نسخوں کا مقابلہ اور اصل تحریر اور منشائے مصنف کی تعیین بڑی دماغ سوزی کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظوں کا معاملہ ہے جو ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک سفر کے دوران مفاہیم کی مختلف صورتوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا زمانی فاصلہ کئی لفظوں کے اصل مفہوم پر پردے ڈال دیتا ہے جس تک رسائی کے لئے زبردست لسانی مہارت درکار ہوتی ہے۔'' (جامعہ، صفحہ نمبر: ۹، اداریہ اختر الواسع، اکتوبر تا دسمبر 2010)

جیسا کہ میں پہلے انٹرویوز میں بتا چکی ہوں کہ ڈاکٹر سیفی سرونجی کی آپ بیتی ''یہ تو سچا قصہ ہے۔'' کا ہندی ایڈیشن پڑھ کر اور اُس سے متاثر ہو کر ہی میں نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ ویسے تو اُس آپ بیتی پر اب تک دنیائے ادب کے سو سے زیادہ قلمکاروں نے اپنے تاثرات اور مضامین لکھے ہیں، لیکن اختر الواسع صاحب بڑے ہی خوبصورت انداز میں لکھتے ہیں:

> ''ایسے ماحول میں سیفی کی خودنوشت ''یہ تو سچا قصہ ہے'' پڑھ کر طمانیت کا احساس ہوا۔ دیگر خودنوشت نگاروں کی طرح یہاں کارناموں کے بیان میں آرائش و زیبائش کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ سیفی سرونجی کی زندگی کے تجربات خاصے متنوع اور گوناگوں ہیں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ نہایت عبرتناک ہے۔ غربت و افلاس کی داستان جانکاہ اپنی جگہ خود سیفی نے اپنے گھر والوں کے جس رویے کی نشاندہی کی ہے وہ خاصا عبرتناک ہے۔ سیفی کی ابتدائی زندگی جس کشمکش، پریشانی میں گزری ہے وہ دراصل ایک پورے معاشرے کا کرب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سیفی نے اپنی محنت، لگن اور توجہ سے نہ صرف تعلیمی مراحل طے کئے بلکہ رفتہ رفتہ کشادگی اور فراغت کے لمحات بھی میسر آئے۔'' (سیفی سرونجی کی آپ بیتی مشاہیر کی نظر میں، صفحہ: ۱۱۰)

اسی طرح خالد محمود پر واسع صاحب لکھتے ہیں:

''ذاکر صاحب نے کہا تھا، معلم کی کتاب زندگی پر علم نہیں، محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ جامعہ کی تعلیمی بستی میں ایسے ان گنت اساتذہ رہے ہیں، جو کہ ذاکر صاحب کے اس قول کی چلتی پھرتی تصاویر تھے، لیکن جیسا کہ کہتے ہیں دنیا کبھی نیک لوگوں سے خالی نہیں ہوتی، اسی طرح تعلیمی ادارے اور بستیاں کبھی اچھے

اساتذہ سے یکسر خالی نہیں ہوتیں، ڈاکٹر خالد محمود بھی ایسے ہی اچھے استاتذہ میں سے ایک ہیں۔''

(خالد محمود شخصیت اور فن، صفحہ نمبر ۲۵۰)

چندر بھان خیالؔ جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کی زندگی کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے ان سے متعلق اختر الواسع رقم طراز ہیں:

''برسوں پہلے عمیق حنفی نے ''صلصلتہ الجرس'' کے عنوان سے اس موضوع پر ایک طویل نظم لکھی تھی۔ حالیہ زمانے میں عنبر بہرائچی کی رزمیہ تخلیق ''لم یات نظیرک فی نظر'' آئی تھی اور اب چندر بھان خیال کی ''لولاک'' نے اس سلسلے کو ایک نئی آب و تاب، گہرائی و گیرائی اور عقیدیت کی روشنی دی ہے۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ذہین اور حساس شاعر اب ریزہ خیالی کی تنکیوں سے گھبرا کر اور ایک بڑے کینوس کی تلاش میں حیاتِ محمدی کی شعری پیکر سازی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں''۔

(چندر بھان خیال: فن اور شخصیت، صفحہ: ۱۰۰)

اس طرح اگر میں اُن کے مضامین سے اقتباس پیش کرنا چاہوں تو سینکڑوں کی تعداد ہے پھر یہ مضمون نہیں بلکہ ایک کتاب ہو جائے گی۔ میں تو ایک طالب علم کی حیثیت سے اُن کی شخصیت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرنے پر ہی اکتفا کر رہی ہوں جیسا میں نے انہیں پایا ہے، جیسا میں نے سیفی صاحب اور پاپا سے اُن کے بارے میں سنا ہے، جیسا کہ میں انہیں ٹی وی پر تقریر کرتے ہوئے سنتی رہی ہوں۔ میں نے بہت سے پروفیسر حضرات کی تقریریں سنی ہیں۔ کئی پروفیسر حضرات تو اتنی جلدی جلدی بولتے ہیں کہ ہم یہ ہی نہیں سمجھ پاتے کہ وہ تقریر کس موضوع پر کر رہے ہیں، جبکہ پروفیسر اختر الواسع کا اندازِ بیان ایسا خوبصورت اور دل میں اتر جانے والا ہے کہ اُن کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اپنی گہری معنویت سے بھرپور ہوتا ہے اور اتنے صاف ستھرے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں کہ ہم جیسے طالب علم کے ذہن و دل روشن ہو جاتے ہیں۔ ان کے اخلاق، کردار اور شخصیت کے کئی مختلف پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن میں اپنی انہیں چند تاثرات پر اپنی بات ختم کرتی ہوں اس لئے کہ میرے پاس ان کی کوئی کتاب نہیں ہے، شاید ہوتی بھی تو اتنی علمیت کی میں اہل بھی نہیں ہوں، لیکن میرا خواب ضرور ہے کہ اُن پر لکھوں گی۔ جب خالد محمود انکل سرونج آئیں گے تو میں اُن سے اختر الواسع صاحب کی کوئی نہ کوئی کتاب یا ان کے بارے میں اور معلومات ضرور حاصل کروں گی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ آپ کی شخصیت خوشبو کی طرح ہے جس کی مہک سے آج سارا زمانہ معطر ہو رہا ہے اور ساری دنیا میں اُن کے نام اور کارناموں کا نہ صرف تذکرہ ہے، بلکہ ان کی تقریریں سننے کے لئے، ان کی شخصیت کو جاننے کے لئے بے شمار لوگ جستجو میں رہتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے غربت میں رہ کر ترقی کی منزلوں کو چھوا ہے۔ ان کی زندگی نئی نسل کے لئے محنت کرنے والوں کے لئے، ترقی کرنے والوں کے لئے ایک ایسا راستہ دکھاتی ہے جس پر چل کر ہم اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتے ہیں بقول شاعر:

غربت میں جو ابھرتا ہے وہ تو جوان دیکھ حسرت سے تو ہر ایک میں فن کار کو نہ ڈھونڈ

☆☆☆

اگروال جیولرز، سرونج، ایم پی

Mobile: 09575089694 Email-Stuti9575@gmail.com

سلمیٰ خاتون

سر سید احمد خاں اور ان کی تعلیمی خدمات

سر سید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ حضرت امام محمد متقی تک پہنچتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے کو ''تقوی سید'' کہتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد ہندوستان میں شاہجہاں کے عہد میں آئے اور اسی وقت سے اکبر ثانی کے زمانہ تک ان کو سلطنت مغلیہ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح برابر کا تعلق رہا۔

جب لال قلعہ کی آخری شمع خاموش ہوئی اور ہندوستان پر برطانوی سامراج کا تسلط ہوا مسلمان اپنی ہزار سالہ حکمرانی کے بعد غلامی کے چنگل میں پھنس گئے۔ ان حالات میں مسلم آبادی دو حصاروں میں بٹ گئی۔ ایک بغاوت اور مقابلے کے لئے اور دوسری مفاہمت اور صلح پسندی کے لئے، مفاہمت اور صلح پسندی کی بنیاد سر سید احمد خاں کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ ان کے قدم کا انحصار حقیقت پر مبنی تھا۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی حالت بغاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتی۔ پہلے قوم کی سطح کو مضبوط ہونا چاہئے۔ انہوں نے سوچا مسلمانوں کی قومی جدو جہد کا رخ متعین کرنے کے لئے چالاک اور مکار حکمراں انگریزوں کے خلاف ایسی حکمت عملی وضع کیا جائے تا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا تشخص اور روقار دوبارہ حاصل کر سکیں۔ اور باوقار زندگی کے لئے ایسے اقدامات کئے جائیں کہ قوم تاریکی کے غاروں میں مدفون نہ ہوں۔ جہاں ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے ہندوؤں کا ذمہ اپنے کندھوں پر اٹھایا اسی طرح دوسری طرف مسلمانوں کا ذمہ سر سید احمد خاں نے اپنے کندھوں پر لیا۔ انہوں نے قوم کو تازہ اور ترقی پسند زندگی کی طرف مائل کرنے کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے۔ مسلمانوں کی اخلاقی اور تعلیمی زبوں حالی کے دائرے سے نکال کر اخلاقی معاشرت کی جانب چلنے کی بنیاد ڈالی۔

سر سید نے اپنی اس نظریہ تعلیم و تربیت کے پیش نظر جنوری ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد انگریزی زبان میں پائے جانے والے علوم و فنون کو تراجم کے ذریعہ عام ہندوستانیوں تک پہنچایا جا سکے۔ سائنٹفک سوسائٹی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے غدر کے بعد ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کو پہلی بار ملک کی ترقی کے لئے ایک جگہ اکٹھا کیا۔ آگے چل کر جب سر سید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا تو سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ اس سوسائٹی نے عام ہندوستانیوں کو تعلیم و تربیت سے آشنا کرانے کے لئے کئی اقدامات کئے جن میں سب سے اہم قدم علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا جاری کرنا تھا۔ یہ وہ گزٹ تھا جس کا شمار اس زمانے کے بہترین اخباروں میں کیا جاتا تھا۔

سر سید احمد خان کا نظریہ تعلیم چونکہ جدید طرز کی تعلیم کے حصول پر مبنی تھا۔ جس میں سائنس، فلسفہ، تاریخ، تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کے ساتھ جدید ٹکنالوجی کی اہمیت کا حامل تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سر سید نے ان علوم و فنون اور جدید ٹکنالوجی کے حصول میں مذہب کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ اپنے ملک کے نوجوانوں کے لئے وہ جس طرز کی تعلیم چاہتے تھے، اس کا اندازہ سر سید کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہوگا۔"
یہی وہ طرز تھا جسے قریب سے دیکھنے پرکھنے اور برتنے کی غرض سے سرسید نے ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ کا سفر کیا۔
سرسید دور اندیش تھے ان کو قوم کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی، مذہبی، اقتصادی بدحالی کا دل سے احساس تھا۔ اس لئے انہیں سمجھنے میں دیر نہ ہوئی کہ اس بدحالی اور تاریکی کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ علم کی شمع جو پوری طرح گل ہو چکی تھی اسے دوبارہ کس طرح روشن کیا جاسکتا ہے۔ وہ سوئی ہوئی قوم کو کھویا ہوا وقار دوبارہ دلانا چاہتے تھے۔ ان کے اندر ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو اپنی حالت خود بخود بدلنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لیں۔
وہ کہتے تھے کہ "سب ترقی کی جڑ یہی ہے کہ علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کرلو۔" اس کام کو کرنے کے لئے انہیں بہت ساری مشکلات سے گزرنا پڑا مگر سرسید کا ماننا تھا کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس میں یہ بتایا گیا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کے سبب کیا ہیں۔ غور وفکر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ مسلمان وقت کے تقاضے کو نہیں سمجھتے اور جدید حالات سے سبق نہیں سیکھتے جبکہ اس مرض کا علاج صرف تعلیم ہی ہے۔ اور وہ بھی جدید تعلیم سرسید جدید تعلیم کے حامی تھے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کی اصلاح کی۔ تعلیم، معاشرت، مذہب، سیاست، زبان وادب سب پر ان کے احسان ہیں۔ وہ بچ کر کنارے کنارے چلنے کا سبق ہرگز نہیں دیتے بلکہ جدوجہد اور ایمانداری کے قائل تھے۔
مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ دینے کا سہرا سرسید اور ان کے رفقاء کے سر رہا۔ مگر سرسید پر الزام ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں۔ یہ بات بھی سو فیصد درست ہے کہ سرسید کے لئے تعلیم نسواں کی مہم تیز کرنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ مسلمان لڑکوں میں تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ پھر لڑکیوں کو تعلیم دینے کا کام اور بھی دشوار تھا۔ اس وجہ سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں۔ جب کہ یہ بات بالکل درست نہیں۔ بقول سرسید "علم بلاشبہ انسان کی جہات ہے اور جہل اس کی موت۔"
سرسید لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کو ضروری اور مفید سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سماج میں مردوں کی تعلیم پر زور زیادہ دیا گیا تو عورتوں کی تعلیم کی راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی۔ سرسید نے اسلام میں عورتوں کی سماجی و معاشرتی حقوق کے حوالے سے مردوں پر زور دیا کہ وہ ان کی ادائیگی کے لئے سنجیدگی سے کام لیں۔ انہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ علمی سطح پر عورتوں کے ساتھ مردوں کا رویہ اچھا نہیں ہے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں اگر وہ انہیں ایمانداری کے ساتھ ادا کریں تو بہت ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی اور کافی حد تک ان کی حالت میں سدھار آجائے گا۔ یہ بات بھی واضح طور پر کہتے تھے کہ ہمارا مذہبی قانون دوسری قوموں کے قانون سے زیادہ بہتر ہے۔
خاتونانِ پنجاب کے ایک استقبالیہ کے جواب میں کہتے ہیں:

''میں تمہاری لڑکیوں کے تعلیم پر جو کوشش کی ہے۔اسے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کے تعلیم کی جڑ ہے۔پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لئے کرتا ہوں وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔''

سرسید کو ۱۸۵۷ء سے پہلے مسلمانوں کا مستقبل صاف نظر آنے لگا۔یہی وجہ تھا کہ سرسید کے تعلیمی نظریات ہمیشہ واضح رہے۔انہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ مردوں کی تعلیم کے بنا عورتوں کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔جب مرد لائق ہو جائیں گے تو بہت ذریعے عورتوں کی تعلیم کے پیدا کرلیں گے۔انہوں نے یہ بھی صاف کر دیا کہ ''جو لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم نسواں کا مخالف ہوں ان کو بتا دو کہ یہ بات غلط ہے۔''

سرسید اپنے مضمون انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں۔میں تعلیم کو سنگ تراش سے مثالیں دیتے ہوئے کہا تھا کہ تعلیم کے بغیر انسان کی روح چتکبرے سنگ مرمر پہاڑ کی مانند ہے۔کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا۔اس کا دھندلا اور کھردرا پن دور نہیں کرتا اور اس کو تراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کے جوہر اس میں چھپے رہتے ہیں۔یہی حال انسان کی روح کا ہے۔انسان کا دل کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو جب تک عمدہ تعلیم و تربیت کا اثر نہ ہوگا چھپی ہوئی خوبیاں نمایاں نہ ہوسکیں گی۔

سرسید کی پوری زندگی اسی فکر میں گزری:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

سرسید کا خیال تھا کہ تعلیم ہی کسی قوم کی ترقی کی ضمانت ہوسکتی ہے۔۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء مدرستہ العلوم کا افتتاح عمل میں آیا۔سرسید کا قیام ان دنوں بنارس میں تھا۔وہ خصوصی طور پر اس تقریب میں شرکت کے لئے علی گڑھ آئے تھے۔اس جلسہ کی صدارت ڈپٹی محمد کریم نے کی تو ۱۸۷۷ء میں اس اسکول کے ساتھ بچوں نے ہائی اسکول وائسرائے ہند لارڈ لٹن کو کالج کی بنیاد رکھنے کی دعوت دی۔اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو گورنر جنرل وائسرائے ہند لارڈ لٹن نے ایم۔اے۔او۔کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔انہوں نے دہلی سے اس تقریب کی یادگار کے طور پر سرسید کو یہ عبارت بھیجی تھی وہ اس طرح تھی:

''بیادگار رکھنے بنیادی کالج کے بدست خاص وائسرائے بتاریخ ۸ رجنوری ۱۸۷۷ء نشان اعزاز بخشی و دوستی از جانب رابرٹ لارڈ لٹن جی سی۔وجی۔ایم۔ایس۔اے۔وائسرائے و گورنر جنرل ہند بہ مولوی سید احمد خان صاحب بہادر سی۔ایس۔آئی پریسیڈنٹ انگلو اورینٹل کالج اہل اسلام مقام علی گڑھ تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۸ء۔''

سب سے پہلے جو طالب علم کالج میں داخل ہوئے ان میں ایک طالب علم ہندو تھا۔جس کا نام مہرناتھ سنگھ تھا کیونکہ سرسید نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کی فلاح و بہبود کے لئے کوششیں کیں۔اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

''لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔یہی وہ معنی ہیں، میں لفظ نیشن کی تعمیر کرتا

ہوں۔ میرے لیے یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے۔ کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔"

سرسید نے ہندوستان کے نازک ترین دور میں اپنی قوم کو جہالت و ناخواندگی، ذلت، غریبی، بربادی و ہلاکت سے باہر نکالا۔ ۲۷/دسمبر ۱۸۸۶ء کو "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولوی سمیع اللہ خان نے کی۔ سرسید کانفرنس کے سکریٹری بنے۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور کو بیدار کیا۔ خود سرسید جلسے کی کاروائی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ اس تحریک میں ایسے ایسے جلیل القدر لوگ شریک ہوتے تھے جو اپنے بیش قیمتی مشوروں سے لوگوں کو فیض پہنچا نے تھے۔ اور لوگ سمجھنے لگے تھے کہ علم ہی وہ شمع ہے جو روشنی اور صرف روشنی دیتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس میں جو نقشہ عورتوں کی حالات کا کھینچا ہے اس کا اثر ہر حساس دل پر ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں ہوا اس میں سرسید نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا:

> "اس وقت ہم تمام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں تو عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہوسکیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔ اور انہیں اس کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ خود ہندوستان کا دیکھ کر کتنے خاندان ذی علم تھے ان خاندانوں کی عورتیں کیسی تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ الزام کہ میں عورتوں کی تعلیم سے کنارہ کش ہوں محض غلط ہے۔ میری رائے میں عورتوں کی تعلیم کا ذریعہ مرد ہی ہوں گے۔ جب مرد لائق ہو جائیں گے تو اپنی بیویوں بچوں اور عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کریں گے۔"

تحریک تعلیم نسواں کے باب میں سرسید اور ان کے رفقاء کی فکر نے عورتوں کی عظمت کا راز بڑی خوبصورتی سے دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ اکبرالہ آبادی جیسا شاعر مشرق کہہ اٹھا:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے

سرسید کے نظریہ تعلیم اور تعلیم نسواں کی تحریک سے اتفاق کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی سرسید کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:

واہ رے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا — یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں پرسوز جگر کیا کہنا — ایک دھن میں ہوتی عمر بسر کیا کہنا

آنے والے وقت نے یہ ثابت کردیا کہ سازگار ماحول میسر ہوتے ہی نہ صرف خواتین میں جدید لیکن رجحان بڑھا بلکہ صنف نازک قرار دیا جانے والی صنف نے اس میدان خارزار میں بھی نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔

☆☆☆

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ایل۔ این۔ ایم۔ یو۔، دربھنگہ

قرۃ العین

عربی ادب میں خودنوشت کی روایت

عربی ادب میں خودنوشت کی روایت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خودنوشت لکھنا بادشاہ اور امراء تک ہی محدود تھا۔ کیوں کہ عرب میں شعروشاعری کا رواج عام تھا۔ وہاں کے قبائل، بدوی، اعراب حضروی اشراف لوگ شاعری کے ہی شیدا تھے۔ عرب میں جب شاعری کا آغاز ہوا تو وہاں کے لوگ تہذیب وتمدّن کے رکھ رکھاؤ سے آزاد تھے، بے باکانہ اور بے ساختہ طبیعتوں کے مالک تھے۔ دورِ جاہلیت میں تعلیم وتعلم سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا، الفاظ کا ذخیرہ موجود ہونے کی وجہ سے عربی قوم خود کو بلند وبالا سمجھتے تھے اور غیر عرب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ایسے میں عرب والے اپنے آپ کو عرب (زبان آور) کہا کرتے اور غیر عرب کو عجم (گونگا) کہہ کر پکارتے تھے۔ اسلامی دور میں سوانحی تصنیفوں اور موضوع کے انتخاب میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی لیکن عربی میں جو سوانح لکھی گئی اس کا مقصد صرف مذہب اور بانی مذہب تھا۔ ابن قلکان کی ''وفیات الاعیان'' کے مترجم میک گکن (Mac guckin) نے سارے عربی علوم وفنون کی بنیاد قرآن کو قرار دیا اور علم وصرف ونحو، حدیث، لغات، رجال اور جغرافیہ وغیرہ سب کے آغاز کو اسی سے منسوب کیا ہے۔ قرآنی احکام کی تشریح تاویل کے لئے احادیث اور ''میسر یا مغازی'' کی تدوین کی اور ان کی صحت کے مدنظر راویوں کے کردار کی جانچ کی ضرورت پڑی جس کے لئے انہوں نے پیغمبر اسلام کو منتخب کیا جبکہ یہ سلسلہ پیغمبرِ اسلام ہی کے وقت شروع ہو گیا تھا، جس کو بڑھاوا خلفاء راشدین نے دیا اور اس کے بعد باضابطہ طور پر لاکھوں آدمیوں کے حالات قلم بند کئے گئے۔ اس ضمن میں اصول وقواعد، معیار بھی مقرر ہوئے۔ مثلاً یہ کہ راوی خود اس واقعہ کو جو وہ بیان کر رہا ہے اس میں شریک ہو۔ یا شریک واقعہ تمام راویوں کے نام بتائے۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ روایت کے لوگوں کے مشاغل، رہن سہن، تہذیب وتمدن، ذہانت، علمیت، مذہبیت اور سیاسی رجحانات و غیرہ غرض یہ کہ ہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر گہرائی سے نظر رکھتے تا کہ کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ ہو جائے اور یہی نہیں ذات کے بیان کے مقصد سے متعلق جو تحریر قلم بند کرتے۔ مثلاً تحریری احکام ومعاہدات، بادشاہوں، امیروں اور قبیلوں کے نام خطوط وغیرہ جیسے مواد پر بھی غائرانہ نظر ڈالی جاتی تھی۔ جبکہ اگر خودنوشت کی پوری روایت پر نظر ڈالی جائے تو مغرب میں اس قسم کی تحقیق وتدوین کو ضروری قرار نہیں دیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہاں راوی کے صدق وکذب کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں جبکہ سید شاہ علی کا ماننا ہے۔

> ''باوجود بلالحاظ منصب ہر شخص کی اخلاقی سراغ رسانی کا دعوی بعض نقادوں کے نزدیک پیغمبر اسلام سے قطع نظر صحابہ کے حالات میں بھی جرح اور تعدیل سے کام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ کتب احادیث و رجال سے موجود مذاق کے مطابق واقعات کا انتخاب روایات کی تحقیق وتنقید اسباب وعلل کی جستجو موضوعات وصنعا (حدیث) کا ردوغیرہ مشکل ہے۔'' (اردو میں فن سوانح نگاری ص:۱۰۴)

اگر دیکھا جائے تو اسلام سے قبل جاہلی ادب میں شعر وسخن کے تقریباً تمام اصناف کسی نہ کسی صورت کے ساتھ موجود تھیں۔ بعد میں یہی ابتدائی نقوش باقاعدہ اصناف کے طور پر عربی ادب میں شامل ہوئے ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ، غزل، قطع، رباعی اور مخمس وغیرہ جبکہ مواد ومضامین کے اعتبار سے حماسہ، تغزل، مدیح، رثاء، الغرض کی ہر نوع کی شاعری عہد جاہلیت میں موجود تھی۔

عرب میں عہدِ جاہلیت میں قصیدہ لکھنے کا رواج عام تھا۔ قصائد کے ساتھ ساتھ عرب شعراء کے یہاں مثنوی بھی لکھنے کا رواج زمانہ قدیم سے تھا یہی وجہ تھی کہ قصیدے کے ساتھ مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی تمام اصناف کے بے انتہا ذخیرے موجود تھے۔ عرب بہت سی زبان جانتے تھے اور بہت بے باک تھے، کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر عرب اپنی زندگی کے واقعات وحادثات کو روزنامچوں کی صورت میں لکھنے لگے۔ جب عربی قوم ہندوستان آئی تو ان کے شعری ذوق میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ اور وہ زمانے کے واقعات کی طرف رجوع ہونے لگے۔ انھیں واقعات کو تحریری شکل میں عرب والوں نے تبدیل کر دیا۔ اس طرح سے عہد عربی حکومت میں عربی زبان کے رواج واشاعت کے ساتھ اس کو پھلنے پھولنے کا موقع بھی ملا اور یوں باضابطہ طور پر عربی میں خودنوشت لکھنے کی بنیاد پڑی۔

عربی زبان میں زیادہ تر قابلِ ذکر سوانح وہ ہیں جو سیرتِ رسول پر لکھی گئی ہیں۔ تقریباً چار صدیوں تک عرب میں سوانح عمری کا یہی تصور قائم رہا۔ اور اس وقت کئی خودنوشت وجود میں آئیں مثلاً پیغمبر اور صحابہ کے حالات پر مشتمل ''سیرت ابن اسحٰق'' (ابن ہشام) کی تصحیح شدہ ''اسد الغابہ'' (ابن الاثیر جذری) صحابہ اور تابعین کے حال میں۔ سیر رجال اور متعدد تصانیف۔ ان کے علاوہ ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' وغیرہ۔ امام غزالی، ابن الجوزی اور ابن خلدون نے آپ بیتیوں کی صورت میں اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات کو بھی بیان کیا ہے۔ عصر حاضر میں ڈاکٹر طٰحہ کی ''الایام'' بھی مقبولیت کی حامل ہے۔ یہ تمام خودنوشت سوانح عمریاں خودنوشت کی روایت میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر کا ترجمہ اردو میں بھی ہوا ہے جس سے براہ راست اردو ادب نے اثرات قبول کیا ہے۔ اگر چہ اردو نے زیادہ تر فارسی سے استفادہ کیا ہے۔ عربی میں گراں قدر سرمایہ موجود ہونے کے باوجود زیادہ فائدہ نہیں مل سکا۔

☆☆☆

دوگھرا، جالے، دربھنگہ (بہار) موبائل: 9161873515

سیدہ جنیفر رضوی

دبستانِ مرشد آباد کے صوفی شاعر: شیخ فرحت اللہ

اک روز بھی وہ بت نہ ہوا رام ہمارا　　بر باد کیا مفت میں اسلام ہمارا
اے وعدہ فراموش جو آتا ہے تو اب آ　　کیا فائدہ جب ہو ہی چکا کام ہمارا

دہلی سے نقل مکانی کر کے دبستان مرشد آباد میں ہمیشہ کے لئے بسنے والے شعراء میں فرحت اللہ فرحتؔ بھی تھے۔آپ کی پیدائش شہر فرخ آباد، اتر پردیش میں ہوئی لیکن ابتدائی عمر دہلی میں گذاری۔آپ سراج الدین علی خان آرزو کے شاگرد تھے۔دلی میں جاری ادبی و شعری سرگرمیوں سے آپ نے خوب فیض حاصل کیا۔جب دلی پھولوں کا چمن نہ رہی اور کانٹوں کا بیابان ہوگئی تو دوسرے شعراء کی طرح آپ نے بھی دبستان مرشد آباد کا رخ کیا۔آپ میر جعفر کے دورِ نظامت میں مرشد آباد آئے۔یہاں آپ کے شعر و سخن کو عرج حاصل ہوا اور عمر بھر دادِ سخن پاتے رہے۔ آپ جدت مضامین اور زورِ قلم میں اپنا سکہ جمائے گئے۔آپ ایک باکمال و باصلاحیت شاعر گذرے ہیں۔آپ کی زبان میں سادگی اور سلاست ہے۔تمثیلات کے اعلیٰ نمونے آپ کے کلام میں خوبصورتی کے ساتھ جڑے نظر آتے ہیں۔آپ کی شاعری کا شمار اردو کے صوفیانہ شاعری میں ہوتا ہے۔یادگار عشق میں ثاقب عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ:

"اردو کے صوفیانہ شاعری کے ذخیرہ میں ان کا حصہ بہت گراں ہے۔ان کا کلام اساتذہ نے بڑی دفعتون سے دیکھا ہے۔خود ہمارے حجرت عاشق کوان کا رنگ بیحد پسند ہے جس کا ثبوت وہ اشعار ہیں جس میں عشق نے فرحت کے مصروں پر مصرے لگائے ہیں۔" (ص:۶۱)

صوفیانہ اور عاشقانہ کلام

زندگی میں تو رہے صدمہ دل غمناک پر　　بعد میرے دیکھئے کا ہو قیامت خاک پر
گذرے اگر چمن میں وہ گل عزار اپنا　　دین چھوڑے ہے گل سی گل شاخسار اپنا
تاثیر آہ میں نے نالہ مین ہے اثر کچھ　　ہووے وہ آہ یا رب کس طرح یار اپنا
اس شوخ نے یہ پوچھا فرحتؔ سے کل کہ تو نے　　اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا
آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم　　ہرگز نہیں ہے دل پر کچھ اختیار اپنا

آپ کا نام فرحت اور تخلص بھی فرحت لیکن زندگی میں نام کا اثر نہ پڑا زندگی بڑی عسرت میں گزار دی اور ۱۱۹۱ھ ۱۷۷۷ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے اور یہی دبستان مرشد آباد میں دفن ہیں۔

تذکروں میں فرحت

سخن شعراء (عبدالغفور نساخ): فرحت تخلص شیخ فرحت اللہ رفیق بہادر علی خان داروغہ نواب ناظم بنگالہ......۱۱۹۱ھ میں مرشد آباد میں فوت کی صاحب دیوان گزرے۔

زندگی میں تو رہے صدمے دل غمناک ہر　　بعد میرے دیکھیے کیا ہو قیامت خاک پر　(ص:۳۶۳)

گلشن سخن (مردان علی خان): شیخ فرحت اللہ فرحت ابن شیخ اسد اللہ از فرزندانِ قاضی مظہر مسطور از دہلی بہ مرشد آباد رفت و مدت ہائے مدید در آنجا بسر بردہ از جہان درگزشت۔

دردِ الم و نالہ و بے طاقتی و آہ یہ کچھ تو صنم ہم نے ترے پیار میں دیکھا (ص:۱۸۳)

تذکرہ سراپا سخن (میر محسن علی): شیخ فرحت اللہ والد شیخ اسد اللہ اولاد میں قاضی مظہر کے جانشیں مرزا۔ بہ سبب رفاقت بہادر علی خان داروغہ ناظم بنگالہ مسکن مرشد آباد وہیں وفات پائی۔ صاحب دیوان شاگرد سراج الدین علی خان آرزو:

جاں اشک گراہوں میں گویا رکی آنکھوں سے لیکن مجھے دیکھے ہے وہ بہار کی آنکھوں سے
چمن میں کیوں نہ میں روؤں گلے سے لگ کے غنچے کے اس صورت کا اپنے پاس اے فرحت کبھی دل تھا

(ص:۱۴۷)

طبقات شعراء (نثار احمد فاروقی): شیخ فرحت اللہ فرزند شیخ اسد اللہ کا جو کہ قاضے مظہر کے اولاد میں سے تھا اور دہلی سے مرشد آباد کو آیا اور وہیں وفات پائے۔ مرشد آباد میں درمیان ۱۱۹۱ھ آیا تھا۔ (ص:۶۴)

گلشن وگلزار (مردان علی خاں): گلشن شیخ فرحت اللہ ابن شیخ اسد اللہ قاضی مظہر جانشیں شیخ مذکو دہلی سے مرشد آباد آئے اور ایک مدت تک وہاں رہے اور وہیں انتقال کیا۔ گلزار: شیخ فرحت اللہ، قاضی مظہر جانشیں مرزا بدیع الدین مدار کے فرزند دہلی سے مرشد آباد آ کر کچھ دنوں رہے۔ وہ ۱۱۹۱ھ مرشد آباد ہی میں فوت ہوئے۔ (ص:۹۳ سے ۹۴)

گلشن ہند (میرزا علی لطف) فرحت تخلص، شیخ فرحت اللہ نام غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ غریبوں کا بنا ہوتا تھا۔

اس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کی کہ تو نے اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار ایسا (ص:۱۳۱ سے ۱۳۲)

نمونہ کلام

آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم ہر گز نہیں ہے دل پر کچھ اختیار اپنا
خط کے آتے ہی ہوئی گم خال کی خوبی تمام آگے طوطی کے کہاں سر سبز ہو سکتا ہے داغ
سینے پہ ترے ہر دم کس طرح سے لوٹی ہے ہو وصل ترا اب کی یہ یار ہے اور میں ہوں
رفتہ رفتہ میں ہوا عشق میں جان کا دشمن دل ہے پہلو میں مرے ہائے کہاں کا دامن
مرنے کے بعد مجھ پر کیا کیا ستم نہ ہوں گے دیکھیں گے غیر تجھ کو اور ہائے ہم نہ ہونگے
جگر اب میرے آنکھوں میں سرشک خونچکاں نکلا بدخشاں سے یہ لعل قیمتی کا کارواں نکلا
نظر آیا سو امیرے ترے تئیں اور بھی عاشق گلی میں لے کے جب تو اپنی تیغ امتحان نکلا
ہوا مشتاق جاتے ہی ہوائے بام دلبر کا اگر پاؤں تو میں لو ہیوں ایسے کبوتر کا
خدا کے واسطے اب بھی تو کر ضبط فغاں اے دل ترے نالے نے تو بر ہم کیا دیوان محشر کا
بتول کی سختی دل دیکھ فرحت نے دیا ہے جی بنانا مقبرہ تربت پہ اس سنگ مرمر کا
آواز خندۂ گل جس کو نہیں خوش آئی نالے پہ کب ہمارے وہ شوخ کان دے گا
میں کس شمار میں ہوں نکلے گا جب وہ گھر سے دیکھ اس کو جان اپنا سارا جہان دے گا

رباعیات

مت نکلواے اشک مرے اپنے تو گھر سے
پالا ہے تجھے لعل میں کس خون جگر سے
آوے ہے صبا تجھ میں تو کچھ اور ہی جو آج
سچ کہہ تجھے سوگند ہی آتی ہے کدھر سے

......

دل کے تئیں اپنے تجھے یار دیے جاتا ہوں
حسرت وصل تری ساتھ لئے جاتا ہوں
طپش و نالہ و فریاد وتڑپنا مرنا
عشق کا کام جو ہوتا ہے کئے جاتا ہوں

......

اک بات میں کیوں جو مجھ سے خفا نہ ہو
جو چاہے کر ستم پہ صنم بے وفا نہ ہو
ناصح بتوں کے عشق میں بے اختیا ہوں
کیا چاہتا نہیں کوئی اپنا بھلا نہ ہو

......

تو جو نالہ نہیں اس کو اثر کرنے کا
فائدہ کیا مرے نت خستہ جگر کرنے کا
ایک دم بھی نہیں جاتا تو نظر سے میری
میں دوانا ہوں ترے آنکھو میں گھر کرنے کا

......

ہر روز جو آہ سر بھرتا ہوں میں
اور نالے پہ نالے شب کو کرتا ہوں میں
نکلا آوے ہے بے قراری سے جی
معلوم نہیں ہے کس پہ مرتا ہوں میں

......

ہر گھڑی جی میں مرے جلوۂ قدوس ہے
طور سینہ ہی میرا اور یہ جی موتی ہے
آہ یہ کون سی ہے راہ کہ در پیش نظر
ہر قدم منزل مقصود سے مایوس ہے

آپ کا شمار دبستان مرشد آباد کے صاحب دیوان شاعر میں ہوتا ہے۔آپ کا دیوان دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔آپ کے کلام کے مطالعہ سے مشق سخن رنگین طبیعت اور زور قلم کا ثبوت ملتا ہے۔آپ نے دبستان مرشد آباد کی شعر وادب کی فضا میں جو آبیاری کی ہے اسے دبستان مرشد آباد کے لوگ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

شعبۂ اردو، وشو بھارتی یونیورسٹی، بولپور، ضلع بیر بھوم (مغربی بنگال)
موبائل: 7872873542 ای میل: syedarezvi@yahoo.com

ڈاکٹر مظفر نازنین

سیّد محمود احمد کریمی کی ترجمہ نگاری "Proximal Warmth" کے حوالے سے

سیّد محمود احمد کریمی صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ پیشے سے وکیل ہیں۔ ایک بہترین مترجم ہیں اور اب تک 12 کتابوں کے ترجمے اردو سے انگریزی میں کر چکے ہیں جن میں "Organwise Ghazlen", "Encomium to Holy Prophet", "Assortment of Short Stories", "Qasidah Burdah Sharif", "Surah Yasin Sharif", "Proximal Warmth", "Closet of Beauties" وغیرہ اہم ہیں۔

زیرِنظر کتاب "Proximal Warmth" معروف شاعر، ادیب وصحافی ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو، کولکاتا ریجنل سینٹر) کے پہلے شعری مجموعہ ''قربتوں کی دھوپ'' (مطبوعہ: ۱۹۹۵ء) کا انگریزی ترجمہ ہے جب کہ ترجمہ شدہ کتاب "Proximal Warmth" ۲۰۱۸ء میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آئی۔ ڈاکٹر امام اعظم کا تعلق دربھنگہ (بہار) سے ہے جو علم وفن کا گہوارہ ہے۔ بیشتر علما، ادبا، شعرا نے یہاں جنم لیا جو مختلف شعبۂ ہائے حیات سے منسلک ہیں۔ سیّد محمود احمد کریمی صاحب کا تعلق بھی دربھنگہ سے ہے۔

جہاں ''قربتوں کی دھوپ'' ڈاکٹر امام اعظم صاحب کی شاہکار تخلیق ہے، وہیں سیّد محمود احمد کریمی صاحب نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر کے انگریزی ادب کی دنیا میں ڈاکٹر امام اعظم صاحب کو متعارف کرایا ہے۔ یہ ترجمہ قاری کے ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑتا ہے نیز مترجم کی بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں پر مہارت کا بین ثبوت پیش کرتا ہے۔ موصوف خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں اور انہیں بیک وقت اردو اور انگریزی پر بھرپور دسترس حاصل ہے۔ یہ کتاب "Proximal Warmth" گویا درِّ نایاب کی مانند ہے جس کا ہر لفظ ایک موتی ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد قاری بحرِ علم وادب میں غوطہ زن ہو جاتا ہے اور پھر پوری طرح سیراب ہو کر ہی ابھرتا ہے۔ اس طرح کی کتابیں اپنی نوعیت میں بے مثال ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی اور اس طرح کے ترجمے کی کتاب شاذ ونادر ہی نظر آتی ہے۔ محمود احمد کریمی صاحب نے ''قربتوں کی دھوپ'' کا شاہکار ترجمہ پیش کر کے باذوق قارئین کے لیے ذہنی تشنگی کی تسکین کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ کتاب کی مشمولات میں "Translator's Note", "Foreword", "Hymn", "Encomium", "Amatory Verses", "Free Amatory Verses", "Verses" شامل ہیں۔

Translator's Note یعنی عرضِ مترجم میں کریمی صاحب نے ڈاکٹر امام اعظم صاحب کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس طرح ترجمہ کیا ہے جیسے زمرد کے تختے میں ہیرے جڑے ہوں۔ Translator's Note کے آخری پیراگراف میں یوں لکھتے ہیں:

> "His poetry anthology "Qurbaton Ki Dhoop" has been rendered by me in English. Now it is on our esteemed readers who could say how far I have been successful in my endeavour."

اس حسین پیرائے میں جہاں وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے جب کہ اپنی کوشش میں وہ کس حد تک کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ قاری پر چھوڑتے ہیں۔ یہ دراصل موصوف کا انکسار ہے۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں ادب میں سوار ہی نہیں بلکہ شہسوار ہیں۔ جن کے ہاتھ میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کا علم ہے اور قاری کے ذہن پر تو گویا اس کتاب کی ورق گردانی کے بعد چودہ طبق روشن ہو جاتا ہے۔

William Wordsworth, P. B. Shelly, Emillie Bronate, Charles Dicken وغیرہ کی کتابوں کو پڑھ کر جہاں سمجھ میں آتا ہے کہ یہ انگریزی ادیب ہیں لیکن کریمی صاحب کی کتاب کی ورق گردانی کر کے سمجھ میں آتا ہے کہ موصوف ادیب ومترجم کے ساتھ اچھے اسلامک اسکالر بھی ہیں۔ صفحہ: ۲۹ میں نعتِ سرورِ کونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ شاندار اور خوبصورت انداز میں کیا ہے:

کیا کچھ نہ انقلاب ہوئے انؐ کی ذات سے
ذرّے بھی آفتاب ہوئے انؐ کی ذات سے

His personality brought about innumerable revolutions

His personality caused particles to become like the sun

صفحہ: ۱۰ ار پر پروفیسر نظیر صدیقی کتاب کے ''پیش لفظ'' میں یوں لکھتے ہیں کہ Charles Dickens کی طرح امام اعظم صاحب بھی بہت نشیب وفراز سے گذرے۔ والدہ کی بے وقت موت نے ان کی زندگی میں گویا ایک انقلاب پیدا کر دیا اور یہ ذہن ودل کے کرب کا ہی نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر امام اعظم صاحب ایک شاعر اور ادیب کے روپ میں نمودار ہوئے۔ یہ بالکل حقیقت ہے۔ ایک varifiable fact ہے۔ شاعری جذبات کی عکاسی ہے۔ احساسات کی ترجمانی ہے۔ شاعر جس نشیب وفراز سے گذرتا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر جتنے حادثات رونما ہوتے ہیں، اس کا گہرا نقش اس کے ذہن ودماغ میں ہوتا ہے۔ ان ہی جذبات میں الفاظ کے گوہر پروکر شاعر یا ادیب کے روپ میں خود کو پیش کرتا ہے جیسا کہ کسی شاعر کا شعر ہے:

شدتِ غم نے مارا تو شاعر بنا — جو ملا نہ سہارا تو شاعر بنا
میں تلاطم سے لڑتا رہا عمر بھر — جو ملا نہ کنارا تو شاعر بنا

جو زخم اس کے ذہن ودماغ میں ہوتے ہیں وہ فراموش نہیں کیے جا سکتے اور شعراء وادباء اس کو ہی خوبصورت اور حسین پیرائے میں رقم کرتے ہیں۔ شاعری دراصل زندگی کے تلخ حقائق، تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ کریمی صاحب نے اس امر کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"Likewise mother's premature death & few other incidents are nigth-marishness for Dr. Imam Azam who has taken the help of different genres of Urdu poetry for outpouring..."

صفحہ: ۷۱ پر ایک خوبصورت غزل کا ترجمہ بڑے ہی حسین انداز میں پیش کیا ہے جس کے پڑھنے سے ڈاکٹر

امام اعظم صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ موصوف بیک وقت ایک شاعر اور ادیب ہیں اور اس پر کریمی صاحب نے اس کا ترجمہ خوبصورت اور جامع الفاظ میں کیا ہے۔ یوں کہیے کہ یہ خوبصورت غزل گویا آبِ زر سے لکھی گئی ہو۔ شعر ترجمے کے ساتھ ملاحظہ کریں:

میری آنکھوں کی چمک ایک ستارا زہرہ
اور تنہائی کی شب کا ہے سہارا زہرہ

The brightness of my eyes 'O' star like Zohra

'O Zohra! You are helper at night's loneliness

میری خوابیدہ امنگوں کو سہارا دے کر
دل کے جذبات کو پھر تم نے ابھارا زہرہ

Fostering support to my dormant ambitions

O' Zohra! You did enliven again the spirit of my heart

ان سے کہہ دیجیے اعظم کہ تمہاری خاطر
دل تو کیا چیز ہے میں جان بھی ہارا زہرہ

O' Azam! Tell her that for her sake

O' Zohra! I resolved to lay down life what to talk of heart

صفحہ: ۱۰۱-۱۰۲ ار پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نذر ایک نظم کا ترجمہ باذوق قارئین کی فن شناس نظروں کے حوالے کرتی ہوں:

کہ فلسفہ لسان کو روشنی سے بھر دیا

He filled philosophy of language with utmost knowledge

آ گہی سے بھر دیا

They furnished vast information and knowledge

اور متنِ شعر کو تکثیریت سے آشنا بھی کر دیا

Text of poem could be acquainted with Pluralism

پر اس نئے مکالمے کو اردو ئی جہان میں

But the new dialogue in the domain of Urdu

راستہ دکھا دیا، راہ پر لگا دیا

Shown the way and let to follow path

وہ کون ہے، وہ کون ہے؟

Who is he, who is he?

کہ جس نے بند روزنوں کو کھول کر

Who, having opened the closed ventilator

دلیل اور ثبوت سے بتا دیا

He convinced by means of proof and agrument

کہ شعریت خلوص ہے

That poetic element is cordiality

کہ شعریت شعور ہے

That poetic element is consciousness

وہ کون ہے؟

Who is he?

کہ جس نے صوت و شعریت سے آشنا کرا دیا

Who acquainted us with sound and poetic element

مجھے بھی اس کی آگہی کا ذائقہ چکھا دیا!

I too could taste it's knowledgeable insight!

گویا اس کتاب کا ترجمہ کر کے ادب کا دائرہ وسیع کیا اور گنجینۂ علم لٹا دیا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میں خود کو ایک ایسی جولان گاہِ ادب میں تصور کرتی ہوں جو اردو اور انگریزی کا منارۂ نور ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں تو کیا مجھ جیسے ہزاروں طلبا و طالبات کے لیے مستقبل میں اردو اور انگریزی ادب کے ساتھ Islamic Philosophy کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ انشاءاللہ!

آج کے اس پرُ آشوب دور میں اردو کے فروغ اور بقا کے لیے اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے ترجمہ نگاری بے حد ضروری ہے تاکہ اردو کا دائرہ صرف اردو والوں تک محدود نہ رہے بلکہ دوسری زبانوں کے جاننے والے بھی اس شیریں زبان کے ادب اور ثقافت سے آشنا ہوں۔

زیرِ نظر کتاب "Proximal Warmth" کے مطالعے سے جہاں "قربتوں کی دھوپ" کے شاعر ڈاکٹر امام اعظم سے وابستگانِ انگریزی ادب بھی واقف ہوں گے وہیں وطنِ عزیز ہندستان کے علاوہ غیر ممالک میں بھی امام اعظم صاحب کے حوالے سے ادب کو سمجھنے اور پڑھنے کا موقع ملے گا۔ میں نے اس کتاب کو بغور پڑھ کر اپنا تاثر پیش کیا ہے ورنہ سیّد محمود احمد کریمی صاحب کے لیے کچھ لکھنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

....

Mobile : 9883014034 / Whatsapp : 9088470916
E-mail : muzaffarnaznin93@gmail.com

پرویز طاہر

مصطفےٰ اکبر: شخص وشاعر

مصطفےٰ اکبر اردو شعر وادب کا ایک اہم اور معتبر نام ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر، صاحبِ طرز نثر نگار اور منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ 'قلم معتبر ہے' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ نثر میں ان کی دو کتابیں۔ ''افکار سے اظہار تک'' اور ''شاکر کلکتوی: حیات وفن'' شائع ہو چکی ہیں۔ اول الذکر کتاب تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس کی اشاعت مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۹۰ء میں ہوئی۔ آخر الذکر کتاب جانشینِ وحشت طاہر علی شاکر کی حیات وخدمات پر ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ۲۰۱۶ء میں مونوگراف کے طور پر شائع کیا۔ مذکورہ کتابوں کی اشاعت سے ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت پورے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے متعدد مضامین رسالہ ''مغربی بنگال''، ''روحِ ادب''، ''آبشار''، ''تمثیلِ نو'' اور دیگر رسائل وجرائد میں شائع ہوئے جو کتابی شکل میں شائع ہونے کے منتظر ہیں۔ ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کو سبھوں نے سراہا ہے۔ سالک لکھنوی اپنی کتاب ''مغربی بنگال میں اردو نثر: ماضی تا حال'' میں لکھتے ہیں:

> ''...... مصطفےٰ اکبر شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ انگریزی اور بنگلہ زبانوں سے اردو میں ترجمہ بھی خوب کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں یا ایک نثر نگار۔ ان کی نظمیں جاندار ہوتی ہیں اور مضامین میں زبان کا انداز وطرزِ بیان شگفتہ ہوتا ہے۔......'' (صفحہ:۳۷۳)

مصطفےٰ اکبر کا اصل نام محمد مصطفےٰ ہے۔ وہ یکم رجولائی، ۱۹۵۸ء کو کولکاتا میں پیدا ہوئے۔ پارک سرکس ہائی اسکول سے ۱۹۷۵ء میں ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کیا۔ مولانا آزاد کالج سے ۱۹۷۸ء میں بی اے آنرز کی ڈگری اور ۱۹۸۱ء میں کولکاتا یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۹۸۳ء میں حکومت مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات و ثقافتی امور، رائٹرس بلڈنگس میں شعبۂ اشاعت سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۸۷ء میں رسالہ 'مغربی بنگال' کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں محمد اعظم صاحب کی سبکدوشی کے بعد وہ مغربی بنگال کے مدیر ہوئے۔ ۲۰۰۲ء میں ترقی پا کر اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کے گزیٹیڈ رینک پر فائز ہوئے۔ ۲۰۱۸ء میں ایڈیٹر آف پبلی کیشن کے فیڈر پوسٹ پر ترقی ہوئی لیکن ڈیپارٹمنٹ نے مغربی بنگال کی اشاعت کی ذمہ داری بحال رکھی۔ وہ اب بھی اس کے مدیر کی حیثیت سے اپنی خدمات بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے مدیر کی حیثیت سے رسالہ 'مغربی بنگال' کے کئی اہم خصوصی شمارے شائع کیے جن میں کبیر نمبر، امیر خسرو نمبر، پریم چند نمبر، عصمت چغتائی نمبر، سجاد ظہیر نمبر، ع۔ رشید نمبر، ٹیگور نمبر اور فیض نمبر کافی مقبول ہوئے۔ ان کی ادارت میں رسالہ 'مغربی بنگال' کے عام شمارے کا معیار کافی بلند ہوا ہے۔

مصطفےٰ اکبر اپنی عملی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی حلقۂ شعر وادب میں مقبول ہیں۔ وہ تقریباً ۱۵ ربرسوں تک کلکتہ کے قدیم ترین ادبی ادارہ ''بزمِ احباب'' کے جنرل سکریٹری رہے۔ یہ دور اس بزم کا زرّیں دور تھا۔ اس دور میں ہر ماہ پابندی کے ساتھ ماہانہ جلسے ہوئے۔ کئی اہم پروگرام ہوئے۔ اس کی سالانہ پکنک کے پروگراموں کو آج بھی احباب

یاد کرتے ہیں۔وہ فی الحال ''بزم شاکری'' کے سکریٹری ہیں جہاں ان کی قیادت میں ہر ماہ ادبی جلسہ و مشاعرہ پابندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ وہی بزم ہے جس کے بارے میں علامہ رضا علی وحشت نے اپنی ایک غزل میں کہا تھا:

خوب ہے بزمِ شاکری وحشت
جس کو با فیض و با اثر دیکھا

مصطفےٰ اکبر بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ہوا۔اسی سال وہ بزم شاکری کے ممبر ہوئے اور شاکر کلکتوی کے شاگردِ رشید نور کلکتوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا لیکن یہ سلسلہ کافی مختصر رہا۔اس کے بعد انھیں مولانا آزاد کالج، کولکاتا میں پروفیسر شاہ مقبول احمد، پروفیسر فخرالدین اثر صدیقی، پروفیسر اعزاز افضل اور پروفیسر نصر غزالی جیسے اساتذہ کرام کے زیرِ تدریس شعر و ادب کی باریکیوں کو سمجھنے کے بہترین مواقع ملے۔شاعری میں مذکورہ اساتذہ نے ان کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ان کی صحبت میں وہ فنِ شاعری کے اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہوئے اور زبان و بیان پر عبور حاصل کیا۔اردو کے کلاسیکی شعرا کے کثیر مطالعہ نے انھیں زبان و بیان کی اعلیٰ روایت کو سمجھنے اور برتنے کا پختہ شعور عطا کیا ہے:

کیوں روٹھ گئے ہم سے کیا بات کہی ہم نے — کچھ یاد نہیں ہم کو اب مان بھی جاؤ تو
چہرے کو گل اور بدن کو گل کدہ کہنا پڑا — دیکھ کر تیرا سراپا مرحبا کہنا پڑا
ہم کہ آداب، محبت کی نہ حد سے جا سکے — بے وفا کو بھی ادب سے باوفا کہنا پڑا

ان کی شاعری کی عمارت اگر چہ کلاسیکی شاعری کی بنیاد پر قائم ہے لیکن ترقی پسند شاعری کے رجحانات اور فنی کمالات کے رنگ و روغن شاعری کی اس عمارت کے ہر در و دیوار پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

حق پرستی کا جنوں کچھ مجھ پہ یوں طاری ہوا — آج اپنے دوش پر اپنا ہی سر بھاری ہوا
نہ اور حوصلۂ صبر و برد باری دے — ستم نصیبوں کو توفیقِ ضرب کاری دے
کب ڈوبیں گے دکھ درد کے دل سوز مناظر — کب ابھرے گا جنت کا نشاں شہر میں تیرے
کب ہو گی میسر ہمیں آزادئ کامل — کب ٹوٹے گی زنجیرِ گراں شہر میں تیرے

کلاسیکی شاعری کی گراں قدر روایتوں اور ترقی پسند شاعری کی اعلیٰ قدروں کی آمیزش سے ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے۔

ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ نظم نگاری کا رجحان رکھتے ہوئے بھی انہوں غزل گوئی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔وہ غزل کے کلاسیکی مزاج سے بخوبی واقف ہیں اس لئے وہ غزل کی تخلیق میں اس کے حسن کو نکھارنے کے لئے فنی لوازمات کو برتنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔غزل اور اس کے حسن سے لگاؤ نے ان کے اشعار میں معنویت کے ساتھ لطافت، نفاست اور طراوت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

نظم کے صحرا سے جب تیری زمیں پر آ گئے
اے غزل مجھ کو بھی کیا کیا شوقِ گلکاری ہوا

ان کی سخت مزاجی بھی غزل کے نرم لہجے میں ڈھل کر ترنم ریز ہو جاتی ہے:

چہرے کو مہتاب آنکھوں کو کنول کہنے لگا　　واہ رے تیرا تصور، میں غزل کہنے لگا
سخت گو شعلہ بلب یہ مصطفےٰ اکبر بھی اب　　اس کی شانِ حسن میں رنگیں غزل کہنے لگا

ان کی غزلوں میں اعلیٰ و معیاری اشعار کی بھرمار ہے جو ان کی بلند خیالی و پختہ کلامی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ان میں زبان کی تہذیب بھی ہے اور فکر کی مرتبت بھی، شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے شعلے کی حدت بھی خارجی اثرات بھی ہیں اور داخلی کیفیات بھی۔ تمام کلام میں کلاسیکی شاعری کا رکھ رکھاؤ اور ترقی پسند شاعری کا تانا بانا ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

چلو کہ پوچھ لیں کب ہو گا زخم دل کا حساب　　مزاجِ یار میں تھوڑی سی برہمی کم ہے
جلاؤ دل کہ مٹے تیرگی کدورت کی　　چراغِ دیر و حرم میں تو روشنی کم ہے
گردشِ پیہم سے لرزاں تیرے بندوں کا نصیب　　جب زمیں ہلکی ہوئی تو آسماں بھاری ہوا
آبلہ پا زیست کی حرماں نصیبی کچھ نہ پوچھ!　　اک مسافت طے ہوئی تو اک سفر جاری ہوا

مصطفےٰ اکبر کی نظمیں بھی ان کی غزلوں کی طرح جاندار و شاندار ہوتی ہیں۔ سلاستِ زبان، زورِ بیان اور حسنِ تسلسل کی وجہ سے ان کی نظمیں پر تاثیر اور زور آور ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں ترقی پسند شعرا کے اثرات نمایاں ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے وہ اپنی نظمیہ شاعری میں فیض احمد فیض سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں کا تیور بھی فیض اور ساحر کی طرح اثر انگیز ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں اپیل کرتی ہیں اور تاریک و پر خطر راہوں میں بھی آمادۂ سفر کرتی ہیں۔ زندگی کا حوصلہ اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم ان کی تقریباً سبھی نظموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ سماجی مسائل اور سیاسی ریشہ دوانیوں سے پریشان ضرور ہیں۔ انہیں انسانی رشتوں کے ٹوٹتے بکھرتے عوامل کا دکھ ضرور ہے لیکن وہ حالات سے مایوس نہیں ہیں بلکہ حالات کو بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ پر امید ہیں کہ حالات ضرور بدلیں گے اور ایک روشن مستقبل کا خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا:

اب کے تو میری جان عجب آیا ہے موسم　　ہے صحنِ چمن زار میں ویرانی کا عالم
ہے پھول نہ مہتاب نہ جگنو نہ ستارے　　اب کس کو ترے حسن سے تعبیر کریں ہم
مایوس نہ ہو آئے گی پھر فصلِ بہاراں　　اے روحِ سخن، جانِ غزل، حسنِ شعرستاں
پھر لالہ و گل مہکیں گے، پھر شام سجے گی　　جلوؤں سے ترے لیلِ سیہ فام سجے گی
پھر آئے گی معشوق صفت صبحِ درخشاں　　اے روحِ سخن، جانِ غزل، حسنِ شعرستاں

(امیدِ سحر)

اے مرے دیدۂ تر!
ایسے دل گیر نہ ہو، تھوڑا سنبھل، تھوڑا ٹھہر
وقت کے ساتھ برے دن بھی گزر جائیں گے
زخمِ دل جتنے بھی ابھرے ہیں وہ بھر جائیں گے

غم نہ کر گم جو ہوا چاند ستاروں کا نگر
دل میں قائم ہے اگر جذبۂ الفت کا اثر
شب کے پردے سے نکل آئے گی لیلیٰ سحر
اے مرے دیدۂ تر!

(اے میرے دیدۂ تر)

ان کے علاوہ 'نئے چراغِ سحر کی خاطر'، '۲۶ جنوری'، 'کرب زدہ لمحے'، 'چلو لوٹ چلیں'، 'سفر ہے شرط'، 'قلم معتبر ہے'، 'آج بھی' وہ نظمیں ہیں جو شاعر کی اعلیٰ فنی اور فکری بصیرت کا پتہ دیتی ہیں۔ 'نئے چراغِ سحر کی خاطر'، 'اے مرے دیدۂ تر' اور 'امیدِ سحر' وہ نظمیں ہیں جن میں فیض احمد فیض کی نظموں کا اسلوب اور تیور دونوں نمایاں ہیں۔ حسنِ تسلسل اور زورِ بیان ان نظموں کا وصفِ خاص ہے۔ ''قلم معتبر ہے'' شاعر کی بہت اچھی نظم ہے جس میں قلم کی عظمت اور قلمکاروں کی طاقت کی اہمیت کو فنکارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے:

قلم معتبر ہے، قلم معتبر!/قلم وجہِ تحریک فکر و نظر/قلم فتحِ بابِ علم و ہنر/قلم معتبر ہے، قلم معتبر!
قلم کے سبب زندگی سرخرو/قلم جب تلک ہے اچھالو لہو/قلم ہے تو حق کی صدا کو بکو/قلم معتبر ہے، قلم معتبر!

المختصر! مصطفیٰ اکبر نے نہ صرف اردو کے مختلف اصنافِ ادب میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں، بلکہ ادبی انجمنوں کے ذریعہ اردو شعر و نثر کے فروغ میں بھی باعمل ہیں۔ امید قوی ہے کہ ان کی بقیہ تحریریں بھی جلد منصۂ شہود پر آجائیں گی۔

☆☆☆

گیسٹ لیکچرار، شعبۂ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، سیالدہ، کولکاتا-۹ (مغربی بنگال)

طلعت انجم فخر

''میراثِ غزل'' کا وارث: احسان ثاقب

ایک مدت سے احسان ثاقب کے بارے میں کچھ رقم کرنے کی آرزو میرے قلب کے نہاں خانوں میں انگڑائیاں لے رہی تھی لیکن ہمیشہ یہ مشکل مانع آجاتی تھی کہ احسان ثاقب جیسے پر گو، متنوع غزل اور نظم گو کے بارے میں تحریر کی ابتدا کہاں سے کی جائے بالخصوص ان کا اچھوتا اسلوبِ نگارش آڑے آجاتا تھا اور ذہن پر یہ بات گراں گذرتی تھی کہ آخر سورج کو چراغ کیوں کر دکھایا جائے۔ یقین جانیں کہ جب کبھی موصوف کی کوئی بھی تحریر راقم کی نذر ہوئی تو یوں لگا کہ یہ محض تحریر نہیں بلکہ الفاظ و معانی کی ایک حسین تصویر ہے جسے موصوف نے اپنے نظام اعصاب کے رگوں میں بہنے والے خون کے چھینٹوں سے اور رنگین بنا دیا ہے ساتھ ہی کماحقہ مجھے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ نہ معلوم وہ الفاظ کہاں سے لاتے ہیں۔ ان کے ذہنی اُپج کے نتائج ہوتے ہیں یا پھر عمیق مطالعے کے ضامن مذکورہ تمام باتیں اپنے آپ قلم کی نوک سے کاغذ کے کینوس پر عیاں نہیں ہوئیں بلکہ اس کے لئے راقم نے احسان صاحب کی نظموں، غزلوں اور تنقیدی مضامین کو کھنگالا اور نچوڑا ہے تب کہیں جا کر بوند بوند سے تالاب بھرا ہے کہ وہ بیک وقت ایک عمدہ شاعر، نثار و نقاد ہیں۔ احسان صاحب ادب عالیہ کے جس در پہ بھی ٹھہرے وہاں سے انہوں نے نئے امکانات و رجحانات کے کئی در وا کئے خواہ وہ تنقید ہو یا تحقیق، شعری جہات ہوں یا پھر نثری اسالیب ہر جگہ وہ منفرد و یگانہ دکھائی پڑتے ہیں۔ میرے خیال سے انہوں نے الفاظ و معانی کا یہ خوبصورت رنگ و آہنگ کہیں سے مستعار نہیں لیا ہے بلکہ وہ ان ذخائر کے خود سوداگر ہیں اور ساتھ ہی اس کی ادائیگی کے کیمیا گر بھی ہیں۔ اس زمرے میں ان کے تنقیدی مضامین کافی کھرے اترتے ہیں۔ موصوف صاف گو طبیعت اور بے باک ذہنیت کے مالک ہیں۔ وہ رس گلے میں ڈال کر زہر کھلانے کے عادی نہیں بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں۔

جس کا احساس انہیں کسی شاعر کے اس شعر کی مانند پر جوش عزم و حوصلے سے ہم کنار کرتا ہے کہ :

فن کار کی عظمت کو جو سمجھا نہیں کرتے ہم بزم میں ان کی کبھی جایا نہیں کرتے

یہ تو تنقید کا قصہ تھا موصوف افسانہ نگاری کے کوچے سے بھی نا آشنا نہیں۔ اُن کے طوفان زا تخلیقی جوش کے باعث ان کی انتہا تو انتہا ابتدا پر بھی ہاتھ رکھنا مشکل و دشوار امر ہے۔ وہ سست گامی کے پرستار نہیں تیز گامی کے دلدادہ ہیں۔ گو عادتاً وہ اس شعر سے مربوط نظر آتے ہیں :

اس کی فطرت میں پانی کی تاثیر ہے ڈھونڈ لیتا ہے خود راستہ آدمی

مذکورہ تمام نکات کی روشنی میں میرے دیرینہ شوق کو ایک راہ ملی اور میں نے احسان صاحب کے حوالے سے چند سطور رقم کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ ہر چند کے احسان ثاقب پر تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں اور ان کی غزل گوئی، نظم نگاری اور افسانوی جہتوں پر بھی لوگوں نے حسب توفیق گفتگو کی ہے جس سے ان کے فنی محاسن کا بھرپور محاسبہ ہوتا ہے پر اب دیکھنا یہ ہے کہ راقم کی یہ تحریر انہیں مزید جلا بخشنے میں کامیاب ہوتی ہے یا پھر......

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۴؍جون ۲۰۱۴ء کو استاذی محترم ڈاکٹر عشرت بیتاب کے توسط سے ہوئی جب عشرت سر نے مجھ سے کہا کہ ''چلو آج میں تمہیں ایک ایسے ادبی شہسوار سے ملاتا ہوں جس نے کئی برسوں تک آسنسول کے ادبی ایڈیشن کو اپنی تحریری پیش کش سے سجایا اور سنوارا ہے۔ بس کیا تھا میں نے فوراً ان کی خواہش پر لبیک کہا اور پھر ہم دونوں احسان صاحب کی رہائش گاہ پہنچے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم نے انہیں پر تپاک لہجے میں سلام کیا: ''السلام وعلیکم''

''وعلیکم السلام اور کہیے عشرت صاحب کیسے ہیں؟ ساتھ میں یہ محترمہ کون ہیں؟'' موصوف نے سلام کے جواب پر سوالی پرت چڑھا کر ہماری طرف اچھالا۔

''الحمدللہ اور یہ انجم ہے گویا طاعت انجم فخر۔'' سر نے بڑی سنجیدگی و متانت سے جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں انجم ہے گویا طاعت انجم فخر کا کیا مطلب؟'' احسان صاحب نے برجستہ پوچھا۔

''انجم سے مراد انجم آرا اس کا نام ہے اور ادبی حیثیت سے طاعت انجم فخر کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔'' عشرت سر نے تفصیل بتائی۔

''مطلب لکھتی اور چھپتی ہو؟'' احسان صاحب براہِ راست مجھ سے مخاطب تھے۔

''جی لکھا تو بہت ہے پر اب تک کچھ شائع نہیں کروایا۔'' میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں، اب تک چھپی کیوں نہیں؟'' احسان صاحب نے پھر سوال داغا۔

''بس یوں ہی کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''عشرت بھائی اس کی تعلیم کتنی ہے؟'' احسان صاحب میرے حوالے سے عشرت سر سے مخاطب ہوئے۔

''ایم۔اے۔ (اردو) ساتھ میں ادب اور گرامر کا خاصا فہم بھی رکھتی ہے۔ اگر آپ اس کی تحریریں پڑھ لیں تو بصد شوق آپ بھی اس کے شیدائی ہو جائیں۔'' سر نے میری شان میں قصیدے پڑھے جس سے سر کے خلوص و ہمدردی کے پیش نظر لمحے بھر کو میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

''اگر ایسا ہے بیٹا تو ذرا مجھے بھی کچھ سنا دو تا کہ میں بھی پرکھ سکوں۔''

پہلے پہل تو میں گھبرائی پر موصوف میری گھبراہٹ تاڑتے ہوئے براہ راست مجھ سے گویا ہوئے۔ ''گھبراؤ نہیں بیٹا سمجھو میں بھی تمہارا استاد ہوں۔''

ان کی اس بات سے مجھ میں تھوڑی ڈھارس بندھی اور میں نے اپنی ایک نظم جو''جہیز'' کے حوالے سے تھی انہیں سنائی:

آہ ! آخر اے مسلماں آہ آخر کب تلک — شان وشوکت، جھوٹی عزت اور طاقت کب تلک

فاطمہ زہرہ ، سکینہ اور زینب کی یہ نسل — یوں ہی بکھری جاتی ہے اور ان پہ فرقت کب تلک

چند اشعار سنتے ہی وہ عشرت سر سے ہم کلام ہوئے۔ ''عشرت بھائی مجھے یقین ہے کہ یہ ادب میں اپنا ایک منفرد مقام بنائے گی کیونکہ اس میں مفاہیم وتراکیب کا وہ ہنر ہے جو سونے کو کندن بناتا ہے بس آپ اسے راستہ دکھاتے جائیے۔'' اور پھر مجھ سے گویا ہوئے۔ ''جب کبھی بھی کہیں بھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو بلا جھجک مجھے یاد کرو۔''

اور اپنا فون نمبر مجھے بطورِ خاص عنایت فرمایا۔ بس کیا تھا اس دن سے میرے اور احسان ثاقب کے مراسم استوار ہو گئے اور آج تک وہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ موصوف وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشورے سے میرے ذہن کو نمو بخشتے رہتے ہیں۔

احسان ثاقب ادبی افق پر شہاب ثاقب کی مانند درخشندہ و تابندہ ہیں۔ یوں تو انہوں نے ادب کے ہر چھوٹے بڑے اصناف پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن یہاں میرا موضوع ان کی شعری جہات کی تک بندی ہے جس کا شوق مجھ میں تب پنپا جب انہوں نے اپنا شعری مجموعہ ''لمبی چپ کا شور'' بطور تحفہ مجھے پیش کیا۔ حالانکہ موصوف نے اپنی یہ نگارش مجھے ۲۰۱۵ء میں بھینٹ کی تھی اور ساتھ ہی میری نئی زندگی کے استقبال کے حوالے سے ایک طویل نظم بھی بطورِ خاص نذر کی تھی مگر وقت اور مصروفیات کی کوتاہی کے سبب میری تحریر بھی ایک لمبی چپ کے شور کا ضامن ہو گئی۔

احسان ثاقب اپنی شعری روایت کی ابتدا کے حوالے سے مجموعہ ''لمبی چپ کا شور'' میں شامل عرض احوال میں خود رقم طراز ہیں :

> ''تک بندی میں نے ۱۹۶۰ء سے شروع کی تھی یہ جانے بغیر کہ آگے بڑی گہری کھائی ہے لیکن برسوں میں یہ کھیل کھیلتا رہا۔ کچھ اہل نظر نے کہا بھی کہ شاعری بچوں کا کھیل نہیں مگر اس خیال سے کہ کبھی تو دیوانگی شعور سے ہم آہنگ ہو گی۔''

احسان ثاقب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن کارانہ تخیل سے تخلیقی احساس و اظہار کو نئی شکل عطا کی ہے۔ موصوف نے بیشتر شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی شاعری میں جو جمالیاتی پیکر تراشی ملتی ہے وہ ان کے حواس کی فعالیت اور اظہار کی قوت کا بیّن ثبوت ہے۔ احسان ثاقب میں بے پناہ تخلیقی وفور اور جوش ہے۔ ان کی تخلیقی توانائی نعتوں، حمدوں، دوہوں، غزلوں غرض ہر صنف میں ہوئی ہے۔ ان کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو اپنے لفظی اور فنی دروبست کے اعتبار سے نہایت مستحکم اور توانا ہیں ان کی غزلوں میں رمزیت، ایمایت اور معنوی تہہ داری ہے۔ معنوی بلاغت، صوتی لطافت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے ان کی شاعری معتبر اور مستند ہے۔ بالخصوص ان کی غزلیں سادگی، ترنم شیرینیت اور کیف و سرور کی بدولت لائق توجہ ہیں۔ ان کے لب و لہجے میں ایک عالمانہ وقار اور احساسات میں طہارت پائی جاتی ہے۔ آپ تصوف اور معرفت کے موضوعات کو بھی نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ انہوں نے زمانے کی تلخ حقیقتوں کو بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے برتا ہے۔ حالانکہ کہیں کہیں ثقالت محسوس ہوتی ہے مگر اس سے ان کے فن کی حیثیت مجروح نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر مکتبۂ فکر کو متاثر کرتی ہے۔ اردو شاعری میں ایک نئی سمت کی نشاندہی کرنے میں اور نت نئے تجربوں کے لئے فضا ہموار کرنے میں جن لوگوں کا ہاتھ ہے ان میں احسان ثاقب کا نام بھی حرمت سے لیا جاتا ہے۔ آپ بہت ہی سلجھے ہوئے انسان اور سنجیدہ مزاج کے حامل شخصیت ہیں۔ بہت ہی سادہ اور پر تکلف زندگی گذارتے ہیں۔ وہ چھوٹی سی چھوٹی بات کو اس ہنرمندی سے شعری پیراہن عطا کرتے ہیں کہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ان کا شعری افق کھلا کھلا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں عروضی رکھ رکھاؤ، زبان و بیان کی احتیاط، اعلیٰ خیالات، الفاظ کی موزونیت، نشست و برخاست، عام فہم تراکیب غرض کہ ایک

اچھی شاعری کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سبھی پائے جاتے ہیں۔ان کے اشعار قاری کے ذہن پر دیر پا تاثر چھوڑتے ہیں۔ندرت، جدت اور تازہ کاری ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ملاحظہ کیجئے ان تمام نکات کی پاسداری کرنے والے اشعار اور داد دیجئے موصوف کی ذہنی آبیاری کو:

وہ آدمی سے فرشتہ بنے خدا نہ کرے — فقط نمائشی چہرہ بنے خدا نہ کرے

نیا موضوع ، نئی سمتیں ، نئے ابہام آتے ہیں — ادب کے سب شعورِ نو غزل کے نام آتے ہیں

سب کے سب تو آج کے اجلے فسانوں میں ہیں گم — سرپھری تہذیبِ نو کا مرثیہ لکھتا ہے کون

اور مزید یہ شعر دیکھئے اپنے اندر کتنی گہرائی اور گیرائی سمیٹے ہوئے ہے:

احباب چیختے رہے ساحل کے آس پاس — دشمن نے ہاتھ بے جھجک اپنے بڑھا دیے

شعری جہات کو جلا بخشنے کے لئے تحقیق وتنقید کا فریضہ انجام دینا بڑی ہی فیروز بختی کی بات ہے اور موصوف اس لحاظ سے خوش قسمت انسان ہیں جنہوں نے ندرت خیال اور معنی آفرینی سے شعری نگارشات میں خوب صورت جلوے دکھائے ہیں۔ان کی غزلیہ شاعری خیال اور جذبے کا حسین امتزاج ہے۔فکر کی تازگی ،شخصیت کی آزادی اور بانکپن ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔انہوں نے ذاتی زندگی کے تجربات ومشاہدات کو اپنے مخصوص پیرائے میں زبان عطا کردی ہے۔

خاموش رہوں گا تو زبان ٹوکے گی مجھ کو — بولوں گا اگر لب مرا فریاد کرے گا

زمانے میں ہر شئے کی افراط ہے — فقط آدمی کی کمی رہ گئی

میں آدمی ہوں فرشتہ نہیں کہ ضبط کروں — نہ اتنا دشتِ الم ناک سے گزار مجھے

اک اذیت نما حقیقت ہے — عمر کا روز مختصر ہونا

دیکھے گا روز خواب نیا بھول جائے گا — وہ آدمی ہے اپنا کہا بھول جائے گا

کھلونوں سے بہل کر تم اقیمی نیند مت سونا — حقائق بھانپ کر ہی کوئی پتھر گھر میں آتا ہے

احسان ثاقب کے دل میں بھی عشق نے انگڑائیاں لیں مگر موصوف نے تہذیب وتمیز کے حصار میں جکڑے اپنے باادب ہونے کا ثبوت پیش کیا۔بطورِ خاص ان اشعار پر غور کیجئے۔آپ خود بخود احاطہ کرلیں گے کہ میری رائے کس حد تک صداقت آمیز ہے:

دونوں ہی تھے وقار کی دہلیز پر کھڑے — بے کیف زندگی میں بھی رس گھولنا پڑا

دے کر رخ امید نہ دے اور چھلاوہ — تو سچ ہے اگر جھوٹ کے خوابوں سے نکل آ

احسان ثاقب کو میں نے اب تک جتنا پڑھا، سمجھا اور پرکھا ہے اس اعتبار سے بلا تامل یہ کہہ سکتی ہوں کہ موصوف کے ذہن میں بے باکانہ رویہ اور سنجیدگی ہم آہنگ ہے۔جس پر انہوں نے رعب اور دبدبے کی ایک دبیز چادر ڈال رکھی ہے۔جس کے اثرات گاہے گاہے ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔مثلاً بیٹیوں کے حوالے سے یہ اشعار دیکھئے:

گرنے مت دینا اے بیٹی اپنے باپ کے سر کی پگڑی — حرص و ہوس کی اس دنیا میں بیٹی سے بیٹا بن جانا
جواں لڑکی اگر بیٹھی ہو گھر میں — پسِ دیوار آنگن بولتا ہے

جہاں ایک طرف وہ بیٹیوں کو دستار بچانے کا مشورہ دے رہے ہیں وہیں دوسری طرف وہ ماں کی عظمت کا بھی اعتراف کر رہے ہیں :

دھوپ کی شدت بن جاتی ہے پل بھر میں ایک ٹھنڈی چھاؤں
جس کے سر پر اپنی ماں کا پیار بھرا آنچل ہوتا ہے

موصوف وطن عزیز کے حالات حاضرہ کا محاسبہ کرتے ہوئے بھی یکسر افسردہ ہو جاتے ہیں اور تب ان کی افسردگی شعری سانچے میں ڈھل کر کاغذ کے کینوس پر یوں رقصاں ہوتی ہے :

ہر کوئی آج خود سے ہی بیزار ہے میاں — کتنی عجیب وقت کی رفتار ہے میاں
جو جانتا ہے جھوٹ برتنے کا ایک ہنر — وہ اس صدی کا صاحبِ گفتار ہے میاں
عدالت بھی جہاں اظہار کی جرأت نہیں رکھتی — سمجھ لیجئے وہاں عیاروں کی سرکار چلتی ہے
نہ کام آئے گی اب سچی گواہی — یہ میرے عہد کا ہندوستاں ہے

اور ان کا مزید یہ شعر تو آج کے عہد میں کیمپوں میں پناہ گزیں مسلمانوں کی زبان کا جاپ دکھائی پڑتا ہے:

وہ کیوں کر سانس بھی لے سکتا ہے آزردہ خانے میں — کہ جس نے زندگی کی بات کی ہے ہر زمانے میں

دورِ رواں میں قوانین وضوابط میں ترمیم تنسیخ کی روز بدلتی ہوئی تصویر سے بیزار ہو کر شاید ثاقب صاحب نے یہ اشعار رقم کیے ہوں گے:

زندہ ہے قانون اگر تو اک مجرم — چادر تان کے سوتا بھی ہے ایسا کیوں
وہ سارے بچ گئے جو چشم دید مجرم تھے — مگر وہ مر گیا جو ان کے درمیان میں تھا

موصوف کے کم وبیش تمام اشعار نے راقم کے ذہن ودل کو جھنجھوڑا ہے ہر چند کہ یہ اشعار پڑھ کر مجھ پر یہ گماں گذرا کہ کہیں یہ اشعار انہوں نے شہنشاہِ وقت کے حوالے سے تو تحریر نہیں کیا ہے اگر نہیں تو پھر آپ خود ان اشعار پر غور فرمائیے اور احاطہ کیجئے کہ واقعی راقم کی یہ رائے بادشاہِ وطن کے شخصی آئینے سے کس حد تک قریب تر ہے :

بقا کا معاملہ جس شخص کے کمان میں تھا — مزاج اس کا کسی اور ہی جہان میں تھا
جنگ پر رکھتے ہیں جو اپنی بصیرت کی اساس — جنگ کیا ہوتی ہے اس کو کربلا دکھلائیے

احسان ثاقب بہت ہی بے باک ذہن کے مالک ہیں اور کسی بھی دلیل کو تبھی پیش کرتے ہیں جب اسے سوچ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں ۔ ان کے اشعار شیرنیت کے ضامن بھی ہیں اور دورِ حاضر کی ترش شدہ سچائی کے مظہر بھی۔ انہوں نے غزل کو وہ آب وتاب اور مختلف النوع لہجہ عطا کیا ہے جو انہیں اپنے معاصرین میں منفرد و یکتا بناتا ہے۔ انسانی ہمدردی، اخوت و بھائی چارگی اور جذبۂ ایثار وخلوص غزل کے اہم اجزاء ہیں جو ہر دل کو متاثر کرتے ہیں۔ جہاں تک غزل کی مقبولیت کا سوال ہے تو وہ اس کی قوتِ تسخیر میں پنہاں ہے۔ غزل عام طور سے محبت اور موضوعاتِ

محبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ظاہر ہے عشق ومحبت کے جذبات آفاقی ہیں۔شاید ہی کوئی دل ایسا ہو جو اس جذبے سے خالی ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہر شخص غزل کے اشعار کو اپنے جذبات واحساسات کا ترجمان وعکاس سمجھتا ہے۔وہ انہیں اپنے دل کی آواز سمجھ کر پسند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محبت زندگی میں بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں ہے۔زندگی میں محبت کے سوا بھی کچھ اور تقاضے ہیں۔غزل زندگی کے اس موڑ پر بھی ہمارا پوری طرح ساتھ دیتی ہے۔اس میں اتنی لچک ہے کہ وہ حالات کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے اور ہر دور کے احساسات وخیالات اور ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔آج کے دور کا انسان بے حد پریشان ہے۔وہ امن وسکون کے چند لمحات کو ترس رہا ہے۔اسے خدا کی اس وسیع دنیا میں کوئی ایسا نہیں ملتا جو اس کا درد بانٹے اور اس کی چارہ گری کرے۔ایسی حالت میں غزل کے اشعار اس کی مسیحائی کرتے ہیں اور اس کا درد بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں نیز یہ اشعار زمانے کے بخشے ہوئے غموں کا مرہم بھی ثابت ہوتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزل محض شاعری نہیں بلکہ ہماری تہذیبی وجذباتی زندگی کا اہم حصہ ہے مذکورہ تمام نکات کی روشنی میں احسان ثاقب غزل کو کئی ایک خانوں میں منقسم کر دیتے ہیں مثلاً غزل، دوہا غزل، آزاد غزل۔کرجاں غزل، سورٹھا غزل، ہمشیرہ غزل، سورٹھا غزل مثلث، غزل نما، کرجاں دوہا اور غزالہ وغیرہ کا ایک ذخیرہ ہے۔

اس زمرے میں سب سے پہلے موصوف غزل کے حوالے سے غزل خواں ہیں کہ :

پھیکے لفظوں کی غزل کا دور اب ثابت کہاں — شاعری کو ایک نئی تفہیم تک اب لایئے
نیا حسنِ معانی چاہتی ہے — غزل اب خوش بیانی چاہتی ہے

احسان ثاقب نے دوہا غزل میں ہندی اور اردو کی کیا خوبصورت آمیزش کی ہے۔مثال دیکھئے:

ثاقب وہی تو ہوتا ہے سچا اور حساس — جس کی جیبھ میں ہوتی ہے نرمی اور مٹھاس

آزاد غزل میں احسان ثاقب صاحب نے کتنے خوبصورت مشورے سے نوازا ہے:

''بچار کھیئے تشخص کا کوئی موہوم نقطہ آج کے ان گرم لمحوں میں یہاں اب جاں بلب اندھے اصولوں کے مسلسل دائروں کا فرق بڑھتا جا رہا ہے''

کرجاں غزل میں موصوف نے کیا خوب تک بندی کی ہے:

ابھی یہ تجربہ ذہنوں کے آس پاس ہی ہے — یہ انجھی بوجھی عداوت بھلی بھلی سی لگی

سورٹھا غزل میں موصوف کے تجرباتی نتائج کی کارفرمائی ملاحظہ کیجئے:

لفظوں کا کردار کچھ اونچا لے جایئے — فن ہوگا گلزار ثاقب قدم بڑھایئے

موصوف کی ہمشیرہ غزل بھی اس زمرے میں پیش پیش ہے:

اس طرح خاموش تو پہلے نہ تھا بوڑھا شجر — اس طرح خاموش کیوں ہے آج کا بوڑھا شجر
گم ہوئی کیسے پرندوں کی صدا معلوم کیا — گم ہوئی کیسے پرندوں کی صدا معلوم ہے

سورٹھا غزل مثلث میں احسان ثاقب کے عزم وحوصلے کو داد دیجئے:

رکھ روشن کردار دنیا سے مت ڈر میاں
گر تو ہے جی دار سا گر بھی کم تر میاں
جیت ملے یا ہار سب اللہ کے سر میاں

غزل نما میں موصوف یوں غزل نمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

دنیا ہی ارتقا دے دنیا ہی پھر گرا دے
دنیا ہی نکتہ چیں ہے

غزالہ کی تیز رفتاری پر بریک لگاتے ہوئے موصوف شعری پیکر میں لفظوں کا خلعتِ فاخرہ یوں عطا کرتے ہیں:

نوکِ زوال پر ہے سمندر کہاں کہاں — پھیلا ہوا ہے کرب کا منظر کہاں کہاں
زیرِ فلک ہے آج بھی انسانیت کی چیخ — سنبھلے گا خاک، خون کا پیکر کہاں کہاں

کرجاں دوہا بھی موصوف کی لفظی شیرینیت سے تشنہ نہیں۔ غور کیجیے:

کرجاں من کے دوار پر رکھ دے وہ تحریر — صدیوں تک ٹوٹے نہیں لفظوں کی زنجیر

غزل مثلث کے تینوں اضلاع کو ناپتے ہوئے موصوف ایک کامیاب شعری ریاضی داں معلوم ہوتے ہیں:

یہ تجربے کا درد ہے فکرِ کہن بدل
اردو زباں کو دیجئے ثاقب نئی غزل
رکھیے قلم کی نوک پر تحقیق و تر کی بات

غزل کی زلفوں کے ہر گرہ کو کھولتے کھولتے موصوف کا ذہن تنقیدی رجحان کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور تب ان کے نوکِ قلم سے اس طرح کے اشعار کی افزائش ہوتی ہے۔

اتنے چہرے میں ہے لپٹا ہوا چہرہ ثاقب — آدمی کی کبھی نہ ذات سمجھ میں آئی
نئے فیشن کی دیکھیں بے نیازی — بھرے بازار میں تن بولتا ہے
کیسے ملے گی بولیے یہ نوکری اسے — فائل میں اس کے اردو کا اخبار ہے میاں
وہ گھر جلا کے روٹی کبھی سینکتا نہیں — اکیسویں صدی کا وہ فن کار ہے میاں

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ احسان ثاقب شعری روایت کی پاسداری کے لئے ایک تیسری آنکھ رکھتے ہیں جو بہت ہی باریک بین ہے بالکل ٹیلی اسکوپ کی طرح جسے عرش سے ایک چیونٹی بھی با آسانی دکھائی پڑتی ہے۔ موصوف کی قوتِ بینائی بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ وہ عمر کے اس پڑاؤ میں بھی کافی حساس ہیں۔ ان کے نزدیک عام فہم باتیں بھی خاص الخاص کا درجہ رکھتی ہیں کیوں کہ اسی سے وہ اپنا شعری خمیر تیار کرتے ہیں۔

احسان ثاقب کی فنی چابک دستی پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی یوں تحریر فرماتے ہیں:

''احسان ثاقب اختراعی ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے شعری سرمائے پر نگاہ ڈالیں تو وہ بے کراں وسعتیں پہن کر عصر کے ہم سفر نظر آتے ہیں۔''

مناظرِ افسانہ کے پیکر تراش ڈاکٹر عشرت بیتاب موصوف کے فکروفن پر یوں رائے دہانی کرتے دکھائی پڑتے ہیں:

''انہوں نے بڑی ریاضت کے ساتھ اپنی شاعری کو اپنی آواز کا نقش بنایا ہے جو قاری کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ کچھ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کے تجربے میں تنوع اور مشاہدے میں دور بینی ہے۔ موصوف آج بھی اپنا اسلوب، اپنا لہجہ اور اپنی آواز کی تلاش میں سر گرداں نظر آتے ہیں۔''

دورِ حاضر میں تمام ادبی رسالوں کی امامت کرنے والا رسالہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ کے مدیر اعزازی ڈاکٹر امام اعظم احسان ثاقب کی ادبی حیثیت کا یوں محاسبہ کرتے ہیں:

''ان کی شاعری میں تخیل کے نئے پیکر دھنک احساس لفظوں میں پنہاں ہیں نیز گہری معنویت کے ساتھ جدت اور انفرادیت کو بھی انہوں نے پیش نظر رکھا ہے۔ ایمائیت اور اشاریت سے بھی انہوں نے کام لیا ہے اور جزئیات نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔''

اور ایک شعر میں موصوف خود اپنے بارے میں رقم طراز ہیں:

ثاقبؔ بڑا ہی سچا قلم کار ہے میاں رکھ دیتا ہے چپ چاپ حقیقت کا آئینہ

احسان ثاقب ایک باکمال، باوقار اور باصلاحیت فن کار ہیں جس کی پختہ دلیل ان کی تحریری کاوش ''لمبی چپ کا شور'' کے ہر صفحے کی ورق گردانی سے حاصل ہوگی۔ درحقیقت مجموعہ ''لمبی چپ کا شور'' ان کے نصف صدی کی مشق سخن کا ثمرہ ہے جو طویل مدت تک فن کی بھٹی میں تپ کر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے طویل تجربات و مشاہدات کو بڑے سلیقے سے شعری پیکروں میں ڈھال کر اسے ''لمبی چپ کا شور'' سے معنون کر دیا ہے۔ مذکورہ انتخاب کے عمیق مطالعے کے بعد راقم کو ایسا لگا گویا موصوف ایک طویل مدّت تک دنیا کی چکا چوند سے بیزار اپنے شعری سفر میں سرگرداں رہے۔ مگر دوسرے ہی پل جب اشعار کی معنویت اور تہہ داری کا خیال آیا تو راقم کے خیالات میں بھی جنبش ہوئی اور پھر ذہن اس نکتے پر آ کر ٹک گیا کہ ثاقبؔ صاحب نے اپنی فکری بصیرت اور فنی ضیا پاشیوں سے سرزمین غزل کو منور و معطر کیا ہے جو قاری کو دعوت فکر دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس نگارش میں ایسے ایسے اشعار قلم بند کئے ہیں جو یقیناً سننے والوں کے دل پر ایک اچھوتا تاثر پیدا کرتے ہیں کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اور احسان ثاقب کی شاعری میں معنویت کا وہی گہرا رنگ پوشیدہ ہے۔ ان کی شاعری کی اساس اخلاقی اقدار ہے جس پر آئندہ نسلوں کی تعمیر و تربیت مقصود ہے۔ آج فرد اور معاشرے کے بکھرتے اور ٹوٹتے رشتوں کی استواری کے لئے احسان ثاقب جیسے بزرگ اور معتبر شاعر کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ ان کے قلم میں اور جولانی دے۔

اخیر میں راقم ان کے شعری محاسن کی کسوٹی پر انہیں کے فن کو پرکھتے ہوئے مضمون ختم کرتی ہے کہ:

قلم خاموش ہے فن بولتا ہے یہ کیسا دور ہے احسان ثاقبؔ

☆☆☆

امان پیلس، نزد ایولائنس اقراء اسکول، نیا محلّہ، آسنسول-۱۳۳۰۲-۷ (مغربی بنگال)

ڈاکٹرعروسہ یاسمین زیبا

بہار میں اردو خاکہ نگاری (۱۹۸۰ءتک)

بہار میں اردو میں خاکہ نگاری کی اولیت کا سہرا باضابطہ طور پر ڈاکٹر سید محمد حسنین کے سر جاتا ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا،لہٰذا بہار میں اردو خاکہ نگاری کی باضابطہ روایت کے آغاز کا سال ۱۹۵۲ء ہی قرار پاتا ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں ناشر نے ان خاکوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ خاکے ۴۶-۱۹۴۵ء میں لکھے گئے تھے۔'' بہر حال بہار میں اردو خاکہ نگاری کی جب بھی بات ہوگی،ان میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کا ذکر سرفہرست ہوگا۔

بہار میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کو خاکہ لکھنے کے علاوہ انشائیہ وتحقیق میں بھی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ پہلی اولیت یہ ہے کہ بہار میں پہلی بار اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری انہوں نے ہی حاصل کی۔اس سے متصل ایک اولیت یہ بھی کہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اردو میں پی ایچ ڈی کی نگرانی پہلی بار جن کی کی تھی وہ سید محمد حسنین صاحب ہی تھے۔ صنف انشائیہ سے متعلق ان کی اولیت یہ ہے کہ پہلی بار اس تعلق سے ان کی ہی کتاب ''صنف انشائیہ اور انشائیے'' شائع ہوئی،جو بے حد مقبول ہوئی۔ان کی قریب ڈیڑھ درجن کتابیں ہیں۔جن کا تعلق مختلف موضوعات سے ہے۔

ان کی پیدائش ۲/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کاکو، جہان آباد میں نانیہال میں ہوئی۔ان کی وفات ۱۰/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اسلام آباد(پاکستان) میں ہوئی۔جہاں وہ اپنی بیٹی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔انشائیہ کے حوالے سے ان کی خدمات مہتمم بالشان ہیں لیکن خاکہ نگاری کے تعلق سے بھی ان کی خدمات روشن ہیں اور آنے والے چراغوں کو روشنی دیتی ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''بہار کے نو چراغ'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔یہ بہار میں اردو خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں بہار کے سات افسانہ نگاروں کے خاکے اور ان کے افسانے شامل ہیں۔یہ سات افسانہ نگار یہ ہیں:

(۱) پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی (۲) جناب نور محمد انجم مانپوری
(۳) پروفیسر سید محمد محسن (۴) پروفیسر سید اختر اورینوی
(۵) جناب مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی (۶) محترمہ شکیلہ اختر
(۷) جناب ح م اسلم عظیم آبادی (پروفیسر سید محمد حسنین)

کتاب کا پیش لفظ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ڈاکٹر سید محمد حسنین کے ان خاکوں کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''حسنین صاحب کے یہ ادبی خاکے بڑے دلچسپ ہیں۔جزئیات پر ان کی نظر خوب پڑتی ہے اور کل کی تعمیر میں ان سے کام بھی لیتے ہیں۔تحریر شاعرانہ بھی ہے اور شاطرانہ بھی،بس محمد حسین آزاد کی تحریر سے ملتی جلتی۔بہار کے نواب نصیر حسین خیال بھی آزاد کے اسلوب بیان کے بڑے دلدادہ تھے۔ حسنین صاحب نے چہرہ بھی اسی انداز کا باندھا ہے،جو''آب حیات'' کے مرقعوں میں ملتا ہے۔آج کل کے رنگ اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ پروفیسر حسنین کو اس انداز بیان سے اتنا شغف کیوں ہے؟ (بہار کے نو چراغ،ڈاکٹر سید حسنین،۱۹۵۲ء)

ڈاکٹر سید حسنین کی وفات کے بعد ان کی دو کتابیں شایع کی گئیں۔۲۰۰۲ء میں تلاش و جستجو اور ۲۰۰۳ء میں ''خس و خار''۔ یہ دونوں مضامین کے مجموعے ہیں۔''تلاش و جستجو'' کا پیش لفظ مشہو شاعر و ادیب مظہر امام نے لکھا ہے۔ پیش لفظ میں مظہر امام نے ان کی خاکہ نگاری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''ڈاکٹر حسنین کے ادبی دائرہ کار میں شخصی خاکہ نگاری کی بھی خاصی اہمیت رہی ہے۔انہوں نے بعض شخصیتوں کے بڑے خوبصورت مرقعے پیش کئے ہیں۔ان میں اختر اورینوی، پروفیسر فضل الرحمٰن، شکیلہ اختر، قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد اور فخر الدین علی احمد خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔''

(تلاش و جستجو، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر سید محمد حسنین کی ایک کتاب ''نیل مرام'' بھی ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں افسانے، انشائیے اور رپورتاژ کے علاوہ خاکے بھی شامل ہیں۔ڈاکٹر سید محمد حسنین اس وقت ح.م.اسلم کے نام سے بھی لکھتے تھے۔اس کتاب میں شامل دو خاکے کے بارے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد ''تعارف'' کے تحت لکھتے ہیں:

''آخر میں دو انشائیے ہیں۔ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر کلیم الدین احمد پر۔ یہ دونوں اردو کے نامور ادیبوں میں ہیں اور اسلم صاحب کے محبوب مصنفین ہیں۔اس لئے انہوں نے ان دونوں پر دل کھول کر لکھا ہے۔'' (نیل مرام، ۱۹۶۸ء، سید محمد حسنین)

''بہار کے نو چراغ'' کے خاکے جن شخصیتوں پر ہیں وہ سب بہار کی نامور شخصیتیں ہیں۔ان خاکوں میں واقعہ نگاری کا خاصا دخل ہے۔حسن احمد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''جن شخصیتوں سے متعلق خاکے اس کتاب میں شامل ہیں، ان سب کا تعلق ریاست بہار سے ہے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اردو دنیا کے لئے نیا اور اجنبی ہو۔کتاب میں شامل سارے خاکے متعلقہ شخصیتوں کے نام کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔بیشتر خاکوں میں خاکہ نگار نے واقعہ نگاری سے کام لیا ہے۔'' (بہار میں اردو خاکہ نگاری، حسن احمد، جنوری ۱۹۸۷ء، ص: ۱۷)

اب سید حسنین کے لکھے گئے خاکوں سے ایسے اقتباسات پیش کر رہی ہوں جن سے سید محمد حسنین کی خاکہ نگاری کی خصوصیات کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس ضمن میں کتاب کا سب سے پہلا خاکہ جو پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی پر ہے، سے اقتباس دیکھیں، جس سے چہرے کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے:

''آپ ان سے ملئے، یہ ہیں مسلم عظیم آبادی، جن پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہی آپ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مولانا عبدالحق نے داڑھی چھوٹی کر کے گاندھی ٹوپی پہن لی ہے۔شکیل صورت، جمیل رنگ ستواں ناک اور بلند پیشانی، بولتے ہوئے لب اور سرخی مائل چہرہ، آنکھیں نشیلی اور نیم دائرہ ترشی عینک سے ڈھکی ہوئی۔قد اوسط ہے اور لانبے ہاتھ چست شیروانی پر دراز نظر آتے ہیں.....''

(بہار کے نو چراغ، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ۱۹۵۲ء)

خاکہ نگاری کا ایک اور نمونہ پروفیسر سید محمد حسن پر لکھے گئے خاکے سے دیکھئے، جس میں سید محمد حسن کی صورت

سے لے کر ان کے شخصی خوبیوں تک رسائی ہو جاتی ہے:

''درمیانہ قد، دراز پیشانی اور آنکھوں پر سیاہ عینک گورے چہرے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ کم سن اور کم سخن ہونے کے باوجود محسن کی شخصیت سے ایک عظمت اور داشت ٹپکتی ہے، جوان کے جمال میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ محسن سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے آپ محسوس کریں گے جیسے آپ نے ایسی باتیں جانیں جو آپ بالکل نہ جانتے تھے اور جن کے نہ جانے بغیر آپ کچھ نہ جان سکتے تھے....''

(بہار کے نو چراغ، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ۱۹۵۲ء)

ڈاکٹر سید محمد حسنین کی ایک کتاب ''نمود ہستی'' بھی ہے جو ۱۹۸۰ء میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں ان کے چار خاکے شامل ہیں۔ یہ خاکے جن شخصیتوں پر ہیں وہ ہیں فخر الدین علی احمد، فخر الدین محمد شمسی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر فضل الرحمٰن۔ ان خاکوں کو مصنف نے ''سیرتی سوانحی مقالے'' قرار دیا ہے، لیکن ان کی نوعیت خاکہ کی ہی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین کے خاکے خاکہ نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ انشائیہ نگاری کے شانہ بہ شانہ خاکہ نگاری کے ذیل میں ان کی خدمات نہایت وقیع ہیں اور تاریخی مرتبہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسنین کے بعد بہار کے اردو خاکہ نگاروں میں معین الدین دردائی کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''جلوے'' ادارۂ فروغ اردو نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ معین الدین دردائی کی پیدائش کا سال ۱۹۱۴ء ہے۔ ان کی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں یہ گیا کالج میں درس وتدریس سے بھی وابستہ ہوئے۔ تحقیقی کاموں کے سبب چند ایام مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی رہے۔ ان کی کئی کتابیں ہیں، جیسے (۱) بہار اور اردو شاعری (۲) ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط (۳) صوفیائے بہار اور اردو۔ ۴/۱۷ر تحقیقی مقالے (۵) جلوے (۶) لسانی مطالعے (۷) تاریخ سلسلہ فردوسیہ اور (۸) مجلس صوفیا۔ جیسا کہ کتابوں کے نام سے ظاہر ہے معین الدین دردائی کی بنیادی دلچسپی تحقیقی امور سے رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکے خاکہ نگاری کے فن پر اس طرح پورے نہیں اترتے جو فن کا خاصا ہوا کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہ خاکے واقعہ نگاری اور مزاج و اطوار کی عکاسی کے حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں۔ پیکر تراشی کے ضمن میں بھی یہ خاکے بیحد معاون ثابت ہوتے ہیں۔

☆☆☆

+2 Jayanand High School Bahera, Darbhanga

ڈاکٹر یاسمین خاتون

سیتا ہرن ایک مطالعہ

''سیتا ہرن'' قرۃ العین حیدر کا ایسا ناولٹ ہے جس کے بارے میں قاری اکثر دو متضاد رائے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس ناولٹ میں جس عورت کا المیہ پیش کیا گیا ہے وہ اس عورت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرے یا پھر اس کے کردار پہ تنقید۔ اسی دو متضاد رائے کے ساتھ اس ناولٹ کی پوری کہانی سفر کرتی ہوئی اختتام پر پہنچ جاتی ہے۔

''سیتا ہرن''، تقسیم ہند کے نتیجہ میں آئی اخلاقی، سیاسی اور سماجی گراوٹ پر مبنی قرۃ العین حیدر کا دلچسپ ناولٹ ہے۔ ہند و پاک میں تقسیم قوموں کا آپسی میل جول، بھائی چارگی اور مشترکہ تہذیبی اقدار ضرب المثل ہیں۔ ''سیتا ہرن'' میں اس کی بہترین نمائندگی کی گئی ہے۔

اس ناولٹ کا مرکزی کردار سیتا ہے۔ اس کے گرد ناولٹ کا قصہ اور فضا گردش کرتی ہے۔ سیتا میر چندانی سندھی ڈاکٹر باپ کی ذہین بیٹی ہے۔ سندھ میں اس کی شاندار کوٹھی ہے۔ ایک مطمئن زندگی ہے لیکن تقسیم ہند کے سیاہ بادل ہزاروں لاکھوں باسیوں کی طرح انھیں بھی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ نتیجتاً سیتا کا خاندان بھی دہلی رفیوجی کیمپ کے بعد دہلی کی تنگ گلی کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ سیتا کے ماما امریکہ میں مقیم ہیں وہ سیتا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بلا لیتے ہیں۔ سیتا امریکہ جاتی ہے، اعلیٰ ڈگریاں بھی حاصل کرتی ہے لیکن امریکی ماحول اور جنسی بے راہ روی اس حد تک اثر انداز ہوتی ہے کہ ابتدائی پرورش اور سنسکار اس کے اندر سے (پرانے دقیانوسی زمرے میں شامل ہو کر) نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنی خاندانی روایات اور مذہبی دائروں کو توڑ کر جمیل سے شادی کر لیتی ہے۔ ماما مامی اور ہندوستان میں مقیم اس کی ماں کو اس خبر سے انتہائی تکلیف پہنچتی ہے لیکن باپ؛ بیٹی کی خوشی کی خاطر اس رشتہ سے مطمئن ہیں۔

ناولٹ کے فن اور حدود اربعہ کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے ''سیتا ہرن'' بھی نقادوں کی بے توجہی کا شکار رہا۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ ناولٹ ہند و پاک کے کئی رسائل میں اشاعت پذیر ہو کر اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ بعض حضرات اسے طویل افسانے میں شمار کرتے ہیں اور بعض اسے ناول کہنے پر مصر ہیں۔ جب کہ ''سیتا ہرن'' کی مصنفہ نے اسے ناولٹ کا نام دیا ہے۔ ''سیتا ہرن'' ناولٹ کے فن پر کھرا اترتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اسے ناولٹ کے زمرے میں داخل کرتی ہیں۔

مصنفہ نے اپنے عصری عہد کے ایک اہم مسئلہ یعنی بعض تہذیبی جڑوں کی تلاش عورت کے المیہ اور مقدر کی داستان اور اس کے مخصوص پہلوؤں پر چند مخصوص کرداروں کی مدد سے ایک مختصر کینوس پر پیش کیا ہے۔ ہر چند کے کینوس ناولٹ کے فن کے لحاظ سے وسیع ہو گیا ہے جو صرف کردار نگاری اور زمان و مکان کے لیے کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناولٹ میں بھی ہندو مسلمان، پنجابی، بنگالی کرداروں کی ایک

طویل فہرست ہے۔ ہمیشہ پورا ہندوستان ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، اس کے بغیر ایک قدم چلنا ان کے لیے محال ہے۔ بدھ اور ہندو مذہب خصوصاً ایودھیا کانڈ پر بھی خصوصی معلومات بہم پہنچائی ہے۔ قدرتی مناظر سے بھی ناولٹ مالا مال ہے۔ ان کے کردار عام انسان شاذونادر ہی ہوتے ہیں وہ تو غیر معمولی طور پر آرٹ یا فلسفہ پر مہارت رکھتے ہیں۔ یہاں بھی بلقیس تھیٹر آرٹسٹ ہے اور بہت سے ڈراموں میں کام کر رہی ہے۔ سیتا نے تو حید سے سوشیولوجی میں ایم اے کیا ہے۔ اس لیے مختلف قوموں، مذاہب، آرٹ اور ثقافت کے متعلق ان کی معلومات نہایت وسیع ہے۔ اسی طرح مختلف قوموں (ہندو بیرونِ ہند) کی تہذیب، معاشرت اور ذہنیت کی نمائندگی ناولٹ کے کرداروں کے ذریعے بخوبی نظر آتی ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو اس ناولٹ میں ماڈرن اِزم کے جوش میں بہہ جانے والی عورت کا المیہ پیش کیا گیا ہے جو اپنے ہی ہاتھوں اپنی راہوں کو پُر خار بنا دیتی ہے جس کی وجہ سے اس کے پیر ہی نہیں روح تک چھلنی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی یہ ناولٹ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں سندھ کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔

"سامنے جو سندھ بہہ رہا ہے، ہمارے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس کے پچھم میں جہاں چاند ڈوبتا ہے موت کا دیس ہے اور ہر سندھی جو مرتا ہے اس گئو ماتا پر جو اس نے زندگی میں برہمنوں کو دان کی، اس سے چمٹا ہوا اس دریا سے گزر جائے گا...... چیت کے مہینے میں بڑا بھاری میلہ ہوتا تھا۔ دراصل ہمارا سب سے بڑا خدا یہی دریا تھا جس طرح پراچین مصر والے نیل کو دیوتا مانتے تھے...... اسی کو مسلمان دریائے پیر اور خواجہ خضر کہتے تھے۔" (''سیتا ہرن'' از قرۃ العین حیدر، ص ۱۳۵)

سندھ سے سیتا کی یہ لگاوٹ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ آج بھی اپنی جڑوں سے کس قدر جڑی ہوئی ہے اور صرف سیتا ہی نہیں، ہر وہ انسان جو تقسیمِ ملک کا شکار ہوا ہے، چاہے وہ مہاجر ہو یا شرنارتھی اس نے اپنی جڑ، اپنی مٹی، اپنی پہچان کھوئی ہے۔ دراصل سیاست دانوں کی گھناؤنی چالوں نے بے قصور عوام کو اپنے ہی ملک میں بے گانہ کر دیا اور انھیں اپنی ہی جڑوں سے اکھڑنے پر مجبور کر دیا۔

بہر حال ناولٹ کے اجزاء کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک تنظیم ملتی ہے جو ناولٹ کا وصف ہے۔

ظاہر ہے کہ ناولٹ میں زندگی یا سماج کا کوئی اہم مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ ادب میں مسئلہ ایک تجربے کو اپنی تمام تہوں اور گہرائیوں سمیت گرفت میں لانے کا ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے تہذیبی جڑوں کی تلاش میں سرگرداں عورت کے المیہ کو مسئلہ بنا کر بڑی گہرائی اور فلسفیانہ پیرائے میں نمایاں کیا ہے جو فریب محبت کا زہر پیتی ہیں اور اس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناولٹ کا موضوع براہِ راست فسادنہیں ہے بلکہ فسادات سے رونما ہونے والے حالات، محرکات اور بالخصوص ہجرت کا مسئلہ اور جدید سوسائٹی کے انٹلکچوئل افراد کے خارجی اور اندرونی افکار و رویہ کا ردِ عمل بالخصوص اس تہذیب کی پروردہ عورتوں کی تلاشِ محبت، خود فریبی اور شکست خوردگی کا سلسلہ جو ختم

نہیں ہوتا ہے تو سراب میں آنکھیں کھلتی ہیں۔ ان کے فکشن میں عورت ہی مرکز رہتی ہے جس کی محرومی، ناکامی اور بے بسی کی گوناگوں گتھیوں کو مصنفہ اُجاگر کرتی ہیں۔ بقول وحید اختر: ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی عورت بے اعتباری، تلاشِ محبت، فریب خوردگی، شکستِ خواب، احساسِ ہزیمت کی علامت ہے۔'' ''سیتاہرن'' کا کینوس تقسیمِ ہند کے بعد دہلی، کراچی، امریکہ اور شری لنکا پر محیط ہے۔ مصنفہ جدید سوسائٹی کی انٹلکچوئل سیتا کا موازنہ رامائن کی سیتا سے کرتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتی ہے۔ ہرن کی فرمائش، سیتاجی کو راون کی گرفت میں جانا پڑا مگر جدید سوسائٹی کی سیتا میر چندانی راون کو خود منتخب کرتی ہے۔ یہ منوہر، ہرن قمر الاسلام، عرفان، پروجشن کمار جو بظاہر دانشور، مصور اور جدید سوسائٹی کے اعلیٰ افراد ہیں، اپنا بھیس اُتارنے کے بعد راکشش ثابت ہوتے ہیں۔ جدید سیتا لکشمن ریکھا اپنی مرضی سے پار کرنے کی وجہ سے اپنی زندگی میں خود زہر گھولتی ہے اور ان لوگوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ گویا سیتا اپنی مرضی سے لکشمن ریکھا پار کرتی ہے نہ کہ اس کے ساتھ سیتاجی کی طرح کوئی مجبوری اور زبردستی ہوتی ہے۔

ناول کے واقعات دہلی، کراچی، نیویارک اور شری لنکا کی سرزمین میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ رامائن اور آریائی تہذیب کی تلمیحات کے ذریعے جدید سیتا کی زندگی کا المیہ رونما ہوتا ہے۔

کردار کی رو سے ''سیتاہرن'' کے سارے کیریکٹر اپنے عصری عہد کی جدید سوسائٹی کی حقیقی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار متحرک اور جاندار ہیں۔ اس ناولٹ میں بظاہر کرداروں کی بھرمار ہے مگر ان میں مرکزیت سیتا میر چندانی کو ہی حاصل ہے جس کے محور پر پوری کہانی گھومتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناولٹ کی کردار نگاری کو ''سیتاہرن'' میں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

دراصل قرۃ العین حیدر نے جدید قدیم تہذیب کا موازنہ کر کے گمشدہ تہذیب کی اہمیت وافادیت پر زور ڈالا ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمہ نگاری، زبان واسلوب کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی منفرد تکنیک کے ساتھ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں وہ روح پھونکی ہے جو اسے اردو کے بہترین ناولٹ کا درجہ دِلاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر جدید اردو فکشن کی معمارِ اوّل بھی ہیں اور معمارِ اعظم بھی۔ مصنفہ پہلی خاتون ناولٹ نگار ہیں جنھوں نے اپنی فنی صلاحیت اور فکری بصیرت نیز تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ اردو فکشن میں ناولٹ کی روایت کو عام کیا۔ اپنی تخلیقات کو ناولٹ کے نام سے منسوب کر کے انھوں نے محققین وناقدین کو اس صنفِ ادب سے متعلق سوچنے اور سمجھنے کی دعوتِ فکر دی۔ شعوری طور پر ناولٹ کے فن وتکنیک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے اس صنف کے ارتقائی سفر کو تقویت بخشی۔

☆☆☆

Guest Faculty, Deptt. of Urdu
Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University, Patna-1
E-mail : - dryasminkhatoon@gmail.com M. 6203908847

ڈاکٹر فریدہ خاتون

سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری

مولانا سید سلیمان ندوی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے استاد علامہ شبلیؒ کے تمام نامکمل اور مجوزہ کاموں کی تکمیل کی، بلکہ بعض اوقات ان کے بنائے ہوئے خاکے کو بھی اتنی وسعت دی کہ وہ ایک نیا خاکہ معلوم ہونے لگا، انہوں نے مذہبی اور ادبی موضوعات کے علاوہ بہت سے تنقیدی مقالات بھی اپنی یادگار میں چھوڑے ہیں، لیکن ان کی علمی جلالت نے ان کی دوسری حیثیتوں کو ماند کر کے رکھ دیا، غالباً یہی وجہ ہے کہ ابھی تک سید صاحب کی ادبی اور تنقیدی خدمات کا کوئی اعلیٰ اور معروضی مطالعہ پیش نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس عنوان سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ اس کو تنقید کے زمرہ میں شامل کرنا بڑا دشوار ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور دسمبر ۱۹۸۴ء کے معارف میں ان کا ایک مقالہ سید صاحب کی تنقید نگاری پر شائع ہوا ہے۔ درج ذیل سطور میں ہم پروفیسر صاحب موصوف کے مقالہ کا ایک ناقدانہ جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ اس مقالہ میں انہوں نے سب سے کام کی بات یہ تحریر کی ہے کہ:

> ''تنقید یا ادب کو مشرقی و مغربی دو حصوں میں تقسیم کرنا ہی نامناسب ہے، ادب و تنقید کا کارنامہ و مطالعہ خواہ مغرب میں ہوا ہو یا مشرق میں، دونوں کی اہمیت ہے، اور ان کی قدر شناسی کے لئے بلا امتیاز، تعصب ایک اصولی و آفاقی معیار سے کام لینا چاہئے۔'' [1]

پروفیسر عبدالمغنی صاحب جب اس نقطۂ نظر سے سید صاحب کی تنقید نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو سید صاحب کا کارنامہ کسی بھی اردو تنقید نگار سے کم نظر نہیں آتا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سید صاحب کی تصنیف ''قیام'' اور ''نقوشِ سلیمانی'' کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے اس مقالے میں سید صاحب کے اس مقدمہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ جو انہوں نے شاد عظیم آبادی کے ایک مجموعۂ کلام پر لکھا تھا اور جس کو وہ سید صاحب کا ''زبردست ادبی معرکہ'' اور ''تاریخ تنقید کا اہم کارنامہ'' قرار دیتے ہیں۔ مقالہ نگار کے نزدیک ''مقدمے کی روح حسب ذیل پیراگراف میں جلوہ گر ہے۔''

> ''شاد کا خاندان دلی سے عظیم آباد آیا تھا، لیکن ان کی صحبت اور ان کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ کے ارباب کمال سے رہا۔ تاہم یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ان کی شاعری پر لکھنؤ سے بہت زیادہ دلی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں لکھنؤ والوں کے صنائع و بدائع کا نمونہ بھی مل جاتا ہے، مگر شاعری کا مذاق، مضامین، معانی، خیالات، سنجیدگی، متانت ہر چیز، دلی کا پتہ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ جو چیز شعرائے لکھنؤ کی ان میں نظر آتی ہے، وہ الفاظ کی صحت، محاوروں کا تتبع اور فارسی ترکیبوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہے۔ اس طرح ہم عظیم آبادی کے حضرت شاد کو لفظی حیثیت سے لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا کہیں گے۔'' [2]

درج بالا اقتباس میں سید صاحب نے جو کچھ بھی تحریر فرمایا ہے اس میں نہ تو کوئی ایسی ندرت ہے اور نہ ہی ایسی جدت، جس کی بنیاد پر ان کے اس مقالے کو ''زبردست ادبی معرکہ'' کہا جا سکے۔ اگر بغرض محال ہم اس کو زبردست ادبی معرکہ تسلیم بھی کر لیں تو مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ ہر ادبی معرکہ کارنامہ تنقیدی کارنامہ نہیں ہوتا، اگر سید صاحب کی درج بالا تحریر پڑھ کر چند افراد کے ہی دل میں یہ داعیہ پیدا ہو جائے کہ وہ شاد کے کلام کا سید صاحب کے فرمودات

کی روشنی میں ایک بار پھر سے مطالعہ کر کے ان کی معنویت کی بازیافت کریں تو ہم کو بھی سید صاحب کی تحریر کو' ایک زبردست ادبی معرکہ' اور تاریخ تنقید کا اہم کارنامہ' ماننے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ لیکن ہمارے ناقص خیال میں پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے سید صاحب کا جو پیراگراف نقل کیا ہے۔ وہ زبردست اور اہم تو دور کی چیز ہے۔ سرے سے تنقیدی کارنامہ ہی نہیں ہے، بلکہ یہ ان کا ایک تاثر ہے جس کو انہوں نے شستہ رفتہ زبان میں تحریر کر دیا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی صاحب کے نزدیک ''سید صاحب کی تنقیدی بصیرت کا دوسرا اہم معرکہ ''شعلہ طور'' کا تعارف ہے جس کو وہ جگر مرادآبادی کے ''پہلے مجموعۂ کلام پر پہلی مبصرانہ تنقید'' قرار دیتے ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے عبدالمغنی صاحب کا دونوں بیان محل نظر ہے۔ جگر کا مجموعہ کلام پر پہلی مبصرانہ تنقید قرار دیتے ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے عبدالمغنی صاحب کا دونوں بیان محل نظر ہے۔ جگر کا مجموعۂ کلام ''داغ جگر'' مرزا احسان احمد بیگ مرحوم نے مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ اعظم گڑھ سے شائع کیا تھا۔ [۳] اس لئے ''شعلۂ طور'' کو جگر کا پہلا مجموعۂ کلام اور سید صاحب کے تعارف کو پہلی مبصرانہ تنقید قرار دینا درست نہیں ہے۔ عبدالمغنی صاحب کے نزدیک سیّد صاحب نے درج ذیل سطور میں جگر کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ جگر کی ''حقیقی توصیف'' ہے:

> ''جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر جب وہ کہتے ہیں، تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے، ہر فطری شاعر کا رنگ مذاق یہی ہوتا ہے، کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے، وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ یکساں ہی ظاہر ہوگا۔'' [۴]

درج بالا تحریر میں سید صاحب نے جگر کی شاعری پر جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، اس کا اطلاق ان کے ہمعصر فانی بدایونی کی شاعری پر نہیں ہوتا؟ کیا اصغر گونڈوی کا شمار اسی ذیل کے شعرا میں نہ کیا جائے گا؟ کچھ بعد کے شعراء میں فراق گورکھپوری کی شاعری کے بارے میں یہ الفاظ نہیں دہرائے جا سکتے؟ سید صاحب نے درج بالا سطور میں ایک ایسا عموجی بیان دیا ہے جس کا انطباق اردو کے اکثر و بیشتر شعراء پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلہ سخن میں سید صاحب نے آگے چل کر حافظ کی شاعری کا بھی یہی وصف قرار دیا ہے۔ درج بالا تحریر پروفیسر عبدالمغنی صاحب کے نزدیک سید صاحب نے درج ذیل سطور میں جگر کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ جگر کی ''حقیقی توصیف'' ہے:

> ''وہ (جگر) مست ہے اور اس مستی میں کسی کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر آتا ہے۔ وہ اس کے حجابات کو اپنے رشتہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے۔ مگر نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھا سکتا۔ اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھا دیتی ہیں، تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے۔''

اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے یہ اظہار خیال کیا ہے:

> ''یہ اردو میں تاثراتی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے، اس میں علامہ کی تنقیدی نگاہ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور اس کی تغزل کی تہوں میں غوطہ لگا کر گوہر آبدار نکال لاتی ہے۔ پھر اس گوہر کی آب و تاب کو ویسے ہی درخشاں الفاظ میں بیان کرنے کے لئے ناقد کا قلم گویا شاعر کا قلم بن جاتا ہے۔ یہ

درحقیقت روح شاعری میں ملول کر کے اس کے عمیق ترین مضمرات کی تشریح کا کمال ہے۔''

ہم نے سید صاحب کی تحریر کو متعدد بار پڑھ کر ''گوہر آب دار'' کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ٹوٹا پھوٹا موتی بھی نہ مل سکا۔ اس طرح کے بیانات تو فارسی اور اردو کے دوسرے شاعروں کے بارے میں بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ اس میں جگر کی کیا تخصیص ہے؟

عبدالمغنی صاحب نے اپنے مقالہ میں سید صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

> ''یہ شبلی کے دبستان تنقید کا ایک امتیازی جوہر ہے، جس کو عصر حاضر میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ساتھ اور کہنا چاہئے کہ ان کے زیر سرکردگی عبدالسلام ندوی، نجیب اشرف ندوی، ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور اب سید صباح الدین احمد، عبدالرحمٰن نمایاں کرتے رہے ہیں۔''

اس بیان میں دو باتیں محل نظر ہیں، اول تو یہ کہ نجیب اشرف ندوی کا شمار ناقدوں میں کسی بھی طرح نہیں کیا جا سکتا، دوئم یہ کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات ''سید صاحب کی سرکردگی'' میں انجام پذیر نہیں ہوئی ہیں۔ ادب ہو یا مذہب، معاشرت ہو یا سیاست شبلی کے ان دونوں شاگردوں میں فکر و نظر کا اتنا بڑا فرق و اختلاف تھا کہ یہ ایک دوسرے کی ''سرکردگی'' میں چل ہی نہیں سکتے تھے۔ ان دونوں کی راہیں جدا جدا تھیں لیکن یہ دونوں کی شرافت ذاتی تھی، جس کی بنا پر دونوں میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہوا کہ زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی ہے۔

بہرحال پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے اپنے اس مقالے میں سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری کی کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتے ہیں جو سید صاحب کی انفرادیت کو سامنے لاتی یا ان کے اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتی ہے کہ ادب کو کیا، کیوں اور کیسے ہونا چاہئے؟ تنقید کا فن نہ تو توضیح ہے اور نہ ہی تشریح، تنقید کا فن اگر ایک طرف کسی ادب پارہ کی بازیافت ہے تو دوسری طرف کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا بھی سکھاتا ہے، سید صاحب کی وہ تحریریں جن کو ادبی تنقید کا نام دیا جاتا ہے، نہ تو کسی ادب پارے کے بازیافت میں معاون ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی ادب کو پرکھنے کا کوئی واضح معیار ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، جن تحریروں کو ان کی ''تنقید'' سے منسوب کیا جاتا ہے وہ تو ایک طرح کی تشریحات ہیں، جو کسی شاعر کے اشعار کو سامنے رکھ کر سپرد قلم کر دی گئی ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب انگریزی ادبیات کے استاد ہیں، ان سے یہ توقع تھی کہ وہ اپنے مقالے میں ان اصولوں کی نشاندہی فرمائیں گے جو سید صاحب کے نزدیک تنقید نگاری کے بنیادی ارکان ہیں اور جن کے بغیر کوئی تحریر تنقید کے زمرے میں شامل نہیں کی جا سکتی، افسوس ہے کہ ان کی ادبی تحریروں کا وہ کون سا وصف ہے جو تنقید بنا دیتا ہے، ہمارے خیال میں اگر پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے اس نکتہ کو چھو لیا ہوتا تو سید صاحب کی تنقید نگاری ہمارے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتی۔

حواشی:

۱- معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص۔۴۲۲ ۲۔ بحوالہ معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص: ۴۲۴، ۴۲۳

۳- ملاحظہ ہو دیباچہ مقالات احسان، مرزا احسان احمد بیگ، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص: ۲

۴- بحوالہ معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص: ۴۲۶

☆☆☆

گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، ایم۔آر۔ایم۔کالج، لال باغ، دربھنگہ۔846004 (بہار)، انڈیا

ڈاکٹر محمد احتشام الحق انصاری

راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں کی انفرادیت

اردو ڈرامے کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہے۔اس کی شروعات کو تقریباً پونے دوسو سال گذرا ہے جو کسی صنف کی ارتقا کے لئے بہت زیادہ نہیں ہے۔اس مختصر سی مدت میں ناول کی موجودہ شکل ہمارے سامنے تک پہنچی ہے۔ناول زندگی کی تفسیر ہے۔اس میں زندگی کی عام حقیقتوں کی سچائیاں ایسے انداز میں پیش کی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کا گہرا شعور ہو جائے۔اردو ناول کی ابتدا اس بیداری کے زمانے میں ہوئی جو انیسویں صدی میں برطانوی حکومت کے استحکام کے ساتھ شروع ہوا۔ناول کی ابتدا سے قبل داستانوں کا دور تھا۔اردو زبان و ادب میں شروعاتی دور سے ہی ناول کا رشتہ سماج سے قائم ہو گیا تھا اور اس کے ذریعہ سماج کی عکاسی عمل میں آتی رہی۔ہمارے ابتدائی ناول نگاروں نے بھی یہ محسوس کیا کہ ادب محض دل بہلانے کی چیز نہیں ہے اور حسن و عشق کی داستان نہیں۔حسن و عشق کے حدود میں مقصدی اور افادی پہلو پر نظر رکھی اور ادب کا اولین مقصد مسائل حیات پر غور و فکر کرنا قرار دیا۔

ہمارے اولین ناول نگار نذیر احمد کے تقریباً سبھی ناولوں میں گھریلو معاشرت کی تصویریں ملتی ہیں۔ان ناولوں میں نئے سماجی حقائق کو منظم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔بہت سے اہم ناول نگار مثلاً پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، مولانا راشد الخیری وغیرہ کے ناولوں کو پڑھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان تمام ناول نگاروں نے انسانیت اور سماج سے محبت کی ہے۔ماضی اور حال کے سماج اور عوامی زندگی کی عکاسی اپنے خوبصورت انداز میں پیش کی ہے کہ ان کے اندر بھوک، افلاس اور سماجی پستی کا نقشہ ہمارے ذہن کے پردے پر ثبت کر جاتا ہے۔ان ناول نگاروں نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو پیش کر کے آنے والی نسلوں کی فلاح و بہبود کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ایسے ہی ایک ناول نگار جنہوں نے سماجی حالات کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔

بیدی نے جو ڈرامے لکھے ہیں وہ ''بے جان چیزیں'' اور ''سات کھیل'' کے عنوان سے شائع شدہ دو مجموعوں کی شکل میں ہمارے سامنے آج بھی موجود ہے۔میں نے ان کے ڈراموں کے دوسرے مجموعے ''سات کھیل'' کا مطالعہ کیا ہے۔اس کی روشنی میں، میں نے ان کے ڈراموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔بیدی کے ڈراموں کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نظریاتی اعتبار سے ڈرامے کی اس روایت سے جڑے ہیں جسے حقیقت نگاری یا پھر سماجی، اشتراکی اور نفسیاتی حقیقت نگاری کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔وہ اپنے موضوعات یا تو تاریخ سے حاصل کرتے ہیں یا پھر عصری سیاسی، سماجی اور نفسیاتی حقیقتوں سے۔ان کے مجموعہ ''سات کھیل'' کے پہلے دو ڈرامے 'خواجہ سرا' اور 'چانکیہ' تاریخ سے لیے گئے ہیں جب کہ باقی پانچ ڈرامے 'تلچھٹ'، 'نقال مکانی'، 'آج'، 'درخشندہ'، اور 'ایک عورت کی نہ' عصر حاضر کی سیاسی، سماجی، یا نفسیاتی حقیقتوں سے متعلق ہیں۔موضوع تاریخی ہو یا عصری حقائق سے متعلق وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کی سماجی معنویت برقرار رہے۔اسی لئے ان کے وہ

ڈرامے بھی جو خالص تاریخی موضوعات کے حامل ہیں کسی نہ کسی عصری حقیقت کا علامیہ بن کر اسی عمل سے گذرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے موضوعات سے اس تاریخی، سائنسی اور طبقاتی شعور کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جس کے تحت وہ مادی قوتوں کو ہی سماجی حرکی قوتیں تصور کرتے ہیں۔ مادے کے اپنے اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی الگ اہمیت اور شناخت رکھتے ہیں اور ہر وہ شئے اور اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ مادے کی اس قوت کو تسلیم نہیں کرتے یا اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ مادہ شعور کو جنم دیتا ہے اور شعور کی دنیا ایک مسلسل رزم گاہ حیات ہے۔ جس میں صرف ایک اصول کام آسکتا ہے۔ ڈارون کی تھیوری Survival of the fittest یعنی جو وقت کے ہوڑ میں مقابلہ کرنے کے لائق ہوتا ہے وہ باقی رہتا اور مقابلہ نہیں کر پاتا وہ فنا ہو جاتا ہے۔ اسی اصول کے تحت اس کائنات کا ارتقا ہوا ہے۔ یہی اصول ہیں جو انسانی بقا کے لئے نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان مادی قوتوں کی باگ ڈور جب صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو عدل وانصاف کا بول بالا ہوتا ہے اور جب یہی نالائق لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے تب استحصال اور ظلم فروغ پاتے ہیں۔ بیدی کے پہلے دونوں ڈراموں میں اسی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول ''خواجہ سرا'' میں قباد کی شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی کی وجہ کاشفہ کی محبت بتائی جاتی ہے، یعنی اس کا کاشفہ کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد صرف اس لئے خواجہ سرا بن کر حویلی میں آجاتا ہے کہ وہاں رہ کر اسے کاشفہ سے جو خود بھی حویلی میں ملازمہ ہے، قریب رہنے کا موقع مل جائے گا۔ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ مادی قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی ہے۔ قبا کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ کوچک کے ہاتھ میں جو طاقت ہے وہ اس کا مقابلہ کسی صورت نہیں کر سکتا ہے۔ اسی لئے وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر کے نہ صرف خواجہ سرا بن جاتا ہے بلکہ جب کاشفہ حویلی سے بھاگ کر سردار قولیش سے شادی کر لیتی ہے تو وہ اس حادثے کو بھی خاموشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ کاشفہ کے ذہن میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ مادی قوت کا مقابلہ متبادل مادی قوت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کاشفہ جب یہ دیکھ لیتی ہے کہ اس کا محبوب قباد ہتھیار ڈال چکا ہے تو وہ متبادل مادی قوت ڈھونڈنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتی ہے اور خلجی سردار قولیش سے اپنا رشتہ جوڑ کر اس کے ساتھ راہ فرار اختیار کرتی ہے۔ اس منظر کو بیدی نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جو قاری کے سامنے اچھی طرح نقش کر جاتی ہے۔

بیدی اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ انسان اپنے مستحکم ارادے اور عمل سے اپنا مستقبل بنا سکتا ہے اور اپنی زندگی کا فیصلہ لے کر اپنے مقدر کو سنوار سکتا ہے۔ صرف تقدیر پر اپنا فیصلہ چھوڑنے والے لوگ بزدل ہوتے ہیں۔ اس بات کی حسین عکاسی قباد اور کاشفہ کے کردار و عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے یقین کی سب سے اعلیٰ تجسیم چانکیہ کے کردار میں ہوئی ہے جو اپنے ارادے، فیصلے اور عمل سے نہ صرف چندر گپت کو ملک کا سب سے بڑا سمراٹ بنا دیتا ہے بلکہ اس کی سلطنت کو بھی سب سے طاقتور سلطنت کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

''تلچھٹ'' اور ''نقل مکانی'' میں احتجاج کی لے کچھ زیادہ ہی تیز نظر آتی ہے۔ ''تلچھٹ'' میں ایک بیوہ ہے

جس کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ محنت اور مزدوری کر کے ایک یتیم بچے یوگ کو پالتی ہے۔ کافی لمبے عرصے بعد اس کا باپ جس کے بارے میں یہ خیال کیا گیا تھا کہ کسی جنگ میں مارا چکا وہ اچانک لوٹ آتا ہے۔ وہ اب یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کے ساتھ چلا جائے۔ بیوہ عورت پہلے یوگ کو اپنے آپ سے الگ نہیں کرنا چاہتی ہے۔ یوگ بھی اپنی ماں کو چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے لیکن باپ جب بیٹے کی پرورش کی خاطر اٹھائی گئی مصیبتوں کی قیمت روپے سے چکانے کی بات کرتا ہے تو ماں بپھر جاتی ہے اور احتجاج کے طور پر وہ نہ صرف ان دونوں کو وہاں سے فوراً چلے جانے کے لیے کہتی ہے بلکہ بطور احتجاج ہی وہ روپے لے لیتی ہے جو باپ نے اسے پیش کیے ہوتے ہیں۔

عصری حقائق کو پیش کرتے ہوئے بیدی نے اپنے اکثر ڈراموں میں نچلے اور درمیانی طبقوں کے مسائل کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان دونوں طبقوں کی زندگی کی مصوری کرتے ہوئے انہوں نے ان کے اعتقادات و نظریات، ان کی محرومیوں اور مجبوریوں، ان کی تمناؤں اور حسرتوں اور ان کی خوشیوں اور غموں کی دلچسپ تصویریں پیش کی ہیں۔ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک کنبے کے مسائل کو پیش کرتے ہیں جو بڑھتی ہوئی آبادی، آسمان چھوتی ہوئی مہنگائی اور مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہی مالی مجبوریاں بالآخر نفیس کو وہ سمجھوتہ بھی کرنے کے لئے تیار کرتی ہے جس پر بیدی کا یہ ڈراما ختم ہوتا ہے۔ نفیس جو طوائف کے نام سے بھی نفرت کرتا ہے ایک دن مجبور ہو کر اپنی بیوی عذرا کو شمشاد بائی کی طرح، رئیس شیو برت کے سامنے گانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

سیاسی وسماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ہی ساتھ بیدی نے ایسے ڈرامے بھی لکھے جو نفسیاتی حقیقت نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس نوعیت کے ڈراموں میں وہ انسانی نفس کی ایسی بے لاگ تصویریں اتارتے ہیں کہ ان کے مشاہدے کہ گہرائی اور نفسیاتی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ''تلچھٹ'' میں جب ماں کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے یوگ کا باپ لوٹ آیا ہے تو اسے یہ خدشہ ستانے لگتا ہے کہ کہیں یوگ اس کے ہاتھ سے چھن نہ جائے۔ یوگ اس کے عمر بھر کی کمائی ہے۔ اس کے چھن جانے کے احساس سے وہ جس طرح کے حرکات وسکنات کا مظاہرہ کرتی ہے ان سے اس کے نفس میں ہو رہی کشمکش کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کشمکش کو پیش کرنے کے لئے بیدی نے جن استعارات وتشبیہات کا استعمال کیا ہے اس سے ان کے مشاہدے کی گہرائی اور نفسیاتی بصیرت کا بین ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

''رخشندہ'' میں بیدی نے اسی نفسیاتی کیفیات کو پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے میں رخشندہ ایک ایسی اعصاب زدہ لڑکی ہے جو ہر وقت عجیب قسم کے وسوسوں میں بھری رہتی ہے۔ وہ طرح طرح کے واہموں کا شکار رہتی ہے اور اپنے ساتھ پورے خاندان کے زندگی کو بوجھ بنا دیتی ہے۔ گھر لوٹنے میں جب بھی اس کے خاوند کو تھوڑی دیر ہو جاتی ہے وہ کہرام مچا دیتی ہے۔ ایک اعصاب زدہ لڑکی کے کردار کو ابھارنے کے لئے بیدی نے جن خوبصورت الفاظ اور جملوں کو پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ رخشندہ کا کردار کسی سچ مچ کی اعصاب زدہ لڑکی کے کردار کی ہو بہو تصویر لگتا ہے۔

بیدی کی نفسیاتی بصیرت کا مظاہرہ ''ایک عورت کی نہ'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس ڈرامے میں بیدی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت بظاہر کچھ اور کہتی ہے لیکن حقیقت میں وہ کچھ اور کہنا چاہتی ہے۔ عام طور سے اس کے نہ میں ہاں چھپا ہوتا ہے۔ عورت کے نفسیات کو اجاگر کرنے کے لئے ان کے دو مکالمے ملاحظہ ہوں:

''ہر ایک عورت دوسرے مرد کی باتوں کو پسند کرتی ہے۔''

''اکثر عورتوں کا اپنی نئی ساری دکھانے، نئی سینڈل کی نمائش کرنے اور چند تحسین کی نگاہیں حاصل کرنے کے سوا اور کچھ مطلب نہیں ہوتا۔''

فنی اعتبار سے بیدی نے حقیقت نگاری کی روایت کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے ڈراموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کرداروں کے مقابلے پلاٹ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لئے ان کی توجہ زیادہ تر واقعات کے انتخاب پر مرکوز رہتی ہے اور پھر ان کی ترتیب و تشکیل اس طرح عمل میں لاتے ہیں کہ ہر آنے والا واقعہ ہمیں کسی نئے انکشاف سے آگاہ کرتا ہے۔ ان کا یہ انکشافی لہجہ ان کے ڈراموں کے اہم خصوصیت ہے۔ ہر انکشاف ہمیں ایک بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہ ہمارے ذہن کو جھکجھوڑنے دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چانکیہ میں وہ ڈرامے کا آغاز چندر گپت کی خواب گاہ سے کرتے ہیں۔ اور پہلے ہی مکالمے میں چندر گپت سے یہ جملہ کہلوا کر ایک نیا سماں پیش کرتے ہیں:

''یہ راج سمراٹ کا کرم نہیں کہ وہ تین گھڑی سے زیادہ سو لے۔''

چندر گپت کا یہ جملہ اس ڈرامہ کا پہلا انکشاف ہے جو نہ صرف اس کے کردار کے اہم پہلو سے ہمیں روشناس کراتا ہے بلکہ ہماری فکر کے لئے تحریک عطا کرتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چندر گپت بہت سوتے تھے اور رات کے پچھلے پہر سے ہی بیدار ہو کر امور سلطنت کے کام میں مصروف ہو جاتے۔

بیدی کے اکثر ڈراموں میں ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جن کا تعلق نچلے یا متوسط طبقے سے ہے۔ خواجہ سرا میں ماحول طبقہ بالا سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے دونوں مرکزی کردار نچلے طبقے سے منسلک ہیں۔ اسی طرح چانکیہ میں انورادھا نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ ''تلچھٹ'' میں ماں یوگ، جوتن کی ماں اور شری پت رائے بھی نچلے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح بقیہ ڈراموں میں بھی انہیں طبقوں کے کرداروں کو لے کر بیدی نے حقیقتوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کردار نچلے طبقے سے ضرور ہیں لیکن جکڑ بندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

بیدی کے کرداروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نئی اور پرانی قدروں کے درمیان تصادم پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں نہ صرف نئی اور پرانی قدروں کی نمائندگی کرنے والے کردار مل جاتے ہیں بلکہ ہر کردار کے نفس میں ہونے والے کش مکش کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بیدی کا ڈرامہ ''آج'' بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں پروفیسر ٹھاکر پرانی قدروں کے علمبردار ہیں تو دوسری طرف امرت، شنکر اور صفدر نئی قدروں کی علم برداری کرتے نظر آتے ہیں۔ اسے واضح کرنے کے لئے چند مکالمے پیش ہیں:

''پروفیسر ٹھاکر: ہم انگریزی اوپیرا کو پسند کرتے ہیں لیکن ہم کرشن یاترا کو بھول گئے ہیں جنہیں کرشن پجاری اپنے مذہبی تہواروں میں کھیلا کرتے تھے جن میں جے دیو، چنڈی داس اور ودیا پتی کے گیتوں کو گایا جاتا تھا۔ جن میں رادھا اور کرشن روح اور اس کا سوامی مدھر وچنوں میں نہ مرنے والا پریم جتایا کرتے تھے......''

شنکر: ہم پرانی روایتوں کے کندھروں پر ضرور آئے ہیں لیکن ہم لگڑ بگڑ نہیں ہیں، جو گڑے مردوں کو اکھاڑتے پھریں۔ تمہارا باپ سلطان تھا تو تمہیں کیا؟

آگے چل کر شنکر پھر کہتا ہے:

''شنکر: ہم اپنے ماضی کے وارث ضرورت ہیں لیکن ماضی پرست نہیں ہیں۔''

بیدی نے اکثر جگہ اپنے ڈراموں اور افسانوں میں بھی زبان و بیان کو پر تکلف بنانے سے گریز کیا ہے۔ وہ مقصد کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ بھی کہنا ہے اسے سیدھے سادے الفاظ اور لہجے میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقائق کی صحیح عکاسی کرنے کے لئے یہ رویہ اپنانا ضروری ہے۔ جب زبان و بیان پر تکلف ہو جاتی ہے تب وہ حقیقت نہ رہ کر ایک خواب نظر آنے لگتا ہے۔ اس لئے ہر افسانہ نگار یا ڈرامہ نگار کو پر تکلف زبان سے گریز کرنا چاہئے۔ بیدی نے ایسا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناولٹ اور افسانوں کی طرح ڈرامے کے میدان میں بھی اپنے ہم عصروں سے پیچھے نہیں ہے۔ افسانے کے مقابلے انہوں نے ڈرامے بہت کم لکھے ہیں لیکن ان میں ایسے ڈراموں کی کمی نہیں جنہیں اردو ڈرامے کی جدید روایت کا کوئی طالب علم نظر انداز کر سکے۔

☆☆☆

سجاد نگر، لڑوآرا، بیگوسرائے (بہار)

ڈاکٹر امام اعظم

ڈاکٹر مشتاق احمد کی نظموں میں صداقت شناسی

پروفیسر مشتاق احمد ناقد، محقق شاعر اور صحافی کی حیثیت سے اردو دنیا میں معروف ہیں۔ ان کی ادارت میں مارچ ۲۰۰۱ء سے اردو رسالہ ''جہانِ اردو'' دربھنگہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے نیز ان کے ہفتہ وار کالم اردو اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے کالموں کے تین مجموعے ''جہانِ فکر'' (مرتب: ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن ارشد)، ''چراغِ فکر'' (مرتب: ڈاکٹر جاوید اختر) اور ''ایوانِ فکر'' (مرتب: ڈاکٹر محمد ارشد حسین) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تبصروں کا ایک مجموعہ ''کتاب در کتاب'' (مرتب: ڈاکٹر وصی احمد شمشاد) بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد ۱۹۹۶ء میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کی سفارش پر بی این منڈل یونیورسٹی مدھے پورہ میں اردو کے لکچرار کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ تقریباً دو سال کے اندر انٹر یونیورسٹی ٹرانسفر کرا کر ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے تحت ملت کالج آ گئے اور یہیں ۲۰۰۹ء میں کمیشنڈ پرنسپل ہوئے۔ انہوں نے ملت کالج میں نئی روح پھونکی اور کالج کو ایک مقام عطا کیا۔ اپنی مدتِ کار میں انہوں نے گیارہ قومی سیمینار اور چار توسیعی خطبات کا اہتمام کرایا جس کی گونج آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ بالترتیب مارواڑی کالج، ایم ایل ایس ایم کالج اور سی ایم کالج کے پرنسپل رہے۔ ان تینوں کالجوں میں بھی انھوں نے قومی سیمینار کرائے جب کہ ایم ایل ایس ایم کالج میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے تعاون سے مظہر امام توسیعی خطبہ کا اہتمام کرایا۔ بحیثیت پرنسپل ہر جگہ ان کی کارکردگی لائقِ تحسین رہی۔ دریں اثناء پرنسپل کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے کے بعد وہ اب ایل این متھلا یونیورسٹی میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس سے قبل وہ یونیورسٹی میں اکیڈمک کونسل کے رکن اور پنشن افسر کی حیثیت سے بھی ذمہ داریاں نبھا چکے ہیں۔ ان کی درجنوں کتابیں ''تنقیدی بصیرت''، ''قرطاسِ مہر''، ''تنقیدی تقاضے''، ''نصرت: فرد اور فنکار''، ''آتشِ پنہاں''، ''مثنوی درِ شاہوار مع تنقیدی مطالعہ''، ''بیان: منظر پس منظر''، ''اقبالیات کی وضاحتی کتابیات''، ''مظلوم شہنشاہ: بہادر شاہ ظفر''، ''بلچما'' (ترجمہ)، ''اقبال کی عصری معنویت''، ''جہانِ فیض''، ''بہار میں اردو تنقید و تحقیق''، ''مائنوریٹی ایجوکیشن آف انڈیا'' (انگریزی)، ''مسلم ریزرویشن: ووٹ بینک پالیٹکس اور وے ٹو پلیٹ'' (انگریزی)، ''میزانِ سخن''، ''احتسابِ فکر و نظر''، ''مولانا ابوالکلام آزاد (انگریزی سوانح)''، ''طنابِ نقد'' وغیرہ اہم ہیں۔ انہوں نے ہندی اور انگریزی میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔

اکیسویں صدی کا سب سے خطرناک المیہ کورونا وائرس ہے جس کی وجہ سے زندگی کی رفتار رک گئی ہے۔ لوگ گھروں میں قید ہو گئے۔ معاشی بدحالی سامنے آئی۔ لاک ڈاؤن نے لوگوں کو کرب اور اذیت کے علاوہ کچھ نہیں دیا جس سے اردو کے قلم کار بھی متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نے کورونا اور لاک ڈاؤن کی درمیانی مدت میں اپنے تاثرات بصورتِ نظم بیان کیے ہیں۔ یہ نظمیں مجموعہ کی شکل میں ''آئینہ حیران ہے!'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں جن کے مطالعہ سے زندہ اور متحرک سخن فہمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیوں کہ صداقت شناسی لطیف حسیت پر فوقیت رکھتی ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ان نظموں کے متعلق رقم طراز ہیں :

''ڈاکٹر مشتاق احمد کی کرونا اور لاک ڈاؤن پر نظمیں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانی ساز پر خارجی اور باطنی محرکات کا ایک وبائی اور احتیاطی سلسلہ کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ ہوا کی لہریں اور ترنگیں تاروں کو چھیڑ کر ان میں سے نت نئے نغمے پیدا کرتی ہیں لیکن انسان کے اندر ایک ایسا اصول مضمر ہوتا ہے جو ان تاروں کی جھنکار سے مختلف ہے۔ ارتعاشوں، آوازوں اور محرکات کے درمیان ڈاکٹر مشتاق احمد کی نظمیہ شاعری آنکھیں کھولتی ہے اور زندگی کی موجودہ کرب آمیز ساز پر انگلی رکھتی ہے۔......'' (''گفتنی'' ص:۱۵)

حقیقی وجود نما یہ پیانہ مشتاق احمد کی نظموں میں تجربہ کی شکل میں بصیرت افروز بنتا ہے جسے حقیقی جمالیاتی اور فنی وجودیاتِ شعری کہا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں احتجاج اور اجتہاد معنیات اور کیفیات کو کئی سطحوں میں اجاگر کرتا ہے اور کورونا اور لاک ڈاؤن کے تقاضے کو وسیع، عمیق اور رفیع اظہاریہ میں دیکھا پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظمیں صداقت پارہ کی کیفیت آفریں لفظ و معنی کے وسیلہ سے ہم آہنگ ہیں اسی لیے ان میں گہرائی ہے اور نشان زدگی بھی ہے۔ یہ دراصل آشوبِ آگہی ہے جس سے متاثر دماغ کے کارگاہ سے نفسیاتی کیفیت کارفرما بنتی ہے اور شاعرانہ آفاق کی رو پذیری کو سامنے لاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مگر خوب صورت نظم ''بدلتے لمحوں کا کرب'' ان احساسات کو الفاظ کا جامہ عطا کرتی ہے، ملاحظہ کریں:

کیلنڈر کے اوراق الٹتے جا رہے ہیں/ میری آنکھوں سے کئی حسین منظر ہٹتے جا رہے ہیں/ میرے کان کسی آہٹ کو ترس گئے ہیں/ پردۂ ذہن پر ژالہ سا بنتا جا رہا ہے/ کینوس پر جب بھی/ کوئی تصویر بناتا ہوں/ ادھوری رہ جاتی ہے/ بار بار بناتا ہوں/ مگر وہ چہرہ نہیں بن پاتا/ دیواروں پر لگی تصویروں کو دیکھتا ہوں/ اور پھر کینوس پر انگلیاں پھیرتا ہوں/ مگر بن نہیں پاتا حال کا چہرہ/ اور تصویر ادھوری رہ جاتی ہے/ کیلنڈر کے اوراق الٹتے جا رہے ہیں/ میری آنکھوں سے کئی حسین منظر ہٹتے جا رہے ہیں!

ڈاکٹر مشتاق احمد نے لاک ڈاؤن کے پس منظر میں صداقت کی معنی آفرینی کو سامنے رکھ کر احتجاجی لہجہ اختیار کیا ہے جس میں سچائی، انفرادیت، امتیازی خوبی اور بصیرت بھی ہے۔ اس ضمن میں نظم ''آئینہ حیران ہے!'' دیکھیں :

یہ بحر و بر/ یہ حیوانات و نباتات/ یہ سفرِ آفتاب/ اور سکونِ جاں رات/ جیسے تھے کل/ آج بھی ہیں/ کہ انھیں دعویٰ نہیں/ اپنی شان و اوقات کا/ یہ سمجھتے ہیں خود کو/ عطیہ اس واحد ذات کا/ مگر/ ہم تھے کل جیسے/ آج کہاں ہیں ویسے/ کہ ہمیں دعویٰ تھا بہت/ اپنے علم و ہنر کا/ ہم پلہ سمجھ رہے تھے/ خود کو اس عظیم تر کا/ ہم رات کو دن بنانے چلے تھے/ چاند پر بستی بنانے چلے تھے/ پا کر رتبہ اشرف المخلوقات کا/ بھول بیٹھے تھے سبق کائنات کا/ پہچان بنا بیٹھے تھے ہم/ دیر و حرم کے نام پر/ ایک دوجے کے دشمن تھے ہم/ دین و دھرم کے نام پر/ دیکھ! / ہماری بستی کیسی ویران ہے/ آباد شہرِ خموشاں اور شمشان ہے/ آج دیکھ کر ہم کو آئینہ حیران ہے/ کہ جو کل تھا، یہ وہی انسان ہے!

ڈاکٹر مشتاق احمد نے اپنے لہجہ اور دردمندی کی امتیازی شان کو بڑے پیمانے پر شناخت عطا کرنے کے لئے ان نظموں کو دیوناگری خط میں بھی شائع کرایا ہے۔

پروفیسر آفتاب اشرف کے مضمون ''اجتماعی شعور کا تخلیقی آئینہ: ''آئینہ حیران ہے'' کے درج ذیل سطور شاعر کی نظموں کی نمایاں خصوصیات کو واضح کرتے ہیں:

''ڈاکٹر مشتاق احمد کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تصورِ زیست اور تصورِ فن دونوں واضح صورت میں تخلیقی پیرہن اختیار کرتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا ایک خاص شعور، ایک خاص ادراک اور ایک خاص نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ اگر کہیں احتجاج بھی ہے تو وہ بھی ایک خاص شعور کے ساتھ شعری اظہار کا حصہ بنا ہے۔ دراصل وہ زندگی کی کشمکش سے صرف نظری وابستگی نہیں رکھتے بلکہ عملی جدوجہد کے آرزومند بھی ہیں۔'' (''آئینہ حیران ہے!'' ص: ۴۰)

''آئینہ حیران ہے!'' میں ۳۰ رنظمیں ہیں۔ ہندوستان میں ملک گیر پیمانے پر مکمل لاک ڈاؤن ۲۴ رمارچ سے شروع ہوا جب کہ ان لاکنگ کا مرحلہ وار آغاز یکم جون ۲۰۲۰ء سے ہوا۔ کتاب میں شامل پہلی نظم ''یومِ احتساب'' ۲۸ رمارچ ۲۰۲۰ء کو اور آخری نظم ''کوزہ گر کی یاد میں'' ۲ رجون کو لکھی گئی۔ آغاز اور اختتام کے حوالے سے یہ دونوں نظمیں ذیل میں قارئین کے پیشِ نظر ہیں:

یہ در، دروازے، کھڑکیاں/ سبھی بند ہیں/ اور بند کمرہ/ بن گیا ہے اک آئینہ/ خود کو دیکھتا ہوں/ ہر اک زاویے سے/ مگر کچھ حاصل نہیں/ اک معمہ بن گیا ہوں/ کس سے پوچھوں/ کہ خلا کا سفر/ سمندر کی تہوں تک رسائی/ چاند پر کمند ڈالنے کی ضد/ کوہِ بلند کی فتح یابی/ تمام جہدِ مسلسل/ سعیِ لاحاصل/ کہ بند کمرے میں تنہائی ہے/ اور صرف خوف کا مہیب سایہ/ زندگی بن گئی ہے/ جیسے ایک فلسفے کی کتاب/ مگر کوئی ہے مرے اندر/ جو کہہ رہا ہے/ یہ ہے یومِ احتساب، یومِ احتساب! (یومِ احتساب)

....

وہ کوزہ گر/ جو چاک پر گیلی مٹی کو/ اپنی انگلیوں کی جنبش سے/ کیسے کیسے روپ میں ڈھالتا تھا/ میری آن بوجھ پہیلی کے دنوں میں/ وہ مٹی کا اک کوزہ/ خوشبوؤں کا سمندر لیے ہوتا تھا/ چولہے پر چڑھی ہانڈی کو دیکھ کر/ شکم کی آگ خود بخود ٹھنڈی ہو جاتی تھی/ پنگھٹ پر گھڑوں کی کھنک/ دلوں میں سوسُر باندھتے تھے/ دیوالی کی وہ ڈبیا/ ذہن و دل کے اندھیرے کو روشن کرتی تھی/ مولوی صاحب کا وہ خاکی بدھنا/ احتیاط و حفاظت کا سبق سکھاتا تھا/ دادی ماں کا آبِ جو/ روح کی پیاس بجھاتا تھا/ اس کوزہ گر کے ہاتھوں/ بھگوان کے بھی کئی روپ نکھرتے تھے/ مگر آج/ وہ کوزہ گر ٹکٹکی لگائے/ اپنے خاموش چاک کو دیکھ رہا ہے/ سوکھی مٹی کا درد جھیل رہا ہے/ کہ اب اس کو/ گیلی مٹی کا انتظار ہے/ جس گیلی مٹی کو/ وہ اپنی انگلیوں کی جنبش سے/ کئی روپ میں بدلتا تھا/ اب وہ گیلی مٹی/ اس کے روپ کو بدلنے والی ہے!

(کوزہ گر کی یاد میں)

اس طرح مذکورہ کتاب میں شامل تقریباً تمام نظمیں لاک ڈاؤن کے دوران لکھی گئیں۔ یہ دورانیہ نہ صرف ملک گیر تالابندی کے لیے یاد کیا جائے گا بلکہ غریب عوام بالخصوص یومیہ اجرت پانے والے افراد کی کس مپرسی اور کام کی جگہوں سے اپنے گھروں کو پہنچنے کی جدو جہد میں جان گنوانے والے مزدوروں کی بے بسی اور لاچاری کے لیے بھی جانا جائے گا۔اس کرب کی نمائندگی کرتی ایک نظم ''دو جڑ کے ہم'' ملاحظہ ہو:

برگد کی چھاؤں میں/ تھکے ہارے ہوئے/ وہ سب جو بیٹھے ہوئے ہیں/ زندگی کی جنگ ہارے نہیں ہیں/ وہ سب ایک دوجے کو دیکھ کر/ بھول گئے ہیں اپنا غم/ کہ ہر ایک کا دکھ/ دوسرے سے بڑا ہے/ ہزار ہا میل چلے چکے ہیں مگر/ ان کی منزلوں کا/ آدھا راستہ پڑا ہے/ یہ سب جو ایک دوسرے کے غم خوار ہیں/ کچھ دیر پہلے سب انجان تھے/ کوئی دیر کے محافظ/ اور کوئی حرم کے پاسبان تھے/ مگر اب دیکھ کر/ سب اپنے پاؤں کے چھالوں کو/ پوچھ رہے ہیں/ سب آسمان سے/ کیا سچ مچ ہم انسان ہیں/ ان کے نیم جان بچے/ ہواؤں میں جھول رہے ہیں/ برگد کے ریشے کو دیکھ رہے ہیں/ ان کو معلوم نہیں/ کہ یہ ریشے اک دن/ زمین تک پہنچیں گے/ اور پھر ایک جڑ بن جائیں گے/ اور ان کے پاؤں کے نیچے کی زمیں بھی/ ختم ہو جائے گی!

ڈاکٹر مشتاق احمد نے کورونا اور لاک ڈاؤن کے اثرات کے ہر پہلو کا بڑی نفاست سے جائزہ لیتے ہوئے حالاتِ حاضرہ پر نگاہ ڈالی ہے۔ پروفیسر محمد علی جوہر (صدر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''آئینہ حیران ہے'' کی نظمیں محض احتجاجی و انقلابی فکر کی آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ کورونا جیسی مہلک وبا کی آڑ میں عالمی سطح پر جس طرح کے واقعات و حادثات رونما ہوئے ہیں اور بالخصوص اپنے ملک ہندوستان میں جس طرح محنت کش طبقوں کے ساتھ سیاسی فریب ہوا ہے اور غیر انسانی رویہ اپنایا گیا ہے، ان تمام فکری و نظری موضوعات کو شعری پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔''

(مضمون ''کثیر الجہاتی و کثیر المعانی شاعری کا البم'' ''آئینہ حیران ہے'' ص:۲۱)

مزدوروں کی ہجرت کے روح فرسا واقعات پر ان کی نظم ''ہم شرمندہ ہیں'' کے ابتدائی چند مصرعے ملاحظہ کریں جہاں انگریزوں کے دورِ اقتدار میں مظالم کی داستانوں کا بیان ملتا ہے:

ہم نے سنا ہے/ فرنگی ہمیں انسان نہیں مانتے تھے/ تاریخ میں درج ہیں/ ایسی ہزاروں دردناک کہانیاں/ اور دادی ماں بھی سناتی تھیں/ گورے حاکموں کے ظلم کی داستاں/ ..../ مگر/ ہمارے پرکھوں نے/ ہمیں دیکھنے نہیں دیا/ غلامی کی وہ شبِ سیاہ

اور اس احساسِ تفاخر کے ساتھ شاعر کو احساسِ ندامت بھی ہوتا ہے جب وہ ان آمادۂ ہجرت مزدوروں کی کس مپرسی کو دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔اسی نظم سے درج ذیل سطور دیکھیں:

مگر ہم شرمندہ ہیں/ ترے ہزار ہا میل کے سفر/ ترے پاؤں کے آبلوں کو دیکھ کر/ ترے کندھوں پر بلکتی ہوئی/ اداس معصومیت کو دیکھ کر/ ہم شرمندہ ہیں/ ترے بے سروساماں قافلے پر/ ان دواؤں کی بارش دیکھ کر/ کہ جن سے مارے جاتے ہیں/ مضر کیڑے مکوڑے

اسی نظم کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ جب ہجرت کرتے ہوئے ان مفلوک الحال مزدوروں کو راستے میں پیش آنے والی مزید پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو کوئی بھی حساس دل آب دیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا:

ہم شرمندہ ہیں/ کہ تم!/ گاؤں کے پیپل کی چھاؤں دیکھ نہیں سکے/ اپنے آدھے راستے سے/ آگے قدم نہیں رکھ سکے/ تم کھاتے رہے در بدر لاٹھیاں/ تمہاری ماں بہنیں/ پیٹتی رہ گئیں چھاتیاں

افسوس کا مقام یہ تھا کہ ان مزدوروں کی پریشانیوں کا علم میڈیا کے توسط سے انتظامیہ کو بھی پورے طور پر تھا لیکن جہاں ایک طرف انتظامیہ نے ان مزدوروں کی جانب سے منہ پھیر رکھا تھا، وہیں اشرافیہ طبقہ بھی ان کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ لہٰذا اس نظم کا اختتام شاعر ایک زبردست طنز کے ساتھ کرتا ہے کہ مزدوروں کا ہجوم ایک قطرہ پانی کو ترس رہا ہے اور ہم لوگ گھروں میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ٹی وی پر انھیں تڑپتا دیکھ رہے ہیں:

یہ اور بات ہے کہ/ سڑکوں پر چل رہے/ ہجوم کو میسر پانی نہیں ہے/ ہم شرمندہ ہیں/ تجھ سے بہت شرمندہ ہیں/ کہ ہم گھروں میں بیٹھ کر/ گرم چائے کی چسکیوں کے ساتھ/ ٹی وی پر ہر ایک بریک کے بعد/ تمہیں تڑپتے ہوئے/ اور کسی کو چھکتے ہوئے/ دیکھ رہے ہیں/ ہم شرمندہ ہیں/ ہم شرمندہ ہیں!

جو واقعات اس نظم یا اس قبیل کی دیگر نظموں کے محرک بنے ہیں، ان کا ذکر بھی ڈاکٹر مشتاق احمد نے اس کتاب میں ''اپنی بات'' کے تحت کیا ہے۔ چند سطور ملاحظہ فرمائیں جو شاعر کی حساس طبیعت اور اضطرابی کیفیت کا بین ثبوت ہیں :

''......اپنے وطنِ عزیز میں ایک طرف کورونا جیسی مہلک وبا کا قہر ٹوٹ رہا تھا تو دوسری طرف سیاسی جبر و استبداد نے لاکھوں مزدوروں کو اذیت ناک زندگی جینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ملک کے مختلف چھوٹے بڑے شہروں سے مزدوروں کا قافلہ در قافلہ ہزار ہا میلوں کے سفر پر پاؤں پیدل نکل چکا تھا۔ ان کے معصوم بچے ان کے ناتواں شانوں پر دم توڑنے لگے تھے اور ان کے پاؤں کے چھالے ان کی سانسوں کو روک رہے تھے۔ ویران سڑکوں پر بھی انہیں کچلا جارہا تھا اور خاموش ریل کی پٹریوں پر ان کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ ایک روٹی کے لیے دس بارہ گھنٹوں تک قطار میں کھڑی بھیڑ کا منظر خون کے آنسو رلانے لگا تھا اور میں اپنے کمرے میں قید اضطرابی کیفیت کا شکار تھا۔......'' (ص:۱۱)

کتاب کی دیگر نظموں بالخصوص ''میں چپ ہوں''، ''نیا عہدنامہ''، ''صدائے خانہ بدوش''، ''اندیشہ''، ''حیاتِ نو''، ''سوال'' وغیرہ میں کورونا کے مہلک اثرات، اس وبا کے زیر اثر بنی نوع انسانیت کی تکالیف، لاک ڈاؤن کے سبب عوام الناس کے معاشی و اقتصادی مسائل کا بھی کہیں واضح اور کہیں تشبیہاتی ذکر برجستہ کیا گیا ہے جو شاعر کی وسیع النظری کا غماز ہے۔ ان نظموں میں احتجاج کی لہر بھی گاہے گاہے ملتی ہے۔

المختصر زیرِ نظر کتاب ''آئینہ حیران ہے!'' اپنی نظموں کے ساتھ کورونائی/ وبائی ادب کے تحت ضبطِ تحریر میں آئی نگارشات میں سے ایک نمایاں شاعرانہ عمل ہے جس کی پزیرائی ہو رہی ہے۔

☆☆☆

موبائل: 9431085816 / 8902496545 ای میل: imamazam96@gmail.com

ڈاکٹر محمد احسن

نئی قومی تعلیمی پالیسی کی نمایاں خصوصیات

قومی تعلیمی پالیسی کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ہندوستان کی نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 ملک کی نئی نسل کے لیے بہت اہم تسلیم کی جارہی ہے۔ کردار سازی، شخصیت کی تعمیر، جائزہ اور تنقیدی امتحان، تخلیقیت اور برادرانہ جذبہ جیسے عناصر کا فروغ جو کسی بھی عمدہ تعلیمی نظام کے لیے لازمی اجزاء ہیں، ان کی کمی ہمارے تعلیمی نظام میں ایک لمبے وقفے سے محسوس کی جارہی تھی۔

اعلیٰ تعلیمی معیار بہتر افراد تیار کرتا ہے۔ افرادی قوت کسی بھی ملک کی بہت بڑی دولت ہوتی ہے، لیکن اس معاملے میں ہندوستان کا معیار بہت بلند نہیں ہے۔ جاپان اعلیٰ افرادی قوت کی بہترین مثال ہے جہاں 1944 میں خوفناک ایٹمی حملے اور دو بڑے شہروں کی مکمل تباہی کے بعد بھی اس ملک نے اپنی افرادی قوت کو بہتر سے بہتر بنا کر دنیا کے ایک امیر اور ترقی یافتہ ملک کی صف میں بہت جلد شامل ہوگیا۔

ہندوستانی تعلیمی نظام کو اکثر ماہرینِ تعلیم نے قدیم اور فرسودہ قرار دیا ہے، کیونکہ ہمارے تعلیمی نظام میں قابلیت کی جانچ یعنی ہمارے امتحانات کا طریقہ کار نادانستہ طور پر رٹ کر یاد کرنے پر یعنی Rote Learning Method پر زور دیتا ہے جس کا روزمرہ کی زندگی میں حقیقی استعمال نہیں ہے۔ **(بحوالہ NEP - 2020 Documents)**
نئی قومی تعلیمی پالیسی کی نمایاں خصوصیات ذیل ہیں۔

اسکولی تعلیم

(1) **ابتدائی بچپن کی تعلیم**: یہ پالیسی ابتدائی برسوں کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ اور اس کا مقصد 2025 تک 6-3 سال کے تمام بچوں کے لیے ابتدائی بچپن کی معیاری نگہداشت اور تعلیم کو یقینی بنانا ہے جس میں خاطر خواہ سرمایہ کاری اور نئی پیش قدمی کی جائے گی۔

(2) **بنیادی خواندگی اور عددشماری**: درجہ 5-1 میں ابتدائی زبان اور ریاضی پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ پالیسی کا مقصد یہ یقینی بنانا ہے کہ درجہ 5 اور اُس کے بعد کے ہر طالب علم 2025 تک بنیادی خواندگی اور عددشماری کی صلاحیت کا حامل ہوجائے۔

(3) **درسیات اور تدریسیات**: ذہنی ارتقا اور آموزشی اصولوں کی بنیاد پر اسکولی تعلیم کے لیے ایک نیا ارتقائی موزونیت والا درسیاتی اور تدریسیاتی خاکہ 4+3+3+5 کی طرز پر وضع کیا گیا ہے۔ اسکول میں پیشہ ورانہ تعلیم کے ساتھ تمام مضامین مثلاً سائنسی علوم، سماجی علوم، علم فن، زبان، کھیل اور ریاضی پر یکساں زور دیا جائے گا۔

(4) **سب کی رسائی**: اس پالیسی کا مقصد مختلف اقدامات کے ذریعے 2030 تک پوری اسکولی تعلیم کے لیے 100 فیصد مجموعی داخلہ تناسب (Gross Enrolment Ratio) حاصل کرنا ہے۔

(5) **مساویانہ اور شمولیاتی تعلیم**: اس پالیسی میں یہ یقینی بنانے کے لیے کئی ٹھوس اقدامات کی تجویز پیش کی گئی ہے

تا کہ کوئی بھی بچہ پیدائش یا اپنے پس منظر کی وجہ سے آموزش اور آگے بڑھنے کے کسی بھی موقع سے محروم نہ رہے۔ اس پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے خصوصی تعلیمی خطے (Education Zones) بھی بنائے جائیں گے۔

(6) **اساتذہ:** اساتذہ کی تقرری مستحکم اور شفاف عمل کے ذریعے کی جائے گی۔ عہدے کی ترقی لیاقت پر مبنی ہوگی۔ کارکردگی کے کثیر ماخذی وقفہ جاتی جائزے لیے جائیں گے اور تعلیمی انتظام کار، یا تربیت یافتہ اساتذہ (Trained Teachers) بننے کے لیے پیش رفت کی راہیں ہموار ہوں گی۔

(7) **اسکول کا نظم و نسق:** اسکولوں کو اسکولی مجموعوں (20-10 پبلک اسکولوں کے کلسٹر) میں منظم کیا جائے گا۔ یہ نظم و نسق اور انتظامیہ کی بنیادی اکائی ہوگی جو تمام وسائل مثلاً بنیادی ڈھانچہ، تعلیمی (مثلاً لائبریریاں) اور افراد (مثلاً آرٹ اور موسیقی کے اساتذہ) اور ساتھ ہی اساتذہ کے ایک مضبوط پیشہ ور معاشرے کی دستیابی کو یقینی بنائے گی۔

II اسکولی تعلیم

(1) **نیا ڈھانچہ:** اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک نیا وژن اور ڈھانچہ تجویز کیا گیا ہے جس کے تحت وسیع، باوسائل، فعال کثیر شعبہ جاتی ادارے وجود میں آئیں گے۔ موجودہ 800 یونیورسٹیوں اور 40,000 کالجوں کو تقریباً 15,000 ممتاز اداروں میں منسلک کیا جائے گا۔

(2) **لبرل تعلیم:** سائنس، علم فن، انسانیات، ریاضیات اور پیشہ وارانہ شعبوں میں مربوط شدہ، مشکل مواقع کے لیے انڈر گریجویٹ سطح پر ایک وسیع اساس لبرل آرٹ کی تعلیم کو رکھا جائے گا۔ اس میں تخیلاتی اور لچک دار درسیاتی ڈھانچے، مطالعے کی تخلیقی آمیزش، پیشہ ورانہ تعلیم کی یکجائی اور داخلے اور فراغت کے پہلو شامل ہوں گے۔

(3) **نظم و نسق:** ادارہ جاتی نظم و نسق، تعلیمی، انتظامی اور مالی خودمختاری پر مبنی ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم کے ہر ادارے کا نظم و نسق ایک خود مختار بورڈ چلائے گا۔

III اساتذہ کی تربیت

اساتذہ کے تربیتی پروگرام کثیر المقاصد ہوں گے اور یہ پروگرام اعلیٰ تعلیم کے فعال اور کثیر شعبہ جاتی اداروں میں منعقد ہوں گے۔ کثیر شعبہ جاتی ادارے ٹیچرس ٹریننگ کے لیے 4 برس پر مشتمل مربوط مرحلہ مخصوص اور مضمون مخصوص بیچلر آف ایجوکیشن کا کورس چلائیں گے اور یہی طریقہ سب سے زیادہ قابلِ قبول ہوگا۔ تربیت اساتذہ کے غیر معیاری اور غیر کارآمد ادارے بند کردیے جائیں گے۔

IV پیشہ ورانہ تعلیم

پیشہ ورانہ تعلیم اعلیٰ تعلیمی نظام کا اٹوٹ حصہ ہوگی۔ صرف تکنیک مخصوص یونیورسٹیوں، صحت سائنس کے لیے مخصوص یونیورسٹیوں، قانون اور زراعت کے لیے مخصوص یونیورسٹیوں یا ان شعبوں یا دیگر شعبوں کے لیے مخصوص اداروں کو بند کر دیا جائے گا۔

نئی تعلیمی پالیسی میں وہ تمام تبدیلیاں شامل ہیں جو ایک طویل عرصے سے لازمی سمجھی جارہی تھیں۔ نئی پالیسی میں 2+10 درسیاتی اور تدریسی ڈھانچے کو ختم کردیا گیا ہے اور ذہنی ارتقا و آموزشی اصولوں کی بنیاد پر اسکولی تعلیم کے

لیے ایک نیا ارتقائی موزونیت والا درسیاتی اور تدریساتی ڈھانچہ 4+3+3+5 کے طرز پر وضع کیا گیا ہے۔ یعنی ابتدائی تعلیم کے پانچ سال، 3 سال کی تیاری کا مرحلہ، 3 سال کا درمیانی مرحلہ اور سیکنڈری اسکولنگ کے لیے چار سال کر دیا گیا ہے۔ اسی نظام میں امتحانات صرف پانچویں، آٹھویں اور بارہویں جماعت کے لیے ہوں گے۔(بحوالہ NEP - 2020 Documents)

نئی قومی تعلیمی کے تحت مختلف شعبوں (Streams) یعنی سائنس، آرٹس اور کامرس کے مابین سخت امتیازات سے گریز کیا گیا ہے جو گیارہویں جماعت سے لاگو ہوتا ہے۔ اس کثیر الشعبہ کورس (Multi-disciplinary Courses) کے تحت اگر کوئی چاہے تو نفسیات اور سماجیات کے ساتھ ساتھ طبیعات کا بھی انتخاب کر سکتا ہے۔ ان تبدیلیوں سے طلبا کے کاندھوں سے بہت سارا بوجھ کم ہو جائے گا نیز طلبا کو غیر نصابی سرگرمیوں اور کھیلوں میں حصہ لینے کا بھرپور موقع ملے گا۔

نئی تعلیمی پالیسی میں کہا گیا ہے کہ درجہ 5 تک تمام اسکولوں میں تعلیم کا ذریعہ مادری زبان یا مقامی زبان یا علاقائی زبان ہوگی۔ یہ ایک مثبت تبدیلی ہے کیونکہ مادری زبان میں افہام اور تفہیم کا مسئلہ نہیں رہتا۔ بچوں میں تخلیقیت اور برادرانہ جذبے کا مزید فروغ ہوگا۔ طلبا کو مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ البتہ انگریزی کو براہ راست درجہ ششم میں متعارف کرانا ان طلبا کے لیے سخت اور مشکل ثابت ہوگا جو متمول گھرانوں کے طلبا جیسے مراعات یافتہ نہیں ہیں۔ اعلیٰ و متمول گھرانوں کے بچے تو انگریزی زبان ابتدائی درجہ سے سیکھ لیں گے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ان کے کنبے میں ہر شخص روزمرہ کی زندگی میں اس زبان کا استعمال کرتا ہو لیکن سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقوں کے بچوں کے ساتھ صورتِ حال مختلف ہو سکتی ہے۔

ہمارے ملک کے متوسط طبقے کے طلبا جنھیں انگریزی زبان کی سمجھ اور انٹرنیٹ کی رسائی حاصل ہے۔ جوان مراعات کے ذریعہ زندگی میں نئے ترقی کے مواقع حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ درسیات و تدریسات کی ان تبدیلیوں کے ذریعہ انھیں یہ مواقع نہ فراہم کرنا کتنا منصفانہ ہوگا۔ اس پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہمارے ملک کے طلبا پوری دنیا میں انگریزی قابلیت کی وجہ سے ہی آئی ٹی انڈسٹری میں اپنا نام روشن کر رہے ہیں۔ انگریزی صلاحیت کے سبب ہندوستانی Diaspora پوری دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ سرکاری اسکولوں کے حالات بھی قطعی بہتر نہیں ہیں، طلبا میں اہلیت کی کمی واضح طور پر عیاں ہے۔ ممکن ہے کہ درسیات و تدریسات کی یہ تبدیلی مجموعی طور پر ایک واضح تفریق کا ذریعہ بن جائے۔ جو لوگ انگریزی زبان بول سکتے ہیں ان کے لیے زندگی کا نقطہ نظر (World View) ان لوگوں کے مقابلے وسیع تر ہوگا جن کو انگریزی زبان پر عبور حاصل نہیں ہوگا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں یہ ایک بہت ہی عام سی بات ہے اسے قیاس آرائی کا نام دے کر ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ انگریزی زبان کو پہلی یا دوسری جماعت سے متعارف کرایا جائے کیونکہ انگریزی کو ایک غیر ملکی زبان ہونے کے باوجود بھی ہم اسے اپنا چکے ہیں۔ ویسے بھی کثیر اللسان ہونا صلاحیت مند ہونے کی ایک نشانی تسلیم کی جاتی ہے۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی میں اعلیٰ معیار کی ذولسانی کتب تیار کرنے کی بات کی گئی ہے تاکہ طلبا انگریزی اوران کی علاقائی دونوں زبانوں میں تصورات کو سمجھ سکیں۔ تاہم اس پر روشنی بھی ڈالی گئی کہ اس کو کیسے انجام دیا جائے گا۔ اگر چہ ہمارے اپنے لسانی ورثے کو بچانا انتہائی ضروری ہے لیکن کیا ہم اسے Learning outcome کی قیمت پر بچانا چاہیں گے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے تعلق سے تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے لاتعداد عہدے خالی ہیں۔ ان اداروں میں میز، کرسیاں اور دیگر بنیادی انفراسٹرکچر نیز اچھی طرح سے لیس لائبریریوں کی کمی ہے۔ کالج میں تدریسی کام کافی حد تک ایڈہاک اساتذہ کے ذریعہ چل رہا ہے۔ یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ کیا ان قلیل وسائل سے دو چار تعلیمی اداروں کے ذریعہ ایک طویل مدتی پائدار منصوبہ (Long Sustainable Plan) بنانا ممکن ہو پائے گا۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی کا مقصد علمی معیشت پیدا کرنا بھی ہے۔ نالج اکنامی (Knowledge Economy) کے لیے یہ لازمی ہے کہ طلبا میں مختلف مہارتیں پیدا کی جائیں۔ سائنسی مزاج کو فروغ دیا جائے جن کی کمی اب تک محسوس کی جارہی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کرونا وبا کے زیراثر اس بڑھتی ہوئی معاشی مشکلات اور مہنگے ہوتے تعلیمی اخراجات کے سبب بچوں کی تعلیم خصوصاً لڑکیوں اور معذور بچوں کی تعلیم کو عیش وعشرت نہ سمجھا جانے لگے۔ اس پالیسی میں غیر ملکی یونیورسٹیوں کے ہندوستان میں کیمپس بنانے کے لیے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ اب یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ بیرونی یونیورسٹیاں معاشی طور پر کمزور طلبا کو وہ مراعات فراہم کریں گی؟ جو سرکاری یونیورسٹیوں میں معاشی طور پر کمزور طلبا کو حاصل ہوتی ہیں۔ کیا نئی پالیسی طلبا کو بیرون ملک جانے کے بجائے ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آمادہ کرسکتی ہیں؟

یہ واضح ہے کہ مابعد کرونا دنیا میں کلاس روم اور سیکھنے کا عمل ایک جیسے نہیں ہوں گے۔ ان حالات میں آنے والے دنوں میں طلبا کو درپیش چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے خاطر خواہ بجٹ کی فراہمی ضروری ہے۔

☆☆☆

ریجنل ڈائریکٹر، مانو بھوپال ریجنل سینٹر

۲۲ فروری ۲۰۲۰ء کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے منعقدہ تقریب ''بیادِ غالب'' میں (دائیں سے) عبدالوارث سفر، ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر صغیر افراہم، ظہیر انور، نسیم عزیزی اور ڈاکٹر منصور عالم

اشرف گل

خدا حافظ

'خدا حافظ' یہ جملہ ہم سب نے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بار دوستوں' رشتے داروں یا دیگر متعلقہ لوگوں سے سنا اور ان سے جواباً کہا بھی ہوگا مگر ہم نے اس جملے کی گنتی کو نہ ہی کبھی قابلِ اعتنا سمجھا اور نہ ہی اس کو سنجیدگی سے سوچا۔ کیوں کہ اب یہ ہمارے ایک کان سے بلا اجازت ہوا کی مانند داخل ہو کر دوسرے سے ہوائی کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس جملے کو سوچتے ہی تر آنکھوں کے تصورات اور یادوں کے ہجوم دل میں در آتے ہیں۔ ایسے رسمی کلمات کی اہمیت ہے بھی اور کچھ بھی نہیں ہاں مگر اپنے بچپن کے دوران مختلف اشغال و مصروفیات کے مابین کچھ خاص مناظر جو میری نظروں سے گذرے۔ ان میں سے کچھ واقعات کا ذکر کرنے جا رہا ہوں۔ امید ہے آپ کے لئے تفنن طبع اور دل جوئی کا باعث ہوں گے۔ گاؤں میں میرے ہم عمر چند لڑکوں کا کھیل کود کا ہر روز کا معمول تو تھا ہی۔ جس کسی نے علی الصبح پہلے بیدار ہو جانا۔ دوسرے دوست کا دوازہ کھٹکھٹا کر اسے ساتھ لینا اور سکول کے وقت سے پہلے ہی سیر سپاٹا کر کے واپس آ جانا۔ کبھی کبھار گاؤں کے اکلوتے تانگہ بان کے تانگا سٹینڈ کی جانب سویرے سویرے گذر ہو جاتا تھا۔ جہاں پر گاؤں کے کچھ لوگ اپنی چھٹیاں گذارنے کے بعد یا کوئی نئی نوکری یا روزگار کی تلاش کے سلسلے میں رخصت ہو رہے ہوتے تھے۔ پردیسی کو اس کے گھر والے تانگے پر ایک بڑے قصبے کی جانب جہاں پر جی ٹی روڈ پر بسوں کا اڈا اور ریلوے سٹیشن تھا۔ بٹھانے کے لئے آتے تو تانگے کی رخصتی کے وقت انہیں 'خدا حافظ' کہہ کر الوداع کیا جاتا۔ ایسے مناظر میں نے کئی مرتبہ دیکھے۔ اور الوداع کرنے اور 'خدا حافظ' کہنے والوں کی بھیگتی آنکھوں کو بھی حیرانی سے دیکھا۔ جیسے خصوصاً کوئی ماں اپنے سپوت کو اس کی نوکری کے سلسلے کسی بڑے شہر بھجوانے پر آنسو چھپا رہی ہے۔ تو ساتھ ہی اس کی بیوی اپنی آنکھوں میں رم جھم برسات کے قطرے اپنے آنچل کے پلو میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ مگر جونہی تانگہ رخصت ہو جاتا، الوداع کہنے والے اپنے جذبات سہلاتے گھر لوٹتے۔ الوداع ہونے والوں کے چہروں پر کوئی پریشانی کی جھلک تک نہ دکھائی دیتی بلکہ تسلی بخش الفاظ ہی ہوتے۔ ایسے تو ہوتا مردوں کو وداع کرتے وقت مگر جب کوئی مرد اپنی بیوی' بہن یا ساس وغیرہ کو رخصت کرتا ہوتا۔ تو مرد لوگ جلد بازی میں خدا حافظ ایسے کہتے۔ جیسے وہ کسی ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا پا رہے ہوں۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے تیکھی اور چھیڑ خانی جیسی خوشی کی جھلک ہوتی۔ سوائے ماؤں کی ممتا کے جو ہمیشہ ملول ہی دیکھی جاتی ہیں۔ ہم بچے لوگ بس ایسا تماشا دیکھ کر یہ غور کرتے کہ دلہنیں کیوں روتی تھیں اور مرد کیوں ہنستے تھے؟ یہ اس وقت معلوم نہیں ہوتا تھا مگر جوں جوں ہم جوان ہو کر سمجھ سے دوچار ہوئے تو ایسے حالات سے گذرتے لوگوں دیکھ کر خاصا پتہ چل گیا کہ شروعات میں تو خاوند بیوی کا پیار لیلیٰ مجنوں ایسا ہوتا ہے۔ بعد میں لیلیٰ کا رنگ کالا نظر آنے لگتا ہے تب حالات دگرگوں ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورتیں نازک مزاج ہوتی ہیں۔ کوئی غمگین واقعہ سنا نہیں' ان کے آنسو بغیر کوئی تفتیش کئے آنکھوں کو دھندلانے لگتے ہیں۔ مگر مردوں کی آنکھیں ہمیشہ خشک ہی دیکھی گئی ہیں۔ مقابلتاً عورتیں چاہے کسی بھی خاندان کی ہوں۔ کوئی ذات پات ہو۔ امیر ہوں یا غریب۔ وہ رونے دھونے میں خوب ماہر ہوتی ہیں اور اس ضمن

میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتیں۔ کسی ٹریجڈی فلم ہی کو دیکھ لیجے۔ پردہ سکرین پر اکثر ایکٹریس ہی روتی ہیں اور ناظرین میں ہر ایک جنس کی نظریں بھگوتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ عورتوں کو ہر قسم کا رونا آتا ہے۔ اصلی سے لے کر نقلی تک (معاف کیجیے۔ محترماؤں کا احترام میرا اولین عقیدہ ہے۔ ان کو نشانہ تضحیک بنانا میرا ہرگز ہرگز مقصد نہیں۔ ان کی عظمت کئی پہلوؤں سے اپنی جگہ مقدم ہے)۔

پھر ذرا بچپن سے نوجوانی میں قدم رکھا۔ تو سوچنے سمجھنے کی تاویلیں اور دیکھنے کے زاویے تبدیل ہونا شروع ہوئے۔ ہم تو 'خدا حافظ' کے معنی یہی سمجھتے تھے کہ کسی کو اگر کہہ دیا تو سمجھو گیا کام سے۔ شاید کبھی اسے دیکھ نہیں پائیں گے۔ یا کچھ دیر کے بعد ان سے ملاقات ہوگی مگر چند ایک نوجوان دیکھنے میں آہی گئے۔ جن پر 'خدا حافظ' کا قانون لاگو ہی نہیں ہو پایا کبھی بھی۔ جیسے ایک ماں نے گذشتہ روز اپنے سپوت کو دل پر پتھر رکھ کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر شہر روانہ کیا تھا۔ اس تاکید کے ساتھ۔ کہ بیٹا دل لگا کر کام کرنا۔ اپنے چچا کے دلائے ہوئے کام کو دھیان سے سرانجام دینا۔ کہیں اس کی رسوائی نہیں کروانا۔ مگر وہ اگلے ہی دن گاؤں میں دندناتا پھر رہا ہے۔ کہتا ہے۔ میں اماں کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے واپس لوٹ آیا۔ اسی ہی طرح جیسے ایک ماں کا بگاڑا ہوا ایک لاڈلا بیٹا ایک صبح کو جلدی ہی اُٹھ گیا تو ماں نے بلائیں لیتے ہوئے کہا 'میرا بیٹا تو آج خیر سے سورج نکلنے سے پہلے ہی بیدار ہو گیا ہے۔ تو بیٹے نے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ نہیں اماں۔ میں تو پیشاب کر کے واپس سونے جا رہا ہوں۔ پھر ایسے بھی ہوا۔ جب کھیل کے میدان میں ٹیم کپتان کسی کھلاڑی کو ٹیم سے آؤٹ کرتا تو اس پر بھی اس کے دوست طنزاً 'خدا حافظ' لاگو کر دیتے۔ پھر بچوں کے کسی کھیل میں کوئی بچہ اپنی ہار پر رو پڑتا اور کھیل سے از خود کنارہ کشی کرتا۔ اس پر بھی چھیڑ خانی کی بنا پر خدا حافظ کا نعرہ لگا کر جملہ کسا جاتا۔ نوجوانوں میں تاش کھیلتے کسی ٹیم کی ہار پر بھی خدا حافظ کہہ کر مزا لیا جاتا۔ بہر حال اس جملے کو متعدد مواقع پر مختلف طریقوں سے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ دنیا کا مصدقہ قانون جس کو کسی بھی حالت میں کوئی بھی 'خدا حافظ' نہیں کہہ پایا: وہ ہے: 'might is right' یعنی 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس'۔ اس قانون کو بچپن سے اب تک دیکھا۔ کیا خورد و کلاں' کیا کم سن و جواں' کیا تنومند و ناتواں۔ طاقت کے اس سرکش اور ضدی گھوڑے کے مونہہ میں اس ٹیکنالوجی کے دور میں بھی کوئی لگام نہیں ڈال پایا۔ قومی کیا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کی مضبوط گرفت سے آزادی ممکن نہیں ہو پائی۔ تاریخ بھی اس حقیقت کی گواہ ہے۔ 'might' کے آگے سبھی نظام ہیچ ہیں۔ تمام فلسفے غلط ہیں۔ بچپن سے لے کر اب تک دیکھا۔ غریب تب بھی ظلم کی زد میں تھا اور اب بھی طاقت کے پنجوں میں گرفتار ہے۔

گو اپنی زندگی میں بھی سینکڑوں لوگوں کو مختلف مواقع پر 'خدا حافظ' کہا اور سننے کو بھی ملا ہے۔ کچھ لوگ تو کہیں نہ کہیں کسی خاص دعوت میں اور کئی اتفاقیہ طور پر بھی مل گئے۔ مگر کئی لوگوں سے قطعاً کبھی بھی ملاقات نہیں ہو پائی جن سے بوقت رخصت کہا گیا کہ ملاقات ضرور ہوگی۔ افسوس ہے کہ یونہی کئی رسمیہ وعدے ہم سب سے وفا نہ ہو پائے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حالات نے مونہہ موڑ لیا۔ سبھی نے عزیزوں کے بچھڑنے پر یہی فقرہ بولا۔ چاہے وہ لوگ تعلیم یافتہ تھے یا ان پڑھ۔ ان سبھی کی اپنی اپنی بول چال کے لحاظ سے ادائیگی بھی سنی۔ کسی نے کہا۔ اچھا 'خدا حافظ' آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ تو کسی نے کہا۔ 'کھدا حافج'۔ جیسے جیسے بھی کسی کی زبان نے ادائیگی کی۔ مطلب سبھی

سمجھتے ہیں۔آج بھی ہر گھر میں مہمانوں کی آمدورفت پر یہ جملہ بولا جاتا ہے۔مگر عزیزوں کو دور دراز وداع کرنے والوں کے کچھ مناظر بھی میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اندرونی درد وکرب اوراداس آنکھوں میں آنسوؤں کی شکل میں دیکھے ہیں۔جس میں لاچاری ہوتی تھی تقریباً سبھی لوگ ہی اپنے پیاروں کو کسی بھی قیمت وداع نہیں کرنا چاہتے مگرایک دوسرے سے جدا ہونا ہی دراصل کامیاب زندگی کا راز ہے۔

پھرایسا بھی دیکھا۔چندایک نوجوانوں میں سے ایک نے دوسرے دوست کو مذاقیہ طور پر جب عارضی طور پر کہیں جاتے ہوئے 'خدا حافظ' کہا۔تو اسے جواب ملا۔چھوڑو یار: میں کوئی کلکتے تھوڑا جارہا ہوں۔ابھی دو گھنٹے کے بعد لوٹ آؤں گا۔(اس دور میں گاؤں کے کچھ لوگ اپنے روزگار کے سلسلے میں کلکتے، بمبئی، وزاگا پٹنم میں جاتے تھے اور سالوں کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے تھے) کسی کسی کو یہ بھی کہتے سنا جاتا۔جب میں دبئی یا دیگر کسی غیر ملک جاؤں گا تب مجھے وداع کرتے یہ جملہ ادا کرنا اور جو مرضی کہنا۔اس وقت مذاق مت کرو۔ابھی تو میں حجام سے شیو کروانے جارہا ہوں۔کسی نے بولنا۔یار۔مولوی صاحب کہتے رہتے ہیں۔اللہ تعالی شاہ رگ سے بھی قریب ہے۔اس آیت کے مقابل 'خدا حافظ' کا مطلب پھیکا ہے۔اس بارے کسی کی کوئی بھی دلیل یا تبصرہ کارآمد نہیں ہو پایا۔کیونکہ یہ فقرہ تو کبھی بھی کسی نے کہنا چھوڑا ہی نہیں۔یہاں تک کہ ہماری پڑوسن ایک ان پڑھ لڑکی جس کا بھائی کچھ جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔کسی رشتے دار کی وساطت سے بڑے شہر میں اپنی نوکری کے سلسلے جارہا تھا۔اس کی ماں اس کو سواری تک چھوڑنے گئی تھی۔تو اس لڑکی نے اپنی ماں سے واپسی پر پوچھا۔بے بے۔تم نے بھائی کو وہ کہا ہے۔جو بھی لوگ اپنے رشتے داروں یا مہمانوں کو جاتے ہوئے کہتے ہیں۔ماں نے کہا۔ہاں بیٹی۔میں نے بولا تو سہی۔مگر الٹا سیدھا سا۔کیونکہ مجھے ان لوگوں کے جیسی گلابی اردو بولنی نہیں آتی تھی۔مگر تمہارا بھائی اتنا سیانا ہے۔وہ جھٹ سے میری زبان سمجھ گیا۔اور مسکرا کر مجھے واپسی بولا۔اچھا۔اماں۔آپ کا بھی خدا حافظ۔یہ بھی دیکھا گیا ہے۔چونکہ یہ جملہ کسی سے جدا ہونے کے وقت بولا جاتا ہے اس لئے اس فقرے کی ادائیگی کے بعد خوشبیوں کی بجائے۔اداسیاں چھلکتی ہیں مگر وہ بھی عارضی کیوں کہ جب جانے والے چلے جاتے ہیں۔تو چند دنوں کے بعد ان کی یادیں خواب ہو جاتی ہیں۔مگر کچھ گہری بھی یادیں ہوتی ہیں۔جو دو دلوں میں پہلی محبت سے رونما ہوتی ہیں۔ماں جب الوداع کہے تو۔میں نے بسا اوقات ایسے مواقع پر اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کو روکنے کا عمل اور چہرے پر یاس وحسرت ضرور دیکھی۔جس کو صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا جب کہ باقی لوگوں کے لئے تو وہ موقع ایک تفنن طبع ہی کا باعث ہوتا تھا جیسے ایئر پورٹس پر جہازوں کو آتا جاتا دیکھنے کا نظارہ وغیرہ۔میں یہ بات پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً آپ سب قارئین نے اپنے ایسے ہی وداعی اوقات میں خصوصاً اپنی اپنی ماؤں کی آنکھوں میں آنسوؤں یا یاس و بے چارگی کے نمونے ضرور دیکھے اوران کی اداسیوں کو بھی محسوس کیا ہوگا۔

ہاں تو گاؤں کے اس اکلوتے تانگے کے اردگرد ہر صبح کے وقت 'خدا حافظ' کہنے والوں کے چند مناظر آپ کے سامنے پیش کردیئے ہیں۔مگر بوقت شام اسی ہی تانگے کو واپسی گاؤں میں مختلف گھروں کی سواریوں سے لدا ہوا بھی دیکھا۔جن لوگوں کو اپنے پیاروں کی آمد کی خبر ہوتی تھی وہ تانگے کے اڈے پر پہنچ جاتے اور انتظار کے دوران آپس میں ادھر ادھر بیٹھ کر اپنے آنے والے پیاروں کی اچھی یادداشتوں کے قصے سناتے رہتے۔جونہی تانگہ نمودار ہوتا۔تو

سبھی کی باتیں جہاں ہوتیں وہیں تھم جاتیں اور چہروں پر خوشی لئے تانگے کی جانب لپکتے۔ کسی کا بیٹا۔ کسی کا بھائی۔ کسی بیوی کا شوہر۔ کسی کی ساس۔ کسی کا سسر۔ کسی کا کوئی کسی کا کوئی رشتے دار۔ ان سبھی کو لینے والوں کے لب پر اب مختلف جملہ 'خوش آمدید' یا اس جیسا کچھ اور ہوتا۔ اس دوران سبھی کے چہروں پر فقط مسکراہٹ' ہنسی اور نشاط کے جذبات مختلف مختلف ہوتے۔ کسی کی ہنسی بہت زیادہ ہوتی۔ کوئی ایسا بغل گیر ہوتا۔ کہ مہمان کی سانس رکنے لگتی۔ کسی نوبیاہتا کو اپنے دوپٹے میں منہہ چھپا کر اس خوشی کو قابو میں لانا پڑتا تھا۔ اگر چہ سب مہمانوں کے رشتے دار حاضر نہیں ہوتے تھے مگر جن جن کے بھی ہوتے ان کے چہروں سے مہمانوں کو استقبال کرنے والے تاثرات قابل دید ہوتے تھے۔ کوچوان تو اس عمل میں تمام جذبات سے بے گانہ اپنی مزدوری فرداً فرداً ہر ایک سے وصول رہا ہوتا۔ اس کو کسی بھی جانے یا واپس آنے والے سے کچھ سروکار نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو صبح کے وقت تانگہ لیٹ ہی چلاتا تھا تا کہ کوئی بستر سے لیٹ اٹھنے والی سواری بھی اس کی مزدوری میں اضافے کا باعث بن سکے۔ اور ایسے ہی واپسی پر وہاں کے تانگہ اسٹینڈ سے دیر ہی سے نکلتا۔ آخری ریل گاڑی اور بس کا انتظار کرتا تا کہ اپنے گاؤں کی کوئی سواری وہاں نہ رہ جائے۔ قصبے میں پسماندہ مسافروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ وہاں نہ تو کوئی ہوٹل تھا۔ اور نہ ہی کوئی سرائے۔ کوئی وہاں اتفاقیہ رہ بھی جاتا۔ تو اس کو کسی دکان کے شٹر کے سامنے ہی نیم خفتہ حالت میں رات بسر کرنا پڑتی۔ تبھی دور دراز سے آنے والوں کو تانگہ چھوٹنے کی ازحد فکر ہوتی تھی۔ بہر حال روتے اور مسکراتے چہرے' خوشی اور غم کے مناظر ایک ہی دن میں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا۔ کہ زندگی فقط صبح سے لے کر شام تک ہی ہے۔ بس آنسوؤں' اداسیوں اور یادوں سے لے کر مسکراہٹوں' مسرتوں اور چھیڑ خانیوں میں گندھی ہوئی۔ اور اب بھی سوچیے۔ فلسفہ زندگی کا ویسے کا ویسا ہی ہے۔

میں نے 'خدا حافظ' کہنے کا ایک اعلیٰ اور انمول نمونہ بھی دیکھا۔ جو ابھی تک میری زندگی کے لمحات کو خوشگوار بناتا ہے۔ میری ماں اپنے کاموں کو جلد نمٹانے اور کسی کام کو لمبا کرنے یا سست روی سے کرنے کی عادی بالکل بھی نہیں تھی۔ اور اس کی ان عادات نے ہی مجھے بھی کاہل اور سست نہیں بننے دیا۔ ہاں البتہ بچپن میں مجھ میں گدھے کے جیسے ڈھٹائی کی صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور ضد کے عوض پٹائی کچھ زیادہ ہی وصول ہوتی تھی۔ ڈھیٹ اور ضدی گدھوں کی خاطر تواضع بھی شاید آپ سب نے گلی بازاروں کوچوں میں گدھا گاڑی بانوں سے کرواتے دیکھی ہوگی۔ میں نے تو اپنے گاؤں میں اپنی نظروں کے سامنے متعدد بار کمہاروں کے ہاتھوں گدھوں کی مرمت کرتے دیکھا ہے۔ وہ بھی ان موقعوں پر جب فصلوں کی کٹائی کے بعد فصل کو زمینوں سے اٹھا کر گھروں یا منڈیوں میں پہنچانا پڑتا تھا۔ تو ان میں سے کچھ گدھے بوجھ کی زیادتی یا فطرت کی مجبوری کے تحت آگے جانے کی بجائے خود کو پیچھے کھینچنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور پھر کمہار لوگ ان کی خاطر جیسے ایک بڑے بانس (چواڑی) کے پے در پے واروں سے دھلائی کرتے تھے۔ یہ امر اگر چہ جانوروں پر تشدد کے ضمن میں آتا ہے۔ مگر اس زمانے تو انسان بھی جانور ہی سمجھا جاتا تھا۔ میری ایک پنجابی غزل کا شعر دیکھیے۔ زندگی ڈھونے کے بارے: میں ہاں گل انسان جاں حیوان ایہہ بجھو۔۔ کھوتیوں ودھ بھار میرے تے گیا ڈھویا۔ (مطلب: میں نے لوگوں سے اپنے یا آپ کے بھی بارے سوال کیا ہے۔ خود کو کہا: کہ میں انسان ہوں یا حیوان۔ بوجھیئے۔ وہ اس لئے کہ گدھے کے بوجھ اٹھانے کی استطاعت سے بھی کہیں زیادہ مجھ پر زندگی کی گاڑی کا بوجھ لادا اور ڈھویا گیا ہے)۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا میری ماں کے 'خدا حافظ' کہنے کا۔ اس کا 'خدا حافظ' کہنے کا انداز سب کے لئے تفنن طبع کا باعث یوں تھا کہ وہ گھر میں آنے والے سبھی مہمانوں کو السلام وعلیکم کا جواب وعلیکم السلام دینے کی بجائے ان کو دہلیز کے اندر آنے سے پیشتر ہی کہہ دیتی تھی۔ اچھا پھر 'خدا حافظ'۔۔۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ کہ مہمان واپس چلا جائے۔ وہ مزاحیا طور پر یہ اچھوتا فقرہ بے وقت ادا کرتے ہوئے خوش ہوتی تھی۔ اور مہمانوں کی خدمت بھی دل و جان سے کرتی تھی۔ مہمان واپس لوٹتے وقت 'بے جی' سے ہنس کر کہتے۔ کہ 'بے جی': اب 'خدا حافظ' کہنے کا موقع ہے۔ مگر میری ماں اپنی حاضر جوابی' ہنسی مذاق' اور فی البدیہہ فطرت سے فوراً ہی کہتی۔ کہ میرے بے وقت 'خدا حافظ' کہنے سے تم لوگ کونسا اپنی خاطر تواضع کرائے بغیر واپس گئے ہو؟ پھر سبھی کو ہنسی کے دورے پڑ جاتے۔ میری ماں کی بدولت میری اور میرے بھائی کی بھی طبیعت تفنن طبع پر مائل ہے۔ کبھی میں اپنی ماں کے 'خدا حافظ' کہنے والا جملہ اپنے خاص رشتے داروں کی اپنے گھر آمد پر جان بوجھ کر کہتا ہوں۔ اس سے سبھی کو میری ماں فوراً یاد آ جاتی ہے۔ اور وہ بھی کہنے لگتے ہیں۔ ہاں یہ بات 'بے جی' (میری ماں) نے کہی تھی۔ اور سبھی کے چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔ جب کبھی میری ماں مرحومہ کا ذکر افسوس ناک یا غمگین مواقع کو بھی ہنسی خوشی میں بدل دیتا ہے۔

اب آجکل تو 'خدا حافظ' کے فقرے کو ہمارے سارے ملک کی عوام نے 'خدا حافظ' کہہ دیا ہے۔ اور اس کی جگہ 'اللہ حافظ' کو دیدی ہے۔ نئی نسل کی زبان پر یہ فقرہ روانی سے ایسے بولا جاتا ہے جیسے سکول شروع ہونے سے پہلے علامہ اقبال کی یہ دعا۔ لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔ ہو۔ آجکل تو ریڈیو ٹی۔ وی کے اینکرز سے بھی 'اللہ حافظ' ہی سننے کو ملتا ہے۔ ہماری تعلیم کی شروعات ہوئی جب فارسی زبان زیادہ رائج تھی۔ اب 'خدا' (فارسی) کو ترک کر کے 'اللہ' (عربی) زبان کا لفظ جوڑ دیا گیا ہے۔ ہماری زبانوں نے 'خدا حافظ' حفظ کیا ہوا ہے۔ یہ گردان مونہہ سے ایسے لگ چکی ہے۔ جیسے مرزا غالب کے مونہہ سے 'مے' لگی تھی اور مر کر ہی چھوٹی تھی۔ اس لئے ہم پر 'خدا حافظ' کہنا فرض کے جیسا ہے۔ چاہے 'اللہ حافظ' کہنے والے ہم پر کوئی بھی فتویٰ لگوا دیں۔ اب میں 'خدا حافظ' کہہ کر مضمون کا اختتام کرتا ہوں سبھی قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔ جنہوں نے میرے مضمون کو پڑھنے کیلئے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

اپنے منتخب عنوان 'خدا حافظ' کے بارے تو حتی المقدور جو دیکھا اور سنا لکھ دیا چونکہ 'خوش آمدید' بھی 'خدا حافظ' کے ہی خاندان کا جملہ ہے۔ اس کے بارے بھی کچھ غلط العام بول چال خصوصاً ہمارے بیسیوں نہایت معتبر' اور خبر دار میڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نہایت ذمہ دار خواتین و حضرات اینکرز یا دیگر جو مختلف پروگرام پیش کرتے ہیں۔ پردہ اسکرین پر آتے ہی ناظرین کو 'خوش Aamdaid' یا 'خوش Aamdeed' بلا جھجک کہتے ہیں۔ یہ جملہ ناظرین خصوصاً بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں 'cotton candy' والے کی گھنٹی کی طرح بجتا ہے۔ لہٰذا یہ میڈیا ہی کا کام ہے کہ اس 'آمدید' اور 'آمدِ ید' کا فرق ناظرین اور سامعین کی بصارت اور ذہنوں میں تحلیل کریں۔ میں نے اپنے فارسی میں حاصل کردہ علم کی روشنی میں بتانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے 'آمدید' فارسی زبان کے مصدر 'آمدن' (مطلب۔ آنا) سے متعلق ہے جبکہ مصدر 'دیدن' (مطلب۔ دیکھنا) سے۔ لہٰذا درستگی بہتر ہے۔ مجھے امید ہے۔ لسانیات کے ماہرین بھی میری اس بارے مدد کر کے عوام کو اس فقرے کی درست بول چال کے بارے تحقیق کر کے رہنمائی فرمائیں گے۔ شکریہ

فریزنو، کیلیفورنیا Ph: 001-559-389-6750

قیوم بدر

ادب میں ملاوٹ

ملاوٹ زندگی کے ہر شعبے میں عام ہوتا جارہا ہے اور جو چیز عام ہو جائے وہ عیب نہیں فن کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔غذا، دوا حد تو یہ ہے کہ زہر بھی ملاوٹ سے مبرا نہیں۔اس کا چلن تجربہ اور جدت کے نام پر ادب میں بھی جاری ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں میں اردو سب سے کم عمر زبان ہے۔چونکہ اس کے خدوخال میں عربی اور فارسی کا نمایاں رول رہا ہے چنانچہ اس زبان کے بیشتر اصناف مثلاً غزل، مرثیہ، نعت، رباعی، قصیدہ انھی زبانوں کی مرہونِ منت ہے۔ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ انگریزی سے اردو ادب میں داخل ہوئے ہیں جن میں سے بیشتر کے اصناف اردو ادب کا حصہ ہیں۔برعکس ایں ہمہ سانیٹ، ترویئی اور ریزگا کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔تاہم جملہ تمام صنفوں میں غزل کو امتیاز حاصل ہے کہ روزِ اوّل سے اس کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے جس سے متاثر ہو کر رشید احمد صدیقی کو برملا اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔''

کچھ دن قبل مشہور شاعر و نقاد مظہر امام نے ''آزاد غزل'' کے نام پر کچھ تجربہ کیے جسے اردو والوں نے قبول نہیں کیا۔اللہ کا شکر ہے کہ یہ تحریر انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی اور غزل لنگڑی ہونے سے بچ گئی ورنہ کلیم الدین احمد کا قول حرف بہ حرف ثابت ہوتا کہ ''غزل نیم وحشی صنف ہے''۔ممکن ہے کل کوئی اور یہاں تک کہہ دیتا کہ ''غزل لنگڑی صنف ہے''۔

''آزاد غزل'' کے موجد مظہر امام کے حوالے سے مشہور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے انھیں اپنے ڈھنگ سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔کہتے ہیں کہ ''جب میں مظہر امام صاحب کو کہیں ایسی ویسی جگہ بیٹھتے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے کہ مظہر امام صاحب بے خیالی میں کہاں جا کر بیٹھ گئے۔انھیں نیوٹن، گیلیلیو اور آئنسٹائن کے درمیان ہونا چاہئے تھا کہ مظہر امام صاحب کوئی ایسی ویسی شخصیت نہیں اور ادب میں ''آزاد غزل'' کے موجد ہیں۔''

بہر کیف یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔اردو ادب خصوصاً شاعری میں تجدید و تجربے کا یہ سلسلہ طول پکڑتا جارہا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ روایتی شاعری کرنے سے مقام ملنا ممکن نہیں کہ میر و غالب نے اردو شاعری کی بیشتر زمینوں پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔بقیہ زمین داغ، اقبال، جگر، حسرت، فانی اور فراق نے اپنے نام کر لیا ہے۔ظاہر ہے کہ جہاں زمینوں کی کمی ہو وہاں آنر شپ فلیٹ کا سسٹم رائج ہونا یقینی ہے جس سے شہ پا کر شعراء بھی اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ ایک شاعر نے تضمینی غزل کے نام پر ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔نئے پرانے شعراء کے مطلع کے علاوہ غزل کے ہر شعر کے ثانی مصرعہ پر اپنا مصرعہ لگا کر غزل کے حسن میں چار چاند لگا دیا ہے۔شاعری خصوصاً غزل کی شاعری میں یہ کمال کا تجربہ ہے جس کی خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے جس سے متاثر ہو کر ایک دوسرے شاعر نے دوسرے شعراء کے مشہور زمانہ مصرعے پر تین مصرعے لگا کر تضمینی قطعہ کہہ کر حلقۂ شعر و ادب میں ممتاز ہو گئے۔

انشاءاللہ کا مشہور زمانہ مصرعہ ''تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور ہم بیزار بیٹھے ہیں'' پر موصوف کی تضمین ملاحظہ فرمائیں:

بہت کچھ کھو کے جیون میں پسِ دیوار بیٹھے ہیں لئے ہاتھوں میں بربادی کا ہم اخبار بیٹھے ہیں
''تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور ہم بیزار بیٹھے ہیں'' نہ ہم پر اے سیاست پھینک یہ دامِ جنوں اپنا

اسی مصرعہ کی مناسبت سے مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کا یہ تضمین بھی دیکھیں۔ آپ اسے نثری تضمین کا نام دے سکتے ہیں ''ان کے درمیان گوش دار دوابی دیوار ہوتی تھی۔ رات ڈھلے جب اُدھر سے کھسر پھسر ہوتی تو اِدھر سے ایک بزرگ کے کھنکارنے کی آواز آتی:

''تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور ہم بیزار بیٹھے ہیں''

اس سے اس بات کا پتہ چلا کہ اب شاعری میں سچ مچ زمینوں کی کمی ہوگئی ہے لہٰذا اب شاعری میں ''آنرشپ غزل'' اور ''آنرشپ قطعہ'' کا چلن قائم ہوگیا ہے۔

اردو شاعری میں زمینوں کی قلت کا اشارہ مشتاق احمد یوسفی نے بہت پہلے کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک شاعر نے اپنی مرصع غزل اپنے ایک سخن فہم دوست کو سنائی۔

انھوں نے کہا ''یہ تو میر کی زمین ہے۔''

شاعر موصوف نے تڑسے جواب دیا ''ہاں میر کی زمین ہے تمہارے باپ کی نہیں۔''

زمینوں کے بکھیرے سے الگ اگر ہم کوئی نئی صنف ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگئے تو ممکن ہے کہ اس حوالے سے ادب میں زندہ رہ جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ اردو زبان میں وسعت ہے الفاظ کی کمی نہیں چنانچہ دوسری زبانوں کی نسبت اردو زبان میں شاعری کے امکانات زیادہ ہیں لہٰذا ہر کوئی قافیہ جوڑ لیتا ہے۔ لیکن کچھ دن بعد پتہ چل جاتا ہے کہ اس سے کچھ ہونے جانے کا نہیں۔ ادب میں کچھ جیالے ایسے بھی ہیں جو کسی کی پوری غزل ہڑپ کر لینے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ فراقؔ گورکھپوری کی صدارت میں ایک نوجوان لہک لہک کر غزل پڑھ رہا تھا اور خوب داد بٹور رہا تھا۔

فراقؔ نے پوچھا۔۔۔ بیٹے یہ کس کی غزل ہے؟

نوجوان نے سینہ پھلا کر کہا۔۔۔ میری غزل ہے۔

فراقؔ نے کہا۔۔۔ یہ تو میری غزل ہے۔

نوجوان نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔۔۔ خیال سے خیال ٹکرا نہیں سکتا ہے۔

فراقؔ نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔۔۔ بیٹے سائیکل اسکوٹر سے ٹکرا سکتی ہے ہوائی جہاز نہیں۔

میرے خیال سے اس طرح کی حرکت سے تو ''ضمینی قلعہ'' یا پھر ''تضمینی غزلیں'' بدرجہا بہتر ہیں کہ اس کی خاطر بہرحال پسینہ بہانا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

فلم حقیقت میں مشہور شاعر کیفی اعظمی کا یہ نغمہ بہت مشہور ہوا تھا۔

ہو کے مجبور تجھے اس نے بھلایا ہوگا

مشہور فلم اداکارہ مینا کماری شاعرہ بھی تھیں۔ان کی موت کے بعد مہہ جبیں ناز کے نام سے ان کا مختصر شعری مجموعہ ''تنہا چاند'' منظرِ عام پر آیا۔اس میں سے ایک شعر آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے جو کیفی اعظمی کے مذکورہ نغمہ کے طرز پر ہے۔

آبلہ پا اس دشت میں آیا ہوگا
ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا

انہیں اشعار کی مناسبت سے محض دو ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ اختر شاہجہاں پوری کی ایک غزل ابھی حال ہی میں دیکھنے کو ملی ہے اس میں سے ایک شعر یوں ہے۔

نوک ہر خار پہ امکانِ سحر روشن ہے
آبلہ پا کوئی اس سمت بھی آیا ہوگا

ملاوٹ در ملاوٹ کی یہ مثال ''آدھی غزل'' کی صورت میں دیکھئے:

ریگ زاروں میں یونہی پھول نہیں کھلتے ہیں
آبلہ پا کوئی اس سمت بھی آیا ہوگا

ملاوٹ کا یہ سلسلہ اتنا دراز ہے کہ اس کا سرا ڈھونڈنا مشکل ہے۔

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی بھی طرحی شاعری کے قائل نہ تھے چنانچہ انھوں نے اسے مصنوعی شاعری سے تعبیر کیا ہے جو ملاوٹ کی ایک شکل ہے۔

ویسے بھی اب ادب میں ان سب کے علاوہ کچھ ہے بھی نہیں۔ممکن ہے کہ کل کچھ جیالے دھڑلے سے کچھ افسانوں کے عنوانات بدل کر افسانے پر اپنا حق جمالیں یا پھر ابتدائیہ یا پلاٹ میں معمولی ردوبدل کر کے افسانے کے خالق ہونے کا دعویٰ کر دیں۔

خیر یہ کوئی نئی بات نہیں تواریخی عمارتوں پر نام لکھنے کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔نوجوانی میں ہم نے بھی یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔حدتو یہ ہے کہ محبت کی نشانی ''تاج محل'' کے ایک گوشے میں اپنا نام لکھ آئے ہیں۔آپ چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔ممکن ہے کل کوئی مؤرخ غلطی سے اس عمارت کا بانی مجھے ہی سمجھ لے۔اگر ایسا ہوا تو تواریخ میں میرا نام بھی زندہ رہ جائے گا۔

☆☆☆

C/O. DULHAN GUL, POST: JAGATDAL-743125
NORTH 24 PGS(WB), MOB:08100107278

پروفیسر حسین الحق

رونے والا کون

آدھی رات اُدھر آدھی رات اِدھر اچانک نیند ٹوٹ گئی اور ایک عجیب قسم کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے ......باہر دھواں دھار بارش ہو رہی تھی......ایک تو بھادوں کہ بارش اور اس پر بیچ رات کا پہر......نزدیک و دور سے آدمی یا جانور کسی کی آواز نہیں، ارد گرد سارے مکانات کے دروازے بند، خود میری کھڑکیاں اور دروازے بھی بند تھے......پھر یہ اندر کیسے آ گیا؟

اور یوں بھی کون سخت دل یا یگانہ فراموش ہے جس نے اس دھواں دھار بارانی رات میں اسے باہر آنے دیا میں نے پہلے تو نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں کمرے کے ماحول کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی......وہاں پہ الگنی تھی......وہ وہیں پر ہے، وہاں پہ الماری......وہ بھی ہے، ہاں تالا بھی لگا ہوا ہے، ادھر ٹیبل کرسی دونوں اپنی جگہ سلامت، اس کنارے پر وارڈ روب وہ بھی بند......کمرے کا دروازہ......قلابہ اندر سے لگا دیکھ کر ید نے اطمینان ہوا اور خوف کے ارے جو کروٹ بھی نہ لینے والی کیفیت تھی وہ دور ہوئی۔ دوسری کروٹ مڑا۔ فریج، ٹی وی، ٹی وی کے پاس چھوٹے ٹیبل پر ریڈیو......سب کچھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ یقین ہوا کہ کمرے میں کوئی ایسی شئے نہیں ہے جو میری نہ ہو مگر یہ؟

میں نے ہمت کر کے سوئچ آن کر دیا۔ روشنی ہوئی تو کمرے کا پورا منظر بھی روشن ہو گیا، کوئی بدلاؤ نہیں تھا۔ کوئی شئے کم نہیں تھی، کوئی شئے زیادہ نہیں تھی مگر وہ آواز تھی۔

وہ آواز کیوں تھی؟ کب سے تھی؟ کدھر سے آ رہی تھی؟ یہ طے کرنا بہت مشکل تھا......پھر بھی شاید پانی کے ریلے کی طرح، ہوا کے بہاؤ کی طرح یا بو کے لہرئے کی طرح......وہ آواز مسلسل چلی آ رہی تھی، مجھ تک بار بار پہنچ رہی تھی۔

چونکہ خوف دور ہو چکا تھا اس لئے تکدر پاس آیا......کیا شان دار نیند برباد کی ہے اس کمبخت نے، میں اس رات کو فاتح جرنیل کی طرح بسر کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کمبخت نے اسے روتی بلے کی رات بنا دیا۔ میں فاتح تھا......یہ الگ بات ہے کہ فتح بہت دنوں بعد نصیب ہوئی......حالانکہ کرن اس وقت سے میری طرف مائل تھی جب مجھے مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں، اب جا کے یہ لمحہ آج رات میرا نصیب بنا......گزشتہ شام پہلی مرتبہ......بارش نے رنگ پکڑنا شروع ہی کیا تھا کہ میں کرن آہو جا کے گھر پہنچا۔ کرن تنہا تھی، اس کا شوہر ٹور پر گیا ہوا تھا، بچے سو رہے تھے، اور نوکرانی کام نپٹا کر اپنے گھر جا چکی تھی......مگر یہ سب کچھ نیا نہیں تھا اور نہ ہی کرن کے بارے میں ایسا کچھ پہلے کبھی میں نے سوچا تھا ......میری اس کی چاہت کا سلسلہ تو اس کی شادی کے پہلے سے جاری تھا مگر تب بھی ہم رومانی باتوں پر ہی اکتفا کرتے تھے اور شادی کے بعد بھی یہ سوچ کر اطمینان رہتا تھا کہ......آہوجہ جی، فانی جسم تمہاری تقدیر، میرا حاصل لافانی روح!

اور کرن بھی میرے سلسلے میں اتنی بے فکر اور مطمئن تھی کہ شادی سے پہلے یا شادی کے بعد، کبھی اس نے شاید سوچا ہی نہیں کہ یہ وقت شیلندر سے ملنے کا ہے یا نہیں۔

سو اس شام بھی، جب کرن آہو جا کے گھر کوئی نہ تھا، میں پہنچ گیا، اس وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی، پھر

بارش تیز ہوگئی، ہم بہت دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ کرن سے بات کا کبھی کوئی ایک موضوع نہیں رہا۔ ہم شاید اس لیے بات کرتے تھے کہ ہمیں بات کرنا ہوتا تھا یا ہمیں ایک دوسرے کو سنتے رہنا ہوتا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ ہنس کر کہا تھا: کیسی فضول باتیں کرتے ہیں ہم لوگ! تو میں نے ہنس کر اسے یاد دلایا تھا:

مری آواز ہی پہچان ہے گر یاد رہے

اس پہ کرن کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

پس اس رات بھی شاید ہم ایک دوسرے میں involve رہنا چاہتے تھے اس لئے ہم باتیں کرتے رہے۔ اس بیچ دیکھا کہ کرن بار بار اونگھ جا رہی ہے۔ میں نے کہا تم جا کر سو رہو، بارش رکے گی تو میں چلا جاؤں گا۔

اس نے سنی ان سنی کر دی اور ہم پھر ایک دوسرے میں مشغول ہو گئے...... مگر پوری موت کی طرح یہ آدھی موت ...... نیند بھی تو ہمیشہ اپنے من کی رانی یا راجہ ہے، جب وہ چاہے تب آئے، آپ چاہتے رہو، اس کی نیند نے پرواہ کب کی، سو اس رات بھی نیند اپنا کس بل دکھانے پر تلی ہوئی تھی، کرن نہ چاہنے کے باوجود اونگھ اونگھ جا رہی تھی۔

اس کی مدھ ماتی آنکھیں دیکھ کر میرے منھ سے نکل گیا:

اچھا ایک کام کرو، تم اپنے بستر پر آرام سے لیٹو۔ میں تم سے گپ کرتا رہوں گا۔

وہ مان گئی، پھر یوں ہوا کہ وہ مسہری پر لیٹ گئی، وہ لیٹی رہی، بولتی رہی، اونگھتے رہی، نیند توڑتی رہی...... وہ چپ ہوتی تو میں بولتا وہ سنتی، دونوں کے بولنے سننے کا سلسلہ چلتا رہا...... اسی درمیان کہنے لگی:

جانتے ہو شیلندر! پچھلی مرتبہ میکے گئی تو ماں کے پاس تمہاری بیس پچیس برس پہلے کی جو ایک تصویر تھی، وہ لیتی آئی۔ اس نے تکیے کے نیچے سے تصویر نکال کر مجھے دکھائی...... میں بڑے اشتیاق سے اسے لینے کے لئے اس کی طرف جھکا۔ اس نے تصویر چھپا لی...... نہیں نہیں، دور سے دیکھو، میں ہاتھ میں نہیں دوں گی۔

میں وہ تصویر لینے کی غرض سے اس کی طرف جھپٹا، وہ تصویر بچانے کی کوشش کرنے لگی، وہ اٹھ کر شاید بھاگنا چاہتی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ بھاگ نہ پائے، اس کوشش میں، بے سوچے سمجھے، میں نے لیٹی ہوئی کرن کو گویا چھاپ لینے کی کوشش کی۔ میں پہلے اس پر جھکا...... پھر شاید اس پر لد گیا...... اور پھر......

میں کرن کے بیڈ روم میں نو ساڑھے نو کے قریب گیا تھا۔ بارش گیارہ ساڑھے گیارہ کے آس پاس رکی، ہم دونوں کم از کم ایک گھنٹہ خاموش بیٹھے رہے، بارش رکنے پر میں چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا...... کرن نے مجھے روکا نہیں۔

میں نیند آنے تک اس آخری منظر اور اس منظر کی کوکھ سے سر اٹھانے احساسِ فتح کے نشے میں بدمست تھا...... مگر اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ آواز تو شاید نیند کے آخری مراحل ہی میں کسی نہ کسی چور دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔

پھر بھی یہ واضح نہیں ہے کہ میں نیند آنے کے آخری لمحے میں منظر کے حصار میں تھا یا آواز کے حصار میں...... مگر نیند ٹوٹنے کے بعد تو بس آواز ہی آواز تھی، منظر کہیں نہیں تھا۔ آواز...... رونے کی آواز کسی بچے کی یا شاید کسی ایسے نوجوان کی آواز جسے ابھی پوری طرح مونچھیں بھی نہ نکل پائی ہوں۔

دس دن گزر چکے مگروہ بچہ یا نوجوانی کی سرحد چھوتا وہ لڑکا، جس کی ابھی پوری مونچھیں بھی نہ نکلی ہوں، ابھی تک روئے جاتا ہے۔ میں دس دنوں سے سویا نہیں ہوں، دس دن گزر چکے نہ میں کرن آہوجہ سے ملنے گیا نہ کرن کا فون آیا...... کچھ عجیب سی بے چینی اندر اندر سر مارتی ہے، میں کیا چاہتا ہوں، مجھے خود پتہ نہیں۔

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ...... کم از کم ایک مرتبہ، پھر کرن آہوجہ سے مل لوں اور دیکھوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے میں involve ہو پاتے ہیں یا نہیں؟ لیکن بے چینی پھر سر مارتی ہے...... حاصل کیا ہوا...... حاصل کیا ہوا۔ میرا اصل مسئلہ کیا ہے؟ میرا اور کرن کا ایک دوسرے میں involve ہونا؟

یا نوجوانی کی سرحد چھوتے ہوئے اس لڑکے کا رونا جو نہ خود مرتا ہے نہ مجھے جینے دیتا ہے......!!

☆☆☆

سرسید کالونی، نیو کریم گنج، روڈ نمبر 06، گیا (بہار)
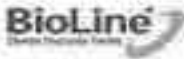
ڈاکٹر نوا امام (ڈینٹل، فیشیل اینڈ ایستھیٹک سرجن) کو ملک کے ۱۰۰ ار بہترین ڈینٹل سرجنوں کی فہرست میں شمار کیے جانے پر سند سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر عشرت بیتاب

گوشت

''آسمان چیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چیلیں، طیاروں کی طرح نیلے آسمان کے اوپر نیچے، آگے پیچھے منڈلا رہی تھیں اور ایک شخص فرش پر کھڑا جھولے سے انسانی جسم کا لوتھڑا، نکال نکال کر گوشت کے پارچے کی صورت فضا میں اچھال رہا تھا۔ اوپر منڈلاتے ہوئے چیلوں کی ٹولی میں سے کوئی ایک آن کی آن میں انسانی جسم کا بازہ، ٹانگیں، لوتھڑے، آ کر جھپٹ لیتا۔ اگر ایک کا نشانہ چوک جاتا تو پیچھے سے آتا ہوا دوسرا لپک لیتا۔ آسمان میں منڈلاتے چیل انسانی جسم کے پارچے کو ایک مشاق غوطہ خور کی طرح اپنے نوکیلے پنجوں میں فوراً جکڑ لیتے اور دور نکل جاتے۔

میری آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوچ کی گہری کھائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے نانی اماں کی بھولی بسری باتیں کہانیوں کی طرح یاد آنے لگیں۔ مجھے وہ زمانہ یاد آنے لگا جب میں سخت بیمار ہو گیا تھا۔ حکیم وید سبھی جواب دے چکے تھے اس وقت میری نانی اماں کی خدمت اور دعاؤں نے ہی میرے نیم مردہ جسم میں نئی جان ڈالی تھی۔ نانی اماں اپنے رب کے آگے، آنچل پسارے، میری زندگی کی بھیک اس وقت تک مانگتی رہیں تھیں۔ جب تک میرے نیم مردہ جسم میں حرکت نہ آ گئی۔ میرے نیم جان جسم کی حرکت پر گھر کے سبھی لوگوں کے چہرے کھل اٹھے تھے جیسے مغموم چہروں پر غازہ و روغن مل دیا گیا ہو۔ خوشیاں، لوٹ آئی تھیں اکلوتے وارث کی طبیعت جو سنبھل گئی تھی۔ ہر سو شہنائیاں سی بج اٹھیں تھی۔ نانی اماں اسی دم خادم رحیم خاں کو آواز دیا اور حکم کیا کہ ''ایک بکرا خرید لاؤ، بچے کی جان کا صدقہ اتارنا ہے۔''

نانی اماں نے اس دن فجر کی نماز سے فارغ ہو کر، بکرے کا صدقہ دیا اور اپنے رب سے میری جان کی امان چاہی۔ بکرے کو ذبح کروا کر اس کے سارے ٹکڑے چیل کوے کو کھلا دیئے۔

نانی گو آج نہیں رہیں لیکن ان کی باتیں، محبتیں شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ نانی اماں کہتیں......

''انسان گوشت کا ایک لوتھڑا ہی تو ہے وہ تو قدرت کا یہ عطیہ ہے کہ رگوں میں دوڑنے والے خون نے اسے اشرف المخلوقات کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے''

کل ہی کی تو بات ہے میں اس وقت پالنے میں تھا کہ میری ماں، اللہ کو پیاری ہو گئی۔ نانی اماں کے شفقت بھرے لمس اور بے لوث خدمت نے مجھے پالنے سے اٹھا کر کالج کی دہلیز تک پہنچا دیا۔ میرے ڈگمگاتے قدموں کو اپنی کمزور و نحیف قوتوں میں جکڑ کر مجھے صحیح ڈگر پر چلنا سکھایا۔ ماں کی شفقت اور پیار کو میں کیا جانوں۔ میں تو پالنے سے نیچے بھی نہ اترا تھا کہ ماں کی محبت سے محروم ہو گیا۔ اور ماں کے انتقال کے بعد پاپا نے دوسری شادی رچا لی۔ وہ تو نانی اماں تھیں جس نے آگے بڑھ کر اس منحنی سی جان کو سینے سے لگایا اور پال پوش کر بڑا کیا۔

آج سپنے میں چیلوں کے تواتر حملوں کو دیکھ کر نانی اماں کی یاد شدت سے آ رہی تھی میری ننھی سی جان کو مرغی

کے چوزے کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ کر حالات وحوادث سے کس کس طرح محفوظ رکھتی تھیں وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ میں نانی اماں کے گاؤں کی کھلی کھلی فضا، کھیتوں اور کھلیانوں کی مست آب وہوا میں جواں ہوا تھا لیکن افسوس کہ ایک دن نانی اماں کا بھی وقت پورا ہوگیا اور وہ بھی عالم ارواح میں جا بسیں۔ میں ان کی جدائی کی تاب کس طرح لا سکتا تھا۔ اداس ہوگیا۔ مانو میری دنیا ہی اجڑ گئی۔ اسوقت نانا جان نے بڑی دانش مندی سے کام لیا۔ انھوں نے فوراً مجھے بہتر تعلیم کے بہانے شہر بھیج دیا جہاں ہوسٹل کے زیر انتظام میری تعلیم مکمل ہوئی اور پھر بیرونِ ملک میں اعلیٰ تعلیم کا موقع بھی میسر آگیا جہاں میں آج تعلیم مکمل کر کے ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوں۔

آج میں مکمل طور پر خود کفیل ہوں۔ ساری ضرورت کی چیزیں مہیا ہیں بس ایک نانی کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے ان کی یادیں، باتیں اور دھندلی سی تصویر آنکھوں کو خیرہ کئے جا رہی تھیں۔ اب تو صرف ان کی یادیں ہی میرے ساتھ رہ گئی تھیں کہ نانا کا بھی گذشتہ سال انتقال ہو گیا تھا۔ گاؤں کی پشتینی حویلی کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری نانا نے اپنی حیات میں ہی خادم رحیم ماما کو سونپ دی تھی۔ میں اکثر لمبی چھٹیوں میں، سال میں ایک بار گاؤں آ کر خیر خیریت لے لیتا تھا۔ کھیت کھلیان کا حساب دیکھتا اور چھٹی گزار کر چلا آتا۔ رحیم خان ماما نہایت ایمانداری سے اپنی ذمہ داری نبھاتے۔ رحیم صاحب کو شروع سے ہی میں خادم نہیں سمجھتا تھا بلکہ گھر کا ایک فرد ہی تصور کرتا اور ہمیشہ ماما ہی کہا کرتا تھا۔ رحیم ماما کے دونوں بچے فوج میں تھے۔ رحیم صاحب خادم نہیں تھے بلکہ نانا کی اولاد کی طرح تھے۔ نانا نے انھیں بچپن سے ایک اولاد کی طرح پالا تھا۔ رحیم ماما کے دونوں بچے جب جوان ہوئے تو نانا جان نے ہی اپنے اثر ورسوخ سے انھیں فوجی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔

آج دونوں بچے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ دونوں بچوں نے کئی بار اپنے والدین کو ہمراہ لے جانے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی لیکن رحیم ماما حویلی کی ذمہ داری اور خدمت سے منہ موڑنا نہیں چاہتے تھے۔

نانا، نانی کے گاؤں کی سوندھی مٹی، جہاں میں نے بچپن کے خوش گوار دن گذارے تھے۔ آج مجھے شدت سے یاد آ رہی تھی اور پھر حویلی کی مرمت کا خیال بھی ابھر آیا کہ نانا کے بعد ساری حویلی کی ذمہ داری میرے ۔۔۔۔ کاندھے پر ہی آن پڑی تھی جسے میں باہر، باہر رہنے کی وجہ کر رحیم ماما کے سر منڈھ دیا تھا۔ ماما کی یاد آتے ہی ان کی شفقت اور خدمت بھی سلور اسکرین کی طرح آنکھوں کے سامنے آ جاتی، اس پر سے گاؤں کی بھائی چارگی کے اوراق، تاریخ پارے کی طرح پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ یہاں مندر۔ مسجد کے درمیان خط امتیاز اب تک نہیں کھینچی گئی تھی۔ مسجدوں کے دروازے پر اب بھی مزدور کے بچے پانی دم کرانے نمازیوں کا انتظار کرتے دوسری طرف مندروں کی تعمیر وتوسیع میں مسلم نوجوانوں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ رامو چاچا، نانا کے ساتھ رمضان کے کئی روزے رکھتے اور نانا کے ساتھ افطار میں شامل بھی ہوتے تھے۔ نانا بھی راکھی کے موقع پر رامو چاچا کی بیگم سے راکھی ضرور بندھواتے اس گاؤں کی یکجہتی کی لوگ مثالیں دیتے تھے۔

شہر کی آلودگی اور غیر ملکی واتاورن سے جب میری طبیعت اچٹ جاتی تو وطن کا کرتا۔ پرسکون ماحول، صاف

ستھری فضا، آلودگی سے پاک، بھائی چارگی کے مربوط رشتے، شانتی ہی شانتی تھی، گاؤں میں۔

گاؤں میں نانی اماں کا وہ پختہ، خستہ مکان، جو اپنے وقت میں حویلی کہلاتا تھا۔ آج بھی ماضی کی بھولی بسری، میٹھی کٹھی یادیں لئے...... ماضی کی شاندار زندگی کی ایک مکمل داستان اپنے دامن میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ جگہ جگہ سے بوسیدہ نظر آنے والی حویلی کی ماضی کے روشن دنوں کی کہانی، آج بھی ہر کسی کی زبان پر تھی۔

میں گاؤں کے لئے نکل پڑا۔ کلکتہ دم دم ایئر پورٹ سے سیدھا ہوڑہ اسٹیشن پہنچا۔ اتفاق سے ہوڑہ دانا پور لگی ہوئی تھی میں ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا۔ صبح تڑکے کیول پہنچ گیا تھا دوسری گاڑی بھی لگی ہوئی تھی اس طرح سورج طلوع ہوتے ہوتے میں گاؤں پہنچ گیا تھا۔ وہاں سے ٹانگہ کر کے حویلی کا رخ کیا۔

اسٹیشن سے باہر آ کر جب ٹانگے پر سوار ہوا تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسٹیشن کے باہر بھیانک خاموشی تھی۔ سبھوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ سبھوں کی آنکھیں بول رہی تھیں لب خاموش تھے جیسے کوئی بڑا حادثہ درپیش آیا ہو۔ سواری بھی کم کم نظر آ رہی تھی۔ ٹانگے پر سوار، میں منزل کی اُور رواں دواں تھا مگر آنکھیں، فضا کی آلودگی سے دھواں دھواں سی ہوگئی تھیں۔ ٹانگہ والا خاموشی سے ٹانگہ ہانک رہا تھا نہ کوئی گفتگو، نہ کوئی حال احوال، جبکہ شہر سے آنے والوں سے ٹانگے والے اکثر شہر کی حالت دریافت کیا کرتے تھے اور گاؤں کی خیرت کی آگاہی دیتے تھے مگر معلوم نہیں آج کیوں، خاموشی کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔

گاؤں کے چوراہے پر پہنچا تو بھیانک منظر دیکھ کر مری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ سبھی ادھر اُدھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ میں حیران و پریشان سبھوں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سبھی چہرے اجنبی لگ رہے تھے۔ سبھوں کے چہرے پر درد والم کی بے شار لکریں ابھر رہی تھیں۔ میں جس کسی سے پوچھتا، وہ میرے سوال کا ٹال کر نکل جاتا بڑی مشکل سے ایک نوجوان کو پکڑ کر پوچھا۔

''بھائی ماجرا کیا ہے۔ سبھی اس طرح بھاگ کیوں رہے ہیں ؟''

تو اس شخص نے صرف اتنا کہا کہ..........

''بڑی حویلی کے ایک گوشت خور کی جان لے لی گئی۔''

بڑی حویلی، میری حویلی.......... رحیم ماما کی شبیہ ابھر آئی، مامی کا مغموم چہرہ سامنے آ گیا..........

میں بھاگتا ہوا حویلی کے صدر دروازے پر پہنچا تو وہاں کا قیامت خیز منظر دیکھ کر آنکھوں کی عنابی مچھلیاں ساکت ہو گیں اور جسم ولب پر قصر جنبش طاری ہوگئی۔ وہاں موجود لوگ طرح طرح کے بیانات دے رہے تھے۔ ماما رحیم اور مامی دونوں میرے موروثی جائیداد کی نگاہ بانی کرتے ہوئے آج گئو رکھشکوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے ایک نحیف و کمزور شخص کو صرف اس لئے مار دیا گیا تھا کہ وہ گوشت خور ہے۔ رحیم ماما پر سنگین الزام تھا کہ وہ گوشت خور ہیں...... گوشت خور...... میرا دماغ چکرا گیا تھا۔ رحیم ماما نے میری یادداشت کے مطابق زندگی میں گائے کا گوشت چکھا تک نہیں تھا۔ ماما کی وجہ کر قربانی کے موقع پر نانا اکثر بکرا کیا کرتے تھے۔ آج انھیں ہی گوشت خور کہہ کر مار گرایا گیا۔

مامی غش پر غش کھا رہی تھیں ان کی طبیعت بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی۔ رحیم ماما کی لاش حویلی کے صدر دروازے پر پڑی تھی۔ لوگوں کا تانتا بندھا تھا۔ ہر طرف خاکی وردی والوں کا پہرہ لگا تھا۔ مامی کی بگڑتی حالت کو دیکھ کر میں نے فوراً علاقے کے چند نوجوانوں کی مدد سے انہیں گاؤں کے اسپتال میں داخل کروایا۔

میں اسپتال سے نکل کر ماما کے دونوں بچوں کو اس کی اطلاع دینے کے لئے سرکاری دفتر پہنچا اور فوجی چھاؤنی کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا تو جو اطلاع ملی اسے سن کر میرے پاؤں کے نیچے کی زمین ہی کسک گئی۔

ہیڈ کوارٹر سے جواب آ رہا تھا کہ......

''آپ کے دونوں جوان خان کشمیر کے دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے ہوئے کل رات شہید ہو گئے''

میں مامی کو کیا جواب دیتا.......... میری آنکھیں بھر آئیں۔ لب میں جنبش کی قوت تک سلب ہو گئی تھی۔

سارے گاؤں میں فوج کی گشت بڑھا دی گئی تھی تا کہ انسانیت کی چیخ آسمانوں میں اڑتے ہوئے چیلوں تک نہ پہنچ سکے۔

میں واپس اسپتال پہنچا تو خبر ملی کہ مامی کو شہر کے بڑے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

میں نے فوراً شہر کے اسپتال کا رخ کیا۔ مامی اسپتال کے بیڈ پر بے سدھ پڑی تھیں۔ ڈاکٹرس نے انجکشن اور دوا دے کر، دوسری کاروائی میں مصروف تھے اور ایکسرے و دیگر رپورٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ساری رات مامی کے سرہانے بیٹھا اپنے رب سے ان کی صحت یابی کی دعائیں کرتا رہا...... مامی کے بے شمار احسانات مجھ پر، نانی کے بعد مامی ہی تھی جنھوں نے میری خدمت کی، میری خاطر کئی راتیں جاگیں اور میری تیمارداری کی۔ آج وہ بستر اور خدمت کی کشمکش میں جوجھ رہی تھیں۔

میں مامی کے لئے اپنے اللہ سے ان کی زندگی مانگتا رہا کہ معلوم نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مامی کے جسم میں جنبش ہوئی۔ میں نے فوراً دوڑ کر ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ اسپتال کے سارے عملے ایک بار پھر حرکت میں آ گئے۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مریضہ کی حالت سدھر رہی ہے۔''

ان کی طبیعت ذرا سنبھلی تو میں گاؤں لوٹ آیا اور رحیم ماما کی تدفین کے اہتمام میں لگ گیا۔ میں نے رحیم ماما کی میت کو حویلی کے صحن میں ہی دفن کر دیا اور پھر مامی کی خدمت کے لئے شہر اسپتال لوٹ آیا۔ اللہ کا شکر، لاکھ لاکھ شکر کہ مامی کی طبیعت بالکل سنبھل گئی تھی۔ میں ریلیز کروا کے انھیں حویلی لے آیا۔

دوسری صبح فجر کی نماز کے بعد بکرے کو ذبح کر کے مامی کی صحت کا صدقہ اتار کر گوشت کے پارچے کو چیل کوے کی نذر کر دیا۔ اور پھر پہلی فرصت میں، میں گاؤں اور شہر سے دور جہاں میری پوسٹنگ تھی، مامی کو ساتھ لئے چلا آیا۔ کیونکہ گاؤں میں تو اب چیلوں کا قبضہ تھا کہ سارا آسمان چیلوں سے بھرا پڑا تھا۔

☆☆☆

''زیب کدہ''، جہانگیری محلہ، آسنسول-۲ موبائل:۹۸۵۱۴۳۹۶۳۹

ڈاکٹر محمد علی حسین شائق

اُتر کے

میلے میں جمع بھیڑ میں آواز لگاتے ہوئے جب وہ داخل ہوا تو وہاں موجود لوگ اس کی شکل وشباہت دیکھ کر سہم گئے ۔ ہاتھ، پیر و دیگر جسمانی اعضاء سے بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ نہ انسان کے چہرہ جیسا لگ رہا تھا نہ ہی اور دوسرے جانداروں کی طرح لیکن اس کی آواز انسانوں کی آواز کی طرح نکل رہی تھی ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ آواز تھوڑی بہت مختلف تھی ۔ اس نے جیسے ہی آواز لگاتے ہوئے بھیڑ کے اندر گھسا لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کنارے لگنے لگے لیکن میلے کے بیچ میں پہنچ کر اس نے کنارے لگے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کیا لیکن لوگ اس کی جانب بڑھنے میں خوف محسوس کر رہے تھے ۔ ان میں کچھ لوگ ہمت جمع کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔

”آیئے، آیئے، آپ لوگ میری طرف بلا خوف آیئے میں آپ لوگوں کے لیئے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں، آپ جس چیز کی تلاش میں سالہا سال سے سرگرداں ہیں میں اسی کا مژدہ سنانے آیا ہوں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، آیئے، قریب آیئے۔“

اس کی باتوں کو سن کر لوگ متحیر بھی تھے اور خوف زدہ بھی لیکن وہ مسلسل لوگوں کو اپنی جانب بلائے جا رہا تھا۔ میلے میں بوڑھے، جوان، بچے، مرد اور عورت سبھی موجود تھے لیکن ان کی شناخت مشکل ہو رہی تھی ۔ عمر کی تفریق بھی نظر نہیں آ رہی تھی ۔ لوگ اب دھیرے دھیرے گروہ کی شکل میں اس کی جانب بڑھنے لگے ۔

”دیکھیئے جلدی کیجیئے، میرے پاس وقت نہیں ہے ۔ میں آپ لوگوں کو یہ مژدہ سنا کر واپس جانا چاہتا ہوں ۔ میرے ذمہ اور بھی کئی کام ہیں ۔“

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی ۔ لوگ اس کے چہرے کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پہچان مشکل ہو رہی تھی ۔ مژدہ سننے کے لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے اور داخلی طور پر بیتاب بھی نظر آ رہے تھے ۔ بھیڑ اب لگ بھگ اس کے قریب جمع ہو چکی تھی ۔ میلے میں موجود دکاندار بھی مژدہ سننے کے لئے اپنی اپنی دکانوں کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے اس کے قریب پہنچ گئے تھے ۔

”سنایئے مژدہ، سنایئے“ بھیڑ سے ایک نحیف آواز ابھری ۔

”بس چند سکنڈ انتظار کیجیئے۔“

اچانک بھیڑ میں چہ مگوئیاں ہونے لگی، کیسا مژدہ؟ ہمیں کیا سننا ہے وہ دیگر آوازیں گونجنے لگی ۔

”اب تو سنایئے، اتنی دیر سے ہملوگ کھڑے ہیں ۔ شام ہو چلی ہے ۔ سورج غروب ہونے والا ہے ۔ جلد ہی چاروں طرف تاریکی پھیل جائے گی ہمیں گاؤں بھی لوٹنا ہے ۔ اس لئے خوش خبری جلد سنایئے۔“ بھیڑ سے یکے بعد دیگرے دو ایک آوازیں ابھریں ۔

”بس سنا رہا ہوں۔“ اس نے استفسار کیا۔

خاموش، خاموش، مژدہ سنئے، مژدہ سنئے'' بیک وقت کئی ایک آوازیں ابھریں اور میلے میں رات جیسا سکوت چھا گیا۔

وہ میلے میں پوری توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ میلے کا کاروبار تھوڑی دیر کے لئے تھم سا گیا تھا۔ بس اکا دکا آدمی ادھر ادھر گھوم رہے تھے لیکن ان کی نظریں بھی اسی کی جانب ٹکی ہوئی تھیں۔

''دیکھئے، میں ضرور آپ لوگوں کو مژدہ سناؤں گا۔ آپ جس چیز کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں وہ چیز آپ کو حاصل ہوگی لیکن اس کے لئے آپ کو کچھ قربانیاں دینی ہوں گی۔ لیکن اطمینان رکھئے میں جان کی قربانی کی باتیں نہیں کروں گا بلکہ آپ سبھوں کو اپنے لباس کی قربانی دینی ہوگی، پھر وہ چیز آپ کے سامنے ہوگی۔''

سبھی لوگ حیرت میں پڑ گئے، چہ مگوئیوں کا شور ایک مرتبہ پھر بڑھنے لگا۔ یہ کیسی انوکھی قربانی، ہم لوگ تو لباس کی قربانی پہلے سے ہی دیتے آرہے ہیں، پھر کیسی قربانی؟

''آپ لباس کی کس طرح کی قربانی کی باتیں کر رہے ہیں ہم لوگ تو لباس کی قربانی شروع سے دیتے چلے آرہے ہیں۔ یہ دیکھئے ہم نے تھری کوارٹر پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھا ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ دیکھئے کتنا پتلا کپڑا پہن رکھا ہے کہ باہر سے جسم کا ایک ایک عضو نظر آرہا ہے، پھر کیسی قربانی کی باتیں کر رہے ہیں آپ؟'' بھیڑ میں موجود ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنی جسم پر موجود کپڑوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بات بالکل صحیح ہے لیکن محض اتنی سی قربانی سے وہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی۔ مزید قربانی دینی ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے بتائیے، لباس کی کیسی قربانی؟'' بھیڑ میں موجود ایک نوجوان شخص نے کہا۔

''دیکھئے اب شام ہو چلی ہے، سورج غروب ہو رہا ہے، چاروں طرف سیاہی پھیل رہی ہے۔ آپ لوگوں کو گھر بھی لوٹنا ہے اس لئے ابھی میں صرف اتنا ہی کہہ پاؤں گا کہ اگر آپ لوگ وہ چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے لباس کی مزید قربانی کے ساتھ کل پھر یہاں آئیں۔''

اتنا کہہ کر وہ پیچھے کی جانب مڑا اور بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ لوگ دھیرے دھیرے اپنے گھروں کی طرف کی بڑھنے لگے۔ دکاندار اپنی اپنی دکانوں کو سمیٹنے لگے۔ تھوڑی دیر میں میلے کا میدان خالی ہوگیا۔ میلے سے لوٹ رہے لوگوں کے چہروں پر تجسس کے آثار نمایاں تھے اور آپس میں محو گفتگو تھے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جو محض لباس کی قربانی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

دوسرے دن سورج پورے آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ لوگوں کے چہروں پر مسرت کی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ آج وہ خوش خبری سننے کے لئے تیار تھے دیکھتے ہی دیکھتے وقت سہ پہر تک آپہنچا۔ تمام راستے میلے کی طرف جارہے تھے۔ بیچ میدان میں بھیڑ اکٹھا ہوتی جارہی تھی کہ اچانک وہ نظر آیا۔

''وہ دیکھو، وہ آرہا ہے!'' بھیڑ میں ایک نوجوان لڑکی نے کہا۔

سبھی اس کی جانب مڑ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے بھیڑ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر مسرت کی لکیریں ابھرنے لگیں تھیں کہ انہیں اب وہ چیز حاصل ہو جائے گی۔ وہ اچانک پھر اسی ٹیلے پر آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب قسم کا تاثر دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے لوگوں کے لباس پر ایک نظر ڈالی۔لوگوں نے آج اپنے لباس کو اور بھی کم کر دیا تھا۔اس بار وہ دیکھ رہا تھا کہ عورتوں اور لڑکیوں کے جسم پر بہت بہت مختصر کپڑے تھے۔ان کا پینٹ گھٹنے سے اوپر تھا اور ٹی شرٹ سینے کے ابھار کے تھوڑا سے نیچے تھا۔وہ بہت خوش تھا۔اسے آہستہ آہستہ کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔بھیڑ میں موجود لوگوں کے چہروں سے عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔ان کے درمیان لباس کی تفریق مٹ چکی تھی۔وہ اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے بے قرار نظر آ رہے تھے۔بھیڑ رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔وہ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ان کے درمیان مرد اور عورت کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ان کے ہاتھ پاؤں ممنوعہ جگہوں پر بھی پڑ رہے تھے۔انہیں اس کے تلذذ کا احساس ہو رہا تھا۔وہ ٹیلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔اسے کامیابی ملتی نظر آ رہی تھی لیکن وہ اس کامیابی سے ابھی پوری طرح خوش نہیں تھا اسے مزید کم لباسی کی ضرورت تھی۔

بھیڑ کی بڑھتی ہوئی شاخ دور تک پھیلنے لگی تھی۔لوگوں کو جسمانی تلذذ حاصل ہو رہا تھا۔وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کو پیچھے کھینچ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور جسمانی تلذذ کے ساتھ اپنے حدود کو تجاوز کر رہے تھے۔کچھ دیر تک یہ منظر جاری رہا۔سورج اپنے سفر پر رواں تھا۔اس کی تمازت بھری کرنیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ رہی تھیں گرمی کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔دھکم پیل میں لوگوں کو وقت کا پتہ بھی نہیں چل سکا کیوں کہ انہیں تو ایک دوسرے کو پکڑنے میں جسمانی تلذذ حاصل ہو رہا تھا۔

جب سورج ڈوبنے لگا تب بھیڑ سے ایک آواز ابھری ''وہ کون سا مژدہ ہے، بتایئے؟ ہم لوگ بہت دیر سے یہاں جمع ہیں۔''

اس آدمی کی بات سن کر وہ ایک بار اور مسکرایا اور اپنے سر کو جنبش دی۔

آج اس کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی تازگی نظر آ رہی تھی۔ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کامیابی مل رہی تھی۔وہ جو چاہ رہا تھا اس کی تکمیل ہونے جا رہی تھی۔

''اب تو بتایئے؟'' پھر ایک نے کہا

اس نے پھر اپنے سر کو جنبش دی اور کہا گھبرایئے مت بہت جلد وہ چیز آپ کو مل جائے گی۔یقیناً آپ نے لباس کی قربانیاں دی ہیں۔آپ کے لباس، آپ کے جسموں سے قدرے چھوٹے ہو چکے ہیں۔وہ چیز آپ کے قریب آ رہی ہے لیکن ابھی اور بھی لباس کی قربانی دینی ہوگی پھر یقیناً وہ چیز حاصل ہو جائے گی۔اس لئے آپ کل پھر یہاں آیئے۔یقیناً وہ خوش خبری سننے کو ملے گی۔اتنا کہہ کر وہ رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتا گیا اور غائب ہو گیا۔

لوگوں کے درمیان چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔عجیب و غریب قسم کا آدمی ہے۔ہم لوگ تو اپنے لباس کی قربانی کر ہی رہے ہیں۔لباس کی قربانی کر کے فیشن کی دنیا میں ہم نے بے بہا اضافہ کر دیا ہے۔آج جس قدر تنگ کپڑے پہنے جائیں، ترقی یافتہ سماج کی نشانی سمجھی جاتی ہے ہم لوگ تو وہی کر رہے ہیں ہم نے اپنے کپڑوں کو تنگ کر لیا ہے۔رہی بات مزید قربانیوں کی تو یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں اس سے وہ چیز تو حاصل ہو جائے گی۔بھیڑ میں موجود لوگ ایک دوسرے سے جملوں کا ردو بدل کر رہے تھے اور دھیرے دھیرے اپنے گھروں کی جانب لوٹنے لگے تھے۔شام کا دھندلکا بڑھنے لگا تھا۔آسمان پر تارے جگمگانے لگے تھے۔رات کی تاریکی میں برقی قمقموں کی چمک سے لوگوں

کے جسموں کا ابھار واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ لوگ خود سے بے خبر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر عیش و مستی کے بعد گھر لوٹ رہے تھے۔

دوسرے دن پھر لوگوں کی بھیڑ میلے میں جمع ہو گئی تھیں اور بے صبری سے اس شخص کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک وہ نظر آیا۔ وہ بھیڑ کی جانب بڑھنے لگا لوگوں کو پورا یقین تھا کہ آج انہیں وہ چیز حاصل ہو جائے گی اور وہ مزید ترقی یافتہ قوم بن جائیں گے۔ لوگ اس بے شناخت چہرے کو دیکھتے لیکن کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ وہ کون ہے۔ لوگ صرف اپنی چیز حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور آج تیسرا دن تھا لیکن اس بار لوگوں کو یقین تھا کہ وہ چیز انہیں مل جائے گی۔

جیسے ہی وہ اونچے ٹیلے پر چڑھا سبھی کی نظریں اس پر ٹک گئیں۔ ماحول میں یکبارگی سکوت چھا گیا۔ اس نے بھیڑ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ اچانک اس کے اندر سے ایک زوردار قہقہہ دراز ہوا اور دراز ہوتا گیا۔ وہ قہقہہ لگائے جا رہا تھا۔ لوگ اس کے قہقہے سے مبہوت ہوتے جا رہے تھے تھوڑی دیر بعد اس کا قہقہہ تھم گیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سبھی لوگ خاموش تھے وہ چپ ہو گیا ایک گہری نظر بھیڑ پر ڈالا پھر ہنسنے لگا۔ یہ معمہ لوگوں کی سوچ سے بالاتر تھا۔ وہ اونچے ٹیلے سے نیچے اترا اور ایک ایک آدمی کو نہارنے لگا۔ وہ اب بھیڑ کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ وہ لوگوں کے تلذذ زدہ جگہوں کو چھوتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لوگوں کے جسموں میں گدگدی پیدا ہوتی اور وہ جسمانی تلذذ میں مبہوت ہو جاتے۔ ایک ایک کر کے جب اس نے تمام لوگوں کو نہار لیا تو پھر ٹیلے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہے کی آواز دور تک گونجنے لگی لوگ خاموش تھے لیکن اب خوف زدہ نہیں تھے بلکہ اس نے تو انہیں جسمانی تلذذ کا ایک حسین موقع فراہم کر دیا تھا۔ لوگ ایک ایک کر کے اسے گلے لگا رہے تھے۔

اچانک وہ چپ ہو گیا اور کہا آج وہ چیز آپ کو مل چکی ہے۔ آپ کے پاس موجود ہے یہی وہ چیز ہے جو میں آپ لوگوں کو دینا چاہتا تھا تاکہ آپ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شمار کیے جائیں۔

لوگ محو حیرت تھے کہ کون سی چیز انہیں حاصل ہوئی ہے۔

بھیڑ میں موجود ایک نوجوان لڑکی نے کہا، ''کون سی چیز ہے جو حاصل ہوئی ہے؟''

''اپنے جسم کو دیکھو تم نے اپنے کپڑوں کی پوری قربانی پیش کر کے وہ چیز حاصل کر لی ہے جو اب تمہارے پاس ہے۔ سبھی لوگ اپنے اپنے جسموں کو دیکھنے لگے۔ میلے میں موجود تمام کے تمام لوگ مادرزاد ننگے تھے۔ ان کے جسموں پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا۔ وہ اپنے حساس عضو کی مدد سے اپنے آپ کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ وہ عریاں ہو چکے تھے۔

''میں نے جس چیز کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کر چکا ہوں۔ مزید آگے کا انتظام آپ خود کریں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا گیا اور یک لخت غائب ہو گیا۔ بھیڑ خود کو ٹٹولتی رہی تب تک رات کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی اور......!!!

☆☆☆

کاشانۂ مصطفیٰ، بلاک نمبر:۳، کمرہ نمبر ۱-۲، تھانہ روڈ، جگتدل، ۲۴؍ پرگنہ (شمال) مغربی بنگال، موبائل: 9831530259

رئیس صدیقی

ظالم سنگھ

یہ اُس عہد کی بات ہے جب بادشاہ ہوا کرتے تھے اور وہ اپنے ملک پر بادشاہت کرتے تھے۔ کچھ بادشاہ اچھے ہوتے تھے تو کچھ بادشاہ بہت برے ہوتے تھے۔

یہ کہانی ایک ایسے ہی برے بادشاہ کی ہے۔ اس کا نام تھا **ظالم سنگھ**۔ ظالم سنگھ بہت ظالم، بدمزاج، تنگ دل اور حاسد بادشاہ تھا۔ وہ بہت مغرور اور انا پرست تھا۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ جو بھی اس کے خلاف بولتا، وہ شخص کسی نہ کسی بہانے قید و بند کی سزا کا شکار ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ کسی کی تعریف بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنی رعایا میں جب کبھی، کسی کو ذرا بھی ہر دل عزیز اور خوش حال دیکھتا تو اس سے حسد کرنے لگتا اور کسی نہ کسی بہانے اس کو نا قابل برداشت تکلیف پہنچاتا۔ اس کی سلطنت میں صرف اس کی ہی حکمرانی چلتی۔ سارے وزیر اس کی ہاں ہاں میں ملاتے۔ ایک روز بادشاہ کے جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ قبیلہ کا سردار **مظلوم سنگھ** عوام میں روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے اور اس کی انصاف پسندی و خدا ترسی کا ہر جگہ چرچا ہے۔

یہ سننا تھا کہ اس ظالم سنگھ نے فرمان جاری کیا کہ ''مظلوم سنگھ کو مابدولت کے سامنے آج ہی اور اسی وقت پیش کیا جائے۔''

بادشاہ کے وزیر نے حکم کی تعمیل کی اور مظلوم سنگھ کو اس کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے مظلوم سنگھ سے اپنی گرجدار آواز میں پوچھا ''کیا یہ سچ ہے کہ تم قبیلہ میں مجھ سے زیادہ پسند کئے جاتے ہو؟ اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ تم مجھ سے زیادہ خوش رہتے ہو؟ مجھے ایمانداری سے پوری بات بتائی جائے۔ مابدولت تمہاری طرف سے فکرمند ہیں۔''

سردار نے بڑی عاجزی سے جواب دیا ''آپ اس ملک کے بادشاہ ہیں، آقا ہیں، مالک ہیں۔ ہر چیز آپ کے ماتحت ہے۔ ہر روز آپ ہزاروں کو اپنی مہربانیوں سے نوازتے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کے مقابلے، اس حقیر کی کیا بساط! بندہ معافی چاہتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''تو گویا بادشاہ سلامت جھوٹ بول رہے ہیں؟'' ظالم سنگھ کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''اگر جان کی امان پاؤں تو عرض ہے کہ میں نے تو ایسا عرض نہیں کیا، عالی جاہ!'' مظلوم سنگھ نے بڑے ادب سے کہا۔

''نہیں! تم گستاخ ہی نہیں، بے ادب بھی ہو۔ تم کو سزا ملنی چاہیے۔'' اور ظالم سنگھ نے اس بے گناہ مظلوم سنگھ کو پھانسی کی سزا دینے کا فیصلہ سنا دیا۔

فیصلہ سن کر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا کیونکہ سارے درباری اچھی طرح جانتے تھے کہ مظلوم سنگھ بے قصور ہے۔

ایک منہ لگے درباری نے کورنش بجالاتے ہوئے بڑے ادب و احترام سے بادشاہ کی خدمت میں عرض کرنے کی ہمت کی۔ ''جہاں پناہ! جہاں تک میری معلومات ہے، سردار مظلوم سنگھ بالکل بے گناہ ہے۔ یہ تو آپ کا خادم ہے۔ آپ کا وفادار ہے۔''

''اچھا تم کہتے ہو تو میں اس کو معاف کر دوں گا مگر ایک شرط ہے۔ یہ میرے ایک سوال کا جواب دے گا۔'' ظالم سنگھ نے تیور بدلتے ہوئے مظلوم سنگھ کے سامنے اپنا سوال رکھا۔ ''میرا سوال یہ ہے کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟''

مرتا کیا نہ کرتا۔ بے چارے سردار نے بہت سوچا کہ اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے لیکن اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے بادشاہ سے درخواست کی:

''عالی جاہ! مجھے اس سوال کا جواب دینے کے لیے چند دن کی مہلت عطا فرمائی جائے۔''

بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے اسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔

''میں تمھیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تم نے اتنی مہلت میں میرے سوال کا جواب نہ دیا تو تمھیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔''

ایک ایک کر کے دن گزر گئے۔ وہ اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا۔ آخری دن سردار نے سوچا کہ کل میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کیوں نہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کا آخری دیدار کر لوں۔ چنانچہ وہ لوگوں سے ملاقات کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ راستے میں اسے ایک لوہار ملا۔ اس نے سردار کو سلام کیا۔ سردار بے خیالی میں جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

قبیلہ کے لوہار نے سردار کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا اس کو تشویش ہوئی کہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے سردار سے دریافت کیا۔

''سردار! کیا بات ہے؟ آج آپ بہت دُکھی دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' سردار نے اسے مختصر سا جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی لیکن لوہار نے سارا قصہ معلوم کر کے ہی دم لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سردار کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر سردار بہت خوش ہوا اور اپنے گھر واپس آ گیا۔

مقررہ دن لوہار سردار کے حلیہ میں، بھیس بدل کر، اپنے چہرہ کو مختلف رنگوں سے رنگ کر اور منھ پر کپڑا لپیٹ کر بڑے اعتماد سے دربار میں حاضر ہوا۔

''کیا تم میرے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو؟'' ظالم سنگھ نے کڑک کر سوال کیا۔

''جی بادشاہ سلامت! یہ غلام، حاضر ہے۔'' لوہار نے عرض کیا۔

ظالم سنگھ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنا سوال داغا۔ ''ہاں تو بتاؤ۔ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟''

''بادشاہ سلامت! اس وقت آپ سوچ رہے ہیں کہ کیا میں وہی **مظلوم سنگھ** ہوں جو آپ کے سوال کا فوراً جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا اور اس نے تین دن کی مہلت مانگی تھی۔''

اس پر بادشاہ چونکا اور بولا ''ہاں، تمہاری آواز کچھ بدلی بدلی سی لگتی ہے۔ تم نے اپنا چہرہ کئی رنگوں سے رنگا ہوا ہے۔ تم نے اپنے چہرہ پر چہرہ لگا رکھا ہے۔ تم مظلوم سنگھ نہیں لگتے ہو۔ آخر تم کون ہو؟''

''میرے آقا! آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ میں مظلوم سنگھ نہیں ہوں۔ میں قبیلہ کا لوہار ہوں۔'' اس نے اپنے چہرہ

سے کپڑا ہٹاتے ہوئے کہا۔

اس انکشاف پر بادشاہ اور سارے درباری حیرت میں پڑ گئے۔ پھر بادشاہ نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا ''تم مظلوم سنگھ کا حلیہ بنا کر، بھیس بدل کر، اپنے چہرہ پر چہرہ لگا کر مظلوم سنگھ کے بدلے کیوں آئے ہو؟''

''جہاں پناہ! مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بے گناہ انسان پھانسی کے تختہ پر نہ چڑھا دیا جائے۔''

''تو کیا تم کو معاف کر دیا جائے گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم دونوں بچ جاؤ گے۔'' بادشاہ غرایا۔

''بادشاہ سلامت! میں اگر اس دنیا سے چلا بھی جاؤں تو قبیلہ اور ملک کا کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن مظلوم سنگھ جیسے ایماندار اور نیک انسان سردار کی اس ملک کو سخت ضرورت ہے۔''

لوہار کی ہمت اور قربانی کا جذبہ دیکھ کر بادشاہ اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

بادشاہ ظالم سنگھ کی خود ستائشی، خود غرضی، غرور، حسد اور ظلم نے لوہار کی شکل میں انسانیت کا پاک اور مہربان چہرہ دیکھا۔ لوہار کے جذبۂ ایثار نے بادشاہ کی سوچ بدل دی۔ اس کا ضمیر جاگ اُٹھا اور وہ **ظالم سنگھ** سے **انسان سنگھ** بن گیا۔

ظالم سنگھ کو **انسان سنگھ** بنے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اسے اپنی زندگی بے کیف، بے رنگ اور پھیکی پھیکی سی لگنے لگی۔ اس کو لگا کہ اب لوگ اس سے ڈرتے نہیں ہیں۔ اس کے سامنے اپنی بات کھل کر رکھتے ہیں۔ اب لوگ حقوق اور جمہوریت کی بات کرنے لگے ہیں۔ یہ بات اس کی انا کو چوٹ پہنچانے لگی۔ اس کی سرشت میں، اس کی جبلت میں، اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر حکمرانی کی انا، غرور، خود ستائشی، خود غرضی، تنگ دلی، حسد، ظلم اور ناانصافی نے پھر گھر کر لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ظالم سنگھ بن کر رہنا ہی اس کی اصل خوشی کا سرچشمہ ہے!

☆☆☆

BUNGALOW NO. 2-RAHAT KADA, 14-GREEN VAALEY ENCLAVE,
AIRPORT ROAD, BHOPAL-462 030, Mob:9810141528, 9811426415
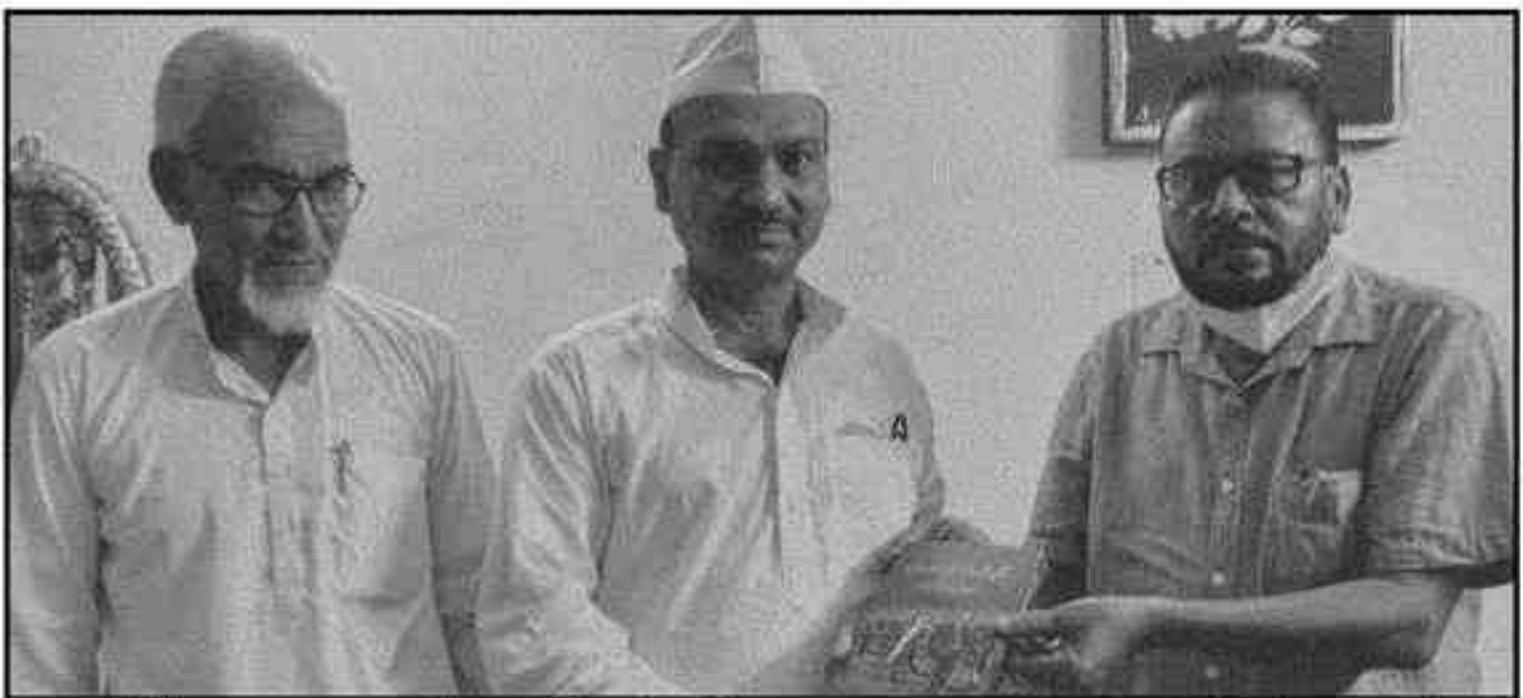
۴؍ اکتوبر ۲۰۲۰ء کو ڈاکٹر نور اسلام (چیئرمین، بہار مدرسہ بورڈ) کو ان کی رہائش گاہ واقع پٹنہ میں اپنی کتاب ''پہلی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) میں اردو زبان کا کردار'' پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم۔ ساتھ میں ہیں ڈاکٹر ایم صلاح الدین

انظارالبشر (بارکپور، مغربی بنگال)

ظاہر و باطن

گذشتہ ۶ اکتوبر کو درگا پوجا کا تہوار اپنے پورے شباب پر تھا۔ شہر کولکاتا کو ہر زاویہ سے دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ شہر میں بڑی بھیڑ تھی۔ لوگوں کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا تھا۔ میں اپنے دو دوستوں کے ہمراہ پوجا کی سیر وتفریح کے بعد رات کے دس بجے سیالدہ اسٹیشن پہنچا کیونکہ زیادہ رات ہو جانے کے بعد گھر کے لوگ برہم ہو جاتے ہیں......

سیالدہ اسٹیشن پر کلّو چچا سے اچانک ملاقات ہوگئی جو میرے محلے میں ہی رہتے تھے، مگر وہ قرب و جوار ہی میں نہیں بلکہ مضافات میں اپنی سیاہ کرتوتوں کی وجہ سے ایک نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ جوا، شراب نوشی، کھینی، پان، گٹکا، مصالہ، سٹہ، پتہ خوری، گانجہ اور ہیروئن خوری اور بھی نہ جانے کتنی بری عادتوں کا ایک مکمل مجسمہ تھے۔

اسی کلو چچا سے ہم لوگوں کی اچانک سیالدہ اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی۔ تفریح لینے کے لئے ہم لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا...... آج بھی وہ حد درجہ شراب کے نشہ میں دھت تھے......

میں نے انہیں بڑے زور سے آواز دی ’’کلو چچا‘‘...... وہ ٹکٹ لینے کے لئے ٹکٹ کاؤنٹر کی جانب جا رہے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو ایک جا کیا اور مسکراتے ہوئے بولے:

’’کیوں بے اتنی رات گئے سیالدہ میں......‘‘

میں نے کہا: ’’کلّو چچا، کیا گھر کو جا رہے ہیں!! ہاں بھئی ٹکٹ تو لے لوں۔

ارے ٹکٹ چھوڑو، یہاں ٹکٹ کون لے رہا ہے۔ ہم لوگ بغیر ٹکٹ آئے بھی اور جا بھی رہے ہیں۔ چچا جلدی چلو ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔ چچا ٹکٹ لینے کے لئے بضد تھے۔ ہم تینوں نے انہیں مضبوطی سے پکڑا اور ۱۰:۰۸ بجے کے راناگھاٹ میں گھسیٹ کر لے گئے۔ گاڑی میں قدم رکھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ اور ہم لوگ خراماں خراماں خرمستی کرتے ہوئے ۲۰ رکیلومیٹر کا سفر ۳۵ منٹ میں طے کرکے ٹیٹا گڑھ پہنچ گئے۔ چچا کو بھی سہارا دے کر اتارا گیا۔ وہ اپنے رستے اور ہم لوگ اپنے رستے چلے۔

اچانک میں نے دیکھا کہ کلّو چچا ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ بڑے آرام سے ٹیٹا گڑھ ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ کاؤنٹر پر کھڑے ہو گئے اور اپنی جیب ٹٹولنے لگے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اتنی رات کو ٹیٹا گڑھ سے کہاں جائیں گے۔ لہٰذا دبے قدموں سے ہم لوگوں نے ان کا تعاقب کیا اور فوراً ان کے پشت پر جا پہنچے۔ کلّو چچا نے ٹیٹا گڑھ سے سیالدہ کے چار ٹکٹیں خریدے۔ حیرت ہے آدمی ایک ٹکٹ چار۔ چچا جونہی مڑے میں نے کہا یہ چار ٹکٹیں سیالدہ کے لئے، کیا ماجرہ ہے؟ سب خیریت تو ہے! بہت نشے میں ہو۔ چچا نے چاروں ٹکٹیں پھاڑ کر وہیں زمین پر پھینکا اور راہ چلتے ہوئے بولے۔ بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا قانوناً جرم ہی نہیں بلکہ ہم خدا کی نظر میں بھی گنہگار قرار دیئے جائیں گے۔ یہ چار ٹکٹیں اسی کا کفارہ ہے۔

ایسا ایک دن میں نہیں ہوگا۔ مگر ایک دن ضرور ہوگا۔

☆☆☆

مظفر مہدی (امریکہ)

ڈراؤنا سچ

وہ نیک خاتون دو بچوں کی ماں تھی۔ ایک بیٹا اور دوسری بیٹی۔ بیٹی ڈاکٹر تھی جس کے لئے ماں کا دل ہمیشہ دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے کی جدائی کے بعد ماں کے ہی شہر میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آکر رہنے لگی تھی۔ ماں کا معمول تھا کہ جب بھی گھر میں کوئی نئی چیز بنتی وہ اپنی بیٹی کو جا کر پہنچایا کرتی تھی۔ ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا برابر لگا رہتا تھا۔ مگر اب بدلے ہوئے حالات میں ملاقات کا سلسلہ موقوف تھا۔ لاک ڈاؤن کے باعث ہر چہار طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ قہر خداوندی کا بول بالا تھا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔ محل سے لے کر جھونپڑی تک میں رہنے والے لوگ خوف میں جی رہے تھے۔ مکمل لاک ڈاؤن کے تحت گھر کے تمام دروازے بند۔ دکانیں بند۔ بازار بند۔ آمد و رفت کا سلسلہ بند۔ ہر جانب ایک گہرا سناٹا۔ ملک ملک، شہر شہر، گاؤں گاؤں کی کہانی ایک جیسی تھی۔ ایسا ڈرانے والا منظر کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔

عرصہ کے بعد آج لاک ڈاؤن میں چند گھنٹوں کی ڈھیل دی گئی تھی۔ ماں کے دل میں بیٹی کا پیار جاگا۔ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ بس کیا تھا اس نے موقع غنیمت جانا اور حسب معمول چند تحائف کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بیٹی کے دروازے پر پہنچی۔ کال بیل بجایا۔ دروازہ کے اندر سے بیٹی نے کیمرہ کی مدد سے باہر کھڑی ماں کو دیکھ لیا اور بہت احتیاط کے ساتھ دروازہ کا ایک حصہ کھولا۔ اندر ہی رہتے ہوئے ماں کو سلام کیا اور خیریت پوچھی اور لپک کر ماں کے ہاتھ کی پوٹلی کو لے لیا اور یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر لیا کہ امی آپ کو فی الحال نہیں آنا چاہئے تھا۔

ماں دروازہ کے باہر کھڑی بند ہوتے ہوئے دروازہ کو دیکھتی رہی۔ منٹ دو منٹ کے لئے اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ تھوڑے توقف کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھی بیٹھی جہاں کرونا وائرس کو کوستی رہی وہیں اپنی بیٹی کے رویوں کے لئے ایک خوبصورت نام کی تلاش میں بھی لگی رہی۔

☆☆☆

صاحب جی

نشہ تو آخر نشہ ہی ہوتا ہے خواہ شراب کا نشہ ہو یا شباب کا۔ دولت کا نشہ ہو یا پاور کا۔ علم کا نشہ ہو یا حسن کا۔ کامیابی و کامرانی کا نشہ ہو یا مقبولیت کا۔ انہیں پا کر آدمی اکثر و بیشتر بے قابو ہو جاتا ہے۔ درآں حالیکہ ان میں کچھ بھی اپنا نہیں۔ یہ ابھی ہے اور نہیں ہے۔ اب خواہ مخواہ آنی جانی چیزوں پر اتنا اترانا اور غرور و گھمنڈ کرنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں۔ بس اس بڑی سچائی سے صاحب جی بالکل ہی نا آشنا تھے۔ اگر واقعی وہ آشنا ہوتے تو اپنے سردار کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں

ہوتے۔ان کے سردار نے ان کا انتخاب ہی اس لئے کیا تھا کہ ان کے ذریعہ اپنے تمام منصوبوں کو عملی جامہ پہنا کر لمبی مدت کے لئے اپنے سر پر تاج سجائے رکھنے کا انتظام کر سکے۔ یوں بھی صاحب جی کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ دھن کے پکے تھے اور کام کے سچے تھے۔وہ بارہا ان راہوں سے گذر کر اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکے تھے۔ان کی فکری و ذہنی تربیت بھی کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ ان کا رنگ و ڈھنگ دونوں بدل گیا تھا۔ یہی دونوں ان کی پہچان بھی بنے ہوئے تھے۔صاحب جی تو صاحب جی ہی ٹھہرے۔وہ دوسروں کا ذرا کم ہی خاطر میں لاتے۔ جب سے نشہ چڑھا تھا نیم چڑھا کریلا ہو گیا تھا۔ وہ صرف اپنی ہی سنتے اور سناتے ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی دوسرا ان کے سامنے بولنے کی ہمت کرے۔ یاد آتا ہے کہ جب وہ اپنے ساتھیوں کے مجمع کے سامنے کرونولوجی کی وضاحت کر رہے تھے تو ان کا غرور ساتویں آسمان پر تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے بھیس میں بدنام زمانہ ہٹلر کا پنر جنم ہوا ہو۔ ان کے وائرس کی خبر سے پورے ملک کی فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔لوگوں کو اپنا وجود خطرہ میں لگنے لگا تھا۔ جڑ سے بے جڑ ہونے کا احساس ستانے لگا تھا۔لوگ صاحب جی سے فریاد پر فریاد کر رہے تھے لیکن وہ تو مکمل صفائی کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔لوگ مایوس ہو کر سڑکوں پر آ گئے تھے۔فریاد اور دعاؤں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر عمر کے لوگوں نے اپنے مالک کے سامنے گڑگڑانا شروع کیا۔ رحمت خداوندی کو جوش آیا۔ابھی لوگ سڑکوں پر ہی تھے کہ اچانک ایک ان دیکھا سا کیڑہ وائرس کی شکل میں ساری دنیا میں نمودار ہوا اور موسیٰ کی لاٹھی کی شکل میں سب کو نگلنے لگا۔ایک وائرس سے تحفظ کے لئے لوگ گھروں سے باہر نکل گئے تھے۔اس قدرتی وائرس سے بچنے کے لئے لوگ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔آج شاہ و گدا سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔صاحب جی اور ان کے سردار سبھوں کی زندگی کے لالے پڑے ہیں۔قدرتی کرونولاجی کے سامنے سبھی بے بس اور بے خود ہیں۔اوروں کی طرح صاحب جی بھی خوف زدہ ہیں۔چہرہ کا رنگ پھیکا پڑا ہوا ہے۔سنا ہے وہ بھی ان دنوں دعائیں مانگ رہے ہیں۔

☆☆☆

نظمیں

مصطفیٰ اکبر (کولکاتا)

امیدِ سحر

اے مرے دیدۂ تر!
ایسے دل گیر نہ ہو، تھوڑا سنبھل، تھوڑا ٹھہر
وقت کے ساتھ بڑے دن بھی گزر جائیں گے
زخمِ دل جتنے بھی ابھرے ہیں وہ بھر جائیں گے
غم نہ کر غم جو ہوا چاند ستاروں کا نگر
دل میں قائم ہے اگر جذبۂ الفت کا اثر
شب کے پردے سے نکل آئے گی لیلیٰ سحر
اے مرے دیدۂ تر!

رات آئی ہے ابھی اور اندھیرا ہوگا
اس اندھیرے میں لٹیروں کا بسیرا ہوگا
ایک ایک کر کے بجھے جائیں گے کچھ اور چراغ
بادِ صرصر کا ہر اک کوچے میں پھیرا ہوگا
غم نہ کر، تھوڑا سنبھل، تھوڑا ٹھہر
اے مرے دیدۂ تر!

رات آتی ہے تو جل جاتے ہیں راہوں میں چراغ
روشنی پھیلتی ہے، ختم کہاں ہوتی ہے
رات کے پردے میں جب ظلم روا ہوتا ہے
ظلم کے سائے میں ہمت بھی جواں ہوتی ہے
غم نہ کر، تھوڑا سنبھل، تھوڑا ٹھہر
اے مرے دیدۂ تر!

ختم ہو جائے گی یہ رات، سویرا ہو گا
روشنی پھیلے گی، پھر دور اندھیرا ہوگا
پھر سے جھانکے گا افق سے کوئی محبوب صفت
ہر طرف پھر سے اجالوں کا بسیرا ہو گا
غم نہ کر، تھوڑا سنبھل، تھوڑا ٹھہر
اے مرے دیدۂ تر!

احسان ثاقب، آسنسول (مغربی بنگال)

شاہین صفت صنفِ نازک کی نذر

اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ
عورت ہے اگر پھول تو انگارہ بھی ہے وہ
پُرجوش فضاؤں میں سخن آرا بھی ہے وہ
تپتے ہوئے صحراؤں کی ہرکارہ بھی ہے وہ
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

یہ اوڑھنی پرچم کو بنانے کے لئے رکھ
اس برقع کو تہذیب بچانے کے لئے رکھ
چوڑی کی کھنک ہوش اُڑانے کے لئے رکھ
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

یہ جان لیں کہ لکشمی، رضیہ بھی تھی عورت
یہ جان لیں دروپدی، دُرگا بھی تھی عورت
تھی موم مگر سنگ اور تیشہ بھی تھی عورت
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

اے ارضِ وطن بول لب آزاد ہیں تیرے
کیوں اہلِ وفا آج کل ناشاد ہیں تیرے
سب چاہنے والے ہی کیوں برباد ہیں تیرے
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

چھائے ہوئے ہیں ہر طرف مقتل کے نظارے
کچھ کہہ رہے ہیں ان دنوں موسم کے اشارے
بے چین کیوں ہیں اس قدر دریاؤں کے دھارے
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

اٹھتے ہوئے طوفان کا رخ موڑ کر بیٹھیں
آ سب کے لئے راحتِ جاں چھوڑ کر بیٹھیں
یہ وقت ہے کہ ہم سبھی سر جوڑ کر بیٹھیں
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

گاندھی کی آزادی کو بچانے کے لئے اٹھ
آئین کا جو سچ ہے بتانے کے لئے اٹھ
ہر سمت نیا جوش جگانے کے لئے اٹھ
اُٹھ اہلِ وفا آ، اے خلقِ خدا آ

ڈاکٹر محمد معراج الحق برق (سابق صدر شعبۂ اردو فارسی، آر ڈی ایس کالج، مظفر پور)

حکمرانِ وقت کے نام

آج ملک ہند میں کیسی مچی ہے کھلبلی
بن گیا ہے اک وبالِ جان و دل این۔ آر۔ سی

ہوگئے سیماب پا ہر سمت پیر و مرد و زن
ہر کس و ناکس کے رخ پہ چھا گئی پژمردگی

چل رہی ہے آج باغِ زیست میں بادِ سموم
ہوعیاں ہر برگ وگل سے بے کسی، درماندگی

ہر طرف ہے نعرہ بازی، احتجاج و خلفشار
سر پہ عہدیدار کے جوں تک نہیں ہے رینگتی

حکمراں بن بیٹھے ہیں فرعون ساماں آج کل
اشک برساتی نظر آتی ہے ہر سو زندگی

ساری دنیا کی زبانوں پر ہے نفریں کی صدا
دیدنی ہے حکمرانِ وقت کی بے غیرتی

ہم تو خوش تھے ساتھ اپنے لائے ہیں تازہ پیام
ہائے وہ تو ہوگئے آمادۂ نشتر زنی

بے شبہ طرزِ حکومت سے ہیں وہ نا آشنا
کیا کہیں بھی بربریت سے حکومت ہے چلی

دیر تک چلتی نہیں ظلم و ستم کی آندھیاں
خاک میں مل جاتی ہے اہل ستم کی برتری

ہوگیا برباد گلشن پھر بھی خوش ہے باغباں
اس رویہ سے تو شیطاں کو بھی آتی ہے ہنسی

ہر سو فرقہ واریت کی آگ بھڑکاتے ہیں وہ
عقل کے مارے سمجھتے ہیں اِسے دانشوری

تھی چمن کی آبرو گلہائے رنگا رنگ سے
ہائے بجلی کس طرح چن چن کے پھولوں پر گری

دیکھتے ہیں وہ سنہرا خواب ہندو راشٹر کا
ہے نہیں کچھ ان کا منصوبہ مگر دیوانگی

ہے نہیں جمہوریت کی شان فرقہ واریت
کیا ترقی قوم کی اس طور ہوتی ہے کبھی

ملک کی تعمیر ہوتی ہے حسیں کردار سے
امتیازِ قوم و ملت ہے محض فتنہ گری

درحقیقت حکمرانی کا ہے یہ زرّیں اصول
باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

کر دکھایا ہے صحابہ نے، ہے کیا جمہوریت
ہیں وہ بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ اور مولا علیؓ

اس حقیقت کے ہیں شاہد آج صدہا واقعات
کس طرح ہوتی ہے درویشی میں بھی شاہنشہی

ظلم ڈھا لو جتنا چاہو، یاد رکھو ایک دن
رنگ لائے گی ہر اک مظلوم کی نوحہ گری

ملتی ہے پاداش بے شک ہر جفا و ظلم کی
ہے نہیں آواز کوئی لاٹھی میں اللہ کی

بے خبر انجامِ بد سے ہیں یہ اہلِ اقتدار
شامتِ اعمال بے شک ان کے سر پر ہے کھڑی

غیرتِ حق کو ذرا سی بھی اگر جنبش ہوئی
سر کے بل گر جائیں گے سارے بتانِ آزری

برق رہ خاموش رفتارِ زمانہ بھی تو دیکھ
گوش بر آواز ہو شاید کوئی سی۔ آئی۔ ڈی

....

آچاریہ جمال احمد جمال (مروئی والا)، کولکاتا

جنابِ علقمہ شبلی بہارِ انجمن بھی ہیں

ضلع نالندہ سے کلکتہ جب تشریف لائے تھے معاشی فکر کا اک بوجھ بھی سر پہ اُٹھائے تھے
پریشانی کے عالم میں قدم اپنے جمائے تھے جنابِ علقمہ نے علم کے جوہر دکھائے تھے

مدرسہ عالیہ کے آپ تو ٹیچر رہے برسوں
کہ علم وفن کے منظر نامہ کے منظر رہے برسوں

مدرسہ اور مسجد میں بھی گھر دے کر چلے آئے مسائل میں گھرے تھے گاؤں سے باہر چلے آئے
جو دولت تھی اُسے بھی مار کر ٹھوکر چلے آئے جنابِ علقمہ اخلاق کے پیکر چلے آئے

خدا کا شکر ہے کلکتہ اُن کو راس آیا ہے
سبھی فرزند کو تعلیم کا زیور پنہایا ہے

اک اچھے شاعرِ فطرت ہیں گلزار چمن بھی ہیں حسینی ہے مزاج ان کا وفادارِ وطن بھی ہیں
ادب کی آبرو ہیں اور انوارِ سخن بھی ہیں جنابِ علقمہ شبلی بہارِ انجمن بھی ہیں

ہمیشہ دوسروں کے وقت پر یہ کام آتے ہیں
نئی راہوں پہ چلتے ہیں نئی منزل بناتے ہیں

بہت ساری کتابیں مختلف موضوع پہ لکھی ہیں جو ہندوستان و بیرونی ممالک میں بھی پھیلی ہیں
بدلتی رُت بدلتے لوگوں کی رنگت بھی دیکھی ہیں کیا ہے تجربہ باتیں وہی لکھیں جو سچی ہیں

ہزاروں رنگ وابستہ رہے دل کی فصیلوں سے
ہمیشہ اشکِ غم پیتے رہے آنکھوں کی جھیلوں سے

جہانِ آب و گل کو چھوڑ کر ملکِ عدم نکلے جنابِ علقمہ شبلی بہ اندازِ کرم نکلے
بقولِ حضرتِ غالب مرے ارماں بھی کم نکلے لبوں پر کلمۂ طیب لیے میرا بھی دم نکلے

مرے معبود شبلی کی خطا کو درگذر کردے
چمک اٹھے لحد ان کی دعا میں بھی اثر کردے

یہاں شہزاد، عاصم، شہریار اک کامیاب انساں اور ان کی بیٹی فرزانہ جو ہے ماں باپ کا ارماں
یہ سب لختِ جگر ہیں بس خدا رکھے انہیں شاداں ہمیشہ ان کے سرمایہ فگن ہو رحمتِ یزداں

جمال اپنی دعا ہے کامیابی اور مل جائے
گلستانِ محبت میں گلِ ارمان کھل جائے

....

ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

ہم آگ سے گذر رہے ہیں

ہمارا ساتھ دے سکو تو آؤ
ہم آگ سے گذر رہے ہیں
گذر رہے تھے، ہم سبک روی سے
مُرغزاروں سے، ندی سے
سبز فرشِ مخملی سے
شاید میری خوش خرامی
کسی بے نظر کو نہ راس آئی
اُس نے اپنی کوتاہ نظری
کوتاہ ذہنی، کوتاہ فہمی
کوتاہ فکری، کوتاہ قلبی
جذبۂ فتنہ پروری
سے تنگ آ کر
ہماری رہگزر کو
مثلِ دوزخ بنا دیا ہے
آگ کا دریا بھی شاید
اُس کے منہ زور شعلوں سے
خدا کی پناہ مانگے

مگر ہمیں تو اس راہِ سخت جاں سے
گذرتے جانا ہے
صدیوں، صدیوں تک
دیکھنا ہے مرا ارادہ
آگ کو سپر ڈالنے پر
مجبور کیسے کرتا ہے
ہمیں یقیں ہے اُس ذاتِ یکتا،
ذاتِ واحد پر
کہ سارا جہاں ہے جس کا تابع
اُس کے حکم کے غلام سارے
ہمارے سجدے، قیام سارے
وہی تو ہے جو نظر نہ آئے
مگر ہمارے دلوں میں ٹھہرے
ہمارا ساتھ دے سکو تو آؤ
ہم آگ سے گذر رہے ہیں!!

ڈاکٹر محمد معراج الحق برق، سابق صدر شعبۂ اردو فارسی، آر ڈی ایس کالج، مظفر پور

دخترانِ شاہین باغ کے نام

محوِ حیرت ہے گلشن کی ہر نازک کلی
باغبانِ بے وفا کی دیکھ کر فتنہ گری

آفریں اے دخترانِ عزم خو شاہین باغ
لڑ کے طوفاں سے دکھا دی جرأت و مردانگی

پست کر ڈالے ہیں تم نے حکمراں کے حوصلے
لے گئی فولاد پر سبقت تمہاری نازکی

آفریں صد آفریں اے پیکرِ عزم و ثبات
ڈال دی ہے دشمنوں کے دل میں کیسی بے کلی

پیش کر دی تم نے بے شک قرن اولیٰ کی مثال
کر کے اُن اسلاف کے نقشِ قدم کی پیروی

ہو گیا ثابت تمہارے عزم و استقلال سے
صنفِ نازک میں بھی ہوتی ہے جوانمردی بھری

ہو مجاہدِ وقت کے اے دخترانِ خوش خصال
ساری دنیا کی نگاہیں آج ہیں تم پر جمی

آج کے فرعونِ ساماں کے اُڑے ہوش و خرد
ورطۂ حیرت میں ڈوبی دشمنوں کی مشنری

کہہ دیا لبیک تم نے وقت کی آواز پر
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے شانِ خودی

پُرخطر ماحول میں آئی نہ ماتھے پر شکن
دستِ نازک میں اٹھالی تیغِ بُرّانِ علیؓ

برقؔ ہے یہ پیش خیمہ انقلابِ دہر کا
پاش پاش ہو جائے گا بے شک طلسمِ سامری

....

۳۱ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو ڈاکٹر امام اعظم کو ''اردو انمول رتن ایوارڈ'' سے نوازتے ہوئے ڈاکٹر مختار احمد فردین۔
ساتھ میں موجود ہیں اشرف احمد جعفری، شاہد اقبال اور محمد شہاب الدین (روزنامہ ''تاثیر'' ہوڑہ)

خالد رحیم، بخشی بازار، کٹک

خدا خاموش ہے

نہ آئے گا، ہدایت دینے اب کوئی
کتابیں-آگئیں ساری
ہوا ہے-ختم نبیوں کا اُترنا بھی
ذرا سوچو
اثر- کتنا ہوا تم پر
بزرگوں کی نصیحت کا
کلامِ رب بھی فریادی
تمہاری غفلتوں سے ہے
خدا خاموش ہے
اور دیکھتا ہے اپنے بندوں کو
عبادت اور ریاضت
کس طرح کی جاری ہے، اپنے خالق کی
نہ ہے خوفِ خدا دل میں
جو تقویٰ ہے دکھاوا ہے
کسی کو زعم دولت کا
تکبّر سے کوئی مملو
کسی کے ساتھ مکّاری
کسی کی جھوٹ سے یاری
کوئی غیبت کا دلدادہ
کوئی بیوی کا ہے مجرم
تو کوئی اپنے بچوں کا

کوئی ظلم و ستم ڈھائے
رُلائے کوئی بے بس کو
کہیں تذلیل انسانی
کہیں تبلیغِ شیطانی
کہیں ایمان بکتا ہے
کہیں ارماں بکتا ہے
کوئی ماں باپ کی تکلیف کا مظہر
کہیں روتے پڑوسی
اور کہیں تخریب کا منظر
محبت بانٹنے والے
کہاں ہیں امن کے خوگر
عجب ہے حال لوگوں کا
پشیمانی کہیں نہ شرمساری ہے
ہر اک جا بے حیائی اور بُرائی ہے
ہزاروں سال کی درس و نصیحت کام نہ آئی
کتابوں کی ہدایت سے کیا نہ استفادہ
وہی دورِ جہالت آج بھی ہے
وہی حیوانیت- انسانیت پر
ہو رہی آج بھی حاوی
اذیت ناک منظر لے کے یہ دنیا کھڑی ہے
خدا خاموش ہے- سب دیکھتا ہے!!

☆☆☆

ڈاکٹر امتیاز احمد صبا، مہیش پٹی، سمستی پور

اُردو

ہے وجہِ نازشِ لوح و قلم بے شک زباں اردو
کہ ہے لفظِ محبت کی انوکھی داستاں اردو

ڈھلی ہے کوثر و تسنیم سے شاید زباں اردو
اٹھاتے ہی قلم بس ہوگئی دیکھو رواں اردو

مہ و خورشید و انجم کی ضیاپاشی کا کیا کہنا!
مگر اہلِ سخن کے واسطے ہے کہکشاں اردو

سمجھنا ہو اگر مذہب تو اُردو کا سہارا لو!
بلا تفریقِ ملت ہے اساسِ بیکراں اردو

چلے ہیں کارواں لے کر امیرِ کارواں لیکن!
جو منزل تک پہنچ جائے سلامت کارواں اردو

یہی عالم جو غفلت کا رہا تو دیکھنا اک دن
پکاریں گے کبھی ہم یا حفیظ و الاماں اردو

ہجومِ تیرگی اس کے قریب آ ہی نہیں سکتا
کھڑی ہر بزم میں ہے بن کے شمعِ ضوفشاں اردو

غزل کا حُسن کہیے اور سخن کی آبرو کہیے!
ادب کے خانۂ دل میں رہے جلوہ کناں اردو

زبانوں کا تسلسل تو رہے گا حشر تک لیکن!
کہاں سے لائے گا کوئی مگر حُسنِ بیاں اردو

وہ نظم و نثر کی دنیا ہو یا اصناف ہوں کوئی!
سناتی ہے ہمیں ہر دن ہماری داستاں اردو

تلاطم خیز موجیں خود پتہ دیتی ہیں ساحل کا
عجب پُرکیف ہے یارو یہ بحرِ بیکراں اردو

جو ایوانِ معلی میں کبھی تھی راز سربستہ
یہی ہے وہ زبانِ اردو، یہی ہے وہ زباں اردو

سخنور سب ہمارے ہیں، میں کن کے نام گنواؤں
جناب میر و غالب بھی رہے جب قدرداں اردو

یہ تیرا فیض ہی تو ہے یقیناً شاعرِ مشرق!
کہ قطرہ سے گہر بن کر ہے زیرِ آسماں اردو

لب و رخسار و ابرو، ذہن و دل کو جگمگاتی ہے
غزل کیا ہے بتاتی ہے ہمیں شیریں زباں اردو

ابھرتی ہے غموں کی دھوپ میں اک سائباں بن کر
شبِ ہجراں کی کہتی ہے انوکھی داستاں اردو

جو تہذیب و ثقافت کی بلندی تک نہیں پہنچے
اُنہیں معلوم کیا، اک رازِ ہستی ہے زباں اردو

خود اپنے گھر میں بے گھر ہے اِسے اک المیہ کہیے
سکوتِ شب میں سُن لینا کبھی آہ و فغاں اردو

کٹی زنجیرِ محکومی، گلستاں میں بہار آئی
بُھلائے گا چمن کیوں کر ترا عزمِ جواں اردو

وہ نعرہ ''انقلاب'' اس کا نہیں نعم البدل جس کا
جو قلب و روح گرمادے ہے وہ سوزِ نہاں اردو

صحافت نے بھی بخشی اس کو وہ پروازِ امکانی
نہیں اب بے زباں اردو، نہیں اب بے زباں اردو

ہوئی جاتی ہے روز افزوں ترقی اس کی عالم میں
کہاں ہیں دیکھ لیں آ کر، رقیب و دشمناں اردو

ترقی کے مدارج طے کرے گی حُسن امکاں ہے
دیارِ ہند میں بھی ہیں بہت سے عاشقاں اردو

فراقؔ و مالکؔ و آزادؔ و مُلاؔ کی توجہ سے
نظر آتی ہے ہر چلمن مثلِ کہکشاں اردو

''براتِ عاشقاں برشاخِ آہو'' کا بھی ہے منظر
سنبھل جائیں جو رکھتے ہوں، اگر دردِ نہاں اردو

گلستاں میں یہ رہتی ہے بہار سرمدی بن کر
جو وقت آیا ہے گلشن پر ہوئی ہے پاسباں اردو

اثاثے کتنے چھوڑے اور کتنے چھوڑ جائیں گے
رہے محسن ادب کے، رفتگاں و قائماں اردو

ہمارے حق پرستوں کا بھی کم احساں نہیں تجھ پر
کہ جن کے فیض سے تیرا بھی ہے سکہ رواں اردو

محبت اور اخوت کا سبق دیتی ہے عالم کو
عرب ہو یا عجم سب کے لئے ہے ارمغاں اردو

وفاداری بہ شرط استواری کی ضرورت ہے
یوں کہنے کو تو ہوتے ہیں سبھی رطب اللساں اردو

ہم اردو کے ہیں دیوانے ہمیں چھیڑے نہیں کوئی
ٹھہر جا! اے غم دوراں سنورتی ہے زباں اردو

اسیر زلفِ اردو ہوں، عجب عالم ہے اس دل کا
ٹھہر جاتا ہوں چھاؤں میں نظر آئی جہاں اردو

جناب سرور و مغنی کے جیسے قدر دانوں نے
دلایا ثانوی درجہ ہے سرکاری زباں اردو

برا کیا ہو، اگر کچھ ذکر کردوں راج بھاشا کا
پریشاں حال تھی جس دم یہ سرکاری زباں اردو

ہوئی شیرازہ بندی، آئینہ بندی، حنابندی
غنیمت جانئے اس کو ملا اک باغباں اردو

نشاۃ ثانیہ جس نے کیا پھر راج بھاشا کا
وہ امتیاز کریمی اک رئیسِ نگہباں اردو

قلم اور تازیانے ہوگئے کچھ اس طرح یک جا
ہوا منزل کی جانب گامزن اب کارواں اردو

ہوا وہ بے اثر کھینچا جو خطِ امتیاز اس پر
نظر آنے لگی ہرسو نمایاں اب زباں اردو

سخنور اور قلمکاروں کی جس نے آبرو رکھ لی
سراہا ان کی خدمت کو بنا کر میہماں اردو

سجایا میکدہ کو یوں نہ لوٹے تشنہ لب کوئی
یہ وہ ساقی ہے جس کے دم سے ہے تسکینِ جاں اردو

شعور و آگہی دیکھو! بہ انداز جنوں اس نے
سنائی قمریوں کو پھر وہ بھولی داستاں اردو

یقیناً ''مردِ مومن'' ہے، میں سچ کہتا ہوں ہم نفسو!
نہاں ''سوز سمندر'' ہے عیاں روح و رواں اردو

چلو! اچھا ہوا احساس کا سورج نہیں ڈوبا
جو ہم چاہیں تو ہوسکتی ہے پھر فخر زباں اردو

خبر کردے کوئی جا کر سخن کے نوحہ خوانوں کو
جو فرصت ہو تو پڑھ لیں وہ یہ نظم جاوداں اردو

تقاضے دوستوں کے تھے عزیزوں کی گذارش تھی
مجھے لکھنا پڑا اس دم، قصیدہ برزباں اردو

صبا کی نظم سے ٹوٹا طلسم بے حسی شاید
اٹھے پھر کارواں لے کر امیرِ کارواں اردو

....

تمثیل نو (جولائی ۲۰۱۸ء- جون ۲۰۱۹ء)

ہے مزین عمدہ مشمولات سے
ہر ورق رکھتا ہے ادبی چاشنی
دو ہزار انیس کا ''تمثیل نو''
آیا ہے ہاتھوں میں سب کے، ہے خوشی

انجم عظیم آبادی

اخبار مشرق کولکاتا۔ ۲۳ر جون ۲۰۱۹ء

تمثیل نو (جولائی ۲۰۱۸ء- جون ۲۰۱۹ء)

اس میں گلہائے مضامیں ہیں کھلے
ہے بمثل گلستاں ''تمثیل نو''
مستفیض اس سے نہ کیوں ہوں قارئین
ہے ادب کا ترجماں ''تمثیل نو''

حلیم صابر

اخبار مشرق کولکاتا۔ ۲۶ر ستمبر ۲۰۱۹ء

مصداق اعظمی

سفر

روشنی کے دار پہ چڑھتے ہوئے　　تیرگی پر فاتحہ پڑھتے ہوئے
سچ کے کڑوے زہر کو پیتے ہوئے　　موت کی آغوش میں جیتے ہوئے
نیند جیسی نیند میں ہوتے ہوئے　　بسترِ پُرخار پر سوتے ہوئے
مفلسی پر ناز فرماتے ہوئے　　قصر والوں سے بھی غرّاتے ہوئے
فائدہ نقصان میں پاتے ہوئے　　حرفِ حق باطل کو سمجھاتے ہوئے
ہاتھ قارونوں کے کٹواتے ہوئے　　اجرتِ مزدور دلواتے ہوئے
ظالموں کا چین لٹواتے ہوئے　　خونِ مظلوموں کا گرماتے ہوئے
پنڈت و ملّا کو جھٹلاتے ہوئے　　بھائی کو بھائی سے ملواتے ہوئے
مسجد و مندر کے گن گاتے ہوئے　　اہلِ میخانہ کو اپناتے ہوئے
قافلے سے بھی الگ جاتے ہوئے　　منزلِ مقصود کو پاتے ہوئے
عزم کی تاریخ دہراتے ہوئے　　وقت کا فولاد پگھلاتے ہوئے
پیار کی برسات کرواتے ہوئے　　نفرتوں کی آگ بجھواتے ہوئے
قسمتیں محنت سے چمکاتے ہوئے　　کھیت کی مٹی کو مہکاتے ہوئے
شاعرِ مشرق کو سنواتے ہوئے　　پرچمِ امید لہراتے ہوئے
اک نئی دیوار اُٹھواتے ہوئے　　اکبرِ اعظم کو چنواتے ہوئے
جابر و ظالم کو دہلاتے ہوئے　　اپنے ہی غصے سے گھبراتے ہوئے
بادشاہوں سے بھی اتراتے ہوئے　　نغمۂ منصور کو گاتے ہوئے

تیری دنیا سے چلا جاؤں گا!

....

گیسوئے افکار

نو بہ نو مضمون سے آراستہ
معنویت سے کسے انکار ہے
کیوں معطر ہوں نہ ذہن و دل، امام
''گیسوئے افکار'' اک گلزار ہے

انجم عظیم آبادی

گیسوئے افکار

اُن کا تحقیقی و تنقیدی عمل
جاری و ساری جو صبح و شام ہے
ہے امام اعظم کی یہ تصنیف خوب
''گیسوئے افکار'' کا نام ہے

حلیم صابر

پروفیسر شاکر خلیق، محلّہ: شاہ سوپن، دربھنگہ

شمیمِ خلد

بہ موقع سانحۂ ارتحال جناب شمس الرحمٰن فاروقی بروز جمعہ بتاریخ ۲۵؍دسمبر ۲۰۲۰ء بمقام الہ آباد (یوپی)

ش	شمیم خلد کی خواہش تھی دل میں	ابھی تک قید تھے وہ آب و گِل میں
م	مشامِ جاں میں جنت کی مہک تھی	بہ استقبال حوروں کی لپک تھی
س	سلامت اور مبارک کی صدا تھی	فضا میں بس صدائے مرحبا تھی
ا	اکیلی ذات میں اک انجمن تھے	وہ تنہا اک دبستان سخن تھے
ل	لیاقت ان کی اصنافِ ادب میں	کہ نظم و نثر اور تنقید سب میں
ر	رحیلِ کارواں اب جارہا ہے	جدائی میں ہمیں تڑپا رہا ہے
ح	حیاتِ مستعار اُن کی ہوئی ختم	خدائے پاک اُن پر کیجئے رحم
م	محمدؐ کے طفیل اِن پر رحم کر	عنایت کر نوازش کر کرم کر
ا	ادب کی محفلوں کی جان تھے وہ	ہماری مجلسوں کی شان تھے وہ
ن	نمائندہ رہے اسلاف کے وہ	علم بردار تھے انصاف کے وہ
ف	فنا ہر شے کو ہے گرچہ جہاں میں	رہے گی یاد ان کی داستاں میں
ا	ادائے فرض میں مشغول رہتے	ہر اک شعبے میں وہ مقبول رہتے
ر	رہے گا نام اس دنیا میں قائم	وہاں رحمت کی بارش ان پہ دائم
و	وفات ان کی ہے گویا مرگِ عالم	خیابانِ ادب میں ہوک عالم
ق	قرینے سے یہ دنیا ان کی گذری	وہاں بن جائے ہر اک بات بگڑی
ی	یہی مولا سے شاکر کی دُعا ہے	تو دیکھو اب جوار حق عطا ہے

....

چراغ آگہی

آئے لے کر ''چراغ آگہی'' اب
تازہ تصنیف جو صلاح الدین
خوب تحقیق، خوب تر تنقید
اُن کی کاوش ہے لائق تحسین

حلیم صابرؔ

اخبار مشرق کولکاتا۔ ۱۸؍ستمبر ۲۰۱۹ء

پروفیسر شاکر خلیق، محلّہ: شاہ سوپن، دربھنگہ-4 (موبائل:8544045092)

آہ! عثمان بھائی

(بہ موقع سانحۂ ارتحال پروفیسر عثمان علی خاں خلف بابو اشفاق علی خاں مرحوم، خان صاحب کی ڈیہوری، دربھنگہ بمقام ڈیلس (امریکہ) بروز بدھ بتاریخ 14-8-2019ء بمطابق 12 ذی الحجہ 1440ھ)

بہ قیدِ صنعتِ توشیح

ع — علم کے ساتھ عمل کی بھی ملی تھی دولت
اس طرح اُن کو ملی دونوں جہاں میں عزّت

ث — ثمر اور کئی نسلیں ہوئیں اُن سے لوگو
ان کے شاگردوں میں بہتوں نے ہے پائی شہرت

م — موت برحق ہے مگر ہائے غریب الوطنی
اُن کو امریکہ کی دھرتی میں ملی ہے تربت

ا — اے خدا ان کے عزیزوں کو ملے صبر جمیل
ہم وطن والوں کو حصے میں ملی ہے فرقت

ن — نعمتِ حق کی فراوانی تھی ان کو حاصل
خویش و احباب سے رکھتے تھے ہمیشہ قربت

ع — عجز کے آپ تھے پیکر تو شرافت کی مثال
بے بہا رب کے خزانے سے ملی تھی دولت

ل — لب سے نکلی نہ کبھی دل شکنی کی باتیں
اپنے احباب کی ہر حال میں کرتے مدحت

ی — یا الٰہی تو ہماری یہ دُعائیں سُن لے
ان کو ہر حال میں حاصل ہو جوارِ رحمت

خ — خوبیاں ان کی نمایاں ہیں ہمارے آگے
ہم پہ طاری ہے ابھی ان کے غموں کی شدّت

ا — اب تو بس صبر کی تلقین کریں گے احباب
اب تو بس ان سے جدائی ہے ہماری قسمت

ن — نامِ عثمان علی خاں کا رہے گا قائم
شاکرِ خستہ نے اللہ سے کی ہے منّت

....

پروفیسر شاکر خلیق
،دربھنگہ(موبائل:8544045092)

آہوان

ستیہ اہنسا کے اس دھرتی کے ہیں ہم سب باشی
مل جل کر ہم رہتے آئے کیا متھرا کیا کاشی

صدیوں سے کھِلتے آئے ہیں بھانت بھانت کے پھول
ہرے بھرے کھیتوں میں دیکھو اب اڑتی ہے دھول

ہندو مسلم سکھ عیسائی ہیں بھارت کی شان
اس کو آج بنانا چاہیں وہ مرگھٹ شمشان

آج نئے بھارت کی لے کر آئے ہیں پر-بھاشا
ہندو راشٹر بنانے کی ہے اب ان کی ابھیلاشا

گاندھی بھی گجراتی تھے اور مودی بھی گجراتی
پوت کپوت کے اس جھگڑے سے بھارت ماں شرماتی

شبد بان لے کر نکلی ہے مودی جی کی سینا
جنتا کے دکھ درد سے اُن کو کیا لینا، کیا دینا

دانشور اور بدّھ جیوی کے دھرم پہ اب ہے داؤ
اِن کے ہی ہاتھوں اب ہوگا سَرو دھرم سد بھاؤ

نفرت کی دیواروں کو اب نوکِ قلم سے ڈھاؤ
تب ویترنی پار کرے گی بھارت ماں کی ناؤ

شاکر جی کے نازک دل پر ایسا لگا ہے گھاؤ
مل جل کر ہم ساتھ رہیں گے ایسی قسمیں کھاؤ

☆☆☆

سلطان احمد ساحل

خراج عقیدت

(پروفیسر سید منظر امام کی رحلت پر)

وہ ایک شخص
جو سب کے لیے سمندر تھا
خلوص و پیار کا
انسانیت کا پیکر تھا
آج پوری ادبی دنیا
سوگوار ہے
کوئی جلسہ ہو/کوئی سیمینار ہو
اور آپ مائک پر ہوں
ادباء، شعراء و سامعین
آپ کو سن رہے ہوں
جھوم رہے ہوں
حسرت بھری نگاہوں سے
دیکھ رہے ہوں
نفیس، شائستہ
نرم گفتار و خوش کردار
اُردو مزاج کی
مجسم تصویر و تعبیر
ایک نئی دانش گاہ
آہ!......
کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے
جب انسان کو/خالی پن سا
محسوس ہوتا ہے
ماضی کی رعنائیاں
خواب کہانیاں
سخن جولانیاں!!!

سلطان اختر (پٹنہ،موبائل:9097450586)

رباعیاں

(سیّد احمد شمیم کے شعری مجموعہ ''کاسۂ شب'' کے تناظر میں)

اربابِ سخن اہلِ نظر پڑھتے رہو
ہو جاؤ گے سیرابِ ہنر پڑھتے رہو
اسلوب میں حیرت ہے خیالوں میں کشش
تم ''کاسۂ شب'' شام و سحر پڑھتے رہو

......

دامانِ دبستانِ ادب میں ڈھونڈو
یا تازگیِ عارض و لب میں ڈھونڈو
نظموں کی بلندی ہو کہ غزلوں کا وقار
جو ڈھونڈنا ہو ''کاسۂ شب'' میں ڈھونڈو

......

گزرے گی بہت چین سے شب پڑھتے رہو
جب تک نہ ہو ترسیلِ ادب پڑھتے رہو
لبریز ہے افکارِ سخن سے اختر
پڑھنے کی طرح ''کاسۂ شب'' پڑھتے رہو

....

سلطان احمد ساحل، جمشید پور

مرہم

موسم اور وقت
کسی کے دُکھوں کی
پرواہ نہیں کرتا
موسم اور وقت کی
بے نیازی
انسان کا
سب سے بڑا
دُکھ ہے،
اور وقت کی طوالت
زخموں کا مرہم ہے!!!

ڈاکٹر رضوانہ ارم، جمشید پور

نظم

میں ایک خوبصورت جزیرہ ہوں
جس کے اطراف و جوانب میں
پانی ہی پانی ہے
سرسبز گل بوٹے ہیں
ہر منظر دھانی ہے
لیکن دل ناداں کی
کچھ اور کہانی ہے
ہے دل میں کسک کوئی
اور آنکھ میں پانی ہے!

....

نقشبند قمر نقوی بخاری (ٹلسا، امریکہ)

رباعیاں

چوبیس جو اوزان رباعی کے ہیں
مسحور سبھی ان کی رعنائی کے ہیں
کیوں کوئی نکلتا نہیں ان سے باہر
کچھ اور بھی انداز زیبائی کے ہیں

....

کھلتے ہیں ابھی پھول بھی بجتا ہے رباب
محفل میں ابھی تک ہے درخشاں مہتاب
کچھ روز ابھی اور ہے خوشبوئے بہار
بننے کو ہیں اب دورِ خزاں کے اسباب

....

اخلاق گراں قدر ہے قیمت سمجھو
تھوڑے سے تعلق کو بھی نعمت سمجھو
اس دور میں بیگانہ وشی رائج ہے
ہوجائے محبت تو غنیمت سمجھو

منیر سیفی (موبائل:9835268274)

قطعات تاریخ وفیات

(۱)

کہاں تقدیر لے آئی کہاں سے
زمیں پر آگئے تھے آسماں سے
وہ کلکاری نہیں تھی سسکیاں تھیں
جو گونجی تھیں بچھڑتے وقت ماں سے
کیا اللہ نے دو سال جو کم
''ضمیرِ کاظمی'' گزرے جہاں سے

2021 - 2 = 2019

(۲)

شام و سحر سے وہ رنگ سیندوری رفت
بزم سخن سے شعروں کی کستوری رخت
''مہ'' نکلا تو تاروں نے تاریخ لکھی

45

''آہ حفیظ اللہ نیولپوری رفت''

2064 - 45 = 2019

محمد امین عامر، ہوڑہ

آہ ! علقمہ شبلی

حیف! استادِ علقمہ شبلی — ہم سبھوں سے ہوئے جدا شبلی
ان کے جیسا کہاں سے اب لائیں — دہر میں تھے مسلّمہ شبلی
نازشِ فکر و فن انہیں کہیے — رشک آور سخن سرا شبلی
نغمگی تھی فضاؤں میں جن سے — کون اب نغمہ گائے گا شبلی
بلبلانِ چمن کو ہے تسلیم — خوش منقار و خوش نوا شبلی
بزمِ ایران[1] سے تھے وابستہ — بزمِ ایراں کے ملک الشعراء شبلی
کون آراستہ کرے اب بزم — تھے سدا بزم آراء شبلی
رونقِ انجمن بہارِ چمن — اب کہاں کوئی ماسوا شبلی
غنچہ و گل کی اُڑگئی خوشبو — گلستاں ہی اُجڑ گیا شبلی
نیکوکاری میں زندگی گذری — وقف للہ تھے سدا شبلی
تیری تربت پہ نور کی بارش — ہو شب و روز ہے دعا شبلی

حیف ! عامر کہ چل دیئے خاموش
بزم سے اُٹھ کے علقمہ شبلی

[1] فارسی زبان وادب کا معروف ادارہ ایران سوسائٹی، کلکتہ

ڈاکٹر امام اعظم

پھول سے اب شعلہ بن جائیں

اوہامی خطوں میں بٹ کر
مکر وریا کے تانے بانے
بُننے کا آغاز غلط ہے
سناٹوں سے اُٹھنے والا
جھوٹ کا ہر انداز غلط ہے
لفظِ سیاست کے ہتھکنڈے
شیطانی ہلچل کے قصے
زہریلی پُھنکار کے شعلے
جب جب دھرتی پر پھیلیں گے
جتنے بھی طوفان چھپے ہیں
امن واماں کی تہہ کے اندر
قربانی کے زورِ عمل کا
آنچل سے پرچم بننے کا
شبنم سے پتھر بننے کا
ایک نئی تاریخ سجے گی
کرب والم کے اِس کھنڈر میں
روشن روشن پیارے لمحے
شاہینی پرواز کی صورت
پَر پھیلائے
جمہوری طاقت کی صدائیں
نعرے بن کر جاگ اٹھیں گی
دھرم، سیاست، پریم، اہنسا
اُجلے اُجلے تن والوں کے

کچھ معذور آداب ہیں شاید
اپنی بسمل ذات کی خاطر
کچھ بوجھل اسباب ہیں شاید
یہ ہے تخت وتاج کا نشہ
تیری جھوٹی شان کا نشہ
جھوٹے سپنے بانٹنے والو!
سن لو یہ تاریخی باتیں
شام کو دھرتی کجلاتی ہے
کونہ کونہ چھپ جاتی ہے
اُس دن بے کل پاگل دھرتی
آنکھیں کھول کے جب پوچھے گی
اُلٹی گنتی گنتے گنتے تھک جاؤ گے
موسم کا ہر ایک اشارہ
ایسا جادو پھیلا دے گا
قریہ قریہ گلی گلی سے
ایک مسرّت جاگ اُٹھے گی
ملک کی عظمت
ملک کی فطرت باقی رکھ کر
ہم سب مل کر
قدم قدم یکجا ہو جائیں
حق کی اب آواز اٹھائیں
پھول سے اب شعلہ بن جائیں!

....

موبائل: 9431085816 / 8902496545 ای میل: imamazam96@gmail.com

غزلیں

شاداں فاروقی (مرحوم)، دربھنگہ

قائل نہیں ہے جو کسی ردّ و قبول کا
وہ شخص لگ رہا ہے مجھے کچھ اصول کا

ویرانیوں میں جائے اماں بھی کہیں نہیں
صحرا میں کام آتا تھا سایہ ببول کا

سورج کی یہ تمازتِ کبریٰ بھی کیا کرے
قدرت نے شامیانہ تنا ہے جو دھول کا

کیا بات کہہ کے کان میں بادِ صبا گئی
چہرہ اُتر گیا ہے بہاروں میں پھول کا

محشر کی تیز دھوپ بھی اُس کا نہ کچھ کرے
شاداں کے ہاتھ آئے جو دامن رسول کا

نقشبند قمر نقوی بخاری (ٹلسا، امریکہ)

موضوعِ سخن مجمعِ افکار سے نکلا
شب زلف سے اور روز روئے یار سے نکلا

طوفان کو تو میں نے سراسیمہ کیا ہے
ڈوبا ہوں جو اِس پار تو اُس پار سے نکلا

سمجھا تھا کہ احباب نے حلقے میں لیا ہے
حیرت ہے کہ میں نرغۂ اغیار سے نکلا

ہر رسمِ مضامین چلی میرے قلم سے
دریائے معانی مرے اشعار سے نکلا

پھولوں سے امیدیں کئی وابستہ تھیں لیکن
جو خار لگا پاؤں میں وہ خار سے نکلا

وہ روزِ قیامت جو مقرر ہے وہ ہوگا
جس روز میں اس محفلِ دلدار سے نکلا

وعدہ جو کیا جائے وہ پورا نہیں ہوتا
ایسا ہی رواج آپ کی سرکار سے نکلا

احسان ثاقب، آسنسول

بے پائے کا خواب ہے میرا نہ کوئی دیوار نہ در
دیکھ رہا ہوں ریت کے اوپر ہوا سے بنتا اپنا گھر
خود سے بچ کر بھاگ رہا ہوں پیڑ نہ سایہ دُور تلک
سر کے اوپر تنی ہوئی ہے دھوپ کی اک لمبی چادر
اک ایسی تاریخ لکھو اب جس کا کوئی اُور نہ چھور
ڈال دو اس گونگی دھرتی کو لفظوں کے دوراہے پر
پوچھئے مت کیوں تھم جاتے ہیں راہِ ہوس میں اس کے پاؤں
اندیشوں میں اُلجھ گیا ہے شاید اک بے باک سفر
بے زنجیر رہیں گے کب تک آگ اگلتے یہ لمحے
پل پل پھیل رہا ہے ہر سو ان دیکھا احساس کا ڈر
سنگ آلودہ سناٹوں میں گونجے گی کب تک یہ چیخ
بھل بھل بہتے خون میں لت پت نیم عریاں ہے ہر منظر
روز اترتا ہے اک کھوجی دریا کی گہرائی میں
لیکن ہاتھ نہ آیا ثاقب کوئی بھی نایاب گہر

ابواللیث جاوید، جامعہ نگر، نئی دہلی

شباب دیکھا نہ رنگ شباب دیکھا ہے
کہ ہم نے زندگی تیرا عذاب دیکھا ہے
میں اپنی پیاس کو لے کر کہاں کہاں بھٹکا
کنارے دریا بھی لیکن سراب دیکھا ہے
عجب نہیں کہ کوئی حادثہ سر سے گذرے
چمکتی صبح میں میں نے شہاب دیکھا ہے
ہماری آنکھوں کی نیندیں ہیں اُڑ گئیں جب سے
سڑک پہ آگ میں جلتا گلاب دیکھا ہے
تمہاری آنکھوں میں اب نیند کیوں نہیں آتی
تمہاری آنکھوں نے یہ کیسا خواب دیکھا ہے
شعور و فکر کی دولت جسے میسر ہے
اُسے بلندی پہ میں نے جناب دیکھا ہے
بغیر عزم سفر منزلیں کہاں جاوید
بطخ کے پاؤں کو کیا زیرِ آب دیکھا ہے

....

کے انیس اظہر (بڑی پیٹ، وانمباڑی، تمل ناڈو)

بخت خفتہ کو جگائیں کیسے — زندگی اپنی بنائیں کیسے
کھو چکے جو اسے پائیں کیسے — ہم گئے وقت کو لائیں کیسے
بے رخی ان کی کھٹکتی ہے بہت — ان کو یہ بات بتائیں کیسے
بے وفا یاروں نے یہ بتلایا — رخ بدلتی ہیں ہوائیں کیسے
جو بچھڑ جائے ہم اس راہی کو — راہ میں چھوڑ کے آئیں کیسے
جس سے وابستہ ہے بچپن اپنا — دل سے وہ نقش مٹائیں کیسے

آج کے دور میں ہم اے اظہر
خود کو فتنوں سے بچائیں کیسے

....

حلیم صابر (۲/ چمروسنگھ لین، کولکاتا-۱۱)

نیک عمل اجلا ہوتا ہے
اس کا بدل اجلا ہوتا ہے
کالی رات میں اور زیادہ
تاج محل اجلا ہوتا ہے
اُس کو برسنا ہی نہیں آتا
جو بادل اجلا ہوتا ہے
جس کا دل اجلا نہیں ہوتا
اُس کا محل اجلا ہوتا ہے
اجلے کب ہوتے ہیں مسائل
ان کا حل اجلا ہوتا ہے
کھلتا ہے کیچڑ میں رہ کر
پھر بھی کنول اجلا ہوتا ہے
حسن ہے کیا صرف اجلے پن میں؟
کیا کاجل اجلا ہوتا ہے؟
فکر کی آگ میں تپ کر صابر
روئے غزل اجلا ہوتا ہے

محمد نوشاد نورنگ، اندور

کانٹوں کو ہم قبا میں سجاکر ہیں آگئے
ہم زہر کو لبوں میں دباکر ہیں آگئے
دنیا نے جو ڈرایا ہمیں خوفِ مرگ سے
شانے پہ ہم صلیب اٹھاکر ہیں آگئے
اس سے غرض نہیں کہ ملامت ملی ہمیں
محفل کو اپنے دل کی سناکر ہیں آگئے
انصاف جب ہمارا قیامت میں نہ ہوا
ہم عرش کا ستون ہلاکر ہیں آگئے
گرتا ہے کون دیکھئے اپنی نگاہ میں
آئینہ سب کے ہاتھ تھماکر ہیں آگئے
تزئین صحرا میں نہ ہو کوتاہی اس لئے
ہم اپنے گھر کو آگ لگاکر ہیں آگئے
شعلے نکل رہے ہیں ہراک بات میں مرے
دوزخ کی آگ دل میں جلاکر ہیں آگئے
پھولوں کے اُبٹنوں سے بنی بات جب نہیں
نورنگ وہ خونِ دل میں نہاکر ہیں آگئے

....

سیّد انظار البشر (بارکپور، شمالی ۲۴/ پرگنہ)

گرم ہے جھوٹ کا بازار خدا خیر کرے
جس پہ قائم ہے یہ سرکار خدا خیر کرے
وقت بدلا تو ذرا یہ بھی تماشا دیکھو
کل کا محتاج ہے مختار خدا خیر کرے
گھر پہ اللہ کے فرقہ پرستوں کی نظر
کیا غضب کا ہے یہ کردار خدا خیر کرے
وہ چراغوں سے تو بستی بھی جلا سکتے ہیں
سر پہ آنے کو ہے تہوار خدا خیر کرے
خوش ہیں رافیل پہ گوبر کے لگانے والے
کتنے قابل ہیں یہ فنکار خدا خیر کرے
اے بشر وقت کو آئینہ دکھایا تم نے
قابلِ فخر ہیں اشعار خدا خیر کرے

....

معراج احمد معراج (کلٹی، مغربی بنگال)

بادہ و مے کی بات ، جام کی بات
شیخ نے کی ہے آج کام کی بات
صبح ہوتے ہی نشہ ختم ہوا
یاد پھر آگئی وہ شام کی بات
میکشوں کے دلوں میں بغض نہیں
وہ تو کرتے ہیں فیضِ عام کی بات
کس قدر لطف اب بھی دیتی ہے
میکدے کی وہ صبح و شام کی بات
میکشو میکدے کی بات کرو
چھیڑو دیوار و در کی ، بام کی بات
ساقیا مجھ کو اچھی لگتی ہے
تیرے جلوؤں کی، تیرے نام کی بات
اپنی آنکھوں سے مے پلا ساقی
آج تو مان لے غلام کی بات
آج ساقی نے کس لیے معراج
چھیڑ دی میرے ننگ و نام کی بات

بدر محمدی، ویشالی

ہوگئی کیا گونگی بہری زندگی
موت کے کھمبے پہ ٹھہری زندگی
کیوں یقیں ہوتا نہیں اس بات پر
آنے والی ہے سنہری زندگی
خود سے میں لپٹا ہوں چادر کی طرح
کیسی ہے یہ سرد مہری زندگی
یوں کھڑے ہیں لوگ اس کے رو برو
جیسے ہو کوئی کچہری زندگی
جا بسا سارا محلہ شہر میں
آگئی گاؤں میں شہری زندگی
بے حس و حرکت ہمالہ ہے تو ہے
جی رہی ہے اک گلہری زندگی
تیرتے ہی کو ڈبو دیتی ہے یہ
ایسی اک ندی ہے گہری زندگی

۳۱ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو ڈاکٹر مختار احمد فردین اپنی کتاب "سماجی امید" ڈاکٹر امام اعظم کو پیش کرتے ہوئے۔
ساتھ میں موجود ہیں اشرف احمد جعفری اور ہمدم نعمانی

انجینئر ہارون شامی (گومتی نگر، لکھنؤ)

موسمِ گل سے نہیں خار سے ڈر لگتا ہے
ان دنوں جرأتِ اظہار سے ڈر لگتا ہے

پہلے آتا تھا مجھے خوبیِ کردار پہ رشک
اب مجھے لغزشِ کردار سے ڈر لگتا ہے

پہلے تنہائی کے احساس سے ڈر لگتا تھا
اب مجھے مجمعِ انصار سے ڈر لگتا ہے

اپنے مضبوط ارادوں پہ یقیں ہے لیکن
وقت کی شدتِ رفتار سے ڈر لگتا ہے

ہر نیا دور نئی سوچ کے ساتھ آتا ہے
ہر بدلتے ہوئے ادوار سے ڈر لگتا ہے

مجھ کو ڈر لگتا ہے اپنوں کی ریاکاری سے
اور انہیں خوبیِ کردار سے ڈر لگتا ہے

جانے کب ختم ہو یہ دولت و دینار کی جنگ
عظمتِ دولت و دینار سے ڈر لگتا ہے

پہلے دیوار کے گرجانے کا ڈر ہوتا تھا
اب مجھے سایۂ دیوار سے ڈر لگتا ہے

جانے کیا ہوگا ترے بعد غزل کا شامی
بے وزن شعروں کے انبار سے ڈر لگتا ہے

رئیس اعظم حیدری (کولکاتا)

فکرِ فردا کیوں کرے سود وزیاں ہے زندگی
غم خوشی کا ہے مرکب راگ جاں ہے زندگی

فکرِ غم بوڑھا بنا دیتی ہے انساں کو ہی جلد
فکر سے خالی اگر ہے تو جواں ہے زندگی

شرط لازم ہے خدا کی ذات پر دل میں ترے
ہے یقیں جب کچھ نہیں سنگِ گراں ہے زندگی

بعد اس کے ہی تو جنت پھر ملے گی دیکھنا
مومنوں کی ہر قدم پر امتحاں ہے زندگی

بن کے قطرہ کیوں رہے تو پھیل جا حدِ نگاہ
آدمی کی مثل بحرِ بے کراں ہے زندگی

تو حصارِ خواہشوں سے اب نکل اے زندگی
تیری ڈوبی خواہشوں میں جو نہاں ہے زندگی

حکمِ ربی سے وجود اپنا یہ قائم اے رئیس
یہ عقیدہ ہے ہمارا کن فکاں ہے زندگی

۱۹؍جون ۲۰۱۸ء کو پروفیسر مظفر حنفی (مرحوم) کے ساتھ ان کی رہائش گاہ میں ڈاکٹر امام اعظم اور سیّد خرم شہاب الدین

اشرف گل (کیلیفورنیا، امریکہ)

پردے میں دوستی کے، جو دشمنی کریں گے
کیا خاک پیش اُن کو ہم زندگی کریں گے؟
وہ ہم کو بھول جانے سے، پیشتر بتائیں
ہم اپنی چاہتوں میں، کیسے کمی کریں گے؟
اُن کو وفا ہماری، جکڑے گی دیکھ لینا
کب تک ستم تمہارے، آوارگی کریں گے؟
کچھ کارِ شیطنت جو شیطان کر نہ پایا
وہ کام بھی بالآخر اِنسان ہی کریں گے
تنہائیوں کو ہم نے، اپنا لیا ہے کیوں کہ
ملنے پہ ان کہی کچھ ہم بات بھی کریں گے
اِس دِل پہ زخم میں نے، یوں ہی نہیں سجائے
دِل میں کبھی تو میرے یہ روشنی کریں گے
کچھ دیر عقل کو بھی دیتے رہے ہیں چھٹی
کچھ کام ہم نے سوچا، بے کار بھی کریں گے
ارمان اب تو دِل میں، چاؤ سے پالتے ہو
پھر کیا کرو گے اِن کا، جب سرکشی کریں گے؟
قتلِ وفا کا شیوہ اشرف انُھیں مبارک
ہم تو خلوص نیت سے، عاشقی کریں گے

ڈاکٹر رضوانہ ارم، جمشید پور

سلیقے سے برتنا چاہتی ہوں
تجھے اے زیست چکھنا چاہتی ہوں

بہت محتاط تھی راہِ وفا میں
مگر میں اب بہکنا چاہتی ہوں

میں شاخ گلِ مہر بھی بننا چاہوں
چنبیلی ہوں، بہکنا چاہتی ہوں

خوشی کی شاخ پر کھِلنا میں چاہوں
میں طائر ہوں ، چہکنا چاہتی ہوں

میں ابر باد بہاری کا ہوں جھونکا
میں سبزہ ہوں لہکنا چاہتی ہوں

۷ار مارچ ۲۰۱۷ء کو قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس میں ڈاکٹر امام اعظم، صبیح بخاری (مرحوم) اور احمد اشفاق (قطر)

پروفیسر ڈاکٹر رام داس (رانچی)

خون ہوگا گیتوں کا، سنسار میں
جو لکھے جائیں گے بس پرچار میں

دیکھو، انسانوں کی لاشیں، دوستو!
کیا بچا ہے اب بھلا، سنسار میں؟

ظلم کے کارن جو ٹوٹے ہیں قلم
زور اُن کا آگیا تلوار میں

پھر چمک اُٹھا سخن کا آفتاب
پھر ملیں چنگاریاں اشعار میں

ہر گھڑی تیغوں کی بارش ہے، جناب!
ہر جگہ ہے کربلا، سنسار میں

جیتے جی دنیا میں لاشیں ہیں عوام
لیڈرو، اب کیا بچا سنسار میں؟

رہتی ہے یہ گھر کے اندر ہی مگر
پھر بھی لگتا ہے کہ ہے بازار میں

آج کی خاتون ہے فیشن زدہ
لگتا ہے کہ بیٹھی ہے بازار میں

دوستو، اب خزاں کی رُت آگئی
پتّے بھی تو اب نہیں اشجار میں

پھر چمکتا ہے سخن کا آفتاب
اب بھی ہیں چنگاریاں افکار میں

شمس کے جیسے چمکتے ہیں یہ رامؔ
رکھتے ہیں چنگاریاں اشعار میں

ڈاکٹر جاوید اشرف فیض (اکبر آباد، آگرہ/ راورکیلا، اوڈیشہ)

(اچاریہ رام داس کی نذر)

جب نظر آئی انبساط کی بوند
پی گئی اُس کو انضباط کی بوند

مفلسی کا نہیں ہے کوئی نشان
اس کے چہرے پر ہے نشاط کی بوند

جادۂ شوق میں وہ کام آئی
تھی جو فطرت میں احتیاط کی بوند

یہ مرے حوصلے کے بخت میں تھی
مل گئی غم میں انبساط کی بوند

کیوں زمینِ جنوں نہ پی جاتی؟!
ٹپکی تھی عقل کی بساط کی بوند

رامؔ جانے ہے کیوں ہے تشنہ لبی؟!
لے اُڑا وقت کیوں نشاط کی بوند؟!

میری ساری ترقیاں اے رامؔ!
پی گئی آج انحطاط کی بوند

رامؔ سمجھے گا کود کو گنگا سا
پائے جو ایک احتیاط کی بوند

سوچ (فکر) کی بڑھ گئی ہے تشنہ لبی
لے اڑا وقت کیا نشاط کی بوند؟

فیضؔ سمجھے گا اُس کو دریا، جناب!
پائے جو ایک ارتباط کی بوند

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
Maulana Azad National Urdu University

مرکزی یونیورسٹی جسے نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیشن کونسل سے "اے گریڈ" حاصل ہے

EPABX : 23008402-04, http://manuu.edu.in/dde

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Admission Notification-July Session 2020-21 2020-21 داخلہ اعلامیہ-جولائی

جولائی 21-2020 سیشن میں مندرجہ ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے پروگراموں میں داخلے کے لیے آن لائن درخواستیں مطلوب ہیں:

پروگرام کا نام	میعاد	مسلمہ حیثیت
ایم اے (اردو) ایم اے (انگریزی) ایم اے (تاریخ) ایم اے (ہندی) ایم اے (اسلامک اسٹڈیز)	دو سالہ	یو جی سی-ڈی ای بی، نئی دہلی کے ذریعے منظور شدہ بحوالہ مکتوب F.8-2/2018 (DEB-III) مورخہ 16/اگست 2018 اور
ایم اے (عربی)	چار سمسٹر	F.8-2/2018 (DEB-III) مورخہ 25/جنوری 2019
بی اے بی کام بی ایس سی (لائف سائنسز)-بی زیڈ سی بی ایس سی (فزیکل سائنسز)-ایم پی سی	چھ سمسٹر	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا گزٹ نوٹیفکیشن نمبر 354 مورخہ 4/ستمبر 2020ء (یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ پروگرامس اور آن لائن پروگرامس) ضابطہ 2020) اور
ڈپلوما ان بیچ انگلش ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن	دو سمسٹر	ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو پبلک نوٹس نمبر F.No.1-15/2020(DEB-I)
سرٹیفکیٹ کورس-اہلیت اردو بذریعہ انگریزی	چھ ماہی	مورخہ: 12/10/2020
سرٹیفکیٹ کورس-فنکشنل انگلش برائے اردو داں		

امیدواروں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ آن لائن فارم داخل کرنے سے قبل لازمی طور پر فاصلاتی تعلیم کا پراسپکٹس پڑھ لیں۔

ای پراسپکٹس اور آن لائن درخواست فارم نظامت فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ manuu.edu.in/dde پر دستیاب ہیں۔ تمام پروگرامس کے لیے درخواست فارم 300 روپے رجسٹریشن فیس کے ساتھ آن لائن داخل کرنی ہوگی۔

امیدوار مزید تفصیلات کے لیے طلبہ رہبری یونٹ ہیلپ لائن 23008463-040 اور 23120600-040 (ایکسٹنشن 2207) اور ٹال فری نمبر 1800 425 2958 پر رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ حیدرآباد، نئی دہلی، کولکتہ، بنگلور، ممبئی، پٹنہ، دربھنگہ، بھوپال، رانچی، امراوتی، سری نگر، جموں، نوح (میوات) اور لکھنؤ میں واقع یونیورسٹی کے ریجنل/سب ریجنل سنٹرس سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

آن لائن درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 22/دسمبر 2020 مقرر ہے۔

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم 29-10-2020 رجسٹرار

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجنا لازمی ہے۔)

نام کتاب: زرد پتوں پہ داستاں شاعر: ابواللیث جاوید ص: 152 قیمت: 150 روپئے

رابطہ: ایچ-17، علی اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور، جامعہ نگر، نئی دہلی-25 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ابواللیث جاوید بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے ''کانچ کا درخت''، ''کنارے کٹ رہے ہیں''، جاگتی آنکھوں کا خواب'' اور ''اب صبح نہیں ہوگی'' شائع ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے آج تک وقتاً فوقتاً شاعری بھی کی ہے۔ اپنی شاعری اور اردو سے بے توجہی کے بارے میں ''عرض کیا ہے'' کے تحت تلخ لہجے میں کہتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں:

''میں شاعر ہونے کا قطعی دعویٰ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ شعر گوئی کی باریکیوں سے میں بالکل واقف نہیں ہوں۔ جو کچھ میں نے اب تک کیا ہے وہ محض اپنے مشاہدے، تجربے اور محسوسات کی بنیاد پر الفاظ کو ترتیب دینے کا کام کیا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں کچھ اچھا ہو گیا ہے تو اس میں محض اتفاق ہی تصور کروں گا۔ تقسیم وطن کے بعد اردو زبان کے ساتھ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اس سے سب واقف ہیں۔ سرکاری سطح پر اس زبان کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی یہ مستحق ہے، حالانکہ ریاستی اردو اکادمیوں کی تشکیل عمل میں آئی جس کا واحد مقصد اس زبان کی ترویج و اشاعت تھا مگر بدقسمتی یہ رہی کہ اس کے ذمہ داران اردو کے تئیں مخلص نہیں رہے اور اسے بھی عام سرکاری محکمہ کی طرح اپنی مفاد پرستی کی نذر کر دیا۔''

کتاب ''زرد پتوں پہ داستاں'' میں غزلیں اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ ابواللیث جاوید کی غزلوں کا لہجہ نیا ہے۔ واقعاتی شہادتوں کے ساتھ مجرد دلائل کو وہ پیش کرتے ہیں۔ یہ غزلیں زندگی کے فلسفہ کی تشریح و توضیح ہیں اور کائنات کے میکانکی تصور کے برخلاف ارادی، روحانی اور شخصی نظریات کی حامل ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ زندگی مسلسل تغیر کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تبدیلی و حرکت کا نام ہے۔ ابواللیث جاوید وجدان سے کام لیتے ہیں کیونکہ حقیقت و واقعیت تک پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی متحرک کی جامد تصویریں ملتی ہیں۔ یعنی ان میں زمانہ، وقت اور حرکت پیہم کو دیکھا جا سکتا ہے۔ محسوسات، تاثرات اور تصویر کشی کو ان کی غزلوں میں خصوصیت سے اہمیت حاصل ہے:

شام کی جاگی کرن گر صبح کو سو جائے گی — بیج میرے جسم میں پاگل ہوا ہو جائے گی

آنکھوں کی پتلیوں میں لہو دوڑنے کو ہے — پلکوں پہ واقعات کی گرمی سجایئے

ہے یہ تسلیم ہم ہیں نظم جدید — میرے پر کھے غزل رہے ہیں لوگ

مایوسی، نامرادی، گھٹن، کوفت، انتظار — یہ آج کے انسان کی تقدیر ہے، کیا ہے

نئے لب و لہجے میں ابواللیث جاوید نے عہد کی عقل پرستی اور زندگی کے مادی تعبیرات پر ضرب لگائی ہے جو

مروجہ فکری راہوں سے قریب اور برعکس بھی ہے۔یہی ان کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔ جہاں تک نظموں کی بات ہے وہ ایسے سائنسی حقائق پیش کرتے ہیں جن کی تصدیق کی جاسکے۔ان کی فکر عقل ووجدان، شعور ولاشعور، زمان و مکان اور ماضی وحال کے حوالے سے گہرا اثر مرتب کرتی ہے۔ ''بچپن''، ''نوجوانی''، ''جوانی'' اور ''بڑھاپا'' ساتھ ہی ''دنیا''، ''زندگی''، ''موت'' اور ''رند آدمی'' جیسی نظمیں اس کی مثال ہیں۔ابو اللیث جاوید نے سرمدی سچائی کو نقطۂ تصور بنایا ہے جس میں وہ کامیاب ہیں۔

....

نام کتاب: اردو افسانے کا سفر: دیہات سے شہر تک مصنفہ: ڈاکٹر بلقیس بیگم ص: 647 قیمت: 600 روپے

رابطہ: 6/1، گوراچاند لین، پوسٹ: انٹالی، کولکاتا-14 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر بلقیس بیگم ذی فہم تنقید نگار ہیں۔خاتون تنقید نگاروں میں اکثریتی اکائی رکھتی ہیں۔اکیسویں صدی میں ان کی تنقید چشم کشا، منور اور متوازن زاویۂ نگاہ رکھتی ہے۔جدید تناظر، اساسی تہذیب وثقافت اور ہمہ جہت تراشیدہ معنی خیزی ان کی شناخت ہے۔قبل وہ ''اردو تنقید سب کے لئے'' جیسی افادیت شناس کتاب اردو کو دے چکی ہیں۔ ڈاکٹر بلقیس بیگم کی تنقیدی کتاب ''اردو افسانے کا سفر، دیہات سے شہر تک: ایک تجزیاتی مطالعہ'' میں ابتدا سے ۱۹۸۰ء تک کے موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔یہ ضخیم کتاب چھ حصے میں منقسم ہے: ''پریم چند کا عہد اور اردو افسانہ'' دیہات اور شہر کی عکاسی ترقی پسند افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں ''جدید اردو افسانے میں دیہات اور شہر کا تصور'' ''اردو افسانے کا سفر دیہات سے شہر تک'' اور ''ماحصل'' کے تحت الگ الگ نقوش قائم کئے گئے ہیں۔اردو افسانے کا طویل سفر دراصل تہذیب کا سفر ہے، اعلیٰ تخلیقی اظہار کے عمل کا سفر ہے اور سماجی دریافت کی فکری سطح کا چیلنج بھرا سفر ہے جس میں علاقائی، قومی، ملکی اور عالمی تناظر کی موجودگی شامل ہے۔اس شناخت کو ڈاکٹر بلقیس بیگم نے جنوبی ہند کی سرزمین، شمالی ہند کی سرزمین اور مشرقی ہند کی زمین میں تلاشنے کی کوشش کی ہے جس میں مثنوی، داستان، ناول، مختصر افسانہ جیسی اصناف شامل ہیں لیکن اس سے بحث کرنے سے قبل بلقیس بیگم نے سامری تہذیب کے منظوم قصے، مصر کی تہذیب کے منظوم قصے، چین کی تہذیب کے منظوم قصے، یونان کی تہذیب کے منظوم قصے، برصغیر کی تہذیب کے منظوم قصے اور ویدک ادب کے نقوش کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ویدک ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اپنشد، جاتک اور پنچ تنتر کی ترجمانی کو بھی نشان زد کیا ہے۔

پریم چند کے عہد میں ادبی، سماجی، سیاسی، معاشی اور اقتصادی اعتبار کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بلقیس بیگم نے اردو افسانے کی پیش رفت کو واضح کیا ہے جس کی آبیاری انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہو رہی ہے۔جب ہندوستان میں سماجی برائیاں شباب پر تھیں، ستی کی رسم تھی، بچپن کی شادی کا رواج تھا، چھوت چھات اور توہم پرستی کی لعنت تھی اور زمینداروں کی طرف سے تباہی و بربادی تھی اور غلامی کی زنجیر تو تھی ہی۔ایسے میں پریم چند اردو افسانے میں قلم کا سپاہی بن کر سامنے آئے جن کے ساتھ ساتھ راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، پنڈت بدری ناتھ سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی وغیرہ نے دیہات اور شہر کی نمائندگی کی، زندگی کی عکاسی کی

اور ماحول کے مطابق افسانے لکھے۔

اس کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں کا دور آتا ہے جس میں عہد کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ڈاکٹر بلقیس بیگم نے شہر اور دیہات کی تعریف کے ساتھ ادبی پس منظر کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور دیوندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر اور بلونت سنگھ کے ایسے افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔اسی طرح جدیدیت سے متاثر افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، کلام حیدری، احمد یوسف، انور سجاد، بلراج مین را، سلام بن رزاق، شفق اور حسین الحق کے افسانوں میں دونوں پہلو کی معنویت و اہمیت کو بلقیس بیگم نے اپنی تنقید سے انفرادیت بخشی ہے۔انہوں نے جتنے ناولوں کا انتخاب کیا ہے ان کی گونا گوں خصوصیت کا بھرپور عکس پیش کیا ہے۔اردو افسانے میں دیہات اور شہر کی حقیقت نگاری پر یہ کتاب بے حد اہم ہے۔

....

نام کتاب: عرفانِ طرزی مصنف:ڈاکٹر محمد رضوان ص:224 قیمت:145 روپے

رابطہ:زکریا کالونی،سعد پورہ، رمنہ، مظفر پور-842002 (بہار) مبصر:پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو میں منظوم تنقید کے موجد قادر الکلام شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں ڈاکٹر محمد رضوان نے کیفیات سے بھرپور کتاب لکھی ہے۔یہ کتاب پانچ حصے میں منقسم ہے:''عبدالمنان طرزی کا سوانحی خاکہ''،''عبدالمنان طرزی کی غزل گوئی''،''عبدالمنان طرزی کی نعت گوئی''،''عبدالمنان طرزی بحیثیت منظوم ناقد''اور''عبدالمنان طرزی بحیثیت فارسی شاعر''۔

ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی شخصیت اور شاعری کی جہتیں حیاتیاتی حرکت اور عمل کی صورتیں ہیں۔اسی حقیقت اور واقعیت کو پانے کے لئے وہ وجدان کا سہارا لیتے ہیں اور شاعری کرتے ہیں۔نئے امکانات سے بھرپور ان کے ناقدانہ شعور نے ان کی انفرادیت کو دوررس بنایا ہے اور سچے عالم کا اعتماد بخشا ہے۔وسیع علم اور گہری نگاہ کی بدولت ان کا سرمایۂ شاعری سخن ہائے گفتنی بنا ہوا ہے۔جس سے شعوری اقدار کا یقین کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رضوان کی تحریر کے مطابق عبدالمنان طرزی کی پیدائش ۳ رجولائی ۱۹۴۰ء تعلیمی سند کے مطابق ہے۔ لیکن اصل تاریخ ۲۱ رمارچ ۱۹۳۸ء ہے۔ان کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا مجموعہ''لکیر''۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ دوسری کتاب''رفتگاں وقائماں'' دربھنگہ کا منظوم ادبی تذکرہ ہے جس کی اشاعت ۲۰۰۱ء میں ہوئی تھی۔طرزی صاحب کی تیسری کتاب''مناظر نامہ'' ہے۔۲۰۰۲ء کی اس کتاب میں مناظر عاشق ہرگانوی کے حالات زندگی، ان کی تخلیقات وتصنیفات کا منظوم اعتراف ہے فکر وفن اور صحافتی کارنامے کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔منظوم کتاب''دستارِ طرح دار'' مظہر امام کی شاعری اور شخصیت پر تنقید ہے۔ایک اور منظوم تنقیدی کتاب'نارنگ زار'' ۲۰۰۳ء میں ہی شائع ہوئی تھی۔اسی سال''طلع البدرُ علینا'' منظوم کتاب وجود میں آئی جس میں سرزمین بطحا سے متعلق اور سیرت پاک کے بارے میں تفصیل ہے۔کتاب''تعارف، تبصرہ، تاریخ منظوم'' ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔

''منظوم جائزے'' (۲۰۰۴ء) وہاب اشرفی کی تیس کتابوں کا منظوم جائزہ ہے۔ ''منظوم سیرۃ الرسول'' (۲۰۰۵ء) میں رسول کریمؐ سے گہری عقیدت ومحبت کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب ''دیوار میں ایک کھڑکی'' (۲۰۰۵ء) ونود کمار شکل کے ساہتیہ اکیڈمی سے انعام یافتہ ناول کا ترجمہ ہے۔ ایک اور منظوم کتاب ''شاہد جمیل'' (۲۰۰۶ء) میں ان کے فکر و فن اور ادبی خدمات وتصنیفات کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ ''آیات جنوں'' (۲۰۰۶ء) طرزی صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ''آہنگ غزل'' (۲۰۰۷ء) میں چار سو غزل گو شعراء کا منظوم جائزہ ہے۔ ''فنکار حق شناز'' (۲۰۰۷ء) میں سید تقی عابدی کے احوال وکوائف منظوم ہیں۔ ''قامت'' (۲۰۰۸ء) میں منور رانا کے فکر وفن کا منظوم جائزہ ہے۔ ''سودیدہ ور'' (۲۰۰۸ء) میں ایک سو شاعر وادیب وصحافی کا منظوم تذکرہ ہے۔ ''دیدہ وران بہار'' (۲۰۰۹ء) میں بہار کی ۱۸۶ اہم شخصیات کا منظوم جائزہ ہے۔ ''سید سعادت علی خاں'' (۲۰۰۹ء) تحقیقی مقالہ ہے۔ ''ماریشش کی ہندی کہانیاں'' (۲۰۰۹ء) ترجمہ شدہ کتاب ہے۔ ''فکر رسا'' (۲۰۱۰ء) رسا دربھنگوی پر تحقیقی مقالہ ہے۔ ''قد آوراں'' (۲۰۱۰ء) فارسی زبان میں شخصیاتی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد رضوان نے طرزی صاحب کی اتنی ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے جبکہ کتاب ''عرفانِ طرزی'' ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ گذشتہ دس سال میں ان کی بہت ساری منظوم کتابیں توجہ کا مرکز بنی ہیں اور ان کی ادبی وتنقیدی ساتھ میں شعری صلاحیت کو سامنے لاتی ہیں۔ ویسے یہ کتاب عبدالمنان طرزی کے حوالے سے قابل مطالعہ ہے۔ ایک تاریخی غلطی کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ طرزی صاحب کی کتاب ''سید سعادت خاں: شخصیت اور شاعر'' کو ڈاکٹر رضوان نے ''یہ ایک تحقیقی منظوم مقالہ'' لکھا ہے جبکہ یہ تحقیقی مقالہ نثر میں ہے۔

....

نام کتاب: ابوالکلام آزاد: نابغۂ عصر مصنف: ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف ص: 200 قیمت: 250 روپے
رابطہ: صدر شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ-4 (بہار) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارنامے پر بہت لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا وجود جہاں عبقری تھا وہیں وہ ہشت پہلو صفات کے حامل تھے۔ ڈاکٹر آفتاب اشرف نے اپنی کتاب کو چار حصے میں منقسم کی ہے۔ ''مولانا آزاد: خاندانی احوال''، ''مولانا آزاد کے معاصرین''، ''مولانا آزاد کے مذہبی افکار'' اور ''مولانا آزاد کے سیاسی نظریات'' کے تحت مدلل بحث کرتے ہوئے مختلف عوامل ومحرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے اور سیاسی، دنیاوی اور مذہبی معاملات کو اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے آزاد کی وسعت کا ادراک کرایا ہے اور جامع کمالات کی تلاش وجستجو کی ہے۔ پروفیسر آفتاب اشرف نے ''مولانا آزاد: خاندانی احوال'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آزاد کے خاندان کے امتیازی پہلو، والدہ اور نانیہالی خاندان، ولادت اور ہندستان واپسی، بچپن کا کھیل یا مستقبل کی شہادت۔ تعلیم وتربیت، مسند درس پر، سرسید کے افکار کی طرف میلان، بلاد اسلامیہ کے اسفار، الہلال کا اجرا، البلاغ، امام الہند کا خطاب، کانگریس کی صدارت، دوسری جنگ عظیم اور مولانا کی قیادت، کانگریس کی صدارت کی دوسری جنگ، استعفی کا مطالبہ، گاندھی جی کی معافی، ہندوستان چھوڑو، شریک حیات کی وفات، مولانا کا عظیم

ایثار، بحیثیت وزیر تعلیم مولانا کے چند کارنامے اور تیسری لحد کو سلام پہنچے جیسے عنوان کے تحت عظمت و کردار کو بے نظیر ثابت کیا گیا ہے۔ڈاکٹر آفتاب اشرف کی تحریر کے اس حصے سے دو ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔والدین اسے محی الدین کا نام دیتے ہیں، تاریخ اسے فیروز بخت کہہ کر پکارتی ہے لیکن اس آزاد فطرت نے خود کو ہمیشہ ابوالکلام آزاد ہی کہلوایا۔''

ایک اور اقتباس دیکھیں:

''کم عمری سے آپ کی ذہانت اور فطانت اور علم کے تئیں آپ کی بھوک کا اندازہ ہونے لگا تھا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے نظیر ذکاوت دی تھی۔جو کچھ پڑھتے فوراً ہی دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کرلیا کرتے تھے۔''

درج ذیل اقتباس بھی توجہ طلب ہے:

''جنت کا استحقاق حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور خاص کر عورتوں کے لئے جن کی بڑی تعداد کے بارے میں تو خود پیغمبرؐ کہہ گئے کہ میں نے جہنم میں عورتوں کی بڑی تعداد دیکھی۔صحابہ نے پوچھا کہ کیوں حضرت؟ تو جہنمی ہونے کی جو چند وجوہات آپؐ نے بیان فرمائی ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نافرمانی کرتی ہیں۔''

ڈاکٹر آفتاب اشرف نے مولانا آزاد کے معاصرین میں بالترتیب مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، سیّد سلیمان ندوی، علامہ اقبال، علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، موہن داس کرم چند گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ان کی عظمت کو نشان زد کیا ہے اور گہرے تعلقات محبت کی تفسیر بتایا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب نے مولانا آزاد کے مذہبی افکار میں کئی نئے نکتے تلاش کئے ہیں اور فطری سرچشمہ سے بحث کرتے ہوئے ''تفسیر میں مولانا کا نظریہ''، ''وحدت ادیان اور مولانا آزاد''، ''مولانا آزاد اور تاریخ''، ''فاطمہ بنت عبداللہ'' جیسے مواعظات کو قرآن کی روشنی میں تاریخی حیثیت عطا کی ہے۔

مولانا آزاد کے سیاسی نظریات سے واقف کراتے ہوئے ڈاکٹر آفتاب اشرف نے ''سیاست دین کا ایک جز''، ''آزاد اور سیاست''، ''مسلمانوں کی سیاسی راہ''، ''نظریہ پاکستان اور مولانا کا موقف''، ''ہندو مسلم اتحاد''، ''مصالحانہ کوششیں''، ''اردو زبان کا مسئلہ اور مولانا آزاد''، ''اردو رسم الخط'' جیسی سرخی کے تحت آئینی اتفاق اور نظریئے کو مقصد اور یکجہتی کے ساتھ قومیت کا میزان بتایا ہے۔فکر کو دعوت دیتی ہوئی مولانا آزاد کی عکاسی یہ کتاب فہم کی کسوٹی اور تاریخی شواہد کی دستاویز ہے۔

....

نام کتاب: شین مظفر پوری: ایک ہمہ جہت شخصیت مصنفہ: ڈاکٹر صوفیہ شیریں ص: 335 قیمت: 350 روپئے

رابطہ: ۳۴ رعبدالحلیم لین، کولکاتا-۱۶ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مسائل حیات سے تلملاہٹ محسوس کرنے والے، زندگی کی تلخیوں اور ترشیوں کو اپنے اندر جذب کرنے والے

اور قدر رواحترام کو اپنی ذات وصفات کا حصہ بنانے والے شین مظفر پوری پر ڈاکٹر صوفیہ شیریں کی کتاب ہر لحاظ سے مکمل اور بھر پور ہے۔ڈاکٹر صوفیہ شیریں 'جواز' میں حقیقت کا اعتراف اس طرح کرتی ہیں:

''یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان کے فن پر نگاہ ڈالنے میں ہم نے عرصہ لگا دیا، لیکن وقت سب سے بڑا ناقد ہے۔ویسے بھی شین مظفر پوری کے تعلق سے ناقدین ادب سے کہیں زیادہ قارئین منصف نظر آتے ہیں۔''

پچاس صفحات کے مقدمہ میں ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے شین مظفر پوری کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور بعض انکشاف بھی کیے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''شین مظفر پوری نے تقریباً سو افسانے لکھے۔چند افسانے کرشن کماری اور ثریا کے نام سے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو ان کے مختلف ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوی سفر کا جائزہ لینے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان کا فن مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے زندگی کی وسعتوں میں سمٹی ہوئی تمام موجودات کی تشریح اور وضاحت پیش کرتا ہے۔''

شین مظفر پوری کے افسانوں کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے وہ یہ بھی لکھتی ہیں:

''شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری میں انشاء پردازی کو بڑا دخل ہے۔ان کے افسانوں کے متعدد جملے پڑھ کر انشائیہ کی گدگداہٹ اور شاعرانہ آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔یہ شعریت اور انشاء پردازی فنکار کے رومانی مزاج کا نتیجہ ہے۔''

شین مظفر پوری ناول نگار تھے، ڈراما نگار تھے، صحافی تھے۔انہوں نے انشائیے بھی لکھے۔'جلوۂ صد رنگ' اور ''ورستم'' کے نام سے کالم بھی لکھے اور ترجمے کا کام بھی کیا۔ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے ان تمام معلومات کا احاطہ کیا ہے۔ ساتھ ہی کتاب کو مزید تین حصے میں منقسم کر کے دانشوروں کے مضامین شامل کیے ہیں۔''شخصیت، سیرت، زندگی'' کے عنوان سے تمنا مظفر پوری، عظیم اقبال، رضوان اللہ ندوی، محمود عالم خاں اور فرد الحسن کے مضامین شامل ہیں۔ ''انٹرویو'' کے تحت مناظر عاشق ہرگانوی کا انٹرویو شین صاحب سے تہہ بہ تہہ گفتگو ہے اور تیسرے حصہ ''فکر وفن'' کو پہچان عطا کرنے والوں میں بالترتیب عبدالمغنی، طلحہ رضوی برق، سید حسن، احمد یوسف، توقیر عالم، عبدالقادر، سلمان عبدالصمد، اسلم جمشید پوری، وہاب اشرفی، مظہر امام، فاروق احمد صدیقی، عبدالمنان، شہاب ظفر اعظمی، ہمایوں اشرف، احمد حسین آزاد، شاہد اختر، محبوب اقبال، حسن رضا، آصف اختر، حافظ فضل الباسط صدیقی، خورشید انور، اعجاز علی ارشد، منظر اعجاز، سید احمد قادری، شکیل احمد قاسمی، احمد یوسف، ممتاز احمد خاں، شاہد علی خاں، رضوان اللہ اور صوفیہ شیریں کے نام اظہار کو نشان عطا کرتے ہیں۔

شین مظفر پوری کی ایک حیثیت خاکہ نگاری کی تھی۔اس پہلو پر منظر اعجاز نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔شین مظفر پوری کا پہلا ناول ''ہزار راتیں'' ہے۔یہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔بعض مضمون نگاروں نے اس ناول کے بارے میں رائے دی ہے کہ اس میں ممبئی کی فلمی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جب کہ سچائی یہ نہیں ہے۔شین صاحب نے بنگال اور

بنگال میں جنسی کاروبار کی مرقع کشی کی ہے۔کلکتہ میں قیام کے دوران انہوں نے تجربہ حاصل کرکے اسے لکھا تھا۔ مجھے انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے بتایا ہے:

''میں نے بڑے ریسرچ کے بعد اپنا ناول ''ہزار راتیں'' لکھا۔اس ناول کا جو بنیادی کیرکٹر ہے وہ علامتی ہے۔اور اس میں ۱۹۵۵ء تک عصمت فروشی کے جتنے طریقے رائج رہے ہیں انہیں اس علامتی کردار کے ذریعہ میزائل کیا ہے۔فلم ایکٹریس سے لے کر پوینا لالٹین تک میں گیا۔انٹرویو لیا اور تمام مقامات سے گذرا ہوں۔''

شین مظفر پوری ۱۵رجولائی ۱۹۲۰ء میں باتھ اصلی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۴راگست ۱۹۹۶ء کو اسی گاؤں میں ان کا انتقال ہوا۔

....

نام کتاب:اردو نظم کا ارتقائی سفر مصنف:سیفی سرونجی ص:279 قیمت:300روپے
رابطہ:سیفی لائبریری،سرونج-464228 (ایم پی) مبصر:پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر سیفی سرونجی کام پر یقین رکھتے ہیں اور کام کئے جارہے ہیں۔ان کا رسالہ ''انتساب'' گذشتہ ۳۴ سال سے شائع ہورہا ہے۔اداریہ میں انہوں نے یہ تنوع پیدا کیا کہ الگ الگ اصناف پر ریاست کے پیش نظر اداریہ لکھنے کی پہل کی اور وافر مواد پڑھنے والوں کو دیا۔اردو نظم کے ارتقائی سفر کا یہ جائزہ کتابی شکل میں پیش کرتے ہوئے انہوں نے بتایا ہے کہ پورے ہندوستان میں اچھے نظم نگاروں کو تلاش کرنا رسائل اور کتابوں تک رسائی حاصل کرنا اور پھر لکھنا ایک مرحلہ تھا جس سے وہ گذرے ہیں۔تمام قابل ذکر شعراء کو شامل کرتے وقت انہوں نے لکھا ہے:

''حتی الامکان کوشش کروں گا کہ تمام قابل ذکر نظم نگاروں کا کچھ نہیں تو تذکرہ ضرور ہوجائے۔اب اس میں مشکل یہ ہے کہ بنیادی طور پر جو نظم نگار ہیں ان میں تو واقعی جان ہے لیکن بہت سے نظم نگار ایسے ہیں جنہوں نے صرف شوقیہ نظم نگاری کی ہے جب کہ وہ ذہنی طور پر نظم سے انصاف نہیں کرپاتے۔بہرحال کوشش تو کی جائے گی۔''

پیش نظر کتاب میں فہرست تیار کرتے وقت صوبہ بہار کا نام کمپوز ہونے سے رہ گیا ہے۔فہرست میں بارہ ریاستوں کے نام ہیں۔مدھیہ پردیش،مہاراشٹر،کشمیر،راجستھان،اترپردیش،مغربی بنگال،دہلی،آندھرا پردیش، کرناٹک،اڑیسہ،تمل ناڈو اور پنجاب میں اردو نظم نگاری کا سرسری جائزہ ہے لیکن کتاب کے اندرونی صفحات پر صفحہ ۲۵۶ سے آخر تک صوبہ بہار کے نظم نگاروں پر تحریر ہے اور مواد ہے۔ڈاکٹر سیفی سرونجی نے کوشش کی ہے کہ پرانے اور بالکل نئے نظم نگاروں تک رسائی کریں اور ان کا نام ضرور شامل کریں۔انہوں نے نظم کی ہیئت اور اصناف پر گفتگو نہیں کی ہے بلکہ علاقہ بہ علاقہ نظر ڈالی ہے۔مثلاً مدھیہ پردیش کو لیں تو بھوپال،گوالیار،اندور،اجین،رتلام،شیوپوری، جبل پور،سرونج،جاورہ،کھنڈوہ اور برہان پور کے شعراء کو شامل کیا ہے لیکن پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعراء کو اہمیت دی گئی ہے اور ان کی نظموں کو بطور حوالہ شامل کیا گیا ہے۔

صوبہ بہار کے تخلیقی امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے سیفی سرونجی نے اعتراف کیا ہے کہ:

''پورے ہندوستان میں بہار ایک ایسا صوبہ ہے جہاں ایک سے بڑھ کر ایک شاعر وادیب موجود ہیں۔ بہار سے کئی اردو رسائل نکلتے ہیں۔خاص طور سے بہار اردو اکاڈمی کا ''زبان وادب'' خورشید اکبر نے ''آمد'' کے جتنے شمارے نکالے وہ بھی اردو ادب میں ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہانِ اردو، تمثیل نو، دسترس، رنگ، کوہسار، افق ادب، صدف، ثالث، ابجد، انتخاب، بھاشا سنگم وغیرہ جھارکھنڈ اور بہار میں ملا کر درجنوں رسائل اور اخبارات سے بہار کے شاعر وادیب ہی جڑے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ صحافت ہو یا اور کوئی شعبہ۔''

اس سچائی کے باوجود یہ فہرست ادھوری اور نامکمل ہے۔سیفی سرونجی کی یہ کتاب ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ جن رسائل کا انہوں نے نام گنوایا ہے وہ اکیسویں صدی کے ہیں۔لیکن ان میں بھی کئی اہم رسائل کے نام چھوٹ گئے ہیں۔پھر بھی نئی نظم کے منظر نامے سے آگاہی کے لئے یہ کتاب اہم ہے کہ موجودہ نظم نگاروں کی بہت سی نظمیں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نظم نگار اپنے ماحول میں جیتا ہے اور جو کچھ تجربہ اور مشاہدہ کرتا ہے اس کی ہی عکاسی نظم کے ذریعہ کرتا ہے۔کشمیر سے یوپی تک اور بہار سے مغربی بنگال تک کے شعراء سیاسی اور سماجی پس منظر میں آج اپنی موجودگی درج کرارہے ہیں جن کی شناخت اور نشاندہی بڑی حد تک ڈاکٹر سیفی سرونجی نے کرائی ہے۔

....

نام کتاب: جہانِ فکر مرتب: ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن ارشد ص: 240 قیمت: 250 روپے

رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-6 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

''جہانِ فکر'' ڈاکٹر مشتاق احمد کے ادبی، علمی، تعلیمی، معاشرتی اور شخصی کالموں کا انتخاب ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد سی ایم کالج، دربھنگہ کے پرنسپل تھے۔فی الحال ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس بڑے کالج کی مصروفیت سے وقت نکال کر وہ حالات حاضرہ پر، نوع بہ نوع سماجی مسائل پر اور عصری جہان معنی پر تسلسل سے مضامین لکھتے رہتے ہیں جو ملک کے بیشتر اخبار میں شائع ہوتے ہیں۔ایسے ہی ۵۴ مضامین کو ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن ارشد نے کتاب بنایا ہے۔یہ دو حصے میں منقسم ہے۔شخصیات اور زبان، تعلیم اور روزگار کے مسائل پر حالات اور تناظر کو سمجھنے میں مددگار سبھی مضامین چشم کشا ہیں۔

شخصیات کے تحت سر سید احمد خاں، علامہ اقبال، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، ٹیگور، پرویز شاہدی، غلام سرور، سید محمد اجمل فرید، شکیل الرحمٰن، مہاشویتا دیوی، عتیق مظفر پوری، کل دیپ نیر، فہمیدہ ریاض، کرشنا سوبتی، نامور سنگھ اور محمد اختر الحسن پر یہ مضامین زندگی کے ترجمان ہیں کیونکہ ان میں حساس ذہن کے تخلیق کار اور دانشوروں کی فکر اور ان کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسرے حصے میں ''مادری زبان میں پرائمری تعلیم، تقاضائے عہد، پیشہ ورانہ تعلیم اور مسلمانانِ ہند، بہار میں اردو ٹی ای ٹی امتحان دینے والوں کا نقصان، بہار میں اعلیٰ تعلیم کے بنیادی ڈھانچوں کو مستحکم بنانے کی ٹھوس اپیل، مغربی بنگال میں اردو کے تئیں بیداری، بہار میں اردو اور فارسی کی صورت

حال، بہار سول سروس امتحان کیلئے مفت کوچنگ کا اہتمام، ملک میں اعلیٰ تعلیم کا معیار، وزیر اعظم کی فکرمندی، بہار کے اسکول اور کالج میں اردو، بہار: سیاسی ایجنڈا اور تعلیم، پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی، بہار میں سرکاری اردو اداروں کی تشکیل نو، بہار: تعلیمی شعبے میں اصلاحات کے امکانات روشن، بہار: فروغ اردو کے لئے ایک خوش آئند پہل، کوچنگ برائے مسابقاتی امتحانات، بہار: امتحان میں نقل نویسی، امارت شرعیہ بہار اور نئی تعلیمی پالیسی، ملک میں غیر ملکی یونیورسٹیوں کے قیام کی وکالت، مقابلہ جاتی دور میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے، بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان؟، بہار میں تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم، اردو کو چاہئے کہ ایسے ہی جیالے، مقابلہ جاتی امتحانوں کے لئے ماحول سازی، تعلیم کے ساتھ اردو کے استعمال کے لئے سنجیدہ کوشش ضروری، نالندہ بین الاقوامی یونیورسٹی اور سیاست، بہار میں اردو ماحول سازی کا نیا نسخہ، بہار اسٹاف سلیکشن کمیشن امتحانات، ہماری آنکھوں میں خواب کون بُنے گا، موجودہ حکومت تعلیم کو تجارت بنارہی ہے، بہار میں اقلیتی یونیورسٹی کی منظوری، اقلیتی اداروں میں ریزرویشن، بہار مسلم معاشرہ اور مقابلہ جاتی امتحان، عالم کاری اور ہندوستانی زبانوں کا فروغ، تدریس کا پیشہ ملازمت نہیں عبادت ہے، ہندوستانی مسلمان اور اشاریۂ مفلسی اور ''ہماری آزادی اور آئینی تقاضے'' جیسے شناخت بھرے مضامین گلوبلائزیشن عہد کا محاسبہ کرتے ہیں اور آئینی تقاضہ کو پورا کرنے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ تناسب کے لحاظ سے فکر ونظر کی وکالت کرتے ہیں، فکر واستفسار اور جہد وعمل کا پیکر بننے کی راہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد حساس ذہن کے مالک ہیں اور معاشرہ کے معاملات ومسائل کا گہرا تجربہ رکھتے ہیں اسی لئے عصر حاضر کے حقائق پر ان کی گہری نگاہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن ارشد نے اس کتاب پر ۲۳ رصفحے کا مقدمہ لکھا ہے اور کتاب میں شامل بیشتر مضامین کا حق ادا کیا ہے۔

....

نام کتاب: نظمانے (نظموں کا مجموعہ) شاعر: ابوبکر عباد ص: 220 قیمت: 125 روپئے

رابطہ: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ابوبکر عباد کی شاعری کی عمر محض چار سال ہے۔ پہلی نظم ''سوچ لہر کی ناؤ میں'' ستمبر ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن 'کہنے' کی رفتار تیز ہوتی گئی اور ۲۰۱۹ء میں انہوں نے یہ مجموعہ اردو قارئین کو دیا ہے جس میں ۱۰۸ رنظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں محدود تہذیب کی ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے اور ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ''جواز واعتراف'' کے تحت انہوں نے تفصیل بتائی ہے اور کتاب کے نام کرن پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعے کا نام ''نظمانے'' رکھنے کا جواز یہ ہے کہ بیشتر نظموں میں افسانے، یا افسانہ پن پوشیدہ ہے۔ سو، خیال یہ ہوا کہ نظم+افسانے=نظمانے، اس کا نام مناسب ہوگا۔ قطعاً دعویٰ نہیں کہ یہ کوئی نئی صنف ہے، یا اس کی ایجاد اب ہورہی ہے۔ نظمیں عشقیہ بھی ہیں، تاریخی، سماجی اور سیاسی بھی۔ عالمی تاریخ، اسلامی عہد، ہندی مائتھالوجی، اسلامی اساطیر اور عظیم شخصیات کو بھی ان کا موضوع بنایا گیا ہے۔ حالات حاضرہ، ماحولیات، ہمارے عہد کے اہم واقعات، بدلتے سماجی اور سرکاری رویے اور انسانی

نفسیات کا بیان کئی نظموں کی اساس ہیں۔ان نظموں میں زندگی کی متعدد سطحوں کا عرفان ہے جس میں ذات اور امتیازات کے کئی خانے اور تلخ حقائق ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا انتساب ابوبکر عباد نے اس طرح کیا ہے:

''جسٹس مارکنڈے کاٹجو (سابق جج، سپریم کورٹ)، پروفیسر اپوروانند (دہلی یونیورسٹی)، جناب رویش کمار (این ڈی ٹی وی)، جناب ونود دُوا (دی وائر) اور ڈاکٹر کنہیا کمار (سابق صدر جے این یو طلبہ یونین) کے نام جنھوں نے خوف کے اندھیرے میں ہمت وحوصلہ کی شمع جلائے رکھی، جبر اور جھوٹ کے دور میں بھی سچائی اور بے باکی اظہار کو جگائے رکھا۔''

ابوبکر عباد نے زندگی کے بیزار لمحوں اور انسانی زندگی کے مکار قصوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور بے حد تلخ تجرباتی مطالعے کو شعری عناصر سے لبریز کیا ہے۔یہ ایسی انوکھی جبلت ہے جس کے افسانوی روپ میں شعوری اہتمام ہے۔وہ ایسے جہان کی سچائیوں کا کشف کرتے ہیں جو زندگی کی بالائی سطحوں اور باطنی زاویۂ نظر کی دریافت ہیں۔ایک طرح سے ان نظموں میں تلاش کا سفر ہے جو باضابطہ ایثار کا مرہون منت ہے۔اور نظریئے کی صورت میں سامنے آیا ہے۔متنوع حقائق کو تخلیقیت سے لبریز کرنے کی تکنیک میں احساساتی فراوانی دیکھی جاسکتی ہے۔''ابوبکر ابن ابوبکر''، ''پیار کی باتیں کریں''، ''رب سائیں''، ''تاج محل سی لگتی ہو''، ''موتی تہہ آب''، ''سانپ سیڑھی کا کھیل اور عیار حاکم''، ''ایک ڈراؤنا خواب اور معبر کا جواب''، ''سعیِ عنکبوت''، ''کافی ہاؤس میں ایک غیر متوقع ملاقات''، ''ہل من مزید''، ''عذاب نیت حاکم''، ''آب حیات کی تلاش میں''، ''عشق کے چاروں امام''، ''حسن، عشق، عاشق اور معشوق''، جیسی نظمیں منطقی جواز کے ساتھ شخصی عنصر اور واقعاتی پیٹرن کی ندرت رکھتی ہیں۔وقت کی تخلیقی قوت کا درجہ رکھنے والی یہ نظمیں واقعات کا تحلیلی مطالعہ پیش کرتی ہیں اور تغیر پذیری کی ترتیب کا وصف رکھتی ہیں۔

....

نام کتاب: افکار کی خوشبو　مصنف: عبدالحئی　ص: 192　قیمت: 100 روپے

رابطہ: سی-۱۸۳، ڈائمنڈ اپارٹمنٹ، 303 تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی-25　مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

بنیادی طور پر ڈاکٹر عبدالحئی صحافی ہیں لیکن تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔زیر مطالعہ کتاب میں ان کے ۱۶ ر تنقیدی مضامین اور بارہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں، ان کے بارے میں عبدالحئی ''پیش لفظ'' میں بتاتے ہیں:

''ابھی میں قومی اردو کونسل سے بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر وابستہ ہوں اور یہاں سے شائع ہونے والے تین ماہانہ اور ایک سہ ماہی رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کی اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ساتھ ہی مطالعے کا سلسلہ بھی جاری ہے اور مضامین بھی لکھتا رہتا ہوں۔گاہے گاہے میرے مضامین، تبصرے مختلف رسالوں اور اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔''

ان کے مضامین عنوانات درج ذیل ہیں: اردو انشائیے کا نقش اولیں: محمد حسین آزاد، اقبال کی شاعری میں مرد مومن کا تصور، اقبال کا پیغام، رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی انفرادیت، رئیس الغزل مولانا حسرت موہانی، آغا حشر کاشمیری کی ڈراما نگاری، مغرب میں تھیٹر کا ارتقا، اختر الایمان کی شاعری کی انفرادیت، ابن صفی کی مزاح نگاری،

ابن صفی کے ناول 'شاہی نقارہ' کا جائزہ، الفاظ کا دیوتا: محی الدین نواب، آتش رفتہ کا سراغ اور ذوقی، احمد علی برقی اعظمی اور ان کی شاعری، شاہد علی خاں: کتاب نما سے نئی کتاب تک، اشاریہ 'نیا دور' اور بچوں کا البیلا ادیب: ابن صفی۔

درج بالا مضامین میں الگ الگ موضوعات پر ربط و تسلسل ہے۔ انداز نقد میں ندرت فکر کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور تازگی میں گہری تنقیدی بصیرت ہے۔ ان کے تنقیدی فلسفے میں ایک طرف سیاسی وسماجی زندگی کے سروکار پر اظہار خیال ہے تو دوسری طرف رواداری اور اصولوں کی پاسداری ہے جس سے روشن نقد کی اہمیت کی شناخت ہوتی ہے۔ تخلیق کے سربستہ راز کو آشکار کرنے میں ان کا تنقیدی عمل فکر انگیز کائنات کو سامنے لاتا ہے اور نئے عہد نامہ کا حصہ بنتا ہے۔ اس طرح حیات آفریں تنقیدی فن کی تفہیم سامنے آتی ہے۔ اختر الایمان کی شاعری پر ان کی رائے دیکھئے:

> ''کچھ ناقدوں کے مطابق انہوں نے میراجی کا اثر قبول کیا تھا لیکن ایسا کہنا غلط ہے۔ ان کی کچھ نظموں میں ایسا ہے لیکن سارے کلام کا تجزیہ کرنے سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ن م راشد کی شاعری سے تھوڑا استفادہ تو کیا تھا لیکن جہاں ن م راشد کی شاعری میں جنسیت کا عمل دخل ہے وہیں اختر کی شاعری میں سطحی تصور، جنسیت کا دور دور تک گزر نہیں۔''
>
> (اختر الایمان کی شاعری کی انفرادیت)

عبدالحیٔ اپنی تنقید میں وسعت مطالعہ کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور منفرد انداز میں تغیرات کے قوس قزح بکھیرتے ہوئے ہیں۔ ابن صفی کے سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''ابن صفی اس معاملے میں اردو زبان و ادب کا سب سے بڑا ادیب ہے کہ اس کی تحریروں اور ناولوں کے نقال سب سے زیادہ رہے ہیں۔ اردو والے کسی ادیب کے ناولوں اور کرداروں کو اس قدر نہیں دہرایا گیا ہے۔ ایچ اقبال، مظہر کلیم، ایم اے راحت، ابن شفیع اور نہ جانے کتنے ناموں نے ابن صفی کی نقل کی اور ان کے کرداروں پر ناول لکھے لیکن وہ ابن صفی جیسا علم، مطالعہ اور تخیل کی بلند پروازی کہاں سے لاتے۔''　(ابن صفی کی مزاح نگاری)

عبدالحیٔ کے تنقیدی محرکات متوجہ کرتے ہیں اور اہم عناصر کے مواد کی فراہمی میں مددگار ہیں۔ ان کے تبصرے میں بھی شخصیت اور فن کا امتزاج ملتا ہے۔ جس کی قرأت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ان سے کتاب شناسی کا صوری و معنوی حسن سامنے آتا ہے۔

....

نام کتاب: چاند سے باتیں　شاعر: خالد سعید　ص: 251　قیمت: 300 روپے　رابطہ: 61/D1-5,993، بیت الجمیل، رنگ روڈ، محبوب نگر، گلبرگہ-585104 (کرناٹک)　مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

خالد سعید تازہ کار شاعر ہیں۔ اپنی غزلوں اور نظموں میں علامت کو راہ دیتے ہیں اور نروان کی بے رنگی، بے سمتی اور لاحاصلی کو عمل اور سوچ کی روشنی عطا کرتے ہیں۔ وہ اپنے انداز بیان سے وجود کا اظہار کرتے ہیں اور موجود کی سطح کو قبول کرتے ہوئے محفوظ امکانات کے ستارے چنتے ہیں تا کہ زندگی کے حقائق سے آگاہی ہو سکے اور محسوسات،

جذبات اور خواہشات کا آکاش بیل سامنے آسکے۔ زندگی کا خارجی پہلو کائنات اور سماج سے عبارت ہے اور داخلی زندگی میں توازن اور احساس کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ اس لئے کہ دور حاضر کی چلتی ہوئی روش کو برتا جائے۔ خالد سعید کی شاعری احساسات، مشاہدات اور تجربات سے عبارت ہے جس میں خصوصی کیفیت الفاظ کی نئی دنیا سے ہے:

نفس نفس میں ہر ایک پل انتشار سا کچھ — لہو کی بارود میں دھرا ہے شرار سا کچھ
کبھی شفق، کبھی حیا، کبھی گلاب شاخ پر — چھلک کے دل سے ایک قطرہ خوں کہاں کہاں گیا
چھینا ہے تونے جسم و لبادہ تو کیا ہوا — خوش ہوں کہ میرے پاس مری بے تنی تو ہے
ہے دھواں دھواں سا ادھر ادھر، کہیں در در یچے جلے ہوئے — کبھی کوئی چوب چیخ اٹھی، مرا شہر خواب جلا ہوا

خالد سعید نے عام حالات کے مشکل ڈگر کو بے تکلف عمل عطا کیا ہے جس میں سانس لیتی ہوئی آس پاس کی زندگی کی فضا ہے اور تہذیبی سیاق کے عناصر کی بازیافت ہے۔ ان کی نظموں میں ایسے اشارے ملتے ہیں جو کیفیات کی دنیا سجاتے ہیں:

دن سرکتا نہیں، شب ڈھلکتی نہیں/ ایک عرصہ افق تا افق منجمد/ کس شمارے میں نیندیں جلیں/ کتنی سانسیں کہ پتھر ہوئیں/ کچھ خبر ہی نہیں/ بس سراپا ہوں مدوجزر (عرصہ تہی آفاق)

خالد سعید کے یہاں احتیاط اور اہتمام ہے، جرأتِ اظہار ہے، حالات وانتشار پر لب کشائی ہے اور عہد حاضر کا ذہنی رویہ ہے:

اب کے موسم میں/ شاخِ زیتون پر پھول بارود کے کھل اٹھے/ ہے افق تا افق ایک دھنک خون کی/ موت: اب رخشِ آوارہ پا، چار سو ہنہناتی ہوئی (بے ریا جی چکے، بے ریا مر چکے)

تازگی، قوت، جدت، ناتمامیوں اور تلخ حقائق کے احساس کو خالد سعید نے لفظیات کا نفسیاتی پس منظر عطا کیا ہے جس سے ہمہ جہتی آگاہی ملتی ہے۔

....

نام کتاب: احساس نگر (نظموں کا مجموعہ) شاعر: ایم نصر اللہ نصر ص: 160 قیمت: 150 روپے
رابطہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، دانش SK لین، ہوڑہ – 711109 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ایم نصر اللہ نصر کی شناخت دو حیثیت سے ہے۔ وہ ناقد بھی ہیں اور مغربی بنگال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اعلیٰ اور جداگانہ مقام رکھتے ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ''احساس نگر'' ان کی شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس میں صرف نظمیں ہیں۔ یہ مجموعہ تین حصے میں منقسم ہے۔ الگ الگ موضوعات پر ۴۸ نظمیں، شخصیات پر ۱۴ نظمیں اور بچوں کے لئے ۱۰ نظمیں شامل ہیں۔ وہ نئے رویے کو ہتھیلی پر سجا کر اور سرو قد بنا کر پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی نظموں میں اشیاء، افراد اور کیفیات کا ایسا منظر نامہ ملتا ہے جس میں تخلیق کاری ہے، شخصیت شناسی ہے اور روشنی کی کرن کی آئینہ داری ہے۔ ان کی نظموں کے بطون میں جو وسعت اور گہرائی ہے وہ فکر کی مختلف جہتوں کو سامنے لاتی ہے اور زمانۂ موجود کی زائیدہ لہروں کے نقوش کو پیش کرتی ہے۔ تخلیقیت کی منطقیت سے براہ راست اظہار کا انداز

کیفیات سے لبریز نظر آتا ہے جو کہیں کہیں تلخ ہو جاتا ہے لیکن یہ تلخی سچائی کو بے نقاب کرتی ہے جس سے واسطہ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سال میں ہم دیکھ رہے ہیں:

''وطن آزاد ہم سے ہے/ وطن آباد ہم سے ہے/ یہ نفرت کی چتا، تندی سیاست کی فضابندی/ تظلم کی فراوانی/ گھروں میں آگ کی لپٹیں/ یہ سڑکوں پر لہو کی رینگتی نہریں/ یہ قتل عام/ یہ چنگیزیت، ہٹلر گری چھوڑو/ تم عصمت کے لٹیرے ہو۔'' (تم ایسا سوچنا چھوڑو)

ایم نصر اللہ نصر نہاں خانۂ دل کی بھی باتیں کرتے ہیں، خوشگوار حیرت تو یہی ظاہر کرتے ہیں اور نامیاتی ربط کا موازنہ پیش کرتے ہیں کہ نسبت اجاگر کرنے سے ہے، خاموش اثرات کے طریق پر رائے زنی سے ہے، ساتھ ہی آرکی ٹائپل رجحانات کے طریق کی صورت کے امیج سے ہے لیکن موجودہ ماحول کے انتشار سے وہ فکر مند بھی ہیں۔ شعور کی غواصی سے نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ:

''میں نے کاٹ لی عمر گریزاں/ ہنسی میں ہو، خوشی میں یا غموں کی بارشوں میں/ مگر بچوں کا کیا ہوگا/ وطن اب بے اماں ہے/ غضب کی دھوپ نفرت کی/ غریبی، مفلسی کی مار بھی اس پر/ لٹیروں کی حکومت ہے/ نہ روزی ہے، نہیں ہے نوکری کوئی/ نہ کاروبار کا موقع۔'' (خدشہ)

ایم نصر اللہ نصر کی بیشتر نظمیں آفاقی اور ملکی صداقت کی اصل حقیقت سے آشنا اور روشناس کراتی ہیں اور خودشناسی اور جملہ اشیاء وصورت کی کائنات کو سامنے لاتی ہیں۔

....

نام کتاب: دیدہ ورانِ بہار شاعر: پروفیسر عبدالمنان طرزی ص: 591 قیمت: 700 روپے
رابطہ: محلہ فیض اللہ خان، لال باغ، دربھنگہ-846004 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

2020ء کی یہ ضخیم کتاب عبدالمنان طرزی کو قادرالکلام شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بہار کے حوالے سے علاقائیت کا یہ شعری منظرنامہ فضابندی کرتا ہے، تخلیقی عمل کی جادوگری کرتا ہے، صوبائی برتری کا احساس دلاتا ہے اور شخصی نوعیت کے شاعرانہ احساس کی تخم ریزی کو سامنے لاتا ہے۔ اس تخم ریزی میں شہرۂ آفاق شخصیتیں ہیں، لالہ و گل کو حسن کا پیکر عطا کرنے والے ہیں، زمانی فاصلہ کا جلوۂ ظہور رکھنے والے ہیں اور بالکل نئے کونپل کی شادابی و زردی بھی ہے۔ زردی اس معنی میں کہ بعض نوخیز کو بھی طرزی صاحب نے ذہن کی شادابی سے کام لے کر دیدہ ور بنا دیا ہے۔ یہ سند طرزی صاحب ہی دے سکتے تھے کیونکہ وہ انسانی صفت اور تخلیقی عمل کے باطنی عکس سے واقف ہیں۔

پیش نظر کتاب شاعرانہ عظمت کی نشاندہی کرتی ہے ساتھ ہی تحقیق اور تنقید کا حق بھی ادا کرتی ہے۔ ۴۵۴ر شخصیتوں کا یہ منظوم انسائیکلوپیڈیا دروں بینی رکھتا ہے، آئینۂ گویائی رکھتا ہے اور وجود کے پھول پر اظہار کی صورت میں رکھتا ہے۔ ادبی جسم کا یہ زندہ روح نامہ ہے جس سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا اور تلاش مدام تلاش کی رواں دواں لہر کو آثار ونشانات عطا کرتا رہے گا۔ قارئین سے مخاطب ہو کر پروفیسر طرزی صاحب پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''تذکرے یا تاریخ کی کتاب کبھی اپنے آپ میں مکمل نہیں ہوتی۔ تصویروں کا امتیاز قائم کرنے اور

فضیلت کو بامعنی بنانے کے لئے دھندلے پس منظر ہی کام آتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان پیکر سازیوں میں شعریت کم ہے۔ وقائع نویسی میں اس کی جستجو بھی بے سود ہے۔ ہمارے یہاں منظوم تذکروں یا تنقیدوں کی روایت بھی تو نہیں ہے۔ میں نے ایک مخصوص طرز کی بنا ڈالی ہے جس کی پذیرائی ہوئی اور تقلید بھی ہونے لگی ہے۔''

یہ خاکسارانہ اعتراف نامہ طرزی صاحب کے مزاج کا حصہ ہے۔ وہ دراصل درد و داغ، سوز و ساز، جستجو و آرزو مندی کی جمالیاتی اور شعری اقداری مکاشفات سے واقف ہیں اسی لئے کلاسیکی، جدید اور مابعد جدید کے ساتھ علاقائی تناظر کی موجودگی کو اساس ادب کا حصہ بنانے میں کامیاب ہیں۔ سوچ کو نئی راہ دینا اور نئے زاویئے کو اثر انداز بنانا ان کے ذہن کا کمال ہے۔ مصنف یا فنکار کے اعماق میں کارفرما تہہ در تہہ پھیلاؤ کو شعر سے توسیع عطا کرنا طرزی صاحب کی بڑی انفرادیت ہے۔ وہ منظوم ناقد ہیں اسی لئے ان کے یہاں زیر مطالعہ کتاب میں بھی وسعت آشنا معنی خیزی ملتی ہے اور وقت کی روانی اور واقعہ بنتی ہے جو لمحے کی مختلف صورتوں کو نشان زد کرتی ہے۔ طرزی صاحب کے شعری گہراؤ میں مثبت پھیلاؤ ہے جس میں کلی، پھول، خوشبو اور رنگ سبھی کچھ ہے۔ تخلیقی کارکردگی، نئے منظر کا ظہور اور نئے مفہوم کے وجودی ادبی رشتے کی مختلف النوع ادراکی نمود و امکانی حقائق سے مالامال یہ کتاب ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔

....

نام کتاب: مینائے غزل شاعر: زماں برداہوی ص: 168 قیمت: 150 روپے

رابطہ: زماں منزل، محلہ: فیض اللہ خان، دربھنگہ-846004 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

زماں برداہوی کی یہ پانچویں کتاب ہے۔ اس میں صرف غزلیں ہیں۔ سیل زماں کی تفہیم و تعبیر کے حوالہ سے انہوں نے اپنی فکر اور جذبے کو پوری شدت سے غزلوں میں تخلیقی گویائی عطا کی ہے۔ شاخِ وجود پر پھول کھلانے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ آئینہ جمال میں منعکس ہو کر دروں بینی کا رنگ پیدا کرنا وہ جانتے ہیں۔ سماجی شعور سے کام لے کر نئی حقیقت کو بھی منکشف کرتے ہیں اور اپنی علمی و تجرباتی آگہی کو تخئیل کی مدد سے اتنا ارتفاع بخشتے ہیں کہ انسلاکات سے علم و عرفان کا انعکاس نمایاں ہو جانا فطری معلوم ہوتا ہے:

سعودی بھی یہودی کے ہی ساتھی ہو گئے شاید
فلسطینی مرے بھائی ذرا آؤ گلے مل لیں

ہماری بات ہے اپنی جگہ جو ہے عقیدت کی
مگر بوسہ لیا ہم نے تو دیکھا وہ تو پتھر ہے

ہو گیا معلوم کہ انساں کی قیمت کچھ نہیں
جب یہاں انسان کا مٹی میں بویا سر ملا

زمانہ گر مخالف ہے تو ہے پرواہ کب اس کی
ہمارا عزم تیور باغیانہ لے کے چلتا ہے

عریانیت کا شکوہ یہاں کس سے کیجئے
شجرِ حیا تو اپنا بھی اب جڑ سے کٹ گیا

ملکی، سیاسی اور شخصی شعور کا وجدان زماں برداہوی کی غزلوں میں تخلیق کا سرچشمہ بنتا ہے۔ یہ جگ ظاہر حقیقت ہے کہ شعر و ادب کی جڑیں علمیات کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور علم وجدان سے ہم آہنگ ہو کر جمالیات کے ظہور

کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہ عناصر ناصرہ ہم زماں برداہوی کی غزلوں میں دیکھتے ہیں۔ وہ اقداری نظام کو سامنے رکھ کر عشق و محبت کی فضیلت کے اظہار کو نمایاں کرتے ہیں اور فلسفیانہ ضابطوں اور اصولوں کے پیمانے کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں:

ہر ایک ہاتھ میں پتھر لئے کھڑے ہیں لوگ　　انہیں سے رشتہ بھی کچھ ہوں مگر بنائے ہوئے

مرے دل کو، مرے گھر کو جلاکر　　مرے ہی دل میں آنا چاہتے ہیں

سب یہاں پردے میں تھے جب ہم نہ تھے　　آشکارا ہم سے سارے ہوگئے

یہ خمار عشق ہے ہرگز نہ اترے گا زماں　　زندگی کو ہم نے اپنی وقفِ جاناں کرلیا

کساد بازاری کے حوالے سے زماں برداہوی اپنی غزلوں میں لطیف اشارہ کرنے میں کامیاب ہیں اور اسی میں تہذیبی اور جذباتی اعتبار سے ان کے اشعار میں شناخت کے عناصر نمایاں ہیں۔

....

نام کتاب: محاکمہ　مصنف: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی　ص: 300　قیمت: 400 روپے

رابطہ: موضع اجرا، وایا: ریام فیکٹری، مدھوبنی- 847337　مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی تنقید نگار ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ کم وقت میں اپنی بصیرت مندی کی وجہ سے شناخت بنانے میں کامیاب ہیں۔ وہ تحقیقی مزاج بھی رکھتے ہیں اور اپنی تحریر میں نئی جہتوں کے انکشافات اور دیدہ ریزی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ عربی ادب پر ان کی خاص نگاہ ہے جن کے ادراک سے نیا مواد اردو کو دیتے رہتے ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب ''محاکمہ'' میں ان کے ۱۲ر تنقیدی و تحقیقی مقالے ہیں جن سے دریائے ادب کی شناوری سامنے آتی ہے۔ مطالعہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تعمیری نقطۂ نظر سے فکروفن کو جلا ملتی ہے۔ تفحص، تجسس اور تکشف کے عمل سے معانی و مفاہیم کی تعبیر واضح ہوتی ہے اور مضمرات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اپنی فکری پرواز کے بارے میں پیش لفظ ''اپنے من میں...'' کے ذریعہ بتاتے ہیں:

''لکھنا پڑھنا اور چھپنا چھپانا میری روزمرہ کی زندگی کا حصہ رہا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ تحریری مشق میرے لئے آب و دانہ کے مانند ہے۔ میری نجی زندگی کا انحصار اسی غیر مرئی ستون پر ہے۔ اگر چند دنوں کے لئے بھی لکھنا پڑھنا موقوف ہوجائے تو ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کے شعلے سرد پڑ گئے ہوں۔''

پیش نظر کتاب میں مضامین کے عنوان اس طرح ہیں:

☆ قرآن: ادب و بلاغت کی میزان ☆ علمائے ہند کی نثر پر قومی یکجہتی کا اثر ☆ بہار میں ادب اطفال: معاصر منظر نامہ ☆ اکیسویں صدی میں دربھنگہ کی تنقیدی کائنات ☆ سادہ نثری اسلوب کا ارتقا اور خطوط غالب ☆ تبصرہ: تعریف و تاریخ، تحلیل و تمثیل ☆ مولانا مناظر احسن گیلانی کا نثری اسلوب ☆ مولانا اعجاز اعظمی کا نثری اعجاز ☆ صفیر بلگرامی: شخص اور شاعر ☆ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی: مقام و کلام ☆ حافظ کرناٹکی ہفت رنگ شاعر۔

ابرار اجراوی نے سائنسی تنقید کے پیش نظر اپنی فکروسوچ کو اعتبار بخشا ہے اور معیار و اقدار کی عمارت کھڑی کی ہے۔ قرآن کریم کی عظمت کو نئے انداز سے دریافت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''قرآن عربی زبان کے چند پرشکوہ الفاظ ومرکبات کا نام نہیں۔ وہ معانی ومطالب کا گنجینہ بھی ہے۔ سارے علوم وفنون کے سوتے یہیں سے پھوٹے ہیں۔ قرآن کریم کا اسلوب وانداز بھی نرالا ہے اور اس کے الفاظ وحروف بھی منفرد ہیں۔ حرا سے جو نسخۂ کیمیا نبی کریمؐ لے کرامت محمدیہ کی طرف آئے تھے اس میں عالم انسانیت کے لئے صرف رشد وہدایت کی ہی تعلیمات نہیں، بلکہ وہ ادب و بلاغت اور زبان وبیان کا بھی اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔''

اکیسویں صدی میں تبصرہ نگاری کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اور غیر افسانوی ادب کا اہم جز قرار دے کر اس کے معتبر ہونے کے بارے میں ابرار اجراوی دلیل پیش کرتے ہیں:

''کتابوں پر تبصری اور ریویو لکھنا پرانے زمانے میں ادیبوں کا نجی شوق تھا۔ کلاسیکی عہد میں بھی تقریظ/ تقدیم اور تبصرے لکھے جاتے تھے۔ مگر اس وقت صرف نام ملتا تھا، دام نہیں۔ جس 'آج کل' میں ظ. انصاری کو ایک تبصرے کے ساڑھے نو روپے ملتے تھے، اسی 'آج کل' میں اِس وقت تبصرہ نگاروں کی خدمت میں ۵۰۰/روپے تک کا اعزازیہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس تبصروں کی اہمیت، وقعت اور قدر وقیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔''

ابرار اجراوی نے بیشتر مضامین میں نقد کے ذریعہ علمیت کو آشکار کیا ہے اور استدلالی اور منطقی عکس کو اثر پذیری عطا کی ہے۔

....

نام کتاب: چراغِ فکر مرتب: جاوید اختر ص: 608 قیمت: 500 روپے
رابطہ: جہانِ اردو، رحم گنج، دربھنگہ-846004 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر مشتاق احمد اپنی سوچ اور اپنے قلم سے خمار ڈالیوں کی خوشبو کشید کر کے نیا پن بکھیرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بہت بڑے کالج کے پرنسپل ہیں لیکن اردو کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کی دوربین نگاہ سے جرأتِ اظہار اس طرح مسلسل سامنے آتی رہتی ہے کہ ان کی ذہنی تازگی، جدت اور آزادانہ مزاج کی رونمائی ہوتی رہتی ہے اور تجربے کے خوش گوار احساس کی وسعت آئے دن اخبار میں دیکھنے کو ملتی رہتی ہے۔ ان کے ایسے ہی شخصی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی ۸۷ ارکالموں کا انتخاب جاوید اختر نے خوبصورت اور بھرپور انداز سے کیا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد استاد، تنقید نگار اور صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن کالم نگار کے طور پر اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ کالم نویس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہو، ذہین وفطین ہو، زبان وبیان کی خوبیوں سے واقف ہو، انداز میں مافی الضمیر بیان کرنے کی خوبی ہو، تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو، معلومات عامہ سے آگاہ ہو، عوامی حقوق کے لئے تعاون کا جذبہ رکھتا ہو، وسعتِ مطالعہ اور اندازِ بیان منفرد، اچھوتا اور جداگانہ ہو اور سادہ زبان لکھنے میں مہارت رکھتا ہو۔ ڈاکٹر مشتاق احمد میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں اسی لئے ''چراغِ فکر'' جلانے میں کامیاب ہیں۔ مختلف النوع موضوعات پر عصری زندگی کے نشیب وفراز کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے بارے

میں وہ بتاتے ہیں:

''اردو میں کالم نگاری کا ذخیرہ گرچہ قابل فخر نہیں لیکن قابل اطمینان ضرور ہے کہ اردو صحافت نگاری کے آغاز سے ہی عصری مسائل پر موضوعاتی کالم یا مضامین لکھنے کی مستحکم روایت رہی ہے۔ حالیہ دنوں میں اس کو مزید فروغ حاصل ہوا ہے اور کالم نگاری باضابطہ ایک فن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کی صحافتی زندگی کا سوال ہے تو یہ خاکسار چار دہائیوں سے اردو صحافت کے پودوں کی آبیاری کر رہا ہے اور مختلف النوع موضوعات پر اپنے افکار و نظریات کی وضاحت بصورت اخباری مضامین اور کالم کرتا رہا ہے۔''

جاوید اختر کا مقدمہ صفحہ ۱۳ ر سے ۳۹ ر تک پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے ڈاکٹر مشتاق احمد کی کالم نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں:

'''چراغ فکر' کے مشمولہ کالموں کے موضوعات سیاسی بے راہ روی، سیاسی رہنماؤں کی ابن الوقتی، مذہبی قائدین کی مفاد پرستی، نام نہاد سماجی رہنماؤں کی نااہلی اور بالخصوص مسلم اقلیت طبقے کی معاشرتی پسماندگی ہیں۔ ان کالموں کے سرسری مطالعے سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کالم نگاری کی سیاسی بصیرت اور سماجی بصارت میں کسی قدر گہرائی اور گیرائی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر محض تبصرہ برائے تبصرہ نہیں کرتے بلکہ مسائل کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو کر گوہر فکر و نظر حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔''

ڈاکٹر مشتاق احمد صحت مند نتائج کے امکانات کو واضح کرنے کے لئے ایسے مضامین لکھتے ہیں جن میں جذبے کی گرمی ہوتی ہے۔ انوکھی اور البیلی تلقینیت ہوتی ہے۔ آج کے شکست و ریخت کے عہد میں مشتاق احمد کی بصیرت افروزی، رمز شناسی، جمالیاتی آہنگی اور سماج میں جاری و ساری متحرک رجولیت کی طلسم کشائی تاثر انگیز ضرور ہے جس کی تہہ میں نئی جمہوری بازدید ہے اور لمسیاتی تہذیبی واضح علامت بھی ہے۔

....

نام کتاب: مری روح کا پرندہ (نظموں کا مجموعہ) شاعر: ف.س.اعجاز ص: 384 قیمت: 400روپے

رابطہ: انشاء پبلی کیشنز، 25-بی، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-700073 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ف.س.اعجاز صحافی، تنقید نگار، افسانہ نویس اور شاعر ہیں۔ شاعری میں غزلیں اور نظمیں ان کی فکر کا آئینہ ہیں۔ ویسے سفرنامہ نگار اور مترجم کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں ف.س.اعجاز کی 145 نظمیں شامل ہیں۔ چالیس سالہ کاوش کا یہ انتخاب اپنے اندر جاتی ہوئی صدی اور نئی صدی کے بیس سال کا منظرنامہ فلسفہ، تاریخ تحریک اور سیاست و ادب تک کو سمیٹے ہوئے ہے جس میں نئی پہل ہے، زوال و انتشار کے بادل ہیں، زندگی کا روزمرہ چیلنج ہے، صورتِ حال کی واضح اور مبہم تصویر کشی ہے اور دوربین و دوراندیش نگاہ کا شد و مد ہے جس کے لئے بعض مخفی ہیئتی تجربے کو انہوں نے راہ دے کر انفرادیت پیدا کی ہے۔ مثلاً ان کی ایک نظم کا عنوان ''بجا کیا ہے'' کیم جنوری 2000ء کے پہلے دن کہی گئی تھی۔ اس میں 48 مصرعے ہیں۔ لیکن لفظ ''بجا'' کے مفہوم الگ الگ ہیں۔

''ٹھیک، ''صحیح جگہ پر''، ''الٹی کلائی''، ''بائیں'' اور ''غلط'' کے معنی میں استعمال کر کے نیا سیاق وسباق دینے کی کوشش کی ہے تا کہ سمت وجہت کے نقوش واضح ہو سکیں۔

ف.س.اعجاز کی نظم ''بابل'' میں درد ہی درد ہے۔ دو بند کی یہ چھوٹی سی نظم چھ چھ مصرعے پر مشتمل ہے۔ جس میں وسیع تجربہ بیان کیا گیا ہے۔ معاشرہ کا مطالعہ اور نفسیاتی تجزیہ بھی ہے۔ تاثیر کی واضح صورت کے علاوہ اس نظم کی تکنیک جداگانہ ہے۔ ف.س.اعجاز نے اس میں پہلا اور ساتواں، دوسرا اور آٹھواں، تیسرا اور نواں چوتھا اور دسواں، پانچواں اور گیارہواں اور چھٹا اور بارہواں مصرعہ ہم قافیہ وہم ردیف رکھا ہے۔ اس طرح یہ نظم آزاد اور پابند دونوں ہیئت میں ہے۔

پیش نظر مجموعہ میں تین نظمیں 'شب باشی'، ''پانی کا تبسم: ایک جمود'' اور ''مالک یوم الدین'' مستزاد غزل سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن یہ مستزاد غزل نہیں ہیں بلکہ نظم کا ہر بند مرکزی خیال کو آگے بڑھاتا ہے اور موسیقیت پیدا کرتا ہے۔ معنویت کے لحاظ سے ان میں ایک طرح سے تصویریت ہے جو نگاہ کو بلند اور بصیرت کو نئی پرواز عطا کرتی ہے اور اسلوب میں فطری خصوصیت ہے۔ اسی طرح نظم ''تم، گم اور تبسم'' اور ''سلام پہلی جنوری'' میں ہیئت کا تجربہ شامل ہے۔ ناتراشیدہ کو کوہِ نور بنانے کا ہنر ف.س.اعجاز کی نظموں میں ملتا ہے۔ اصولی اور معروضی ان کا طریقہ چمک پیدا کرتا ہے اور نئے پن کو اعتبار بخشتا ہے۔ ان کی نظموں کے بعض عنوان اس طرح ہیں:

شور، کارِ تمنا، عجلت، بکھراپن، ربطِ صدا، مستیاں نیند کی، کچے شیشے کی دیوار، تیری صدا کا رنگ، بوئے نغمہ، اذنِ سفر، تخفیف، اندھی آنکھوں کا سپنا، متاعِ کاغذ، سفر آواز کا، اشک مریم، کوئی قاتل کہیں سے در آئے، کالا جادو، فرصت، خوابِ قلم، مانگ کا سہاگ، چلا رہا ہے لیبیا، وہ صدیوں کا مارا ہوا آدمی، ہماری محبت کی بیمار آنکھیں، کن فیکون، لائٹ ایفیکٹس، اس کے اور میرے کھلونے، راستے کا نمبر، جب ہم ٹرانزٹ میں تھے، چور اور چاند، نظم اک برف کا ٹکڑا، بہت گہرا ہے دہلی میں وغیرہ۔ ان میں ''من وتو'' اور ''اشکِ مریم'' سانیٹ ہیں۔

کئی جہتوں سے اہمیت، افادیت اور برتری رکھنے والی ف س اعجاز کی نظمیں فنی شعور کے احساس کی غماز ہیں۔ ان میں ماحول اور شخصیت کا ردِ عمل ہے اور حالات کی وسیع ودقیق نوعیتیں ہیں۔

....

نام کتاب: عشرت گیاوی: حیات وشاعری　مصنف: ڈاکٹر سید شاہد اقبال　ص: 336　قیمت: 350 روپے
رابطہ: آستانہ حق، روڈ نمبر-10 (ویسٹ بلاک)، نیو کریم گنج، گیا-823001　مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر سید شاہد اقبال محقق اور ناقد ہیں۔ وہ فن پارے اور شخصیت پارے میں نقد اور پرکھ کے یقین سے جامعیت پیدا کرتے ہیں اور لہجہ، ڈکشن اور تعمیر وتخلیق کے عناصر کی منطق ومقصد کی ساخت کو عمل سے گذارتے ہیں۔ ان کی قوت انتقاد کی تازہ پیش کش عشرت گیاوی پر ہے۔ جن کے فن پارے کے اندر چھپے ہوئے امکانات کی روشنی میں شاہد اقبال اپنی تحقیقی حس کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہیں اور اپنے واضح نقطۂ نظر کو قدر وقیمت عطا کرنے کے فہم شناس ہیں۔

''حالات عشرت گیاوی'' ''عشرت گیاوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ اور ''انتخاب کلام عشرت گیاوی'' کے عنوان کے تحت شاہد اقبال نے شناخت کو منطقی صداقت سے جوڑ کر نہج و ربط عطا کیا ہے اور ادبی و معنوی جہات کی نشاندہی کی ہے۔ ''مقدمہ'' اور ''پیش لفظ'' میں گیا کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ 3/ اکتوبر 1965ء کو گیا بحیثیت ضلع وجود میں آیا اور 1972ء میں چار اضلاع میں منقسم ہوا۔ ''گیا ڈسٹرکٹ گزیٹر'' کے حوالے سے درج ہے کہ گیا بھگوت پران کے مطابق ایک بادشاہ کا نام تھا۔ اس کا نام گیا امرت رس تھا اور اسی کے نام سے یہ شہر آباد ہوا۔ بھگوان وشنو نے یہاں دیوتاؤں کو قیام کرنے کے لئے کہا اور اسے مقدس قرار دیتے ہوئے یہ بشارت دی۔ جو شخص اپنے اسلاف کے لئے پنڈ دان کرے گا وہ سیدھے سورگ میں جائے گا۔ اسی لئے گیا متبرک شہر مانا جاتا ہے۔

اسی شہر گیا میں اردو شاعروں کی تعداد اچھی خاصی رہی ہے۔ ان میں عشرت گیاوی بھی ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہد اقبال لکھتے ہیں:

> ''زیر نظر کتاب دبستان غالب کا ایک اہم فنکار، عشرت گیاوی: حیات اور شاعری'' سے متعلق تخلیقی اور تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ جس پر اب تک کسی نے توجہ نہیں دی ہے۔ گرچہ ''شمیم عشرت (1942ء) اور ''صدکان گہر'' (1927ء) کلام عشرت گیاوی کے دو ایسے گراں قدر مطبوعات ہیں جو منظر عام پر آچکے تھے جسے ان کے لائق شاگرد سید حسن امام وارثی (م: 1961ء) نے مرتب کر کے نظامی پریس لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔''

عشرت گیاوی کی پیدائش اروکا میں 1860ء میں ہوئی تھی اور ان کا انتقال شہر عظیم آباد میں 1920ء ہوا۔ وہ وہبی شاعر تھے اور مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ کئی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا (کلیم عاجز)''، ''تذکرہ شعراء گیا (مختار احمد عاصی)''، ''تذکرہ مسلم شعراء بہار (سید احمد اللہ ندوی)''، ''عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ (یوسف خورشیدی)'' وغیرہ کتابوں میں عشرت کا ذکر ہے اور نمونہ کلام بھی شامل ہے۔ عشرت گیاوی کے ہم عصروں میں امداد امام اثر (1849-1934ء)، رنجور عظیم آبادی (1862-1922ء)، شاد عظیم آبادی (1842-1927ء)، شاہ اکبر دانا پوری (1842ء-1910ء) شفق عمادی (1870-1944ء)، شوق نیموی (1861-1904ء)، عبدالغفور شہباز (1855-1908ء) وغیرہ ہیں۔ عشرت گیاوی نے غزل، نظم، رباعی، غزلیہ خمسہ اور قطعات میں تجربے کئے تھے۔ عشق، محبت، شراب، شباب اور کسی حد تک تصوف کی باتیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر سید شاہد اقبال نے ان کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور کلام کا انتخاب بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ ایک گم شدہ شاعر کو پہچان دینے کی یہ بڑی کوشش ہے۔

....

نام کتاب: پروفیسر عبدالمغنی: ناقد و دانشور مصنف: ڈاکٹر عارف حسن وسطوی ص: 224 قیمت: 250 روپئے
رابطہ: حسن منزل، روڈ نمبر-6، آشیانہ کالونی، حاجی پور، ویشالی- 844101 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

پروفیسر عبدالمغنی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اردو کے کاز کے لئے انجمن ترقی (بہار) کے پلیٹ فارم

سے کام کرتے رہے۔ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن اردو کے کارنامے میں ان کی شخصیت نہاں تھی۔ وہ ناقد تھے، صحافی تھے اور ماہر اقبالیات کی حیثیت سے بھی انہیں جانا جاتا تھا۔ ان پر زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر عارف حسن وسطوی نے پہلی بار ان کی زندگی، سیرت وکردار اور ان کے گراں قدر علمی وادبی کارنامے پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کے حوالے سے زندہ رہنے والی زیر مطالعہ کتاب کو ڈاکٹر عارف حسن نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے: حیات وشخصیت، عبدالمغنی اور اردو تحریک، عبدالمغنی کی اہم تصانیف، عبدالمغنی کی تنقید نگاری، عبدالمغنی کا اسلوب نثر، عبدالمغنی کی ادبی خدمات اور حاصل مطالعہ۔

ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی تحقیق کے مطابق پروفیسر عبدالمغنی 4 رجنوری 1936ء میں بہار کے شہر اورنگ آباد کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ سے شروع ہوئی۔ وسطانیہ، فوقانیہ، مولوی اور عالم کے امتحانات پاس کئے۔ میٹرک کا امتحان پرائیوٹ سے پاس کیا۔ البتہ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ پھر انگریزی میں آنرس کیا اور اسی سبجیکٹ میں ایم۔ اے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ ان کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کا موضوع T.S. Eliot's Concept of Culture تھا۔ وہ لیکچرر سے پروفیسر کے عہدہ تک پہنچے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہیں چانسلر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کا وائس چانسلر بنایا لیکن بی ایڈ فرضی ڈگری گھوٹالا میں انہیں مجرم قرار دیتے ہوئے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ بعد میں وہ بے داغ ثابت ہوئے۔ ان کا انتقال 5 رستمبر 2006ء کو پٹنہ میں ہوا۔ ان کے نام سے 44 کتابیں مطبوعہ ہیں۔ جن پر ڈاکٹر عارف حسن نے روشنی ڈالی ہے۔ بعض کتابیں ضخیم ہیں لیکن بعض چند صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عارف حسن نے سچا تجزیہ کیا ہے:

> ''انہوں نے اپنی تنقید کی بنیاد ادب برائے زندگی پر رکھی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے تنقید کے تمام اسالیب مارکسی، نفسیاتی، عمرانی جمالیاتی، تاثراتی، سائنسی وغیرہ سب کو اپنی جگہ ادھورا قرار دیا اور ان سب کے بدلے تنقید میں ایک جادۂ اعتدال کی راہ اختیار کی۔''

اتنا ہی نہیں، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل، امتزاجی تنقید، تخلیقیت پسند تنقید، آزاد نظم، آزاد غزل وغیرہ کو نہ پسند کرتے تھے اور نئے تجربے، نئی لہر اور نئی آمد واضافے سے دوری بنائے ہوئے تھے۔ وہ اخلاقی اور روحانی قدروں تک خود کو محدود بنائے ہوئے تھے بلکہ ان کی وابستگی کلاسیکی اور اسلامی ادب سے تھی۔ ان کی فکر کا محور اگرچہ محدود تھا لیکن ان کی شخصیت چھتنار تھی جن کے نظریات کی حمایت کرنے والے بھی تھے۔

ڈاکٹر عارف حسن وسطوی نے پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی اور ان کے ادبی کارنامے پر تفصیل سے لکھا ہے اور ان کے موقف کی نشاندہی بے باکی سے کی ہے۔ اس سے ان کی ذہنی بلندی اجاگر ہوتی ہے۔

....

نام کتاب: سورج سوا نیزے پر مصنفہ: شمع اختر کاظمی ص: 214 قیمت: 300 روپے

رابطہ: 12/14، فرسٹ فلور، سائیں ناگر، بھیونڈی-421302 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

شمع اختر کاظمی کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر اصلاحی مضامین کا یہ مجموعہ نسائی فکر کی شناخت رکھتا ہے۔ افہام و تفہیم کی آرزومندی کو ان مضامین میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انتہاپسندانہ جمال پرستی ہر مضمون کی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ جس کے پس منظر میں کردار کی گہرائی ہے۔ زندگی کی قطعیت کی واضح تصویر ہے۔ اور وقت کے تقاضے کے معانی کی تلاش ہے۔ حقانی القاسمی نے ان مضامین کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شمع اختر کاظمی نے مذہبی احیا پسندی، جبر واستحصال، فرقہ واریت، فساد، ہجومی تشدد، تعلیم، بے روزگاری، دہشت گردی، غذائی تحفظ، غربت، بیماری، بدعنوانی، کرپشن، کثافت اور معاصر انسانی زندگی کو درپیش بیشتر مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔"

شمع اختر کاظمی کی وضاحت اور صراحت میں انفرادی سوچ ہے جو وقت کی آواز ہے۔ سماجی ناہمواریوں پر جارحانہ تنقید ہے اور عصر حاضر کے مسائل کا تجزیہ و مطالعہ ہے۔ ان میں مبالغہ آمیز تصور نہیں ہے۔ غلو اور مبالغہ نہیں ہے اور عدم اعتدال و عدم توازن نہیں ہے بلکہ حقیقت کی سچائی ہے۔ منتشر احساسات کے اصل واقعات ہیں اور قابل فہم و چشم خیال کی کیفیات ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل میں درج مضامین کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے:

'آؤ فساد فساد کھیلیں، زندگی تو ہی بتا تیری علامت کیا ہے؟، بات نکلی ہے تو دور تلک جائے گی، ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے، ڈگر ڈگر لہو لہو قدم قدم ہیں سازشیں، مہاجر نہیں معمار ہیں ہم، اور موت کا الزام بھی کسی پر نہیں آتا، بنگال کا لال قلعہ منہدم کیوں ہوا، آندھیوں سے بچا کر رکھا اپنے آنگن کا بوڑھا شجر، طلاق ثلاثہ: تحفظ یا تباہی، محنت کش ننھے ہاتھوں کا نوحہ، سراغ قتل شہادت ثبوت سب گونگے، وہ تارے جو گل ہو گئے، میرے مولا میرے بچوں کو سفر کرنا ہے، اب احساسِ پشیمانی کہاں ہے؟، ان بہادر خواتین کے حوصلوں کو سلام، رت بدل جاتی ہے جب خلق خدا بولتی ہے، یہی تو ہے ہمارا المیہ، ان محراب وجز کے نام، لہو پکارے گا آستیں کا، غشیات: جس نے انسانی زندگی میں زہر گھول دیا، قلم صحافت اور صحافتی ذمہ داریاں، کوئی تو ہے اس پردۂ زنگاری میں، زندہ قومیں ماضی کی داستانوں میں نہیں جیتیں، دھوپ کو چھاؤں بنانے کا ہنر کرنا ہے، وعدوں کے سنہرے خواب تو ہیں، ہم جنس پرستی: انسانی سماج کی تذلیل، نام نہاد مہذب قوم کا عالمی منظر نامہ، شام: خون آشام، اور عذاب کا سورج۔

ظلمت میں منزل کی جستجو بھرے شمع اختر کاظمی کے مضامین جواز رکھتے ہیں تاکہ ظاہری منظر نامہ کی کیفیات منعکس ہوسکیں اور احتجاج بھی سامنے آسکیں۔ عمل و حرکت کو دلیل کی کسوٹی پر ذریعہ اظہار بناتے وقت جذباتی شرکت میں قارئین کو ساتھ لے کر چلنے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ ان کی دلیل معنوی توازن میں ہے، مفہوم کی سالمیت میں اور مہذب و سنجیدہ افکار و تصورات میں ہے۔ ان کا متین انداز سماجی احوال و مسائل کی ترجمانی اور عکاسی میں ہے جس کا بنیادی نکتہ اصلاح ہے۔

....

نام کتاب: پروفیسر ظفر حبیب: شخصیت اور افسانہ نگاری   مرتب: ڈاکٹر احسان عالم   ص: 426
قیمت: 250 روپئے   رابطہ: گلیکسی کمپیوٹر، رحم خان، دربھنگہ- 846004   مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر احسان عالم کھوجی فطرت کے ناقد ہیں۔ انھوں نے ظفر حبیب کو بحیثیت افسانہ نگار بڑے پیمانے پر دریافت کیا ہے۔ حالانکہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ظفر حبیب کی شناخت نہیں ہے۔ جبکہ ان کے دو افسانوی مجموعے ''آنگن آنگن'' اور ''جنگل کا سفر'' شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مجموعہ میں سات اور دوسرے میں گیارہ افسانے شامل ہیں جن پر بالترتیب سیفی پریمی، اعجاز علی ارشد، احمد رضا صدیقی، عبدالمغنی، ناوک حمزہ پوری، محبوب اعلیٰ قریشی، بدر اورنگ آبادی، احمد سجاد، قاسم فریدی، تمنا مظفر پوری، نورالہدیٰ، علقمہ شبلی، شہاب ظفر اعظمی، محمد شرف الدین، سید عبدالباری، فاروق اعظم قاسمی اور قیام نیر کے مختصر اور کچھ طویل مضامین صفحہ 39 سے 128 تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بقیہ صفحات میں ظفر حبیب کے افسانے دیے گئے ہیں۔ 38 صفحے میں ڈاکٹر احسان عالم کا ''عرض مرتب'' اہمیت رکھتا ہے۔ مضامین لکھوانے اور پرانے مضامین کی دستیابی میں انہیں دشواری ضروری ہوئی ہوگی لیکن ترتیب دیتے وقت بعض مضامین کی صحت پر تراش خراش کرنا ضروری تھا۔ من وعن شائع کر دینے سے منفی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ دو ایک مثال بطور نمونہ درج کر رہا ہوں۔ واقعات کی بے ترتیبی اور زبان و بیان کی کمزوری کی طرف سیفی پریمی صفحہ 41 پر لکھتے ہیں:

> ''واقعات کے سلسلے میں ایک مقام خلاف معمول نظر آتا ہے۔ صفحہ 10 پر درج ہے کہ روزی شاپنگ کے لئے دوپہر کو نکلی۔ وہ غریب لڑکی اس کو ملی اور گھر لے آئی۔ (صفحہ 15)۔ تھوڑی ہی دیر میں خادمہ چائے اور ناشتہ لے کر حاضر ہوئی۔ روزی نے اسے خوب سیر ہو کر ناشتہ کھانے کو کہا اور چائے بھی پلائی۔''

یہاں ناشتہ لفظ بڑی قباحت پیدا کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو زبان و بیان پر توجہ کی ضرورت ہے۔

''آنگن آنگن'' پر یہ تبصرہ 'کتاب نما' دہلی سے لیا گیا ہے۔

مجموعہ ''آنگن آنگن'' کی سات کہانیوں کے بارے میں ڈاکٹر احمد رضا صدیقی انکشاف کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کہانیوں کا ترجمہ اور ترجمانی میں فرق ضرور ہے:

> ''زیر بحث مجموعہ ان کے طبع زاد افسانوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ انگریزی و ہندی کے شاہکار افسانوں کو ترجمہ ہے۔ اس کے اندر سات کہانیاں ہیں جن میں چھ انگریزی اور ایک ہندی سے ترجمہ ہے۔......
> راقم الحروف نے ان میں سے چند کہانیوں کو انگریزی زبان میں بھی پڑھا ہے۔ اصل کہانی کے فقرے اور جملے بھی میرے چشم تخیل کے سامنے ہیں۔ اس لئے میں دیکھ رہا ہوں کہ کہاں پر یہ ترجمہ ہے اور کس مقام پر ترجمانی۔'' (صفحہ 44)

بعض فروگذاشتوں کی بھی ڈاکٹر احمد رضا نشاندہی کرتے ہیں:

> ''مثلاً صفحہ 50 پر تعلق اور تاسف کا مخصوص انداز میں ''تاسف'' ص سے ''تاصف'' لکھا ہوا ہے۔ صفحہ 46 پر زہد شکن کی جگہ زاہد شکن لکھا ہوا ہے۔ صفحہ 38 پر کیا وہ ایک سگریٹ کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں کی جگہ کیا وہ ایک سگریٹ پر مجھ کو ترجیح دیتے ہیں، درج ہے۔'' (صفحہ 46)

مجموعہ ''جنگل کا سفر'' پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

''ظفر حبیب صاحب کو تعمیر ماجرا اور ارتقائے قصہ نیز کردار نگاری پر مزید توجہ دینی چاہئے تا کہ ان کے فن میں وسعت کے ساتھ ساتھ زیادہ گہرائی اور بلندی پیدا ہو۔'' (صفحہ 47)

ناوک حمزہ پوری لکھتے ہیں:

''ہم ان خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سے بہتر افسانوں کی توقع باندھ سکتے ہیں۔'' (صفحہ 51)

بیشتر مضامین میں ظفر حبیب کے بارے میں ایسی رائے دی گئی ہے جن سے کتاب کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ ڈاکٹر احسان عالم مرتب کرنے کے ذمہ دار ہیں ورنہ ظفر حبیب کو مضامین پر ایک نظر ڈالنی چاہئے تھی۔

....

نام کتاب: منصور خوشتر: نئی صبح کا استعارہ　مرتب: کامران غنی صبا　ص: 288　قیمت: 300 روپے

رابطہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ-846004　مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اپنے عصر سے ہم آہنگ فعالی شخصیت کا نام کامران غنی صبا ہے۔ وہ نئی دریافت، جدید فلسفہ اور جدید تر ادب کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نئے رجحان کے ہم عصر ادیب، شاعر اور صحافی منصور خوشتر پر انہوں نے کتاب ترتیب دی ہے جس میں اردو کی عالمی بستی کے 53 اہم قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔ مختصر سرمایہ کے وقیع قلم کار منصور خوشتر کی فعال اور متحرک شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کامران غنی صبا لکھتے ہیں:

''ادب وصحافت سے ان کی وابستگی جنون کی حد تک ہے۔ روزنامہ ''قومی تنظیم'' سے وہ عرصہ سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ کئی سالوں سے ''دربھنگہ ٹائمز'' کے نام سے وہ ایک انتہائی معیاری ادبی رسالہ نکال رہے ہیں۔ ''المنصور ایجوکیشنل ٹرسٹ'' نام سے انہوں نے ایک ادارہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اس ادارے کی جانب سے کئی بڑے اور کامیاب مشاعرے، سیمینار اور ادبی پروگرامس کرائے جا چکے ہیں۔ رشک وحیرت کی بات ہے کہ اپنی نجی اور کاروباری مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر منصور خوشتر زبان وادب کی خدمت کے لئے اتنا سارا وقت کس طرح نکال پاتے ہیں؟ مزید حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ دہلی یا پٹنہ جیسے بڑے شہر میں نہیں بلکہ دربھنگہ جیسے نسبتاً چھوٹے شہر میں رہ کر یہ سارے کام انجام دے رہے ہیں۔''

منصور خوشتر ''تحقیق'' کے نام سے بھی رسالہ نکالتے ہیں۔ اس کی نشاندہی رہ گئی ہے۔

قلمکاروں نے لکھتے وقت منصور خوشتر کو متحیر کن شخصیت، بیدار ذہن شخصیت، روشن مستقبل کا جواں علامت، عزیز وباوفا، موجودہ نسل کا جواں عمر شاعر، عصر حاضر کے عکاس، ادب کی متنوع جہات کا ثروت مند ستارہ، اردو ناول کا رسیا، یوسف صحافت اور شاعر خوش فکر، حال کے گیسو پر مستقبل کی روشن تصویر، نئی نسل کا ادبی مجاہد، غزل کی ایک نئی آواز، نئی نسل کے نمائندہ اور مقبول غزل گو شاعر، امتزاجی اسلوب کا توانا شاعر، نوجوان نسلوں کا ترجمان، کرشماتی شخصیت وغیرہ بھاری بھرکم القاب سے نوازا ہے اور مضامین لکھے ہیں۔ دیگر عنوان بھی ہیں جن کے تحت اظہار کا ذریعہ فراہم کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں کی یہ مروت پسندی ہی ہے کہ انہیں وقت کی لہروں سے ہم آہنگ مان رہے ہیں اور اعتراف

کررہے ہیں۔لکھنے والوں کے نام اس طرح ہیں:

کامران غنی صبا، محمد حامد سراج، عظیم بیگ، مناظر عاشق ہرگانوی، مشتاق احمد نوری، فاروق ارگلی، عبدالمنان طرزی، اویس احمد دوراں، حقانی القاسمی، ثناءالہدیٰ قاسمی، ظفر حبیب، جمال اویسی، نذیر فتح پوری، احمد سہیل، سید احمد قادری، شہاب ظفر اعظمی، ریحان غنی، اقبال واجد، رہبر چندن پٹوی، عطا عابدی، خورشید حیات، انوارالحسن وسطوی، قیام نیر، بدر محمدی، شمیم قاسمی، مجیر احمد آزاد، سلیم انصاری، محمد اشرف کمال، انور آفاقی، احسان عالم، غلام نبی کمار، امتیاز انجم، خالدہ خاتون، جمیل اختر شفیق، نجم الثاقب، فرقان سنبھلی، نصر الدین بلخی، نوشاد منظر، آصف، مستفیض احمد عارفی، ذکوان رشید، مظفر احسن رحمانی، محمد عارف اقبال، صفی الرحمٰن راعین، احسان ثاقب، پرویز اقبال، امان ذخیروی، احمد علی برقی اعظمی، احسان عالم، حیدر وارثی اور محمود احمد کریمی۔

صحافت، شاعری اور شخصیت کے حوالے سے کامران غنی صبا کی یہ کتاب منصور خوشتر کی تخلیقی اظہاریت، ترتیبی عمل اور معنوی وسعت وقوت کے احساس کو گہرا شعور اور شناخت عطا کرتی ہے۔

....

نام کتاب: حرفِ تازہ شاعر: اظہر نیر ص: 224 قیمت: 250 روپے

رابطہ: برہولیا، کسنی سمری، دربھنگہ-847106 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اظہر نیر کہنہ مشق اور زود گو شاعر ہیں۔مختلف شعری اصناف میں تجربہ کرتے رہے ہیں۔ ''حرفِ تازہ'' میں ان کی نظمیں، آزاد غزلیں، تربنی، ماہیا، ہائیکو، سہرا اور رخصتی شامل ہیں۔ان اصناف میں اظہر نیر نے ذات وصفات اور واردات و ملاحظات کا امپیکٹ قائم کررکھا ہے۔جس میں عوامی سوچ کی نمائندگی ہے۔ ماحول کی سسکیاں اور محرومیاں ہیں اور انسانی حدود اور اخلاقی قیود کا تاثراتی ردِعمل ہے۔ان میں ذاتی انکشاف واکتشافات بھی ہیں۔

اظہر نیر نے اپنی شعری ہنرمندی سے شعبہ جات حیات کے اکثر زاویہ کو احساسی تناظر اور نتائجی سیاق وسباق میں رکھ کر امپارٹیکل انداز میں ہمکنار کیا ہے۔جس میں نفسیاتی لگاؤ اور یگانگت کا علمی استغراق اور فکری استفراغ نمایاں ہے۔تخلیقی سانچے کے تعارض کی ناگزیر پیش کش کی چند مثال دیکھئے:

عورت مقدس ماں ہوتی ہے/محبت کرنے والی بیوی بھی ہوتی ہے/ بہن کی صورت ہوتی ہے/تو کہیں بیٹی بھی ہوتی ہے/ایک دوسرے سے محبت بھی کرتی ہے/عورت سے عورت نفرت بھی کرتی ہے/ جان کی دشمن بھی بن جاتی ہے/عورت بیٹی کے لئے جان بھی دیتی ہے/اگر اپنی کوکھ میں مار بھی ڈالتی ہے/ کئی روپ عورت کے ہیں یہ/سو اس کو سمجھنا اب مشکل بہت ہے! (عورت)

''حرفِ تازہ'' میں نظموں کا وافر حصہ ہے۔ یہ نظمیں جذب کی پاکیزگی، جذبہ کی شدت اور شاعرانہ اظہار ایک مقام عطا کرتی ہیں:

کتبے کا پتھر/ پشتارے کی صورت/سوچ رہے ہیں کب تک آخر/ ڈھوتے رہیں/ وہ جو ہم سے بچھڑ گئے ہیں/ ان سے اپنا رشتہ ہے/ خون خرابہ، دہشت گردی/ ہر دن کا معمول/ اس دنیا میں/ اب تو زندہ لوگوں

میں بھی / رشتہ کی پہچان نہیں ہے! (کتبے کا پتھر)

شاعری میں اختراع یا تبدیلی ذہن کو متحرک کرتی ہے۔ بحر، زمین، ردیف، قافیہ، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل، تعلّی، تمثیل وغیرہ اشعار کو مزین کرتے ہیں۔ اظہر نیر نے ''آزاد غزل'' میں تجربہ کرتے وقت خلوت اور جلوت سے تسکین حاصل کی ہے:

کیا کرتے ہو بارش پتھروں کی اس طرف کیوں / بدن میرا تو شیشے کا نہیں ہے!

....

میں نے آنکھیں موند لیں تو دل کے پس منظر تمام / پیش منظر ہو گئے!

اظہر نیر نے تخیل کی جھیل کے کنارے بیٹھ کر ''تربنی'' میں بھی جذبات کی عکاسی کی ہے:

نیند کی طلب ہے / دن کی محنت کا یہ سبب ہے / ہم سے ملنے کا اب وقت ان کو کب ہے!

فکر و اظہار کی ہم نشینی کے دوران ملی جلی کیفیات کو اظہر نیر نے ''ماہیا'' کی موزونیت عطا کی ہے:

اخبار کی تھی سرخی / لوگ مگر بے حس / ہر شہر میں شورش تھی!

مانوس اور آشنا سرحدوں میں اظہر نیر نے ''ہائیکو'' کی طرف بھی توجہ کی ہے اور نئی تصویر کو فطری استعداد کا روپ دیا ہے۔ ملک سخن میں ہیئتی تجربہ بھی متوجہ کرتا ہے:

انساں ہے لاچار / ہر دن سو سو حادثات / جینا ہے دشوار!

اظہر نیر نے عصری تقاضے کے تحت جلوہ آرائی پیش کی ہے۔

....

نام کتاب: صدائے ضمیر   شاعر: ضمیر یوسف   ص: 208   قیمت: 160 روپے

رابطہ: 376/2، سرت چٹرجی روڈ، پلاٹ-B-54، ہوڑہ-3 (مغربی بنگال)   مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو میں قطعات لکھنے والوں کی تعداد آج کم ہے۔ ضمیر یوسف نے اس صنف سخن میں انسان دوستی اور مقدس رشتے کی پاسداری کی ہے اور باطن سے آزاد وجود کے طور پر پیدا ہونے والی شرط اور عرفان کو پورا کیا ہے۔ ان قطعات میں مختلف سطحوں کو ظاہر کر کے زندگی کے ربط کو متنوع حقائق عطا کیا ہے اور لطیف امتیاز کے شعور سے بہرہ ور ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یہ تخلیقی جہان کا کشف ہے کہ انوکھا زاویۂ نظر ضمیر یوسف نے تلاش کیا ہے اور شعری عناصر سے لبریز زندگی کے کئی اچھوتے پہلو کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ احساساتی سطح پر بھی ان کے قطعات متاثر کرتے ہیں اور شخصی اسٹرکچر کو بھی انہوں نے کلیدی کردار بنایا ہے۔ یہ تخلیقی قوت کا کمال ہے اور بنیادی تشخص اور تغیر پذیری کے عمل کا اٹوٹ رشتہ ہے جس میں تہذیبی عناصر کا مظہر دیکھا جا سکتا ہے اور منطقی جواز کی تخلیقیت کا قائل ہونا پڑتا ہے:

جگمگاتے ہوئے ستارے بھی   اب اندھیروں سے لو لگانے لگے
کل جو روشن خیال بنتے تھے   تیرگی کے قریب آنے لگے

......

کوئی چہرہ بھی اسے تازہ نظر آیا نہیں — آدمی کا چہرہ چہرہ آئینہ پڑھتا رہا
ٹوٹی قبروں کی طرف دیکھا کسی نے بھی نہیں — پختہ قبروں پر زمانہ فاتحہ پڑھتا رہا

ضمیر یوسف کے قطعات کی ایک بڑی خوبی حالت حاضرہ کی عکاسی ہے۔ بے رنگ، بے سمت اور لا حاصل تصوریت کے دور میں خود شناسی کی ترغیب ہے اور دانش کے ستارے چننے کے جذبات وخواہشات کا آکاس بیل ہے جس کے چاروں طرف پیچیدگیاں ہیں، الجھنیں ہیں، ذات پات کا بھید بھاؤ ہے اور احساساتی زندگی کے امتیازات ہیں:

متحد اہل وطن پھر آج ہوں — تنگ نظری اور پستی کے خلاف
کھیلنا ہے قوم کو اک فائنل — ملک میں فرقہ پرستی کے خلاف

......

مسلکی آگ میں جھلستے ہیں — ایک مذہب کے ماننے والے
ایک دوجے کا خوں بہاتے ہیں — ایک ہی رب کے ماننے والے

......

کتنا عجیب ہے یہ سفر کا پڑاؤ بھی — کوئی کہیں پہ رہتا ہے منزل کہیں پہ ہے
کس درجہ دردناک ہے تقسیم کا غذات — یادیں کہیں پہ جسم کہیں، دل کہیں پہ ہے

خارجی زندگی کی نامساعدات کے خلاف ضمیر یوسف نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے قطعات میں سچائی، سنجیدگی اور خلوص کے روزن دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے چھوٹے آدرشوں کی آواز پر اور ضمیر کی نفی پر کئی جہتوں سے روشنی ڈالی ہے اور سماج کے آلودہ فضا پر توجہ مبذول کرائی ہے کہ زمین، وطن، مذہب اور انسانی سچائی کے لمس پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور رواں دواں لکیروں کو آشنائی بخشنے کے وصف میں جذب ہونے کی ضرورت ہے ورنہ چاروں طرف کی پراسرار مسموم ہوا فطری رفتار کو روکنے کے درپے ہے۔

....

نام کتاب: شیرازۂ حیات: مولانا طیب عثمانی ندوی کی حیات وخدمات مصنف: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
ص: 248 قیمت: 250 روپے رابطہ: ہیڈ اردو ڈپارٹمنٹ، انجمن ڈگری کالج، بھٹکل مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی معلم ہیں، ناقد ہیں اور صحافی بھی ہیں۔۔ ان کا گھرانہ علمی، ادبی اور مذہبی رہا ہے۔ ان کے والد ماجد مولانا شاہ محمد طیب عثمانی ندوی تحریکی، تعمیری اور اسلامی شخصیت کے مالک تھے۔ ادیب، صحافی، محقق، ناقد، سفرنامہ نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے بھی ان کے قلم کی جلوہ گری سامنے آتی رہی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب کے ''عرض حال'' میں ڈاکٹر رشاد عثمانی ان کی ہمہ جہتی پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''والد محترم مرحوم کی شخصیت بہت ہی ہمہ جہت مگر سادی، عوام وخواص، دوستوں، ملنے والوں اور شاگردوں کے درمیان بے حد مقبول ومحبوب رہی ہے۔ آپ عجز وانکساری، شرافت ونیک نفسی، مشرقی انداز وتمدن،

تہذیب واخلاق،خشیت،للّٰہیت،مروت،نرمیت،رواداری اوروضع داری کا بے نظیر نمونہ تھے۔دراصل آپ خاندان کے ذمہ دار ترین فرد،عزیزوں و دوستوں کے غمگساراور شاگرد نواز واقع ہوئے تھے۔"

مولانا طیب عثمانی پر زیر نظر کتاب میں "سوانح وشخصیت" کے تحت سات مضامین، "فکروفن" کے عنوان سے تیرہ مضامین، "منظوم خراج عقیدت" کے تحت چار، "دیباچے" کے عنوان سے تین، "تبصرے" (پانچ)، "افکارو اقدار" (ایک)، "حیات دوام" (ایک)، "سفرنامہ حرمین شریفین (چار)، "ادبی اشارے" (ایک)، "خیابان خیال" (تین)، "وفیات" "(اخبارورسائل کے تراشے-آٹھ) اور" قارئین کے خطوط" (گیارہ) مضامین وتاثرات شامل ہیں۔لکھنے والوں میں بالترتیب محمد رابع حسنی ندوی، محمد جعفر، احمد سجاد، حسن رضا، تابش مہدی، بدیع الزماں، محمد شبیر عالم خان، ابوذر عثمانی، سید عبدالباری، محسن عثمانی ندوی، شاہ بلال احمد قادری، محمد ظفر الدین، جاوید حیات، محمد عارف اقبال، وقار انور، محمد منصور عالم، سید احمد قادری، ممتاز احمد خاں، ظفر عالم سہرامی، ضیاء الرحمٰن ضیا مدنی، یوسف حسین خاں، شمس بدایونی، مدیر معارف (اعظم گڑھ)، مدیر فاران (کراچی)، مدیر زندگی (رامپور)، مدیر تجلی (دیوبند)، مدیر ادیب (علی گڑھ)، مدیر تذکرہ (لکھنؤ)، شاہ معین الدین احمد ندوی، ماہر القادری، سید احمد عروج قادری، عامر عثمانی، ابن فرید، عبدالمغنی، ابوالقاسم ایوب اصلاحی، عمیر الصدیق ندوی دریابادی، محمد رضوان خاں، غلام نبی کمار، اشعر حمیدی، شاہ فتح اللہ قادری، شاہ مشیر حسنین عثمانی، شاہ مسرور عثمانی، شوکت علی وغیرہ کے نام اہم ہیں کہ ان سب نے مولانا طیب عثمانی ندوی کی حیات وخدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے، منفرد اور واضح شناخت عطا کی ہے، بصیرت اور ماہرانہ صلاحیت کا اعتراف کیا ہے، ادبیات کی اثر پذیری کو واضح کیا ہے، وقیع ومدلل کاوشوں کو اعتبار بخشا ہے، وسیع تناظر میں منضبط فکری اور فنی مطالعے کو جہت اور سمت عطا کی ہے اوران کی تحریکی واجتماعی شغف کو نمایاں کیا ہے۔

مولانا طیب عثمانی 30 ستمبر 1930ء کو پیدا ہوئے تھے اوران کا انتقال 29 ستمبر 2015ء کو ہوا۔ان کی گیارہ کتابوں کے نام اس طرح ہیں: رسول اکرمؐ، نقش دوام، حدیث اقبال، افکار واقدار، حیات دوام، سفرنامہ حرمین شریفین، ادبی اشارے، صحرا میں اذان، شخصیات، اسلامی معاشرہ اور خیابانِ خیال!

طیب عثمانی کی تعمیری فکر ونظر پر رشاد عثمانی کی یہ کتاب ادبی توازن رکھتی ہے اور شخصیت اور کائنات، شخصیت اورانسان، شخصیت اورفن کار اور شخصیت اور خدا کو سمجھنے میں مددگار ہے۔

....

نام کتاب: ناشاد اورنگ آبادی: شخصیت اور شاعری مرتب: ڈاکٹر خورشید انور ص:200 قیمت:200 روپے

رابطہ: محلہ سیدنا، بالمقابل فلوریڈا اسکول، پھلواری شریف، پٹنہ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر خورشید انور علم وادب کے شیدائی ہیں۔فن اورفن کار کو پرکھنا جانتے ہیں اور خوبصورتی کے سچے تصور کے شیدائی ہیں۔انہوں نے غزل کے مقبول اور مشاعرہ کے مشہور شاعر ناشاد اورنگ آبادی پر مضامین کو مرتب کیا ہے اوران کے ادبی قد کو روشنی بخشی ہے۔ناشاد اورنگ آبادی زندگی کے مشاہدات، تجربات اوراس کے لمس کو شاعری کا روپ دیتے رہے ہیں۔ان کے پاس اپنی زبان، اپنا لہجہ اوراپنے احساسات ہیں اس لئے شعری حیثیت میں ناآسودگی،

خلش اور اندرونی انتشار کے ساتھ تہہ داری سچائی کی گہرائی ملتی ہے جس میں سرخوشی اور سرشاری دیکھی جاسکتی ہے۔ روایت کی شگفتگی اور عصری آگہی کی روشنی کی نمائندگی کرنے والے شاعر کے بارے میں ڈاکٹر خورشید انور ''عرض مرتب'' میں لکھتے ہیں:

''ناشاداورنگ آبادی کی شاعری نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ شاعری ان کا عقیدہ ہے، ایمان ہے، جتنی محبت انہیں ہمیشہ سے اپنے فن سے رہی ہے اتنی محبت شاید انہوں نے اپنے آپ سے نہیں کی ہے۔ اپنے وجود کے ہر زخم، ہر درد کو، آنسوؤں کو اور بے ساختہ چیخوں کو اپنے اشعار میں ڈھالنے کے فن کو ایک شاہکار ہنر میں تبدیل کیا ہے۔ زندگی کے نامساعد حالات، پرخطر راستے، جانب داری اور تعصب کی زہریلی فضاؤں سے بھی وہ اپنے شعری شاہکاروں کا علم لہراتے رہے۔''

15 جنوری 1935ء میں پیدا ہونے والے ناشاداورنگ آبادی کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پرواز سخن، میل کا پتھر، لمحے لمحے کا سفر، ہم سفر غزلیں اور غزل کیسے لکھیں، جیسی کتابوں پر اور ان کی شخصیت پر جن کے مضامین زیر مطالعہ کتاب میں شامل ہیں، ان کے نام بالترتیب اس طرح ہیں:

شاداں فاروقی، عنوان چشتی، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، علیم اللہ حالی، ناوک حمزہ پوری، اعجاز علی ارشد، محفوظ الحسن، شبنم گورکھپوری، پریم اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی، لطف الرحمٰن، قمر اعظم ہاشمی، کلیم سہسرامی، عاطف بنارسی، غلام ربانی تاباں، ممتاز احمد، مظہر امام، اویس احمد دوراں، تاج پیامی، ششی ٹنڈن، ضیاء الرحمٰن شارق، شاکر کریمی، شکیب ایاز، قمر رئیس، حسن امام درد، ایم اے ضیا، منصور عمر، امام اعظم، امتیاز احمد صبا، علی اظہر زیدی، معبود آمر، منیر سیفی، محمد اختر الحسن، اشفاق احمد عارفی، اوم کرشن راحت، سید حیات وارثی، اے ایس جلال الدین، سیف سہسرامی پوری، مشتاق احمد نوری، انور شمیم، احمد مصور صبا، محمد عظیم اشرف، سعد اللہ چیروٹڈوی، سلطان اختر، قاسم فریدی، زین شمس، قوس صدیقی، محمد سلمان، آصف اختر، ظہیر صدیقی، فضل اللہ قادری، اثر فریدی، ستپال سنگھ چوہان، اجنے اگیات، بسمل عارفی، شبیر حسن شبیر، شکیل حسن، شمیم قاسمی، ساحر داؤد نگری، شکیل سہسرامی، عبدالباری، ظفر صدیقی، عظیم الدین عظیم اور انجم سہسرامی!

درج بالا ناموں نے طویل، مختصر اور مختصر ترین رائے سے ناشاداورنگ آبادی کی شعری انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے انسانیت کی جس طرح پاسداری اور آبیاری اپنی تخلیقات کے ذریعہ کی ہے اس کے نقوش آشکار کئے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں زبان کی سادگی اور فکر کی گہرائی سے جس طرح کام لیا گیا ہے اسے اجاگر کیا ہے۔

....

نام کتاب: محب الرحمٰن کوثر: تخلیقی سفر ایک جائزہ مرتب: ڈاکٹر عشرت بیتاب ص: 120 قیمت: 200 روپے
رابطہ: زیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول-713302 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر عشرت بیتاب اپنے ہم عصروں میں اس لئے منفرد ہیں کہ وہ تعصب کو راہ نہیں دیتے ہیں اور علم بانٹتے رہتے ہیں۔ دور حاضر کے انسان کے ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کو جوڑتے رہے ہیں اور ادبی تابندگی کے لئے ہمہ وقت مشغول و مصروف رہتے ہیں۔

محبّ الرحمٰن کوثر شاعر تھے۔ان کی ادبی شخصیت شناسی کے لئے ڈاکٹر عشرت بیتاب نے کتاب ترتیب دی ہے۔
اس میں بالترتیب احسان ثاقب، معراج احمد معراج، سلیم سرفراز، عشرت بیتاب، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مجبوب انور، اشرف جعفری، سید محفوظ عالم کے مضامین، تبصرے اور تجزیے کے ساتھ محبّ الرحمٰن کوثر کی شعری تخلیقات کا انتخاب شامل ہے۔
محبت الرحمٰن کوثر رہوا (ویشالی، بہار) میں 2/جولائی 1938ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ریلوے کی ملازمت کرتے رہے۔ 1959ء میں کلرک کی حیثیت سے بحالی ہوئی تھی اور 1996ء میں آفس سپر نٹنڈنٹ کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ان کا انتقال 19 نومبر 2009ء کو ہوا۔ان کے تخلیقی سفر کے بارے میں مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی بتاتے ہیں:

''ان کی پہلی غزل ماہنامہ ''آفاق'' کلکتہ کے اکتوبر 1959ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔انہوں نے ڈرامے، افسانے، مضامین، تبصرے، مقالے، تنقید، نظم، آزاد نظم، قصیدہ، قطعات، رباعیات، ماہیے، رثا، ثلاثیت اور غزل سب میں اپنی فنی بصیرت، ارفع تخیل اور فکری بالیدگی کا مظاہرہ کی۔''

اتنی خوبیوں کے شاعر پر توجہ نہیں دی گئی تھی۔ان کی ادبی وابستگی کا ذکر تک نہیں ہوتا لیکن ڈاکٹر عشرت بیتاب نے انہیں جدید حسیت کے شاعر کی حیثیت سے دریافت کیا ہے اور ان کی شاعری میں عہد کی ہم آہنگی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیفیات، تاثرات اور لہجے کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے ادبی سرمائے کا ذکر کرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں عشرت بیتاب لکھتے ہیں:

''موصوف کی حادثاتی موت سے ان کا بہت سارا ادبی کاز ادھورا ہی رہ گیا جیسا کہ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ شاعری کی 'عروض و بلاغت پر ایک مسودہ تیار ہے۔ دوسری ایک اہم کتاب 'آسنسول کی ادبی سرگرمیاں' کا مسودہ بھی زیر ترتیب ہے اور سب سے اہم کتاب اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے چکے تھے۔ معلوم نہیں یہ ساری چیزیں آسنسول کے کوارٹر میں دیمک کی نذر ہو گئیں یا پھر گاؤں کی مٹی نے اسے چٹ کر ڈالا، کہنا مشکل ہے۔''

چند مشاہیر سے ان کی شاعری پر لکھوانا اور کتابی شکل میں زیور طبع سے آراستہ کرنا آسان نہیں تھا لیکن یہ کام عشرت بیتاب نے خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں محبّ الرحمٰن کوثر کی غزلیں، نظمیں، سہرا، رخصتی اور ایک مقالہ شامل کر کے ان کی سوچ و فکر کی وسعت و گہرائی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک نعت، چھ غزلیں، چودہ نظمیں، ایک سہرا، ایک رخصتی نامہ، جگر مرادآبادی پر ایک مقالہ اور شاہین، کہکشاں پروین، حسن نجمی سکندر پوری، اسلم بدر، مہتاب پیکر اعظمی، محمد شمیم اقبال سہرامی اور جوگندر پال کی کتابوں پر تفصیلی تبصرے سے بخت خفتہ سامنے آتے ہیں اور قلم کے راز ہائے دروں پر روشنی پڑتی ہے۔

....

نام کتاب: عشرت بیتاب کے نمائندہ افسانے مرتبہ: شگوفہ تمنا ص: 176 قیمت: 132 روپے
رابطہ: معرفت شکیل دانش ایڈوکیٹ، ریل پار، آسنسول-713302 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

عشرت بیتاب تنقید نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ویسے وہ ہمہ جہت قلم کار ہیں۔

جہاں تک افسانہ نگاری کی بات ہے لکھتے وقت وہ تہذیب، ثقافت اور زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کو پیش رکھتے ہیں۔ صحت مند معاشرے کے خواہاں رہتے ہیں۔ متنوع اور جدید موضوعات میں نفسیات کو بھی راہ دیتے ہیں اور عصر حاضر کے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں شعوری اور غیر شعوری عوامل شامل رہتے ہیں۔ کہیں کہیں تلمیح اور استعارے سے کام لیتے ہیں۔ ساتھ ہی فکری اعتبار سے مادیت، گلوبلائزیشن اور بکھرتی ہوئی قدروں کے تصادم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے سماجی، جنسیاتی، رومانی اور حالات حاضرہ کے عکاس ہیں۔ چیونٹی، سسٹر، ریت پر اگا ہوا گلاب، ٹھنڈی آنچ کا سورج، تبدیلی، پھول کی چادر، برف میں چنگاری، بے نور آنکھیں، بند دریچوں میں گھٹن اور دیگر افسانے سماج کے حقیقی چہرہ کو سامنے لاتے ہیں۔

شگوفہ تمنا نے عشرت بیتاب کے نمائندہ افسانوں کا جامع انتخاب پیش کیا ہے۔ ان افسانوں کی تعداد 24 ہے:

''آسودگی، بے حسی، بے نور آنکھیں، بے ثمر حیات، بند دریچوں کی گھٹن، برف میں چنگاری، پھول کی چادر، تبدیلی، تاڑ کی چھاؤں، ٹھنڈی آنچ کا سورج، چیونٹی، ذہن کے بند دریچوں سے، ریت پر اگا ہوا گلاب، رسائی، زمین سے اکھڑا ہوا پودا، سفید ساڑی والی عورت، سورج میں اٹکا ہوا قدم، سر، سفر جاری ہے، ساڑی، سسٹر، مرد، عورت، نیرنگ پیرہن اور ہری گھاس کی کونپل۔''

شگوفہ تمنا نے اپنے طویل پیش لفظ میں مندرجہ بالا افسانوں کے بطون میں تنقیدی زاویہ نگاہ سے جھانکنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے نباضی کر کے بحیثیت افسانہ نگار عشرت بیتاب کی شناخت کو استحکام بخشا ہے اور ان کے فکری نظام کو عہد کے ساتھ جوڑ کر وضاحت کی ہے تاکہ اہمیت کے احساس کا اندازہ ہو سکے۔ اور اثر پذیری قابل لحاظ حد تک متاثر کر سکے۔ شگوفہ تمنا جانکاری دیتی ہیں:

> ''آپ نے اپنی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ''لاش کا حمل'' کے عنوان سے 1968ء میں رسالہ ''شکیلہ'' ممبئی میں آپ کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ اس کے بعد سلسلہ وار آپ کے پانچ افسانوی مجموعے ''ریت پر اگا ہوا گلاب'' (1992ء)، ''بے ثمر حیات'' (1990ء)، ''برف میں چنگاری'' (2003ء)، ''ذہن کے بند دریچوں سے'' (2010ء) اور ''سفر جاری ہے'' (2016ء) شائع ہوئے۔''

عشرت بیتاب نے سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ یہاں تک کہ افسانہ ''بے نور آنکھیں'' میں ہجڑوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ وہ عصبیت اور استحصال کے خلاف اثر انگیز احتجاج کرتے ہیں اور اونچ نیچ پر ضرب لگاتے ہیں۔ اور ہندو مسلم رواداری پر بھی زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر افضال عاقل اس کی تصدیق اس طرح کرتے ہیں:

> ''عشرت بیتاب کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ ہر طرح کے حالات سے گذری ہے اور انہوں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔''

عشرت بیتاب کے افسانوں کو سمجھنے کے لئے، تہہ داری اور معنویت سے جانکاری کے لئے شگوفہ تمنا کی ترتیب دی ہوئی یہ کتاب کشش رکھتی ہے، کئی نقوش سامنے لاتی ہے اور رونما معاشرے کی دکھتی رگ کی نشاندہی کرتی ہے۔

نام کتاب: شگفتگی و برجستگی قلم کاروں کی مصنف: نارنگ ساقی ص: 360 قیمت: 400 روپے
رابطہ: L-4، کناٹ سرکس، نئی دہلی-110001 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو میں ادبی لطائف کو اعتبار بخشنے والوں میں نارنگ ساقی جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ دکھ اور تناؤ بھری زندگی میں مسکراہٹ کے پھول کھلانا آسان عمل نہیں ہے۔ انہوں نے لطیفے کے ذریعے ادبی تہذیب کو اجاگر کیا ہے اور فنی لحاظ سے طنز و مزاح کو تذکرۂ قندہ مضحکات بنایا ہے۔ ادبی لطیفے کی ان کی پہلی کتاب ''ادبی لطیفے'' 1992ء میں شائع ہوئی تھی۔ 208 صفحے کی اس کتاب کی یہ مقبولیت ہی تھی کہ 1993ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن پاکستان سے طبع ہوا۔ پھر نظر ثانی اور اضافے کے ساتھ تیسرا ایڈیشن 1996ء میں منظر عام پر آیا تب ضخامت 256 صفحات تھی۔ اس کا چوتھا ایڈیشن 2004ء میں شائع ہوا۔

لطائف کا دوسرا مجموعہ ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' 2007ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اسی سال ہندی میں بھی یہ شائع ہوا اور 2014ء میں پاکستانی ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ اب نئی کتاب ''شگفتگی و برجستگی قلم کاروں کی'' شائع ہوئی ہے جسے دو حصے میں تقسیم کیا گیا ہے بلکہ تیسرا حصہ بھی ہے۔ پہلے حصہ میں 68 قلمکار ہیں جن کی پیدائش اور وفات کی تاریخ کے ساتھ تصویریں بھی ہیں۔ دوسرے حصہ میں 329 قلمکاروں کے لطیفے ہیں۔ اور تیسرے حصے میں 280 تصویروں سے ادیبوں کا یا قلمکاروں کا نگار خانہ ہے۔ جس میں گھر آنگن کے ساتھ پوری اردو دنیا سمٹ آئی ہے۔ ایسی کتابیں اردو میں کم شائع ہوتی ہیں۔ اس کا ہر لطیفہ اور ہر تصویر احساس کے سلونے پن سے مرصع ہے، جو الفاظ کی آگہی اور فوٹوگرافی کی عکاس ہے۔ نکھری، ستھری اور مسکراہٹ بھری یہ کتاب وسعت اور تہہ داری رکھتی ہے کہ ہر لطیفہ بے ساختہ پن سے بھرا ہوا ہے جو تہذیبی سیاق میں نیا پن لئے ہوئے ہے اور بازیافت کے پیکر کو سامنے لاتا ہے مثلاً:

☆ ''بیگم فیض ایلس کو اپنے شوہر کی سگریٹ نوشی سے بے حد چڑ تھی۔ وہ بار بار فیض کو اس بری عادت کے لئے ٹوکتی تھیں اور فیض صاحب حسب عادت مسکرا کر کہتے تھے: 'نو پرابلم'۔
ایک بار جب ایلس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اپنی بیٹی سلیمہ کو ساتھ لے کر فیض کے کمرے میں دندناتی ہوئی داخل ہوئیں جہاں فیض سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ایلس نے غصے سے پاؤں پٹخ کر فیض سے کہا 'دیکھو فیض اگر تم نے سگریٹ نوشی ترک نہ کی تو میں تم سے طلاق لے لوں گی'۔
فیض صاحب مطالعے میں مصروف تھے۔ بغیر اُدھر دیکھے مسکراتے ہوئے بولے ''نو پرابلم''۔

☆ مولانا مودودی کے جوش ملیح آبادی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ کئی روز کی غیر حاضری کے بعد ملنے آئے تو جوش صاحب نے وجہ پوچھی۔
''کیا بتاؤں جوش صاحب۔ پہلے ایک گردے میں پتھری تھی۔ اس کا آپریشن ہوا۔ اب دوسرے گردے میں پتھری ہے۔'' مولانا نے جواب دیا۔
''میں سمجھ گیا۔'' جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ''اللہ تعالیٰ آپ کو اندر سے سنگسار کر رہا ہے۔''

☆ انجمن کے زیر اہتمام چندر بھان خیال کے مجموعے کے اجراء کا پروگرام بنایا گیا۔ اس موقع پر امیر قزلباش نے

پروفیسر گوپی چند نارنگ سے اظہار خیال کی درخواست کی۔ چونکہ نارنگ صاحب اسی وقت تشریف لائے تھے اس لئے انہوں نے موقع کو ٹالنے کے لئے کہا۔ ''کیول سوری یہاں موجود ہیں لہٰذا پہلے ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔'' جب کیول سوری نے بھی آمادگی ظاہر نہ کی تو نارنگ ساقی نے جملہ کسا ''کیول سوری کہہ رہے ہیں کہ تقریر کرنے کا حق صرف پڑھے لکھے لوگوں کو ہے۔'' اس پر پروفیسر نارنگ نے برجستہ جواب دیا ''مجھے پتہ نہیں تھا کہ نارنگ ساقی بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔''

کمپوزنگ کی بعض غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً عابد رضا بیدار کو علی رضا بیدار اور عطا کاکوی کو عطا کوروی لکھا گیا ہے۔ ویسے یہ کتاب نئی ریت اور نئی ہواؤں کو بکھیرتی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

....

نام کتاب: گہرِ ادب مصنف: ڈاکٹر سرور حسین ص: 230 قیمت: 280 روپے

رابطہ: 201، شہید پیلس، سمن پورہ، پٹنہ۔800014 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر سرور حسین تازہ کار ناقد ہیں۔ ''گہرِ ادب'' میں ان کے ۱۴ تنقیدی و تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ عنوان اس طرح ہیں:

''خودنوشت سوانح عمری، اظہار ذات کا تصادم''، عصر حاضر میں فیض کی معنویت: مکتوبات فیض کے آئینے میں''، طنزیات مانپوری کی عصری معنویت''، ''اختر اورینوی کے افسانوں میں سماجی و طبقاتی شعور''، ''کلامِ عاجز کا جدلیاتی مطالعہ''، ''وہاب اشرفی کا سماجی و تہذیبی رویہ''، ''لکشمن ریکھا کے پار: ایک تہذیبی و تاریخی بحران کا منظر نامہ''، ''شمولِ جنس اور جمالیات''، ''جہد زندگانی کا شاعر: اویس احمد دوراں اور اس کی آپ بیتی''، ''احمد زین الدین کا خاکہ نگاری''، ''صلاح الدین محمد: ایک منفرد شخصیت، ایک خوش اسلوب شاعر''، ''احمد الیاس کی شاعری''، ''انسانی قدروں کا سفیر: نارنگ ساقی'' اور ''حیرت فرخ آبادی کی شاعری میں ترقی پسندی۔''

ان مضامین میں تنقید ہے، تحقیق ہے، اعتدال ہے، توازن ہے، اپنا انداز نظر ہے، مطالعہ کا استحسان ہے اور معاصر رجحانات و مسائل کی باریکی او گہرائی ہے۔ ادبی تناظر کی یہ قطبیت بھٹ کے حوالے سامنے لاتی ہے اور نئے پس منظر کو پیش کرتی ہے۔ خودنوشت سوانح عمری پر تفصیل سے لکھتے ہوئے سرور حسین نے شعوری جواز پیش کیا ہے اور زندگی کے ہر عمل کو تجربات کی کسوٹی پر حقیقت اور اصلیت کے ساتھ نئی صورت عطا کرنے کی کوشش کی ہے اور وجود کی تلاش کے تجسس کو عمل اور ردعمل کی مثال سے محسوس کرایا ہے۔ ان کا ماننا ہے:

> ''خودنوشت سوانح نگاری صاحب سوانح کے باطن سے آگاہی کا عمل ہے جو اپنے اظہار میں بلاواسطہ اور سیدھا ہوتے ہوئے بھی انتہائی پیچیدہ ہوتا ہے۔ خودنوشت سوانح نگار حیات و کائنات کے ہر مظہر کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی وہی دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ انسان کی داخلی و خارجی زندگی متضاد کیفیات و حالات کا مجموعہ ہوتی ہے لہٰذا اس کی زندگی میں پیش آنے والے یہ کیفیات و حالات اس کے شعور کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔''

فرد کے حرکات وعمل پر سرور حسین کی نگاہ دوررس بنتی ہے اسی لئے ادبی فن کار پر ان کی بصیرت افروزی مثبت اثرات سامنے لاتی ہے اور وضاحت کے عمل سے گذرتی ہے۔فیض کے خطوط کی روشنی میں ان کی شخصیت کے ظاہری، نقوش کو جس طرح سرور حسین نے احساسات کا گواہ بنایا ہے اس سے درد، مصیبت، جدوجہد، کشا کش، عظمت، بلندی، ہمت، یقین، نیکی، انسان دوستی اور شب و روز کا ردعمل صورت پذیر ہوتا ہے۔ سامراجی نظام کا بحران، اقتدار کی سازش، سماجی استحصال، آزادی اور جمہوریت کے تلخ حقائق سبھی کچھ سامنے آتے ہیں اور صورت حال کی دوررسی پر نگاہ ٹکتی ہے اور اتحاد وہم آہنگی کا مظہر بنتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ان کی شاعری کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کے جو پہلو چھن کر ہمارے سامنے آتے رہے ہیں وہ انہیں ایک وطن پرست، مجاہد آزادی، اعلیٰ وارفع انسانی وجمہوری قدروں کا نقیب اور ایک انتہائی درد مند انسان کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔لیکن ان کی شخصیت کی یہ تصویر ان کے فکری ونظری ابعاد کو جس قدر روشن کرکے ہمارے مطالعہ میں لاتی ہے اتنا ہی ان کے باطن کے عملی رویے اور سروکاروں کی تلاش کی ہماری طلب کو بھی بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہے......تاہم ان کے خطوط کا مجموعہ ''صلیبیں مرے دریچے میں'' اس کارہائے نمایاں کو انجام دینے میں جتنا مؤثر نظر آتا ہے وہ بجاطور پر توجہ کا مستحق ہے۔''

دیگر مضامین میں بھی سرور حسین کے متجسس تنقیدی ذہن کو دیکھا جاسکتا ہے۔

....

نام کتاب: ہاتھ نہ جل جائے شاعر: فراغ روہوی ص:169 قیمت:107 روپے

رابطہ: 67، مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ اسٹریٹ)، کولکاتا-73 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

فراغ روہوی تازہ دم شاعر ہیں اور سبھی طرح کی صنف سخن پر قدرت رکھتے ہیں۔غزل، نظم، حمد، نعت، ماہیا، رباعی، دوہا، کہہ مکرنی اور بچوں کی شاعری پر ان کی کتابیں قبل منظر عام پر آچکی تھیں۔اب ''ہاتھ نہ جل جائے'' کے نام سے ہائیکو کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ہیئت کے لحاظ سے یہ تین مصرعے کی شاعری ہے۔لیکن اس میں 5، 7، 5 کا سلیبل ہوتا ہے۔اس کے لئے پسندیدہ ارکان فعلن فعلن فع، فعلن فعلن فعلن فع، فعلن فعلن فع اور فعلن فعلن فع، فعلن فعلن فعلن فاع، فعلن فعلن فاع ہیں۔ جاپانی کی شرائط ہیں جنہیں اردو والوں نے اپنایا ہے اور مرغوب بنایا ہے۔ان میں فراغ روہوی بھی ہیں۔تقریباً پانچ سو ہائیکو کا ان کا یہ مجموعہ تخلیقی فکر و عمل کا حصہ بنا ہے جس میں تکنیک اور فارم کے ساتھ موضوعات کا تنوع ہے۔فطرت، موسم، رشتے کی بے ثباتی، تہذیبی قدروں کا گم ہونا، ماں کی عظمت، فرد کی تنہائی، آس پاس کا المیہ، شناخت کی بے یقینی وغیرہ نظریے پر ان کے ہائیکو کی کائنات ان کے رویئے کی پہچان ہیں۔فراغ روہوی نے جدید حسیت کو اپنایا ہے اور سبک بار مزاج وآہنگ کو اختیار کیا ہے۔سلاست اور روانی سے کام لے کر مواد کو خود میں جذب کیا ہے اور آہنگ کی دھمک کو نامیاتی بنایا ہے:

چڑیوں کو چہکار/تو نے ہی بخشی یا رب/پھولوں کو مہکار (حمد)
اے طیبہ کے چاند/پھول، شفق، خورشید، قمر/تیرے آگے ماند (نعت)
تم پر سب کو ناز/ولیوں کے سردار تمہیں/تم ہی غریب نواز (منقبت)
کہاں بچا ہوں میں/اپنے آپ کو قسطوں میں/بانٹ چکا ہوں میں
گھر کیا، دفتر میں/ہم تو ڈوبے رہتے ہیں/سوچ سمندر میں

فراغ روہوی کے ہائیکو میں ظاہر کی آنکھ اور باطن کے محسوسات کو دیکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے اشیا اور مظاہر سے رشتہ استوار کر کے ہائیکو کہے ہیں اور امکانات کی دنیا آباد کی ہے۔ان ہائیکو میں تشنۂ تکمیل ہے۔الفاظ کا آہنگ ہے اور بصری تمثیلیں ہیں۔یہ فنکارانہ بصیرت ہی ہے کہ فراغ روہوی صورت حال کو منکشف کرنے کے لئے مترادفات کے ڈھیر نہیں لگاتے بلکہ امیج کو رقیق بنا کر پیش کرتے ہیں۔اسی لئے احساس کا رخش عجز اظہار کی آواز بنتا ہے اور جذبات کو استعارہ عطا کرتا ہے۔

فراغ روہوی کے ہائیکو کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں صوتی مد جزر احساس کو متشکل کرتا ہے عبا و قبا پر گلِ لالہ آراستہ کرتا ہے اور ہجوم گل و رنگ کے منظروں کو پیش کرتا ہے جس کے جلوے نئی داستان لکھتے ہیں اور جو قابلِ ذکر اہمیت کے حامل ہیں۔کیونکہ ان میں تخلیقی کلبلاہٹ ہے اور شعری ہنر کی گہری آشنائی ہے۔فراغ روہوی نے ہائیکو کی نئی تہہ کے گہرے پانی میں غوطہ لگا کر موتی تلاشنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

....

نام کتاب: کاسۂ شب شاعر: سید احمد شمیم ص: 288 قیمت: 400 روپئے رابطہ: بیت الشرف، روڈ نمبر 18، پروفیسرس کالونی، آزاد نگر، مانگو، جمشید پور–832110 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

سید احمد شمیم کے فکری کینوس میں روحِ عصر ہے۔تہذیبی و سماجی عوامل ہیں اور ادراک کے مرحلے کی آئینہ داری ہے، گرم خیالات کی جولانی کی وجہ سے ان کی نظمیں، غزلیں عمیق اور بامعنی ہو کر استقامت فکر و فن کا نتیجہ بنتی رہی ہیں۔ انہوں نے پورے شعور اور کامل ریاضت فن کے ساتھ شاعرانہ لَے کو شعریت و لطافت کے تابع رکھا ہے اور کسی بھی نظریہ کو لادنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے خیال و فکر اور نظریئے کے قائل رہے ہیں۔ساتھ ہی داخلیت کی مہر ثبت کی ہے۔

سید احمد شمیم اپنے مخصوص اسٹریچنگ کے عمل کو بروئے کار لا کر شعری مواد کو منقلب کرتے ہیں۔نظم اور غزل کی اکائی پر منتج ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔نامیاتی آہنگ پر بھی ان کا اہتمام نمودار ہوتا ہے اور احساس کے مد و جزر کے مطابق قرأت آئینہ بنتی ہے۔چند غزلیہ اشعار دیکھیں:

آگ ہے آگ، ذرا ہاتھ بچا کر رکھنا — دیکھنے میں تو بدن پھول سا نازک کومل
شائستگی کا چیر کے رویا نہ جا سکا — چپ چاپ دل کی آگ بدن کو گلا نہ دے
خوشبو، شراب، پھول، ہوا، زرد نرم دھوپ — موسم بھی کتنے خواب دکھا کر بدل گیا

قطرہ قطرہ لمس کی لذت رگوں میں تیرتی ریشہ ریشہ تن بدن میں سانپ جیسے رینگتے
جلتا بجھتا پیلا سورج، پھٹتی بدلی، قوسِ قزح ساون کی سندھیا، ست رنگا ڈالے ایک دوپٹہ ہے

سید احمد شمیم جن ارتسامات کو خارج سے اخذ کرتے ہیں انہیں نئے تصورات میں ڈھالتے ہیں۔ اسی لئے ان کا اظہار مکمل اور حسین ہے۔ دراصل فن اپنی نوعیت کے اعتبار سے مکمل اظہار ذات ہے۔ ہماری جبلتیں اور حواس مختلف تاثرات شعوری سطح پر آ کر احساسِ خودی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی سے وجدان کی تشکیل ہوتی ہے۔ کوئی تاثر اگر وجدان کو مکمل طور پر متاثر نہ کر سکے تو اس کا اظہار بھی تشنہ رہ جاتا ہے۔ سید احمد شمیم عرضی لحات کو جاوداں بنانا جانتے ہیں۔ وہ احساس، تمنا، جذبہ، تاثر کی لہروں کو شعر بند کرتے ہیں اور بازآفرینی کی ابدیت بخشتے ہیں۔ ان کی نظموں میں تخلیقی اور جمالیاتی کے ساتھ سماجی اصلیت کا عکس دیکھا جا سکتا ہے:

مجھ پہ اتنی خزاؤں نے/ سفر کیا ہے/ کہ میری آنکھوں سے بھاری خواب/ کھو چکے ہیں/ اور اب میری آنکھیں بند ہوتی ہیں/ تو میں خود کو/ بیکراں بھیانک سناٹے کے صحرا میں پاتا ہوں/ ایک ناگن میرا پیچھا کرتی ہے/ اور مجھے اپنی سخت/ زہریلی پکڑ میں جکڑ لیتی ہے/ میں درد اور دہشت سے/ چیخ اٹھتا ہوں/ اور تب دن کا زرد مدقوق سورج/ دانت نکوس رہا ہوتا ہے! (صبح ہونے کے بعد)

سید احمد شمیم کی بیشتر نظمیں ارتقائی شکل اختیار کر کے احساسات، تاثرات، جذبات اور فکر و عقل کی کارفرمائی سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ایک اور نظم دیکھئے:

خواب کے جزیروں کی/ سیم گوں فضاؤں میں/ نقرئی رداؤں میں/ چاند کی فشاطہ/ گنگناتی جاتی ہے/ اور عروسِ گیتی کے/ حسن روح پرور کو/ جگمگاتی جاتی ہے/ رات خواب زاروں کی/ ان حسیں ستاروں کی/ کیف زا نظاروں کی/ زرنگار ہے لیکن/ میرے دل کی گرمی سے/ چاند بھی تپیدہ ہے/ روح آبدیدہ ہے! (مہ تپیدہ)

خوش رنگ دھنک کی کسک کی بھرپور دھوپ کی چاندنی بکھیرتی سید احمد شمیم کی غزلیں اور نظمیں جذب کی زبان بن کر ترجمانی کرتی ہیں۔ اور اسی میں ان کی انفرادیت ہے۔

....

نام کتاب: انعکاس قلم مصنف: انوار الحسن وسطوی ص: 246 قیمت: 250 روپے

رابطہ: حسن منزل، آشیانہ کالونی، روڈ نمبر: 6، حاجی پور - 844101 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

انوار الحسن وسطوی کی یہ ساتویں کتاب ہے جس میں ان کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین چار حصے میں منقسم ہیں۔ ''ذکر قائماں'' کے تحت نجم الہدیٰ، علیم اللہ حالی، عبدالمنان طرزی، ایم اعجاز علی، سید محمد اشرف فرید، ممتاز احمد خاں، ریحان غنی، ثناء الہدیٰ قاسمی اور منصور خوشتر پر مضامین ہیں۔ ''یادِ رفتگاں'' کے عنوان سے خلیق انجم، سید عبدالرافع، سید محمد اجمل فرید، ثوبان فاروقی اور ناصر رضا خاں جلالی پر یادوں کے چراغ روشن کئے گئے ہیں۔ ''مسائل اردو'' کی سرخی سے اردو تحریک کو عالمی تناظر میں جانچا گیا ہے۔ بہار میں اردو صحافت کو ماضی و حال کے آئینے میں پرکھا گیا ہے اور اردو سے نئی نسل کی دوری کو بنیاد بنا کر مضمون سے لسانی نسل کشی کا انعکاس سامنے آتا ہے

اور محاسبہ کی دعوت دیتا ہے۔ ''تبصرے'' کے عنوان سے متین عمادی، مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالصمد، منصور احمد اعجازی، ممتاز احمد خاں، وسیم احمد، حسن رہبر، بدر محمدی، تمثیل احمد، رضوان احمد ندوی، محمد عالم قاسمی، مشتاق احمد مشتاق اور سید مصباح الدین احمد کی کتابوں پر تبصرے ہیں۔

انوارالحسن وسطوی نے فن اور ادب کی ماہیت پر کتابوں کی روشنی میں بحث کی ہے اور تحقیقی اور مطالعاتی درجہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وحدت مکاں، وحدت زماں اور وحدت عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے وحدت تاثر کے امتزاج کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ ادب اور فن کے نظریات سے بحث ہے جو احساس کے تابع ہیں۔ ملک گیر سطح پر اردو تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے انوارالحسن وسطوی نے 1998ء میں قائم شدہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نئے امکانات پر اس طرح توجہ مبذول کرائی ہے:

''یہ یونیورسٹی اپنے منشور کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم کے توسط سے اعلیٰ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی اور روایتی و فاصلاتی دونوں طریقوں سے چلائے جانے والے تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ اردو کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کامیابی ملک گیر سطح کی اردو تحریک کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔

صوبہ بہار میں ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے 2016ء سے بہار کے تمام 38 اضلاع میں فروغ اردو سیمینار، مشاعرے اور طلبہ و طالبات کے درمیان تقریری مقابلے کا انعقاد کرایا جا رہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہار کے تمام اضلاع میں ایسے پروگراموں کا انعقاد ہونے سے بہار کی اردو تحریک ایک بار پھر زندہ ہوگئی ہے۔''

اردو زبان ہماری علمی، دینی اور ثقافتی سرمایہ ہے۔ لیکن آج اردو سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے اور ہم خود کو اردو سے دور کرتے جا رہے ہیں۔ اردو کو عوام اور خواص کے درمیان زندہ رکھنے کے لئے انوارالحسن وسطوی فکرمند ہیں اور مشورہ دیتے ہیں:

''اردو ہمارے گھروں میں زندہ رہے، اس کے لئے ہمیں اس سے اٹوٹ رشتہ قائم کرنا ہوگا کیونکہ یہ ہماری مادری اور تہذیبی زبان کے ساتھ ساتھ ہماری مذہبی زبان بھی ہے۔ مذہب اسلام کی بیشتر کتابیں اسی زبان میں محفوظ ہیں جن سے ہم اور بے شمار لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر لوگ جنہوں نے عربی نہیں پڑھی ہے اردو کے ذریعہ مذہب اسلام کو جانا اور سمجھا ہے۔ اس لئے اس کے فروغ اور اس کے تحفظ کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔''

انوارالحسن وسطوی کی تنقید کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں احساسات کی عکاسی کے ساتھ قاری کو اپنا ہم فکر اور ہم خیال بنانے کی عصری حسیت کی ترجمانی ملتی ہے۔ معنویت کو دعوت دیتی ہوئی ان کی تنقید میں وضاحت کی انفرادیت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے اور زبان کی شناخت اور بقا کی رہنمائی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

....

نام کتاب: آئینے تحریر کے مصنف: محسن باعشن حسرت ص: 160 قیمت: 120 روپئے
رابطہ: 4، پرنسپ اسٹریٹ، پہلی منزل، کولکاتا-700072 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

محسن باعشن حسرت بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن انہوں نے وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین لکھے ہیں، جس کا تعلق تاثراتی تنقید سے ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع شدہ پیش نظر مضامین کے مجموعہ میں درج ذیل تحریر کا آئینہ متوجہ کرتا ہے:

شاہ مقبول احمد: ایک تاثر، سالک لکھنوی: شخصیت اور شاعری، وکیل اختر: اپنے عہد کا کامیاب شاعر، محمد ایوب بیامی: تعارف، شخصیت اور شاعری، یوسف تقی: بحیثیت مجاہد قلم، مغموم کلکتوی: ایک منفرد شاعر، احمد رئیس: چند یادیں چند باتیں، آسمان شعر و ادب کا ایک درخشندہ ستارہ: فراغ روہوی، احمد کمال حشمی: ایک خوش فکر اور معتبر شاعر، علیم الدین علیم اور ان کا شاعرانہ مزاج، نوشاد مومن اور ادب بنگالہ، بچوں کے کل وقتی شاعر: حشمت کمال پاشا، ادب اطفال اور گیت کار کے خالق محمد افضل خاں، احساس کا سفر کا شاعر خالد رحیم، ادب اطفال اور عبدالرحیم نشتر، اظہر نیر اور ان کی غزلیہ شاعری، محمود عالم قاسمی یادوں کی دہلیز پر، ادب اطفال اکیسویں صدی کے تناظر میں، 1980ء کے بعد کی شاعری اور چند اہم شعراء، چند باتیں مضمون نگاری سے متعلق۔

درج بالا مضامین کا بیشتر حصہ بلکہ 99 فیصد شاعر اور شاعری سے متعلق ہے۔ محسن باعشن حسرت نے احساس، جذبہ، محاکات اور تاثیر پر توجہ دے کر شعری تخلیقات کا جائزہ لیا ہے جس میں روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت سے متاثر شعرا شامل ہیں۔ عصری میلانات کے پیش نظر جدید تصور پر انہوں نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ارتقائی انداز اور سلیقہ و شائستگی کی حدود میں رہ کر اقدار پر شاعری کی نیرنگی پر اور عجز و نیاز پر اپنا مطالعہ پیش کیا ہے۔ شاہ مقبول احمد مولانا آزاد کالج میں صدر شعبہ تھے ان کے پڑھانے کے انداز پر محسن باعشن حسرت اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ان کے پڑھانے کا طریقہ نہایت ہی دل پذیر ہوا کرتا تھا۔ ہر طالب علم ان سے متاثر تھا۔ پڑھاتے وقت وہ بالکل سنجیدہ ہو جاتے تھے اور جب وہ سمجھاتے تھے تو ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی عمیق سمندر میں غوطہ لگا چکے ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ ہمارے ذہن میں نقش ہو جایا کرتا تھا اور ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سمندر سے باہر آ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے لعل و جواہر لٹا رہے ہیں اور ہم سبھی طالب علم ان خزانوں کو بٹور رہے ہیں۔''

پدم شری سالک لکھنوی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ اس سے قبل وہ کانگریس پارٹی میں شامل تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے محسن باعشن حسرت بتاتے ہیں:

> ''سالک صاحب کا اصل نام شوکت ریاض کپور ہے۔ ان کے والد صاحب نے جو لکھنؤ (یوپی) کے ہندو برادری سے تعلق رکھتے تھے، 1909ء میں اسلام مذہب قبول کرلیا۔ پہلے ان کا نام تلسی رام کپور تھا۔ بعد میں طارق ریاض کپور ہو گئے۔ سالک صاحب کی پیدائش 16/ دسمبر 1913ء کو لکھنؤ (اتر پردیش) میں ہوئی۔ بی اے (سینٹ زیویرس کالج) کلکتہ، بی کام (سٹی کالج) کلکتہ اور دبیر کامل

فارسی (لکھنؤ یونیورسٹی) لکھنؤ سے کیا۔''

محسن باعشن حسرت زمینی طہارت کو اپنی تنقید میں برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس میں انداز بیان اور اسالیب کو اولیت حاصل ہے۔ واضح رائے زنی سے تحریر کی دھار تیزی سے کروٹیں لیتی ہے اور صحیح تصویر کو ابھارتی ہے۔ لیکن ان کی تنقید کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انہوں نے خود کو مغربی بنگال تک محدود کر رکھا ہے۔ اس کتاب میں شامل تین چار مضامین کو چھوڑ کر سبھی مغربی بنگال کے شاعروں پر ہیں۔ دو ایک عنوان توجہ کھینچتے ہیں لیکن وہاں بھی صرف مغربی بنگال ہے۔ ''1980ء کے بعد کی شاعری اور چند اہم شعراء''، ''ادب اطفال: اکیسویں صدی کے تناظر میں''، ''چند باتیں مضمون نگار سے متعلق'' وغیرہ میں مغربی بنگال کے ہی شعراء نظر آتے ہیں۔ اس طرح ایسے مضامین کا کینوس محدود ہو جاتا ہے۔

....

کتاب: ''اوراقِ غزل'' شاعر: ڈاکٹر احسان عالم ص: ۱۷۶ قیمت: ۲۵۰/روپے
رابطہ: گلیکسی کمپیوٹرس، محلہ رحم خاں، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ (بہار) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر احسان عالم تیز رفتار قلم کار ہیں۔ وہ وقت کو اپنے شکنجے میں لیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دھڑا دھڑ کتابیں لکھ رہے ہیں، مضامین سپردِ قلم کر رہے ہیں اور شاعری کو نئی جہت عطا کر رہے ہیں۔ اور شاعری بھی ایسی کہ روایت اور وراثت کا احساس نمایاں نظر آئے جس میں ماضی کی نغمگی دیکھی جا سکتی ہے اور مستقبل کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ''اوراقِ غزل'' احسان عالم کی غزلوں، تین چار نظموں اور چند شخصیاتی منظوم تخلیق کا مجموعہ ہے۔ اپنی تصنیف و تالیف سے آگاہی وہ اس طرح پہنچاتے ہیں:

> ''میرا تعلق سائنس سے رہا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں اردو سے ایم اے کرنے کے بعد ۲۰۱۳ء میں اپنا رجسٹریشن پی ایچ ڈی کے لیے کرایا۔ اس کے بعد اردو لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۲۰۱۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس کے بعد میری تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب تک میری پندرہ نثری کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں زیادہ تر تصانیف اور چند ترتیب بھی ہیں۔''

سولہویں کتاب ان کا شعری مجموعہ ہے۔ ان کی بیشتر غزلوں اور نظموں میں نئے نئے الفاظ ملتے ہیں اور پرانے الفاظ کو نئے معانی بھی دیے گئے ہیں۔ احسان عالم نے مخصوص انداز میں دلچسپ اور نیا لطف پیدا کیا ہے۔ بدلتی قدریں ان کی سوچ میں شامل رہی ہیں اور پر آشوب طرزِ زندگی کو بھی انھوں نے نئی پہچان دینے کی کوشش کی ہے۔ تشکیل و تعمیر کا جذبہ بھی ان کے یہاں اپنی توجہ کھینچتا ہے۔ جدید عصری تقاضے کے کلیش سے بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں اور تجربے اور مشاہدے کو اپنے مطالعے سے روشنی عطا کر کے منظر نامہ کو نیا روپ بخشتے ہیں:

میں آدابِ محبت جانتا ہوں — جفاؤں پر بھی پابندِ وفا ہوں
میں نے یوں ہی نہیں پائی ہے یقیں کی دولت — کتنے اصنامِ یقیں طاقِ گماں تک پہنچے
ہم میں استکبار جو پیدا کرے — علم یا وہ آگہی اچھی نہیں

کوئی جھک کر اگر تم سے ملا ہے　　یقیناً تم سے وہ قد میں بڑا ہے
جہاں پر سودے بازی روز و شب ہوتی ضمیروں کی　　سیاست کی ہی وہ کوئی گلی معلوم ہوتی ہے

احسان عالم بکھراؤ کے اکیسویں صدی کے عہد میں پہچان کو زندہ رکھتے ہوئے دردمندی کو سرگرم عمل بنائے رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور مضبوط پہچان کو فکری پیراہن بخشتے ہوئے رچی بسی شعوری بیداری کی جامع عکس کشی کرتے ہیں۔عبدالمنان طرزی، رفیع الدین راز، آفتاب اشرف، انور آفاقی، منصور خوشتر اور مشتاق دربھنگوی پر ان کی شخصیت شناسی نظمیں، تصویروں، لکیروں اور رنگوں کے حقیقی خاکے ہیں۔ان میں جذباتی کیفیت کے ساتھ دل کے آئینے بھی ہیں۔

محسوسات کی عمیق گہرائیوں سے بھری احسان عالم کی غزلیں، نظمیں، الفاظ کی صورت کو متحرک کرتی ہیں اور ذہانت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

....

نام رسالہ: خدابخش لائبریری جرنل ایڈیٹر: شائستہ بیدار ص: اردو-209، ہندی-61، انگریزی-14
قیمت: 400 روپے رابطہ: خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ-800004 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر عابد رضا بیدار جب خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر تھے تو انہوں نے خدابخش لائبریری کو وہ رنگ، روپ اور انتظامی امور سے مالامال ترسیلی عمل بنایا تھا جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔انہوں نے پوری دنیا سے مخطوطات کا ایسا ذخیرہ لاکر اس لائبریری کو اتنا جاندار اور شاندار بنایا کہ اب باہر کے ممالک تک جانے کی ضرورت نہیں تھی، دستیاب مواد سے یہیں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بیدار صاحب نے ''خدابخش لائبریری جرنل'' کی روح میں ایسی جان پھونکی کہ یہ رسالہ تحقیقی مضامین کا نشانِ امتیاز بن گیا۔انسلاکیت اور تلازمیت کے میلان سے بھرپور اس رسالے کو ہر حال میں بالادستی حاصل تھی۔لیکن بیدار صاحب کے جانے کے بعد لائبریری ماضی کی طرف لوٹنے لگی جس کا اثر ''جرنل'' پر بھی پڑا۔

اسے اتفاق کہئے کہ تقریباً چار دہائی بعد خدابخش لائبریری کی ڈائرکٹر ان کی صاحبزادی ڈاکٹر شائستہ بیدار بن کر آئیں اور انہوں نے اپنے تجربے سے لائبریری کو ازسرِنو وہ مقام دلانے کی کوشش کی ہے جو ان کے والد کے زمانے میں تھی۔ڈاکٹر شائستہ نے ''جرنل'' کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے اور 2015ء سے التوا میں پڑے اس رسالے کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی کوشش کی ہے اور شمارہ نمبر 179 سے 182، 183 سے 186، 187 سے 190، 190 سے 194، 195 سے 196 اور 197 سے 198 شائع کر کے کارکردگی کو نئی پہچان دی ہے۔میں شمارہ نمبر 98-197 کو مطالعہ میں لے رہا ہوں۔ یہ شمارہ دسمبر 2019 کا ہے۔اداریہ میں ڈاکٹر شائستہ لکھتی ہیں:

''لائبریری کا ایک سہ ماہی جرنل جو مرحوم قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی میں 1977ء سے نکلنا شروع ہوا، 2014ء میں پچھلی سیریز کا آخری شمارہ نکلا، جو پورے ایک سال کے چار شماروں کی جگہ سال میں ایک شمارہ کے حساب سے شائع ہوا۔''

پیش نظر شمارہ میں پہلا مضمون بلکہ سفرنامہ آفتاب حسن کا ''پٹنہ' یورپ میں (1930ء کی دہائی کا ایک سفرنامہ) صفحہ 1 سے 130 تک محیط ہے۔ آفتاب حسن کون تھے اس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ ادارہ کی طرف سے تین صفحہ کے ''پیش گفتار'' سے بھی اس کا علم نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ جانکاری ملتی ہے کہ آفتاب حسن کا لکھا ہوا شاہ جعفر اور ان کے دوسرے احباب کا مشترکہ سفرنامۂ یورپ ہے۔ شاہ جعفر فرزند نواب سید واجد حسین، پٹنہ کے اکابر میں تھے۔ وہ چند احباب کے ساتھ لندن گئے۔ وہاں سے فرانس اور جرمنی گھومتے گھامتے پٹنہ واپس لوٹے۔ ان کے سفرنامہ کو لکھنے والے آفتاب حسن غالباً پٹنہ کے ہی تھے۔ ان کی یہ تحریر ''ندیم'' گیا میں مارچ 1935ء تا 1938ء شائع ہوئی۔ بھولی بسری اس تحریر کو 'ندیم' سے خدابخش جرنل میں شائع کر کے گمشدہ کو نئی پہچان دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر جمشید قمر کا 'اردو غزل 1900-1955ء کی درمیانی مدت میں' کے عنوان سے ہے۔ منتخب اشعار کے حوالے سے جمشید قمر نے بات کی ہے جس میں امیر مینائی اور داغ وغیرہ کے اشعار دیئے گئے ہیں۔ جبکہ امیر مینائی کی وفات 1900ء میں اور داغ کی 1905ء میں ہو چکی تھی۔ اشعار کے صرف نمونے دیئے گئے ہیں ان کی خوبیوں سے یا خامیوں سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ صفدر امام قادری کا مضمون ''صوفیہ اور بھکتی تحریک کے ادبی اثرات'' لسانی مطالعہ ہے۔ 12 صفحہ کے اس مضمون میں اردو کے 26، انگریزی کے 20 اور ہندی کے 28 حوالے ہیں۔ اس شمارہ کا اہم حصہ 1958ء سے اپریل 1974ء کے عرصے میں اکابر کے ناموں کا اشاریہ ہے جن کی اس عرصہ میں وفات ہوئی تھی۔ سکھ مسلم رشتے پر بھی مضمون اہم ہے۔ اور جواہر لال نہرو کا مضمون دنکر کی ایک کتاب پر ہے۔ ہندی کا حصہ اہم ہے۔ انگریزی حصہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

....

نام کتاب: کلیم عاجز مصنف: ڈاکٹر اسلم جاوداں ص: 136 قیمت: درج نہیں ہے رابطہ: اردو ڈائرکٹوریٹ، C- بلاک، III آفیسرز فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ- 800001 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر اسلم جاوداں فعال شخصیت کا نام ہے۔ ادبی، فکری اور علمی رجحانات سے واقف ہیں اور اردو کے لئے جیتے ہیں۔ اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار سے وابستہ ہیں۔ اس ڈائرکٹوریٹ کے سابق ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر انہوں نے اردو کی ترقی کے لئے بہت کام کیا ہے جس کے اثرات ہر ضلع میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک بڑا کام اس ادارے نے مونوگراف تیار کرنے کا لیا ہے۔ یہ بیک وقت دس کتابیں ''فرد نامہ'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہیں۔ ان میں ایک کتاب کلیم عاجز پر بھی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں کبھی کلیم عاجز سے بے حد قریب رہے ہیں۔ اس لئے ظاہر و باطن سے ان کی واقفیت زیادہ رہی ہے۔ کلیم عاجز اپنے طرز کے متوجہ کرنے والے شاعر تھے۔ تخلیقیت سے بھرپور تعبیر کے امکانات سے آراستہ اور مشترک تہذیب کو وجود کا لمحہ عطا کرنے والی شخصیت تھے۔ اسلم جاوداں نے اپنی کتاب کو 14 / ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ''کلیم عاجز کا شجری نسب وحسب'' کلیم عاجز: تاریخ کے آئینے میں (پیدائش سے لے کر 15 / فروری 2015ء تک)، ابتدائی حالات زندگی، شاعری کی ابتدا، شاعری کا محرک و آغاز، کلیم عاجز اور مشاعرہ، وہ جو شاعری کا سبب ہوا: ایک مختصر تعارف، جب فصل بہاراں

آئی تھی: ایک مختصر تعارف، ہاں چھیڑو غزل عاجز، نثری تصانیف کا مختصر تعارف، کلیم عاجز کی نثر میں بولیوں کا استعمال اور انتخاب کلام عاجز۔''

اس کتاب کا پیش لفظ امتیاز احمد کریمی نے لکھا ہے۔ یہاں چند جملے درج کر رہا ہوں:

''تحریر ہو یا تقریر، ادارت ہو ترتیب و تہذیب یا انتظامی نظم و ضبط، ہر میدان میں ڈاکٹر اسلم جاوداں اپنا نقش ثبت کرتے ہیں۔ کلیم عاجز کے شعری مجموعے ''جب فصل بہاراں آئی تھی'' اور ''ہاں چھیڑو غزل عاجز'' کو ترتیب دینے کا شرف بھی انہیں حاصل رہا ہے۔ انہوں نے کلیم عاجز کی شخصیت اور ادبی خدمات پر باضابطہ تحقیقی کام بھی کیا جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی— کلیم عاجز کی شاعری کا حقیقی آغاز 1947ء سے ہوا اور ان کے شاعری میں اسیر ہونے کا بنیادی سبب 1946ء کا وہ فرقہ وارانہ فساد تھا جس میں ان کی والدہ اور چھوٹی بہن شہید ہو گئی تھیں— کلیم عاجز نے بہت ساری شخصیاتی نظمیں، نعت، رباعیاں، قطعات اور سہرے لکھے ہیں۔''

اسلم جاوداں نے ماہر لسانیات کی طرح کلیم عاجز کی شاعری اور ان کی نثری تصانیف کا جائزہ لیا ہے جو دلائل کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔ انہوں نے اضافیت کے نظریہ سے کام لے کر قواعد کے تناظر کا تعین کیا ہے جس میں زبان کی کائناتی طاقت ہوتی ہے۔ مثلاً اسلم جاوداں نے کلیم عاجز کے نثری اسلوب کو دریافت کرنے کے لئے ''بے ساختگی اور بے تکلفی'' خاص لفظوں کا استعمال، مرادفات کی موزونی، مقفّیٰ اور مسجع عبارت، مرقع نگاری'' جیسے عنوان کے تحت بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کی نثر میں حسن، دل سوزی، جاں گدازی، دل گرفتگی، بے تکلفی، مرقع کشی اور جذبات نگاری جیسی کیفیت نیا ذائقہ دیتی ہے۔ اسی طرح کلیم عاجز کی غزلوں کو تاریخ کے ''معمہ'' کے حوالے سے جانچا پرکھا ہے۔ اور مشاہدے اور تجربے کی ظہور پذیری کو تسلسل کے پس منظر میں نئے معانی سے آشنا کرایا ہے۔ اسی طرح شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلم جاوداں نے اہم اور بامعنی نکتے پر توجہ دی ہے۔ تحقیق، نشانیات، اشارے اور قوانینِ لغت کے حوالے سے یہ کتاب کلیم عاجز شناسی میں اہمیت کی حامل ہے۔

....

نام کتاب: عبدالمغنی مصنف: ڈاکٹر ریحان غنی ص: 88 قیمت: درج نہیں ہے رابطہ: اردو ڈائرکٹوریٹ، C-بلاک، III آفیسرز فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ-800001 مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار نے مونوگراف چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ بہار کے مشاہیر ادب کی خدمات سامنے آسکیں اور نئی نسل کو ان کی شناخت اور دریافت میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ اسی سلسلے کی ان کی شناخت اور دریافت میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ اسی سلسلے کی کتاب ڈاکٹر ریحان غنی نے پروفیسر عبدالمغنی پر لکھی ہے۔ عبدالمغنی انگریزی کے پروفیسر تھے لیکن اردو کے مردِ مجاہد تھے۔ ساری زندگی اردو کے لئے سینہ سپر رہے اور اس کا حق دلوانے میں کامیابی حاصل کرتے رہے لیکن اسی کے ساتھ وہ ناقد تھے اور صحافی بھی تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ رہا۔ اور کئی نسل کی ذہنی آبیاری کرتے رہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کا نظریہ واضح تھا۔ وہ اردو کی حیات اور توسیع چاہتے تھے اور

اسلامی ادب کے افقی جہت کو زمانی جہت میں تصور کرتے تھے۔ وقت کا تسلسل انہیں قوت دیتا تھا اور ادب کے حوالے سے صوبیے، لفظیے اور کلمے مختلف سطح پر انہیں کلی عمل آوری میں مددگار تھے بلکہ بنیادی کردار ادا کرنے میں معاون تھے۔

ڈاکٹر ریحان غنی بزرگ صحافی ہیں، دیدہ ور صحافی ہیں اور نکتہ شناس صحافی ہیں۔ چالیس سالہ تجربہ ان کے عمل کی تلاش ہے۔ وہ اردو تحریک سے وابستہ رہے اور پروفیسر عبدالمغنی کے ہم قدم بھی رہے۔ انہوں نے پروفیسر عبدالمغنی کو قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ پیش نظر ان کی کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے۔ ''پروفیسر عبدالمغنی: ایک تعارف''، پروفیسر عبدالمغنی دو تحریکات کے آئینے میں'' بہار میں اردو تحریک اور پروفیسر عبدالمغنی، اردو تنقید اور پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر عبدالمغنی کے اداریے: ایک جائزہ'' پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے'' مختلف شخصیات پر پروفیسر عبدالمغنی کی تحریریں'' پروفیسر عبدالمغنی کی منتخب تحریریں'' شبلی کے کمال کا تدارک و تردید، پروفیسر عبدالمغنی کا آخری یادگار انٹرویو''۔

ڈاکٹر ریحان غنی نے طبعی سائنسی انداز میں عبدالمغنی کے ادبی بنیادی رشتے پر روشنی ڈالی ہے اور کئی جہات کے انسلاک سے کام لے کر افقی اور عمودی کارنامے کو اجاگر کیا ہے۔ خاص کر'' بہار میں اردو تحریک اور پروفیسر عبدالمغنی'' بے حد معلوماتی باب ہے۔ اس میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان سے آج کا قاری ناواقف ہے کہ بہار میں اردو کا بیج 1938ء میں بویا گیا۔ بہار میں اردو تحریک کی تاریخ راجندر پرساد اور عبدالحق سے جڑی ہوئی ہے۔ 26 جنوری 1950ء کو ملک میں جو دستور نافذ ہوا اس کی رو سے ہندی بہ خط دیوناگری ہندوستان کی قومی زبان قرار دی گئی۔ خاص بات یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے صدر راجندر پرساد ہی تھے۔ 1951ء میں بہار میں اردو تحریک کے لئے نیا سنگ میل ڈالا گیا جس کی سربراہی غلام سرور نے کی اور پٹنہ میں تین روزہ اجلاس ہوا جس کی صدارت رشید احمد صدیقی نے کی تھی۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے تحت 1956ء میں صدر جمہوریہ راجندر پرساد کی خدمت میں لیڈی انیس امام کی قیادت میں سوا دس لاکھ دستخط کے ساتھ ایک عرض داشت پیش کی گئی۔ اس کے بعد اردو کو الیکشن ایشو بنایا گیا۔ یہ 1967ء کی بات ہے، جس کی قیادت میں عبدالمغنی پیش پیش تھے۔ اس کے بعد 1972ء سے عبدالمغنی نے اردو تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کی تقلید ممکن نہیں ہے۔

ریحان غنی نے پروفیسر عبدالمغنی کے سلسلے میں بہت سا انکشافی مواد اپنی کتاب میں دیا ہے جس سے عبدالمغنی کے کارنامے کو مکمل طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عبدالمغنی پر ایک ضخیم کتاب ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی قبل آچکی ہے لیکن ریحان غنی کی کتاب جدا نوعیت کی ہے۔ اور کارکردگی کا اثر لئے ہوئے ہے۔

....

نام کتاب: گیسوئے افکار مصنف: ڈاکٹر امام اعظم ص: 272 قیمت: 300 روپے اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6 مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی

ڈاکٹر امام اعظم کے ادبی مضامین کے مجموعوں میں گیسو سیریز کی زیر نظر کتاب چوتھی کڑی ہے۔ اس سے قبل ۲۰۰۸ء میں گیسوئے تنقید، ۲۰۱۱ء میں گیسوئے تحریر، اور ۲۰۱۸ء میں گیسوئے اسلوب زیور اشاعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب کل اکتیس (۳۱) مضامین پہ مشتمل ہے جسے تین حصوں Catogories کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں

چودہ مضامین ہیں جو متفرق موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں ۔ دوسرے حصہ میں گیارہ مضامین ہیں جس میں اردو کی صنف شاعری کے حوالے سے شعرائے کرام کی شخصیت اور فن پر گفتگو کی گئی ہے اور تیسرا حصہ چھ مضامین پر مشتمل ہے جس میں اردو کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے حوالے سے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں پر گفتگو کی گئی ہے۔ متذکرہ تمام کے تمام اکتیس مضامین ادبی اہمیت کے حامل ہیں اور اپنے قاری کی تسکین کا باعث بنتے نظر آتے ہیں۔

متفرق موضوعات پر مشتمل حصہ اول میں بعض نہایت اہم اور معلوماتی مضامین شامل ہیں جن میں پہلا ہی مضمون 'اکیسویں صدی میں اردو زبان کی عالم گیر مقبولیت ،ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔اردو زبان کی زبوں حالی اور تنزلی کی داستانیں سنانے والے لوگوں کے لئے شاید مضمون نہایت حوصلہ افزا ہو اور ان کے ذہنوں میں اردو کے حوالے سے چھائی ہوئی مایوسیوں کے سائے شاید زائل ہو جائیں ۔اردو زبان جس طرح برصغیر ہندو پاک کی سرحدوں سے نکل کر عالمگیر پیانے پر اپنا مسکن تعمیر کر رہی ہے وہ اپنی دوامی زندگی کا ثبوت مہیا کر چکی ہے۔انٹرنیٹ کی دنیا میں بھی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو نے بھی اپنا مستحکم مقام بنالیا ہے اور آج اس سائنسی ترقی کے دور میں اردو کسی بھی زبان سے پیچھے نہیں ہے۔آج گھر بیٹھے اردو کے اخبارات ،رسائل اور من چاہی کتابوں کا مطالعہ بڑی آسانی سے کیا جا رہا ہے۔اس کے علاوہ مختلف اردو ویب سائٹس، چینل اور پروگراموں کے ذریعہ اردو کی ترقی دیکھی جاسکتی ہے۔اردو زبان کے حوالے سے یہ مضمون نہایت اہم اور معلوماتی ہے۔ڈاکٹر امام اعظم کی اردو سے محبت اور اندیشوں کی یہ مضمون غمازی بھی کرتا ہے۔اس کے علاوہ ''فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین اور ان کی خدمات''، ''پروفیسر گوپی چند نارنگ: مابعد جدیدیت کے سالار'' اور ''مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ: پیکرِ علم وادب'' مضامین بھی نہایت گرانقدر ہیں۔اس کے مطالعہ سے گونا گوں ذہنی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ اردو شاعری سے متعلق ہے۔جس میں نظیر اکبرآبادی کے دور سے آزاد غزل کے دور تک کے کم و بیش سولہ شعراء کرام کی شعری عظمت پر گفتگو کی گئی ہے۔اس طرح کلاسیکی شاعری، ترقی پسند شاعری، جدید شاعری اور مابعد جدید شاعری کے مزاج کا بھرپور مطالعہ کیا گیا ہے۔نظیر اکبرآبادی، پرویز شاہدی، شاکر کلکتوی، مظہر امام، منظر شہاب، مظفر حنفی، سید احمد شمیم، مناظر عاشق ہرگانوی، ارشد مینانگری، نواز دیوبندی، عبرت بہرائچی، احسان ثاقب، سجاد شاکری، قمر رئیس بہرائچی، بدر محمدی، ظفر فاروقی اور اکیسویں صدی میں آزاد غزل گو شاعرات کی شاعری کے مختلف مخفی گوشوں پر گفتگو کر کے قارئین کے سامنے لانے کی سعیٔ بلیغ کی گئی ہے۔متذکرہ بالا تمام شعراء اپنے اپنے فن کے حوالے سے خاصے معروف ہیں اور اُن کے مزید تعارف کی چنداں ضرورت قطعی نہیں ہے۔ڈاکٹر امام اعظم نے ان کی شاعری کے چند مخصوص انداز پر نظر کی ہے جو قابلِ ستائش ہے۔

تیسرا اور آخری حصہ ناول نگاری اور افسانہ نگاری سے متعلق ہے۔عبدالحلیم شرر کے ناول ''فردوس بریں'' اور صدیق عالم کے ناول ''چارنک کی کشتی'' کا عورتوں کے مسائل کے تناظر میں خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔دونوں ناولوں کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کیا گیا ہے اور ناول کی منظرکشی، کردار، مکالمے اور پلاٹ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ دونوں ناولوں پر لکھے گئے مضامین ہمارے مطالعے کے متقاضی ہیں۔افسانہ نگاروں میں ظفر اوگانوی، عابد معز، بیگ

احساس اور اسلم جمشید پوری کے افسانوں پر گفتگو کی گئی ہے جو نہایت دلچسپ معلوماتی اور پُر مغز ہیں۔ظفر اوگانوی کو مختلف الجہات شخصیت کا مالک بتاتے ہوئے ان کی دیگر ادبی کارگزاریوں اور کارناموں پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جس کے تحت ان کی تنقید نگاری کے حوالہ سے صفیر بلگرامی پر لکھے گئے ان کے تحقیقی مقالہ پر بھی مثبت رائے دی گئی ہے۔ یہ مقالہ علامہ جمیل مظہری کی نگرانی میں لکھا گیا تھا اور اس پر ظفر اوگانوی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔

افسانوں میں ان کا اولین افسانوی مجموعہ ''بیچ کا ورق'' زیر مطالعہ لایا گیا ہے اور اس میں شامل سبھی گیارہ افسانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ان کے دیگر افسانوں میں افسانہ ''قصہ ایک مجسمے کا'' اور ''نکلا جو حرف دعا'' پر مخصوص بات کی گئی ہے۔ظفر اوگانوی کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال جن اہل قلم حضرات نے کیے ہیں اُن میں سالک لکھنوی، وہاب اشرفی قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر دبیر احمد نے ان کے گیارہ ادبی مضامین کو'اذہان واشخاص' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کیا۔اس کے علاوہ ظفر اوگانوی: حیات ادبی خدمات (ڈاکٹر دبیر احمد)،ظفر اوگانوی (مونوگراف، ڈاکٹر دبیر احمد)،ظفر اوگانوی: نقوش وآثار (مرتب ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی) اور ایک کتابچہ'پروفیسر ظفر اوگانوی کی بحیثیت استاذ' (اشرف احمد جعفری) بھی شائع ہو چکے ہیں۔ظفر اوگانوی کی حیثیت ایک اہم جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے مسلم ہے۔ بیگ احساس کی افسانہ نگاری ان کے افسانوی مجموعہ'دخمہ' کے حوالے سے زیر بحث لائی گئی ہے۔ان کے چند مشہور افسانوں کو بھی احاطۂ مطالعہ میں لیا گیا ہے۔جس میں 'سانسوں کے درمیان'، 'کھائی'، 'رنگ کا سایہ' اور 'شکستہ پر' قابل ذکر ہیں۔ چند معروف ناقدین مثلاً ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور مرزا حامد بیگ نے ان کے افسانوں سے متعلق اپنی جو رائے دی ہے اُس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز گو کہ احصائیٔ تغذیہ (Medical Nutritionist) اور امراض استحالی (Metabolic Diseases) کے ماہر ڈاکٹر ہیں مگر انہیں اردو ادب سے اس قدر شغف ہے کہ سنجیدہ اور فکاہی دونوں اسلوب پر دسترس حاصل ہے۔اپنے کوائف میں ادبی وطبی موضوعات میں دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ دسمبر ۲۰۱۶ء تک ان کی طبی موضوعات پر ۱۷ کتابیں اور ۹ کتابیں طنز و مزاح پر شائع ہو چکی ہیں۔ایک کتاب انگریزی زبان میں بھی ہے۔ان کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کلیم چغتائی رقم طراز ہیں:

''عابد معز ایک طرحدار انسان ہیں۔شاید اس لئے وہ نئی طرحیں ڈالنے کی طرح طرح کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔''

ڈاکٹر عابد معز نے اردو کے فکاہی ادب کو پُر اثر بنایا ہے اور افسانوی ادب میں بہتر اضافہ کیا ہے۔

اسلم جمشید پوری اردو زبان وادب کے ایک نہایت ہی فعال، کثیر الجہات تخلیق کار ہیں۔انہوں نے ادب کے ہر شعبہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ویسے بنیادی طور پر ایک معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں لیکن انہوں نے ادب اطفال، تحقیق ودریافت، تنقید، اسکرپٹ رائٹنگ اور ڈاکومنٹری فلمیں بنانے میں بھی معاونت کی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی تقریباً ڈیڑھ سو پروگرام نشر اور ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔اردو صحافت میں بھی ان کی اہم سرگرمیاں رہی ہیں۔ان کی تخلیقات کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اشاعتِ اخبارات ورسائل کے

علاوہ ۹ر افسانوی مجموعے ادب اطفال میں 'ممتا کی آواز' اور 'عقل مند لڑکا' وہ اہم مطبوعات میں شامل ہیں۔ تحقیق کے تحت کتاب ''تفہیم شعر''، تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات اہم ہیں۔ چونکہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اس حوالے سے نئی نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری حد درجہ صادق جذبہ سے کیا اور تقریباً درجنوں طلباء سے اپنی نگرانی میں تھیسس لکھوا کر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلوائی۔ اس طرح اسلم جمشید پوری نئی نسل کے نمائندہ فعال تخلیق کار سے معروف ہیں۔ ان کے کارناموں کا احاطہ متعدد معروف ناقدین نے بھی کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''گیسوئے افکار'' اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات، طلباء وطالبات کے لئے نہایت اہم اور کارآمد کتاب ہے۔ اسے ہر صاحب علم کی لائبریری میں ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی گزشتہ تقریباً پچیس کتابوں کے ذریعہ جو ادب میں اضافہ کیا ہے، یہ کتاب بھی اُس کی ایک اہم کڑی ہے۔ کتاب نہایت صاف ستھری، دیدہ زیب اور خاصی ضخیم بھی ہے جس میں شعری، نثری اور تحقیقی تخلیقات کے حوالے سے اہم اہل قلم حضرات کے فن پر مدلل گفتگو موجود ہے۔

....

نام کتاب: چراغِ آگہی (ادبی مضامین) مصنف: ڈاکٹر ایم. صلاح الدین ص: 160 قیمت: 200 روپے
اشاعت: 2019 ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دہلی-2 مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

'چراغِ آگہی' بائیس ادبی مضامین پر مشتمل ڈاکٹر ایم. صلاح الدین کی تصنیف ہے۔ پیش لفظ بہ عنوان 'میں بھی چراغ لے کے ہواؤں میں آیا ہوں' کے تحت ڈاکٹر موصوف نے اپنی مضمون نگاری وافسانہ نگاری کے سلسلہ میں تفصیلی بیان رقم کیا ہے۔ اس بیان سے جہاں ان کا ادبی موقف ظاہر ہوتا ہے وہیں ان کی تہذیب وثقافت، ادب وکلچر اور سماجی سروکار سے ذہنی وابستگی اور پھر اس کے تحفظ کی فکر بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی اس فکر کی واضح تصویریں اس کتاب میں شامل اکثر مضامین میں بھی نمایاں طور پر ابھر جاتی ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا اور تیسرا مضمون بالترتیب 'منصب تدریس اور طریقۂ تدریس محتاج توجہ' اور 'نہ ہوا ردو تو ویراں ہو گلستاں تیرا' اس بات کی پختہ دلیلیں ہیں۔ اس کے علاوہ شکری، ہرسنگھ پور اور گنگوارہ جیسے تاریخی مقامات کی علمی، ثقافتی، سماجی اور دینی اہمیت کو نہایت دردمندانہ اسلوب میں بیان کرنا بھی موصوف کے انہیں اندیشوں کو ظاہر کرتا ہے۔ جناب نقشبند قمر نقوی بخاری کی منظوم تاریخ ہند 'حماسہ'، ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیقی وتدوینی کتاب 'دو تاریخی شاہکار نظمیں'، حسن امام درد کا مجموعہ کلام 'حصار درد'، عبداللطیف اوج کا 'دیوانِ اوج'، جناب صلو چودھری کا 'ترجمۂ گیتا'، فہیم انور کا ٹیگور کی کتاب 'جیون شرتی' کا اردو ترجمہ 'میری یادیں'، ڈاکٹر کوثر مظہری کا شعری مجموعہ 'ماضی کا آئندہ' اور شاہد اقبال کے مضامین مجموعہ 'فکر ونظر' ڈاکٹر موصوف کے گہرے مطالعہ سے گذرے ہیں اور انہوں نے ان تمام کتابوں پر تفصیلی بحث کی ہے اور اپنی مثبت آراء بھی رقم کی ہے۔ ان تمام کتابوں پر ایک مبصر کی حیثیت سے تبصرہ کے طور پر ابتدا کی گئی ہے مگر یہ تبصرے طویل ہو کر مضامین کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان خصوصیت سے جناب نقشبند قمر نقوی کی منظوم تاریخ 'حماسہ' اور مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کا

مضمون 'دیوانِ اوج' قابل ذکر ہے کہ جناب نقشبند قمر نقوی بخاری سے پوری دیانتداری کے ساتھ تاریخی حقائق کو منظوم کر کے ایک نہایت نمایاں کام انجام دیا ہے۔ یوں تو بہتیرے تاریخ دانوں نے تحقیق کے ذریعہ تاریخ کے نقوش پیش کئے ہیں مگر اکثر اپنی ذاتی رائے سے مغلوب ہو کر اپنے بیانات میں مخلص نہیں رہ گئے ہیں۔ موصوف کی منظوم تاریخی کتاب عیب سے پاک ہے اور تاریخی سچائی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی صاحب نے بہار کے دور دراز علاقہ ضلع ویشالی کی بستی شیر پور چھتوارہ سے شاگرد رشید داغ دہلوی جناب عبداللطیف اوج کے حالات و کمالات کھوج نکالے ہیں اور ان کا دیوان بھی دریافت کر ڈالا۔ وفاتِ داغ کے تقریباً تین سال تک اوج کے باحیات رہنے کے ثبوت ملتے ہیں۔ گویا ان کا دیوان پوری ایک صدی تک وقت و حالات کی گرد میں دفن تھا۔ یہ دیوان ایک سو گیارہ خستہ و کرم خوردہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مفتی صاحب کی علمی بصیرت نے عرق ریزی اور تدوین کے اصولوں کی پاسداری کو تحقیق کا عمدہ نمونہ بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہوئی جو موصوف کا اعلیٰ درجہ کا ادبی کارنامہ ہے۔

اس کے علاوہ منٹو، منظر شہاب، جاوید نہال، مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالمنان طرزی، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کے فن پر گہری نظریں ڈالی گئی ہیں۔ تمام مضامین کے مطالعہ سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے تمام مضامین میں اپنی ادبی، تنقیدی اور اخلاقی بصیرت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے جس سے ان کی پُرخلوص ادبی خدمت کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ زبان اردو سے ان کا والہانہ عشق و جنون میں نظر آتا ہے جو فی زمانہ ایک انمول خزانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتاب دیدہ زیب ہے اور اردو زبان و ادب کے عاشقوں کے لئے ایک انمول تحفہ بھی ہے۔ اردو ادب کے طلبا و طالبات کے لئے اس کا مطالعہ کارآمد ضرور ثابت ہوگا۔

....

نام کتاب: سہرے کی ادبی معنویت مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ص: 320 قیمت: 350 روپے
اشاعت: 2019 ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دہلی-2 مبصر: ابواللیث جاوید

''سہرے کی ادبی معنویت'' ڈاکٹر امام اعظم کی مرتب کردہ ۱۲/ مضامین، ایک انٹرویو اور ۲۳۵/ اُردو کے معتبر شعراء کے لکھے ہوئے سہروں اور نظموں پر مشتمل اپنی نوعیت کی اردو میں ایک انوکھی کتاب ہے کیونکہ سہرا نویسی گو کہ ایک قدیم صنف سخن مانی گئی ہے مگر اس نہج کی کوئی باضابطہ کتاب دستیاب شاید نہیں ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم اردو ادب میں ایک واحد قلم کار ہیں جنہیں تحقیق و جستجو میں ہمیشہ جدت کی تلاش رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی فلموں میں اُردو کی تلاش کی ہے اور اُردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب میں کثرت میں وحدت کا اظہار بھی کیا ہے۔ اپنے نام آئے ہوئے خطوط میں ہندوستانی معاشرے کے خدوخال واضح کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں۔

اس کتاب کا انتساب اُردو سہرے کی روایت کے علمبردار جناب ارشد مینا نگری کے نام کر کے اپنی 'سہرا دوستی' کا بھرپور ثبوت فراہم کیا ہے۔ سہرا نویسی کے حوالے سے جناب امان خاں دل (امریکہ) کا ایک شعر:

صرف ماضی ہی میں سہرے کا چلن عام نہ تھا دورِ حاضر میں بھی کہتے ہیں سخنور سہرا

بھی کتاب کے ابتدائی صفحہ پر درج ہے۔مقدمہ بہ عنوان 'میں پیام نشاط لایا ہوں' میں ڈاکٹر امام اعظم نے رسم سہرا کے تعلق سے ایک مدلل مطالعہ پیش کیا ہے۔جس سے بہت سارے پوشیدہ گوشے ظاہر ہوتے ہیں۔بیس مشاہیر قلم کے سہرے کے متعلق رائے، چھہتر سہرے کے شائع شدہ گلدستوں، انتیس شعری مجموعوں کو سہرے کی تہنیتی نظموں کی شمولیت کی تفصیل دی گئی ہے۔جس میں غالب، ذوق، وحشت کلکتوی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، شاکر کلکتوی اور مظہر امام جیسے بلند پایہ شعرائے کرام کے شعری مجموعے شامل ہیں۔ان تمام تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سہرا نویسی بھی قصیدہ کی طرح ایک صنف سخن قرار پائی ہے۔

شاہد جمیل نے اس کتاب کا دیباچہ بعنوان 'سہرے کی ادبی معنویت کا جواز' لکھا ہے۔جنہوں نے ڈاکٹر امام اعظم کے سہرا نویسی کے حوالے سے عزم کی تائید کی ہے اور چند مثالوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ سہرا نویسی کی روایت غالب اور ذوق سے شروع ہو کر موجودہ بڑے شعراء تک پہنچ چکی ہے۔جس میں ابراہیم ہوش، اعجاز صدیقی، پرویز شاہدی، وحشت کلکتوی، شاکر کلکتوی، جرم محمد آبادی، جمیل مظہری، بے خود کلکتوی، قیصر شمیم، علقمہ شبلی، منظر شہاب، اویس احمد دوراں، کلیم عاجز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ارشد مینا نگری نے سہروں کا مجموعہ 'سہروں کے چہرے' شائع کر کے سہرا نویسی کی روایت کے علم بردار ہونے کا مقام حاصل کرلیا ہے۔یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کچھ محققین نے اس صنف سخن پر باضابطہ تحقیق کا کام شروع کر دیا ہے۔دیباچہ کے آخر میں فلموں میں بھی سہرا نویسی کے جادو کا ذکر کیا گیا ہے اور فلم 'چودھویں کا چاند' میں شکیل بدایونی، فلم 'رضیہ سلطان' میں کیف بھوپالی اور فلم 'غزل' میں ساحر لدھیانوی کے لکھے ہوئے سہروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔فلم 'غزل' کے سہرے کے یہ مصرعے بھی کوٹ کئے گئے ہیں:

میں نے جذبات نبھائے ہیں اصولوں کی جگہ اپنے ارمان پرو لایا ہوں پھولوں کی جگہ

تیرے سہرے کی یہ سوغات کسے پیش کروں؟

کتاب میں شامل ۱۲؍مضامین میں بیشتر مضامین رسالہ 'تمثیل نو' دربھنگہ کے خصوصی شمارہ (اکتوبر ۲۰۰۷ء تا جون ۲۰۰۸ء) جو سہرا پر خصوصی مطالعہ تھا، میں شامل ہیں۔ڈاکٹر امام اعظم نے ان مضامین کے علاوہ سہرا نویسی کے حوالے سے اور آگے بڑھ کر ۲۳۵؍شعراء کے علاوہ مبتدی حضرات کو بھی شامل کر کے اُن کے حوصلے بڑھانے کی سعی کی گئی ہے۔قدیم و جدید شعراء میں مرزا غالب، اکبرالہ آبادی، ذوق دہلوی، فانی بدایونی، اجتبیٰ رضوی، اعجاز صدیقی، جمیل مظہری، رمز عظیم آبادی، سالک لکھنوی، اویس احمد دوراں، شاہ فضل امام واقف عظیم آبادی، عطا کاکوی، علقمہ شبلی، کلیم عاجز، قیصر شمیم، مظہر امام، مظفر حنفی، نادم بلخی اور ناوک حمزہ پوری کے کلام شاملِ کتاب ہیں جو یقیناً اس کتاب کی اہمیت و افادیت پر دلالت کرتے ہیں۔

کتاب کی کمپوزنگ، طباعت اور گٹ اپ عمدہ ہے جو صاحب کتاب کے ستھرے ذوق کو عیاں کرتی ہے۔کتاب چونکہ نئے موضوع پر ترتیب دی گئی ہے اس لئے اُمید کامل ہے کہ اسے ہر حلقہ میں پذیرائی ہوگی۔

....

نام کتاب: مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانوں کی انفرادیت مصنفہ: ڈاکٹر عذرا مناظ ص: 160
قیمت: 200 روپئے اشاعت: 2019 ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6 مبصر: ابواللیث جاوید

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر عذرا مناظ کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ اس سے قبل بھی انہیں ایک کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانوی جہتیں' لکھنے کا شرف حاصل ہے۔ گمان غالب ہے کہ موصوفہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانہ نگاری سے بے حد متاثر ہیں اور انہوں نے اپنی تحقیق کا بھی موضوع ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانوں کی انفرادیت کو ہی بنایا۔ تحقیق کے لئے مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مناظر عشق ہرگانوی کی ادبی شخصیت کا تفصیلی جائزہ، جدید اردو افسانے کا مختصر ارتقائی جائزہ، مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ، مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانوں میں موضوعات اور مسائل کی عکاسی اور مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانوں کی انفرادیت۔

پہلے باب کے تحت مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے حالات زندگی پر ان کے مختلف انٹرویوز اور چند تحریروں سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جس سے ان کی پیدائش، تعلیم، روزمرہ کی مصروفیت، والدین کی شفقت اور دیگر خاندانی حالات کی اچھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ والدین کے رکھے ہوئے نام مناظر حسن سے مناظر عاشق ہرگانوی کی تبدیلی کی وجہ تسمیہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان کے افراد خانہ میں جد امجد سے لے کر بھائیوں، بہنوں، رشتہ داروں تک کا تفصیلی بیان بھی ملتا ہے۔ جس کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کی بہتر تعمیر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ادب کی مختلف صنفوں میں ان کی تخلیقات اس قدر ہیں جن کا جائزہ لینا دشوار نہیں تو ممکن بھی نہیں ہے۔ اسکول کے زمانہ سے ہی ان کی افسانوی اور شعری تخلیقات اُس وقت کے مقتدر رسائل و اخبارات میں اشاعت پذیر ہونے لگی تھیں۔ خوش قسمتی سے انہوں نے درس و تدریس کا ہی کیریئر اپنے لئے منتخب کیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی نگارشات کا ایک انبار کھڑا کر دیا۔ دی گئی فہرست کے مطابق اب تک ان کی ۲۳۱ رکتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں نثری، تنقیدی، شعری تخلیقات اور انٹرویوز شامل ہیں۔ ان کے ہم عصر قلم کاروں نے بھی ان کے فن پر ۴۳ رکتابیں لکھی ہیں جن میں یوگل کشور پرساد کی دیوناگری رسم الخط میں دو کتابیں بھی شامل ہیں۔ مختلف رسائل کی بزم مشاورت میں شمولیت کی تعداد ۴۱ ربتائی گئی ہے۔ ان کا ذکر انگریزی کی ۲۴ ر Who's who میں بھی شامل ہے۔ اسی طرح ادب کے حوالے سے انہیں ۵۴ رانعامات و اعزازات حاصل ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی انگریزی، دیوناگری، انگیکا زبانوں میں بھی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو ادب کی قد آور شخصیات سے انٹرویوز، ریڈیو، ٹیلی ویژن نشریات کا بھی ذکر ہے۔ مجموعی طور پر ان تمام تفصیلات کے مدنظر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ادبی قد کا اندازہ لگانا قدرے مشکل نظر آتا ہے کیونکہ اب تک کی جتنی بھی ہستیوں کے متعلق معلومات ہمارے پاس موجود ہیں اُن سے کہیں بالاتر ادب میں ان کا Contribution نظر آتا ہے۔ ادب اطفال میں ان کی نگارشات کے لئے انہیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے سیکڑوں کتابوں کے دیباچے اور تقریظات بھی تحریر کئے ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے سفرنامے، سوانح نگاری، ڈراما نگاری، ناول نگاری اور دوسری بڑی

زبانوں سے ترجمہ کا بھی کام کامیابی سے انجام دیا ہے۔ یہ باب مناظر عاشق ہرگانوی کی صحیح ادبی شخصیت کی تصویر نہایت ہی کامیابی سے پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

دوسرے باب میں افسانوں کا ارتقائی جائزہ لیا گیا ہے جس کے تحت پریم چند سے لے کر رومانوی و ترقی پسند دور کے تقریباً ۳۵ر افسانہ نگاروں اور جدیدیت سے متعلق ۲۰ر افسانہ نگاروں کی کارکردگی کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان ادوار کے تمام قلم کاروں کے فن کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور بہت سے اہم قلم کاروں کے نام بھی شامل نہیں ہیں جو ذرا مشکل امر ہے تاہم ایک اچھی کوشش کہی جاسکتی ہے۔ ان تمام قلم کاروں کی نگارشات کو سامنے رکھ کر مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بہتر ہے۔

تیسرے باب میں افسانوں کے اسلوب پر بحث کی گئی ہے۔ اسلوب کی تعریف مختلف کتابوں کے حوالے سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ذریعہ اسلوب کی تشریح کی اچھی کوشش کی گئی ہے اور اس کے تناظر میں مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریروں میں اسلوبی حسن تلاش کیا گیا ہے جو ایک اچھی کوشش ہے۔

چوتھا باب مناظر عاشق ہرگانوی افسانوں میں موضوعات اور مسائل کی تلاش کے لئے مختص ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے کچھ افسانوں سے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں جن سے افسانوں میں موضوع و مسائل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس باب پر خاص محنت کی گئی ہے۔

آخری اور پانچواں باب افسانوں کی انفرادیت سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں مناظر عاشق ہرگانوی کے چند افسانوں سے اقتباسات اور چند قلم کاروں کی آرا پیش کئے گئے ہیں۔ افسانوں میں 'عورت کی طلب، بکھری اکائیاں، وسن بستھ، قطرہ قطرہ احساس' کے حوالے دیے گئے ہیں اور جوگندر پال، ڈاکٹر فہیم اعظمی، عبدالصمد، مشتاق احمد نوری، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر فراز حامدی، نورالحسنین، ڈاکٹر طارق سعید، ڈاکٹر طٰہٰ شمیم، رفیع حیدر انجم، ڈاکٹر عشرت بیتاب، ایم نصر اللہ نصر، فرحان حنیف وارثی، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر احسان عالم، صفی الرحمٰن راعین، احمد ابراہیم علوی، ڈاکٹر رضوان انصاری، ڈاکٹر عبید اللہ چودھری، ڈاکٹر مسرت جہاں، رام لعل اور ڈاکٹر انور سدید کے افسانوں پر آراء شامل ہیں۔ اتنے معروف قلم کاروں کی تحریروں کے پردے میں ایک نہایت معتبر افسانہ نگار کی تصویر صاف جھلکتی ہے۔

ڈاکٹر عذرا مناظ نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے فن و شخصیت کو تنقید کی کسوٹی پر جانچنے والے تقریباً ۴۳ر اہل قلم حضرات کی فہرست میں اپنا ۴۴ رواں نام درج کرا لینے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی زیر تبصرہ کتاب یقیناً ہرگانوی شناسی میں معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کی کمپوزنگ، طباعت اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔ قیمت بھی واجبی ہے۔ اس کی ادبی حلقے میں پذیرائی یقیناً ہوگی۔

....

نام کتاب: نذیر فتح پوری ایک ہشت پہلو فنکار　مصنف: ڈاکٹر محفوظ الحسن　ص: 100　قیمت: 150 روپے

اشاعت: 2019　رابطہ: اسباق پبلی کیشنز، پونے　مبصر: ابواللیث جاوید

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر محفوظ الحسن کے مطابق نذیر فتح پوری کی نگارشات پر تبصرہ یا تاثر یا تعارف کی طرح ہے، اُن پر تنقید نہیں ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نذیر فتح پوری کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر ان کی ادبی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ نذیر فتح پوری کی متعدد کتابیں (نثری و شعری و تنقیدی مجموعے) کے حوالے سے ان کی شاعری، افسانہ نویسی، مدیرانہ صلاحیتوں، سماجی سروکار اور لوگوں سے عقیدت و محبت کے حوالے سے تاثرات قلم بند کئے گئے ہیں جو خالصتاً مصنف کے ذاتی ہیں۔ جن کتابوں پر نظر ڈالی گئی ہے ان میں 'ادب کے ماہ منور احمد کنڈے'، 'ریزہ ریزہ دل'، 'محمدؐ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا'، 'ڈاکٹر نسرین رمضان سید کے مضامین کا مجموعہ، نذیر فتح پوری پونے کے ادبی افق کا سورج، رونق افروز کی مرتب کردہ 'نذیر فتح پوری ایک ہمہ جہت فنکار'، 'بیتے کل کا ایک پل'، 'شفق سوپوری کا ناول نیلما کا تنقیدی جائزہ'، 'رفیق جعفر کی کتاب نذیر فتح پوری: شخص، شاعر اور مدیر'، 'مختار بدری کی کتاب اردو شاعری میں جانور'، نظم سفر، پابند نظموں کا مجموعہ 'اعتراف'، نذیر فتح پوری کے دو خطوط ڈاکٹر محفوظ الحسن کے نام، 'ایک اور کالی داس' شامل ہیں۔ تمام کتابوں کے مشمولات پر اظہار رائے کیا گیا ہے جس سے نذیر فتح پوری کی ادبی بلند قامتی کا احساس ہوتا ہے۔ مصنف نے زود نویسی کی بات کرتے ہوئے نذیر فتح پوری کا موازنہ علیم صبا نویدی، ناوک حمزہ پوری اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی سے کیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ نذیر فتح پوری بھی جلد ہی اُس نشانے کو پار کر جائیں گے۔

مذکورہ بالا کتابوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف نے نذیر فتح پوری کی شاعری، افسانہ نگاری اور دیگر اصناف پر ان کی گرفت کا تذکرہ کیا ہے جس میں ان کے خوش آئند مستقبل کی بھی پیشین گوئی کی ہے۔ زیر نظر کتاب نذیر فتح پوری کی مجموعی ادبی تخلیقات پر ایک صالح تبصرہ بھی ہے اور توصیفی کلمات بھی۔ اس کے مطالعہ سے اُردو کے طلباء و خاطر کو خواہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

....

نام کتاب: ممنوعہ سمت میں (ہندی کویتاؤں کا ترجمہ) مترجم: ڈاکٹر شاہینہ تبسم ص: 112 قیمت: 100 روپے

اشاعت: 2018 رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6 مبصر: ابواللیث جاوید

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر اوم پرکاش راٹھور کی ہندی کویتاؤں کا اردو ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر اوم پرکاش راٹھور علم نباتیات کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ موصوف ناندیڑ کے پیپلز سائنس کالج کے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہو کر ہندی زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ ادبی و سائنسی دونوں میدانوں میں یکساں سرگرم عمل ہیں۔ فلسفہ پر بھی شائع ہو چکے ہیں۔ علم نباتیات میں دلچسپی کی وجہ کر انہوں نے روایتی طبی پودوں پر خاص توجہ دی اور اب انہوں نے مختلف مہلک امراض جیسے ذیابیطس، بلڈ پریشر، پرانا بخار اور کینسر کے علاج کے لئے موثر ادویات کی دریافت کی ہے۔ ہندی کویتاؤں میں انہوں نے نئے تجربے بھی کئے ہیں اور جا بجا معروف سائنسداں نیوٹن، آئنسٹائن کو استعارے کے طور پر استعمال بھی کیا ہے۔ سماج میں پھیلی ہوئی جہالت، توہم پرستی جیسی مہلک خرابیوں کو دور کرنے کا عزم کیا ہے اور اپنی کویتاؤں کا ہی ذریعہ بنایا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ ان کی

مادری زبان ہندی ہے مگر مرٹھواڑہ میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے انہیں مراٹھی اور انگریزی زبان پر بھی مہارت حاصل ہوگئی۔

زیر تبصرہ کتاب ۴۹ نظموں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے شاعر کے فکر کی بلندیاں، زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کی تڑپ اور زمانہ کی کجی روش پر ان کا اندیشہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ بعض نظمیں ہمیں ماضی کی وادیوں کی سیر کراتی ہیں اور اپنی عظمت رفتہ کا احساس دلاتی ہیں۔ ان نظموں میں زندگی کے مختلف رنگوں کا بھی بیان ہے اور اس کی سفاکیوں کا تذکرہ بھی۔ زندگی پر چبھتا طنز بھی ہے اور اُس کی بے بسی بھی۔ ایک نظم 'بھلو موبائل' دیکھئے:

دوستو! / آج مہانگر کے / اس بیکراں عوامی سمندر میں / بھیک مانگتا ہوا / ایک گداگر مجھ سے بولا / "صاحب پھٹا نوٹ / یہاں کیوں دیتے ہو؟ / مندر گلک میں ڈالو نا" / یہ کہہ کر وہ / اپنے موبائل پر / اپنی محبوبہ سے باتیں کرنے لگا۔

اسی طرح کی پُر اثر نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر شاہینہ تبسم کی ترجمہ کی کوشش قابل تحسین ہے۔ انہوں نے ترجمہ کرتے وقت یہ خاص خیال رکھا ہے کہ اصل نظم کا پیغام من وعن اردو میں منتقل ہو جائے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ ویسے بھی دوسری زبانوں کی شاہکار تخلیقات کا ترجمہ کر کے اُسے اردو کے قارئین تک پہنچانے کے عمل کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا کیونکہ ادبی خزانہ میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری زبانوں میں کیا تجربے کئے جا رہے ہیں اس سے قارئین متعارف ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو میں بھی 'ترائیلے' ہائیکو، جیسی صنف سخن کو شامل کر لیا گیا ہے اور ان پر مشق سخن بھی ہو رہا ہے۔ ترجمہ کا کام نہایت احسن ہے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔

'ممنوعہ سمت میں' کا ترجمہ ہمارے اردو ادب میں یقیناً ایک اضافہ کا درجہ رکھتا ہے۔ کتاب خوبصورت ہے۔ نظموں کی مناسبت سے بھ.م. پرسواڑے کے بنے اسکیچ میں شامل ہیں جو اس کتاب کی شان اور قدر بڑھانے میں معاون ہیں۔ امید ہے اس کتاب کو قابل قدر پذیرائی ملے گی۔

....

نام کتاب: نہایت (شعری مجموعہ) شاعر: خالد عبادی ص: 112 قیمت: 150 روپے اشاعت: 2016
رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6 مبصر: ابواللیث جاوید

'نہایت' خالد عبادی کا شعری مجموعہ ہے جس میں ۴۰ غزلیں اور ۲۰ نثری نظمیں شامل ہیں۔ خالد عبادی ہماری نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے یہاں تخیل کی بلندی، الفاظ کی سحر کاری اور استعاروں کی موزونیت بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ڈگر سے ہٹ کر اپنی بات کہنے کی الگ راہ بنائی ہے جو دیگر شعراء کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اپنے ہم عصر شعراء میں ان کا انداز بالکل منفرد ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

یہ ضرب طبل نہیں ہے یہ دل کی دھڑکن ہے
کسی دماغ میں رخنہ کوئی تو در آیا

مجھے اچھی نہیں لگتی تو اچھی بھی نہیں ہوگی
یہ دنیا کیا مری نظروں میں کچھ توقیر رکھتی ہے

کوئی مرجائے تو پھر موت نہیں آتی ہے
چھوٹ جاتا ہے جو دنیا میں وہی ساتھی ہے

بچ نہیں پاتا تیرے ناز کا مارا کوئی — چیختے چیختے یہ عمر گذر جاتی ہے
نہ جانے دیکھتی کیا ہے نگاہ سرگیں تیری — سمجھ میں کچھ نہیں آتا نمک کیا ہے جراحت کیا
دو چار دن نوازشیں برحق رہا نصیب — سو حال اب یہ ہے کہ تمہیں دلبرو کہو
میری رسوائی مبارک ہو تری شہرت ہو — حال دل میں نے سنایا تو کوئی شعر سنا

مذکورہ بالا اشعار شاعر کے خیالات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔خیالات کی ندرت،تخیلات کی وحدت اور طبیعت کی جدّت ان اشعار کے صاف صاف منعکس ہوتی ہے۔مذکورہ ساتواں شعر تو شاعر کے عقائد کی بھی عکاسی کرتا نظر آرہا ہے۔پوری شاعری رومان انگیزی سے پاک ہے۔خالد عبادی کی شاعری خیالات کے پرواز کی شاعری ہے۔عقائد کے تعلق سے شاعر قلندرانہ رویہ کا حامل ہے۔ایک شعر:

میں اپنے طرز کے جینے کا آمادہ سدا کا — نہ خوفِ والی و قاضی نہ ڈر کوئی خدا کا

شاعر نے خودی کے فلسفہ کو زندگی کا اہم اصول بنایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

ٹھوکر میں تخت و تاج کو رکھا کیا سدا — میں تنگ احتیاج کو رکھا کیا سدا

اس مجموعہ کے مطالعہ سے یقیناً ایک گونا گوں فرحت کا احساس ہوتا ہے اور اردو شاعری کے تئیں ایک احساس احترام بھی پیدا ہوتا ہے۔نثری نظموں کے حصہ میں بھی 'خوشی بہ خوشی'، 'پس یقین کرو'، 'کیوں' جیسی نظمیں زندگی کی سفاکیوں کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔زمانہ کے رسم ورواج اور بے جا سماجی زیادتیوں کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔اس شعری مجموعہ کو اردو ادب کا ایک اہم تحفہ کے طور پر لینا چاہئے۔امید قوی ہے اسے ادبی حلقہ میں اچھی پذیرائی ملے گی۔

....

نام کتاب:افسردگی کی لہر (شعری مجموعہ) شاعر:قربان آتش ص:128

قیمت:250روپئے اشاعت:2018 مبصر:ابواللیث جاوید

زیر تبصرہ کتاب قربان آتش کا دوسرا شعری مجموعہ 'افسردگی کی لہر' ہے جس میں ایک حمد اور ایک سو دس غزلیں شامل ہیں۔غزلوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر حزن وملال کا پیکر ہے اور وہ اپنے حالات سے بہت پریشان ہے۔تمام غزلیں ایک ہی مزاج کی ہیں اور ہر شعر شاعر کی ناکامیوں اور مایوسیوں کی داستان بیان کرتا ہے۔شاعری کا انداز روایتی ہے اور کسی بھی تحریک سے متاثر نہیں۔غزل کے مزاج میں جو شگفتگی، جو نزاکت اور جو حسن ہوتا ہے ان تمام غزلوں میں عنقا ہے۔مصرعوں میں آپسی ربط بھی نہیں مثلاً:

ذرا یہ میل کا پتھر ختم تو ہونے دے — مری تلاش کا محشر ختم تو ہونے دے
زہر اگلتا رہ گیا خانہ بدوشی کے خلاف — تم نے کیا ہمت جتائی تاج پوشی کے لئے
اتنی شمشیر نظر اُس کی تھی پیاسی آتش — سارے جسموں کا مرے چوس لیا جوس آخر
اتنی بھی تاب کہاں رہ گئی مجھ میں باقی — روح میں شیشۂ صحرا کو چھپالوں کیسے
دشت وکہسار ہوں یا شاخ وشجر ہوں آتش — سکۂ ابر سے بھیگا نہ کسی کا دامن

لفظی ترکیبیں بھی نہایت اجنبی قسم کی استعمال کی گئی ہیں۔اوپر کے اشعار میں 'تلاش کا محشر'، 'ہمت جتائی'، 'شمشیر نظر'، 'شیشۂ صحرا' جیسی ترکیبیں کھٹکتی ہیں۔ کی مثالیں تقریباً ہر غزل میں مل جائیں گی۔شاعر اپنی ہی لفظیات کے اسیر ہیں جس کی وجہ سے غزلوں میں رعنائی نہیں اور قارئین کو متاثر نہیں کرتیں۔بعض اشعار میں تو تذکیر و تانیث کی بھی غلطیاں ہیں۔ایک شعر دیکھئے:

یہی زمانے کی آئین بن گئی ہے آج　　نگہ کا شیشۂ رحم و کرم بدل دینا

اس شعر میں آئین کو مؤنث اور شیشۂ رحم و کرم کی ترکیب کچھ عجیب نہیں ہے؟

غزل میں کوئی حسن یا کسی طرح کی کشش نہیں ہے۔ پڑھنے والا ایک کیفیت ڈھونڈتا ہے جو اس مجموعہ میں نہیں ہے۔

....

نام کتاب: اکیسویں صدی میں اردو صحافت　مصنف: ڈاکٹر امام اعظم　ص: 296　قیمت: 200 روپے
اشاعت: 2016　پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی　مبصر: پروفیسر عبدالمنان، کولکاتا

اردو صحافت کی تاریخ کی ترتیب کے مراحل طے کرنے میں جیالے محققوں کے افکار کے جوبن مضطرب ہوئے اور جمال کی دوشیزگی نکھارنے کا ثبوت دیا اس کی تاریخ کی طوالت، ادب کی خوشنمائی کا ایک اٹوٹ ذریعہ ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور سرفروشی کی تمنا کی بیداری اور بخت رسائی میں اردو صحافت کی خدمات کو فراموش کر کے تصورِ آزادی اور حریت پسندی کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اردو کے فنکاروں بالخصوص صحافیوں کا قلم ہمہ وقت بیدار ہے اور ایسے ایسے گل و بوٹے سجائے ہیں جن کی ضیائے پُر نور آج بھی ہندوستان کی قسمت کی سرفرازی کی ناقابل فراموش مثال ہیں۔ ع　اے بوئے گل سمجھ کے مہکیں چمن کے بیچ

زندگی حشر سامانی اور سود وزیاں سے عبارت ہے جس کے جلوے انسکالات کی تہہ داریوں کو تفہیم سازی کی دعوت دیتے ہیں اور انسانیت کی نباضی و دلکشی میں سازِ نہاں کے ترنگ کو چھیڑتے ہیں (صحافت کے بکھرے جلوے)۔ یہاں انسانیت کی بیداری اور زماں و زمین کہ تہہ داری کی عقدہ کشائی کا اثاثی مقصد یہ ہے کہ صحافت کے افادی پہلو اجاگر کیے جائیں اور ہندوستان کی آزادی میں کارہائے نمایاں کا اعتراف کیا جائے۔انسانیت کی دلکشی اور تہہ داری کی پرتوں کو جس ادا کے ساتھ اور شوق مستانہ کی لذت اور ابدی کارفرمائی کے انداز میں اردو صحافت نے اپنے شباب کا حسن و جمال لٹایا ہے اس کا فیاضی اور دلبری کے ساتھ امام اعظم کے قلم نے دَر کھولنے کی ایسی صورت نکالی ہے کہ اردو کے جیالے فنکاروں سے مضامین لکھوا کر کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔'اکیسویں صدی میں اردو صحافت' اس کی زندہ مثال ہے۔اس جوئے ناب میں جس قدر غوطہ زنی کا فرض نبھایا جائے گا اسی قدر جو ادبی شخصیت جلوہ نمائی کا فرض ادا کرے گی وہ امام اعظم کی ہوگی۔امام اعظم نے صحافت کی تاریخ لکھ کر اور قابل ذکر فنکار کے خیالات کو یکجا کر کے اردو صحافت کی سمت و رفتار کا تعین کیا ہے۔ان کے دو گوشوں کی طرف توجہ دی جاسکتی ہے۔ایک گوشہ صحافت کی تاریخ اور افادیت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسری طرف امام اعظم کے زاویۂ نگاہ کی

رغبت کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس کتاب میں صحافت کی اہمیت اور افادیت کے علاوہ اس کی تاریخ کا وہ باب روشن ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کتاب اردو صحافت کے ماضی کی رفتار پر روشنی ڈالتی ہے اور مستقبل کی بشارت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی کا مختصر مگر جامع اور مانع خیال اردو صحافت کی تاریخ اور امام اعظم کے مستحسن اقدام کا اعتراف ہے۔ ترسیلی میڈیا نے جس تیزی کے ساتھ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی نظام کو گھیر لیا ہے اور غلامی میں بھی آزادی کے نغمے الاپنے کی سبیل پیدا کی ہے اس کی طرف بھی بڑی فراخی اور دلائل کے ساتھ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ میں اس مستحسن کاوش پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

....

نام کتاب: پہلی جنگ آزادی 1857ء میں اردو زبان کا کردار ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر امام اعظم

اشاعت: 2020 ص: 272 قیمت: 300 روپے

رابطہ: الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، گنگوارہ، دربھنگہ-7 مبصر: پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مظفر پور

''پہلی جنگ آزادی 1857ء میں اردو زبان کا کردار'' معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر امام اعظم کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ یہ اُن مقالات کا مجموعہ ہے جو جدوجہد آزادی کی 150 ویں سالگرہ کے موقع پر 28/ 29/ مارچ 2007ء کو ''پہلی جنگ آزادی (1857ء) میں اردو زبان کا کردار'' کے عنوان سے دربھنگہ میں منعقد کیا تھا اور اس کے روح رواں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم تھے۔ یہ اپنے علامتی سرورق، کاغذ، کمپوزنگ اور مواد و مشتملات کی گراں مائیگی کے اعتبار سے بہت ہی جاذب نظر اور اہم ہے۔ اس کا انتساب مجاہد آزادی مولانا عبدالعلیم آسی کے نام کیا گیا ہے۔ یہ ان کی خدمت میں بہترین خراج عقیدت ہے۔ اس کا پیش لفظ خود مرتب کتاب ڈاکٹر امام اعظم کا تحریر کردہ ہے جو پُر مغز، معلوماتی اور حقائق بداماں ہے۔ ''اس لئے زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہئے''۔ بہادر شاہ ظفر پہلی جنگ آزادی کے حوالے سے، عنوان کے تحت محترم پروفیسر عبدالمنان طرزی کی منظوم کاوشیں، فکر بلند اور فن لطیف کی آئینہ دار ہیں۔ نثری حصہ حسن امام درد کے مضمون ''جنگ آزادی میں بہار کا حصہ (1857 کے آس پاس)'' سے شروع ہوتا ہے جو بہت خوب ہے۔ مگر مضمون کے پہلے پیراگراف میں راجہ رام نرائن موزوں سے منسوب شعر:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اُن کا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عطا کاکوی کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

''تذکرۂ مسرت افزا'' میں یہ ادنیٰ تغیر یہ شعر مرزا ابراہیم مشتاق بنارسی کے نام لکھا ہے۔ حزیں کی وجہ سے موزوں کا بنارس سے رابطہ مسلّم ہے۔ انہوں نے ممکن ہے یہ شعر مشتاق کا سنا ہو اور سراج الدولہ کی خبر شہادت سن کر یہ شعر پڑھا ہو۔'' (بحوالہ سہ ماہی ''معاصر'' پٹنہ، شمارہ ۳۶، ص: ۵، مدیر: کلیم الدین احمد)

ڈاکٹر برکت علی نے ابھی اپنے مضمون ''پہلی جنگ آزادی سے پہلے کے اردو شاعروں کا رویہ'' (ص: ۱۴۹)

میں یہی غلطی کی ہے یعنی اس شعر کو موزوں سے منسوب کر دیا ہے جو درست نہیں۔

بہر کیف، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے مضمون کا عنوان ''غالب ۱۸۵۷ء کے چشم دید'' ہے اس سے بات واضح نہیں ہوتی۔ گواہ یا کچھ اور ہونا چاہئے تھا، ادھورا پن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مضمون بڑا جامع اور بھرپور ہے۔ پروفیسر عبدالواسع کا مقالہ ''پہلی جنگ آزادی کا تحریکی ادب'' بہت ہی قیمتی بلکہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مجید بیدار نے اپنے مقالہ ''پہلی جنگ آزادی کی تحریک میں جنوبی ہند کا حصہ'' میں اپنے موضوع کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ پروفیسر شاکر خلیق نے سرسید احمد خاں کو پہلی جنگ آزادی کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ میں اپنے مضمون ''انیسویں صدی کی غزلیہ شاعری میں ۱۸۵۷ء کا عکس'' کے متعلق خود کچھ کہنے کے بجائے کتاب کے پیش لفظ سے یہ عبارت نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

> ''عام طور پر غزلیہ شاعری کو حسن وعشق کی داستان کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے اپنے مقالے ''انیسویں صدی کی غزلیہ شاعری میں 1857ء کا عکس'' پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ پہلی جنگ آزادی کے دوران استعارے اور علامتیں اور غزل حوصلہ کی نشان بن گئے اور شاعروں نے غزل کے توسط سے انقلابی پیام کو سارے ملک کے سامنے نمایاں کیا۔'' (ص:22)

پروفیسر ایم۔ کلام الدین نے ''ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی تحریکی شاعری'' میں بہت ہی عمدہ اور عالمانہ بحث کی ہے۔ پروفیسر رئیس انور نے اپنے گرانقدر مقالہ میں ''اردو زبان وادب پر پہلی جنگ آزادی کے اثرات'' کو بڑے محققانہ انداز میں نمایاں کیا ہے۔ اختصار میں جامعیت کا حُسن جلوہ گر ہے۔ ''پہلی جنگ آزادی 1857ء اور غزل'' کے عنوان سے انیس رفیع نے اپنا مضمون بہت محنت سے لکھا ہے۔ اس لئے یہ اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔

پروفیسر خالد سعید نے ''پہلی جنگ آزادی اور جنوبی ہند'' کے موضوع پر اچھی کاوشیں کی ہیں۔ حقانی القاسمی نے ''کالا پانی کے سزایافتگان'' کا اچھا تعارف کرایا ہے مگر علامہ فضل حق خیرآبادی کے ساتھ انہوں نے تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تساہل پسندی سے کام لیا ہے۔ علامہ مرحوم نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ اس سلسلہ میں محققین مختلف الخیال ضرور ہیں مگر حق ی ہے کہ علامہ مرحوم انگریزوں کی نظر میں اپنے فتویٰ جہاد کی وجہ سے معتوب اور سزایافتہ ہوئے۔ مولانا عبدالشاہد خان شیروانی نے ''الثورۃ الہندیہ'' کے مقدمہ میں مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام کی تحقیقات کا ضعف ثابت کر دیا ہے، یہاں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔

مجھے لگ رہا ہے کہ میرا تبصرہ طویل ہوتا جا رہا ہے اس لئے آخر میں صرف ڈاکٹر منصور عمر کی اہم تحریر 1857ء پر اظہار خیال کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ اردو کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک نادر ونایاب مطالعہ ہے۔ ہر تصویر زبانِ حال سے 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کی خونچکاں داستان بیان کر رہی ہے۔ اس لئے ان تصویروں کو حفاظت سے رکھنے کی ضرورت ہے۔

مجموعی طور پر پیش نظر کتاب گرانقدر اہمیت کی حامل ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے یہ حوالہ

کے کام آئے گی۔اس طرح اس کا شمار زندہ کتابوں میں ہوتا رہے گا۔اس کی شاندار ترتیب وتہذیب اور پیش کش کے لئے ڈاکٹر امام اعظم ہم لوگوں کی مبارکبادی کے مستحق ہیں۔

....

نام کتاب:نسوانی چیخ(افسانوی مجموعہ) مصنفہ:طلعت انجم فخر ص:100

قیمت:200روپے اشاعت:2019 مبصر:احسان ثاقب،آسنسول

اردو کے مختصر افسانے عام طور پر نیا اور اختیار کرنے کا ہنر رکھتے ہیں اور شاید یہ بھی کہ اس کا ہر دوسرا قدم صحت مند خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔کچھ قلم کار اس آرٹ کو عظیم بنانے کے لئے اپنی جدو جہد کو مقدور بھر شبلی، حالی اور شرر کی طرح عروج گذشتہ کی داستان رنگ میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ایسا ادب اپنی مثالیت پسندی اور آدرش کے لئے مشہور رہا ہے۔اس طرح کا رخ نہ گاندھیائی طریق فکر اور نہ پریم چندی خصوصیت کے اعتبار سے کسی تحریک کا حامی ہوتا ہے بلکہ یہ قلم کاری یا نجی زندگی کی آئیڈیالوجی کا عکس کہلاتا ہے۔گرچہ افسانوی ادب کی عمر زیادہ لمبی نہیں ہے پھر بھی اس کی مصوری اور عکاسی فکر وفن کی مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

''نسوانی چیخ'' ۲۰۱۹ء کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔مصنفہ کا نام طلعت انجم فخر ہے۔اس میں کل سولہ مختصر افسانے ہیں۔بقول عشرت بیتاب خاتون قلم کاروں میں طلعت انجم فخر بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے مطابق کہ یہ افسانوی مجموعہ انسان کی دردمندی کی داستان ہے اور یہ بھی کہ طلعت انجم فخر نے عروسِ حیات کی نقاب کشائی اور وقت کی تھرتھراہٹوں اور دھڑکنوں کا احساس بخوبی کیا ہے—طلعت انجم فخر جس دور کی قلم کار ہیں ان کی نگارشات نظریاتی وفاداری سے آزاد ہوکر بھی ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔افسانے کو بیان کرنے کا ایک خوبصورت اسلوب یہ بھی ہے کہ ان کی حقیقت نگاری محض ایک لوجک نہیں ہوتی بلکہ برجستہ حقیقت نگاری ہوتی ہے۔''نسوانی چیخ'' کے تمام افسانوں میں موضوع کے لحاظ سے جتنے بھی پلاٹ اور کردار آئے ہیں وہ تمام فنی تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔آج کے افسانے کو جس اسٹیج سے بھی پڑھا جائے زندگی میں جو ہنگامیت ہے، افراتفری ہے، بے چینی ہے وہ سب محسوسات بن کر دل اور دماغ میں اتریں گے ہی۔یہ کچھ ایسے تجربے ہیں کہ قلم کار خواہ جس سطح کا ہو بہر صورت وہ اس کا اظہار کرے گا۔طلعت کے افسانوں میں پلاٹ سے کلائمکس تک اس طرح کے Inspiration موجود ہیں۔حقائق کی بنیاد پر جو نظریاتی تشکیل ہوتی ہے اس میں شبہات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔سماجی تناظر میں کوئی بھی مخصوص جذباتی عمل فکشن کا سرمایہ نہیں ہوتا۔تضاد اور تصادم کو گردوپیش کے معاملات میں غیر فعال نہیں ہونا چاہئے۔''نسوانی چیخ'' میں شامل تمام افسانے واقعاتی حوالے سے لکھے گئے ہیں۔تشنہ زندگی کا کرب ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔'سخہائے گفتنی' میں مصنفہ نے اپنے اس پہلے افسانوی مجموعہ میں خود کے تعلق سے یہ واضح کردیا ہے کہ میری تحریروں کو عمدہ پرواز میرے ہردلعزیز استاد محترم ڈاکٹر عشرت بیتاب صاحب نے عطا کی۔مثل مشہور ہے کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے مگر میں اسے طلعت انجم فخر کی ذہانت ہی کہوں گا کہ ان کے افسانے کسی بھی طور پر اپنی انفرادی پہچان سے الگ نہیں نظر آتے۔شاید یہی نفسیاتی بنیاد طلعت انجم فخر کو کامرانی

کی خوش خبری عطا کرتی ہے۔میری تمام نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

وہ فن کاری نہیں کاریگری سے لفظ و معنی کی　　شعورِ فن اگر ہوتا تو رازِ فن بتا دیتے

....

کتاب کا نام: قدیم رسائل اور اداریہ نگاری　مصنف: نور الہدیٰ　ص: ۴۲۴　قیمت: ۴۵۰ روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی　مبصر: ایم نصر اللہ نصر (9339976034)

نور الہدیٰ صاحب کی علمی و ادبی شخصیت حلقۂ اردو ادب میں ناآشنا نہیں۔سائنس کا طالب علم اور ماہرِ ریاضیات ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اردو ادب کی وہ خدمت کی ہے جسے اہل علم و دانش فراموش نہیں کر سکتے بلکہ اردو ادب ہمیشہ ان کا ممنون و مشکور رہے گا۔وہ مدرسہ عالیہ کے شعبۂ ریاضیات سے منسلک ضرور رہے لیکن ان کا ذوق و شوق خالص اردو ادب سے رہا وہ بھی تحقیق و تنقید سے۔ چونکہ وہ فارسی زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں اور عربی سے بھی اچھی واقفیت ہے اس لئے ان کی اردو تخلیقات و تصنیفات میں ان زبانوں کے الفاظ، اشعار اور محاورات کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں جو ان کے مضامین کے وقار میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ان کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔ لائبریریوں میں وقت گزارنا ان کا شیوہ ہے۔سوائے اس کے ان کا کوئی ادبی اڈہ نہیں ہے۔ ہیں تو بڑے خشک مزاج مگر حق گوئی سے کبھی باز نہیں آتے۔ مصلحت پسندی انہیں بالکل پسند نہیں۔انہوں نے بڑے بڑے کام کیے اور اردو زبان و ادب کو بہت اہم تخلیقات اور تصنیفات سے مالا مال کیا لیکن اردو والوں کی بے توجہی کے سبب وہ خود اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکے جس کے وہ مستحق ہیں۔ان کی تصنیفات و تالیفات میں ایجاد معانی (قدیم و جدید سائنسی کارناموں کا تجزیہ و تحقیق) تخمین و ظن (تحقیقی و تنقیدی مضامین)، تذکار نظامی (کامریڈ محمد نظام الدین حیات و اسفار)، بازگشت (تذکار پر لکھے گئے تنقید و تبصرے) دیارِ گم گشتہ (وطن مالوف اور وطن ثانی کا تہذیبی منظر نامہ) نیز ہائر سیکنڈری فزکس (اول، دوم) ان آرگینک کیمسٹری (اول، دوم) اور آرگینک کیمسٹری مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی فرمائش پر لکھی گئی کتابیں شامل ہیں۔زیر ترتیب میں مشاہیر کلکتہ (فکر و فن کے آئینے میں) اور خطوط خمدار منتظر اشاعت ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی تخلیقات و تصنیفات کی اہمیت و افادیت سرسری مطالعے کے حصار سے باہر ہیں۔ان کا سارا ادبی کام ٹھوس اور تحقیق شدہ ہوتا ہے۔'قدیم رسائل اور اداریہ نگاری' ان کا ایک بڑا اور قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔نیز یہ خالص تحقیقی مقالہ بھی ہے اس کتاب پر تو انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنی چاہئے۔قدیم رسائل کی جس طرح موصوف نے بازیافت کی ہے اور آغاز سے انجام تک کے حالات قلم بند کیے ہیں اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔یہی نہیں ان رسائل کے اداریے پر بھی اچھی اور معلوماتی گفتگو ہوئی ہے۔کچھ مشہور رسائل اور جریدے کے نام ہی ملاحظہ فرمالیں جن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔دلگداز، مخزن (بیسویں صدی کا اولین صحیفۂ ادب)، زمانہ (ایک تاریخ ساز جریدہ)، رسالہ 'عصمت' دہلی، الناظر لکھنؤ، ہمایوں لاہور (ایک تعارف)، نیرنگ خیال لاہور اور میخانہ وغیرہ۔اس کتاب کے تعلق سے موصوف لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں بہ استثنائے 'دلگداز' جتنے رسائل کا تعارف و تبصرہ پیش کیا گیا ہے ان کا تعلق 1901

سے 1920 تک کے درمیانی عرصے سے ہے۔ یہ دور اردو فارسی زبان و ادب کے سیاق میں روشن ترین دور تھا۔ اس عہد کا ہر رسالہ بذات خود ایک دبستان علم ہوا کرتا تھا۔ مشمولات طبع زاد اور nascent state میں ہوتے تھے۔ لکھی ہوئی چیزیں الفاظ و بیان کے الٹ پھیر کے ساتھ دوبارہ نہیں لکھی جاتی تھیں۔ ہر رسالہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتا تھا ہر ایک کے واضح اور مثبت پروگرام ہوتے تھے۔ خدمتِ ادب اور کردار سازی میں کسی عُجب و غرور کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ مدیرانِ رسائل اپنے وقت کے مربیِ علم و اخلاق ہوا کرتے تھے' (پیش لفظ)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم رسائل کی اہمیت کیوں ہوا کرتی تھی۔ ان کے اندر خالص پن اور پاکیزگی کا احساس بھرا ہوتا تھا۔ اس وقت کے قلمکار بھی کافی منجھے ہوئے ہوتے تھے۔ مطالعے اور مشاہدے کے انبار ان کے پاس تھے۔ وہ ادب کا چھچھلا کنارا نہیں بلکہ گہری جھیل ہوا کرتے تھے۔ کا تا اور لے بھاگا والی بات ان میں بالکل نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ادب کا تیس مار خاں سمجھتے ہوں۔ کافی سنجیدگی سے ادب کا مطالعہ کرتے اور خوب ذہن میں پکاتے پھر خامہ فرسائی کرتے۔ مدیران رسائل و جرائد بھی ماہر علم و فن ہوا کرتے تھے۔ ان کی علمیت کا اندازہ ان کے اداریے سے ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ اداریے ہی رسائل کی شناخت ہوتے ہیں۔ اس کے تہذیبی لوازمات کا انحصار ان کے اداریے پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے رسائل کے نظریات اور مقاصد نیز معیار و مسلک بھی طے ہوا کرتا ہے۔ اداریہ نگاری کے تعلق سے موصوف نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کے اصول وضوابط بھی طے کیے ہیں۔ نیز قدیم رسائل کے اداریے کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں:

☆ ''مخزن' اور 'زمانہ' کے اداریوں میں ایک شان دلربائی تھی۔ سپردگی اور حسن ایثار کا یہ عالم تھا کہ مدیر کی ذات کہیں نمایاں نہیں ہوتی تھی۔ مدیر اپنی ذات کو فنکار کی ذات اور شخصیت کے مقابلے میں ادنی تصور کرتا ہے۔

☆ 'مخزن' کلی طور پر ایک علمی جریدہ تھا۔ اس کی اپنی وضعداری تھی۔ مخزن میں اداریے کا کوئی عنوان مقرر نہیں تھا۔ اہم تخلیقات نظم و نثر کے ساتھ مدیر (شیخ عبدالقادر) کا توصیفی نوٹ اور فنکار کی فنی خوبیوں پر جزوی تبصرہ ہوتا۔

☆ 'مخزن' کا ہم عصر رسالہ 'زمانہ' تھا۔ مخزن ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا اور زمانہ ۱۹۰۳ء میں۔ خدمت زبان و ادب کے معاملے میں دونوں میں اشتراک فکر اور اشتراک عمل تھا۔ لیکن کئی حیثیتوں سے زمانہ کا مقام اونچا تھا۔

☆ 'انیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہونے والے دو رسائل اپنے مقاصد اور پیغام کے اعتبار سے بہت اہم تھے۔ ایک سرسید کا 'تہذیب الاخلاق' اور دوسرا عبدالحلیم شرر کا 'دلگداز' جو 1887 میں منظر عام پر آیا۔

مذکورہ بیانات کی نقل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس گدڑی میں کافی ادبی لعل چھپا ہوا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ادبی اداروں کو چاہئے کہ اس بندے کے پوشیدہ ادبی ذخائر کو حاصل کر کے اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کیا جائے ورنہ سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ ادبائے قدیم میں یہ چند اکابرین ادب ابھی زندہ و سلامت ہیں ان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک اس کتاب کی اہمیت کا تعلق ہے تو تحقیق وتنقید کے لحاظ سے اس کا ورق ورق معلوماتی ہے۔ اسلوبیات

کی حیثیت سے بھی یہ کافی خصوصیات کی حامل ہے۔کافی معلومات اس کتاب میں جمع شدہ ہیں۔قاری کے لئے خصوصی طور پرنئی نسل کے محققوں اور مضامین نگاروں کے لئے یہ کتاب معاون ومددگار ہے۔اس کتاب میں بہت کچھ ہے جس کا عُشرعشیر بھی بیان نہیں ہوا۔اس اہم کام کے لئے نورالہدیٰ صاحب کو بہت بہت مبارکباد۔

....

مؤلف:ڈاکٹر پروفیسر کرامت علی کرامت ص:۴۴۰ قیمت:۳۰۰؍روپے

ناشر:اڈیشا اردو اکاڈمی بھوبنیشور مبصر:ایم نصراللہ نصر (9339976034)

تالیف وترتیب کا کام یوں تو دیکھنے میں بہت آسان لگتا ہے لیکن حقیقتاً یہ کام اتنا بھی آسان نہیں ہے جسے کوئی بھی کرلے۔سب سے مشکل کام مواد کا اکٹھا کرنا ہے وہ بھی اصلی شکل میں۔اس کے لئے لائبریریوں اور معاونین کے دروں پر دستک دینا پڑتی ہے۔لمبی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔کافی صرفہ بھی آتا ہے۔وقت کی زیاں کاری بھی خوب ہوتی ہے۔راہ میں حائل نادیدہ پریشان کن حالات کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔تصدیق وتحقیق کا معاملہ بھی پیش آتا ہے۔پھر جاکر ایک تالیف یا ترتیب منزل مقصود کو پہنچتی ہے۔کتابی شکل میں شائع کرنا ہو تو مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے جو ایک بڑا مسئلہ ہے۔

پروفیسر کرامت علی کرامت کے پاس ایسے بہتیرے ادبی نوادرات محفوظ ہیں جن کی اہمیت اردو ادب میں کسی ادبی خزینہ اور دفینہ سے کم نہیں۔نیز اگر ان کو منظر عام پر نہ لایا گیا تو ضائع بھی ہوسکتے ہیں۔جیسا کہ اس کتاب کے سلسلے میں یہ عقدہ کھلا ہے کہ ماہرِ اقبالیات شیخ حبیب اللہ کی ادبی شخصیت اڑیسہ کے فنکاروں میں کافی اہمیت کی حامل تھی۔موصوف نے اقبال کے تعلق سے اتنے مضامین لکھے ہیں اور اتنے مختلف زاویے سے اقبال کو پیش کیا ہے کہ ماہرین اقبالیات بھی انہیں سلام کرنے سے گریز نہیں کرتے لیکن جیسا کہ ہماری ادبی تہذیب کی روش رہی ہے کہ وہ زندگی میں تو گھاس ڈالنے سے گریز کرتی ہے بعد از مرگ کسی کسی کو یاد کر کے اسے عرش تک پہنچانے کا کام بھی خوب کرتی ہے اور کسی کی ذات پر پڑی دبیز گرد کو جھاڑنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں فرماتی۔میر،غالب،اقبال اور بھی دوسروں کے ساتھ یہی مرحلہ پیش آیا۔انہیں بھی زندگی میں وہ قدر ومنزلت حاصل نہ ہوئی جو وفات کے بعد ملی۔

شیخ حبیب اللہ جب قریب المرگ ہوئے اور انہیں موت کی آہٹ محسوس ہوئی تو انہیں اپنی تخلیقات وتصنیفات کے ضائع ہوجانے کا خدشہ ستانے لگا۔چاروں سمت نظر دوڑانے کے بعد انہیں ڈاکٹر کرامت علی کرامت کی شخصیت پر یقین کامل ہوا کہ یہی شخص اس کی حفاظت کرسکتا ہے۔لہٰذا اپنے تمام سرمایۂ ادب کو ایک بستے میں ڈال سائیکل پر رکھ کرامت صاحب کے دولت خانے پہنچ گئے اور ان سے گزارش کی کہ وہ اس کی حفاظت فرمائیں۔پھر دو مہینے کے بعد وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔کرامت صاحب نے اس کی حفاظت نیک نیتی سے کی اور موقع کی تلاش میں لگے رہے۔اللہ بھلا کرے موجودہ اراکین اڈیشا اردو اکاڈمی کا کہ کرامت صاحب کی گزارش پر اس نادر ادبی دفینہ کو کتابی شکل میں شائع کر کے برباد ہونے سے بچالیا۔اس کے لئے وہ بے حد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس کتاب میں کرامت صاحب کا طویل اور تحقیقی مقدمہ بھی شامل ہے جو مطالعے سے تعلق رکھتا ہے جس میں

انہوں نے مذکورہ راز کو برہنہ کیا ہے۔ نیز شیخ حبیب اللہ کی شخصیت اور ادبی حیثیت کو اجاگر بھی کیا ہے۔ ان کی تخلیقات پر تبصرہ بھی فرمایا ہے جس کے لئے وہ بھی مبارکباد کے حقدار ہیں۔ کرامت صاحب کی تحقیقات اور انکشافات کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

☆ ''علاؤالدین خلجی اور فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے فارسی زبان اڑسہ پہنچ کر اڑیا زبان پر اثر انداز ہونے لگی تھی لیکن یعقوب چرخی کے پوتے خانِ دوراں سید محمود کی صوبے داری کے دور (1667-1660) میں مرزا عبدالقادر بیدل کے کٹک آنے کے بعد ہی سے یہاں اردو اور فارسی شعروادب کا تسلسل کے ساتھ ارتقائی عوامل کا سراغ ملتا ہے۔''

☆ ''یہاں کے تخلیقی فن کاروں میں شیخ حبیب اللہ بھی ہیں۔ ان کا تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے تھا۔ شیخ حبیب اللہ نے نثر میں فکشن نگاری، مضمون نگاری، تنقید نگاری، انشائیہ نگاری اور ڈراما نگاری کا میدان منتخب کیا اور ہر میدان میں اپنی تخلیقیت کے جواہر سے دائمی نقوش ثبت کیے ہیں۔''

☆ ''موصوف زندگی بھر اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا غائر مطالعہ کرتے رہے اور ان کے فکر وفلسفہ کے بحر بیکراں میں غوطہ لگاتے رہے۔''

☆ ''ان کی تخلیقات ہند کلکتہ، آجکل دہلی اور پھر شاخسار کٹک، فروغ اردو لکھنؤ، صبح امید بمبئی، شیرازہ کشمیر، اقبال آسنسول، طلسم حرف کھنڈوہ جیسے رسائل کے اوراق کی زینت بنتی رہیں۔''

مطلب یہ کہ کرامت صاحب نے وعدہ تو نبھایا ساتھ ہی ان کی تخلیقات کا گہرا مطالعہ بھی کیا اور خوبصورت مقدمہ لکھا۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ بیشتر علمائے ادب اور ناقدین علم وفن نے اقبال کے اردو کلام اور ان کی اردو شاعری پر ہی گفتگو کی ہے لیکن شیخ صاحب نے اقبال کی فارسی شاعری کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور معلوماتی تجزیہ بھی پیش کیا ہے جن کی ماہرین اقبالیات نے کھل کر تعریف کی ہے خصوصی طور پر جگن ناتھ آزاد نے انہیں عقیدت واحترام کا اظہار بھی کیا ہے۔

دراصل مؤلف کی بات اپنی جگہ لیکن مصنف کی بات نہ کریں تو یہ سراسر ناانصافی ہوگی۔ مرتب نے بھی انہیں کی بات کی ہے۔ بیشک شیخ صاحب کی ادبی شخصیت قابلِ صداحترام ہے۔ انہوں نے جس زاویے سے اقبال کو پڑھا ہے، سمجھا ہے اور ان پر مضامین اور مقالے قلم بند کیے ہیں اس کی تعریف اور دادو تحسین لازمی ہے۔ اس کتاب میں صرف اور صرف اقبال کے تعلق سے شیخ صاحب کے ۳۸ مضامین شامل ہیں۔ جن کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں:

علامہ اقبال، اقبال کا جوہر ادراک، غالب اقبال اور روداد عشق، غالب اقبال اور افسانۂ دل، اقبال کی ہندی مہاپرشوں سے عقیدت مندی، غالب اقبال اور پروردگار، اقبال اور یوروپی مفکرین، اقبال غالب اور صنف نازک، پریم چمد اور اقبال، اقبال غالب اور سماوات، علامہ اقبال کی پیشن گوئیاں، اقبال اور ٹیگور، ابلیس اقبال کی نظر میں، عظمت آدم اور اقبال، حافظ اور اقبال، کارل مارکس اور اقبال، اقبال کا تصور مومن، جمہوریت اور اقبال، اقبال اور رومی اور متعدد دیگر مضامین۔ ان مضامین کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نے صرف اقبال کا ہی

مطالعہ نہیں کیا بلکہ دیگر اہم ادبی شخصیات کو بھی اسی فکر و نظر سے پڑھا اور اقبال کی انفرادیت اور عظمت کو تلاش کیا۔ شیخ صاحب کا ایک ایک مضمون کافی ادبی اور تنقیدی مواد کا حامل ہے۔ جس سے واقفیت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ پہلے ہی مضمون میں عطیہ فیضی کی زبان میں اقبال کی یورپ میں شہرت و مقبولیت کا راز افشا کیا ہے۔ یوروپین مشاہرین ادب کی نظر میں اقبال کتنے محترم تھے مختلف واقعات کے اذکار و تمثیل کے ساتھ بتایا ہے جو نہایت معلوماتی ہے۔ اقبال کا جوہر ادراک بھی دوسروں سے بہت مختلف تھا۔ ان کی نظر تیز اور فکر کافی گہری تھی۔ ان کا تصور مرد مومن، فلسفۂ خودی، عظمت شاہین، سپند، شری کرشن، بھرتری، رومی اور گوئٹے سے ادبی تعلقات۔ طلسم زمان و مکان کا نظریہ گویا کیا نہیں ہے اس کتاب میں۔ اس کا مطالعہ ہر خاص و عام ادیب شاعر اور ادب پسند کے لئے کافی مفید ہے۔

اللہ سے التماس ہے کہ جس طرح ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے شیخ صاحب کے ادبی خزانے کو برباد ہونے سے بچالیا اسی طرح ان کے پاس جو بھی ادبی ذخائر مسودات کی شکل میں پڑے ہیں کسی وسیلے سے وہ بھی منظر عام پر آجائیں۔ اللہ اس کا انتظام کرے آمین۔ کرامت صاحب اور ادارہ اڈیشا اردو اکاڈمی کا ایک بار اور شکریہ۔ فی الحال اکاڈمی کافی فعال ہے۔ سلسلہ جاری رہے۔

....

نام کتاب: بہار شرر بار (افسانے) مصنفہ: ڈاکٹر رضوانہ ارم قیمت: 200 روپئے اشاعت: 2018
رابطہ: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس کالج، جمشید پور، جھارکھنڈ-1 مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر رضوانہ ارم ایک معروف شاعرہ، افسانہ نویس اور تنقید نگار کے طور پر مستحکم شناخت رکھتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستگی ہے اور علم و ادب سے والہانہ محبت ان کا شیوہ ہے۔ ''بساط آرزو'' (مطبوعہ 2010ء) کے نام سے غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آیا۔ یہ ایک توانا اور افکار نو سے آراستہ شعری اثاثہ ہے جسے شعر پسند قارئین و ناقدین نے اسے نہ صرف پسند کیا بلکہ امکانات کے روشن پہلو کی جانب اشارہ بھی کیا۔ ''فیض احمد فیض کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے انہوں نے تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی کو شائع کیا اور اپنی تنقیدی و تحقیقی کاوشوں کو استحکام بخشا نیز اپنے افکار سے فیض کے نئے گوشوں کی جانب اشارے بھی کئے۔ افسانہ نویسی کی جانب ان کی خاصی توجہ رہی ہے۔ رسائل و جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوئے ہیں اور بھیڑ سے الگ نئی کہانی کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ زیر مطالعہ افسانوی مجموعہ ''بہار شرر بار'' ان کا پہلا مجموعہ ہے۔

اس مجموعے میں کل اکتیس افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے عنوانات ایک نظر میں متاثر کرتے ہیں اور معنی کی نئی دنیا سے ہمکنار ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ''گل مہر خواہشیں''، ''عکس رخ یار''، ''بہار شرر بار''، ''شمع سوزاں''، ''جویائے الفت''، ''خواہش کی جل پری''، ''طلسم خواب ہفت''، ''تھوڑی بارش تھوڑی دھوپ''، ''آتش کدہ ذات''، ''چاند میں تیرتی کشتیاں''، ''عذر کوتاہیٔ الفت''، ''شہر خواب تمنا'' وغیرہ افسانے عنوان کی جدت اور الفاظ کی حسن گری کے سبب مطالعے کی خواہش کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے افسانے صرف نسائی جذبات کے اظہار

کا وسیلہ نہیں ہیں بلکہ احتجاج، مقام و مرتبہ کی خواہاں خواتین کے درد، مرد اساس سماج میں عورت کی اصل صورت اور کئی مسائل سے نبرد آزما ہماری آدھی آبادی یہاں موجود ہے۔ ان کی تخلیقی پروان اپنی بلندیوں کو چھوتے ہوئے قصۂ دل و جان بیان کرکے چونکانے اور سوچنے کو مجبور کرتی ہے۔ عورت کے سامنے مرد اور اس کی سرشت کا نظریہ ملاحظہ کریں اور حقیقت سے روبرو ہونے کی کوشش کیجئے: ''کچا ریشم'' کی حمیرا اور افسانے کے مزاج کا اندازہ ان جملوں سے کیا جاسکتا ہے۔

''حمیرا کی شخصیت کو مورد الزام ٹھہرانے کے لئے اس نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر یہ سازش رچی اور جی بھر کر زمانے بھر میں رسوا کیا۔ کمال، چالاکی سے اپنے بے ہودہ کردار کا مکروہ سچ کسی پر فاش ہونے سے قبل ہی نیا تماشا کھڑا کر دیا کہ مبنی بر پدری معاشرہ، مردوں کی سفاکیوں اور گناہ عظیم پر جیسے چپی سادھ لیتا ہے کہ مرد تو ایسے ہی ہوتے ہیں، گویا ان کا بدکردار عیاش و فحاشی ہونا ایک آفاقی سچ ہو اور مرد کے ساتھ شرافت کا تصور کوئی گالی ہو، مگر عورت کے لئے ہر گام اگنی پر کچھا کا ہون کنڈ تیار ہے خواہ وہ کیسی ہی مثالی سیرت اور پاکیزہ کردار کی ملکہ کیوں نہ ہو، آگ پر ننگے پاؤں چلنا تو اس کا مقدر ہے، اگنی پر کچھا تو انہیں کو دینی پڑتی ہے، جن پر سیتا اور مریم ہونے کا گمان ہو۔''

رضوانہ ارم اظہار کے لئے الفاظ کا نیا پیکر تیار کرتی ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں اس قدر مشاقی کا ثبوت دیتی ہیں کہ فقرے ایک جہانِ معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ انہوں نے عام کہانیوں کی ڈگر سے تھوڑا الگ ہو کر اپنی تخلیق کو سنوارا ہے۔ یہاں ماجرا نگاری واضح نہیں مگر تہہ بہ تہہ موجود ہے۔ کردار کھل کر گرد و پیش کی عکاسی نہیں کرتے مگر ایک طاقتور عنصر کے طور پر افسانے میں اپنی موجودگی کا احساس کراتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے میں شاعری کی شمولیت سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ موقع محل اشعار سے افسانوی بنت کو آگے بڑھاتی ہیں۔ بیانیہ میں شاعری کا لطف ان کی شعری کاوشوں میں دلچسپی کا مظہر بھی ہے۔ وہ کہانی بنتے بنتے شعر کہنے لگتی ہیں اور شعر کہہ کر پھر افسانے میں واپس ہوتی ہیں۔ ان کا یہ انداز دوسرے افسانہ نگاروں سے انہیں الگ کرتا ہے۔

ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ایک دلکش نثری بیانیہ کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نیم خوابیدہ ماحول میں کوئی کانوں میں مانوس اور نامانوس گفتگو کرتا چلا جا رہا ہو۔ اس گفتگو میں عمدہ نثر کی چاشنی بھی ہے تو شعر کی نزاکت اور اس کا حسن بھی۔

کہانویت سے لبریز ایک دردمند کہانی ''گھروندہ کانچ کا'' کی ساوتری اور ان کے بیٹے کا قصہ دل کو چھو جاتا ہے۔ عورتوں کے عادات و اطوار بحیثیت ماں کے ان کی الفت و عظمت معاشرے کی سچائی اور قدرت کا اپنا نظام اس کہانی کو کامیاب کہانیوں کے صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ رضوانہ ارم جہاں نئی کہانی خلق کرنے میں مہارت رکھتی ہیں وہیں روایت سے حاصل معیاری افسانے بھی ان کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

''بہار شر ربار'' کے پیش لفظ میں افسانہ نویس صاف طور پر لکھتی ہیں: ''اس افسانوی مجموعے کا لفظ لفظ آگہی کی شدت کا استعارہ ہے، حرف حرف اذہان و روحانی کرب اور شدت جذبات و احساسات کو زک پہنچانے کا ردعمل

ہے کہ "Knows where the shoes pinches only the wearers" اسی اظہاریہ کی روشنی میں ان کے افسانے واقعی ایک ردعمل ہے آج کے سماج کے فرسودہ افکار کے خلاف۔ ان افکار میں نسائی مسائل کی گھیرابندی اوراس سے نکلنے کی چھٹپٹاہٹ بھی موجود ہے۔ ''خواتین کا ادب'' کے عنوان سے جو اقتباسات مصنفہ نے شامل کئے ہیں ان سے عورتوں کی پرقوت موجودگی نیز سماج وادب کے آئینے خانے کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ ''گفتنی'' کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے رضوانہ ارم کے افسانوں کے باطن سے موتی نکالے ہیں اور لکھا ہے کہ ''وہ اپنے آس پاس کی چیزوں کو باریک بینی سے دیکھ کرمحسوس کر کے ان کی مصوری، عکاسی اور ترجمانی کرتی ہیں۔''

یہ کتاب خوبصورت شائع ہوئی ہے۔ یقین ہے افسانے قارئین پسند کریں گے اور فکشن ناقدین اس میں شامل افسانوں پر اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں گے۔

....

نام کتاب: احساس نگر (نظمیں) شاعر: ایم۔نصر اللہ نصر ص: ۱۶۰ قیمت: ۱۵۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۹

پتہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A، ستین بوس روڈ، ہوڑہ (مغربی بنگال) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ایم نصر اللہ نصر کا قلم تیز گام ہے۔ ان کی تصنیفات ''امکان سے آگے'' (شعری مجموعہ)، ''افہام ادب'' (تنقید و تحقیق)، ''انتقاد واستبصار'' (تنقیدی مضامین)، ''ثنائے رب'' (حمدیہ کلام)، ''بنگال میں اردو نظم نگاری: آغاز تا حال'' اور ''سخن سرائے'' (شعری مجموعہ) ان کی ادبی شناخت نامے کے روشن ستارے ہیں۔ مذکورہ فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے نثر اور نظم دونوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ پیش نظر مجموعہ ''احساس نگر'' ان کی نظم نگاری سے وابستگی کا مظہر ہے۔

نظموں کے اس مجموعے کو انہوں نے تین عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ ''شہر موضوعات'' سب سے طویل باب ہے۔ اس میں ''کبھی تو آؤ''، ''تم ایسا سوچنا چھوڑو''، ''عجیب رشتہ ہے''، ''گھر میں اب شور نہیں ہوتا ہے''، ''سال کی آخری شب''، ''خدشہ''، ''خواب موسم رنگ'' نظموں میں احساس کی وہ دنیا آباد ہے جس سے کہیں طنز تو کہیں ہمدردی کے بول ابھرتے ہیں۔ ''ماں''، ''ہوا''، ''فسانۂ الفت''، ''وہ اگر مل جائے''، ''خاموش کیوں ہو''، ''وقت''، ''وہ چند لمحے'' وغیرہ میں جذبات کی لَو تیز ہے۔ اس حصے میں ''اف! یہ مچھر'' نظم سادہ ہے مگر اس میں غضب کی نشتر زنی کی گئی ہے۔ یہ تخلیق فکری پختگی اور معاشرے میں موجود مچھر نما لوگوں کی سچائی پر محیط ہے۔ اس نظم کے آخری سطور ملاحظہ کیجئے اور نصر اللہ نصر کو داد دیجئے:

''ہمارے بیچ بھی مچھر نما انساں ہیں بہت/ جو لہو چاٹتے ہیں/ خون بھی پی جاتے ہیں/ جان کے یہ بھی بڑے دشمن ہیں/ اف! یہ مچھر عجیب مچھر ہیں۔''

''شہر شخصیات'' میں قیصر شمیم، حامی، معید رشیدی، ڈاکٹر محمد شمشیر عالم، شمس افتخاری، شمس الزماں انصاری، ڈاکٹر معصوم شرقی، نذر الاسلام، خواجہ جاوید اختر، علقمہ شبلی، اشہر، ظ۔ انصاری، عرفان بنارسی، فہیم اختر کے تعلق سے

نظمیں متاثر کرتی ہیں ۔ یہ باب پہلے باب کی نظموں سے زیادہ اپیل کرتی ہیں ۔شخصیات کی خوبیاں اور ان کے کارنامے ذہن میں بہ آسانی ابھر آتے ہیں۔ ''شہر اطفال'' بچوں کے لئے لکھی گئی نظموں پر محیط ہے۔ ''قدموں کے نیچے ماں کے جنت چھپی ہوئی ہے''، ''سردی آئی''، ''میرے ابو کتنے اچھے''، ''تارے''، ''سائل''، ''لوری''، ''اللہ تیرے کتنے نام''، ''بچوں کی عید''، ''گاؤں کی عید'' اور ''بول سدا تو میٹھے بول'' ادب اطفال میں اضافہ ہیں ۔ بچوں کے لئے شاعری ان کی نفسیات کے عین مطابق ہو تو کامیابی ملتی ہے ورنہ اس میں انفرادیت ممکن نہیں ہے۔ نصر اللہ نصر بچوں کی ذہنیت، عمر اور تقاضے سے واقف ہیں اور عام فہم انداز سے بچوں کو لبھانے میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے اپنی بات کے عنوان سے نثری اظہاریہ میں اردو نظم نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے سچائی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''......آج نظمیں زیادہ لکھی جا رہی ہیں کیونکہ یہ پابند سے آزاد اور مزید آزاد ہو گئی ہے۔ اب نثری نظمیں زیادہ کہی جا رہی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی چیز کی زیادتی اس کے معیار کو گھٹا دیتی ہے۔ آج کل نظمیں تو سیر کے بھاؤ لکھی جا رہی ہیں مگر نظم نگاری کے تقاضے کو طاق پر رکھ کے۔ اس طرف نظم نگاروں کو تو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

اس نکتے کو ذہن میں رکھئے اور ''احساس نگر'' کا مطالعہ کیجئے تو آپ مایوس نہیں ہوں گے بلکہ نصر اللہ نصر کے احساس جدید کی ترجمانی پہ آپ خوشگوار احساس سے شرابور ہوں گے۔ ان کے یہاں عصری معاملات و حادثات کے زیر اثر رونما ہونے والے حالات کی سنگینی اور سماجی برائیوں کی جانب واضح نظریہ موجود ہے۔ ان کی نثری نظموں میں مقصدیت ہے صرف الفاظ کی ثبت کاری نہیں ہے۔ یہ مجموعہ قارئین کے درمیان مقبول ہوگا۔ اس امید کا اظہار کرتے ہوئے بچوں کے لئے نظم ''بول سدا تو میٹھے بول'' کے دو اشعار پیش کرتا ہوں جو ان کے افکار کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے:

بول سدا تو میٹھے بول — اپنے منہ کو جب بھی کھول
لفظ لفظ میں امرت گھول — تلخ نہ ہو لہجہ تیرا

....

نام کتاب: شیر کا احساس اور دیگر افسانے افسانہ نگار: اوبناش امن ص: ۱۶۰ اشاعت: 2019
قیمت: 200 روپئے پتہ: شیو چندر پتھ-۲، کالی مندر روڈ، ہنومان نگر، پٹنہ-۲۰ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

اوبناش امن شاعری اور نثر نگاری دونوں سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''ابر رواں'' ہے۔ ان کی غزلیں متاثر کرتی ہیں اور سبک رواں انداز دل لبھانے میں کامیاب ہے۔ انہوں نے ''ٹیوشن کے جھمیلے'' پیش کر کے انشائیہ نگاری میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ ترجمہ نگاری کے ذریعے بھی امن جی نے ادب میں اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ انہیں افسانہ پڑھنا اور لکھنا بے حد عزیز ہے۔ ان کے افسانے اردو کے موقر رسالے میں شائع ہوئے ہیں اور قارئین نے پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

''شیر کا احساس'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں پندرہ افسانے شامل ہیں جن کے عناوین اس طرح ہیں۔ ''کہانی کے آگے کی کہانی''، ''خوف''، ''صبح کیوں نہیں ہوتی''، ''شیر کا احساس''، ''قلی گاڑی''، ''اشتراکیت

کی جیت''،''عقرب''،''جاگتی آنکھوں کا سراب''،''پل صراف''،''سمندر کی خاموشی اور تنو بھائی''،طوطے کی فطرت''، ''مداری''،''سجن پور ہائی اسکول''،''بکھرتے آشیانے''اور''گھوڑا'' افسانے موضوعاتی تنوع رکھتے ہیں۔'کہانی کے آگے کی کہانی' آج کی زندگی اور افکار تازہ کی کہانی ہے۔ بیٹی کی ذہنی ارتقا ہمارے سماج کی کثافتوں کو درشاتا ہے۔ مشابہ کی کہانی کا یہ انجام سچائی اور آج کی زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔''کون کہتا ہے کہ تمہیں سولی پر چڑھایا جائے گا؟'' کہتا ہوا راجا نے اپنی تلوار نکالی اور ایک ہی جھٹکے میں لکڑ ہارے کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔اس طرح سچ کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کر دی گئی۔'' افسانہ 'خوف' میں بڑھیا اور بکرے کو بھولنا آسان نہیں ہے۔ یہ افسانہ انسانی عظمت کی گاتھا اور مکروہ سماج کی کارکردگی کا بیانیہ ہے۔'صبح کیوں نہیں ہوتی' فکر انگیز کہانی ہے۔زبردستی کے لادے ہوئے رشتوں اور مافی الضمیر کی پکار اور نفسیات اس میں موجود ہے۔''شیر کا احساس'' اس مجموعے کا سرنامہ افسانہ ہے۔ یہ انسان کے اس احساس کا قصہ ہے جس میں زندگی اور موت کی کوئی حقیقت نہیں۔محسوسات کی برتری کی نفسیات دیا شنکر کو اس مقام پہ لے جاتی ہے جہاں موت کی خوبصورتی ہے صرف تماشہ نہیں۔''اشتراکیت کی جیت'' میں انصاری لڑکی کی تعلیم اور اس کی راہ میں آرہی رکاوٹوں کو سچائی سے بیان کیا گیا ہے۔مرداساس سماج میں اس طرح کے واقعات عام ہیں مگر اس عام سے واقعہ کو اویناش امن نے خاص بنادیا ہے ٹرین کی بوگی اور لال سلام کی حرکتوں کی تصویر کشی کر کے۔''جاگتی آنکھوں کا سراب'' خوبصورت افسانہ ہے۔اس کا اختتام اتنا شاندار ہے کہ دوبارہ تیبارہ پڑھنے کو جی چاہے۔جذبات کی تیز لو سے آپ کا سخت دل بھی پسیج جائے گا۔ثنا اور پارول سے قربت اور اخبار کی سرخی اسے اس دنیا کی سچائی سے اچانک روبرو کر دیتا ہے جس کی نفسیات یاد ماضی اور عجیب وغریب خیالات کی جنم داتا ہے۔ ''طوطے کی فطرت'' میں خورشید صاحب کا درد اس طرح جھلکتا ہے کہ طوطے کی جگہ وہ کتنے کا بچہ پالتو گھر لے آتے ہیں۔ان کا بیٹا فیض انہیں چھوڑ کر جارہا ہوتا ہے اور وہ گھر سے غائب ہوتے ہیں۔عین روانگی کے وقت وہ آتے ہیں اور گویا ہوتے ہیں کہ'' بیٹے اب تم لوگ تو جا ہی رہے ہو تو ہمیں تنہائی دور کرنے کے لئے کچھ تو چاہئے تھا۔سوچا ایک پالتو جاندار گھر میں رکھ لوں......اور دیکھو اس بار میں طوطا نہیں لایا بلکہ تمہارے کہنے کے مطابق کتا ہی لایا ہوں۔'' یہ افسانہ آج ہمارے بزرگوں کے تنہائی کے المیہ کو بیان کرتا ہے۔''سجن پور ہائی اسکول'' ہمارے سماج اور نیتاؤں کی منافرت نیز سیاسی فائدہ رسانی پر مبنی کہانی ہے۔آپ کی قربانیوں پر پانی پھیرنے کے لئے نیتاؤں کا منصوبہ کافی ہے۔

اوویناش امن کے افسانوں میں سب سے زیادہ اپیل کرنے والا نکتہ ان کی انسان دوستی اور معاصر معاشرہ کی تصویر کشی ہے۔وہ جن موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں انہیں نفسیاتی پہلو سے بھی دیکھتے ہیں۔کوئی بھی افسانہ پڑھ جائیے ان کی فکری استعداد اور فنی چابک دستی کا دلدادہ ہو جائیں گے۔ان کی زبان سہل اور پُر اثر ہے جو افسانے کو قاری کے دلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہے۔اس مجموعے میں شامل پروفیسر اسلم جمشید پوری (اوویناش امن کی افسانہ نگاری: اردو افسانے میں ایک لطیف جھونکے کی آمد) اور شہاب ظفر اعظمی (اوویناش امن کے افسانے) کی تحریروں میں افسانہ نگار اوویناش امن کی کاوشوں کو سراہا گیا ہے۔اوویناش امن نے''بہت دنوں کی بات ہے......'' میں اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔فکشن کے سنجیدہ قارئین کو تازگی سے بھرپور اس مجموعے کا

مطالعہ کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے اس مجموعہ کو پسند کیا جائے گا اور اوینا ش امن کی شناخت بحیثیت افسانہ نگار مستحکم ہوگی۔

....

نام کتاب: اڑان سے آگے (غزلوں کا مجموعہ) شاعر: ثناء اللہ ثنا دوگھروی قیمت: 250 روپے
سال اشاعت: 2019 پتہ: مقام و پوسٹ: دوگھرا، وایا: جالے، ضلع: دربھنگہ (بہار) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

''اڑان سے آگے'' ثناء اللہ ثنا دوگھروی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ثناء دوگھروی نے بچوں کے لئے قابل قدر شاعری کی ہے۔ صحافت سے بھی ان کا تعلق ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں ان کی صاف گوئی ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''......جو باتیں میرے مشاہدے میں آتی ہیں، جو میں محسوس کرتا ہوں گردوپیش میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں، جو دل کو چھو جاتے ہیں، جن سے دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا، کوشش کرتا ہوں کہ اسے بہتر انداز میں الفاظ کا جامہ پہنا سکوں۔ شعر کہتے وقت میں یہ نہیں سوچتا کہ ناقدین ادب میرے اشعار کو کس زمرے میں رکھیں گے یا اس کا کیا مقام ہوگا، میں تو بالکل آزادانہ طور سے بس اپنے دل کی آواز کو منظم طور پر پیش کرنے کے شوق کی تکمیل کیلئے شعر کہتا ہوں۔ اتنا ضرور لحاظ رکھتا ہوں کہ میری شاعری فنی خامیوں سے پاک اور اعلیٰ اقدار کی ترجمان ہو۔'' (اڑان سے آگے: ۲۹-۲۸)

اس روشنی میں ان کے پہلے مجموعہ کلام کی شاعری کا مطالعہ باعث انبساط ہے کہ ان کے یہاں صدائے دل کی فراوانی ہے اور حالات حاضرہ سے آنکھیں ملانے کی جرأت بھی:

ہر بات ہر اک کو تو بتائے نہ بنے ہے
حق بات مگر مجھ سے چھپائے نہ بنے ہے

کرتی رہتی ہے مسلسل یہ نئی فرمائش
کچھ نہ کچھ زندگی ہر لمحہ نیا چاہتی ہے

چمن میں ہے نفرت کی آگ ہر جانب
تم ہی بتاؤ کہاں آشیاں کی بات کروں

بیج نفرت کیو بوتے ہیں دلوں میں سب کے
ایسے لوگوں کی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

محبت کا بھرم میں نے کہاں، کس دم نہیں رکھا
بہت رکھا، مگر پلکوں کو اپنی نم میں رکھا

اس نے آنکھوں سے پلایا ہے نہ جانے کیا کچھ
بے خودی کا ہے کو جائے گی اب اس جام کے بعد

درد دل کا مرے سامان ہوا چاہتی ہے
ایک تصویر جو آنکھوں میں بسا چاہتی ہے

بدن اس کا اگر ہے مشک و عنبر
تو سانسوں میں بسا کر دیکھتے ہیں

ہر ایک آن نئے امتحان میں گذرا
ہر ایک سانس مصائب کا سلسلہ ہے کہ بس

مذکورہ اشعار بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں فکر کی جیوتی سے جو دنیا روشن ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ثنا دوگھروی پیار و محبت کا پیامبر ہیں۔ سماج میں نفرت کو محبت سے بدلنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مسائل زندگی کا احساس ان کی شاعری میں ہے تو اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے حوصلے کی باتیں کرتے ہیں۔ سادہ بیان ان کی خوبی ہے۔ سادگی سے اہم مسائل ہمارے روبرو کر دیتے ہیں اور انداز اتنا دل پذیر کہ شاعری دل میں گھر کر جاتی ہے۔

اس مجموعے میں ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر محسن رضا رضوی اور ڈاکٹر توقیر عالم توقیر کی تحریریں شاعر اور ان کی شاعری کو جاننے کا وسیلہ ہیں۔ ڈاکٹر عطا عابدی کی رائے سے اتفاق ہے کہ:

''...... جہاں اس نے آرزوئے قلب کا اظہار کیا ہے وہیں زخم جگر کو بھی شعری پیکر دینے کی کاوش و جستجو حال و آئندہ سے منسوب خوابوں کی حسین تعبیر کے مترادف ہے۔''

ہارڈ پیپر بیک والی یہ کتاب خوبصورت شائع ہوئی ہے۔ سرورق کی عکاسی بامعنی اور متاثر کن ہے۔ بیک پر ان کی شاعری کی اختصاص سے مزین آراء موجود ہیں۔ یقین ہے اس پہلے مجموعے سے ثناء اللہ دوگھروی کی شاعری سے قارئین استفادہ کریں گے اور مزید ممکنہ دل پذیر شاعری کا انتظار کریں گے۔

....

نام کتاب: میں نے کہا......؟ (شعری مجموعہ) شاعر: اطیب اعجاز ص: قیمت: 200 روپے
اشاعت: 2018 پتہ: 241-10-9 رسالہ بازار، قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد-8 مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

طیب اعجاز کا پہلا شعری مجموعہ ''لمس کی خوشبو'' 2001 میں شائع ہوا اور اس کی مقبولیت کے سبب کئی ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ ''رفاقتوں کے درمیان'' (مارچ 2004ء)، ''لفظ لفظ خوشبو'' (2007ء) اور ''دھڑ کن دھڑ کن صل علیٰ'' کے ذریعے انہوں نے اپنی شاعری قارئین کے حوالے کی۔ ان کی غزلیں اور گیت کو گلوکاروں نے بھی گائے ہیں۔ ان کے سی۔ ڈی اور آڈیو البمس بھی دستیاب ہیں۔ پیش نظر مجموعہ اردو اور انگریزی میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں حمد، نعت پاک، نعتیہ گیت، غزلیں، نظمیں اور گیت شامل ہیں۔

اطیب اعجاز نے معاصر صورت و حالات پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنی شاعری کو پُر قوت بنایا ہے۔ عصری آگہی اور انسانیت کی سربلندی ان کا خاص موضوع ہے۔ حمدیہ اور نعتیہ اشعار ان کی شخصیت کا نمایاں رنگ ہے جس رنگ ہے جن سے ان کی مذہبی وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حمد و نعت کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

تیرا بندہ ہوں ناز ہے تجھ پر — تیری جانب ہو ہر قدم اللہ
جنت کا بے گمان وحقدار ہو گیا — اپنا لیا ہے جس نے اسوہ رسول کا
تاثیر پوچھتے ہو کیا ان کی زبان کی — کنکر بھی پڑھنے لگتے ہیں کلمہ رسول کا

ان کی غزلیں قدیم و جدید رنگ سے آراستہ ہیں۔ انہوں نے جذبات دل کا برملا اظہار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ اس وجہ سے ان کے یہاں عشقیہ شاعری کا رجحان حقیقت سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ رواں اور سہل انداز سے وہ قصۂ دل کہہ جاتے ہیں:

اچھے اچھوں پہ ہو غشی طاری — اس کا حسن و جمال مت پوچھو
چوٹ سہہ کر مسکرانا اور ہے — مسکرا کر دل دکھانا اور ہے
موسم گل کے تقاضے اور ہیں — زندگانی کا فسانہ اور ہے
اپنی مٹی کی لاج رکھی ہے — اوڑھ لے کیوں نہ یہ کفن مٹی

سورماؤں کا ذکر ہی کیا ہے کیسے کیسوں کو کھا گئی دنیا
نام ور، باکمال لوگوں کے نقش سارے مٹا گئی دنیا
ہے زندگی مرے بس میں بھی بس کے باہر بھی یہ دسترس میں بھی ہے دسترس کے باہر بھی

''میں نے کہا...؟'' مجموعہ میں پروفیسر محمد عبدالرزاق فاروقی کا مضمون 'طیب اعجاز کی حمدیہ شاعری' شامل ہے۔ اس میں ان کے مجموعے کا جائزہ اس نہج پر لیا گیا ہے کہ حمدیہ شاعری کے اختصاص روشن ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ کہنے میں آسانی ہورہی ہے کہ اطیب اعجاز جیالے فن کار ہیں اور موضوعات پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ جو کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے موزوں اصناف کا انتخاب کرتے ہیں اور اس فورمیٹ کے ساتھ انصاف بھی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ترسیل کا کوئی خاص مسئلہ نہیں۔ البتہ جدید رنگ بھی کہیں کہیں واضح طور پر متاثر کرتا ہے اور معنی کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ اس کا سرورق جاذب نظر ہے۔ بیک پر شاعر کی تصویر سے آشنائی کا در کھلتا ہے ہمیں یقین ہے ان کے دوسرے مجموعوں کی طرح ''میں نے کہا'' کو بھی مقبولیت ملے گی۔

....

نام کتاب: مطالعے کا سفر مصنف: سلیم انصاری ص: ۲۱۴ قیمت: 137 روپے اشاعت: 2019
پتہ: ایچ آئی جی 3 آنند نگر، ادھارتال، جہاں پور، ایم پی-4 مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

اردو شعر وادب میں سلیم انصاری بطور شاعر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''وصل آگہی'' 1996ء میں منظر عام پر آیا اور قارئین نے ان کی سنجیدگی فکر ونظر کو سراہا۔ مطالعہ پسند ہونے کے سبب ادب کی تازہ صورت حال سے واقف ہیں۔ عصری ادب کو بطور خاص مطالعے میں رکھتے ہیں اور مضامین کی شکل میں اظہار رائے بھی کرتے ہیں۔ ان کے مضامین رسائل وجرائد میں شائع ہوتے ہیں جن سے ان کی تنقیدی نقد ونظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب ''مطالعے کا سفر'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مشمولہ ستائیس مضامین شخصی کارناموں اور ادبی خدمات کے حوالے سے تحریر کیے گئے ہیں۔

''اقبال کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر'' میں انہوں نے شاعر مشرق کی شاعری کے بنیادی محرکات کو بیان کرتے ہوئے ان کے پیغامات پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ ''غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش'' ایک اہم موضوع پر محیط ہے۔ غالب کی شاعری میں جو پیکر تراشی اور تصویر کشی موجود ہے ان میں انفرادیت موجود ہے۔ یہ مضمون چیدہ اشعار سے مزین ہے۔ ''لہو بولتا ہے'' کی روشنی میں ستیہ پال آنند کی شاعری (نظموں) کا جائزہ لیا ہے اور عنوان ''ستیہ پال آنند کا تخلیق شعور اور عالمی عصری آگہی'' رکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آنند جی اردو شاعری کے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ان کی نظمیں پُر تاثیر ہوتی ہیں۔ ''مابعد جدید نظم: ایک نا تمام جائزہ'' اور ''1980ء کے بعد کی شاعری کے خدوخال'' اردو شاعری کے توانا عہد کے جائزے پر محیط ہے۔ یہ دونوں مضامین موضوع کو سلیقے سے پیش کرنے اور اہم ناموں کی شمولیت سے پُر ہے۔ کرشن کمار طور اپنی انفرادیت کے سبب اردو شاعری کے افق پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''خاک خمیر کی تخلیقی کائنات'' ان کی شاعری کے باطن

سے گفتگو ہے۔سلیم انصاری نے فکشن کو بھی موضوع تحریر بنایا ہے۔شموئل احمد کے ناول ''گرداب''،وحشی سعید کے افسانے،حیدر قریشی کے افسانے اور نورالحسنین کے ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کئی جگہوں پر بے باکی سے رائے دی ہے۔جہاں انہوں نے قابل تعریف موضوع اور بیانیہ کو سراہا ہے وہیں حقیقت نگاری کے باب میں کئی اشارے بھی کئے ہیں۔

''غضنفر کی شاعری سے ایک مکالمہ''،''زندگی سے مکالمہ کرنے والا شاعر-خوشبیر سنگھ شاذ''،''کبیر اجمل خوشگوار حیرتوں کا شاعر''،''اگلے پڑاؤ سے پہلے-ایک خوشگوار تخلیقی تجربہ''،''عطا عابدی-زخم،زندگی اور خواب کا شاعر''وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن میں مضمون نگار کی سوچ دنیا آباد ہے۔شعراء بطور خاص ہم عصر شعراء کا مطالعہ اور ان کے اختصاصی پہلو کو قلم بند کرنا ذرا جوکھم بھرا کام ہے۔اس کے لئے فکر میں معروضیت اور جذبے میں ایمانداری ہونی چاہئے۔ان کا اقرار ہے کہ ''مجھے یہ خوش گمانی کبھی نہیں رہی کہ مجھ میں کوئی ناقد بھی پوشیدہ ہے۔مگر میری نثر نگاری کے پیچھے یہ بات ضرور ہے کہ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہر ادبی نسل کو اپنا ناقد خود پیدا کرنا چاہئے۔اس لحاظ سے میں شروع سے ہی اپنی ادبی نسل کی تخلیقی سمت و رفتار کا مطالعہ کرنے میں ایک طرح کی طمانیت محسوس کرتا رہا اور ان پر اپنے تاثرات اور ردعمل بھی ظاہر کرتا رہا۔''اس روشنی ان کے مضامین ایک خاص نکتہ کی متقاضی ہونی چاہئے تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے مضامین ان کی بے باکی اور مطالعہ پسندی کی غمازی کرتے ہیں۔امید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔

....

نام کتاب: اوج ثریا(مکمل دیوان غزلیات) شاعر:عبدالمتین جامی ص:۱۷۶ قیمت:200روپے
اشاعت:2019 پتہ: اردو بازار،ڈاکخانہ پدماپور،ضلع کٹک(اوڈیشہ) مبصر:ڈاکٹر مجیر احمد آزاد،دربھنگہ

عبدالمتین جامی کو شعر و ادب سے والہانہ شغف ہے۔ان کے شعری مجموعے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہیں کئی مروجہ اصناف شاعری پر قدرت حاصل ہے۔''نشاط آگہی''(شعری مجموعہ)،''بساطِ سخن(رباعیات)،''مونس سخن''(رباعیات)،''ترانۂ جاوید''(دیوان رباعیات)سے ان کی شاعری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب کہ ''پرانے کپڑوں کا سوداگر''(افسانے)اور''نئی تنقیدی جہات''(تنقیدی مضامین)ان کی نثری کاوشوں کی تمثال ہیں۔انہوں نے ترجمہ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔''بر فیلے کنول''(اڑیا ناول کا ترجمہ)،''خاموشیوں کے نقوش''(منظومات)،''پرتیبھا رائے کے افسانے''ان کے ذریعے کیے گئے تراجم ہیں۔وہ ایک فعال ادبی زندگی گذار رہے ہیں۔زیر مطالعہ کتاب''اوج ثریا''ان کی غزلوں کا دیوان ہے۔

ان کی غزلوں کے اشعار کلاسیکی طرز کے حامل ہیں۔ان کے یہاں جذبات و احساسات کے تمام رنگ بہ آسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔خالص غزل کے اشعار حسن برپا کرتے ہیں اور عشقیہ جذبات کی بھرپور ترجمانی میں کامیاب ہیں تو دوسری جانب ذات کے اندر کا کرب بھی رونما ہوتا دکھائی پڑتا ہے۔درد و الم ہے تو نشاط و سرور کی بھی جلوہ گری ہے۔روح عصر بھی بالیدہ ہے اور آج کے مسائل پوری طرح آشکارا ہیں۔انہوں نے تشبیہات و استعارات سے بھی خوب کام

لیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجربات زندگی کو شاعری کا پیرہن عطا کرنے کی جستجو خوب سے خوب تر ان کے یہاں ہے۔

بھلے ہی راہ پر تم درد کے کچھ خار رکھنا ہمارے ذہن کو ہر موڑ پر بیدار رکھنا

صیاد کے ہاتھوں میں نہ دے تیر جفا کا شاخ غم دوراں پہ ہے جذبات کی چڑیا

پوچھتے ہو بے سبب کیوں دوستی کی عافیت شہر میں محفوظ کب ہے آدمی کی عافیت

وہ اتنا خوب رُو ہے کہ اس کی مثال کیا جیسے کسی کوِی کی کویتاؤں کا ہو چھند

ان کی ہے ضد کہ میں اس شہر میں تنہا رہ لوں سامنے موت رہے پھر بھی میں زندہ رہ لوں

کبھی گر وقت سے آنکھیں ملاکر بات کرتا میری تحویل میں بھی درد کی جاگیر ہوتی

قطرۂ شبنم ہے گویا اپنے فن کا یہ جزیرہ پیاس ہے بے حد اگر تم کو سمندر ڈھونڈنا ہے

مذکورہ اشعار سے ان کے فکرآسمان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کی شاعری میں پختگی ہے اور اپنی راہ نکالنے میں کامیاب وکامران ہیں۔اس دیوان کے آخری چند صفحات پر مشاہیر کی آراء کو شامل کیا گیا ہے۔ان آراء سے عبدالمتین جامی کی شاعری کی خوبیوں کا علم ہوتا ہے۔بلراج کومل، پروفیسر عبدالمغنی، شمس الرحمٰن فاروقی، علی احمد جلیلی، پروفیسر کرامت علی کرامت، مصور سبزواری، ظہیر غازیپوری، پروفیسر عنوان چشتی وغیرہ نے ان کی ستائش کی ہے۔یقین ہے اس دیوان سے عبدالمتین جامی کی شاعری کے دلدادگان میں اضافہ ہوگا اور ان کی شاعری پہ گفتگو ہوگی۔

....

نام کتاب: بیخودؔ کی نثری شناخت ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر محمد منصور عالم ص: 304 قیمت: 400 روپے
اشاعت: 2019 پتہ: پروفیسر عباس علی خان بیخودؔ لٹریری فاؤنڈیشن، 40B، تالتلہ لین، کولکاتا-16
مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر محمد منصور عالم ایک مستند محقق وناقد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔اردو اور فارسی زبان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور انگریزی زبان کو بھی انہوں نے ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ان کی فارسی دانی اور خدمات قابل ستائش ہیں۔متعدد قابل ذکر اداروں سے وابستہ رہے ہیں اور کئی انجمنوں کے روح رواں بھی۔ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور سنجیدہ علمی وادبی حلقے میں پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ان کی ایک اہم کتاب ''پروفیسر عباس علی خاں بیخودؔ: حیات وشخصیت'' کے نام سے شائع ہوئی جس سے بیخودؔ شناسی کے باب میں یکتا ہونے کا جواز دیا ہے۔انہوں نے کئی اہم نامور شخصیات کے کارناموں کو منظر عام پر لانے کا کام انجام دیا ہے جن کو لوگ فراموش کرتے جارہے ہیں۔زیر مطالعہ کتاب بیخودؔ شناسی کی اگلی کڑی ہے۔یہ کتاب تھوڑی الگ نوعیت کی ہے۔اس میں ڈاکٹر منصور کے مضامین بیخودکو جاننے میں معاون ہیں تو جناب بیخود کی نثری تحریریں بھی یکجا کی گئی ہیں۔

اس کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔پہلا باب ''عباس علی خاں بیخودؔ: حیات وشخصیت''، جس میں موصوف کی زندگی اور شخصیت سے وابستہ تمام گوشوں پر خامہ فرسائی ہے۔یہ باب تحقیق کی عمدہ تمثال ہے۔دوسرا باب ''مضامین بیخود پر ایک طائرانہ نظر'' میں بیخود کے مشمولہ مضامین کا جائزہ شامل ہے اور ان نثری ہنرمندی کا ذکر

کیا گیا ہے۔ یہ باب بیخود کی نثر نگاری اور تعین قدر کی راہ ہموار کرتا ہے۔ تیسرے باب میں مضامین بیخود (متن) کے تحت پندرہ مضامین شامل کیے گئے۔ ان مضامین میں شعری پسند کو زیادہ دخل ہے۔ بیخود کی نثر کا مطالعہ شعروادب سے ان کی گہری وابستگی، مطالعہ پسندی اور شعر فہمی سے عبارت ہے۔ غالبؔ، اقبالؔ، داغؔ، شاد، اصغر، پرویز شاہدی وہ اسمائے گرامی ہیں جن سے اردو شعروادب کے توانا خدوخال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ چوتھا باب ''وحشت بیخود کی نظر میں'' ہے۔ یہ باب وحشت کو جاننے کا وسیلہ ہے۔ اپنے استاد وحشت کلکتوی کے حوالے سے پانچ مضامین محنت و ریاضت سے تحریر کیے گئے ہیں۔ انہیں ہم استاد کے لئے شاگرد کا اکرام واحترام کہہ کر پس پشت نہیں ڈال سکتے ہیں بلکہ جس استدلال اور حوالوں سے بیخود نے وحشت کی شاعری پر گفتگو کی ہے اس میں ایماندارانہ اپروچ اور ادبی دیانت داری کی خوشبو موجود ہے۔ ابواب کے پیش کش سے قبل عرض مرتب میں ڈاکٹر منصور عالم نے اس کتاب کو بیخود کے مرتبہ کے تعین کی راہ میں اضافہ قرار دیا ہے۔ انیس رفیع کے مشمولہ مضمون کا عنوان ''استاذی پروفیسر بیخود کے نثر پارے'' ہے۔ جس میں ان کی نثر نگاری سے گفتگو کی گئی ہے۔ نورالہدیٰ نے مرتب کتاب ڈاکٹر منصور عالم کو سلیقے سے متعارف کرایا ہے اور ان کی ادب نوازی کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ پروفیسر سید منال شاہ القادری نے پیش لفظ میں اس معیاری کام کی ستائش کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ''......اس مجموعے سے بیخود کی ادبی تصویر کا دوسرا رخ بھی، جو اَب تک گمنام تھا، اپنے تمام تر خدوخال کے ساتھ سامنے آگیا ہے۔'' اظہارِ تشکر کے کلمات غضنفر علی خان، صفدر علی خان، ظفر عباس خان اور خاور حسنین صاحبان جو پسرانِ بیخود ہیں نے ادا کیے ہیں۔

کتاب صوری و معنوی اعتبار سے اچھی ہے۔ قارئین اسے پسند کریں گے۔ بلاشبہ بیخود کے چاہنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہے۔

....

نام کتاب: اردو (شعری مجموعہ، حصہ اوّل) شاعر: ارشد مینا نگری قیمت: 300 روپے اشاعت: 2018
پتہ: سروے نمبر 19، گھر نمبر 51، مومن پورہ، مالیگاؤں، ضلع ناسک (مہاراشٹر) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ارشد مینا نگری کثیر التصانیف شاعر و ادیب ہیں۔ نت نیا سوچتے رہتے ہیں۔ متعدد اصناف شاعری میں گل بوٹے ٹانکنے اور کئی موضوعاتی شعری مجموعے منظر عام پر لانے میں انہوں نے اولیت کا سہرا حاصل کیا۔ ''نئے اجالے''، ''احساس''، ''دھرتی کے تارے''، ''عید''، ''ماں''، ''رحمۃ للعالمین''، ''ابر نیساں''، ''ہم سب ایک ہیں''، ''پیارا ہندوستان''، ''بولتے پتھر''، ''غزل، غزالہ، غزل نما'' وغیرہ شعری مجموعے ان کی شعری شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔ ارشد مینا نگری کے فکر وفن پر کئی تنقیدی و تحقیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت اور شاعری اقرار و اعتراف کی راہ پر چل پڑی ہے۔ اردو کے معیاری رسالوں نے بھی ان پر گوشے شائع کیے۔ اعزازات وانعامات سے بھی نوازے گئے۔ اس طور پر ارشد مینا نگری اس عہد کے مشہور شاعروں کی فہرست میں جگہ پاچکے ہیں۔ زیر مطالعہ مجموعہ ''اردو'' ان کی اختراعی فکر اور جدید حسیت سے لبریز شاعری کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے پیش لفظ میں دل کی بات لکھ دی ہے۔ اس سے اس مجموعہ کے محتویات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ہر زبان میں اس

کے بولنے والوں کی تہذیب وثقافت جھلکتی ہے۔اس طرح اردو زبان تمام تہذیبوں وثقافتوں سے آراستہ وپیراستہ ہے۔ایسے کئی یگانہ محاسن سے اردو کا بیان، دلبر و دلکش بنا ہوا ہے۔اردو کی دلبری و دلکشی نے میرے قلم کو بھی شعری مجموعہ کی تخلیق پر آمادہ کیا سو یہ مجموعہ شعری بہ نام ''اردو'جلوہ گر ہوا۔''

اردو نام نامی کے تحت غزلیات، غزل نما، نظمیں، گیت، رباعیات، قطعات، دوہے غیر مردف، دوہے مردف، دوہا قطعات، دوہا دوبیتی، دوہا غزل، دوہا گیت، سانیٹ، ثلاثیاں، تکونی، چوبولے، کنڈلیاں، دوھکا، مکالمہ، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں اور رعنا اصناف سخن میں ارشد بینا نگری نے شاعری کی ہے۔ یہ شاعری لفظی بازیگری نہیں ہے بلکہ ان میں معنوی جہات روشن ہے۔ان اشعار کے اندر ایک رعنا ملاحظہ کیجئے:

رخسار ساعت کو بھی چومے اردو
انداز نرالا ہے یہ دلداری کا
ہر شخص کے احساس میں جھومے اردو

اس منفرد انداز رکھنے والی کتاب میں شامل غزل کے چند اشعار پیش ہیں جن میں اردو ثقافت کی جلوہ گری ہے:

نظم اور گیت کی زباں اردو   ہر مرصع غزل کی جاں اردو
اس میں ہر اک زبان بستی ہے   سب زبانوں کا اک جہاں اردو
دل میں اترے ہے بات اردو کی   ہر نظر میں صفات اردو کی
دھنک سی ہیں لہجے میں انگڑائیاں   لئے لفظ اردو پہ رعنائیاں
اے اردو ترے بول موتی نما   تری بات ہیروں سی ضوباریاں

گفتنی کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے تفصیل سے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کو پیش کیا ہے اور پھر اس شعری مجموعے کی تعریف کی ہے۔مذکورہ تحریر میں تحقیق اور نظریاتی اصول کی بازیابی کا معیار و اعتبار بلند ہے۔ ارشد بینا نگری کی ''اردو'' سے حد درجہ محبت کا یہ ثبوت عام ہوگا اور اسے مقبولیت ملے گی، ایسی مجھے امید ہے۔

....

نام کتاب: خوابوں کا جزیرہ (شعری مجموعہ) شاعر و ناشر: خالد رحیم ص:۱۹۲ قیمت:250روپے اشاعت:2018

پتہ: خانساماں لین، منی ساہو چوک، بخشی بازار، کٹک-753001 (اڑیسہ) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

خالد رحیم نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کے ذریعے پہچان بنائی ہے۔وہ غزل اور نظم دونوں میں اظہار کی قدرت رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں کے مجموعے ''عکس در عکس (1984ء) اور ''غبار راہ گزر'' (1994ء) پسند کئے گئے۔ ہندی میں قومی یکجہتی پر مبنی نظموں کا مجموعہ ''میرا وطن مہان ہے'' کو کافی مقبولیت ملی، ''جانوروں کا مشاعرہ اور بچوں کی نظمیں (1994ء)، ''جمال ہم نشیں'' (تضمینات) اور ''احساس کا سفر'' (نظمیں، دوہ، ماہئے) ان کی مطبوعہ تصانیف ہیں۔ ''خوابوں کا جزیرہ'' ان کی غزلوں کا نیا مجموعہ ہے۔خالد رحیم کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔غزل کے اشعار میں نیا پن اور نرم لہجہ متاثر کرتا ہے۔ان کی تخلیقی اُپج میں رنگ ہائے زندگی روشن ہے۔

حالات حاضرہ پر بھی نگاہ رکھتے ہیں اور روایت کو ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ آج کی زندگی کے مسائل، سیاست، کربنا کی اور انسان کی حالت اس انداز سے ان کی شاعری میں موجود ہے کہ انہیں معاصر شاعری کا نمائندہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ شاعری میں عصر پیش کرنے کی چند مثالیں پیش ہیں:

فرض میں نے نبھایا ہے سچ بول کر	مطمئن ہوں کہ میرا خدا ساتھ ہے
بدل سکتے ہیں وہ ارادہ یہ بھی ہے ممکن	پلا کر دودھ ہم نے ہی تو ان سانپوں کو پالا ہے
آگ نفرت کی لگی ہے چاروں جانب	لوگ دہشت میں دہل کر رہ گئے ہیں
ہر اک دل میں چھپا ہے ایک دہشت	وبا یہ شہر میں آئی کہاں سے
کل جلا کر راکھ کر ڈالا تھا گھر کو	آج کیوں ہے خیر خواہی کا تماشہ
مروت کی حدوں کو چھوڑ کر باہر نہیں آتا	مرا دشمن بھی میرے سامنے کھل کر نہیں آتا
جسے تم دوسروں سے سن رہے ہو	حقیقت میں وہ میری داستاں ہے

خالد رحیم کے یہاں صرف مسائل اور کرب ناک زندگی کی عکاسی ہی نہیں ملتی ہے بلکہ وہ حوصلہ اور اچھے سماج کی تعمیر و تشکیل میں انسان کے رول کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ وہ ہمدردی سے معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے کی سوچتے ہیں۔ وہ صرف الزام نہیں لگاتے ہیں بلکہ اُپائے سوچتے ہیں۔ اس طرح ان کا نقطۂ نظر تعمیری اور اصلاحی ہو جاتا ہے۔ وہ غور و فکر کے عادی ہیں۔ ان کے یہ اشعار آپ کو متاثر کیے بنا نہیں چھوڑیں گے۔:

تم اپنے نام کو اس شہر میں بدنام مت کرنا	جو دل کو ٹھیس پہنچائے کبھی وہ کام مت کرنا
ہر سمت اُگا اپنی محبت کا اجالا	نفرت کے اندھیروں سے نکلنے کی ذرا سوچ
دکھاوا لوگ کرتے جا رہے ہیں ایک مدت سے	کسی دن آ کے سچ مچ تم ذرا غمخوار ہو جانا

خالد رحیم کی شاعری کے حوالے سے تین مضامین اس مجموعے کے شروعاتی حصے میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے ''خالد رحیم کی شعری کائنات'' کے عنوان سے ان کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے انہیں تلخ سچائیوں اور تجربات کا بیان کرنے والا شاعر قرار دیا ہے۔ پروفیسر احمد کے مشمولہ مضمون کا عنوان ''خالد رحیم: روایت اور توسیع روایت'' میں ان کے اشعار کی ترسیل اور سادہ لہجہ جیسی خوبیوں کا ذکر ہے۔ ایم۔ نصر اللہ نصر نے ان کی غزل کے ایک مصرعہ ''میں بھی اپنی غزلوں میں پھول کی خوشبو رکھتا ہوں'' کو عنوان بناتے ہوئے ان کے شعری اختصاص کو محتویات میں رکھا ہے۔ بیک کور پر شاعر کی پاسپورٹ سائز تصویر اور کرشن پرویز کی رائے خالد رحیم کی شاعری کی اہمیت کو درشاتا ہے۔ ہارڈ بینڈ والی کتاب کا سرورق خوبصورت ہے اور اس پر یہ شعر معنوی دلکشی کا نمائندہ ہے:

اوروں کے لئے راہ میں جلنے کی ذرا سوچ	ہو جائے گا روشن ترے خوابوں کا جزیرہ

''اردو زبان دنیا کی چند بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دوسری زبانوں اور تہذیبوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔'' (ادارہ)

نام کتاب: نقوش افکار مصنف وناشر: وارث ریاضی اشاعت: 2016 رابطہ: کاشانۂ ادب، سِکٹا (دیوراج)، پوسٹ: بسوریا، وایا: لوریا، مغربی چمپارن (بہار) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

وارث ریاض بزرگ شاعر اور صاحب فکر ونظر نثر نگار ہیں۔ شعری مجموعہ ''حرفِ آرزو'' (2012ء) ان کی فطری شعری شوق اور مہارت کا ثبوت ہے۔ مطالعہ پسند ہیں اور چھان پھٹک کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے مقالات/ مضامین ''معارف'' (اعظم گڑھ)، ''افکار ملّی'' (نئی دہلی)، ''تہذیب الاخلاق'' (علی گڑھ)، ''غالب نامہ'' (نئی دہلی)، ''بحث ونظر'' (حیدرآباد)، ''کانفرنس گزٹ'' (علی گڑھ) وغیرہ میں شائع ہوئے۔ پیش نظر کتاب ''نقوشِ افکار'' ان کے مقالات/ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل اٹھارہ مقالات شامل ہیں جن کے محتویات میں تعلیم، مذہبیات، شخصیات اور ادبیات کا مطالعہ موجود ہے۔

''نقوش افکار'' کو مقالات کی نوعیت کے لحاظ سے پانچ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ تعلیم کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر چار مقالات کو اولیت دی گئی ہے۔ ''تسلط ہے دنیا پہ دانشوری کا''، ''پروفیسر نثار احمد فاروقی: ایک بالغ نظر صاحب علم وقلم''، ''علی گڑھ کے سفر کی جسمانی وعلمی فتوحات'' اور متاخر الذکر عنوان کے سلسلے میں ''استدراک پروفیسر ریاض الرحمن خاں شیروانی'' کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مقالہ نگار کا دائرہ فکر وسیع ہے اور وہ استدلالی گفتگو کے قائل ہیں۔ موضوع کے تعلق سے تمام گوشوں کو روشن کرتے ہیں اور اپنی بات رکھنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے ہیں۔ تحریروں میں موجود مباحث ان کی علمی بصیرت کا آئینہ دار بھی ہے۔ اسلامیات کی سرخی کے تحت چار مضامین ''ہندوستانی مسلم معاشرے میں طہارت اور پاکیزگی کا مسئلہ''، ''حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء اور سجدۂ تحیت''، ''تصوف: ائمہ مجتہدین اور علمائے اسلام کی نظر میں'' اور ''فتح مکہ: غیر مسلم ودانشوروں کی نگاہ میں'' وہ تحریریں ہیں جن میں ایک عالم دین کی ریاضت اور صالح فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں خالص مذہبی افکار اور تاریخی بصیرت موجود ہے۔ ان مضامین میں بھی ان کا انداز نظر مثبت ہے اور مذہب سے قلبی وابستگی کا جواز بھی موجود ہے۔ بطور خاص ''حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا اور سجدۂ تحیت'' میں موجود حوالے اور حاصل مطالعہ نیز نتیجہ قابل مطالعہ اور چشم کشا ہیں۔ اقبالیات کے حوالے سے ان کے چار مضامین ''علامہ اقبال اور احمدیت''، ''ڈاکٹر اقبال کے چند محل نظر افکار ونظریات'' اور دو استدراک (ڈاکٹر سید عبدالباری کے مضمون اور ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی کے مضمون کے سلسلے میں) میں موجود مباحث کا دائرہ کار اقبال کے نظریات وافکار نیز مطالعات ہیں۔ اقبال کو چاہنے والے اور ان کی کمیوں کو بیان کرنے والوں کی کمی نہیں ہے مگر ''نقوش افکار'' کے یہ مضامین مستند حوالوں اور کھلے ذہن سے اقبال کو بطریق احسن ان کے مراتب کو جاننے میں معاون ہیں۔ مضمون نگار کا مطالعہ اقبال پرستی میں در آئے مبالغے کی گرفت اور صداقت کے بیان سے مملو ہے۔ شخصیات میں ''مولانا حسرت موہانی''، ''پروفیسر مختار الدین احمد آرزو''، ''پروفیسر نذیر احمد''، ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی''، ''قاضی مجاہد الاسلام قاسمی'' کے حوالے سے مضامین منفرد انداز سے انہیں جاننے میں معاون ہیں۔ ''بیاض'' (شاعر عطا عابدی) کا تقابلی مطالعہ جو اس کتاب میں ادبیات کے زمرے میں میں شامل ہے ان معنوں میں منفرد ہے کہ عام طور پر شاعری کا تقابلی مطالعہ آسان نہیں جبکہ یہاں

اساتذۂ فن کی شاعری کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ بیاض کی شاعری جس طور پر متاثر کرتی ہے یہ مضمون ہمیں اس سے کہیں آگے بڑھ کر سوچنے کو مجبور کرتا ہے۔

''نقوش افکار'' کے لئے 'پیش نامہ' پروفیسر سید حسن عباس اور 'حرفے چند' مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی نے تحریر کئے ہیں اور مصنف وارث ریاضی کے مقالات کو سراہا ہے۔ مشمولہ مقالات کی افادیت مسلّم ہے اور غیر جانب داری سے کیا گیا تجزیہ ادب کی صالح روایت کو فزوں تر کرنے کے مترادف ہے۔ مقالہ نگار کا انداز علمی اور منطقی ہے نیز نثر میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جناب وارث ریاضی کے مجموعۂ مقالات سے اہل علم استفادہ کریں گے اور ان کی کاوشوں کے لئے نیک دعاؤں سے نوازیں گے۔

....

نام کتاب: بچوں کے سنگ مصنف: ڈاکٹر احسان عالم اشاعت: ۲۰۱۹ء قیمت: ۱۲۰ روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (شمال ۲۴ پرگنہ) مغربی بنگال

انسان کی زندگی میں علم کی بہت اہمیت ہے۔ خصوصی طور پر بچوں کی تعلیم کیساتھ تربیت بھی بہت ضروری ہوتی ہے۔ اگر بچوں کو تعلیم کے ساتھ تربیت ٹھیک سے ہوتی ہے تو وہی بچے آگے چل کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ان ہی باتوں کو موضوع بنا کر ڈاکٹر احسان عالم نے ایک کتاب ''بچوں کے سنگ'' لکھی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'بچوں کے سنگ' خالص تعلیمی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ۱۰۴ صفحات کی اس کتاب کو احسان عالم نے تین حصوں میں بانٹا ہے۔ پہلا حصہ 'بچوں کے سنوارنے والے چند رشتے'، دوسرا حصہ 'بچوں کے لئے چند ضروری ہدایات' اور تیسرا حصہ 'چند اہم شخصیتیں جن کی زندگی بچوں کے لئے مشعل راہ ہیں' کے عنوان سے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ احسان عالم نے 'بچوں سے چند باتیں' کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا 'گفتنی' بھی شامل ہے۔ کتاب کے پہلے فلیپ پر ڈاکٹر احسان عالم کا 'مختصر تعارف' درج ہے اور آخری فلیپ پر موصوف کی دیگر تصنیفات و تالیفات درج ہیں۔ کتاب کا انتساب انہوں نے اپنی بھتیجی عذرا صدف کے نام معنون کیا ہے اور عذرا صدف کی ولادت پر پروفیسر منصور عمر مرحوم کے تین شعر بھی درج ہے۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بچے کسی بھی ملک اور قوم کے مستقبل ہوتے ہیں اس لئے ان کی ذہن سازی با قاعدگی کے ساتھ ہونی چاہئے۔ بچوں کا ذہن کچے بانس کی مانند ہوتا ہے۔ شروع میں جس طرف موڑیں گے۔ اس طرف مڑتا جائے گا۔ اس لئے بچوں کی ذہن سازی اور تربیت میں مثبت پہلو کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر احسان عالم درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں اور روزانہ سینکڑوں بچوں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں جس سے بچوں کے نفسیات کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کو تحریر کیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں 'بچوں کے کردار کو سنوارنے والے چند رشتے' میں موصوف نے بچوں کی زندگی سنوارنے میں والدین اور اساتذہ کے کردار کا ذکر نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے باب میں موصوف 'بچوں کے لئے چند ضروری ہدایات' کے عنوان سے کئی ایک مضامین شامل کیا ہے جیسے بچوں کے فرائض کیا ہیں، بچوں کی کامیابی کا راز کیا

ہوتا ہے، بچوں کو کس طرح کی غذا لینی چاہئے، گرمی کی چھٹیاں بچے کیسے گذایں، کمپیوٹر اور فیس بک کا استعمال کیسے کریں، مادری زبان کی اہمیت کیا ہے، امتحان کا نفسیاتی اثر بچوں پر کیا پڑتا ہے، بچوں پر کتاب کے بوجھ کا کیا اثر ہوتا ہے، اور اساتذہ کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ ان تمام موضوعات پر موصوف نے تشفی بخش گفتگو کی ہے اور تیسرے باب میں موصوف نے چند عظیم شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جن میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور اے، پی جے عبدالکلام ہیں۔ یقیناً ان تمام شخصیتوں کی حالات زندگی کا مطالعہ بچوں کی زندگی میں فکر کے نئے دریچے وا کریں گے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب بچوں کی بہتر ذہن سازی کے لئے بہت اچھی ہے۔ شعری و ادبی منظر نامے کے فروغ کے ساتھ بچوں کے تربیتی منظر نامے کو بھی سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

....

نام کتاب: ''معراج الادب و معراج العلق'' شاعر: سید انظار البشر اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: سید انظار البشر، شمالی ۲۴ پرگنہ، کولکاتا-۱۲۰ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق شمال ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

''معراج الادب و معراج العلق'' انظار البشر کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ جس میں حمد، نعت، نظم، غزل، ہزل، اور سہرا وغیرہ شامل ہیں۔ انظار البشر نے اس کتاب کو تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب 'کنت کنزاً' ہے جس میں ایک حمد، ۵ نعت شریف، ایک آزاد نظم اور ۶ منقبت شامل ہیں۔ دوسرا حصہ 'حسن تغزل' ہے۔ اس میں تقریباً ۲۷ غزلیں شامل ہیں اور تیسرا حصہ 'قندیل تبسم' ہے جس میں ۱۹ ہزل شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سہرا اور یادوں کے سہارے کے نام سے ماسٹر مقصود عالم کا ایک تاثراتی مضمون بھی شامل ہے۔ کتاب کے پہلے فلیپ پر حلیم صابر کی آرا اور آخری فلیپ پر حبیب ہاشمی کی آرا شامل۔ کتاب کے صفحہ ۵ پر شاعر موصوف کا تعارف اور صفحہ ۶ پر ڈاکٹر غلام قادر جیلانی امر اعزازی کا ایک مضمون 'ستر ہزار ممتا' شامل ہے۔

موصوف نے اس کتاب کا انتساب 'اپنی پسر زادی سیدہ زینب فاطمہ عرف زویا کے نام' معنون کیا ہے۔ صفحہ ۲۰ پر 'حقیقت' کے عنوان سے موصوف نے اپنے خیال کو مختصر میں تحریر کیا ہے۔

انظار البشر ابتدا سے ہی شعر و شاعری کے شوقین رہے ہیں اور ادبی محفلوں سے ان کی وابستگی ہمیشہ سے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں تجربے کی جھلک اور برجستگی نظر آتی ہے یہ کتاب کئی معنوں میں اہمیت کی حامل ہے کہ اس لئے کہ موصوف کی تحریروں سے مذہبی مطالعے کی جھلک بھی ملتی ہے اور رنگ تغزل بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہونٹوں پر تبسم کی لکیریں بھی ابھر آتی ہیں

کتاب میں شامل غزلیں ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس عہد کے حالات بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں جس کے درمیان شاعر موصوف کا فکری شعور محو سفر ہے۔ ان کی غزلوں سے چند اشعار دیکھیں:

حال دل یوں بیاں نہیں ہوتے　　تم اگر ہم زباں نہیں ہوتے
عشق میں خود کو مبتلا کر کے　　مر رہا ہوں ذرا ذرا کر کے
کتنا بے درد یہ زمانہ ہے　　ٹوٹ کر آج دل نے جانا ہے

ہزل کے چند اشعار دیکھیں:

گوری دے یا کالی دے　　لڑکی پیسے والی دے
سالی مجھ کو گالی دے　　اللہ منھ میں لالی دے

اس طرح کے اور بھی بہت اشعار ہیں جو موصوف کے ذاتی تجربے کو بیان کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انظار البشر کے یہاں خاکساری بہت ہے۔ تجربے سے لبریز ہیں احساس کی مضبوط رسی ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اور اپنے خیال کو صفحہ قرطاس پر بے جھجک انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ امید ہے قاری اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

☆☆☆

نام کتاب: ''اردو زبان وادب کی تاریخ'' مصنف: پروفیسر مجید بیدار قیمت: ۳۰۰ روپے
زیر اہتمام: انیس امروہوی، دہلی-۹۲ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (شمال ۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال)

پروفیسر مجید بیدار ادب کی دنیا کے ایک محترم نام ہے۔ موصوف کا بنیادی تعلق درس وتدریس سے رہا ہے۔ ادب کے ساتھ موصوف نے تعلیم اور طلبا وطالبات کی ذہنی آبیاری کے لئے کئی ایک مضامین بھی لکھے۔ یہ ایک اچھے استاد ہونے کی دلیل ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''اردو زبان وادب کی تاریخ'' موصوف کی ایک اہم کتاب ہے۔ کتاب کا انتساب سید عبدالعزیز عدنان (بی۔ ٹیک) کے نام معنون کیا ہے۔ کتاب کے بیک کور پر موصوف کا مکمل تعارف درج ہے۔ جس میں ان کی تخلیقات، انعامات وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ ۳۸۳ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چار حصوں ''الف، ب، ج، اور د میں منقسم ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر حصہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، اس طرح کل ۲۴ ابواب پر مشتمل یہ کتاب اردو زبان وادب کی تاریخ کو بیان کرتی ہے۔ ماقبل اس کتاب کے اردو زبان وادب کی تاریخ پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر اعجاز حسین وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ان کے بعد ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر انور سدید نے اردو زبان وادب کی تاریخ کو سمیٹنے کی بھر پور کوشش کی۔ ایسے میں پروفیسر مجید بیدار کی یہ کتاب ان کتابوں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ زبانیں ہمیشہ تغیر پذیر رہی ہیں اور وقت کے ساتھ اس کے اندر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، کیونکہ جو زبان ساکت ہو جاتی ہے اس کی ترقی وہیں رک جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کی شناخت مٹ جاتی ہے لیکن اردو زبان کے اندر ایسی بات نہیں ہے اس نے ہمیشہ دوسری زباوں سے استفادہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ نئے نئے قلمکاروں کو اردو زبان وادب کی تاریخ لکھنے کے لئے نئے سرے سے قلم اٹھانی پڑتی ہے۔

پروفیسر مجید بیدار نے اس کتاب میں ان ہی تمام باتوں کو مذکور رکھا ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے تعلق سے اس کی تاریخ کو قاری تک آسانی سے پہنچایا جا سکے۔ اس میں وہ کامیاب ہیں۔

چار حصوں میں تقسیم اس کتاب کا پہلا حصہ ''اردو زبان وادب کا تعارف'' ہے۔ اس میں اردو کے معنی ومفہوم، زبان کی تعریف، اور وضاحت، ادب اور ادبی خصوصیات، زبان وادب میں فرق اور زبان کا تاریخی ورثہ، اردو ایک

ہند آریائی زبان شامل ہیں۔

دوسرا حصہ 'ہند آریائی زبانوں کا تعارف' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ہندوستان میں آریاؤں کی آمد، آریاؤں اور دراوڑیوں میں ٹکراؤ، وادیٔ سندھ کی قدیم ابتدائی زبانیں، آریاؤں کی نقل مکانی، شمالی ہند میں آریاؤں کا تصرف، جنوبی ہند میں دراویڈیوں کا تسلط، شامل ہیں۔ تیسرا حصہ ''وسطی اور جدید ہند آریائی زبانیں'' ہے۔ اس میں سندھ، پنجاب اور دوآبہ میں آریائی زبانیں، ویدوں اور ذاتوں کا دور، پراکرتوں اور اپ بھرنش کا دور، مغربی ہند اور اس کی بولیاں، اردو کے بارے میں مختلف نظریات، اردو صوفیائے کرام کے ذریعہ پھیلی شامل ہیں اور چوتھے حصے میں ''اردو زبان کا آغاز اور پھیلاؤ' ہے۔ اس میں اردو کے فروغ میں تاجروں کا حصہ، اردو کی ترقی میں سپاہیوں کا حصہ، شاہانہ سرپرستی میں اردو کا فروغ، اردو کا مولد اصلی، اردو کا اثر شمالی ہند پر اور اردو کا اثر جنوبی ہند پر شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ پروفیسر مجید بیدار نے اردو زبان و ادب کی تاریخ کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔ قاری اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

....

نام کتاب: دھوپ کا مسافر شاعر: جمیل اختر شفیق اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت: ۱۶۰ روپے

ناشر: فائن آرٹ پرنٹنگ، سیتامڑھی، بہار مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (شمال ۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال)

''دھوپ کا مسافر'' جمیل اختر شفیق کا اولین شعری مجموعہ ہے جس میں کل ۱۱۰ رغزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ نو اشخاص کے تاثرات ان کی شاعری کے حوالے سے شامل ہیں۔ ان سب کے علاوہ ''حرف آغاز'' میں ''میری خودار طبیعت کا تقاضا ہے الگ'' کے عنوان سے شاعر موصوف نے ۱۲ رصفحات پر مشتمل اپنی روداد تحریر کی ہے۔ کتاب کا انتساب انہوں نے اپنی امی ابو کے نام معنون کیا ہے جن کی موجودگی شاعر موصوف کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کو ہر پل حیات نو عطا کرتی ہے۔

کتاب کے پہلے فلیپ پر ملک کے معروف و نامور ادیب، شاعر، اور نقیب انور جلالپوری مرحوم کے تاثرات شامل ہے اور کتاب کے آخری فلیپ پر مفسر، محقق، مصنف، شاعر و ادیب علامہ جلال الدین قاسمی مالیگاؤں کی آراء شامل ہے۔ کتاب کے بیک کور پر بیرون ملک کے شعراؤ ادباء ناصر ناکاگاوا چیف ایڈیٹر اردو نیٹ جاپان، تنویر پھول، نیویارک (امریکہ) اور ابن عظیم فاطمی کراچی کے مختصر آراء شامل ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمیل اختر شفیق تجربے کی دھوپ کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں اور اس تجربے کو اپنے ذہن و فکر میں محفوظ کر کے انہیں شعری قالب میں خوبصورتی کے ساتھ ڈھال دیتے ہیں ان کی غزلوں کا مطالعہ اس بات کو باور کراتا ہے کہ وہ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے بلکہ انہیں شعری قالب میں ڈھال کر قاری کی عدالت میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری سماج کے اس چہرے کو عیاں کرتی ہے جس کی خراشیں ہمیشہ تازہ دیکھائی دیتی ہیں۔

جمیل اختر شفیق کی شاعری میں اضطرابی کیفیت اور اضمحلالی احساسات کا دور دور تک پتہ نہیں رہتا ہے۔ ان

کے اندر اظہار کی برجستگی ہے۔ان کی غزلوں سے چند اشعار دیکھیں:

ہے دل میں پختہ ارادہ بھلا کے چھوڑوں گا ۔۔۔ میں تیری ساری علامت مٹا کے چھوڑوں گا

ساتھ چلنا ہے تو چل ورنہ بتا دے مجھ کو ۔۔۔ فیصلہ اپنا ذرا جلد سنا دے مجھ کو

رقم کرتے ہوئے جس کا لہو الفاظ بن جائے ۔۔۔ پڑھی جاتی ہے لوگوں میں وہی تحریر مدت تک

شفیق اس عہد کی گندی سیاست سے الگ رہنا ۔۔۔ یہاں ہر موڑ پر ابلیس کے سردار بیٹھے ہیں

یہ کبھی مت دیکھئے کہ کس نے کیا تنقید کی ۔۔۔ خامشی سے صرف اپنا کام کرتے جایئے

اس طرح کے اور بھی بہت اشعار ہیں جس سے جمیل اختر شفیق کا بانکپن اور برجستگی کا احساس ہوتا ہے۔شاعر موصوف کی شاعری یقیناً سہل پسندی کی شاعری ہے اور عام قاری بھی آسانی سے ان کے مفاہیم کو سمجھ سکتا ہے۔یہی شاعری کی معراج بھی ہوتی ہے۔ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

....

نام کتاب: اکیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ اور تصوف کی معنویت ترتیب وتقدیم: پروفیسر سید شاہ حسین احمد

ناشر: خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ اشاعت: ۲۰۱۹ء صفحہ اردو مضامین کا: ۲۴۴

صفحہ انگریزی مضامین کا: ۴۴ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق (۲۴ پرگنہ شمال، مغربی بنگال)

زیر تبصرہ کتاب 'اکیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ اور تصوف کی معنویت' پروفیسر سید شاہ حسین احمد کی مرتب کردہ ہے۔اس کتاب میں کل ۲۸ مضامین شامل ہیں۔ان میں ۵ مضامین تصوف کے موضوع پر انگریزی میں مختلف مشاہیر ادب کے ذریعہ لکھا گیا ہے۔اس کے علاوہ مرتب کا 'حرف اول' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔علاوہ ازیں پروفیسر سید شاہ حسین احمد کا خطبہ صدارت کے ساتھ پروفیسر شاہ حسین الحق کا 'اکیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ اور تصوف کی معنویت' پر کلیدی خطبہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

یقیناً موجودہ صورت حال کے تناظر میں ''تصوف'' کی ادبی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آج ہم تصوف کے معنویت سے خود کو یکسر الگ کر چکے ہیں نتیجے میں ہمارے اندر کا انسان مر چکا ہے اور ہم انسانیت کے جسم پر حیوانیت کا خول چڑھا کر درندگی کا ننگا رقص کر رہے ہیں اور خود کو مسرور وشادماں محسوس کر رہے ہیں۔

ماقبل تبصرہ آیئے 'تصوف' کے مفاہیم کو سمجھیں۔تصوف قرآنی اصطلاح میں تزکیۂ نفس اور حدیث کی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں۔تصوف کے حوالے سے ایک فرانسیسی عالم لوئی ماسینیون (Louis Massignon) نے تصوف کو داخلیت اسلام قرار دیا ہے یعنی اسلام کو اپنے آپ میں داخل کر لینا صوفیا کرام کے نزدیک قرآن کی آیتوں کا مسلسل ورد اور ان میں وہ معنی (باطن) تلاش کرنا کہ جو ظاہر میں نظر نہیں آتے یا پوشیدہ ہیں، صوفیا کے نزدیک تصوف کی بنیاد ہیں۔سب سے خاص بات یہ ہے کہ اسلام ایک کامل دین ہونے کے ناطے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔تصوف کے حوالے سے کچھ نظریہ داں حضرات ان پہلوؤں کو تین اقسام میں دیکھتے ہیں۔جسمانی،

عقلی اور روحانی۔ یہ تیسرا پہلو جو 'روحانی' ہے اس پر اختصاص حاصل کرنے والوں کو صوفی کہا جاتا ہے۔

آج اکیسویں صدی میں صوفی اور تصوف کی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ صوفیائے کرام ہی تھے جنہوں نے انسان کو انسان سے جوڑنا، بھائی چارہ رکھنا، اور میل محبت سے زندگی گزارنے کا درس دیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ تصوف کی ابتدا ایسا نہیں کہ جدید عہد میں ہوا بلکہ ابتدا میں بھی یہ تصوف ہی تھا جس کا کوئی نام نہیں تھا اور انسانیت کی تبلیغ کرتا رہا۔ حضرت ابوالحسن ابوشمنہؒ کشف المحجوب صفحہ نمبر: ۹۳ میں رقم کرتے ہیں:

> ''تصوف آج بے حقیقت نام ہے لیکن پہلے بے نام کی حقیقت تھی یعنی صحابہ وسلف رحم اللہ کے وقت میں یہ نام نہ تھا لیکن اس کے معنی ہر ایک میں موجود تھے، اب نام ہے معنی نہیں یعنی معاملات تصوف تھے دعوی نہ تھا اب دعوی ہے معاملات نہیں۔''

بہر حال تصوف کی معنویت اپنی جگہ مسلم ہے اور رہے گی۔ زیر تبصرہ کتاب کا انتساب ''آفتاب شریعت حضرت دیوان شاہ ارزانی قدس سرہٗ'' کے نام معنون ہے انتساب کے بعد والے صفحہ پر عربی میں ایک جملہ درج ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے تو گویا اس نے سب لوگوں کا قتل کیا۔''

صوفیا کرام کے حوالے سے مرتب نے ''حرف اول'' میں بہت اچھی بات کہی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''زمانہ کروٹیں بدلتا ہی رہتا ہے انقلابات تو آتے ہی رہتے ہیں۔ طوفان خیز باد سموم چلتی ہی رہتی ہے لیکن تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کیا ہو یا خلافت عباسیہ میں لادینیت دبے پاؤں داخل ہوئی ہو یا فقہی مسائل میں حیلہ سازی کا چور دروازہ کھلا ہو یا جب بھی اور جہاں بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی تحریک چلی ہو تو یہ صوفیائے کرام ہی ہیں جنہوں نے بغیر خون بہائے ہوئے بلکہ کبھی کبھی اپنا ہی خون دے کر صرف اسلام اور مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ انہوں نے تو انسانیت کی بھی حفاظت کی ہے''

لیکن اکیسویں صدی آتے آتے ہمارا ہندوستان جس طرح آپسی انتشار کا شکار ہونے لگا کہ ہندو مسلمان کی بات نہیں کرتا، انسان انسان کا دشمن نظر آنے لگا اور ایک دوسرے کے جان کے لالے پڑنے لگے۔ ایسے حالات میں پھر ایک مرتبہ صوفیوں کے افکار و خیالات کو مشتہر کرنے کی اسد ضرورت آن پڑی ہے کیونکہ پورا انسانی سماج افتراق کا شکار ہو چکا ہے۔

یہ کتاب یقیناً اس معنوں میں زبردست اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں شامل تمام مضامین اپنے آپ میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے روح کو تازگی، ادب کو ادبیت اور لاشعور کو روحانی قوت ملنے کا احساس ہوتا ہے انگریزی میں لکھے گئے مضامین بھی نہایت اہم ہیں۔ مختصر یہ کہ ادبی اور معنوی لحاظ سے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

....

نام کتاب: کارآمد ادب مصنف: پروفیسر مجید بیدار قیمت: ۳۵۰ روپے زیر اہتمام: انیس امروہوی، تخلیق کار پبلی کیشنز، 401/B یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی-۹۲ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق

''کارآمد ادب'' پروفیسر مجید بیدار کا ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جس میں تعلیم، تدریس اور عملی زندگی کے ہمہ گیر مسائل پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب موصوف نے ''اپنے چہیتے شاگردوں کے نام جنہوں نے مجھے استاد کا درجہ دے کر عزت وتکریم کی اور مجھ سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی'' کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب میں کل ۶۲ موضوعات پر مضامین لکھے گئے ہیں اس کے علاوہ مصنف کی جانب سے ''چند باتیں'' کے عنوان سے بھی ایک مضمون شامل ہے اور کتاب کے آخر میں مصنف کا مختصر سوانحی خاکہ بھی تحریر ہے جس سے مصنف کے تعلق سے بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

یقیناً اردو زبان وادب میں شعر اور نثر کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب بھی لکھا جارہا ہے لیکن اردو زبان وادب میں اب ایسے ادب کی ضرورت ہے جو انسان کے عملی زندگی کے ہمہ گیر مسائل کو سامنے لائے، ساتھ ہی درس وتدریس کے حوالے سے بھی ایسے مضامین کی ضرورت ہے جس سے اردو ادب کو بھی فائدہ ہو اور طلبا و طالبات کو حصول علم میں بھی آسانیاں پیدا ہوں۔

پروفیسر مجید بیدار نے اس کتاب میں ان ہی موضوعات کو اٹھایا ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام مضامین پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہیں۔ خصوصاً طلبا و طالبات اس کتاب کے مطالعہ سے بہت مستفیض ہوں گے۔ ساتھ ہی اساتذہ کرام بھی اس کتاب کے مطالعہ سے اپنے اندر پڑھانے کے طریقہ کار میں تبدیلی لانے کی کوشش کریں گے کیونکہ اس کتاب میں کچھ ایسے بھی مضامین ہین جن کا تعلق براہ راست نفسیات سے ہے۔ اہم مضامین میں ''کند ذہن بچوں میں تعلیم سے رغبت پیدا کرنے کے طریقے''، ''پرچہ سوالات کے جوابات دینے کی تیاری''، ''طالب علم کی شناخت کے اہم نکات''، ''ذہن کو کیسے بدلا جائے''، ''صبر وضبط کی عادت ڈالنے کے طریقے''، ''خود پرستی اور انا پرستی کے ہجوم میں''، ''کیا غصہ شخصیت کا منفی رخ ہے؟''، ''زخم کھا کر مسکرانے کی عادت'' وغیرہ اور بھی ایسے بہت سے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں جو ہماری شخصیت کو ابھارنے میں مددگار و معاون ثابت ہوں گے۔

پروفیسر مجید بیدار واقعی ایک ذہنی طور پر بیدار صفت انسان ہیں اور انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ ادب کے مزاج کو شعر وشاعری اور حسن وعشق کے داستانی تخیل سے نکل کر عملی زندگی میں ڈالنے کی ضرورت ہے یہی ہماری کامیابی کا زینہ بھی ہوگا۔ ملاحظہ کیجئے ان کے جملے:

> ''اہم حقیقت یہ ہے کہ اردو سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد کا مزاج اب بھی شعر وشاعری اور حسن و عشق کی داستانوں میں الجھا ہوا ہے جب کہ دنیا کی حقیقتیں واضح ہوتی جارہی ہیں اور دنیا کے ادبیات میں دن بدن ایسے مواد کی پیش کش پر توجہ دی جارہی ہے جو درحقیقت انسانی فکر اور معیشت کو ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کو بھی فیض پہنچانے کا ذریعہ بنے۔'' (صفحہ:۱۱)

ان کے ان جملوں سے اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر مجید بیدار یقیناً ایک ایسے ادب کی تخلیق کے محرک کے طور پر کام کرنا چاہتے ہیں جس سے ادب کی بھی خدمت ہو اور عملی زندگی میں بہتری آئے۔ یہ کتاب بہت اچھی ہے اور اسے ہر خاص وعام کے درمیان مقبولیت ملنی چاہئے۔

نام کتاب:مشترکہ غزلیں شاعر:پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی واحسان ثاقب اشاعت:۲۰۱۹ء
قیمت:ایک سوروپے ناشر:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹرمحمد علی حسین شائق (مغربی بنگال)

''مشترکہ غزلیں'' پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اوراحسان ثاقب کی مشترکہ کوششوں کا نقش اول تجربہ ہے۔ اردوادب میں نیا تجربہ کرنے کا رجحان پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے اندر شروع سے رہا ہے۔مشترکہ غزلیں اسی کی ایک کڑی ہے۔غزل یقیناً اردو شاعری کی آبرو بھی ہے اور وقیع صنف سخن بھی۔اس نے ہمیشہ اور ہر دور میں زیادہ سے زیادہ شعراء کو اپنے گیسو کا اسیر بنائے رکھی اور نہایت ہی لطافت ،شگفتگی،شائستگی کے ساتھ سفر کرتی رہی اور آج بھی اس کی قدر ومنزلت میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی ہے۔اردو شاعری میں نئے تجربوں نے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کو حوصلہ بخشا ہے اور کبھی بھی انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ناقدین ادب نے ہمیشہ نئے تجربوں کا استقبال کیا ہے اور مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی حوصلہ افزائی کی ہے۔تجربہ انسان کو ہمیشہ بہتر سے بہترین کی طرف لے جاتا ہے جس سے انسان کے اندر پختگی آتی ہے یہی وجہ ہے کہ مناظر عاشق ہرگانوی کی ایک دو نہیں بلکہ سو سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بھی کئی ایک نامور شعراء وادباء نے ان کے اوپر کتابیں لکھ کر ان کے حوصلے کو مزید تقویت بخشی ہے اور بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے۔''مشترکہ غزلیں'' کا تجربہ بھی اردوادب میں یقیناً نیک فال ثابت ہوگا۔مناظر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اکثر وبیشتر وہ اپنی سوچ کے ساتھ دوسروں کو بھی شامل کر لیتے ہیں جس سے اس شخص کی بھی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے اور ادب کے تعلق سے اس کے اندر حوصلہ جاگتا ہے۔

احسان ثاقب صاحب (آسنسول) نے ان باتوں کا اعتراف بھی کیا ہے اور مشترکہ غزلیں کی اشاعت میں وہ ان کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ملاحظہ کیجئے:

''پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نیا سوچتے ہیں اور عمل فوراً کر ڈالتے ہیں اس طرح ان کا کام وسیع حلقے میں پہنچ جاتا ہے اور وہ مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنی سوچ میں وہ دوسروں کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور محرکات کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔میرے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ میں ان کے ہم قدم ہوں۔زندگی نے وفا کی تو ان کی تحریک میں شامل ہوتا رہوں گا۔''

(مشترکہ غزلیں، مجھے اعتراف کرنا ہے،احسان ثاقب)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا اس ضمن میں جملے دیکھیں:

''ایک دن احسان ثاقب صاحب سے فون پر بات ہو رہی تھی۔پیش پا افتادہ اظہار سے نکلنے کی بات آئی تو یکا یک ذہن میں بجلی سی کوندی۔میں نے ان سے کہا ہم دونوں مل کر غزل کو نیا سلیقہ دے سکتے ہیں۔وہ سنجیدہ ہو گئے اور حرکی اور متغیر جمود کی یکسانیت سے نکلنے کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ میں نے بتایا کہ ہم دونوں مل کر مشترکہ غزل کہیں اور تخلیقی عمل کا نیا در سامنے لائیں۔''

(گفتنی از منظر عاشق ہرگانوی ،مشترکہ غزلیں)

اس طرح دونوں حضرات کیے یکساں خیالات نے مل کر تخلیقی عمل کا نیا در ''مشترکہ غزلیں'' کی شکل میں لا دیا۔ اردو ادب میں یقیناً یہ ایک نیا تجربہ ہے اور تجربے ہر حال میں ہونے چاہئے۔ایک ہی انداز میں چلتے رہنا انسان کو بور کر دیتا ہے۔

''مشترکہ غزلیں'' میں کل ۴۰ رغزلیں ہیں جس میں چار اشعار کی غزل احسان ثاقب کی ہے اور تین اشعار کی غزل مع مقطع منظر عاشق ہرگانوی کی ہے اس طرح کل ملا کر سات اشعار کی ایک مشترکہ غزل مکمل ہوگئی۔اس طرح ۴۰ رغزلیں اس کتاب میں شامل ہیں۔

غزل جس نے رومان پسندی سے اپنا سفر شروع کیا آج زمانے کی شدت پسندی، حالات حاضرہ کی ضرورتوں اور روز و شب میں الجھا ہوا انسان اور اس سے جوجھتا سماج کی عکاس بن گئی ہے''۔مشترکہ غزلیں'' میں شامل تمام غزلیں اس کی نمائندگی کر رہی ہیں۔زبان و بیان میں لطافت اور ندرت کا احساس بیدار ہو جاتا ہے دو اذہان کے خیالات ایک غزل میں سمونے کی یہ کوشش آئندہ دنوں میں بار آور ثابت ہوگی۔لیکن ایک بات جو مجھے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ مقطع میں صرف مناظر صاحب کا ہی نام آیا ہے اس سے ایک عام قاری جب اس کتاب سے نکال کر ایک غزل پڑھے گا تو وہ یہی تاثر قائم کرے گا کہ یہ غزل مناظر صاحب کی ہے۔اس لئے میری ناقص رائے یہ تھی کہ جہاں انہوں نے یہ نیا تجربہ کیا وہیں مقطع میں بھی دونوں حضرات کا تخلص استعمال کر کے ایک نیا تجربہ قائم کرتے تو بہتر ہوتا۔بقیہ کتاب کی چھپائی وغیرہ عمدہ ہے۔قاری اس نئے تجربے کو پسند کریں گے۔چند اشعار ملاحظہ کریں:

بے کیف زندگی کو سزا کہہ لیا کرو — کہنا ہے جو بھی اچھا برا کہہ لیا کرو
یہ بھی سیاسی کھیل کا نسخہ عجیب ہے — دنیا وفا کرے تو جفا کہہ لیا کرو
آسماں نرم ہو گیا آخر — لاج رکھ لی مری کفن میرا
برف سی جم گئی نظر میری — بے صدا ہو گیا ذہن میرا
حجاب توڑ کر آنکھیں اٹھا نہیں سکتے — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

....

نام کتاب: تفحص و جستجو مصنف: ڈاکٹر ہمایوں جمیل اشاعت: دسمبر ۲۰۱۸ء ص: ۱۹۲

رابطہ: ڈاکٹر ہمایوں جمیل، 87/1، رپن اسٹریٹ، کولکاتا-۱۶ مبصر: ڈاکٹر محمد علی حسین شائق

''تفحص و جستجو'' ڈاکٹر ہمایوں جمیل کی تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کل ۱۹ مضامین شامل ہیں۔ انتساب اپنے استاذی محترم کے نام اس طرح معنون کیا ہے جس سے ان کا اپنے استاذی سے قلبی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ان جملوں کو دیکھئے:

''مغربی بنگال میں اردو تحقیق و تنقید کے سرخیل استاذی محترم پروفیسر یوسف تقی مرحوم کے نام جنہوں نے مجھ جیسے ہیچ مداں کو تحقیق و تنقید کا راہرو بنا دیا۔''

واقعی یہ بہت بڑی بات ہے۔ورنہ آج کل کے زیادہ تر شعراء و ادباء تھوڑی سی صلاحیت کے حامل کیا ہو جاتے

ہیں کہ خود کو استاد سے اوپر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر ہمایوں جمیل ان تمام بدعات سے پاک ہیں اور ایک سچے شاگرد اور ایماندار ادبی سپاہی کی طرح خاموشی کے ساتھ ادب کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ہمایوں جمیل کی وابستگی کلکتہ کے مولانا آزاد کالج کے شعبہ اردو سے ہے اور طلبا و طالبات کی علمی پیاس بجھانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ کم لکھتے ہیں لیکن بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں اور خالص ادب لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بے جا تعریف، تضحیک و تصنع کا ذرہ برابر سائبان نظر نہیں آتا ہے۔ ان کا ادبی مطالعہ بہت عمیق ہے۔

کتاب میں شامل کل ۱۹ رمضامین کے عنوانات اس طرح ہیں ''مولانا شبلی نعمانی: ایک صاحب نظر سیاح''، ''منٹو کی افسانہ نگاری''، ''خطوط غالب میں دلی''، ''سالک لکھنوی کی شعری و نثری خدمات''، ''علامہ شبلی: شخص اور شاعر''، ''رضا نقوی واہی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری''، عین رشید۔ ایک مختصر تعارف''، ''علامہ جمیل مظہری کا فن شاعری''، ''کنہیالال کپور بحیثیت طنز و مزاح نگار''، ''ظہیر انور کی ڈرامہ نگاری ''بلیک سنڈے کی روشنی میں''، ''یوسف تقی: خشک ٹہنی زرد پتے کی روشنی میں''، منفرد لب و لہجے کا شاعر: نصر غزالی''، ''جاوید نہال میری نظر میں''، ''ولی کا اجتہادی رویہ''، ''شاگرد جمیل احسان در بھنگوی''، ''داستان گوئی عصر حاضر میں''، ''اردو شاعری میں فیض کا مقام''، ٹیپو سلطان اپنے کردار کی روشنی میں''، ''خطوط غالب سے متعلق چند باتیں'' اس کے علاوہ ''اپنی بات'' کے عنوان سے ہمایوں جمیل کا ایک مختصر مضمون بھی شامل ہے۔

اگر ادبی مضامین لکھے جاتے ہیں اور کسی اخبار میں شائع ہو جاتے ہیں تو بعد میں ان مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی شکل میں محفوظ رکھ دینا چاہئے ورنہ ضائع ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ ہمایوں جمیل کو بھی اس کا احساس ہے یہی وجہ کہ انہوں نے ان مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دے ڈالی۔ ملاحظہ کیجئے ان ہی کی زبان میں:

> ''میرا یہ پہلا مجموعہ مضامین ان ادبی مضامین پر مشتمل ہے جنہیں وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی ضرورت کی تکمیل کے پیش نظر سپرد قلم کیا گیا۔ ان مضامین کو کتابی شکل دینے کا خیال اس وجہ سے آیا کہ یہ منتشر حالت میں زیادہ دنوں تک رہنے کے بعد کہیں تلف نہ ہو جائے۔ حالانکہ اس میں شامل مضامین کسی نہ کسی ادبی رسالے میں شائع ہو چکے ہیں۔''

کتاب میں شامل پہلا مضمون ''مولانا شبلی: ایک صاحب نظر سیاح'' میں موصوف نے مولانا کو بحیثیت سیاح پیش کرنے کے ساتھ انہیں سوانح نگار، شاعر، مورخ کے علاوہ تنقید نگار کے روپ میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بحیثیت سیاح اس مختصر مضمون میں جامع معلومات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''منٹو کی افسانہ نگاری'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں موصوف نے منٹو کو بحیثیت افسانہ نگار کے علاوہ ایک سچے فن کار کی شکل میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ لوگ اچھائی میں برائی تلاش کرنا آسان سمجھتے ہیں لیکن برائی میں اچھائی تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن وہ کام منٹو نے کیا ہے۔ اپنے مضمون میں موصوف فرماتے ہیں:

> ''اچھی چیز کو تو سبھی اچھا کہتے ہیں لیکن برائی میں اچھائی کا پہلو تلاش کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس برائی میں اچھائی کی تلاش ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔'' (صفحہ:۲۱)

''خطوط غالب میں دلی'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں ۱۸۵۷ء کے پہلے اور بعد دلی کی تباہی و بربادی، شکست و ریخت، دلی کا اجڑنا اور پھر بسنا ان تمام حالات کا ذکر میر کے ساتھ غالب نے بھی کیا ہے۔اس ضمن میں لکھا گیا مضمون اچھا ہے۔

اس کے علاوہ سالک لکھنوی کی شعری و نثری خدمات کا بھی احاطہ بہت ہی قاعدے سے کیا گیا ہے۔ کلکتے کی ادبی فضا کو زرخیز بنانے والوں میں سالک لکھنوی کے ساتھ علقمہ شبلی، جمیل مظہری، نصر غزالی، جاوید نہال، احسان دربھنگوی، عین رشید، ظہیر انور کی ادبی خدمات پر لکھے گئے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ان کے مطالعہ سے معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔ علاوہ ازیں رضا نقوی واہی، کنہیالال کپور، فیض کی شاعری اور ادبی خدمات کا بھی موصوف نے خوبصورتی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ داستان گوئی پر لکھا گیا مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے کہ داستان گوئی کا دور اب ختم ہو چکا ہے داستان گوئی اب قصہ پارینہ تو نہیں لیکن تحریر پارینہ ہوتا جا رہا ہے اس کے باوجود کچھ ادیب ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی جسارت کی ہے میں ان داستان گو حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ساتھ ہی ہمایوں جمیل صاحب کو بھی کہ انہوں نے عہد حاضر میں داستان گوئی کی روایت کو زندہ کرنے والوں کی بازیافت کر اس ضمن میں مضمون لکھا ہے۔''ولی کا اجتہادی رویہ'' بھی بہت ہی عمدہ مضمون ہے۔اس کتاب میں شامل تمام مضامین بہت ہی اچھے اور معلوماتی ہیں۔

....

کتاب: فوزیہ مغل :اہل دانش کی نظر میں مرتب:اسلم چشتی اشاعت:۲۰۱۸ء ص:۲۰۶
قیمت:۵۰۰/روپے رابطہ:سویرا اکیڈمی،لندن مبصر: افروز عالم (دبئی)

جو سائنس کی کرشماتی آلودگی میں بھی اردو کی خوشبو محسوس کر لیتی ہے، جو صدی صدی منزلوں سے موجود صدی میں فوزیہ مغل تک پہنچنے والے گرانقدر سرمائے ادب سے فیض پا رہی ہے۔ جو اردو زبان و ادب و تہذیب کو شناخت کے ساتھ دیکھنا اور برتنا چاہتی ہے جو تخلیق، تحقیق، صحافت، مشاعروں، ادبی جلسوں اور مختلف علوم کو ترجموں کے ذریعہ اردو کو Rich بنانے اور حفاظت کرنے کے جتن میں لگی ہوئی ہے۔اس نسل کے نام منسوب اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کی ذمیداری محترم اسلم چشتی نے اپنے سر لیا اور سویرا اکیڈمی ،لندن نے اس کتاب کو شائع کر کے محترمہ فوزیہ مغل کو ایک بار پھر اہل نقد و نظر کے درمیان موضوع گفتگو بنا دیا ہے۔

میرے دوستوں کی فہرست میں محترمہ فوزیہ مغل صاحبہ کا شمار ان بے تکلف دوستوں میں ہوتا، جس سے بات کر کے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ بنا کسی ملاقات کے قریب بیس سال پرانی رفاقت ہے۔ خط و کتابت اور ادبی دوستی کا سلسلہ ۲۰۰۵ء سے اب تک قائم ہے۔عزیز من خالد سجاد (کویت) کے پہلے شعری مجموعہ کی رسم رونمائی لاہور میں ہوئی تھی، اس موقع سے ۲۰۱۵ء کے اپریل میں وہاں دس روز قیام کا اتفاق ہوا تھا۔اس دورے میں فوزیہ مغل سے لاہور کے کئی ادبی تقریب میں اچھی ملاقات رہی۔ موصوفہ نہایت ہی ملنسار اور خوش مزاج واقع ہوئی ہیں، جو بسا اوقات ان کی پریشانی کا سبب بھی بنتا ہے، محترمہ پچھلے کچھ سالوں سے جرمنی میں سکونت اختیار کر چکی ہیں، جہاں وہ

مستقبل کی تلاش میں اپنے حال سے جوجھ رہی ہیں۔ آپ جب تک پاکستان میں رہیں، شاعری، افسانہ، تبصرہ، ادبی رسالے کی ادارت اور مغل پبلی کیشنز کے تحت ادبی کتابوں کی اشاعت میں مسلسل مصروف رہیں۔ یہ شغل ان کا ذریعہ معاش بھی تھا اور روحانی غذا بھی۔ بیشمار راتوں کی شب داری اور آنکھوں کی لالی نے یہ کمال دکھایا جس کے نتیجے میں موصوفہ کو بھارت اور پاکستان کے کئی انجمنوں سے اعزازات نصیب ہوئے۔

پیش نظر کتاب موصوفہ کی شخصیت کا وہ قبول نامہ ہے جس کو ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں کے ادیبوں نے قلم بند کر کے اپنی اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے اور اُن اوراق پریشاں کو مجی اسلم چشتی نے ایک جا کر کے اپنی رفاقت کا حق ادا کر دیا ہے۔ ۲۰۶ر صفحات کی اس کتاب کو ترتیب دینے اور شائع کرنے میں تھوڑی سادرد اور برداشت کر لینا چاہئے تھا، کتاب کو hardbond کر لی گئی ہوتی تو، اس کی عمر میں اضافہ کے امکان بڑھ جاتے، خیر۔ کتاب کو پانچ باب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا باب منظوم سوغات، دوسرا باب نثری سوغات، تیسرا باب عکس سخن، چوتھا باب منتخب غزلیات، پانچواں باب روداد جہاں۔ عرض مرتب کے عنوان سے اسلم چشتی نے اپنا اقبالیہ بیان قلم بند کیا ہے، پیش ہے اس مضمون سے ایک چھوٹا سا اقتباس:

> ’’یہ فوزیہ مغل کی پرکشش و پرسوز شخصیت کا ہی جادو تھا کہ میں اس چیلنج میں سرخرو ہوا، میرے بہت سے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند کی قربانی رنگ لائی اور خوبصورت خوش شکل انتخاب مرتب ہو کہ کتابی شکل میں ڈھل گیا۔‘‘

مجھے امید ہے کی محترمہ فوزیہ مغل کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب مفید اور معاون ثابت ہوگی۔

....

نام کتاب: مناظر ادب (حصہ نظم) مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی اور محمد پرویز ص: 196 قیمت: 200 روپے
اشاعت: 2019 پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: صفی الرحمن راعین (ایڈوکیٹ)، دربھنگہ

آج بھارت میں کالجوں کی تعداد ۴۰۲۷۳۷، اعلیٰ تعلیمی ادارے ۱۱۴۴۳ اور ۷۸۹ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں ۴۷ر سنٹرل یونیورسٹیاں، ایک نیشنل اوپن یونیورسٹی اور ۱۳ر اسٹیٹ اوپن یونیورسٹیاں ہیں۔ کالج میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اردو شعبہ قائم ہیں۔ ۳۶۷ کالجوں میں اردو شعبہ کا مقام کافی بلند ہے۔ دور حاضر کا اہم تقاضا ہے کہ طلباء و طالبات مقابلہ جاتی امتحانات کو ٹارگیٹ بنائیں، محنت، لگن و منصوبہ بند طریقہ سے مسلسل تیاریاں کریں اور کامیابیاں حاصل کریں۔ اعلیٰ مقاصد کی حصولیابی کے لئے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے دیرینہ تعلیمی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں یو۔ جی۔ سی۔ نیٹ اور جے۔ آر۔ ایف۔ کے نئے نصاب کے مطابق مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کے لئے ’’مناظر ادب: حصہ نظم‘‘ کو مرتب کیا ہے۔ ۱۹۷ر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اردو میں نظم نگاری کا آغاز و ارتقاء، اردو کے ۱۵ر اہم نظم نگاروں اور ان کی ۴۳ نظمیں ،۴۰ ۱ر معروضی سوالات اور ان کے جوابات ہیں جو امتحان کے پیٹرن کے مطابق ہیں۔

پیش نظر کتاب کا پہلا مضمون ’’اردو میں نظم نگاری کا آغاز و ارتقاء‘‘ ہے۔ اس مضمون میں واضح کیا گیا ہے کہ نظم

عربی لفظ ہے جو 'پرونا'' کے مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ اردو میں یہ لفظ فارسی سے آیا ہے۔ یہ ایک صنف شاعری ہے جس میں کسی خاص موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اس صنف کے سرمائے میں سب سے زیادہ اضافہ نظیر اکبرآبادی نے کیا ہے۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے نظم نگاری کو ایک تحریک کی شکل دی۔ چکبست نے حب الوطنی، اکبرالہ آبادی نے طنز و مزاح، اقبال نے بیداری اور جوش نے رومانی و انقلابی نظموں سے اردو شاعری کو آشنا کیا ہے۔ نظم گو شعراء فنی تجربہ کرتے رہے ہیں جو اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے۔ پیش نظر کتاب میں نئے نصاب کے مطابق اردو کے پندرہ اہم نظم نگاروں کا تعارف، اہم نظموں کی فہرست، ادبی خدمات و انفرادیت اور ۴۳ نظموں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ نظم نگاروں میں نظیر، آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی، چکبست، اقبال، جوش، میراجی، فیض، اختر الایمان، مخدوم محی الدین، ن.م. راشد، ساحر اور شفیق فاطمہ شعریٰ پر الگ الگ باب میں معلومات درج ہیں۔ معلومات مختصر ہیں لیکن اہم ہیں۔ اس صنف کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ صرف نظم نگار اور ان کی نظموں کا مطالعہ کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ باریک بینی کے ساتھ چھوٹی باتوں پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

''مناظر ادب (حصہ نظم)'' کی بنیادی اور اہم خوبی معروضی سوالات ہیں۔ اس باب میں ۱۰۴/ اہم اور مفید سوالات اور اُن کے جوابات ہیں۔ معروضی سوالات و جوابات مقابلہ جاتی امتحان کے نصاب کے مطابق ہیں۔ امتحان دینے والے امیدواروں کو معروضی سوالات کے جوابات پر کمانڈ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اس طرز پر دیگر سوالات و جوابات کو بھی شامل کر کے تیاری کو بہتر نتیجہ کے لئے تیز رفتار میں بدل سکتے ہیں۔ پیش نظر کتاب معلومات کا ایک انمول خزانہ ہے۔ امتحان کے امیدواروں کو سنجیدگی کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہ کتاب ایک گائیڈ لائن کی طرح ہے جو بے حد مفید ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے نئے نصاب پر گہرے مشاہدے کے بعد پیش نظر کتاب کو مرتب کیا ہے۔ اس سے طلباء و طالبات کو مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری میں نئی توانائی ملے گی۔

....

نام کتاب: مناظر ادب (حصہ غزل)　مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی اور محمد پرویز　ص: 160　قیمت: 150 روپے
اشاعت: 2019　پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی　مبصر: صفی الرحمٰن راعین (ایڈوکیٹ)، دربھنگہ

آج بہار میں ۱۷/ صوبائی یونیورسٹیاں، ۴/ مرکزی یونیورسٹیاں، ۵/ نجی یونیورسٹیاں اور ۶۳۸/ کالج ہیں۔ کالج کے طلباء و طالبات کو اعلیٰ مقاصد اور ملک کی ترقی کے گراف کو بڑھانے کے لئے مقابلہ جاتی امتحانات کو اپنا مشن بنانا چاہئے۔ اس کے لئے پلاننگ کے ساتھ لگاتار محنت، لگن اور سنجیدگی سے امتحانات کی تیاری کرنی ہوگی۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے چار دہائی کے تعلیمی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں یوجیسی نیٹ اور جے۔ آر۔ ایف کے نئے نصاب کے مطابق مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کے لئے ''مناظرِ ادب۔ حصہ غزل'' کو مرتب کیا ہے۔ اس سے طلباء و طالبات کو نئی روشنی ملے گی۔ زیر مطالعہ کتاب میں ۱۶/ ابواب ہیں۔ غزل کا آغاز و ارتقاء کے ساتھ ساتھ ۱۵/ غزل گو شعراء کرام کی ۱۶۳/ غزلیں اس میں شامل ہیں۔ ۲۱۲/ معروضی سوالات اور ان کے جوابات بھی ہیں جو بے حد مفید اور

کارآمد گائیڈ لائن کی طرح ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحان کے سوالات کے طرز پر اسے تیار کیا گیا ہے۔ غزل مقبول صنف سخن ہے۔ اردو میں یہ فارسی اور عربی سے آئی ہے۔ اس کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ملتی ہے۔ اس میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس کے تمام مصرعے کسی بھی ایک بحر میں ہوتے ہیں اور قافیہ اور ردیف کی پابندی بھی کرنی ہوتی ہے۔ اس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور کسی ایک مفہوم کا اظہار کرتا ہے۔ غزل کی شروعات امیر خسرو سے مانی جاتی ہے۔ قلی قطب شاہ، ولی دکنی، میر، سودا، ناسخ، ذوق، مومن، غالب، حالی، آزاد، شاد، حسرت وغیرہ بے شمار غزل گو شعراء کرام نے اسے فروغ دیا ہے۔ اس طرح پہلے باب میں مختصر میں غزل کا آغاز وارتقاء کو پیش کیا گیا ہے جو بے حد معلوماتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ۱۵؍اہم غزل گو شعراء کرام کی ۱۶۳؍غزلوں کو پیش کیا گیا ہے۔ شعراء کرام میں ولی، میر، غالب، مومن، شاد، حسرت۔ فانی، جگر، اصغر، یگانہ، فراق، مجروح، کلیم عاجز، شہریار، عرفان صدیقی کا مختصر تعارف، ادبی خدمات، انفرادیت، اعزازات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس میں ردیف کے مطابق غزل گو شعراء کرام کی غزلوں کو بھی پیش کیا گیا ہے جن کی مجموعی تعداد ۱۶۳؍رہے۔ اس سے غزل کے معیار، مقصدیت اور معنویت کا پتہ چلتا ہے جو قابل داد و تحسین ہے۔ یہ معلومات ۱۲۶؍صفحات پر محیط ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب ''مناظر ادب۔حصہ غزل'' کی اہم اور امتیازی خوبی معروضی سوالات ہے۔ اس باب میں ۲۱۲؍اہم اور مفید معروضی سوالات اور اس کے جوابات ہیں۔ معروضی سوالات مقابلہ جاتی امتحان کے طرز کے مطابق ہیں۔ طلباء و طالبات کو معروضی سوالات کے جوابات پر قدرت حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ معروضی سوالات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور قابل توجہ ہیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی قابل تحسین ہیں کہ وہ طلباء کی رہنمائی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ اسی فکر کا نتیجہ یہ کتاب ہے جو بے حد مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ دیرینہ تجربات و مشاہدات سے اس کتاب کے مشمولات سے امتحان کے امیدواروں کو تیاری میں نئی روشنی اور بہتر گائیڈنس ملے گا جس سے وہ امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کر سکتے ہیں اور اعلیٰ رینک میں مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

....

نام کتاب: مناظر ادب (حصہ انشائیہ) مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی اور محمد پرویز ص: 148 قیمت: 150 روپئے
اشاعت: 2019 پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: صفی الرحمٰن راعین (ایڈوکیٹ)، دربھنگہ

۲۰۱۹ء میں یو۔ پی جوڈیشیل سرویسیز میں ۱۸؍مسلم خواتین اور راجستھان جوڈیشیل سروز میں ۵ مسلم خواتین نے کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس طرح کے کارہائے نمایاں سے طلباء و طالبات کو درس حاصل کرنا چاہئے اور انہیں مقابلہ جاتی امتحان کو اپنی تعلیم کا مقصد بنانا چاہئے۔ عزت، خوشحالی اور اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کے لئے وہ مقابلہ جاتی امتحان کو اپنا مشن بنائیں اور بہتر پلاننگ کے ساتھ امتحان کی تیاری کریں۔ ماہر درس و تدریس پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نیٹ اور جونیئر ریسرچ فیلوشپ کے مقابلہ جاتی امتحان کے پیش نظر نئے نصاب کے مطابق اس کتاب کو مرتب کیا ہے جس کا نام ''مناظر ادب۔حصہ انشائیہ'' ہے۔ اس ترتیب میں محمد

پرویز بطور معاون ہیں۔ یہ کتاب پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تعلیمی خدمات میں ایک بے نظیر اضافہ ہے۔ اس سے امتحان کے امیدواروں کو تقویت حاصل ہوگی کیونکہ یہ کتاب بے معلوماتی اور مفید ہے۔ زیر نظر کتاب میں سات ابواب ہیں۔ اردو میں انشائیہ نگاری: فن اور آغاز وارتقاء کے ساتھ ساتھ چھ انشائیہ نگاروں کے گیارہ انشائیے اور ۱۳۵ معروضی سوالات مع جوابات شامل ہیں۔ پہلا باب صنف انشائیہ میں دل ودماغ پر اثر انداز ہونے والے انوکھے خیالات کو غیر رسمی انداز میں تحریری شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ زندگی کی اشیاء اور مظاہر کو نئے شخصی زاویوں سے دیکھنے اور تاثر کو اسلوب کی تازگی اور آزادہ روی سے پیش کرنے کا عمل ہے جس کے پڑھنے کے بعد زندگی کے کسی تاریک گوشہ پر روشنی کا ایک نیا پرتو نظر آتا ہے۔ اس سے کشادگی اور رفعت کا احساس ہوتا ہے۔ اس باب میں اس کے فن، آغاز اور ارتقاء پر معلومات افزا اور کارآمد نقاط کو پیش کیا گیا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں اردو کے چھ انشائیہ نگاروں کے گیارہ انشائیے شامل ہیں۔ انشائیہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، احمد جمال پاشا اور مشتاق احمد یوسفی کا مختصر تعارف، تخلیقات اور اسلوب نگارش کو پیش کیا گیا ہے۔ انشائیے میں ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''، ''غالب جدید شعراء کی مجلس میں''، ''چینی شاعری''، ''چارپائی''، ''وکیل صاحب''، ''لاہور کا جغرافیہ''، ''سائیکل کی سواری''، ''کپور کا فن''، ''شامت اعمال''، ''جنون لطیفہ'' اور ''گھر میں آنا مرغیوں کا'' پیش کیا گیا ہے۔ اس میں نئے نصاب اور امتحان کے پیٹرن کے مطابق معلومات کو شامل کیا گیا ہے جس سے امیدوار زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکیں۔ ڈاکٹر ہرگانوی کے دیرینہ تجربات ومشاہدات سے انشائیے کا ایک رنگارنگ گلدستہ سامنے آیا ہے جو معلومات کا ذخیرہ ہے۔ زیر مطالعہ کتاب کا ایک اہم حصہ ۱۳۵ ر معروضی سوالات مع جوابات ہے۔ اسے امتحان کے طرز پر اچھی تیاری وکامیابی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرنے سے معلومات میں اضافہ ہوگا۔ یہ امتحان کے لئے ایک مکمل گائیڈ بک ہے۔ اس طرز پر مزید معلومات حاصل کر کے لیاقت وصلاحیت کو منور کیا جاسکتا ہے۔ یہ امیدوار کی محنت ولگن پر منحصر ہے کہ کتنے بہتر انداز میں ابواب اور اس سے وابستہ معروضی سوالات پر کمانڈ رکھتے ہیں۔ امتحانات میں اہم سوالات کی جگہ غیر اہم سوالات بھی پوچھے جاتے ہیں اس لئے امیدوار کو مطالعہ کا دائرہ وسیع رکھنا بہت ضروری ہے۔ بلا شبہ نئے نصاب کے مطابق یو.جی.سی.نیٹ اور جے.آر.ایف کے مقابلہ جاتی امتحان کے لئے یہ مفید کتاب ہے۔

....

نام کتاب: ایک لڑکی مصنف: خواجہ احمد عباس تدوین وترتیب: مناظر عاشق ہرگانوی ص: 116 اشاعت: 2019 قیمت: 120 روپے پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی مبصر: صفی الرحمٰن راعین (ایڈوکیٹ)، دربھنگہ

یہ انتہائی قابل رشک واقعہ ہے کہ لارڈ میکالے کے چارٹرا یکٹ کے مطابق ۱۸۵۵ء سے آئی.سی.ایس.امتحان کی شروعات ہوئی۔ یہ بھی انتہائی قابل درس واقعہ ہے کہ آٹھ سال بعد ۱۸۶۳ء میں پہلا ہندوستانی آئی.سی.ایس.افسر ستیندر ناتھ ٹیگور بنے۔ اس اہم اور قابل درس واقعہ سے متاثر ہوکر ۱۸۷۱ء میں محنت ولگن سے چار ہندوستانی آئی.سی.ایس. افسر بنے تھے۔ یہ روایت بہتر نتائج کے ساتھ جاری ہے۔ اس روایت کو برقرار رکھنا لازمی ہے۔ موجودہ دور مقابلہ جاتی

امتحانات کا ہے۔ سبھی طلباء اور طالبات کو سماج میں پروقار حیثیت حاصل کرنے کے لئے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاریاں کرنی چاہئیں تا کہ وہ ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کر سکیں۔ اس اہم ضرورت کے پیش نظر ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے مجموعہ ''ایک لڑکی'' کو تدوین و ترتیب دیا ہے جو یو۔جی۔سی۔ کے نصاب میں شامل ہے۔

افسانہ وہ نثری تخلیق ہے جس میں اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت ہو اور کسی خاص مرکزی تاثر پر استوار ہونے کے ساتھ زندگی کا کوئی گوشہ یا عکس پیش کرے۔ اس میں قصہ، پلاٹ، کردار، نقطۂ عروج، زمان و مکان اور وحدت تاثر کے عناصر ہوتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں فن کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تخیل کی بلند پروازی اور سماجی شعور کی عکاسی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کی تعبیر ترقی پسند نظریات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے تین عورتیں، معمار وغیرہ نے انہیں ایک بڑے مقام پر فائز کر دیا تھا۔ ان کے گیارہ افسانوی مجموعے میں پہلا افسانوی مجموعہ ''ایک لڑکی'' ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں دس افسانے اور ۱۶۲ معروضی سوالات و جوابات ہیں۔ اس کتاب کو مقابلہ جاتی امتحانات کے مقاصد کے پیش نظر ترتیب دیا گیا ہے۔ گفتنی میں اختصار کے ساتھ خواجہ احمد عباس، ان کے افسانوں، عوام کے حقوق، انصاف، سماج پر اثر ڈالنے والے خارجی حالات اور ترقی پسند تحریک کے اثرات وغیرہ پر دلائل کے ساتھ پر اثر انداز میں معلومات کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی اس کاوش کو میں ان کی دیرینہ صلاحیت پر محمول کرتا ہوں۔ انہیں مقابلہ جاتی امتحانات پر دسترس حاصل ہے جس کی نمایاں جھلک گفتنی اور معروضی سوالات و جوابات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں خواجہ احمد عباس کے سبھی افسانے فکر انگیز، معنی خیز اور سماج کے عکاس ہیں جو افسانوی خوبیوں سے منور ہیں۔

دو ایک افسانہ کی تفصیل ضروری ہے۔ افسانہ ''معمار'' کا ہیرو عمارتوں کی تعمیر میں کام کرنے والا بندو معمار ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ ان دنوں وہ بے کار تھا۔ بیٹے کی شادی کے بعد بہو کے آنے پر اس نے گھر کے علاوہ کسی دوسری عمارت میں رات گذارنے کا فیصلہ کیا اور اس تلاش میں نکل پڑا۔ کئی عمارتوں کے پاس پہنچنے پر دربانوں نے اُسے وہاں سے بھگا دیا۔ آخر تھک کر سڑک کے کنارے وہ چادر لپیٹ کر سو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے نئی دہلی کی شاندار عمارتوں کی تعمیر میں کام کرنے والا مزدور بندو کی دردناک موت کو پیش کیا ہے جو آج بھی ہندوستانی سماج کی ایک دردناک سچائی ہے۔ افسانہ ''ابابیل'' کا مرکزی کردار ظالم اور مار پیٹ کرنے والا رحیم کسان ہے۔ گاؤں کے لوگوں، بچوں، جانوروں اور اپنے گھر کے افراد کو بھی مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ اُس کی اس عادت کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے اس سے بولنا بھی بند کر دیا۔ مار سے تنگ و پریشان ہو کر اُس کے لڑکے اور بیوی نے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ اب وہ اکیلا رہ گیا۔ اِسی دوران اس کے گھر میں گھونسلہ بنا چکے ابابیل اور اُس کے بچوں کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔ ایک دن بارش سے ابابیلوں کو بچانے کے لئے بارش میں بھیگتے ہوئے اُس نے اُس گھونسلے کی حفاظت کی لیکن بارش میں بھیگنے کی وجہ سے وہ سخت بیماری میں مبتلا ہوا اور اُس کی موت ہو گئی۔ پڑوسیوں

نے دیکھا کہ وہ مر چکا ہے اوراس کے پاس چارابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی ہیں۔
خواجہ احمد عباس نے افسانوں میں زندگی کے اہم موضوعات کو پیش کیا ہے۔اُن کے افسانوں میں دوراندیشی، عصری حسیت اور مستقبل شناسی ملتی ہے۔ بیبا کی اور حقیقت نگاری بھی موجود ہے۔ سماج کے مسائل اور مصائب کو افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔زیر مطالعہ کتاب میں ماہرامتحان ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے معروضی سوالات اور ان کے جوابات کو بھی شامل کیا ہے جو امتحان کے طرز پر ہیں اور گائیڈنس کی شکل میں مفید اور کارآمد ہیں۔ اِس سے امتحان کے امیدوار کو تیاری میں سہولت حاصل ہوگی۔ بلاشبہ یہ کتاب معلومات سے مزین اور خوب سے خوب تر ہے۔

....

نام کتاب: یادوں کے آئینے میں مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ص: ۱۲۰ قیمت: ۱۵۰روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۰ء مبصر: ڈاکٹر ابراراحمد اجراوی (مدھوبنی)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ہرفن مولا تخلیق کار ہیں، ہمہ جہتی، ہمہ بینی اور ہمہ گیری ان کی شناخت ہے، وہ زود نویس بھی ہیں اور خوب نویس بھی۔ وہ اردو کے سند باد ہیں، جس نے شعروادب کے تمام جزیروں کو چھان مارا ہے۔ شاعری، فکشن، خاکہ، انشائیہ، طنز ومزاح، سفرنامہ، سوانح، تنقید غرض ہر شعری اور نثری صنف پر ان کے دست خط ثبت ہیں۔ ان کا قلمی سفر پچاس پچپن برسوں سے بے تکان جاری ہے، ڈھائی سو سے زائد کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کلاہ افتخار اپنے سر پر رکھتے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے قلم اٹھایا تھا، ملازمت سے سبک دوشی کے بعد بھی یہ قلم ان کی انگشت شہادت کی گرفت سے آزاد نہیں ہوا ہے۔ وزیر آغا نے غلط نہیں کہا تھا کہ مناظر عاشق ہرگانوی حالت بیداری میں ہی نہیں، بلکہ عالم خواب میں بھی قلم وقرطاس پر ہاتھ جمائے کچھ نہ کچھ رقم کرتے رہتے ہیں۔ وہ تصنیف وتالیف اور تحریر وتخلیق کی ایسی مشین ہیں، جو ہر دم رواں رہتی ہے۔

زیر نظر کتاب 'یادوں کے آئینے میں' نادرۂ روزگار اور یادگار زمانہ سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں فاضل مصنف نے اپنے رفقاء ومعاصرین کا ایک ایسا البم تشکیل دیا ہے جس میں مختلف عہد کی متحرک تصویریں ہم کلام ہیں۔ مناظر عاشق ادبی دنیا کے ابن بطوطہ کا لباس زیب تن کرکے، دیس بدیس گھومتے رہے، پورب پچھم کی وسعتوں کو اپنے قابو میں کیا، سیمناروں، مشاعروں، مباحثوں اور مذاکروں میں سرگرم عمل رہے، حرکت وفعالیت اور ذوق سیر و سیاحت ہی وجہ تھی کہ ملک وبیرون ملک کے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور ناقدوں سے ان کے مراسم کی مضبوط اساس فراہم ہوگئی، انھیں اجنبی کو اپنانے اور گلے لگانے کا فن آتا ہے، وہ دوست کیا، دشمن اور حریف کو بھی اپنی طلاقت لسانی اور شیریں بیانی سے رام کر لیتے ہیں، شناساؤں میں ہم عمر وہم عصر بھی رہے، ہم درس وہم پیشہ بھی یار غار بن کر رہے اوران کے وسیع حلقۂ احباب میں بزرگ وعمر رسیدہ افراد کی بھی شمولیت رہی ہے، جس کا تقاضا تھا کہ وہ یادوں، ملاقاتوں اور باتوں کے سلسلے کو کتابی شکل عطا کریں کہ ہمارا حافظہ بہت کمزور ہوگیا ہے، یا اِس کان سننے اور اُس کان نکالنے کی روش زور پکڑتی جارہی ہے اورنئی نسل تو فراموش کاری کے معاملے میں اپنا جواب نہیں رکھتی، کون سنتا ہے آہ وفغان درویش۔

نجی یادداشتوں اور یاران کہن کے تذکرے پر مشتمل ان کی ایک اور کتاب ''یادیں باتیں'' عرصہ قبل یعنی ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں انھوں نے اکابر و اسلاف کے شخصی کوائف و مآثر کو سمیٹا تھا اور کلاسک کے درجے میں آنے والے شعرا، ادبا اور ناقدوں کی کہکشاں آباد کی تھی۔ فراق گورکھ پوری، جمیل مظہری، نسیم انہونوی، سہیل عظیم آبادی، خلیل الرحمٰن اعظمی، زیب غوری، غیاث احمد گدی، احمد جمال پاشا، کالی داس گپتا رضا، کلام حیدری اور مظفر گیلانی اس بزم میں شریک تھے، مگر ظاہری بات ہے کہ یار باش مناظر 'عاشق' کے معشوقوں میں کچھ نام چھوٹ گئے تھے اور شعر و ادب کے کچھ اور روشن ستارے تھے جو انھیں دعوت تحریر دے رہے تھے اور ان کی خاموشی و بے پرواہی پر شکوہ سنج تھے، سوان مابقیہ دوستوں اور یاروں کی یادوں کو تجونے کے لیے انھوں نے ایک اور کتاب کا ڈول ڈالا اور بشکل کتاب ہذا یادوں باتوں کا نگار خانہ سجا کر قارئین کی عدالت میں پیش کر دیا۔ اس کتاب میں علم و فن اور شعر و ادب کی دنیا کے جو نام وربا سی شامل ہیں، ان کے اسما بالترتیب یہ ہیں۔ عصمت چغتائی، انتظار حسین، قمر رئیس، مظہر امام، بیکل اتساہی، کلیم عاجز، شین مظفر پوری، عبدالقوی دسنوی، ملک زادہ منظور احمد، رحمٰن نیر، عزیز اندوری، ہمایوں ظفر زیدی، رضوان احمد، سید اجمل فرید وغیرہ کی یادوں اور باتوں سے اس چمن کتاب میں گل کاری کی گئی ہے۔ اتفاق سے ان تمام افراد کی بساط حیات لپیٹی جا چکی ہیں اور یہ تمام اپنا مستعار عرصۂ حیات مکمل کر کے کسی اور دنیا میں اپنا ڈیرا ڈال چکے ہیں، مگر اپنے تخلیقی کارناموں اور ادبی کارگزاریوں کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں آج بھی زندہ ہیں اور ہم ان کے ذکر میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

سارے مرحومین کو مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی چشم سر سے اور بہت قریب سے دیکھا ہے، انھیں جانچا، پرکھا، ٹٹولا اور برتا ہے۔ ان سے ادبی اور تخلیقی معاملہ کیا ہے۔ صبح و شام ان سے بغل گیر رہے ہیں۔ ادب گلوب پر ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کی محفل گرم کی ہے۔ تلخ و شیریں یادوں کا ایک سلسلہ ہے، جو خود بینی اور خود شناسی پر مجبور کرتا ہے۔ ان سے مناظر عاشق کی خط و کتابت رہی ہے۔ ترتیب و پیش کش میں بھی انھوں نے ایک وضع، رواداری اور شائستگی برقرار رکھی ہے اور شدت عصبیت یا اظہار محبت میں کسی شخصیت کا قد بڑھانے / تراشنے یا ان کی تحقیر و توہین کرنے کا یارا نہیں دکھایا ہے۔ انھوں نے صداقت و عدالت کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا ہے، تاکہ ان خاکوں / سوانحی مضامین میں مخصوص عہد و عصر کی تصویر مجسم ہو سکے۔ ان میں عصمت چغتائی واحد خاتون ادیبہ ہیں، جنھیں مصنف نے بالانشیں رکھ کر حلقۂ نسواں کو ادب معاشرہ میں مقدم رکھنے اور ان کی کاوشوں کو بنظر استحسان دیکھنے کا ہمیں سبق دیا ہے۔ عصمت آپا کے ساتھ اپنی ملاقات کو لفظوں کا پیرہن عطا کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جس میں خود شناسی کا جذبہ ہے اور وقوعہ کو بے کم و کاست بیان کرنے کا سلیقہ نمایاں ہے:

''مظہر امام نے میرا تعارف کرایا تو جھٹ سے بولیں ''پڑھتی رہتی ہوں۔ بہت چھپتے ہیں۔ یہ اچھی عادت نہیں ہے۔ سوچتے کب ہیں؟ صرف لکھتے ہی رہتے ہیں۔'' (ص:۶)

شہرۂ آفاق فکشن نویس انتظار حسین سے بھی فاضل مصنف کے علائق و روابط گہرے رہے، ان کی باہمی شناسائی کے استحکام میں سرحدوں کی شعلہ فشاں خلیج حائل نہ ہو سکی۔ انتظار حسین بھی ادب نوازی اور فن پرستی کے معاملے میں

تعصب کا شکار نہ تھے، مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں پر نظریں جمائے رکھتے تھے اور بوقت فرصت ان پر اپنی تنقیدی رائے کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔ ایک سیمنار میں علیک سلیک اور تعریف و تعارف کے بعد مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی ڈائری برائے آٹو گراف بڑھائی، تو اس وقت کی صورت کی کس طرح منظر کشی کی ہے:

''میں [مناظر عاشق ہرگانوی] نے نوٹ بک نکال ان سے کہا'' آٹو گراف چاہیے۔''

انھوں نے بلا تامل لکھا:

''ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور۔ (ص:۱۱)

مصنف کو اپنے اکابر ہی نہیں، معاصرین سے ملنا، ان سے گفتگو کا بازار گرم کرنا، ان سے ادبی انٹرویو لینا اور چبھتے ہوئے سوال کرنا بہت پسند رہا ہے۔ انتظار حسین سے جب انھوں نے یہ سوال کیا کہ'' زندگی کا جمالیاتی پہلو کیا فحش نگاری میں مضمر ہے'' تو انھوں نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہا، وہ ہمیں ذات اور درون ذات کا محاسبہ کرنے کی تحریک دیتا ہے:

''ہرگز نہیں۔ اظہار کے گہرے معنیاتی تفاعل سے صورت حال سامنے آتی ہے۔ لیکن جمالیاتی پہلو کو فحش نگاری تک لے جانا مضحک ہے کہ معصوم نفسیاتی خواہش کی فضا الگ ہوتی ہے۔ جسم و جمال کی لطافت کے اظہار کے لیے بھی الگ الفاظ ہیں۔'' (ص:۱۹)

ان خاکہ نما تحریروں میں قارئین کو مشک بار ادبی اور شعری فضا کی تو سیر کرائی ہی گئی ہے، شخصیت کے دروں کو ابھارنے کے ساتھ نجی تعلقات کے اطرف کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ باخبر افراد جانتے ہیں کہ مشہور شاعر و ناقد مظہر امام سے ان کا تعلق کسی خاص دائرے تک محدود نہیں تھا، ان کے ساتھ مناظر عاشق ہرگانوی کے مراسم کی پہنائی و گیرائی کو حرفوں، شبدوں اور لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تعلقات الفاظ و اصوات کی بندشوں سے آزاد تھے۔ وہ ادبی کائنات میں ان کے 'بڑے بھائی' بھی تھے۔ اور نہ صرف مظہر امام، بلکہ ان کے اہل خانہ اور رشتہ داروں کے ساتھ خوش گوار یادوں کا خوش کن اور مسرور کن سلسلہ آباد تھا۔ وہ خود ان تعلقات کی بے پناہی کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

''مظہر امام کے ساتھ میری یادیں بادیں اتنی ہیں کہ پوری ایک کتاب بن سکتی ہے۔ دربھنگہ، پٹنہ، سری نگر، جمشید پور، دہلی اور ہزاری باغ کے ساتھ بھاگل پور کی یادیں باتیں ہیں۔ میں جب مارواڑی کالج، بھاگل پور آ گیا تو وہ مبینہ بھابھی کے ساتھ یہاں بھی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ان کی اپنائیت اور قربت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان جگہوں میں ہم نے شب و روز ساتھ گذارے تھے۔ کشمیر کے پہلگام کی یادیں بھی لپٹی ہوئی ہیں جب ہم دو دن'' پہلگام ہوٹل'' میں رکے تھے اور امیتابھ بچن، راج کمار، اسرانی، سندر اور ریکھا سے ملاقات بات ہوئی تھی اور میں نے ان دوراتوں میں ناولٹ'' آنچ'' لکھا تھا۔'' (۳۸)

پھر مظہر امام کے ساتھ اپنے بے تکلفانہ تعلقات کو تحریر کے پیانے میں ڈھالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب ۱۹۷۲ء میں ایم اے کرنے کے لیے پٹنہ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا تو ان کا مسکن میرے لیے گھر آنگن بن گیا۔ اور گھریلو تعلقات اتنے مستحکم ہوئے کہ من و تو کی تخصیص ختم ہو گئی۔ ان کی ایجاد کردہ ''آزاد غزل'' کی ترویج کے لیے میں نے بڑا کام کیا۔ ان کی شخصیت پر کبھی کبھی نشتر زنی بھی کی گئی جس کا جواب میں نے دم خم کے ساتھ دیا کہ ان کی شخصیت، فکر اور نظریہ سے میں بہت حد تک واقف ہو چکا تھا۔'' (ص: ۴۳)

خاکہ نویس ہرگانوی کے حلقۂ شناساں میں منفرد و مشہور گیت کار بنگل اتساہی بھی شامل ہیں، جو عمر کے دورانیے میں ان سے کئی سال آگے تھے، بنگل شاعر ادیب ہی نہیں، سیاست داں بھی تھے، ایم پی تھے، سیاست کی ہر گلی تک ان کی رسائی تھی، وہ وی آئی پی کلچر سے تعلق رکھتے تھے، مگر دو طرفہ تعلقات اور اظہار محبت میں نہ عمروں کا تفاوت حائل تھا، نہ میدان عمل اور پیشوں کا اختلاف کبھی کسی شکر رنجی کا باعث بنا۔ باہمی رشتوں میں گرمی اور تمازت تھی اور گویا دونوں طرف برابر آگ لگی رہتی تھی۔ گرم جوشانہ مراسم پر مبنی ایک واقعہ انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

''وہ [بنگل اتساہی] کسی مشاعرہ میں آسام گئے تھے۔ واپسی کا ٹکٹ برہم پتر میل سے تھا۔ یہ ٹرین بھاگل پور ہو کر دہلی جاتی ہے۔ بنگل صاحب نے رجسٹرڈ خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ وہ بھاگل پور اتر جائیں گے اور دو دن میرے یہاں قیام کریں گے۔ اتفاق سے مجھے وہ خط ایک ہفتہ بعد ملا اور میں بھاگل پور میں تھا بھی نہیں۔ پی ایچ ڈی کا ایک وائیوا لینے اندور گیا ہوا تھا۔ واپسی پر بنگل صاحب کو فون کیا تو انھوں نے بتایا ''بھاگل پور ریلوے اسٹیشن پر میں سامان کے ساتھ اتر گیا تھا۔ آپ کو فون لگاتا رہا لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ جب ٹرین کھلنے لگی تو میں دوبارہ سوار ہو گیا۔'' (۴۸)

مناظر صاحب تعلقات کو تکلف و تصنع کی آلودگی سے پاک رکھتے ہیں اور باہمی علائق کو بے تکلفی کی آخری حد تک لے جانے کے آرزومند رہتے ہیں، وہ استاد و شاگرد اور صغیر و کبیر کی مصنوعی تفریق کی دیوار کو بھی منہدم کر دینا چاہتے ہیں۔ ادب میں طنز کرنے، فقرہ کسنے اور جملہ چست کرنے کی روایت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم عاجز نہ صرف ایک وضع دار اور ایک دائرے میں رہنے والے شاعر تھے، بلکہ کم آمیز، کم گو اور شائستہ و سنجیدہ اردو کے استاد بھی تھے۔ شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی میں ان کا رعب و جلال دیدنی تھا۔ کیا مجال کہ کوئی ان سے کھل کر بات کر سکے۔ وہ اپنی ذات میں لیے دیے رہتے تھے۔ طلبہ ہی نہیں شعبہ کے اساتذہ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ مگر کبھی احترام کا گھروندا ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی جیسا کھلنڈرا اور شوخ طالب علم ہم پیشہ اساتذہ کی چٹکی اور دل لگی کا منظر کس طرح پیش کرتا ہے، دیکھیے:

''میں جب طالب علم تھا تو دو واقعے ایسے ہوئے جن کا ذکر ضروری ہے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک بہت تھی۔ کلیم عاجز صاحب حسب معمول کرتا، پاجامہ اور بنڈی میں ڈپارٹمنٹ آئے۔ ہم سب طالب علم فل سویٹر اور کوٹ میں کانپ رہے تھے۔ شعبے کے ایک استاد یوسف خورشیدی صاحب کلاس لے رہے تھے۔ انھوں نے کلیم صاحب کو دیکھ کر آہستہ سے کہا ''بڈنگ ہاؤس کی گرمی ساتھ لیے چلتے

ہیں۔'' مخاطب ہم طلبا تھے، لیکن کلیم صاحب نے یہ جملہ سن لیا۔ وہ پلٹ کر ان کے پاس آئے اور بہت خفا ہوئے۔ ایسی خفگی پہلی بار میں نے دیکھی۔'' (ص:۵۴)

مشہور افسانہ نگار شین مظفر پوری بھی کتاب کے اوراق میں جلوہ گر ہیں، مناظر صاحب کے ساتھ ان کے مخلصانہ اور محبانہ روابط سب پر عیاں تھے، شین صاحب سے ان کی ملاقاتوں کا شمار عدد سے باہر ہے، مصنف نے اس موہنی اور پیاری شخصیت کی تصویر ایک خاکے میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ شین مظفر پوری پردے کے پیچھے سے کام کرنے والے ادیب تھے، زندگی بھر پس منظر میں رہ کر دوسروں کی قلمی اور ذہنی پرورش کرتے رہے، اردو افسانے کو اوج اور موج عطا کیا، مگر آخری وقت اتنا ہی دردناک گزرا۔ عروج و زوال کی دوری پل بھر میں مٹ گئی۔ تحقیر، توہین اور تضحیک کا ہر حربہ ان پر آزمایا گیا۔ وہ ہم عصروں اور رفقائے کار کی دست درازیوں کا تختۂ مشق بنتے رہے اور یوں انھیں عظیم آباد کی دھرتی سے بوریہ بستر سمیٹنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایک دوست دوسرے دوست کے کرب و درد پر کس طرح بے چین ہوتا ہے، ان سطروں میں محسوس کیجیے:

''شین صاحب مذہب بیزار آدمی تھے۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں پٹنہ کو خیر باد کہہ کر وہ اپنے گاؤں ہاتھ اصلی چلے گئے۔ اس کا علم مجھے ان کے خط سے ہوا۔ جسے پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے بے حد کرب سے لکھا تھا کہ اب وہ اپنے گاؤں میں ہی رہیں گے۔ معاش کا مسئلہ یہاں بھی تھا۔ اس لیے گاؤں کی مسجد میں مؤذن بن گیا ہوں!۔ یہ ایسی اطلاع تھی جسے سوچ کر میں آج بھی اندر سے ٹوٹ جاتا ہوں، بکھر جاتا ہوں اور ان کی مغفرت کے لیے خود بخود دعائیں نکلتی ہیں۔'' (۶۵)

کم ضخامت کی یہ کتاب اپنے عہد کی ممتاز اور سر برآوردہ شخصیتوں کا خوب صورت اور پر کشش البم ہے، بہت سارے فریم ہیں، جس میں مختلف چھوٹی بڑی تصویریں قرینے اور سلیقے سے سجائی گئی ہیں۔ یہ متحرک خاکے زیر نظر شخصیت کے چہرہ بشرہ، ان کے خدو خال، ان کی پسند و ناپسند، ان کے نظریات و خیالات، ان کے شعوری اعمال، حرکات و سکنات اور نشست و برخاست کا ہیولی خلق کرتے ہیں اور قاری ان سطروں کی لہر میں بہتا ہوا اس شخصیت کی موج در موج تہوں میں کھو جاتا ہے۔ مناظر صاحب کے سلسلۂ احباب میں اور بھی کئی لوگ ہیں، جن کے نام اور کام پر گم نامی کی گرد جمی ہوئی ہے، جو کسی 'عاشق' کی دید و شنید کے منتظر ہیں، امید ہے کہ وہ اپنے احساس و اظہار کی تہوں کو ایک بار پھر کریدیں گے اور اپنے موئے قلم سے ان دھندلی اور مٹتی ہوئی تصویروں کو ابھاریں گے اور ان کے ناک ونقشہ کو قارئین سے روبرو کرائیں گے۔

....

نام کتاب: شعاع نقد (مجموعہ مضامین) مصنفہ: ڈاکٹر رضوانہ پروین ص: ۲۴۰ قیمت: ۳۵۰/روپے

ناشر: کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی، سن اشاعت: ۲۰۱۹ء تبصرہ: ابرار احمد اجراوی

ڈاکٹر رضوانہ پروین کا تعلق طبقۂ نسواں کی نئی نسل سے ہے، یہ تنقیدی جہان کا قدرے نیا نام تو ہے کہ ان کا تنقیدی اثاثہ عددی اعتبار سے ذرا کم ہے، مگر یہ فکشن تنقید کا ابھرتا ہوا توانا اور تابندہ نام بھی ہے۔ وہ اردو ادب کی با

شعور اور سنجیدہ و متین قاری ہیں، مطالعہ و محاسبہ اور غور و فکر کے طویل راستہ پر چلنا ان کی عادت ثانیہ ہے۔ وہ اس خار زار راستہ پر چل کر کچھ پھول بھی چنتی ہیں اور پھر پابندی سے اپنے تنقیدی افکار کو تنقیدی ملبوس عطا کرتی رہی ہیں، زیر نظر مجموعہ مضامین بشکل کتاب ان کی ایک اہم تنقیدی پیش رفت ہے۔ وہ فکشن قاری ہیں، اس لیے فکشن یعنی ناول و افسانہ پر ہی تنقیدی اور تجزیاتی مضامین مجلات و رسائل میں لکھتی اور ایک حلقے میں انہماک سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔ تازہ ترین پیش کش 'شعاعِ نقد' ان کا مجموعۂ مضامین ہے، مگر اس میں مضامین و مشمولات کی سطح پر جو یکسانیت و مماثلت ہے، اس کے سبب اس کو روایتی مجموعہ تصور کر لینا قرین انصاف نہیں ہوگا۔ یہ روایتی اور بھرتی کے مجموعہائے مضامین سے مختلف و ممیز ہے۔

مختصر تمہید کے بعد اس کتاب کی فہرست کو کھنگالتے ہیں۔ مصنفہ صنفی یکسانیت یا صنفی احترام کا خیال رکھتی ہیں کہ ایک مقولہ ہے 'کند جنس با ہم جنس پرواز'۔ ان کے بیش تر مضامین خواتین ناول نگار یا افسانہ نویس پر مرتکز ہیں، جو ان کی تانیثیت پسندی اور خاتون پرستی کا اظہار و اعلان ہے۔ افسانہ کی تنقید پر جو دس مضامین زینت کتاب ہیں، وہ یوں ہیں۔ اردو افسانے کا نیا سنگ میل: دخمہ، الیاس احمد گدی: ایک منفرد افسانہ نگار، ذکیہ مشہدی کے چند نمائندہ افسانے: تجزیاتی مطالعہ، شائستہ فاخری کا افسانوی افق، صادقہ نواب سحر: بحیثیت افسانہ نگار، عصر حاضر کی ایک حساس افسانہ نگار: نسترن احسن فتیحی، آشا پربھات کے افسانوں میں سماجی و معاشرتی پہلوؤں کی عکاسی، بانو کے افسانے: حالات کے نگار خانے، اعجاز شاہین بحیثیت افسانہ نگار، افسانہ 'بیچ ندی کا مچھیرا': ایک جائزہ۔ اس کے بعد ناول کی تنقید کے عنوان سے نو مضامین شامل ہیں۔ ہندستانی عوام کے حزن و کرب کا عکاس: اماوس میں خواب، ناول 'جس دن سے': ایک مطالعہ، 'لفٹ' عصر حاضر کا عکاس، فرسودہ رسوم کی جکڑ بندی اور نسوانی حقوق کی پامال داستان: اندھیرا پگ، ناول 'لمحوں کی کسک' ایک عمومی جائزہ، 'آنکھ جو سوچتی ہے': عمومی جائزہ، 'قطرے پہ گہر ہونے تک': تنقیدی جائزہ، شہناز فاطمی کا ناول 'بولتی آنکھیں': تعارفی مطالعہ، فائر ایریا: ایک مطالعہ۔

مضامین کی تقسیم و تعیین سے ہی بیک نظر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ کو فکشن اور متعلقات و مشتقات فکشن سے ذہنی مناسبت ہے، وہ نان فکشن یعنی غیر افسانوی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لینے سے گریز کرتی ہیں، یا ان مضامین کو باضابطہ اشاعتی پروگرام کا حصہ بنانے پر آمادہ نہیں ہیں، تاکہ تنقید کے منظرنامے پر ان کی شناخت اور اختصاص پر حرف نہ آئے۔ مذکورہ تمام مضامین جامع اور تکمیلیت آشنا ہیں، زیر بحث ناول و افسانہ کی کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمہ اور زبان و بیان کے مفصل و مطول جائزے پر مبنی ہیں۔ تمام مضامین کی ساخت اور مواد کی ہمہ رنگی سے مصنفہ کی تنقیدی بصیرت عیاں ہے۔ حالاں کہ وہ ابھی تازہ کار اور نو وارد ہیں، اس کے باوجود انھیں زبان و بیان پر عبور اور تحریری اظہار پر وفور حاصل ہے، اس لیے ناول یا افسانہ کا تجزیاتی سفر کرتے ہوئے ان کا قلم ذریعہ اظہار کی تنگ دامنی کا شکوہ نہیں کرتا۔ وہ ایک معتدل و متوازن رویے کی پرستار ہیں، ان کے یہاں افراط و تفریط کا گزر نہیں ہوتا۔ انھوں نے تخلیق اور تنقید کے درمیان ایک متوازی خط استوار کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ قاری تخلیق اور تنقید کی قربت اور دونوں کی ہم آہنگی سے محظوظ ہو سکے۔ مصنفہ متن مرکوز تنقید کے مسلک کی حامی ہیں، اس لیے وہ متن

کی قرأت وقربت کو ہی اصل اور کل تصور کرتی ہیں۔اور تخلیق کے متن کی خواندگی کے بعد جو تاثرات اور احساسات ان کے ذہن میں از خود جنم لیتے ہیں، اس کو کسی لاگ لپیٹ اور دوسرے ناقدین کی آرا کے ذخیرے کی طرف جھانکے بغیر، حوالۂ قرطاس کر دیتی ہیں۔

اس زمانے میں نہ صرف اچھے فکشن تخلیق کاروں کا قحط ہے، بلکہ ذی استعداد فکشن ناقدین کے تولد کا عمل بھی رک سا گیا ہے۔ فکشن ناقدین کی خزاں رسیدہ کھیتی بادِ بہاری کی منتظر ہے۔انھوں نے فکشن کو اپنے مطالعہ ومکاشفہ کا محور کیوں بنایا، وہ اس سوال کا جواب ان لفظوں میں دیتی ہیں:

> ''اس بات سے انکار نہیں کہ موجودہ صدی فکشن کی ہے۔گزشتہ چھبیس ستائیس سالوں میں دھڑلے سے ناول اور افسانے منظر عام پر آئے۔ان میں کچھ کہنہ مشق قلم کاروں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ بالکل نئی نسل کے قلم کاروں کی پہلی تخلیق نے بھی چونکایا...جو کہ فکشن کے مستقبل کے لیے خوش آئند ہے۔یہی صورت حال فکشن کی تنقید کی بھی ہے۔اب سے دو تین دہائی قبل تک یہ سوال اٹھایا جارہا تھا کہ 'نئی نسل کو اپنا ناقد خود پیدا کرنا ہوگا' یہاں اس جواز کے طور پر عرض کرتی چلوں کہ اس صدی میں تخلیق کاروں نے بھی بڑی مستعدی سے تنقید کے میدان میں قدم رکھا ہے، جو کہ تخلیق اور تنقید دونوں کے لیے فال نیک ہے۔''

'دخمہ' پروفیسر بیگ احساس کا مشہور افسانوی مجموعہ ہے، جس کو معتبر ادارہ ساہتیہ اکادمی نے بھی اعزاز سے سرفراز کیا تھا اور اس پر ناقدین کے حلقوں میں پذیرائی اور مدح وستائش کا دور بھی عروج پر رہا۔مصنفہ نے بھی مجموعۂ ہذا کی شہرت سے متاثر ہوکر، کتاب کا پہلا مضمون اسی افسانوی مجموعہ پر مرکوز رکھا ہے، مگر وہ اس کی کہانی، پلاٹ اور کرداروں کی نامعلوم دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے اس لفظ کی تحقیق کو اساسی درجہ دیتی ہیں، تا کہ ایک کم خواندہ قاری پر بھی ابتدا میں ہی اس افسانے کی ماہیت وسریت منکشف ہو سکے۔اس لفظ کے معنی ومفہوم تک رسائی حاصل کرتے ہی افسانہ کا پس منظر قاری پر منتج ہو جاتا ہے کہ دخمہ کوئی عام فہم لفظ نہیں، یہ ایک استعارہ ہے، یہ ایک علامت اور تمثیل ہے۔وہ اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''دخمہ پارسیوں کے قبرستان میں نعش کے رکھنے کی خاص جگہ کو کہتے ہیں۔چونکہ اس افسانے کے مرکز میں پارسی برادری ہے۔پارسیوں کے یہاں نعش کو دفن کرنے یا جلانے کے بجائے دخمہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا ہے تا کہ گدھ اسے کھالیں۔چونکہ گدھوں کا نعش کو کھا کر پیٹ بھرنا پارسیوں کے مذہبی عقیدے کے مطابق نیک عمل تصور کیا جاتا ہے۔'' (ص:۲۲)

'الیاس احمد گدی ایک منفرد افسانہ نگار' بھی کتاب کا ایک اہم اور قابل استفادہ مضمون ہے، جس میں انھوں نے الیاس احمد کی شخصیت وسوانحی احوال وآثار کا جائزہ لینے کے بعد ان کے چند افسانوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا ہے۔خاتمہ کے طور پر وہ جو کچھ لکھتی ہیں، اس سے الیاس احمد گدی کے افسانوں کی حقیقی دنیا کے جزیروں تک رسائی کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔تقابلی انداز میں لکھتی ہیں:

''الیاس احمد گدی ایک جینوین فن کار ہیں۔ انھوں نے زندگی کے مختلف رنگ کو اپنے افسانوں میں علامتوں کا سہارا لے کر بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی فکری فنی افتاد کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ہندی کے ایک ممتاز ادیب کا قول بامعنی معلوم ہوتا ہے کہ جو کام مہا شویتا دیوی نے بنگلہ میں کیا ہے، وہی کام الیاس احمد گدی اردو فکشن میں انجام دے رہے تھے۔ اور اس منزل کی طرف گام زن تھے جہاں پہنچ کر مہا شویتا دیوی کی امتیازی شناخت بنی، لیکن المیہ یہ ہے کہ الیاس صاحب کا ذریعہ اظہار 'اردو' تھی اور اردو جس بے اعتنائی کا شکار ہے وہی موصوف کے حصے میں بھی آئی۔'' (ص:۳۹)

مصنفہ خاتون قلم کاروں کی نمائندہ ہیں، اور خواتین نے فکشن اصناف سے رغبت تو خوب دکھائی ہے، مگر تنقید کی دنیا میں ان کے نشان قدم تلاش کرنے سے بھی بہت کم ملتے ہیں۔ یہاں بھی مردوں کی حکمرانی ہے، اور انھی کی فکر تنقیدی دنیا پر حاوی ہے، اسی لیے مصنفہ کے اس تنقیدی دست خط کو نہ صرف ازراہ مروت مرد ناقدین نے، بلکہ نسائی حلقہ کی نمائندہ فکشن نقادوں نے بھی دل کھول کر، تحسین و آفریں سے نوازا ہے اور ان کے نقش اول کو نقش ثانی و ثالث میں تبدیل کرنے کے لیے حوصلہ افزا اور مثبت تحریریں لکھی ہیں، یہ تحریریں کتاب کی پشت اور فلیپ پر ثبت ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ بعنوان 'دستک آنے والے ہوا کی' مایۂ ناز مقبول ناول نگار نورالحسنین نے ذرا تفصیل سے لکھا ہے اور نئی نسل میں سے ہی قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جیلانی بانو، نارنگ و فاروقی وغیرہ کے نمودار ہونے کی توقعات وابستہ کرتے ہوئے یہ حوصلہ افزا جملے لکھے ہیں:

''رضوانہ پروین کی فکشن تنقید سے رغبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود بھی افسانے لکھتی ہیں۔ گو ابھی آرزو کا لڑکپن ہے لیکن جس طرح وہ تنقید نگاری پر محنت کر رہی ہیں، اگر اسی طرح اپنی افسانہ نگاری پر بھی توجہ دیں گی تو ایک دن اس میدان میں نام کر جائیں گی۔'' (ص:۱۴)

مشہور تخلیقی ناقد حقانی القاسمی کے قلم اعجاز رقم سے جو مختصر تحریر کتاب کی پشت پر درج ہے، اس کی بنت میں بھی مصنفہ کو میدان تنقید میں مہمیز کرنے کی آرزو کا دخل ہے۔ لکھتے ہیں:

''رضوانہ پروین نے 'تفہیم و تعبیر کے ذریعہ ادبی دنیا میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ 'الیاس احمد گدی اور سنجیو کی ناول نگاری: تقابلی مطالعہ' کے ذریعہ شناخت کا دوسرا مرحلہ طے کیا اور اب فکشن نگاروں پر مبنی اس کتاب کے ذریعے شناخت کی ایک اور نئی منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ رضوانہ پروین سے ادبی دنیا کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں کہ وہ تازہ، توانا اور تابندہ ذہن کی حامل ہیں اور ان کے اندر فکشن کے مباحث و امکانات اور معاصر تنقیدی ڈسکورس کو سمجھنے کی قوت بھی ہے۔''

افسانہ نگار اور مترجم عذرا نقوی کی یہ اصلاح انگیز رائے بھی قابل قدر ہے کہ:

''رضوانہ افسانوں کا بیریک بینی سے مطالعہ کرتی ہیں اور اپنے انداز میں ان کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرتی ہیں۔ ان کے مضامین غیر ضروری حوالوں سے بوجھل نہیں ہیں۔ ابھی ان کو بہت دور جانا ہے۔

زبان و بیان پر مزید محنت کرنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تنقید میں اپنی الگ پہچان بنائیں گی۔''
ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا یہ قول بھی بجا ہے کہ

''ڈاکٹر رضوانہ پروین نے تنقید میں خصوصاً فکشن کا انتخاب کیا ہے۔ بہت اچھا کیا ہے۔ وہ ایک تخلیق کار کا ذہن بھی رکھتی ہیں اور تنقید نگار کا بھی۔ انھوں نے اپنے معاصرین کی طرز سے ہٹ کر تنقیدی جائزوں کی اپنی ڈگر تلاش کرلی ہے۔ موضوع پر گرفت رکھتی ہیں، اس کی زبان و بیان پر نظر رکھتی ہیں اور اپنی رائے قائم کرتی ہیں۔''

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا بھی رضوانہ پروین کے تنقیدی مراحل کی طرف سفر سے خوش ہیں، لکھتی ہیں:

''رضوانہ کا رجحان تنقید کی طرف ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''شعاع نقد'' کے مسودے کے چند باب پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں موصوفہ نے موجودہ دور کے کئی اہم ناولوں اور افسانوی مجموعوں پر بھرپور انداز میں تاثراتی و تجزیاتی مضامین لکھے ہیں۔ اگر اسی طرح رضوانہ نے مشق سخن جاری رکھی تو ہمیں مستقبل میں ان سے روشن توقعات ہیں کہ وہ خواتین نقادوں میں اپنا نام درج کروالیں گی۔''

رضوانہ پروین نوعمر ہیں، مگر انھوں نے پرانی لکیروں کو پیٹنا اور دوسروں کے پھیکے ہوئے نوالے کو حلق میں اتارنا، اپنا شیوہ نہیں بنایا ہے، وہ قدیم فن پاروں کا جائزہ لینے اور اس پر پر رٹا رٹایا جملہ دہرانے کے بجائے، نئی اور تازہ ترین فکشن نگارشات پر تنقیدی تجزیہ تحریر کرتی ہیں، جو ان کی جدت پسندی اور تخلیقیت دوستی کا مظہر ہے۔ ابھی ان کو تنقید اور تحقیق کا لمبا سفر طے کرنا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ سفر کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے عزائم میں استحکام اور قدموں میں پختگی آ ہی جاتی ہے۔ امید ہے کہ ان کی سابقہ تنقیدی کتابوں کی طرح اس تنقیدی مجموعۂ مضامین کا بھی انبساط کے ساتھ حلقۂ ناقدین میں استقبال کیا جائے گا۔ تا کہ 'آدھی دنیا' خواتین تنقید نگاروں کی دنیا میں جو مہیب اور خوف ناک خلا نظر آتا ہے، اس کی کچھ حد تک تلافی ہو سکے۔ اور رضوانہ پروین نسائی تنقیدی سرمایے کا اہم دست خط بن کر فکشن تخلیقات کو تنقید کے مراحل سے گزارتی رہیں۔

....

نام کتاب: محیط (غزلیں) شاعر: جمال اویسی ص: ۱۸۴ قیمت: ۵۶۰/روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، سن اشاعت: ۲۰۲۰ء تبصرہ: ابرار احمد اجراوی

جمال اویسی اردو شاعری کا خاصا متعارف نام ہے۔ انھیں بیش تر شعری اصناف میں اظہار خیال پر قدرت حاصل ہے۔ وہ نظم کے ساتھ غزل کے مقبول عام پیکر میں بھی اپنی تخلیقات پیش کرتے رہتے ہیں۔ تازہ شعری مجموعہ 'محیط' (پانچواں مجموعۂ غزل) بھی صرف غزلوں پر مبنی ہے۔ یہ ظاہری قد و قامت کے اعتبار سے مختصر تو ہے، مگر 'بقامت کہتر بقیمت بہتر' کا مصداق ہے۔ کل ۱۳۳ غزلوں کا معیاری انتخاب مجموعہ کی زینت بنا ہے، یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ابتدا میں گریز کے عنوان سے شاعر نے اپنے مسلک غزل اور مشرب شاعری کو تحریر کا پیرہن عطا کیا

ہے، جو عالمانہ لمس کا حامل ہے۔ انھوں نے غزلیہ شاعری میں فکر و نظر کی سطح پر عہد بعہد رونما ہونے والی معنوی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے غالب کو پہلا نظریہ پرداز شاعر ثابت کیا گیا ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے بھی ہے اور اسی جلو میں اپنے شاعرانہ افکار کا اظہار بھی۔ پھر انھوں نے اردو غزل کا استعارۂ اعظم حضرت انسان کو قرار دیا ہے، جو غالب و اقبال کا فکری پرتو ہے۔ دلیل میں غالب و اقبال کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''غزل کا سب سے بڑا استعارہ انسان ہے اور یہ غالب کی شاعری میں ہر رنگ میں وا ہوا ہے۔ اس لیے میری نگاہ میں اردو غزل کا پہلا عظیم شاعر غالب ہے اور دوسرا اقبال۔ اقبال نے غالب کی نظر کو مزید کشادہ کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے مرزا غالب اردو غزل کے پہلے نظریاتی شاعر ہیں۔ اقبال نے آکر غزل کو ایک چست اور مضبوط قبا پہنا دی۔ چناں چہ غزل محض احساسات و جذبات کی ترجمان ہونے سے بچ گئی اور عالمی سطح کی بڑی شاعری کا پہلا شناخت نامہ بن سکی۔''

انسان عظیم ترین ہی نہیں، اشرف المخلوقات اور افضل الموجودات بھی ہے، اس کی حقیقت و ماہیت، اس کے درون و بیرون کا سراغ لگانا ممکن نہیں، وہ پرت در پرت چھپی ایسی تکوینی حقیقت کا ممزوجہ ہے، جس کی گرہ کشائی میں تخلیق کاروں کا انبوہ مصروف و مشغول ہے، مگر انسان تو بحر اوقیانوس ہے، اس کی تہوں کو انگشتِ دست سے چھونا، اس کی گتھی کو سلجھانا، اسی کے مماثل انسان کے بس کی بات نہیں۔ میر و سودا، فانی و اکبر، ذوق و غالب، اقبال و فیض..... سبھی نے حضرت انسان و متعلقات انسان کو تخلیق کی مرکزیت و مرجعیت کے منصب پر فائز کیا ہے، یہ اردو شاعری کی موروثی روایت ہے، عہد حاضر کے شاعر جمال اویسی بھی اعلیٰ ترین مخلوق یعنی انسان کو ہی اپنا موضوع شاعری منتخب کریں، تو اس میں تحیر و تعجب کا کون سا عنصر ہے؟ انسان کی ذات، اس کے شب و روز، اس کے دکھ درد، اس کی آزادی و پابندی، اس کی تنہائی و انحصار نفسی، ناکامی و نامرادی، یاسیت و قنوطیت، ذہنی و قلبی ناآسودگی سے اویسی بھی غزل کے جام جہاں نما میں ہم کلام ہوتے ہیں، مگر سوال وہی ہے کہ کیا اس نوع بشری کی حقیقتوں کا ادراک اور اس کا انکشاف غزل کے پیمانے میں ممکن ہے؟ دیکھیے مجموعۂ ہذا سے چند اشعار، جس کا محور و مرکز تو وہی بارہ چہروں والا انسان عظیم ہے، مگر آہنگ اور اسلوب عصری حسیت کا عکاس ہے۔ شاعر نے اپنی فکری پرواز انجانی فضاؤں میں جاری رکھنے کی کوشش کی ہے۔

چلتا ہی جاؤں اپنی صدا کا گجر لئے — رستے پہ میرے کوئی دیا کوئی گھر نہ ہو

دریا کئی یگوں سے بہتا ہے میرے اندر — کیا بات ہے کہ اس کا طغیان کھو گیا ہے

سنتا ہوں ایک نغمۂ جاں سوز کچھ پرے — روتا ہوں میں امانتِ پروردگار ہوں

ان اشعار میں شاعر نے خود کلامی و خود شناسی کی رو میں انسان کی ازلی اور ابدی حقیقتوں کا راز جاننے کی کوشش کی ہے۔ انسان بظاہر ایک متناہی شی ہے، مگر جب اس کی پہنائیوں اور گہرائیوں کو ناپنے کا مرحلہ آتا ہے تو یہ کارِ آساں مشکل تر ہو جاتا ہے کہ ایک محدود حقیقت لامحدود خلاؤں کا سفر کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔ اور یہ مندرجہ ذیل شعر تو انسانی کی نارسائیوں کا عمدہ تخلیقی اظہار ہے، یہی اس حقیقت کا بیان بھی ہے کہ انسان ایسی تخلیق

ہے، جو اپنی تکمیلیت و ہمہ گیری کے دعووں کے باوجود ایک نامکمل اور ناقص وجود ہے، جس کی تکمیل کا راز سر بستہ اس دنیا کے خزینوں سے دریافت کرنا محال ہے۔

راسخ نہ ہو سکا جو ابھی تک، وہ نقش ہوں
شرمندہ ہونے سے جو رہا، خواب ہے مرا

ہر شاعر کسی کا مقلد اور پیرو ہوتا ہے۔ یہ تقلیدی دائرہ فکری اور نظری دائروں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ پیروی پیش رواں جہان علم و دانش میں معیوب شیوہ بھی نہیں، مجموعہ کے خالق جمال اویسی کو پیش رووں کی انگشت گیری کا دعویٰ تو ہے، مگر وہ ان تجربوں کو ذرا بانداز دیگر پیش کرنے کے عادی ہیں اور اپنا منبع و مرکز کسی اور جہان شاعری کو قرار دیتے ہیں۔ تجربات عہد خاص اور زمان مخصوص کے زائیدہ ہوتے ہیں، ماقبل اور مابعد کے تجربوں میں اشتراک کے عناصر تلاش کرنا بے فائدہ عمل ہے۔ انسان تو ایک کلی ہے، مگر اس کی بشری جبلتوں، دنیاوی تقاضوں اور اس کے آمال و آلام کی بے پناہی نے اس کو کئی حصوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔

شاعر پر سابقین اولین سے انحراف و انفرادی فکر حاوی ہے۔ ان کے یہ جملے بہت کچھ بیان کرتے ہیں:

''میں نے غالب اور اقبال کے فکری رویوں کو اپنے تجربات کی روشنی میں Subvert کرنے کی جرأت کی ہے۔ اقبال نے جو علاج تجویز کیا ہے اس سے قطعی انکار نہیں، لیکن میں نے غزل میں انسان کی پستی اور ناکامی کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو کوشش کی ہے، اس میں کہیں کہیں نطشے کی آواز بھی شامل ہے۔ کہیں کافکا، کہیں سارتر، کہیں آئنسٹائن، کہیں حضرت عمرؓ اور کہیں گوتم بدھ کی آوازیں شامل ہیں۔ یا یوں کہیں ان آوازوں کے زیر و بم اور ان کے امتزاج سے میں نے ایک قدرے اجنبی آواز بنائی ہے۔''

زیر نظر مجموعہ کے شاعر نے سابقہ آوازوں کو بانداز دیگر دہرانے، اس کو نئے قلب و قالب میں پیش کرنے، یا خالی خانوں میں رنگ بھرنے کی جو بات کہی ہے، وہ اس شعر کے مفہوم سے ثبوت و ظہور کے دائرے میں آجاتی ہے، اس شعر میں ہمیں اکیسویں صدی کے 'اقبال' کا چہرا آئینہ ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ:

کچھ خواب کچھ امنگیں ہیں پوٹلی میں میرے
تاروں بھرے جہاں سے آگے ہے پاؤں دھرنا

اور اس شعر کا پراز شوخ روپ تو فکر اقبال کا پرتو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

نفوذ کرتی ہیں مجھ پہ ہی تیری سازشیں
میں تیری قدرت کا اک عجب انتقام ہوں

جمال اویسی نظموں کے شاعر کے طور پر دنیائے ادب میں شہرت رکھتے ہیں اور ان کی طویل نظموں کو نقادان ادب نے خراج تحسین پیش کیا ہے، مگر غزلوں میں بھی ان کا فنی جوہر کھلتا ہے، وہ غزلیہ کائنات میں بھی اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں میں طاق ہیں۔ یہ انفرادیت ایک عرصہ کے ریاض کے بعد ہم دست ہوتی ہے۔ کنج تنہائی میں

بیٹھ کر شعر شعر جینا ہی ان کا وظیفۂ حیات ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ غزل اور نظم ہی کیا، اصناف کے معاملے میں ان کا کوئی شعری خانہ خالی نہیں ہے اور اپنے اس شعر کی تصویر ہیں کہ

مجموعۂ غزل ہے رباعی ہے نظم ہے
جس طاق کو بھی دیکھیے شاداب ہے مرا

'محیط' کی بیش تر غزلیں اپنی جدید لفظیات اور معنوی سیاق کے سبب ہمیں متاثر کرتی ہیں اور نئے الفاظ، جدید تراکیب، معنی خیز استعارے اور تشبیہات سے ہمیں روبرو کراتی ہیں، شعری دنیا اور شناسانِ اویسی سے امید ہے کہ وہ اس مجموعہ کی بھی کماحقہ پذیرائی کریں گے اور ان کی غزلیہ شاعری کو نئے آفاق و آثار اور نئے نظریات سے ہم آغوش کرائیں گے کہ ان کی شاعری کی چیخ اب تک دبی دبی اور خاموش ہے، جس کو بلند آہنگ نعرہ میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

....

کتاب: شمس الرحمٰن فاروقی بنام نذیر فتح پوری مرتب: نذیر فتح پوری ص: ۴۸ قیمت: ۵۰/روپے اشاعت: ۲۰۲۰ء
رابطہ: اسباق پبلی کیشنز، سائرہ منزل 230/B/102، لوہگاؤں روڈ، پونے-32 مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

زیرِ تبصرہ کتاب نذیر فتح پوری کے نام شمس الرحمٰن فاروقی کے کل ۲۷/خطوط کا مجموعہ ہے جو ۳۱/برسوں کے دوران لکھے گئے۔ پہلا خط ۴/جون ۱۹۹۲ء کا ہے جب کہ آخری خط ۲۵/اپریل ۲۰۱۳ء کا ہے۔ یہ کتاب اور اس میں شامل مکاتیب مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان کبھی خوش گوار اور کبھی کڑوے مراسم کے گواہ ہیں۔ مرتب نے جہاں فاروقی صاحب کے ادبی مرتبے کا برجستہ اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنی علمیت دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش نہیں کی وہیں ان کی چند بشری کمزوریوں کا تذکرہ بھی برملا کیا ہے مثلاً فاروقی صاحب کے ذریعہ پونا میں اپنی کتاب ''شعرائے پونا: ایک تحقیق'' کے اجرا کے بعد اظہارِ خیال کے دوران فاروقی صاحب کے کتاب اور صاحبِ کتاب کو نظر انداز کر کے شہر پونا کے واقعات پیش کرنے کا ذکر افسوس ناک لہجے میں ہوا ہے۔ اسی طرح جہاں نارنگ-فاروقی ادبی معرکہ آرائی کا ذکر بھی نذیر فتح پوری نے اپنی تحریر ''گفتِ باہمی'' میں کیا ہے، وہیں فاروقی صاحب اور اپنے درمیان رشتوں میں در آئی تلخی کو بھی بیان کیا ہے جو ان کی ادبی دیانت داری کا ثبوت ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ مرتب نے زیادہ تر ان خطوط کو ہی شاملِ کتاب کیا ہے جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان خوش گوار مراسم کو ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان خطوط کی اشاعت کے متعلق مرتب نے لکھا ہے :

> ''محترم پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے گراں قدر خطوط اچھے دنوں کی سوغات ہیں۔ برسوں سے میں نے یہ خزانہ سنبھال کر رکھا۔ ان خطوط کی اشاعت اس لیے عمل میں آ رہی ہے کہ میں اپنی خوشی میں احباب کو شامل کر سکوں۔'' (ص: ۴)

کتاب میں شامل بیشتر مکاتیب رسیدی نوعیت کے ہیں اور سرسری طور پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں فاروقی صاحب کی ناسازیٔ طبیعت، ہاتھوں کی شدید تکلیف اور فرصت کے فقدان کا اکثر ذکر ملتا ہے۔ رسیدی خطوط میں مکتوب الیہ کی کتابوں اور ''اسباق'' کے عام شماروں اور خاص نمبروں کی وصولی کا بیان ہے۔ چار پانچ خطوط میں کچھ اہم ادبی نکات

پر مکتوب نگار کا قلم چلا ہے مثلاً ۱۳؍ جون ۲۰۰۱ء کے خط میں میر کے دواوین کی اشاعت کے متعلق فاروقی لکھتے ہیں:

''......میر کے دیوانِ اول کا قدیم ترین نسخہ جو ۱۷۸۸ء کا لکھا ہے، محمود آباد کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اکبر حیدری نے اسے مرتب اور مدون کر کے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ میر کے دیوانِ اول کا صرف ایک نسخہ ایسا ہے جس میں ان کے مرثیے بھی ہیں۔ یہ مرثیے ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر مسیح الزماں نے کتابی شکل میں شائع کر دیے تھے۔ میرے اطلاع وعلم کے میر کا دیوان دوم الگ سے کبھی شائع نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اگر آپ یہ دیوان شائع کر رہے ہیں تو بڑی اچھی بات ہے۔''

کتاب میں شامل تین خط ایسے بھی ہیں جو فاروقی صاحب کی بجائے ان کے معاونین نے ان کی جانب سے لکھے ہیں۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ معیاری ہیں تاہم کمپوزنگ کی جا بجا غلطیاں گراں گزرتی ہیں مثلاً کتاب میں ڈاکٹر (ڈاک ٹ ر) کو ہر جگہ ڈاکڑ (ڈاک ڑ) لکھا گیا ہے۔

....

کتاب: موج شاکری: حیات اور شاعری مصنف: ڈاکٹر ابوبکر جیلانی ص: ۳۲۸ قیمت: ۴۰۰؍ روپے
اشاعت: ۲۰۱۹ء رابطہ: 16/A/1 لنٹن اسٹریٹ، تیسری منزل، کولکاتا-۱۴ مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

موج شاکری جانشینِ وحشت شاکر کلکتوی کے تلامذہ میں شامل چند اہم اور زود گو شعرا میں سے ایک تھے۔ پیشہ سے بیڑی مزدور موج شاکری مالی طور پر زندگی بھر نا آسودہ رہے تاہم انھوں نے اس نا آسودگی کو اپنی شاعری میں زیادہ اثر انداز ہونے نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ اردو شعر وادب کی خدمت کرتے ہوئے ۲۰۰۵ء میں اپنے آبائی وطن موضع امام گنج، ضلع گیا، بہار میں ہو گیا۔ انھوں نے زندگی کا طویل عرصہ شہر کولکاتا کے محلہ پٹوار بگان میں بیڑیاں بناتے گذارا۔ ان کے انتقال کے ۱۴؍ سال بعد یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ اس غیر معمولی تاخیر کے متعلق مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں واضح کیا ہے کہ موج شاکری نے اپنی حیات میں ہی کئی مرتبہ ان سے مجموعہ کی اشاعت کی خواہش کا اظہار کیا تھا تاہم کلام کی ترتیب میں شاعر کی جانب سے تساہلی اور ناسازیِ طبیعت اس خواہش کی تکمیل میں بڑی رکاوٹیں بنی رہیں یہاں تک کہ موج صاحب راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ اس کے بعد موج مرحوم کے چند احباب کے بارہا اصرار پر مصنف نے اس کتاب کی اشاعت کا تہیہ کیا اور بالآخر برسوں کی محنت کے بعد کلامِ موج شاکری مع تجزیہ زیرِ تبصرہ کتاب کی صورت میں پیشِ نظر ہے۔ کتاب کو پانچ ابواب ''عہدِ موج''، ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، ''حیاتِ موج (الف ''امام گنج''، ''سوانح حیات'')''، ''شعر و سخن کی ابتدا (غزلیں، قطعات، حمد و نعت، منقبت، سلام، سہرا)''، ''موج شاکری دیگر کتابوں میں'' اور ''خیالِ موج (مجموعۂ کلام)'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کتاب کا بڑا حصہ یعنی کلامِ موج شاکری ''خیالِ موج'' کے عنوان سے صفحہ ۱۰۰ تا ۳۲۴؍ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۲۶۸؍ غزلیں، ۲۴؍ قطعات بشمول قطعاتِ تاریخِ وفات، ۸؍ نعتیں (حالاں کہ آغازِ کلام میں عنوان ''حمد و نعت'' تحریر ہے لیکن کلام میں ایک بھی حمد شامل نہیں ہے۔)، ۲؍ منقبتیں حضرت علیؓ کی شان میں، ۳؍ سلام حضرت حسینؓ اور دیگر اہلِ بیت اطہار کے نام اور ۲؍ سہرے شامل ہیں۔ جیسا کہ اعداد و شمار سے واضح ہے کلام میں غزلوں کی اکثریت

ہے۔ڈاکٹر ابوبکر جیلانی نے ان غزلوں کا موضوعاتی مطالعہ تفصیلی طور پر کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ موج بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ان کی غزلوں میں جہاں ملک کے مختلف خطوں میں پھیلی لاقانونیت، تعصب، تنگ نظری، انتشار، افراتفری، فسادات کی ہولناکیوں کو موضوعِ اشعار بنایا گیا ہے وہیں اس کے برعکس قسمت کی ستم ظریفی اور حالات کی سنگینی سے نبردآزمائی اور مضبوط قوتِ ارادی کا بھی بیان جابجا ہوا ہے۔دو اشعار ملاحظہ ہوں:

باغباں کی سازش تھی ورنہ اے چمن والو　　میرا ہی نشیمن کیوں برق سے جلا ہوتا
اس خرابے میں کوئی گھر نہیں رہتا آباد　　پڑھیے لکھا ہوا گرتی ہوئی دیواروں پر

غزلوں میں خالص روایتی طرز کے رومانی اشعار کی بھی کثرت ہے۔پہلی غزل کا مطلع اور ایک شعر دیکھیں:

ہر دم بندھا ہوا ہے تصور جمال کا　　پاتے ہیں ہجر میں بھی مزہ ہم وصال کا
نقاب اُٹھیں وہ اپنے پہلے پھر دعویٰ کریں ایسا　　کسے تابِ نظر ہے، حسنِ جاناں کون دیکھے گا

کاغذ معیاری ہے، طباعت اور کمپوزنگ اوسط درجے کی ہے، سرورق یک رنگی اور غیر جاذبِ نظر ہے۔

....

کتاب: باغِ صنوبر (دیوانِ رباعیات)　شاعر: ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی　ص: ۲۸۰　قیمت: ۲۸۰/روپے
اشاعت: ۲۰۱۹ء　رابطہ: اثبات ونفی پبلی کیشنز، ۵/۸۹، رپن اسٹریٹ، کولکاتا-۱۶　مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

اردو کی مشہور و مقبول اصنافِ سخن میں سے ایک رباعی بھی ہے۔اردو کے ابتدائی زمانے سے اس کے شعری خزانے میں رباعیات بھی اضافہ کرتی آ رہی ہیں۔متقدمین و متوسطین شعرائے اردو کی طرح جن معاصرین شعراء نے اس مشکل مگر متاثر کن صنفِ سخن میں طبع آزمائی سے گریز نہیں کیا، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کا بھی ہے۔وہ برسوں سے رباعی کہہ رہے ہیں اور مختلف اہم علمی، ادبی اور سماجی شخصیات کے فن اور کارناموں پر مبنی ان کی رباعیات شہر کولکاتا کے مختلف روزناموں کے ادبی کالموں کی زینت بنتی رہتی ہیں۔تاہم وہ دیگر موضوعات پر بھی کثرت سے رباعیاں کہنے کی قدرت رکھتے ہیں جس کا بین ثبوت ان کی رباعیات کا دیوان ''باغِ صنوبر'' ہے۔ اس دیوان میں مختلف موضوعات پر کل 504 رباعیاں بلحاظِ ابجدی ترتیب شامل ہیں اور جہاں تک ''باغِ صنوبر'' میں شامل رباعیوں کے موضوعات کا سوال ہے، ان میں موجود تنوع یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ شاعر کا مطالعۂ حیات اور مشاہدۂ کائنات بے حد وسیع ہے۔حمد، نعت، مسلم معاشرے میں موجود مسلکی اختلافات پر رنج و افسوس کا اظہار، بے ثباتیِ حیات، پند و نصیحت، حکمرانِ وقت کے فرعونی اعلانات اور ان سے متاثر عام آدمی کی پریشانیاں، دلوں پر ثبت محبت کے روشن نقوش، محبوب کا سراپا، ہجر و وصال کی کیفیت، رباعی گوئی کی اہمیت، شاعر کے نزدیک رباعی کی اہمیت، رباعی کا غزل سے موازنہ، طنز و مزاح اور عصرِ حاضر کی ہائی ٹیک محبت، معاشرے کے تلخ مسائل وغیرہ اس دیوان میں شامل رباعیوں کے اہم موضوعات ہیں۔تین رباعیاں نموتاً ملاحظہ کریں:

ہر ذرّہ پڑھا کرتا ہے کلمہ تیرا　　ہاں! وجہِ ہدایت ہے صحیفہ تیرا
تسبیح ترے نام کی پڑھتا ہی رہوں　　ہر لمحہ زباں پر ہو وظیفہ تیرا　(حمدیہ رباعی)

فخرِ انساں ، نازشِ آدم ہیں آپؐ محبوبِ خدا ، نورِ مجسم ہیں آپؐ
ہیں ارض و سما آپؐ کے دم سے روشن ہے رب کی عطا، رحمتِ عالم ہیں آپؐ (نعتیہ رباعی)

کرتا ہے کسی کو کہاں آباد گھمنڈ ہوتا ہے سدا نذرِ افتاد گھمنڈ
ہوتا ہے تکبر کا انجام برا انسان کو کر دیتا ہے برباد گھمنڈ (بے ثباتیِ حیات)

مذکورہ بالا رباعیوں سے شاعر کی فنِ رباعی پر گرفت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ عاصم شہنواز شبلی کا مطالعہ وسیع ہے جس کی بنیاد پر وہ رباعیوں کے موضوعات کے ساتھ مناسب انصاف کرتے ہیں۔

''باغِ صنوبر'' میں دیگر مختلف موضوع پر بھی درجنوں رباعیاں شامل ہیں، جن کا بخوفِ طوالت یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ دیوانِ رباعیات صنفِ رباعی میں شاعر کی قادرالکلامی کا بین ثبوت ہے۔ امید قوی ہے کہ موصوف کی شخصی رباعیوں کا مجموعہ بھی عنقریب قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔

کتاب عمدہ اور دبیز کاغذ پر شائع کی گئی ہے اور صوری و معنوی اعتبار سے دیدہ زیب ہے۔ کمپوزنگ اور طباعت کا بھی عمدہ نمونہ اس کتاب میں ملتا ہے۔

....

کتاب: گلہائے آرزو مرتب: امان ذخیروی ص: ۸۰ قیمت: ۲۰۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۹ء
رابطہ: ندیم پبلی کیشنز، پتھر کی مسجد، پٹنہ مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

نکاح انسان کی فطری ضرورت ہے اور نسلِ انسانی میں اضافہ کرنے کا شرعی اور قانونی جواز بھی۔ اسلامی تعلیمات کے منابع یعنی قرآن اور حدیث میں نکاح کی ترغیب متعدد مقامات پر ملتی ہے۔ نکاح کی تقریب کو تقدس اور سعادت مندی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ نکاح صرف دو افراد کی باہمی وابستگی نہیں بلکہ ان کے دیگر افرادِ خانہ کو بھی جوڑتا ہے۔ یوں تو اسلام میں شادی کی بنیادی شرائط صرف ولی اور گواہوں کی موجودگی میں نکاح خواں کے ذریعہ ناکح اور منکوحہ کی موجودگی میں نکاح کے لیے مقررہ کلمات کا پڑھنا اور ایجاب و قبول ہی ہے تاہم نکاح جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں دو دلوں کو جوڑنے کا ایک نہایت خوش گوار بندھن ہے، اس لیے اہلِ خانہ اس موقع پر خوشی کا اظہار کئی طریقوں سے کرتے ہیں جن میں بہترین مشروبات و ماکولات کا اہتمام سے لے کر مسرت کے نغمے گانا بھی شامل ہیں۔ ان ہی نغماتِ مسرت میں دولہے کے لیے سہرا اور دلہن کے لیے رخصتی یا دیگر تہنیتی نظمیں بھی شامل ہیں۔

شادیوں کے موقع پر سہرا نویسی کی روایت اردو شاعری میں بہت قدیم ہے لیکن اس کے شانہ بشانہ رخصتی لکھنے کا سلسلہ بھی عرصہ سے جاری ہے۔ طباعت و اشاعت کی آسانی کے بعد سہروں، رخصتیوں اور تہنیتی نظموں کے باقاعدہ کتابچے یا گلدستے شائع ہونے لگے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ''گلہائے آرزو'' بھی رخصتی ناموں اور تہنیتی نظموں کا ایک حسین گلدستہ ہے جسے مرتب نے اپنی دخترِ نیک اختر عزیزہ زاہدہ مسکان سلمہا کے عقدِ سعید کے موقع پر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس گلدستے میں امان ذخیروی کے ''عرضِ مرتب'' اور مشتاق احمد نوری کے ''اظہارِ مسرت'' جیسی نثری تحریروں کے علاوہ کل ۳۸ رخصتی نامے یا تہنیتی نظمیں شامل ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان ۳۸ نظموں

کے شعرا کا تعلق ملک کی مختلف ریاستوں سے ہے جو امان ذخیروی صاحب کی خوشی میں شامل ہیں۔ چند اشعار ان رخصتی ناموں سے ملاحظہ فرمائیں جن میں دعا، نصیحت، بیٹی کے جانے کا غم اور اس کا گھر بسنے کی خوشی جیسے ملے جلے جذبات موجود ہیں:

اپنے شوہر کی رضا رکھنا متاعِ داماں	زندگی اس سے بنے گی تری صد رشکِ جناں	عبدالمنان طرزی
غم جدائی کا سبھوں کو ہے بہت اے مسکان	نہ رلا خود کو کہ ہے وقتِ سفر جا بیٹی	عطا عابدی
یہ فضلِ خدا یہ کرشمہ ہوا ہے	جو مہندی ہنسی ہے، جو سہرا کھلا ہے	فراغ روہوی
چلی ہے لاڈلی بیٹی مقدس جسم پر لے کر	حیا کی اوڑھنی، عزت کا جامہ، صبر کا زیور	شمیم انجم وارثی
کس طرح روک لوں جانے سے اے گلدان سنو	مری بچی، مری گڑیا، مری مسکان سنو	انجنی کمار سمن
نمی آنکھوں میں ہے لیکن تبسم زیرِ لب رقصاں	بزرگوں کی دعا تقلیدِ سنت بن کے آئی ہے	امام اعظم
کسی کو تجھ سے نہ تکلیف کوئی پہنچے گی	تو زاہدہ ہے روش تیری زاہدہ جیسی	مناظر عاشق ہرگانوی

بہر حال یہ کتابچہ ایک باپ کا اپنی بیٹی کے لیے اس کی شادی کے موقع پر ایک حسین تحفہ ہے جسے دلہن ہمیشہ اپنے دل میں بسا کر رکھے گی۔ کتابچہ کا کاغذ اور طباعت عمدہ ہیں لیکن کمپوزنگ کی کہیں کہیں غلطیاں در آئی ہیں۔

....

کتاب: ہر روز روزِ عید　مصنف: احتشام الحق　ص: ۲۴۸　قیمت: ۲۵۰ روپے　اشاعت: ۲۰۲۰ء
رابطہ: مرکز فروغِ علم ودانش، دیورابندھولی، دربھنگہ-۸۴۷۳۰۳　مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

گریگورین کیلنڈر جسے عرفِ عام میں انگلش کیلنڈر بھی کہا جاتا ہے، میں کل ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ اس کیلنڈر میں شمسی تاریخیں ہوتی ہیں اور یہ جغرافیائی اعتبار سے زمین کے اپنے محور پر کے سورج گرد ایک گردش مکمل کرنے پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کیلنڈر کی تاریخوں کے مطابق دنیا بھر میں قومی اور بین اقوامی سطح کی تحریکوں، دریافتوں، ایجادات اور شخصیات کے کارناموں کے حوالے سے مخصوص یوم منانے کا سلسلہ جاری ہے۔ ان میں بتدریج اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ بہت سے ایسے ایام ہیں جن کے منانے کا آغاز اکیسویں صدی میں ہی ہوا۔ ان ایام کے سالِ آغاز، وجہِ آغاز، ادارہ یا تنظیم (جس نے یوم منانے کا اعلان اور اہتمام کیا) اور دیگر تفصیلات پر مشتمل ایک بے حد معلوماتی کتاب پر یہ تبصرہ ہے۔ کتاب کے مصنف دربھنگہ، بہار سے تعلق رکھنے جواں سال قلم کار احتشام الحق ہیں جنھوں نے اس کتاب میں قومی اور بین اقوامی سطح کے کل ۱۶۳ ایام کی تفصیلات شامل کی ہیں۔ مصنف کی معلومات کے مطابق اس نوعیت کی اب تک کوئی کتاب اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی اور یہ درست بھی لگتا ہے کیوں کہ راقم الحروف کی نگاہ سے بھی اب تک اس طرح کی کوئی کتاب نہیں گذری۔ مصنف کی رائے اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں:

"کوئی چھ سات سال ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا بھر میں مختلف تحریکوں، دریافتوں، ایجادات اور شخصیات کے کارناموں سے جو ایام منائے جاتے ہیں، ان کے سلسلہ میں اردو میں مواد کی بے حد کمی ہے۔ حالاں کہ یہ راقم الحروف کی کوتاہ رسی اور علم کے ذخیرہ تک عدم رسائی تھی۔ بہر حال اس احساس

کے بعد راقم نے ایسے ایام کو اردو میں لانے کا ارادہ کرلیا۔..... میری معلومات کے مطابق اردو زبان میں کتابی شکل میں اس طرح کی کوئی چیز اب بھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ البتہ اب ڈیجیٹل مواد کی کمی نہیں ہے۔......"

مصنف نے اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں منائے جانے والے جن ایام کو شامل کیا ہے، ان میں کچھ ایام اقوامِ عالم کے لیے باعثِ افتخار ہیں تو کچھ ایام کسی بڑے انسانیت سوز سانحہ یا کسی عظیم غم کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔ کچھ ایام مصائب و آلام میں مبتلا افراد میں زندگی کی رمق پھونکنے کے لیے منائے جاتے ہیں تو کچھ ایام کسی بڑے خطرے سے آگاہ اور چوکنا رہنے کے لیے منائے جاتے ہیں نیز انسانوں کو لاحق بڑی بیماریوں کے متعلق بھی بہت سارے یوم منائے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان سے بچنے کی تمام کوششیں کرسکیں۔ ہندستان کا قومی یومِ افواج، یومِ آزادی، یوم ہیروشیما/ یومِ نیوکلیائی مخالفت، عالمی یومِ قہقہہ، عالمی یومِ مسرت، عالمی یومِ بیداری سونامی، عالمی یومِ تھلسیمیا، عالمی یومِ سرطان، عالمی یومِ ایڈز وغیرہ ان ایام میں شامل ہیں۔

کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے عام قارئین بالخصوص نوجوانوں اور طلبا کے لیے بے حد مفید ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات کے طلبا بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ کتاب کی طباعت اور استعمال کیا گیا کاغذ بہترین ہے۔ اس نوعیت کی کتاب کی اشاعت کے لیے فاضل مصنف کو دلی مبارک باد۔

....

کتاب: نقوشِ شبلی مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ص: ۳۲۰ قیمت: ۴۰۰ر روپے اشاعت: ۲۰۲۰ء
رابطہ: دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ-۲۷۶۰۰۱ (اترپردیش) مبصر: شاہد اقبال (کولکاتا)

انیسویں صدی میں مسلمانانِ ہند میں جو چند ممتاز ترین اور نابغہ ہستیاں وجود میں آئیں ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی تھے۔ وہ سرسیّد احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے ان نہایت قریبی رفقا میں سے تھے جنھوں نے اس تحریک کی ہر جد و جہد میں سرسیّد کا ساتھ دیا۔ علی گڑھ میں اورینٹل کالج کے قیام کے بعد وہ اس میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی و فارسی درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور یہ سلسلہ سرسیّد احمد خان کی حیات تک جاری رہا۔ علی گڑھ کالج کی ملازمت سے قبل، اس کے دوران اور ملازمت سے استعفیٰ کے بعد بھی شبلی کے قلم نے اسی ادب کی تخلیق کی جو علی گڑھ تحریک کی اصلاحات میں شامل تھا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے علامہ شبلی نعمانی کا دائرہ بے حد وسیع تھا جس میں قرآن و حدیث، کلام و عقائد، فقہ و فلسفہ، سیرت و سوانح، تاریخ و تذکرہ، تعلیم و تربیت، عربی اور فارسی شعر و ادب، سیاسیات، شاعری، املا اور صحت زبان جیسے موضوعات شامل تھے۔ تاہم اس نابغہ شخصیت پر سیّد سلیمان ندوی کے بعد اہلِ قلم حضرات نے مستقل توجہ نہیں دی۔ انفرادی مضامین و مقالات سامنے آتے رہے لیکن اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب کی عرصۂ دراز سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی جسے زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے پورا کیا۔ موصوف دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہیں جسے علامہ شبلی نے قائم کیا تھا۔ موصوف کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں رقم طراز ہیں :

''......علامہ شبلی کے دیگر مہتم بالشان کارناموں کا مطالعہ و جائزہ سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) کے بعد اہلِ علم کا مستقل موضوع نہ بن سکا، بلکہ علامہ شبلی جس قدر عالی رتبہ شخص تھے، اور ان کے کارناموں کا دائرہ جس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے، اس لحاظ سے ان کی فکر و نظر کی قدر و قیمت کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا۔ راقم الحروف نے اسی احساس کے تحت اپنی کم مائیگی کے باوجود شبلیات کے تشنۂ تحقیق و تصنیف پہلوؤں پر مطالعہ و تحقیق کا ایک سلسلہ قائم کیا، جس کے تحت نہ صرف متعدد کتابیں لکھیں بلکہ ہند و پاک کے موقر رسائل و جرائد میں علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین و مقالات بھی شائع کیے۔ پیشِ نظر کتاب ان ہی مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔''

اس کتاب میں فاضل مصنف نے کل ۱۸ر مقالات کے ذریعہ شبلی شناسی کی کامیاب کوشش کی جن میں ''علامہ شبلی کا بچپن اور تعلیم''، ''علامہ شبلی کا علمی، ادبی اور فکری سرمایہ''، ''علامہ شبلی اور غالب''، ''علامہ شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور اعظم گڑھ''، ''علامہ شبلی اور نواب محسن الملک''، ''علامہ اقبال شبلی کی انجمن میں''، ''علامہ شبلی اور عطیہ فیضی: چند حقائق''، ''علامہ شبلی: شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری کی نظر میں''، ''شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی تاریخ کا ایک ورق''، ''علامہ شبلی اور انجمن حمایت الاسلام لاہور''، ''علامہ شبلی اور کلکتہ''، ''تصانیفِ شبلی کے دو دہلوی ناشرین''، ''جہانِ شبلی''، ''علامہ شبلی سے متعلق سیّد یحیٰ احمد ہاشمی کے نام چند غیر مطبوعہ خطوط''، ''علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں''، ''علامہ شبلی کے نو دریافت خطوط''، ''علامہ شبلی کے متعلق دو مراسلے'' اور ''مطالعۂ شبلی کے چند زاویے'' شامل ہیں۔

کتاب نہایت عمدہ اور دبیز کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے۔ کمپوٹرائزڈ کتابت بھی سلیقے سے کی گئی ہے۔ امید قوی ہے کہ یہ کتاب مطالعاتِ شبلی میں اہم سنگِ میل ثابت ہوگی۔

....

نام کتاب: شالوم سلام (Shalom-Salam (An Interfaces in Israil & Palestine مصنف: انعم
اشاعت: 2020ء ص: 183 قیمت: 299 رابطہ: 'ہیر پیج' محلہ چک رحمت، بھیگو، دربھنگہ-4 مبصر: احتشام الحق، دربھنگہ

فلسطین اور اسرائیل اگر ان ملکوں کے ناموں سے علاحدہ ہو کر ایک خطہ ارض کی بات کی جائے تو بلاشبہ یہ انبیاء کی سرزمین رہی ہے۔ کئی اولوالعزم پیغمبروں کا اس سرزمین سے تعلق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تین بڑی قوموں؛ قدامت کے لحاظ سے یہودی، عیسائی اور مسلمان، کا اس سرزمین سے روحانی رشتہ رہا ہے۔ رشتوں کا یہی بے حد جذباتی لگاؤ شاید اسے متنازع بھی بناتا ہے۔ کئی صدیوں سے مختلف قومیں اس سرزمین پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے برسرِ پیکار رہی ہے ہیں۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے جس یلغار اور خونی تصادم کا سلسلہ شروع ہوا ہے وہ تا حال جاری ہے لیکن امن اور سکون جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے، انسان کا دل اس سے نہ کبھی خالی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ دنیا کے کسی خطہ ارض میں انسان کا خوں بہے ہر حساس اور زندہ انسان کے دل میں اس کی کسک اور ٹیس محسوس ہوتی ہے۔

انسانی جاں تلفی اور خوں ریزی کے سبب پیدا ہونے والے اس درد اور ٹیس کو انعم نے بھی محسوس کیا ہے۔ انعم

ای ایف ایل یونیورسٹی حیدرآباد میں پی ایچ ڈی اسکالر ہیں۔ انہوں نے ''اسرائیل اور فلسطین کے تنازع کے حل میں ادب کی اہمیت'' کو موضوع بناتے ہوئے اپنا ایک ریسرچ شروع کیا ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اسرائیلی حکومت کی جانب سے ملنے والی فیلوشپ پر تل ابیب یونیورسٹی اسرائیل کا رخ کیا اور ۱۹-۲۰۱۸ء کے درمیان وہاں آٹھ مہینے رہ کر انہوں نے دونوں ملکوں کی تہذیب و ثقافت اور تمدن، رسوم و روایات، طرز بود و باش، انداز فکر و نظر، تعلیم و تعلم کے طریقۂ کار وغیرہ سمیت وہاں کی زندگی کا بہت قریب اور گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ انہوں نے لوگوں سے ملاقات کی، ادبا و دانشوران کے خیالات سے روشناس ہوئیں۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے ادب کا بھی مطالعہ و تجزیہ کیا اور دونوں طرف کے ادب کے متون کے بین السطور میں امن و امان کی خواہش بھی محسوس کی اور اس کے اندر انہیں امید کی ایک کرن بھی نظر آئی۔

اس آٹھ ماہ کے سفر میں انہوں نے جو کچھ اخذ کیا وہ تو ان کے ریسرچ ورک کا حصہ ہوگا۔ لیکن ریسرچ اور ریسرچ سے الگ جو کچھ انہوں نے محسوس کیا اس کو بھی انہوں نے ضائع نہیں کیا بلکہ اس آٹھ ماہ کے سفر کے درمیان پیدا ہونے والے احساسات و تجربات کو بڑی محنت سے سفر نامہ کی شکل میں محفوظ کرلیا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ Salam-Shalom (Interfaces in Israil & Palestine) کے نام ۲۰۲۰ء کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ یہ سفر نامہ ہندوستان سے اسرائیل اور فلسطین اور پھر ہندوستان واپسی تک کے ان کے سفر کی ایک روداد ہے۔

سفر انسان پر ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کے درمیان کے تفاوت و یکسانیت کو تو عیاں کرتا ہی ہے یہ کتابِ فطرت کے مشاہدہ و مطالعے کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ اس کے ذریعہ انسانی فطرت کو بھی سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ سماج و معاشرہ کے درمیان جو فرق و مماثلت ہے وہ بھی دیکھنے اور سیکھنے کو ملتا ہے۔ گویا ایک ملک سے دوسرے ملک کے درمیان نظام زندگی میں جو فرق اور بوقلمونی ہے سفر کے ذریعہ انسان پر اس کا انکشاف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک باشعور شخص جب کسی ملک یا بڑے شہر کا سفر کرتا ہے تو وہ تمام خوبیاں اور خامیاں عادات و اطوار اس پر بڑی آسانی سے منکشف ہو جاتے ہیں جن کی طرف عام حالات میں اس کی توجہ نہیں جاتی ہے۔ یہ ساری چیزیں ایک اچھے سفر نامے کا حصہ بنتی ہیں اور پھر مصنف کو اگر اظہار پر قدرت حاصل ہے تو سفر نامہ قاری کے سامنے اس شہر/ ملک کے سارے مناظر کو آنکھوں سامنے پھیر دیتا ہے۔ جس ملک کے سفر کی روداد اس سفر نامہ میں شامل ہے۔

زیر نظر کتاب قاری کو اسرائیل اور فلسطین کی تہذیب و ثقافت سے روشناس ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم کے ترقی کے اسباب کیا ہوتے ہیں اور وہ کیا خوبیاں ہوتی ہیں جو کسی قوم کو تعداد کے لحاظ سے کم ہونے کے باوجود ترقی کی راہ پر ڈالتی ہیں۔ انہوں نے اس سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ دونوں طرف کی نئی نسل اپنے ملکوں کو کس طرح سے دیکھ رہی ہے۔ خود مصنفہ کا تعلق نئی نسل ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیل و فلسطین کو دوسرے ممالک کی نئی نسل کس طرح دیکھتی ہے۔ بعض جگہوں پر مصنفہ سے اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے تاہم مجموعی طور پر کتاب قابل مطالعہ ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ ارض فلسطین تین بڑی قوموں کی عقیدت و محبت کا منبع رہی ہے۔ مصنفہ نے غالباً اسی کے مدنظر زیر نظر کتاب کا انتساب

بھی ابوالانبیاء سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کیا ہے۔جن سے تینوں قومیں اپنا روحانی رشتہ جوڑتی ہیں۔

مصنفہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو انگریزی میں ہے۔امید کی جاتی ہے اہل علم کی نظروں میں اعتبار کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔صوری اعتبار سے بھی کتاب خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

....

۱۴؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو پروفیسر ایم نہال کی رہائش گاہ واقع دربھنگہ میں ان کی صاحب زادی اور اِفلو، حیدرآباد کی ریسرچ اسکالر انعم کی کتاب ''شالوم سلام'' کی رونمائی کرتے ہوئے ممتاز دفاعی سائنس داں پدم شری مانس بہاری ورما۔
ساتھ میں موجود ہیں پروفیسر ایم نہال، محترمہ انعم، ڈاکٹر مدیحہ اور محترمہ صبیحہ نسیم

۱۱؍جنوری ۲۰۲۰ء کو ڈاکٹر نوا امام (ڈینٹل، فیشیل اینڈ ایستھیٹک سرجن) کی کلینک واقع محلہ رحم خاں، نزد ملت کالج (دربھنگہ) کے باہر جناب شہیر امام، ڈاکٹر امام اعظم، اظہر داؤدی، ڈاکٹر نوا امام

راہ و رسم

ابواللیث جاوید، نئی دہلی: 'تمثیل نو' کا شمارہ جولائی ۲۰۱۸ء تا جولائی ۲۰۱۹ء نظر نواز ہوا۔ اپنی روایت کے عین مطابق شمارہ ہر اعتبار سے بہت خوب ہے۔ گوشۂ منظر شہاب کے ساتھ ساتھ جناب مظہر امام، جناب سید منظر امام اور جناب مناظر عاشق ہرگانوی صاحبان کے خصوصی مطالعے بھی اس شمارہ کو پُر وقار بناتے ہیں۔ یہ آپ کی نہایت مخلصانہ اور ادبی کوشش ہے کہ جن بڑے اور بلند پایہ فن کاروں کو زمانہ بہت جلد فراموش کر دینے کا عادی ہے، اُن شخصیات کے ادبی اعلیٰ درجہ کے کارناموں کو زمانہ کے سامنے آئینہ کرنے کی ہمت، حوصلہ اور جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان گوشوں میں خصوصیت کے ساتھ جناب منظر شہاب کا گوشہ نہایت کارآمد ہے کیونکہ ان کی بہت سی یادگار نگارشات منظر عام پر نہیں بھی آئیں اور اگر آئیں بھی تو ایک ادب کے مخصوص حلقہ نے ہی اس کی نوٹس لی۔ ان نگارشات کی اہمیت ادب میں اضافہ کی حیثیت کے طور پر ہے۔ اُسی طرح جناب مظہر امام نے جن اصناف ادب پر طبع آزمائی کی اور ادب کو بے شمار سرمایہ عطا کیا اُسے مشکل سے ہی لوگوں نے ہضم کیا۔ اُن کے ساتھ بھی امتیازی سلوک کے بجائے ایک عمومی رویہ اپنایا گیا۔ یہ ہماری ادبی دنیا کا بہت بڑا المیہ ہے۔ جناب سید منظر امام کی کاوشوں کو وہ درجہ نہیں دیا گیا جن کے وہ مستحق اور اہل تھے۔ یہ ہر زمانہ کی ادبی منافرت رہی ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا معاملہ بھی بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ چونکہ انہوں نے ہندوستان کے ہر ادبی علاقہ میں اپنی نگارشات سے گہری چھاپ چھوڑی ہے اس لئے انہیں چاہتے ہوئے بھی لوگ نظر انداز نہیں کر پاتے۔ ہاں، ادب کا ایک مخصوص طبقہ ان کی ہر حال میں مخالفت کرتا نظر آتا ہے جس کی میرے خیال سے کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ اب کی بھی مضامین کا حصہ کچھ زیادہ ہی دمدار معلوم ہوا۔ شعری حصہ پر شاید آپ زیادہ توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اس بار افسانہ تو برائے نام ہے۔ مجموعی طور پر رسالہ ادبی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔ دو غزلیں اور ایک ڈاکٹر تاج پیامی کا مضمون مفلوف ہے۔ اگلے شمارے میں شامل کرلیں گے۔

....

انجم عظیم آبادی، کولکاتا: ''تمثیلِ نو'' شمارہ جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۸ء (گوشۂ منظر شہاب) موصول ہوا تھا۔ اس شمارہ پر بھی آپ نے کافی محنت کی ہے، جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ تمام مشمولات اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کی مرتبہ کتاب بعنوان ''پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار'' زیر مطالعہ رہا۔ بھائی ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ''غالب ۱۸۵۷ء کے چشم دید گواہ'' اگر کتاب میں شامل نہ کیا گیا ہوتا تو ایک کمی کا احساس رہتا۔ وہ میری مبارک باد کے مستحق ہیں۔ پہلی جنگِ آزادی کے تعلق سے غالباً اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جسے سرکاری سطح پر خصوصی انعام سے نوازا جانا چاہیے۔ ہم تو آپ کے اختراعی ذہن کے پہلے ہی سے قائل ہیں۔ دعا ہے کہ آئندہ بھی اس کا ثبوت دیتے رہیں گے۔ کتاب کے متعلق ایک قطعہ حاضر ہے :

جاں نثاروں کی ہے شامل داستاں — اس میں معلومات کے روشن ہیں باب
ہے امام اعظم کی یہ کوشش بھی خوب — پہلی جنگ آزادی پر ان کی کتاب

....

احسان ثاقب، آسنسول: 'تمثیل نو' کا تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء) پیش نگاہ ہے۔ اطمینان اور سکون سے اس کی تخلیقات کو پڑھا اور سمجھا۔ ہمیشہ کی طرح اس میں اردو زبان کے کئی رنگ نظر آئے۔ ہر رنگ جاذب اور انوکھا ہے۔ سرورق دیکھ کر ہی منظر شہاب کی بلند پایہ شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ وقار اور وہ متانت جوان کی تصویر میں ہے۔ ان کے تعلق سے لکھے گئے تمام مضامین بطور ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اس تازہ شمارے کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اس کے خصوصی گوشہ میں مظہر امام، سیّد منظر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی کے نام نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ یہ قدر شناسی ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ۔ نہ ہوا کو ہی اور نہ خوشبو کو ہی بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ فن اور فن کار کا رشتہ اتنا عظیم اور اتنا گہرا ہوتا ہے، کم سے کم مجھ جیسے نافہم کو یہ بات آج سمجھ میں آئی۔ امام اعظم صاحب۔ آپ قابل مبارکباد ہیں۔ میں نے جو محسوس کیا وہ یہ کہ 'تمثیل نو' کا یہ شمارہ پچھلے تمام شماروں سے زیادہ پُر وقار اور باوزن ہے۔ اس رسالے کے توسط سے آپ نے گلزار ادب کو معطر کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ مشمولات کی فراہمی میں ممکن ہے تاخیر ہو جاتی ہو مگر آپ کے عزائم خوش گوار فکری علامت بن کر آتے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں نثری اور شعری حوالے سے کہیں بھی کوئی کم یابی نظر نہیں آتی ہے۔ ہر جگہ افکار و عمل کا معاملہ اعتبار اور اعتماد کی حد میں ہے۔ منظر شہاب کا یہ شعر آپ کی نذر کرتا ہوں:

نرم لہجہ بھی عجب آگ لگاتا ہے شہابؔ — آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے

....

خلیق الزماں نصرت، ممبئی: ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ ایک مکمل کتاب ہوتا ہے۔ اس کی کاپی کو پڑھنے کے بعد محفوظ کر لینا چاہئے تاکہ آنے والے کل میں یہ دستاویزی حیثیت کی حامل ہو جائے گی۔ ڈاکٹر امام اعظم اردو کے سپاہی کی حیثیت سے دربھنگہ سے اردو کو فروغ دے رہے ہیں۔ اردو ادب کے لئے وہ نئے نئے گوشے نکالتے رہتے ہیں، یہ ان کی عادت میں شامل ہے۔ ان کا اچھا خاصا جاب ہے۔ مولانا آزاد اردو نیشنل اردو یونیورسٹی کولکاتا کے ریجنل ڈائریکٹر ہیں۔ ایسا عہدہ خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے۔ اس کو سنبھالنے کے لئے تنظیمی صلاحیت کی ضرورت ہے اور یہ خوبی ان میں موجود ہے۔ ان کے ہم منصب ساتھیوں سے ان کی صلاحیتوں کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ اسی لئے تو میں اپنی تحریروں میں لکھتا رہتا ہوں کہ جو تہذیب اور طور طریقہ ہم اردو والوں کا ہوتا ہے وہ انگریزی جاننے والوں (یعنی ذریعہ تعلیم انگریزی) کا نہیں ہوتا۔ یہ ہمیں اردو ادب اور شاعری سے ملتا ہے جسے ہم اردو والے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے ہیں۔ جس طرح شاعری میں ہم ایک حرف بھی زائد یا کم تسلیم نہیں کرتے اسی طرح اپنے عہدے کے اصولوں کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار اردو والوں نے ابتدا سے اب تک بڑا نام کمایا ہے۔ تاریخ اردو کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی سے اب تک اردو شعراء اور ادباء نے صرف شاعری ہی نہیں کی ہے،

انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ بے شمار کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، پیش کار، تحصیل دار، آفیسر اور جج شاعر تھے۔ ایک شاعر نادر لکھنوی تھے۔ انہوں نے طنزاً کہا تھا:

لوگ کہتے ہیں فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

اور میں نے مذکورہ شعر کے ثانی مصرعے کو عنوان بنا کر ایک کتاب ترتیب دے دی ہے جو عنقریب شائع ہوگی۔

امام اعظم نے 'تمثیل نو' کے تازہ شمارے کو اسی طرح کے ایک عظیم منتظم اور ایڈمنسٹریٹر منظر شہاب مرحوم (سابق پرنسپل کریم سٹی کالج، جمشید پور) کے نام منسوب کیا ہے۔ میرے لئے باعث مسرت یہ ہے کہ میں نے بھی انہیں کے انڈر میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء تک تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے کریم سٹی کالج سے بی کام کیا تھا۔ یہ کالج میری مادرِ علمی ہے۔ استاذی منظر شہاب اردو، فارسی اور انگریزی پر مکمل عبور رکھتے تھے وہ ایک اچھے پُر گو شاعر اور نقاد بھی تھے نیز بحیثیت پرنسپل وہ ایک کامیاب آرگنائزر بھی تھے۔ چاہے جس کلاس میں ڈسپلن شکن، شور شرابہ ہو، وہاں اس افواہ کا پہنچا دینا ہی کافی ہوتا تھا کہ پرنسپل صاحب آرہے ہیں، کلاس میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ اچھے خاصے سرکش اور غنڈہ صفت طالب علم کو بھی اس کالج میں انسان بن کر رہنا پڑتا تھا۔ منظر شہاب سرکم گو تھے مگر ضرورت پڑنے پر اپنی سنجیدہ بارعب اور پروقار شخصیت اور زبردست قوتِ استدلال سے مدمقابل کو لاجواب اور مطمئن کر دیتے تھے۔ 'تمثیل نو' کے مطالعے کے دوران اس ضمن کی ڈھیر ساری باتیں ذہن میں آگئیں۔ خاص کر پروفیسر سید منظر امام اور امام اعظم کے مضامین پڑھتے پڑھتے وہ بہت یاد آئے۔ پرنسپل منظر شہاب پر سب سے اچھا کام ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین کا ہے۔ دوسرا کام امام اعظم نے کیا ہے۔ بیشتر مضمون نگاروں نے ان کے فن پر باتیں کی ہیں۔ چاہے وہ انور عظیم ہوں یا ابرار احمد اجراوی۔ زیادہ تر مضمون نگار نے استاذی منظر شہاب کو دیکھا ہے اس لئے بھی سچائی ابھر کر آگئی ہے۔ کسی نے مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ ہمارے بزرگ دوست پروفیسر سید منظر امام قابل شخص تھے انہوں نے اپنے نظریے کے مطابق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ صلاح الدین صاحب کوئی ناقد نہیں ہیں۔ انہوں نے جیسا بھی کام کیا ہے اپنی صلاحیت کے بھروسے پر کیا ہے۔ ہر معمولی فنکار جس ادبی ماحول میں پیدا ہوتا ہے اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی روایتیں اسے متاثر کرتی ہیں اور سب کو ایک جیسا ماحول نہیں ملتا ہے۔ منظر امام صاحب، منظر شہاب کی شاعری میں کچھ اور چاہتے تھے، جو ان کے مقالے میں نہیں ہے۔ اس پہلو سے بھی اب مضامین لکھے جائیں تو بہتر ہوگا۔ بحیثیت پرنسپل منظر شہاب کی شخصیت ادبی محفلوں کی متحرک اور متنوع رہی ہے۔ انہوں نے زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو دیکھا ہے، سوچا ہے اور پھر لکھا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ گوشہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

....

سلطان احمد ساحل، جمشید پور: 'تمثیل نو' کا تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء) بتوسط سیّد احمد شمیم نظر سے گزرا۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔ سب سے پہلے میں آپ لوگوں کو اس بات کے لیے مبارک باد پیش کرنا

اپنا اولین ادبی اور اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے منظر شہاب پر خصوصی گوشہ شائع کیا ہے۔ یہ ایک بڑا کام تھا جس کو آپ لوگوں نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنا ادبی فریضہ بھی بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔

منظر شہاب کی ترقی پسند شاعری میں رجائیت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کی شاعری میں امید و رجائیت کے نقوش جا بجا ملتے ہیں۔ چوں کہ وہ ایک دردمند اور حساس دل رکھتے تھے، اس لیے زندگی کے تاریک پہلو ان کی مایوسی اور ناامیدی کے ساتھ غم و غصے کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ منظر شہاب تہذیبِ فن کے شاعر تھے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لیے بھی شیریں بیانی کو ضروری سمجھتے تھے۔

گوشۂ منظر شہاب کے علاوہ دیگر گوشے بھی اپنی جگہ نمایاں طور پر اچھے لگے۔ پیشِ نظر شمارے میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، سیّد احمد شمیم، احمد بدر، ایم نصر اللہ نصر اور ڈاکٹر امام اعظم کی نگارشات نے رسالے کو مزید باوزن بنا دیا ہے۔ دیگر مشمولات بھی اس معیاری رسالے کے مطالعے کے لیے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ ''تمثیل نو'' کے تمام شماروں میں صرف تحقیق، تنقید اور تخلیق ہی نہیں بلکہ تقریباً تمام ادبی اصناف شامل رہتی ہیں۔ ''تمثیل نو'' میں جو مشمولات شائع کی جاتی ہیں وہ خواہ نثری ہوں یا شعری یقیناً قاری کے لیے ہر لحاظ سے مفید تر ہیں اور آپ کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ۔ میری نیک تمنائیں اور دعائیں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

....

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، رامپور، یو پی: کل ہی پانچ ہفتے بعد دہلی سے آیا ہوں۔ اتوار کے روز پھر سے دہلی جانا ہے۔ بیٹی پہلے سے بہتر ہے لیکن ابھی اس کی ایک رپورٹ اور آنی ہے۔ حسب وعدہ اپنی نئی کتاب ''تذکروں کا اشاریہ'' پیشِ خدمت ہے۔ اس کتاب میں تین ہزار قلم کاروں کا اشاریہ ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب انفرادیت رکھتی ہے۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔ ''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ ایک خاص نمبر کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکالرز و محققین کے لیے اس کا ہر صفحہ مفید ہے۔ اس کے کبھی شماروں سے اگر وفیات ہی لے لی جائیں تو باقاعدہ ایک اچھی تحقیقی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ''تمثیل نو'' کی ساری تخلیقات کا اشاریہ مزید اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہو سکتا ہے۔ مجھے ذرا سہولت ہو تو اشاریہ کو دوبارہ دیکھوں گا۔ ان شاء اللہ۔

....

ڈاکٹر رضوانہ ارم، جمشید پور: آپ کی علمی و ادبی کاوشوں اور ادبی ہنرمندیوں کی معترف فقط میں ہی نہیں بلکہ ایک زمانہ آپ کی معرکتہ الآرا تصانیف و تخلیقی جولانی اور اعلیٰ ادارتی صلاحیتوں کا قائل ہے۔ 'تمثیل نو'، 'سہرے کی ادبی معنویت' نے شعری جہات شگفتہ لب و لہجہ اور ادبیت کے شش جہات امکانات کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔ نہایت ممنون و مشکور ہوں۔ 'تمثیل نو' اور 'سہرے کی ادبی معنویت' ترتیب و تہذیب، تزئین و آراستگی کا عمدہ استعارہ ہے۔ اداریہ تا منثور تبصرے ادبی رسائل و جرائد کے باب میں اعلیٰ ادبی ذوق اور معیاری اقدار کی نمائندگی کا باعث ہیں۔ یوں تو اردو کے عالمی افق پر کئی عمدہ رسائل و جرائد اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں مگر 'تمثیل نو' کا ہر شمارہ عالمی ادب کے اس بحرِ بے کراں میں نیرنگیٔ افکار و اسلوب نادر کے ایک خوش نما جزیرے سے عبارت ہے۔ بہر حال، اداریہ

ادبی وثقافتی خبروں سے مزین ہے جو حصول مادری زبان، درس وتدریس، مقابلہ جاتی امتحانات اور اعلیٰ درجات میں معیاری نصاب ادب کی ترتیب میں نہایت معاون ومددگار ہے۔ ''خصوصی پیشکش'' کے عنوان سے جناب مظہر امام، جناب سید منظر امام اور جناب مناظر عاشق ہرگانوی کی عالمانہ بصیرت، ذکاوت وذہانت اور تخلیقی بلندیٔ فکر پر مشتمل تمام مضامین لائق صد ستائش ہیں۔ دیگر مضامین، انشائیہ، افسانچہ، منی کہانی، نظمیں، غزلیں، تبصرے، منظوم تبصرے اور منثور تبصرے اس شمارے کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ 'سہرے کی ادبی معنویت' آپ کی علمی وادبی ہنرمندیوں اور کارکردگی عمدہ شاہکار کہے جانے کا مستحق ہے جس میں شامل تمام تہنیتی نظمیں، سہرے کے اشعار، زبان وبیان کی فصاحت وبلاغت، خلاقانہ ذہانت، عمدہ تراکیب واستعاروں نیز پُرخلوص وپُرجوش دلی جذبوں کا ایک خوبصورت نگارخانہ ہے۔ 'سہرے کی ادبی معنویت' کے تمام مشمولات فن سہرا نگاری میں نئے امکانات کے در وا کرتے ہیں۔ اسلوب کی ندرت، فکروفن پر نگاہ اور فن سہرا نگاری پر سیر حاصل بحث نے عہد جدید کے قاری کو اس فن سے متعارف کروانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ تمام مضامین وشعری گل بوٹے چمن میں بہار کی آمد کا سماں پیش کر رہے ہیں۔ دلی و پُرخلوص مبارکباد! ایک نثری نظم اور ایک غزل ارسال کر رہی ہوں، پسند آئے تو شائع کرنے کی زحمت کریں۔

....

معراج احمد معراج، کلٹی، مغربی بنگال :پروفیسر مشکور معینی صاحب کے توسط سے آپ کی عنایت کردہ دوگراں قدر کتابیں موصول ہوئیں، میں اس عنایت کے لئے جناب والا کا از حد ممنون ہوں۔ پہلی کتاب ''گیسوئے افکار'' ہے جو آپ کے مضامین کا مجموعہ ہے جبکہ دوسری کتاب آپ کی ادارت میں نکلنے والا مایہ ناز رسالہ ''تمثیلِ نو'' ہے۔ ''تمثیلِ نو'' کا سرسری مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ آپ نے کوزے میں سمندر بھر دیا ہے۔ عظیم علمی ادبی شخصیت منظر شہاب پر گوشہ بھی قابلِ تعریف ہے اور یہ آپ کی طرف سے مرحوم کے لئے عمدہ خراجِ عقیدت ہے۔ منظر شہاب کے فن وشخصیت کے تعلق سے جو مضامین قلم بند کئے گئے ہیں وہ واقعی لائقِ ستائش ہیں۔ ہر مضمون نگار نے اپنے عنوان کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ انور عظیم، مظہر امام، احمد بدر، شمس فریدی، پروفیسر منظر امام اور آپ کے مضامین نے منظر شہاب کی شخصیت کے کئی پہلو روشن کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مظہر امام، منظر امام اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی پر خصوصی گوشہ شامل کر کے آپ نے ان شخصیات کے تئیں اپنی عقیدت ومحبت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس رسالے میں آپ نے مومن اور وحشت کلکتوی کی شاعری پر بھی معلومات افزا مضامین کو جگہ دی ہے۔ انشائیے، افسانچے اور افسانہ کے حوالے سے بھی اچھی تخلیقات کو شاملِ اشاعت کیا ہے۔ منظومات کا حصہ بھی قابلِ تعریف ہے اور اس میں آپ کی نظرِ انتخاب کی داد دینا ہوگی۔ کئی کتابوں پر تبصرے بھی اس رسالے کی اہمیت میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ میں محمد علی حسین شائق کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے شعری مجموعے ''دفینہ پہاڑ کا'' پر بہت ہی کارآمد اور پرمغز تبصرہ کیا ہے۔

☆☆☆

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا ☆ رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

ڈاکٹر محمد امین عامر (ہوڑہ، موبائل: 9883057511)

اردو جریدہ "تمثیل نو" دربھنگہ (جولائی ۲۰۱۸-جون ۲۰۱۹ء)

کیا جاذبِ نظر ہے "تمثیل نو" مجلّہ
جولائی اٹھارہ تا جون انیس کا رسالہ

مخصوص ہے یہ "گوشۂ منظر شہاب" یہ
دیگر نگارشات میں بھی کامیاب یہ

اداریہ "مجھے کچھ کہنا ہے" دیکھئے
دکتر امام اعظم کا ہے غور سے پڑھئے

حمد و نعت کا ہے گلدستہ بعدۂ
پھیلا رہا ہے خوشبو ہر سو بہ کو بہ کو

ہیں کامیاب اس میں شکیل سہسرامی
اور کامران ہیں جو امان خان دل بھی

پھر اس کے بعد حسین[1] پرویز کے ہے قلم کا
دکتر اوصاف سعید سے بہتر مصاحبہ

مکتوب دلگداز ہے نوشاد نوری کا
منظر شہاب کے ہے نام غزل سرائی کا

"پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں"
جب شاعر کہے ایسی غزل سرد فضا میں

انور عظیم کی بھی یہ تحریر خوب ہے
تحریر کی زبان کی تاثیر خوب ہے

"منظر شہاب، پیراہن جاں اور تیزا ہوا"
مظہر امام کا ہے مقالہ یہ بے بہا

"مجروح پرندے کی صدا" کے حوالے سے
منظر شہاب کی ہے غزل جھوم جائیے

رفعت سروش کے ہے قلم کا یہ جائزہ
گویا کہ دُرِ ناب سے ہے یہ جڑا ہوا

نثری ادب کا کیوں نہ نمونہ اسے کہیں
تخلیقِ مناظر کو بھلا کیوں نہ ہم پڑھیں

"مجروح پرنے کی صدا" پر بھی گوش ہو
منظر شہاب کی ہے صدا کچھ تو ہوش ہو

اقبال انصاری کی ہے تحریر دلگداز
دراصل ہے مجروح پرندے کی یہ آواز

"منظر شہاب: جینے کی ادا کا شاعر" ہے
مقالۂ شمیم[2] سے یہ نکتہ ظاہر ہے

"ایم صلاح الدین[3] کی منظر شہاب شناسی"
عنوان کے تحت ہے منظر کی نکتہ رسی

"عصری آگہی کا شاعر: منظر شہاب" ہے
مضمونِ ابوالفیض[4] بہت لاجواب ہے

"اور پھر بیاں اپنا" ہے ایک مقالہ
شہاب کے ہے پندرہ مضامین کا مجموعہ

شمس فریدی کا ہے اس پر مطالعہ
کیا خوب انہوں نے پیش کیا ہے یہ جائزہ

اردو ڈراما کے لئے منظر شہاب نے
کردار بہتر پیش کیا ہے یہ جانئے

اس کے فروغ میں بھی ہے شہاب کا حصہ
جس پر صلاح الدین کا مضمون ہے عمدہ

منظر کی نثرنگاری پہ بھی دیکھئے مضمون
احمد بدر کی ہے یہ تحریر بوقلمون

ایم نصر اللہ نصر کی تحریر دیکھئے
عنوان کے تحت ہے جو تفسیر دیکھئے

"منظر شہاب کے (جو) مہربانِ خاص" ہیں
احباب ان کے گویا ان کے دل کے پاس ہیں

"جلتے شبدوں کی آنچ اور کومل لہجے کا شاعر"
بہ ایں عنوان پڑھئے منظر شہاب کو بغائر

پروین ارم[5] کا یارو مضمون یہ ہے عمدہ
گویا گلوں کا یہ ہے آراستہ گلدستہ

"آسمانِ شاعری کا درخشندہ شہاب" ہے
شعر و سخن کا یہ بہت پُرنور باب ہے

ابرار احمد[6] اجرای کا یہ عنوان ہے
''نظم و غزل کے آئینے میں منظر شہاب'' کو
منظر شہاب: شخصیت اور فن'' کا جائزہ
خصوصی پیشکش بھی ہے مظہر امام پر
''مظہر امام کی شاعری سے چربہ اور سرقہ''
''مظہر امام کی یاد میں'' اختر جاوید نے
''مظہر امام: اک آواز جو ہمیشہ سنائی دے گی''
سید منظر امام پر بھی خصوصی پیشکش
''یہ نہ ہونا تھا پھر کیسے ہوا؟'' کہو
''سید منظر امام کا تخلیقی عمل'' بھی
''سید منظر امام: اک تاثر'' بھی پڑھئے
''سید منظر امام: کچھ یادیں، کچھ باتیں''
مناظر عاشق پہ مضامینِ دلنشیں
''ادب کا کوزہ گر'' ہیں عاشق ہرگانوی
''مناظر عاشق کی ہیں جو چار کتابیں
''مناظر عاشق کی نعتوں میں جاگتے''
اشعار کے حوالے سے امام اعظم کا
''ظفر اوگانوی کا اک دلچسپ خط بھی ہے''
''اردو افسانچے کا ایک المیہ'' تحریر
''کند ہم جنس باہم جنس'' قمر نقوی[10] بھوپالی کا
''ادبی صحافت'' کے عنوان نقوی[11] بخاری کا
''مومن کی شاعری میں تطبیق اور تضاد''
تاریخ کے آئینہ میں اردو کا بھی سفر
''وحشت کلکتوی کی تخلیقِ ہنرمندی
خورشید کیوں نہ کہئے سلیماں خورشید کو
چمکا تھا اُفقِ ہند میں جو بن کے روشنی
''عربی ادبیات کے اردو تراجم'' کی
ابرار اجراوی کی ہے تصنیف دوستو
پھر اس کے بعد ''فرات اور حسین الحق'' پڑھئے
خالد محمود کا ہے نثری اسلوب کیا
''گیسوئے اسلوب'' سنوارے ہیں امام اعظم نے

تحریر میں ہے پختگی مستحکم بیان ہے
عبدالرحمٰن عبد[7] کو بھی پڑھئے دوستو
دکتر امام اعظم نے بھی پیش ہے کیا
مقالہ نگاروں کے مقالے بھی خوب تر
کیا خوب نقد و نظر ہے مناظر عاشق[8] کا
کھینچی ہیں لکیریں بہت باقاعدگی سے
عبدالرحمٰن عبد کی ہے تخلیق عمدگی
از جانبِ مدیرِ مجلّہ ہے کیا دلکش
مقالۂ احمد شمیم پر بھی نظر ہو
ہے جائزۂ مناظرِ عاشق ہرگانوی
اور نجم عثمانی صاحب کو بھی داد دیجئے
عبدالرحمٰن عبد کی ہیں ذہنی کاوشیں
خصوصی پیشکش کے تحت ہیں یہ آفریں
کیا عمدہ نثر پارہ ہے نصر اللہ نصر کی
عرفانہ[9] کی ان پر ہیں بصیرانہ نگاہیں
''احساس کی چبھن'' ہے جو محسوس کیجئے
کیا دلنشیں مقالہ ہے پڑھئے اسے ذرا
عاشق کے نام اور جواب اس کا بھی پڑھئے
عاشق ہرگانوی کی ہے تنقیدِ دل پذیر
مقالہ پُر از معلومات ہے جناب عالی کا
''تمثیل نو'' مجلّہ پر ہے خوب تبصرہ
عبدالمنان[12] کی ہے تحریر طبع زاد
جاری ہے سوئے منزل از خامۂ مظفر[13]
کیا فکر اجاگر ہے از صابر علی سیوانی
علم و ادب کا ایک تھا مہرِ درخشاں جو
عامر[14] بھی ہے گواہ چھٹی اس سے تیرگی
جو معنویت ہے اس پہ کتابِ تحقیقی
جس پر صلاح الدین کا ہے تبصرہ یارو
اوار ایم نصر اللہ نصر کی بھی داد دیجئے
ایم نصر اللہ نصر کا اس پہ ہے جائزہ
ادبی مباحث اور تنقیدی نگاہ سے

''دکتر امام اعظم کا تنقیدی مکاشفہ'' ''گیسوئے ادب'' کے ہے حوالہ سے برملا

مجیر احمد آزاد[15] کا اس پہ ہے جائزہ موصوف کے قلم کی ہے تحریر بے بہا

احسان کی ہے شاعری میں خود اعتمادی اس پہ ہے خوب خواجہ[16] کے قلم کی جولانی

اردو افسانے کی ہے روایت کہاں تلک منشی پریم چند سے حجاب علی[17] تک

دکتر حسن انصاری کا اس پہ ہے مطالعہ جو صفحۂ ''تمثیل نو'' جریدہ پہ اُبھرا

''فیض احمد فیض ایک عہد ساز شاعر'' پڑھئے مقالۂ مسیح الدین[18] بنظرِ غائر

''خودنوشت سوانح نگاری کا فن'' بھی جانئے ''بہار کے حوالے'' سے ترنم پروین سے

''سیاست کے مد و جزر میں سردار جعفری[19]'' ہیں ''تیرتا سخنور'' وہ ماہرِ تیراکی

محمد سرور لون کا ہے مقالۂ تحقیق کیجیے ضرور مطالعہ اس کا جناب عالی

''کلیم کے اسلوبِ غزل پر میر کے اثرات'' از جانبِ رضوان[20] ہے قاری کو یہ سوغات

''سید علی حیدر[21] کے تعلیمی خیالات'' بقلمِ زینب[22] یہ بھی بہت بہتر ہے سوغات

عصری درس گاہوں میں اردو تحقیق کی کیا حالیہ صورت ہے یہ بھی جانئے بھائی

سید ایاز احمد روہوی کی ہے تحریر کہ ہے بہت ہی فکر انگیز اور دل پذیر

پُرلطف ہے انشائیہ قیوم بدر کا داڑھی بڑھائی شیخ نے دلچسپ ہے قصہ

افسانچہ ''آج کا غریب ووٹر'' ہے از جانبِ رئیس[23] یہ سماجی منظر ہے

کیا خوب ہے افسانہ ایک دیکھئے ''موتی'' کہ ہے اثرِ خامۂ نقشبند قمر نقوی

منی کہانی بھی ہے ''اب وقت نہیں رہا'' انجم عظیم آبادی کا پُردرد و غمزدہ

نظموں سے بھی محظوظ ہوتے جایئے جناب قطعات و رباعیات سے ہوں آپ فیضیاب

غزلیں بھی لطف لے لے کے پڑھئے ضرور آپ دادِ سخن بھی شعراء کو دیجئے ضرور آپ

''نظر اپنی اپنی'' کے عنواں سے تبصرے گویا کہ کتابوں پر ہے یہ کھرے کھوٹے

عنوانِ ''راہ و رسم'' سے ہے سلسلۂ خطوط ''تمثیل نو'' مجلّہ سے ہے یہ بھی مربوط

منظوم تبصرہ بھی ہے اس خاکسار کا ''تمثیل نو'' مجلّہ میں اس شرمسار کا

منثور تبصرہ پہ بھی ہو آپ کی نظر
عارف[24] کی ہے نگارشِ بہتر و پُراثر

حواشی

[1] سید فاضل حسین پرویز [2] سید شمیم احمد [3] ڈاکٹر ایم صلاح الدین [4] ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی [5] ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم [6] ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی [7] ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد [8] پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی [9] ڈاکٹر وصیہ عرفانہ [10] نقشبند قمر نقوی بھوپالی [11] نقشبند قمر نقوی بخاری [12] پروفیسر عبدالمنان [13] ڈاکٹر منظر مہدی [14] ڈاکٹر امین عامر [15] ڈاکٹر مجیر احمد آزاد [16] خواجہ احمد حسین [17] حجاب امتیاز علی [18] ڈاکٹر مسیح الدین خاں [19] علی سردار جعفری [20] محمد رضوان [21] سید علی حیدر نیر [22] زینب ناز [23] رئیس صدیقی [24] عارف حسن وسطوی **نوٹ**: جن قلم کاروں کے اسمائے گرامی پورے کے پورے شعر میں آگئے ہیں ان پر حاشیہ نہیں ہے اور جن کے نام بار بار آئے ہیں اس پر ایک ہی حاشیہ ہے۔

انوارالحسن وسطوی

''تمثیلِ نو'' دربھنگہ (جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء): ایک نظر میں

اردو دنیا کا مقبول ادبی رسالہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ کا تازہ شمارہ (جولائی ۲۰۱۸ء تا جون ۲۰۱۹ء) ابھی میرے پیشِ نظر ہے۔ اردو کے معروف ادیب، شاعر اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں شائع ہونے والے اس رسالہ نے اپنے تازہ شمارہ کی اشاعت کے ساتھ اپنی عمر کے 18 سال مکمل کر لیے ہیں۔ اس شمارہ سے قبل اس رسالہ کے ۶۸ر شمارے (بشمول مشترکہ شمارے) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے ۱۸ ر برسوں کے سفر میں اس رسالہ نے جس کامیابی سے اپنی منزلیں طے کی ہیں وہ لائقِ تحسین بھی ہیں اور قابلِ رشک بھی۔ اس جریدہ کے حوالے سے لکھے گئے مضامین، تبصرے، رائیں اور اشاریے کو ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے ترتیب دے کر ۲۰۱۷ء میں کتاب ''تمثیلِ نو: ادبی صحافت کا نقش'' شائع کی ہے۔ جس سے ''تمثیلِ نو'' کے 18 سالہ ادبی سفر پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ جو اس رسالہ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ روزِ اوّل سے اصناف کے ساتھ ساتھ شخصیت پر بھی معیاری اور پُر مغز ادب پیش کرتا رہا ہے۔ زیرِ مطالعہ شمارہ میں بھی دیگر مشمولات کے علاوہ جہاں ممتاز ترقی پسند شاعر و ادیب منظر شہاب پر گوشہ شامل ہے وہیں اردو شعر و ادب کی تین اہم شخصیتوں جناب مظہر امام، پروفیسر سید منظر امام اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی پر مشتمل خصوصی پیشکش بھی شامل شمارہ ہے۔

۴۱۶ صفحات پر مشتمل ''تمثیلِ نو'' کے اس تازہ شمارہ کا آغاز حسبِ سابق ''مجھے کچھ کہنا ہے'' (اداریہ) سے ہوا ہے۔ پھر اس کالم میں گذشتہ ایک سال کی ادبی و ثقافتی خبریں شامل کی گئی ہیں جن کے مطالعے سے پورے ملک کی اہم ادبی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے۔ بعدہٗ ''وفیات'' کے تحت کل ۷۰ ر ادبی، علمی، سیاسی اور سماجی زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کی وفات کی خبریں مع مختصر معلومات شامل ہیں۔ ان شخصیتوں میں معروف کے علاوہ چند غیر معروف شخصیتیں بھی شامل ہیں جن کے نام سے عام لوگ واقف نہیں ہیں۔ یہ مدیرِ رسالہ کی وسیع القلبی ہے کہ وہ ذرّہ کو بھی آفتاب سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ''اداریہ'' کے بعد شکیل سہسرامی کی ''حمد'' اور امان خاں دل (امریکہ) کی 'نعت' سے رسالہ معطر ہوا ہے۔ پھر سعودی عرب میں مامور ہندوستانی سفیر ڈاکٹر اوصاف سعید سے ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کا ایک دلچسپ اور معلوماتی ''مصاحبہ'' نظر نواز ہوتا ہے۔ جس کے مطالعے سے سفیر مذکور کی اردو ادب سے ان کی وابستگی مرکزِ نگاہ بنتی ہے۔

''گوشۂ منظر شہاب'' میں منظر شہاب کی شخصیت اور فن پر مختلف عنوانات سے کل ۱۷ ر مضامین کی شمولیت ہے۔ اس گوشہ میں جن مضمون نگاروں کی نگارشات شامل ہیں وہ ہیں: نوشاد نوری، انور عظیم، مظہر امام، رفعت سروش، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، اقبال انصاری، سید احمد شمیم، پروفیسر سید منظر امام، ڈاکٹر سید ابوالفیض سیّد آبادی، شمس فریدی، ڈاکٹر ایم. صلاح الدین، احمد بدر، ایم نصر اللہ نصر، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد اور ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم۔ یہ تمام مضامین منفرد زاویے سے لکھے ہوئے ہیں اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ ''خصوصی پیش کش''

کے حصہ میں بالترتیب مظہر امام، سید منظر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی پر کئی عمدہ مضامین کی شمولیت ہے، جن کے مطالعہ سے تینوں شخصیتوں سے قاری کی واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مضامین کے باب میں مختلف عنوانات کے تحت کل ۱۸ر مضمون نگاروں کی تحریریں شامل ہیں، جن میں ڈاکٹر مظفر مہدی کا مضمون ''اردو تحریک: تاریخ کے آئینے میں'' مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور معلوماتی ہے۔ نئی نسل کے لوگوں کو بغور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اردو تحریک کی تاریخ سے واقف ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر مظفر مہدی صاحب نے نہایت سچائی اور دیانت داری سے بہار کی اردو تحریک کے دولخت ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اپنی اس تحریر میں پروفیسر عبدالمغنی کی مضبوط قیادت میں بہار میں اردو کے حقوق کی حصولیابی کا تذکرہ کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس باب کے دیگر مضامین بھی معلوماتی اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ بالخصوص نقشبند قمر نقوی بھوپالی کی تحریر ''کند ہم جنس با ہم جنس''، نقشبند قمر نقوی بخاری کی تحریر ''ادبی صحافت'' اور صابر علی سیوانی کی تحریر ''وحشت کلکتوی کی تخلیقی ہنر مندی'' متاثر کرتی ہیں۔ نثری حصہ میں ''ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی'' (انشائیہ)، ''آج کا غریب ووٹر'' (افسانچہ)، ''موتی'' (افسانہ) اور ''اب وقت نہیں رہا'' (منی کہانی) دلچسپ اور شگفتہ تحریریں ہیں۔ اس طرح نثری حصّہ مواد سے بھرپور ہے۔

زیرِ نظر شمارہ میں مختلف شعرائے کرام کی ۱۸ر نظمیں اور ۱۹ر غزلیں شامل ہیں۔ نثری حصّہ کی طرح یہ شعری حصہ بھی متاثر کرتا ہے۔ ''نظر اپنی اپنی کے تحت'' ۸۱ر کتابوں پر مناظر عاشق ہرگانوی، ابواللیث جاوید، ایم نصر اللہ نصر، مجیر احمد آزاد، محمد علی حسین شائق، اشرف احمد جعفری، ابرار احمد اجراوی، شاہد اقبال، احسان عالم، صفی الرحمن راعی اور احمد معراج کے تبصرے زینتِ شمارہ بنے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں کتابوں پر تبصرے شاید ہی کسی دوسرے ادبی رسالے میں پڑھنے کو ملیں۔ ''راہ و رسم'' (خطوط) کے تحت ابواللیث جاوید (نئی دہلی)، پروفیسر عبدالمنان (کولکاتا)، پروفیسر رئیس انور (دربھنگہ)، ڈاکٹر نگار عظیم (نئی دہلی)، منیر سیفی (پٹنہ)، احسان ثاقب (نوادہ)، انجم عظیم آبادی (کولکاتا)، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (بتیا، مغربی چمپارن)، صابر علی سیوانی (حیدرآباد) اور ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم (جمشید پور) کے خطوط شاملِ شمارہ ہیں۔ شمارہ کا اختتام ''تمثیلِ نو'' (۱۸-۲۰۱۷ء) پر محمد امین عامر کے منظوم اور ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کے منثور تبصرے پر ہوا ہے۔ ان تبصروں کے ذریعہ گذشتہ شمارے کا ایک بھرپور تعارف نذرِ قارئین کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ''تمثیلِ نو'' کا یہ تازہ شمارہ حسبِ سابق قابلِ قدر، قابلِ استفادہ، معیاری اور دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ ضخامت کے باوجود اس شمارہ کی قیمت صرف ۲۰۰ر روپے ہے، جسے محلّہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، ضلع: دربھنگہ-۷ (بہار) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مدیرِ رسالہ سے رابطہ کا نمبر 9431085816 ہے۔

☆☆☆

حاجی پور (موبائل: 9430649112)

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ ☆ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ڈاکٹر یاسمین خاتون

رسالہ 'تمثیلِ نو' (۲۰۱۸ء) ایک جائزہ

اردو جریدہ 'تمثیلِ نو' مارچ ۲۰۰۱ء سے تسلسل کے ساتھ بہار کے مردم خیز شہر دربھنگہ سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ بہار میں جدید شعری و ادبی رجحانات اور نثری و تنقیدی افکار و خیالات کا بہترین ترجمان ہے۔ زیر نظر رسالہ ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت'' سے متعلق تحقیقی و تخلیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم اور ان کے رفقائے کار حقیقتاً اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور فروغ و ترقی اور مقبولیت و محبوبیت کے لیے جو کوششیں اور کاوشیں کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش اور آفریں ہے۔ ان کی کاوشیں، عزائم اور رسالہ کے مشمولات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو داں طبقے کو مختصر وقت میں اردو کے تمام اصنافِ سخن سے آگاہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اس رسالہ میں ڈاکٹر امام اعظم صاحب کا اداریہ، حمد و نعت، سفر نامہ، روداد، رپورتاژ، اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت، اکیسویں صدی میں بہار کی اردو تنقید کے نئے افق، اکیسویں صدی میں دربھنگہ کی تنقیدی کائنات، 'گوشۂ نظام صدیقی' میں نظام صدیقی کے ادبی، تخلیقی اور تنقیدی مضامین سے متعلق تمام تر معلومات، 'گوشۂ عابد معز' میں ان کے ادبی شہ پاروں، طنز و مزاح اور افسانہ نگاری میں ندرت، انفرادیت اور انوکھا پن کا تعارف سے متعلق مضامین اور 'گوشۂ نقشبند قمر نقوی' میں ان کے ادبی و تخلیقی اور تنقیدی مضامین کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے، غزلیں، نظمیں، صحافت وغیرہ سب کچھ موجود ہیں جو انتہائی معلوماتی، دلچسپ اور مفید ہیں۔

'تمثیلِ نو' کے اس جدید شمارے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پوری ادبی، تحقیقی اور تنقیدی دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے جس سے اردو زبان و ادب کی اہمیت و افادیت اور رفتار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اہم ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور صحافیوں کے کارناموں اور ان کی ادبی خدمات سے ہر طرح واقفیت کرانے کی قابلِ ستائش کوشش ہے۔ اس میگزین کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے مطالعہ سے اردو ادب کی ارتقائی کاوشوں اور کوششوں کے بارے میں واقفیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر امام اعظم کا اداریہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' کا مطالعہ کیجیے۔ یہ مضمون دریا میں کوزے کو بند کر دینے کے مترادف ہے جو باسٹھ صفحات پر محیط ہے۔ 'سفر نامہ' کے ضمن میں پروفیسر حافظ شائق احمد یحییٰ کا سفر نامہ 'نیویارک شہر کی سیر'، قیوم بدر کا مضمون 'تہذیبوں کا گڑھ علی گڑھ' نہایت معلوماتی مضامین ہیں۔ ان سے نہ صرف جدید نسل استفادہ کر سکتی ہے بلکہ ادبا، مصنفین اور اہلِ قلم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس رسالہ سے ایک طرف بہار میں بیسویں صدی کے دوران اردو تنقید نگاری کی ترویج و ترقی کی کوششوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تو دوسری طرف اس کے تنقید نگاروں کی محنت و لگن اور ان کی گرانقدر خدمات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جن میں کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، ابوذر عثمانی، شکیل الرحمٰن، لطف الرحمٰن، احمد سجاد، مظفر اقبال، نجم الہدیٰ، قمر اعظم ہاشمی، ش۔ اختر، علیم اللہ حالی، اعجاز علی ارشد، ممتاز احمد خاں، محمد توقیر عالم، منصور عالم، اعجاز احمد، امام اعظم اور انوار الحسن وسطوی وغیرہ جیسی شخصیات شامل ہیں۔

اس رسالہ میں مشرق و مغرب کے درمیان تہذیبی و ثقافتی روابط و تعلقات کا امتزاج موجود ہے۔ یہ ادبی مضامین تبصروں، رایوں اور اشاریوں کا مجموعہ ہے۔ یہ جریدہ اپنی متنوع مشمولات کے سبب گذشتہ دو دہائیوں سے اردو حلقوں

میں معروف ہے۔اس کی اہمیت کے پیشِ نظر معتبر قلم کاروں نے ان مشمولات پر تحریریں قلمبند کی ہیں، انھیں یکجا کر کے مرتب موصوف نے 'تمثیلِ نو' کے قارئین کو ایک منفرد تحفہ پیش کیا ہے۔ اس رسالہ میں کتابوں پر تبصروں کی تعداد بھی غیر معمولی ہے۔ عام طور پر رسالوں میں معدودے چند کتابوں پر تبصرے شامل ہوتے ہیں مگر 'تمثیلِ نو' میں یہ تعداد پچاس سے بھی متجاوز ہے۔ یہ رسالہ کی دوسری انفرادیت ہے جو قابلِ ذکر ہے۔ الغرض یہ اردو داں طبقہ خاص طور پر شعبۂ اردو کے طلبہ و طالبات کے لیے از حد مفید اور نفع بخش ہے۔

ڈاکٹر سید احمد قادری (گیا) کا مضمون ''اکیسویں صدی میں بہار کی اردو تنقید کے نئے افق'' تنقیدی ادب کے موضوع پر ایک وقیع مضمون ہے جس میں انھوں نے بہار میں اکیسویں صدی کے تنقید نگاروں کی بیش بہا خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ ''بہار میں اردو تنقید کی شاندار روایت اور تاریخ رہی ہے لیکن افسوس کہ اس بکھرے ہوئے اوراق کو سمیٹنے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی جس کا نتیجہ ہے کہ بہار کے بہت سارے ناقدینِ ادب کے کارناموں پر وقت کی دبیز گرد پڑ گئی ہے۔'' ڈاکٹر سیّد احمد قادری نے ان تمام ناقدینِ ادب کی گرانقدر خدمات اور نگارشات کو اُجاگر کر کے ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا مضمون ''اکیسویں صدی میں دربھنگہ کی تنقیدی کائنات'' کو اردو ادب کے تنقیدی موضوع پر ایک اہم دستیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے دربھنگہ کے قلمکاروں، مصنفین اور ناقدینِ ادب کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی سنجیدہ کاوش کی ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''دربھنگہ کا ادبی، تخلیقی اور تنقیدی سفرنامہ بہت تابناک ہے۔ دکن سے لے کر شمالی ہندوستان تک دربھنگہ کا چرچا اور شہرہ ہے۔ یہ شہر اپنی جغرافیائی حدود اور آبادی نفوس کے اعتبار سے دوسرے شہروں کی بہ نسبت محدود اور مختصر ہے۔ مگر اس کی ادبی، تنقیدی اور تخلیقی حیثیت کا گراف جغرافیائی اور عددی شماریات سے ماورا ہے۔ یہاں ادبا، شعرا، محققین، فکشن نگار اور ناقدین کی بڑی تعداد سکونت پذیر ہے۔'' اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس شہر نے بڑے بڑے اہلِ قلم، نقاد اور محققین اور مصنفین کو جنم دیا ہے۔

پروفیسر توقیر عالم کا مضمون ''غالب کی غزل گوئی'' ایک اہم مضمون ہے۔ انھوں نے اس مضمون کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اردو غزل میں ایک جداگانہ روشِ اختیار کی تھی اور قدیم روایت سے ہٹ کر ایک ایسی جدید راہ اپنائی تھی جس میں فکر و فلسفہ کی آمیزش تھی جب کہ ان سے پہلے کے شعرا عشق و عاشقی اور ہجر و وصال کی دنیا ہی تک محدود تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''غالب نے اردو غزل کی دنیا بدل دی۔ اس میں فکر و فلسفہ کی آمیزش کی جب کہ عام طور سے اردو غزل عشق و عاشقی، ہجر و وصال تک ہی محدود تھی۔'' (تمثیلِ نو، ص:۱۷۲)

علاوہ ازیں 'حسرت موہانی بحیثیت مجاہدِ آزادی'، 'فروغِ اردو میں غیر مسلم ادیب و شاعر کا حصہ'، 'ایک منفرد اسلوب کے مالک علی میاں ندوی' اور دیگر مضامین معلومات افزا اور قابلِ توجہ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

☆☆☆

گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ:ا　موبائل: 6203908847

۲۴ نومبر ۲۰۱۹ء کو ایران سوسائٹی، کولکاتا میں منعقدہ قومی سیمینار بعنوان ''علامہ شبلی: حیات و کارنامے'' میں دائیں سے ڈاکٹر افتخار احمد، ڈاکٹر منصور عالم، ظہیر انور، نورالہدیٰ، ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر اعجاز علی ارشد اور ڈاکٹر درخشاں زریں

۲۶ دسمبر ۲۰۱۹ء کو مانور یجنل سینٹر کولکاتا میں ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب ''ہندستانی ادب کے معمار: مظہر امام'' کی رونمائی کرتے ہوئے (دائیں سے) شاہد اقبال، ڈاکٹر محمد مظہر قادری، ایم نصر اللہ نصر، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر افتخار احمد اور صابر رضا شمسی

۲۲ جنوری ۲۰۲۰ء کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا کے زیر اہتمام تیرہویں کل ہند اردو کتاب میلے میں منعقدہ احتجاجی مشاعرے کی تصویر۔ اسٹیج پر (سامنے کی صف میں دائیں سے) ڈاکٹر امام اعظم، ارشاد آرزو، عنبر شمیم، فیروز اختر، مشتاق انجم، فراغ روہوی، محمود راہی، قیصر شمیم (صدر مشاعرہ)، کمتر عظیم آبادی، نیر اعظمی اور امان اللہ ساغر۔ عقب میں حلیم صابر، کوثر پروین کوثر، شفیع الرحمٰن نجمی و دیگر

۱۹ ستمبر ۲۰۲۰ء کو پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب ''پہلی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) میں اردو زبان کا کردار'' کی رونمائی کرتے ہوئے (دائیں سے) ڈاکٹر عبدالقیوم ساقی، ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر آفتاب اشرف (صدر، شعبۂ اردو)، ڈاکٹر افتخار احمد اور ڈاکٹر وصی احمد شمشاد

۵؍ستمبر ۲۰۱۹ء کو کتاب ''گیسوئے افکار'' پیش کرتے ہوئے
جناب بلال حسن (صدر، بزمِ شہرِ نشاط، کولکاتا) اور ڈاکٹر امام اعظم

۶؍جولائی ۲۰۱۹ء کو کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' اور ادبی جریدہ
''تمثیلِ نو'' پیش کرتے ہوئے جناب محمد علی اشرف فاطمی
(سابق وزیرِ مملکت، حکومتِ ہند) اور ڈاکٹر امام اعظم

۲۱؍جولائی ۲۰۱۹ء کو 'ادبستان' محلہ گنگواره، دربھنگہ میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر ایم صلاح الدین
کی کتاب ''چراغِ آگہی'' کی رونمائی کرتے ہوئے (دائیں سے) ڈاکٹر تو امام، محمد کریم اللہ حیاتی، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر امام اعظم،
ڈاکٹر ایم صلاح الدین، حیدر وارثی، نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم)، محمد امام، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور معزالدین راغب

۶؍اکتوبر ۲۰۱۹ء کو 'ادبستان' محلہ گنگواره، دربھنگہ میں الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب
''گیسوئے افکار'' کی رونمائی کرتے ہوئے (دائیں سے) حافظ محمد نصر الحق، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر وکیل احمد (ایڈوکیٹ)، ڈاکٹر امام اعظم، رفیع الدین
راز (امریکہ)، حیدر وارثی، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، محمد کریم اللہ حیاتی، حافظ نازش نہال اور ڈاکٹر سرفراز احمد

۱۷؍نومبر ۲۰۱۹ء کو دربھنگہ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، ۳۱-ہرن باڑی لین، کولکاتا-۷۳ کی جانب سے ایک تقریبِ استقبالیہ کے دوران ڈاکٹر امام اعظم کی پذیرائی
کرتے ہوئے (دائیں سے) صادق حسین، اخلاق احمد (سابق کونسلر)، بدر عالم (صدر، ادارہ ہٰذا)، محمد ایوب صدیقی، محمد یونس (جنرل سکریٹری، ادارہ ہٰذا) و دیگر

BIHURD00640/04/1/2005-T.C. ISSN-2249-636X Rs. 200/-
Monthly **TAMSEEL-E-NAU** JULY 2019 - DECEMBER 2020
Vol-19, Issue : 74-79 Mobile : 08902496545
E-mail: imamazam96@gmail.com Blog: drimamazam.blogspot.com 09431085816
Hony **Editor : Dr. Imam Azam**, Gangwara, Darbhanga-846007 (Bihar)

ڈاکٹر امام اعظم کی کتابیں

- نصف ملاقات (مظہر امام کے نام خطوط) ۱۹۹۴ء
- قربتوں کی دھوپ (شعری مجموعہ) ۱۹۹۵ء
- مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۹۷ء
- نئے علاقے میں (ہندی سے ترجمہ) ۲۰۰۱ء
- اقبال انصاری: فکشن کا سنگِ میل ۲۰۰۳ء
- مولانا عبدالعلیم آسی: تعارف اور کلام ۲۰۰۳ء
- گیسوئے تنقید (ادبی مضامین) ۲۰۰۸ء
- عہد اسلامیہ میں دربھنگہ اور دوسرے مضامین ۲۰۰۹ء
- ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالغفور شہباز ۲۰۱۱ء
- گیسوئے تحریر (ادبی مضامین) ۲۰۱۱ء
- ہندوستانی فلمیں اور اردو (ادبی زاویے) ۲۰۱۲ء
- فاطمی کمیٹی رپورٹ: تجزیاتی مطالعہ ۲۰۱۳ء
- نامۂ نظیر (نظیر صدیقی کے خطوط امام اعظم کے نام) ۲۰۱۳ء
- مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری زون ۲۰۱۴ء
- اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب............ ۲۰۱۴ء
- نیلم کی آواز (شعری مجموعہ) ۲۰۱۴ء
- اکیسویں صدی میں اردو صحافت ۲۰۱۶ء
- مظہر امام (شخصیت سیریز برائے یوپی اردو اکاڈمی) ۲۰۱۷ء
- گیسوئے اسلوب (ادبی مضامین) ۲۰۱۸ء
- نقوشِ علی نگر: تبصرے اور تجزیے ۲۰۱۸ء
- سہرے کی ادبی معنویت ۲۰۱۹ء
- گیسوئے افکار (ادبی مضامین) ۲۰۱۹ء
- ہندوستانی ادب کے معمار: مظہر امام ۲۰۱۹ء
- پہلی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) میں اردو زبان کا کردار ۲۰۲۰ء

ڈاکٹر امام اعظم کے فن اور شخصیت پر کتابیں

- ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ — ڈاکٹر ایم صلاح الدین ۲۰۱۲ء
- عہدِ اسلامیہ میں دربھنگہ: تحلیل و تجزیہ — ڈاکٹر سرور کریم ۲۰۱۳ء
- دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی و صحافتی خدمات کے حوالے سے — ڈاکٹر سرور کریم ۲۰۱۶ء
- تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش — ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی ۲۰۱۷ء
- ڈاکٹر امام اعظم کی بازآفرینی — پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ۲۰۱۸ء
- Proximal Warmth ("قربتوں کی دھوپ" کا ترجمہ) — سیّد محمود احمد کریمی (مترجم) ۲۰۱۸ء
- چٹھی آئی ہے! (مشاہیر کے خطوط امام اعظم کے نام) — شاہد اقبال ۲۰۲۰ء

Design & Printed By : Screener, Kolkata-16, Mob. 9331094800